قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ

کہیے، پس حجت پوری اللہ کی رہی۔

رَحْمَةُ اللّٰهِ الْوَاسِعَة

شرح

حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَة

جلد چہارم

تصنیف

امامِ اکبر، مجدّدِ ملّت، حکیم الاسلام

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلوی قدس سرّہ

شارح

سعید احمد پالن پوری

استاذ دار العلوم دیوبند

ناشر

مکتبہ حجاز دیوبند ضلع سہارنپور (یوپی)

تفصیلات

نام کتاب	:	رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ جلد چہارم
نام ماتن	:	امام اکبر، حجۃ اللہ فی العالمین، مُسند الہند، حکیم الاسلام حضرت مولانا شاہ ولی اللہ قطب الدین احمد محدث دہلوی قدس سرہ (ولادت ۱۱۱۴ھ وفات ۱۱۷۶ھ)
نام شارح	:	سعید احمد پالن پوری استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند
سائز	:	۲۰×۳۰/۸
صفحات	:	٦٦٤
سنہ طباعت	:	باراول ربیع الثانی ۱۴۲۴ ہجری مطابق جون ۲۰۰۳ عیسوی
کمپیوٹر کتابت	:	روشن کمپیوٹرز، محلّہ اندرون کوٹلہ دیوبند فون نمبر 09997658227
کاتب	:	مولوی حسن احمد پالن پوری فاضل دارالعلوم دیوبند
پریس	:	ایچ۔ایس۔آفسیٹ پرنٹرس۔چاندنی محل، دریا گنج دہلی ۲

ناشر

مکتبہ حجاز دیوبند ضلع سہارنپور (یوپی)

فہرست مضامین

زکات کا بیان

روزوں کا بیان

حج کا بیان

سلوک واحسان کا بیان

بیوع ومعاملات

باب (۵) وراثت کا بیان ۶۲۶-۶۶۲

دوسری قسم

تفصیل واراحادیث مرفوعہ کے اسرار وحکم کا بیان

زکات کا بیان

باب (۱) زکوٰۃ کے سلسلہ کی اصولی باتیں

باب (۲) انفاق کی فضیلت اور امساک کی مذمت

باب (۳) زکاتوں کے نصاب

باب (۴) مصارفِ زکوٰۃ

باب (۵) زکوٰۃ سے تعلق رکھنے والی باتیں

باب ـــــ ۱

زکوٰۃ کے سلسلہ کی اصولی باتیں

زکوٰۃ کا عنوان عام ہے۔تمام انفاقات (زکوٰۃ،صدقۃ الفطر اور عُشر) اور محاصل (خراج وخُمس) اس کے ذیل میں آتے ہیں۔فقہ کی کتابوں میں بھی یہ عنوان عام استعمال کیا گیا ہے۔انفاق فی سبیل اللہ میں بہت فائدے ہیں۔تفصیل مبحث خامس، باب دہم میں گذر چکی ہے (دیکھیں رحمۃ اللہ الواسعہ ۱:۶۴۲-۷۵۰) یہاں اس کی دو بڑی مصلحتیں ذکر کی جاتی ہیں: ایک کا تعلق آدمی کی ذات سے ہے، دوسری کا ملکی مصالح سے۔

زکوٰۃ میں ذاتی مصلحت: زکوٰۃ نفس کو سنوارتی ہے

زکوٰۃ میں ذاتی مصلحت یہ ہے کہ وہ نفس کو سنوارتی ہے۔اور اس کی چار صورتیں ہیں:

پہلی صورت ـــــ انفاق سے بخل کا ازالہ ہوتا ہے ـــــ نفوس کا حرص وبخل کے ساتھ اقتران ہے۔اور حرص بدترین خُو ہے۔وہ آخرت میں نفس کے لئے سخت مضر ہے۔جو شخص انتہائی حریص ہوتا ہے: جب وہ مرتا ہے تو اس کا دل مال میں پھنسا رہتا ہے۔اور یہ تعلق اس کے لئے باعثِ عذاب بن جاتا ہے۔اور جو شخص راہِ خدا میں خرچ کرنے کا خوگر ہوتا ہے، اور حرص وطمع سے پاک ہوتا ہے: آخرت میں یہ چیز اس کے لئے مفید ہوتی ہے۔

آخرت میں نافع ترین خصلت اِخبات ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے نیازمندی اور بندگی ظاہر کرنا۔اس کے بعد سخاوتِ نفس کا درجہ ہے یعنی فیاضی اور بلند حوصلگی کا مقام ہے۔اخبات سے جبروت میں جھانکنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے یعنی وصلِ خداوندی کا باب وَا ہوتا ہے۔اور سخاوت سے نفس نکمی کیفیات سے پاک ہوتا ہے۔کیونکہ سخاوت کی روح: ملکیت کی بہیمیت پر قہر مانیت ہے۔فیاضی سے ملکیت کو بہیمیت پر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔اور بہیمیت پر ملکیت کا رنگ چڑھتا ہے۔اور وہ ملکیت کے احکام کو اپناتی ہے۔

اور ملکیت کو بہیمیت پر غلبہ تین کاموں سے حاصل ہوتا ہے: (۱) ضرورت کے باوجود راہِ خدا میں مال خرچ کرنا (۲) ظلم کرنے والے سے درگذر کرنا (۳) اور ناگواریوں میں سختیوں پر صبر کرنا، بایں امید کہ آخرت میں ثواب ملے گا۔چنانچہ

نبی ﷺ نے ان تینوں باتوں کا حکم دیا ہے۔ اوران میں جوسب سے اہم بات ہے یعنی انفاق فی سبیل اللہ: اس کی تفصیلات منضبط فرمائی ہیں۔ اور باقی دو کا مختصر تذکرہ فرمایا ہے۔ انفاق کی اہمیت اس سے بھی واضح ہے کہ قرآن کریم میں بہت سے مقامات میں زکوٰۃ کو نماز اور ایمان کے ساتھ ملا کر بیان کیا ہے۔ سورۃ البقرۃ آیت ۳ ہے: ''متقی وہ لوگ ہیں جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور نماز کا اہتمام کرتے ہیں۔ اور ہم نے جو کچھ ان کو دیا ہے۔ اس میں سے خرچ کرتے ہیں'' اور سورۃ المدثر آیات (۴۳-۴۵) میں اللہ پاک نے جہنمیوں کا قول نقل کیا ہے: ''ہم نہ تو نماز پڑھا کرتے تھے۔ اور نہ غریبوں کو کھانا کھلایا کرتے تھے۔ اور ہم بحث کرنے والوں کے ساتھ بحث کیا کرتے تھے'' یعنی اسلام کے خلاف باتیں چھانٹا کرتے تھے۔

دوسری صورت ــــــ کبھی انفاق کا الہام ہوتا ہے، تو اس وقت انفاق سے نفس خوب سنورتا ہے ــــــ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی مسکین کو کوئی سخت ضرورت پیش آتی ہے۔ وہ اللہ کے سامنے گڑگڑاتا ہے۔ اور تدبیر الٰہی میں اس کی حاجت روائی منظور ہوتی ہے، تو اللہ تعالیٰ کسی بندے کو الہام کرتے ہیں کہ وہ اس کی حاجت پوری کرے۔ پھر اگر وہ نیک بخت بندہ یہی شخص ہوتا ہے تو اس کے دل میں الہام قبول کرنے کے لئے کشادگی پیدا ہوتی ہے۔ اور قلب کو انبساط اور روحانی انشراح حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ الہام اس کو حاجتمند پر خرچ کر کے رحمتِ خداوندی حاصل کرنے کے لئے تیار کرتا ہے۔ اس لئے وہ خرچ کرنا نفس کو سنوارنے میں بے حد سودمند ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ انفاق دل کے داعیہ سے اور اللہ کو راضی کرنے کے جذبہ سے ہوتا ہے۔ پھر قرآن وحدیث میں جو انفاق کے فضائل آئے ہیں، اور اس پر جو ثواب کے وعدے کئے گئے ہیں وہ سونے پہ سہاگہ کا کام کرتے ہیں۔

تیسری صورت ــــــ انفاق جذبۂ ترحّم پیدا کرتا ہے ــــــ کسی بھی جاندار کو تکلیف میں مبتلا دیکھ کر دل کا پسیجنا اور اس پر ترس کھانا بھلے لوگوں کا فطری جذبہ ہے۔ نیز لوگوں کے ساتھ حسن معاملگی کا جن خوبیوں پر مدار ہے، ان میں سے بیشتر کا تعلق جنسی عاطفہ سے ہے۔ پس جس میں جذبۂ ترحّم نہیں، اس میں شگاف ہے، جس کا انسداد ضروری ہے۔ اور وہ انفاق کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔

چوتھی صورت ــــــ انفاق سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ اور نفس مزکّٰی ہوتا ہے ــــــ مبحث ۵ باب ۱۰ میں یہ بات تفصیل سے بیان کی گئی ہے کہ خیرات سے کس طرح خطائیں معاف ہوتی ہیں۔ اور جان ومال میں برکت ہوتی ہے۔ یہ چیز بھی نفس کے تزکیہ کا ذریعہ بنتی ہے۔

زکوٰۃ میں ملکی مصلحت: انفاق میں مملکت کی بہبودی ہے

انفاق سے مملکت کو نفع پہنچتا ہے۔ اور اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں:

پہلی صورت ــــــ انفاق سے کمزوروں کو سہارا اور حاجتمندوں کو تعاون ملتا ہے ــــــ ملک میں سب لوگ

تندرست اور مالدار نہیں ہوتے۔ کچھ کمزور اور حاجت مند بھی ہوتے ہیں۔ اور حوادث کا حال یہ ہے کہ صبح وہ کسی پر ٹوٹتے ہیں تو شام کسی پر۔ ہر قوم کسی بھی وقت دست نگر ہوسکتی ہے۔ پس اگر لوگوں میں کمزوروں اور حاجت مندوں کی معاونت اور غمخواری کا طریقہ نہیں ہوگا، تو کمزور برباد ہوجائیں گے اور حاجت مند بھوکے مریں گے۔

دوسری صورت —— انفاق سے حکومت کی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور رفاہی کام انجام پاتے ہیں —— حکومت کے ذمہ دو کام ہیں: اول: سرکاری عملہ کی کفالت کرنا۔ کیونکہ وہ مملکت کے کاموں میں مشغولیت کی وجہ سے اپنی کفاف کمانے پر قادر نہیں۔ اس لئے ان کے گذارے کا انتظام حکومت کے ذمہ ہے۔ دوم: رفاہِ عام کے کام۔ جیسے سڑکیں بنانا، پُل باندھنا وغیرہ۔ یہ کام چند افراد بسہولت انجام نہیں دے سکتے۔ ایسے کام حکومت ہی بسہولت انجام دے سکتی ہے۔ اس لئے ان دونوں کاموں کے لئے خزانہ کی ضرورت ہے۔ اور وہ لوگوں کے تعاون ہی سے جمع ہوسکتا ہے۔

اور آسان اور مصلحت سے ہم آہنگ بات یہ ہے کہ مذکورہ دونوں مصلحتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا جائے۔ چنانچہ شریعت نے ایک مصلحت کو دوسری مصلحت میں داخل کردیا ہے یعنی ہر انفاق سے نفس کی اصلاح بھی ہوتی ہے، اور فقراء اور حکومت کی ضرورت بھی پوری ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر انفاق عبادت ہے۔

﴿من أبواب الزكاة﴾

اعلم: أن عمدةَ مارُوعى فى الزكاة مصلحتان:

[۱] **مصلحةٌ**: ترجع إلى تهذيب النفس، وهى: أنها أُحضرتِ الشُّحَّ، والشحُّ أقبحُ الأخلاق، ضارٌّ بها فى المعاد؛ ومن كان شحيحا: فإنه إذا مات بقى قلبُه متعلِّقا بالمال، وعُذِّب بذلك، ومن تَمَرَّنَ بالزكاة، وأزال الشح من نفسه، كان ذلك نافعًا له.

وأنفعُ الأخلاق فى المعاد — بعد الإخبات للّٰه تعالى — هو سخاوة النفس، فكما أن الإخبات يُعِدُّ للنفس هيئةَ التطلُّع إلى الجبروت، فكذلك السخاوة تعدُّ لها البراءةَ عن الهيئات الخسيسة الدنيوية.

وذلك: لأن أصلَ السخاوة قهرُ الملكيةِ البهيميةَ، وأن تكون الملكيةُ هى الغالبة، وتكون البهيميةُ منصبغةً بِصِبغها، آخذةً حكمَها.

ومن المنبِّهَاتِ عليها: بذلُ المال مع الحاجة إليه، والعفوُ عمن ظلم، والصبرُ على الشدائد فى الكُرَيْهات، بأن يَهُونَ عليه أَلَمُ الدنيا، لإيقانه بالآخرة.

فأمر النبىُّ صلى اللّٰه عليه وسلم بكل ذلك، وضبط أعظمَهَا — وهو بذلُ المال — بحدودٍ،

وقُرِنَتْ بالصلاة وبالإيمان في مواضع كثيرة من القرآن ، وقال تعالى عن أهل النار: ﴿لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ، وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ، وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَائِضِيْنَ﴾

وأيضًا: فإنه إذا عَنَّتْ للمسكين حاجةٌ شديدة، واقتضى تدبيرُ اللّٰه أن يُسَدَّ خَلَّتُه: بأن يُلْهِمَ الإنفاقَ عليه في قلب رجل، فكان هو ذلك: انبسط قلبُه للإلهام، وتحقق له بذلك انشراحٌ روحانِيٌّ، وصار مُعِدًّا لرحمة اللّٰه تعالى، نافعًا جدًّا في تهذيب نفسه؛ والإلهامُ الْجُمَلِيُّ المتوجهُ إلى الناس في الشرائع تِلْوُ الإلهام التفصيلي في فوائده.

وأيضًا : فالمزاج السليم مجبولٌ على رِقَّةِ الجنسية، وهذه خصلةٌ: عليها يتوقف أكثرُ الأخلاق الراجعةِ إلى حُسْنِ المعاملة مع الناس، فمن فقدها: ففيه ثُلمة، يجب عليه سدُّها.

وأيضًا: فإن الصدقات تكفر الخطيئات، وتزيد في البركات، على ما بينا فيما سبق.

[۲] ومصلحة: ترجع إلى المدينة، وهي: أنها تجمع لامحالةَ الضعفاءَ، وذوي الحاجة؛ وتلك الحوادثُ تغدو على قوم وتروح على آخرين، فلو لم تكن السنَّةُ بينهم مواساةَ الفقراء، وأهلِ الحاجات، لهلكوا وماتوا جوعًا.

وأيضًا : فنظام المدينة: يتوقف على مال يكون به قِوامُ معيشةِ الحفظة الذابِّيْن عنها، والمدبِّرين السائِسِيْن لها؛ ولما كانوا عاملين للمدينة عملاً نافعًا، مشغولين به عن اكتساب كفافهم: وجب أن يكون قِوامُ معيشتهم عليها؛ والأنفاقات المشتركة لا تسهل على البعض، أولا يقدر عليها البعض، فوجب أن تكون جبايةُ الأموال من الرعية سنةً.

ولما لم يكن أسهلُ ولا أوفقُ بالمصلحة من أن تُجعل إحدى المصلحتين مضمومةً بالأخرى: أَدخلَ الشرعُ إحداهما في الأخرى.

ترجمہ: زکوۃ کے ابواب کی اصولی باتیں: جان لیں کہ ان مصالح میں سے جو زکوۃ میں ملحوظ رکھی گئی ہیں: بہترین مصلحتیں دو ہیں:

ایک: وہ مصلحت ہے جس کا تعلق نفس کی اصلاح سے ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نفس میں حرص حاضر کی گئی ہے۔ اور حرص بدترین خصلت ہے۔ نفس کے لئے آخرت میں ضرر رساں ہے۔ اور جو شخص انتہائی درجہ حریص ہوتا ہے: جب وہ مرتا ہے تو اس کا دل مال کے ساتھ الجھا رہتا ہے۔ اور وہ اس تعلق کے ذریعہ سزا دیا جاتا ہے یعنی وہ تعلق ہی باعثِ عذاب بن جاتا ہے۔ اور جو شخص زکوۃ ادا کرنے کا خوگر ہوتا ہے، اور اپنے نفس سے انتہائی حرص کو دور کر دیتا ہے: تو یہ بات اس کے لئے مفید ہوتی ہے۔

اور اخلاق میں سے آخرت میں نافع ترین خصلت ـــــ اللہ تعالیٰ کے سامنے نیازمندی کے اظہار کے بعد ـــــ وہ سخاوتِ نفس ہے۔ پس جس طرح یہ بات ہے کہ اخبات نفس میں جبروت (اللہ تعالیٰ) کی طرف جھانکنے کی کیفیت پیدا کرتا ہے، پس اسی طرح سخاوت: نفس کو دنیوی نکمّی کیفیات سے پاکی کے لئے تیار کرتی ہے۔ اور یہ بات اس لئے ہے کہ سخاوت کی بنیاد: ملکیت کا بہیمیت کو قابو میں کرنا ہے۔ اور یہ بات ہے کہ ملکیت ہی غالب ہونے والی ہو۔ اور بہیمیت: ملکیت کے رنگ میں رنگین ہونے والی ہو، اور اس کے حکم کو اپنانے والی ہو۔

اور اس پر یعنی ملکیت کے غلبہ پر آگہی دینے والی یعنی پیدا کرنے والی چیزوں میں سے: (۱) حاجت کے باوجود مال خرچ کرنا ہے (۲) اور ظالم سے درگذر کرنا ہے (۳) اور ناگواریوں میں سختیوں پر صبر کرنا ہے۔ بایں طور کہ آسان ہو جائیں اس پر دنیوی تکالیف، اس کے آخرت پر یقین رکھنے کی وجہ سے۔

پس حکم دیا نبی ﷺ نے ان سب باتوں کا یعنی مال خرچ کرنے کا اور حق تلفی کرنے والوں سے درگذر کرنے کا اور شدائد میں صبر کرنے کا۔ اور منضبط کیا ان میں سے اہم ترین کو ـــ اور وہ مال خرچ کرنا ہے ـــ حدود وضوابط کے ساتھ۔ اور ملائی گئی زکوٰۃ: نماز اور ایمان کے ساتھ قرآن کی بہت سی جگہوں میں۔ اور اللہ تعالیٰ نے دوزخیوں کا قول نقل کیا ہے: ''نہیں تھے ہم نماز پڑھنے والوں میں سے۔ اور نہیں کھانا کھلایا کرتے تھے ہم غریب کو، اور گھسا کرتے تھے ہم گھسنے والوں کے ساتھ''

اور نیز: پس بیشک شان یہ ہے کہ جب کسی مسکین کو کوئی شدید حاجت پیش آتی ہے۔ اور اللہ کا انتظام چاہتا ہے کہ پوری کی جائے اس کی حاجت، بایں طور کہ الہام کریں وہ اس بندہ پر خرچ کرنے کا کسی شخص کے دل میں۔ پس ہوتا ہے وہ مُلْہَم یہی آدمی: تو کشادہ ہوتا ہے اس کا دل الہام کے لئے یعنی وہ شخص الہام قبول کرتا ہے اور پایا جاتا ہے اس قلب میں اس الہام کی وجہ سے روحانی انشراح۔ اور ہو جاتا ہے وہ الہام اللہ کی رحمت کو تیار کرنے والا، بہت زیادہ نافع اس کے نفس کو سنوارنے میں، اور الہام اجمالی جو شریعتوں میں لوگوں کی طرف متوجہ ہونے والا ہے، وہ الہام تفصیلی کے پیچھے آنے والا ہے اس (انفاق) کے فوائد (بیان کرنے) میں۔

اور نیز: پس درست مزاج آدمی پیدا کیا گیا ہے تمام جاندار مخلوقات کے ساتھ مہربانی کے جذبہ پر۔ اور یہ ایک ایسی خصلت ہے: جس پر موقوف ہیں بیشتر وہ اخلاق جو لوگوں کے ساتھ حسن معاملگی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ پس جو شخص اس خصلت کو گم کرتا ہے: تو اس میں رخنہ ہے، ضروری ہے اس پر اس کو بند کرنا۔

اور نیز: پس بیشک صدقات خطاؤں کو مٹاتے ہیں اور برکتوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ اُس طرح سے جس کو ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔

(۲) اور دوسری مصلحت: شہر کی طرف لوٹتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ شہر اکٹھا کرتا ہے قطعی طور پر کمزوروں اور حاجت مندوں

کو۔ اور وہ حوادث صبح کو جاتے ہیں ایک قوم کے پاس اور شام کو جاتے ہیں دوسری قوم کے پاس۔ پس اگر نہ ہو طریقہ لوگوں کے درمیان فقیروں اور حاجت مندوں کی غم خواری کا تو وہ ہلاک ہو جائیں گے اور بھوکے مریں گے۔

اور نیز: پس شہر کا نظام موقوف ہے ایسے مال پر جس کے ذریعہ اُن محافظین کے گذارہ کا انتظام کیا جائے، جو شہر سے دور کرنے والے ہیں (دشمنوں کو) اور جو شہر کا انتظام اور تدبیر کرنے والے ہیں اور جب تھے وہ مفید کام کرنے والے شہر کے لئے، غافل ہونے والے اس کام کی وجہ سے اپنی بقدر ضرورت روزی کمانے سے تو ضروری ہوا کہ ان کی معیشت کا انتظام مملکت کے ذریعہ ہو —— اور مشترک خرچے: آسان نہیں ہوتے بعض پر یا قادر نہیں ہوتے ان پر بعض۔ پس ضروری ہے کہ پبلک سے اموال وصول کرنے کا کوئی طریقہ ہو —— اور جب نہیں تھا زیادہ آسان اور نہ مصلحت سے زیادہ ہم آہنگ: اس بات سے کہ بنائی جائے دو مصلحتوں میں سے ایک ملی ہوئی دوسری کے ساتھ۔ پس داخل کیا شریعت نے دونوں میں سے ایک کو دوسری میں۔

تشریح: الہام جُملی سے مراد: وحیِ تشریعی (قرآن وحدیث) ہے۔ اور یہ جُملی (مجموعی) اس لئے ہے کہ سب لوگوں سے اس کا تعلق ہے۔ کسی مخصوص آدمی سے اس کا تعلق نہیں۔ اور الہام تفصیلی سے مراد: تکوینی الہام ہے جو کسی خاص بندے کو کسی خاص آدمی پر انفاق کے سلسلہ میں ہوتا ہے۔ اور یہ تفصیلی اس لئے ہے کہ اس کا معین شخص سے تعلق ہوتا ہے اور ''فوائد بیان کرنے میں پیچھے آنے'' کا مطلب یہ ہے کہ الہام سے دل میں پیدا ہونے والی کیفیت کے علاوہ یہ فضائل بھی جذبۂ انفاق کے لئے مہمیز کا کام کرتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

مقدار و مدّتِ زکوٰۃ کی تعیین میں حکمت

جب زکوٰۃ کی مصلحت معلوم ہوگئی، تو اب دو چیزوں کی تعیین ضروری ہے؟

پہلی چیز: زکوٰۃ کی مقدار متعین ہونی ضروری ہے۔ کیونکہ تعیین نہیں ہوگی تو صارفین (زکوٰۃ دینے والے) کم سے کم دینا چاہیں گے۔ اور عاملین (زکوٰۃ وصول کرنے والے سرکاری آدمی) زیادہ سے زیادہ لینا چاہیں گے۔ اور اس سے منازعت ہوگی۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار بہت تھوڑی نہ ہو، کیونکہ اس کی کچھ اہمیت نہ ہوگی۔ نہ بخل ہٹانے میں وہ کارگر ہوگی (نہ اس سے غریبوں کی حاجت روائی ہوگی نہ عملہ کی کفالت) اور وہ بھاری مقدار بھی نہ ہو۔ کیونکہ اس کی ادائیگی دشوار ہوگی۔

دوسری چیز: وصولئ زکوٰۃ کی مدت متعین ہونی ضروری ہے۔ اور وہ مدت ایسا مختصر وقفہ نہ ہو جو جلد گھوم آئے اور لوگوں کے لئے ادائیگی دشوار ہو جائے۔ نہ بہت لمبا وقفہ ہو۔ کیونکہ مدتِ مدید کے بعد انفاق سے بخل کا رذیلہ زائل نہیں ہوگا۔

اور غریبوں اور سرکاری عملہ کے گھر خوش حالی بھی طویل انتظار کے بعد آئے گی۔

اور مصلحت سے ہم آہنگ مدت ایک سال ہے۔لوگ اس مدت کے عادی ہیں۔تمام انصاف پرور بادشاہ سال بھر میں لگان وغیرہ وصول کرتے ہیں۔پس اس مدت کے عرب وعجم خوگر ہیں۔اور یہ مدت ایک ایسے ضروری امر کی طرح ہوگئی ہے،جس کے بارے میں لوگ اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہیں کرتے۔اور یہ مدت ایک ایسے مسلّم امر کی طرح ہوگئی ہے جس کی عادت والفت ہوجانے کی وجہ سے کلفت دور ہوگئی ہے۔اس لئے یہی مدت مناسب ہے۔لوگ اس کو آسانی سے قبول کرلیں گے۔اوراس میں لوگوں پر مہربانی بھی ہے۔

ثم مَسَّتِ الحاجة:

[١] إلى تعيين مقادير الزكاة، إذ لولا التقدير لفَرَّط المفرِّطُ، ولاَعْتَدَى المُعْتَدِى؛ ويجب أن تكون غيرَ يسيرة لايجدون بها بالاً، ولاتَنْجَعُ من بخلهم؛ ولا ثقيلةً، يعسُر عليهم أداؤها.

[٢] وإلى تعيين المدة التى تُجبى فيها الزكواتُ؛ ويجب أن لاتكون قصيرة، يسرع دَوْرَانُها، فتعسر إقامتها فيها، وأن لاتكون طويلةً: لا تَنْجَعُ من بخلهم، ولا تَدُرُّ على المحتاجين والحفظة إلا بعد انتظار شديد.

ولا أوفقَ بالمصلحة من أن يُجعل القانون فى الجباية: ما اعتاده الناس فى جباية الملوك العادلة من رعاياهم؛ لأن التكليف بما اعتاده العرب والعجم، وصار كالضرورى الذى لايجدون فى صدورهم حرجًا منه، والمُسَلَّمِ الذى أذهبتِ الألفةُ عنه الكلفةَ: أقربُ من إجابة القوم، وأوفقُ للرحمة بهم.

ترجمہ: پھر حاجت پیش آئی: (۱) زکوۃ کی مقداروں کی تعیین کی۔کیونکہ اگر اندازہ مقرر نہیں کیا جائے گا تو کوتاہی کرنے والے کوتاہی کریں گے۔اور زیادتی کرنے والے زیادتی کریں گے۔اور ضروری ہے کہ وہ مقداریں اتنی تھوڑی نہ ہوں کہ لوگ اس کی کچھ پرواہ ہی نہ کریں۔اور نہ وہ ان کے بخل میں نفع پہنچائے۔اور نہ وہ اتنی بھاری ہوں کہ لوگوں پر ان کی ادائیگی دشوار ہوجائے (۲) اوراس مدت کی تعیین ضروری ہے جس میں زکاتیں وصول کی جائیں۔اور ضروری ہے کہ نہ ہو اتنی مختصر مدت کہ جلد ہو اس کا گھومنا۔پس دشوار ہوجائے اس مدت میں زکاتوں کی ادائیگی۔اور یہ کہ نہ ہو اتنی لمبی مدت کہ نہ نفع پہنچائے ان کے بخل میں۔اور نہ خوش حالی لائے محتاجوں اور نگہبانوں کے گھر مگر سخت انتظار کے بعد۔

اور نہیں ہے مصلحت سے زیادہ ہم آہنگ کوئی چیز اس سے کہ وصولی کا قانون بنایا جائے: اس مدت کو جس کے لوگ عادی ہیں انصاف پسند بادشاہوں کی وصولی میں ان کی رعایا سے۔اس لئے کہ اس چیز کا مکلّف بنانا جس کے عرب وعجم

عادی ہیں، اور وہ اس ضروری امر کی طرح ہوگئی ہے کہ نہیں پاتے لوگ اپنے سینوں میں اس کے بارے میں کچھ تنگی، اور وہ اس مسلّم امر کی طرح ہوگئی ہے کہ الفت نے اس مدت سے کلفت کو دور کردیا ہے: ایسی مدت زیادہ قریب ہے قوم کے قبول کرنے سے، اور زیادہ ہم آہنگ ہے لوگوں پر مہربانی کرنے سے۔

لغات: **البَال** سے مراد: وہ چیز ہے جس کا اہتمام کیا جائے **أمر ذو بالٍ**: وہ کام جو قابل اہتمام ہو...... **نَجَعَ** (ف) **نجوعًا**: فائدہ مند ہونا، نفع پہنچانا...... **جَبٰی** (ض) **جِبَايَة الخراجَ**: جمع کرنا۔ وصول کرنا...... **دَرَّ** (ن،ض) **دَرًّا**: بہت دودھ دینا۔ یہاں خوش حالی کے معنی ہیں۔ کہا جاتا ہے **لَادَرَّ دَرُّہ**: خدا کرے کہ وہ خوش حال نہ ہو۔

☆ ☆ ☆

زکوٰۃ، عُشر، خُمس اور صدقۃ الفطر کی تعیین کی وجہ

مقادیر مالیہ: زکوٰۃ، عشر، خُمس اور صدقۃ الفطر کی تعیین شریعت نے گذشتہ انصاف پرور بادشاہوں کے محاصل کے طریقوں کو پیشِ نظر رکھ کر کی ہے۔ معتدل ممالک کے تمام نیک سیرت بادشاہ چار مدّات سے اموال وصول کیا کرتے تھے۔ اور ان کی ادائیگی لوگوں پر بار نہیں ہوتی تھی۔ وہ خندہ پیشانی سے اس کو ادا کرتے تھے۔ وہ چار مدات یہ ہیں:

پہلی مد —— اموالِ نامیہ کے زوائد سے کچھ وصول کیا جائے —— **اموالِ نامیہ** وہ ہیں جن میں محسوس بڑھوتری ہوتی ہے۔ یہ تین اموال ہیں: (۱) وہ مواشی جو نسل حاصل کرنے کے لئے پالے جاتے ہیں، جو مباح گھاس چر کر پلتے بڑھتے ہیں (۲) کھیتیاں یعنی زمین اور باغات کی پیداوار (۳) اموالِ تجارت۔

ان اموال میں سے دو وجہ سے زکوٰۃ وعشر وصول کئے جاتے ہیں:

پہلی وجہ: یہ اموال مدافعت کے محتاج ہیں۔ کیونکہ جانوروں کی چرنے کے لئے بستی سے باہر آمد ورفت رہتی ہے۔ کھیتیاں اور پھل: جنگل میں غیر محفوظ مقام میں ہوتے ہیں۔ اور اموالِ تجارت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہیں اور گھروں میں اور دوکانوں میں بھی حفاظت کے محتاج ہیں۔ حکومت: درندوں، چوروں اور دراندازوں سے ان کی پاسبانی کرتی ہے۔ اور فقہی ضابطہ ہے: **الغُرم بالغُنم**: تاوان بعوض نفع ہے[1]۔ یعنی جب کسی چیز سے نفع اٹھایا ہے تو اس کا عوض لازم ہے۔ اس لئے انصاف پرور بادشاہ ان اموال سے کچھ وصول کیا کرتے تھے چنانچہ شریعت نے بھی مواشی اور اموال تجارت میں زکوٰۃ مقرر کی اور غلہ اور پھلوں میں عشر لازم کیا۔

دوسری وجہ: ان اموال میں نُماء حقیقی ہے یعنی ہر وقت ان میں اضافہ ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ مواشی بچے جنتے ہیں۔ کھیتیاں پکتی کٹتی ہیں اور ڈھیر لگ جاتا ہے۔ پھل اترتے ہیں اور تجارت نفع دیتی ہے۔ اس لئے اگر ان اموال کے

---

[1] قواعد الفقہ (سید عمیم الاحسان) قاعدہ ۱۹۵ شرح القواعد الفقہیہ (احمد زرقاء) قاعدہ ۸۶

زوائد اور بڑھوتری میں سے کچھ لیا جائے گا تو لوگوں پر کچھ بار نہ ہوگا۔

دوسری مد —— سرمایہ داروں سے اور دولت مندوں سے کچھ لیا جائے —— ان کے اموال میں سے بھی دو وجہ سے لیا جاتا ہے۔

پہلی وجہ: یہ اموال بھی چوروں ڈکیتوں سے حفاظت کے محتاج ہیں، جو حکومت کرتی ہے، اس لئے مذکورہ ضابطہ سے اس کا عوض لیا جاتا ہے۔

دوسری وجہ: دولت مندوں کے ذمّے اور بھی خرچے ہوتے ہیں یعنی وہ طرح طرح سے خرچ کرتے رہتے ہیں۔ پس اگر ان خرچوں میں زکوٰۃ بھی شامل کرلی جائے گی تو ان پر کچھ بار نہ ہوگا۔

تیسری مد —— سراسر نفع بخش اموال میں سے کچھ لیا جائے —— وہ اموال یہ ہیں: (۱) اسلام سے قریب زمانہ کے جاہلیت کے دفینے (۲) بہت قدیم عہد کی دفن کی ہوئی قیمتیں چیزیں (۳) اور احناف کے نزدیک قدرتی کانیں (۴) اور اموال غنیمت —— یہ سب اموال سراسر نفع بخش ہیں۔ بغیر کسی خاص مشقت کے لوگ ان کو حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے یہ اموال گویا مالِ مفت ہیں۔ پس اگر ان میں سے پانچواں حصہ لیا جائے گا تو لوگوں پر بار نہ ہوگا۔

چوتھی مد —— نفری ٹیکس —— گذشتہ حکومتیں ہر باروزگار آدمی پر ایک ٹیکس لگایا کرتی تھیں۔ کیونکہ لوگوں میں اکثریت کمانے والوں کی ہوتی ہے۔ پس اگر ان سے مال کی معمولی مقدار لی جائے گی تو بار نہیں ہوگی۔ اور مال کی معقول مقدار جمع ہوجائے گی۔ شریعت نے اس ٹیکس کے عوض صدقۃ الفطر مقرر کیا ہے۔

والأبواب التى اعتادها طوائف الملوك الصالحين من أهل الأقاليم الصالحة، وهو غيرُ ثقيل عليهم، وقد تلقتها العقول بالقبول: أربعة:

الأول: أن تؤخذ من حواشى الأموال النامية، فإنها أحوج الأموال إلى الذَّبِّ عنها، لأن النموَّ لايتم إلا بالتردُّد خارجَ البلاد، ولأن إخراج الزكاة أخف عليهم، لِمَايرون من التزايد كل حين، فيكون الغُرْمُ بِالغُنْمِ —— والأموال النامية ثلاثة أصناف: الماشية المتناسلة السائمة، والزروع، والتجارة.

والثانى : أن تؤخذ من أهل الدُّثور والكنوز، لأنهم أحوج الناس إلى حفظ الأموال من السُّرَّاق، وقُطَّاع الطريق، وعليهم أنفاقاتٌ، لايعسُر عليهم: أن تدخلَ الزكاةُ فى تضاعيفها.

والثالث: أن تؤخذ من الأموال النافعة، التى ينالُها الناس من غير تعب، كدفائن الجاهلية، وجواهر العاديِّين، فإنها بمنزلةِ المَجَّان، يخف عليهم الإنفاق منه.

والرابع: أن تُلْزَمَ ضرائبُ على رء وس الكاسبين، فإنهم عامَّةُ الناس وأكثرهم، وإذا جُبى من كل منهم شيئٌ يسير، كان خفيفًا عليهم، عظيمَ الخَطَر فى نفسه.

ترجمہ: اور وہ ابواب یعنی صیغے جن (سے لینے) کے عادی بنے ہوئے ہیں معتدل خطّوں کے نیک بادشاہوں کے گروہ۔ اور وہ لوگوں پر گراں نہیں۔ اور تحقیق استقبال کیا ہے ان ابواب کا عقلوں نے قبولیت کے ساتھ وہ مدّات چار ہیں:

اول: یہ کہ لیا جائے اموالِ نامیہ کے حواشی (زوائد) سے۔ پس بیشک وہ اموال سب سے زیادہ محتاج ہیں ان سے مدافعت کے۔ اس لیے کہ بڑھوتری تام نہیں ہوتی مگر بستیوں سے باہر آمد ورفت سے (یعنی مواشی کو اگر گھر باندھ کر چارہ دیا جائے گا تو آمد وخرچ برابر ہو جائے گا۔ اور سرکاری چراگاہ میں چریں گے تو زوائد نفع ہی نفع ہوں گے اور جب جانور جنگل میں جائیں گے تو ان کی حفاظت بھی ضروری ہوگی۔ جو حکومت کے ذمّے ہے) اور اس لیے کہ زکوٰۃ نکالنا لوگوں پر آسان ہے اُس اضافہ کی وجہ سے جو وہ ہر وقت دیکھتے ہیں۔ پس ہو جائے گا تاوان نفع کے عوض (یہ پہلی وجہ کی دلیل ہے) اور اموالِ نامیہ تین قسمیں ہیں: (۱) وہ مویشی جو سرکاری چراگاہ میں چرنے والے ہیں۔ اور نسل حاصل کرنے کے لیے پالے جاتے ہیں (۲) اور کھیتیاں (۳) اور اموالِ تجارت۔

اور دوم: یہ کہ بہت زیادہ مال اور خزانہ والوں سے زکوٰۃ لی جائے۔ اس لیے کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ اموال کی حفاظت کے محتاج ہیں چوروں اور ڈکیتوں سے۔ اور ان پر دیگر مصارف بھی ہیں۔ ان پر یہ بات دشوار نہیں کہ زکات ان مصارف کے درمیان داخل ہو جائے۔

اور سوم: یہ کہ سراسر نفع بخش اموال سے لیا جائے۔ وہ اموال جن کو لوگ حاصل کرتے ہیں کسی مشقت کے بغیر۔ جیسے: زمانۂ جاہلیت کے دفینے یعنی قریبی عہد کے رکاز۔ اور بہت قدیم زمانہ کے لوگوں کی دفن کی ہوئی قیمتی اشیاء۔ پس بیشک وہ اموال مفت ملی ہوئی چیزوں کی طرح ہیں۔ لوگوں پر ان میں سے خرچ کرنا آسان ہے۔

اور چہارم: یہ کہ مال کی کچھ مقدار لازم کی جائے برسرِ روزگار لوگوں کے سروں پر۔ پس بیشک کمانے والے عام لوگ اور اکثر لوگ ہیں۔ اور جب وصول کیا جائے گا ان میں سے ہر ایک سے تھوڑا مال تو وہ ان پر آسان ہوگا۔ اور فی نفسہٖ عظیم الشان مقدار ہو جائے گی۔

لغات: **الباب من المال:** صیغہ، مدّ ...... **حاشية:** کنارہ یہاں بمعنی زائد ہے ...... **الغُرْم:** تاوان، وہ مال جس کا ادا کرنا ضروری ہو ...... **الغُنم:** غنیمت ...... **الدَثْر:** بہت جمع **دُثور** ...... **تضاعیف:** درمیان، بیچ، **فی تضاعیف الکلام:** گفتگو کے بیچ میں ...... **جوھر:** معرب ہے گوہر کا بمعنی قیمتی پتھر۔ یہاں قیمتی اشیاء مراد ہیں ...... **عَادِیّ:** بہت قدیم۔ لسان العرب (مادّہ عدا) میں ہے کہ بہت پرانی چیز اور شخص کو قوم عاد کی طرف منسوب کرتے ہیں ...... **المَجّان:** مفت، کہا جاتا ہے: **أخذه أو فعَلَه مَجّانا:** اس نے مفت لیا یا کیا ...... **الضرائب جمعُ الضريبة:** ٹیکس۔

☆　☆　☆

وجوب زکوٰۃ کے لیے سال بھر کی مدت میں حکمت

وجوبِ زکوٰۃ کے لیے سال بھر کی مدت دو وجہ سے مقرر کی گئی ہے:

پہلی وجہ: زکوٰۃ کی بڑی انواع یہ ہیں: اموالِ تجارت کی زکوٰۃ (اور مواشی کی زکوٰۃ) کھیتوں اور باغات کی پیداوار کی زکوٰۃ۔ انہیں میں سے زیادہ تر زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے۔ اور ممالکِ بعیدہ سے تجارتی درآمدات و برآمدات سال میں ایک بار ہوتی ہیں (اور جانور سال میں بچے دیتے ہیں) اسی طرح کھیتیاں سال میں ایک بار پکتی ہیں۔ اور پھل ایک مرتبہ اترتے ہیں۔ اس لیے زکوٰۃ کی وصولی کے لیے یہ مدت طے کی گئی ہے۔

دوسری وجہ: سال مختلف موسموں پر مشتمل ہوتا ہے، جن میں نُماء کی امید ہوتی ہے۔ اگر ایک سیزن خالی رہے گا تو دوسرے میں تلافی ہوجائے گی۔ اس لیے یہی مدت موزون ہے۔

جنسِ مال سے زکوٰۃ لینے کی وجہ: صارفین کی سہولت اور ان کی مصلحت سے زیادہ ہم آہنگ بات یہ ہے کہ زکوٰۃ جنسِ مال سے لی جائے یعنی اونٹوں کے جھنڈ سے اونٹنی، گایوں کے گلہ سے گائے اور بکریوں کے ریوڑ سے بکری وصول کی جائے۔ رقم یا غیر جنس سے زکوٰۃ ادا کرنے میں بعض مرتبہ دشواری پیش آتی ہے۔

مویشی، زُروع، تجارت اور کنز کی تعریفات: نصوص میں مواشی، زُروع، تجارت اور کنز کی تعریفات بیان نہیں کی گئیں۔ اس لیے مثال، تقسیم اور جائزہ کے ذریعہ جامع مانع تعریفات درج ذیل ہیں۔

(۱) —— مواشی —— اکثر علاقوں میں اونٹ، گائے بھینس اور بھیڑ بکریوں کو مواشی اور اَنعام کہا جاتا ہے[۱] شریعت نے انہیں میں زکوٰۃ لازم کی ہے۔ اور گھوڑوں کے گلے بڑے نہیں ہوتے۔ عرب: نسل بڑھانے کے لیے ان کو نہیں پالتے۔ صرف بعض علاقوں میں جیسے ترکستان میں: نسل کے لیے گھوڑے پالے جاتے ہیں۔

(۲) —— زُروع —— عرف میں ایسے غلّوں اور پھلوں کو زُروع کہتے ہیں جو سال بھر باقی رہتے ہیں اور جو پیداوار اس سے کم مدت باقی رہتی ہے اس کو سبزی ترکاری کہتے ہیں۔

(۳) —— تجارت —— کوئی چیز اس نیت سے خریدی جائے کہ اس کو فروخت کر کے نفع کمایا جائے گا تجارت کہلاتی ہے۔ پس اگر کوئی چیز بخشش میں ملی ہو یا میراث میں پائی ہو (یا کھیت میں پیدا ہوئی ہو) اور اتفاقاً اس کو بیچا اور نفع کمایا، تو عرف میں اس کو تاجر نہیں کہتے۔

(۴) —— کنز یعنی خزانہ —— سونے چاندی اور کرنسی کی کافی مقدار کو کہتے ہیں، بشرطیکہ وہ عرصۂ دراز تک محفوظ رہے۔ دس بیس درہم خزانہ نہیں کہلاتے، خواہ وہ کتنی ہی مدت باقی رہیں۔ اسی طرح دیگر ساز و سامان بھی خزانہ نہیں کہلاتا، اگرچہ

---

[۱] مواشی: ماشیہ کی جمع ہے اور أنعام: نَعَم کی جمع ہے۔ اردو میں مویشی بھی مستعمل ہے ۱۲

وہ کتنا ہی زیادہ ہو۔ اسی طرح جو مال آیا گیا ہو گیا، ٹھہرا نہیں، وہ بھی خزانہ نہیں کہلاتا۔

ملحوظہ: یہ بابِ زکوٰۃ کی تمہیدی باتیں ہیں۔ جو مسلمہ اصول کے طور پر مستعمل ہیں (پس ان کو خوب ذہن نشین کرلیا جائے) اور باب زکوٰۃ میں جو امور مبہم تھے ان کی تفصیلات نبی ﷺ نے عربوں کے عرف وعادت کو پیش نظر رکھ کر بیان فرمائی ہیں (پس ان کی حکمتوں کو جاننے کے لیے عربوں کا عرف پیش نظر رکھنا ضروری ہے)

ولما كان دَوْرانُ التجارات من البلدان النائيَةِ، وحَصادُ الزروع، وجَنْىُ الثمرات: فى كل سنةٍ، وهى أعظم أنواع الزكاة، قُدِّرَ الحولُ لها؛ ولأنها تجمع فصولاً مختلفةَ الطبائع، وهى مظنة النماء، وهى مدة صالحة لمثل هذه التقديرات.

والأسهلُ والأوفقُ بالمصلحة: أن لاتُجعل الزكاة إلا من جنس تلك الأموال: فتؤخذ من كل صِرْمَةٍ من الأبل: ناقةٌ، ومن كل قطيع من البقر: بقرة، ومن كل ثُلَّةٍ من الغنم: شاةٌ، مثلاً

ثم وجب أن يُعْرَفَ كلُّ واحد من هذه بالمثال والقِسمة والاستقراء، لِيُتَّخَذَ ذلك ذريعةً إلى معرفة الحدود الجامعة المانعة:

فالماشية فى أكثر البلدان: الإبلُ، والبقَر، والغنم، ويجمعها اسم الأنعام؛ وأما الخيلُ: فلا تَكثُر صِرَمُها، ولاتناسلُ نسلاً وافرًا، إلا فى أقطار يسيرة، كتركستان.

والزروع: عبارة عن الأقوات والثمارِ الباقيةِ سنةً كاملةً، ومادون ذلك يسمى بالخَضْراوات.

والتجارةُ: عبارة عن أن يشترى شيئًا، يريد أن يَرْبَح فيه، إذ من مَلَكَ بهبةٍ أو ميراثٍ، واتفق أن باعه فربح، لايسمى تاجرًا.

والكنز: عبارة عن مقدار كثير من الذهب والفضة، محفوظٍ مدةً طويلة، ومثلُ عشرة دراهم، وعشرين درهمًا، لايسمى كنزًا وإن بقى سنين؛ وسائرُ الأمتعة لاتسمى كنزًا، وإن كثرت؛ والذى يغدو ويروح، ولايكون مستقرًا، لايسمى كنزًا.

فهذه المقدِّمات تجرى مجرى الأصول المسلمة فى باب الزكاة؛ ثم أراد النبىُّ صلى الله عليه وسلم أن يَّضْبِطَ المبهمَ منها بحدودٍ معروفة عند العرب، مستعمَلَةٍ عندهم فى كل باب.

ترجمہ: اور جب تھا تجارتوں کا گھومنا بلادِ بعیدہ سے اور کھیتیوں کا کٹنا اور پھلوں کا چننا: ہر سال میں۔ درانحالیکہ وہ زکوٰۃ کی بڑی انواع ہیں تو ان کی زکوٰۃ کے لئے ایک سال مقرر کیا گیا۔ اور اس لیے کہ سال مختلف ماہیت کے موسموں کو جمع کرتا ہے۔ اور مختلف موسم بڑھوتری کی احتمالی جگہ ہیں۔ اور ایک سال مناسب مدت ہے اس قسم کی تقدیرات کے لئے۔

اور سہل تر اور مصلحت سے زیادہ ہم آہنگ بات یہ ہے کہ نہ مقرر کی جائے زکوٰۃ مگر اموال کی جنس سے۔ پس لی جائے اونٹوں کی ہر جماعت سے: اونٹنی، اور گایوں بھینسوں کے ہر گلہ سے: گائے اور بھیڑ بکریوں کے ہر ریوڑ سے: بکری۔ مثال کے طور پر۔

پھر ضروری ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو پہچانا جائے مثال، تقسیم اور جائزہ لینے کے ذریعہ۔ تا کہ بنائی جائے وہ چیز جامع مانع تعریفات کے جاننے کا ذریعہ —— پس مواشی: اکثر علاقوں میں اونٹ، گائے بھینس اور بھیڑ بکریاں ہیں۔ اور سب کو جمع کرتا ہے لفظ اَنعام۔ اور رہے گھوڑے، پس نہیں زیادہ ہوتی ان کی جماعت (ریوڑ) اور نہیں بڑھتے وہ بہت زیادہ بڑھنا مگر بعض علاقوں میں، جیسے: ترکستان —— اور زُروع: نام ہے روزیوں کا اور پھلوں کا جو پورے سال تک باقی رہنے والے ہیں اور جو اس سے کم باقی رہتی ہیں وہ سبزی ترکاری کہلاتی ہیں —— اور تجارت: نام ہے اس کا کہ خریدے آدمی کسی چیز کو، نیت رکھتا ہو کہ نفع کمائے گا اس میں۔ کیونکہ جو شخص کسی چیز کا مالک ہوا ہو ہبہ یا میراث کے ذریعہ اور اتفاقاً اس کو بیچ دیا اور نفع پایا تو وہ تاجر نہیں کہلاتا —— اور کنز: نام ہے سونے چاندی کی بہت مقدار کا، جو محفوظ رہے مدتِ دراز تک۔ اور دس بیس درہم خزانہ نہیں کہلاتے اگرچہ وہ باقی رہیں سالوں۔ اور دیگر ساز وسامان بھی خزانہ نہیں کہلاتے، اگرچہ وہ بہت زیادہ ہوں۔ اور وہ مال جو صبح کو آیا اور شام کو گیا، اور نہیں ہوتا وہ ٹھہرنے والا: نہیں کہلاتا خزانہ۔

پس یہ تمہیدی باتیں ہیں۔ باب زکوٰۃ میں مسلّمہ بنیادی باتوں کی جگہ جاری ہیں۔ پھر چاہا نبی ﷺ نے کہ منضبط کریں ان میں سے مبہم کو ایسی حدود کے ذریعہ جو عربوں کے نزدیک معروف ہیں، جو زکوٰۃ کے ہر باب میں ان کے نزدیک مستعمل ہیں۔

باب —— ۲

انفاق کی فضیلت اور امساک کی مذمت

اب دو باتیں بیان کرنی ضروری ہیں:

اول: راہِ خدا میں خرچ کرنے کے فضائل وترغیبات، تا کہ لوگ شوق ورغبت، اور فیاضی سے خرچ کریں۔ کیونکہ زکوٰۃ کی روح فیاضی ہے۔ اور تہذیب نفس کا مقصد، جو زکوٰۃ کی پہلی اور بنیادی مصلحت ہے، وہ بھی سخاوت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

دوم: راہِ خدا میں خرچ کرنے سے ہاتھ روک لینے کی قباحتیں بیان کی جائیں۔ اور دولت سے لوگوں کا دل ہٹایا جائے۔ اس لئے کہ آخرت میں نقصان پہنچنے کی اور زکوٰۃ نہ دینے کی جڑ بنیاد: انتہائی درجہ کا بخل ہے۔ اور وہ مال کی بے حد محبت کا نتیجہ ہے۔

اور کنجوسی کا ضرر دنیا میں بھی پہنچتا ہے اور آخرت میں بھی۔ تفصیل درج ذیل ہے:

دنیا میں کنجوسی کا ضرر

حدیث شریف میں ہے کہ: ''ہر صبح دو فرشتے اترتے ہیں: ایک کہتا ہے: اے اللہ! خرچ کرنے والے کو بدل عطا فرما (دوسرا فرشتہ آمین کہتا ہے) اور دوسرا کہتا ہے: اے اللہ! خرچ نہ کرنے والے کا مال تلف فرما!'' (پہلا فرشتہ اس پر آمین کہتا ہے، پھر دونوں فرشتے آسمان پر چڑھ جاتے ہیں) (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۶۰) اس حدیث میں انفاق کی فضیلت اور امساک کی خرابی: دونوں باتیں بیان کی گئی ہیں یعنی جو راہِ خدا میں خرچ کرتا ہے اس کو دنیا میں بھی اس کا عوض ملتا ہے، اور جو جمع رکھتا ہے اس کا مال دیر سویر تلف ہو جاتا ہے۔

یہی مضمون درج ذیل حدیثوں میں بھی آیا ہے:

پہلی حدیث: ارشاد فرمایا: ''انتہائی درجہ کی بخیلی سے بچو۔ غایتِ حرص ہی نے تم سے پہلے والوں کو تباہ کیا ہے۔ اس نے ان کو ابھارا اور انھوں نے اپنوں ہی کا خون بہایا اور ناجائز چیزوں کو حلال کرلیا'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۶۵)

دوسری حدیث: ارشاد فرمایا: ''خیرات: پروردگار کے غصہ کو ٹھنڈا کرتی ہے، اور بُری موت کو ہٹاتی ہے'' یعنی دنیا میں اللہ تعالیٰ عافیت سے رکھتے ہیں اور خاتمہ بالخیر ہوتا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۰۸)

تیسری حدیث: ارشاد فرمایا: ''خیرات: خطا کو بجھاتی ہے، جس طرح پانی آگ کو بجھاتا ہے'' یعنی دنیا وآخرت میں وہ خطا کے ضرر سے محفوظ رہتا ہے (مشکوٰۃ، کتاب الایمان۔ حدیث مُعاذؓ نمبر ۲۹)

چوتھی حدیث: ارشاد فرمایا: ''جو شخص حلال کمائی سے کھجور کے بقدر بھی خیرات کرے ــــ اور اللہ تعالیٰ حلال ہی کو قبول فرماتے ہیں ــــ تو اللہ تعالیٰ اس خیرات کو اپنے دائیں ہاتھ سے قبول فرماتے ہیں ــــ اور اللہ کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں ــــ پھر اس کو خیرات کرنے والے کے لئے پالتے ہیں، جس طرح لوگ بچھڑے کو پالتے ہیں۔ تا آنکہ وہ صدقہ پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۸۸)

تشریح: ان چاروں حدیثوں میں دنیوی اور اخروی نفع وضرر کا بیان ہے:

پہلی حدیث: کا راز یہ ہے کہ ملأ اعلیٰ نظام صالح کے لئے دعائیں اور نظام طالح کے لئے بددعائیں کرتے ہیں۔ اور جو شخص معاشرہ کو یا خود کو سنوارنے کی کوشش کرتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ رحمت نازل فرماتے ہیں۔ اور جو زمین میں فساد پھیلاتا ہے اس کو پھٹکارتے ہیں۔ یہی دعائیں اور رحمتیں خرچ کرنے والے کی طرف متوجہ ہوتی ہیں اور بددعائیں اور لعنتیں کنجوسی کرنے والے کی طرف۔ پس فیاض آدمی پنپتا ہے، اور فیاض معاشرہ رونق پکڑتا ہے۔ اور حریص آدمی خود بھی تباہ ہوتا ہے اور معاشرہ کو بھی لے ڈوبتا ہے اور آخرت کا نفع وضرر تو سامنے ہے۔

اور دوسری اور تیسری حدیثوں کا راز یہ ہے کہ یہی دعائیں اور رحمتیں خطاؤں کی معافی کا سبب بنتی ہیں۔ اور اللہ کی ناراضگی خوشی سے بدل جاتی ہے۔ اور خطا کار خرچ نہیں کرتا تو ناراضگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور ایک دن وہ تباہ ہو جاتا ہے۔

اور چوتھی حدیث میں جو فرمایا گیا ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ اس خیرات کو قبول فرماتے ہیں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ خیرات کی صورت، مثلاً کھجور خیرات کی ہے تو اس کی صورت: عالم مثال میں خیرات کرنے والے کی طرف منسوب ہو کر پائی جاتی ہے یعنی کہا جاتا ہے کہ یہ کھجور فلاں شخص کی خیرات ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ یہ فلاں کا صاحب زادہ ہے اور وہاں عالم مثال میں ملأ اعلیٰ کی دعاؤں سے اور بندے پر رحمتِ خداوندی سے، اس خیرات کی ظاہری صورت تکمیل پذیر ہوتی ہے۔ اور وہ کھجور پہاڑ کے برابر ہو جاتی ہے۔ اور نسبت کی وجہ سے دنیا میں بھی خیرات کرنے والا برکتوں سے مالا مال ہوتا ہے۔ جیسے نسبت کی وجہ سے صاحب زادہ کا احترام کیا جاتا ہے۔ یہ دنیا میں اس خیرات کا سودمند ہونا ہے۔

آخرت میں کنجوسی کا ضرر

درج ذیل تین حدیثوں میں آخرت میں کنجوسی کا ضرر بیان کیا گیا ہے:

پہلی حدیث: ارشاد فرمایا: ''جو بھی سونا یا چاندی رکھتا ہے، اگر وہ اس کا حق ادا نہیں کرتا، تو جب قیامت کا دن آئے گا، اس کے لئے اس سونے چاندی سے آگ کی تختیاں بنائی جائیں گی۔ پھر ان سے اس کے پہلو، پیشانی اور پیٹھ کو داغا جائے گا، جب بھی وہ ٹھنڈی پڑیں گی، دوبارہ تپائی جائیں گی۔ یہی عذاب اس کو قیامت کے پورے دن میں ہوتا رہے گا، جو پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔ یہاں تک کہ بندوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا۔ پس وہ اپنی راہ لے گا: جنت کی طرف یا جہنم کی طرف'' (مشکوۃ حدیث ۱۷۷۳) اس سزا کا تذکرہ سورۃ التوبہ آیات ۳۴ و ۳۵ میں بھی آیا ہے۔ حدیث شریف میں اسی کی وضاحت ہے۔

دوسری حدیث: ارشاد فرمایا: ''جس آدمی کو اللہ تعالیٰ نے دولت عطا فرمائی ہو، پھر اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی ہو، تو وہ دولت قیامت کے دن اُس آدمی کے سامنے ایسے زہریلے ناگ کی شکل میں آئے گی، جس کے انتہائی زہریلے پن کی وجہ سے سر کے بال جھڑ گئے ہوں گے، اور اس کی آنکھوں کے اوپر دو سفید نقطے ہوں گے (ایسا سانپ انتہائی زہریلا ہوتا ہے) پھر وہ سانپ اس کے گلے کا ہار بنا دیا جائے گا۔ اور وہ اس کی دونوں باچھیں پکڑے گا، اور کہے گا: میں تیری دولت ہوں! میں تیرا خزانہ ہوں'' (مشکوۃ حدیث ۱۷۷۴) اس سزا کا تذکرہ بھی سورہ آلِ عمران آیت ۱۸۰ میں آیا ہے۔

تیسری حدیث: جب رسول اللہ ﷺ نے پہلی حدیث میں سونے چاندی کی زکوٰۃ ادا نہ کرنے کا وبال بیان فرمایا، تو دریافت کیا گیا کہ اگر کسی کے پاس اونٹ، گائیں بھینسیں اور بھیڑ بکریاں ہوں، اور ان کی زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہو تو کیا سزا ہوگی؟ آپ ﷺ نے ان کی سزا بھی ویسی ہی بیان فرمائی جیسی سونے چاندی کی بیان فرمائی تھی۔ مثلاً: مویشی

کے مالک کو ہموار میدان میں منہ کے بل لٹایا جائے گا۔ اور اونٹ حاضر کئے جائیں گے، جو گنتی میں پورے ہوں گے، مُٹاپے میں بھی کوئی کمی نہ ہوگی، اور بچہ تک غائب نہ ہوگا۔ وہ اپنے مالک پر چلیں گے اور اس کو کاٹیں گے۔

تشریح: اموال اور مواشی کی زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی اس طرح سزا کے دو سبب ہیں۔ ایک: اصلی سبب ہے۔ دوسرا: معاون سبب ہے۔ اصلی سبب تو خود مالدار کے احساسات وادراکات ہیں۔ اور معاون سبب ملأ اعلی میں طے پائے ہوئے امور ہیں۔ تفصیل درج ذیل ہے:

اصلی سبب: جس طرح یہ چار باتیں ہیں: (۱) ایک صورتِ ذہنیہ دوسری صورتِ ذہنیہ کو کھینچتی ہے یعنی خیال سے خیال ابھرتا ہے (۲) اور ایسے دو امر جو متضایفین ہوتے ہیں یعنی ایک کا سمجھنا دوسرے پر موقوف ہوتا ہے، جیسے ابوّت (باپ ہونا) اور بنوّت (بیٹا ہونا) جب ان میں سے ایک کا خیال آتا ہے، تو دوسرا بھی ذہن میں ضرور آتا ہے۔ (۳) اور جب شہوت کا وفور ہوتا ہے۔ اور دل ودماغ میں اس کے اَبخرے ہیجانی کیفیت پیدا کرتے ہیں، تو خواب میں عورتوں کی صورتوں کو دیکھنے کی نفس میں خواہش پیدا ہوتی ہے (۴) اور جب قلب انوارِ الٰہی سے خالی ہوتا ہے، اور ظلمانی تصورات سے لبریز ہوتا ہے، تو ڈراؤنی صورتیں مثلاً ہاتھی کی صورت دماغ میں آتی ہے۔

اسی طرح انسانی حواس اپنی فطرت سے چاہتے ہیں —— جب نفس پر مثالی قوت کا فیضان ہوتا ہے یعنی آدمی آخرت میں پہنچتا ہے —— کہ اس کی کنجوسی اس کے تصورات وادراکات میں واضح اور کامل طور پر متمثّل ہو۔ پھر یہی احساس اُس مال کے تمثّل کا باعث بنتا ہے جس میں اس نے کنجوسی کی ہے۔ اور تندہی سے اس کی حفاظت کی ہے۔ اور وہ اس کے افکار پر سوار رہا ہے۔ یہ اموال واضح اور کامل طور پر اس کے سامنے نمودار ہوتے ہیں۔ اور قانونِ خداوندی کے موافق مالدار اپنے مال سے تکلیف اٹھاتا ہے یعنی سونے چاندی سے داغا جاتا ہے یا سانپ کا ہار پہنایا جاتا ہے۔ اور اونٹ روندتے اور کاٹتے ہیں۔ قانونِ خداوندی میں اسی طرح سزا طے کی گئی ہے۔ اور گایوں اور بکریوں کی سزا کو بھی اسی انداز پر سمجھ لیں۔

اور معاون سبب: یہ ہے کہ ملأ اعلی زکوٰۃ کے وجوب کو جانتے ہیں، بلکہ وہ وجوب ملأ اعلیٰ ہی میں طے پایا ہے۔ اور وہاں یہ بات بھی طے پائی ہے کہ جو لوگ زکوٰۃ ادا نہیں کریں گے ان کو انہی اموال سے سزا دی جائے گی۔ ملأ اعلیٰ میں طے شدہ یہی امور قیامت کے دن سزا کی مذکورہ صورتوں کے فیضان کا سبب بنتے ہیں۔

سانپ کی سزا اور تختیوں کی سزا میں فرق: قرآن کریم میں اور مذکورہ روایات میں اموال یعنی سونے چاندی کی زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی دو سزائیں بیان کی گئی ہیں: ایک: مال کا سانپ بن کر گلے کا ہار بننا۔ دوسری: اس مال کی تختیاں بنا کر اس سے مالدار کے خاص اعضاء کو داغنا۔ یہ دو مختلف سزائیں: دو الگ الگ صورتوں میں دی جائیں گی۔ سانپ کا ہار اس صورت میں پہنایا جائے گا جبکہ آدمی پر اجمالی طور پر مال کی محبت غالب آئی ہوگی یعنی وہ زندگی بھر مال کی دُہائی دیتا رہا ہوگا۔ اس صورت میں مال کی وہ محبت شئ واحد (سانپ) کی صورت میں متمثّل ہوگی۔ اور مال کی محبت جس نے اس کے

نفس کو گھیر رکھا تھا، ہار پہنانے کی صورت میں نمودار ہوگی۔ اور آخرت میں نفس کا اُن اموال سے اذیت پانا نہایت زہریلے سانپ کے ڈسنے کی صورت میں جلوہ گر ہوگا۔

اور تختیوں کی سزا اس صورت میں دی جائے گی، جبکہ متعین دراہم ودنانیر کی محبت اس پر غالب آئی ہوگی۔ مال کو سینت کر رکھا ہوگا۔ بار بار اس کو دیکھتا ہوگا روپیوں کی گڈیاں گنتا ہوگا اور خوش ہوتا ہوگا اور ہمہ وقت دل ودماغ مال کی صورتوں سے بھرے رہتے ہوں گے۔ اس صورت میں وہ مال تختیوں کی صورت میں کامل ومکمل اور تکلیف دہ ہوکر نمودار ہوگا یعنی اس کی دولت کا ایک پیسہ بھی غائب نہ ہوگا اور اس کی گرم دہکتی تختیاں بنا کر اس کے اعضاء کو داغا جائے گا۔ پناہ بخدا!

﴿فضلُ الإنفاق وكراهية الإمساك﴾

ثم مسَّتِ الحاجةُ:

[۱] إلى بيان فضائل الإنفاق، والترغيبِ فيه: ليكون برغبة، وسخاوةِ نفسٍ، وهى روح الزكاة، وبها قِوامُ المصلحةِ الراجعةِ إلى تهذيب النفس.

[۲] وإلى بيانِ مَساوى الإمساك، والتزهيدِ فيه: إذ الشحُّ هو مبدأُ تضررٍ، مانعُ الزكاةِ، وذلك:

[الف] إما فى الدنيا، وهو قولُ الملَكِ:" اللهم أَعْطِ منفِقا خَلَفًا" والآخَرِ:" اللهم أعط ممسكًا تلفًا" قوله صلى الله عليه وسلم:" اتقوا الشحَّ، فإن الشحَّ أهلك من قبلكم" الحديثَ، وقوله: صلى الله عليه وسلم:" إن الصدقةَ لَتُطْفِئُ غضبَ الرب" وقوله صلى الله عليه وسلم:" إن الصدقة تُطْفِئُ الخطيئة كما يُطْفِئُ الماءُ النارَ" وقوله صلى الله عليه وسلم:" فإن الله يَتقَبَّلُها بيمينه، ثم يُرَبِّيْها لصاحبها" الحديثَ.

أقول: سِرُّ ذلك كلِّه: أن دعوةَ الملأ الأعلى فى إصلاح حالِ بنى آدم، والرحمةَ بمن يسعى فى إصلاح المدينة، أو فى تهذيب نفسِه، تنصرفُ إلى هذا المُنْفِقِ، فتورثُ تلقِّيَ علومٍ للملأ السافل وبنى آدم: أن يُحسنوا إليه، ويكون سببًا لمغفرة خطاياه، ومعنى" يتقبلها" أن تتمثَّل صورةُ العمل فى المثال منسوبةً إلى صاحبها، فَتَنْسَبِغُ هنالك بدعوات الملأ الأعلى ورحمة الله به.

[ب] أو فى الآخرة، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" ما من صاحبِ ذهبٍ، ولافضةٍ، لايؤدى منها حقَّها، إلا إذا كان يومُ القيامة صُفِّحَتْ له صفائحُ" وقوله صلى الله عليه وسلم:" مُثِّلَ له مالُه يومَ القيامة شجاعًا أقرعَ" وقوله صلى الله عليه وسلم فى الإبل، والبقر، والغنم:

قريبًا من ذلك.

أقول: السبب الباعث على كون جزاءِ مانِع الزكاة على هذه الصفة شيئان: أحدهما أصل، والثانى كالموكِّد له؛ وذلك: كما أن الصورةَ الذهنية تجلب صورةً أخرى، كسلسلة أحاديث النفس الجالبِ بعضُها بعضًا؛ وكما أن حضورَ صورةِ متضايِفٍ فى الذهن يستدعى حضورَ صورةِ متضايفٍ آخر، كالبنوة والأبوَّة؛ وكما أن امتلاء أوعية المنى به، وثورانَ بخاره فى القُوى الفكرية، يَهُزُّ النفسَ لمشاهدة صور النساء فى الحُلْم؛ وكما أن امتلاء الأوعية ببخار ظلمانى، يُهَيِّجُ فى النفس صورَ الأشياء المؤذية الهائلة، كالفيل، مثلاً: ؛ فكذلك المدارِكُ تقتضى بطبيعتها إذا أُفيضت قوةٌ مثالية على النفس: أن يتمثل بخلُها بالأموال ظاهرًا سابغًا، وأن يجلب ذلك تمثُّلَ ما بخل به، وتعانىٰ فى حفظه، وامتلأت قواه الفكريةُ به أيضًا ظاهرًا سابغًا، يتألم منه حَسَبَما جرت سنة الله أن يتألم منها بذلك؛ فمن الذهب والفضة الكيُّ، ومن الإبل الوطءُ والعَضُّ، وعلى هذا القياس.

ولما كان الملأ الأعلى علموا ذلك، وانعقد فيهم وجوبُ الزكاة عليهم، وتمثَّلَ عندهم تأذِّى النفوس البشرية بها، كان ذلك مُعِدًّا لفيضان هذه الصورة فى موطن الحشر.

والفرق بين تمثله شجاعًا، وتمثله صفائحَ: أن الأول فيما يغلب عليه حُبُّ المال إجمالاً، فتتمثل فى نفسه صورةُ المال شيئًا واحدًا، وتتمثل إحاطتُها بالنفس تطوُّقًا، وتأذِّى النفسِ بها بِلَسْع الحية البالغة فى السَّمِّ أقصى الغايات؛ والثانى فيما يغلب عليه حب الدراهم والدنانير بأعيانها، ويتعانى فى حفظها، وتمتلئ قواه الفكرية بصورها، فتتمثلُ تلك الصور كاملةً تامةً مُؤْلِمَةً.

ترجمہ: **خرچ کرنے کی فضیلت اور خرچ نہ کرنے کی مذمت:** پھر حاجت پیش آئی: (۱) خرچ کرنے کے فضائل بیان کرنے کی اور اس کی ترغیب دینے کی۔ تاکہ خرچ کرنا رغبت اور سخاوتِ نفس (فیاضی) سے ہو۔ اور سخاوت ہی زکوٰۃ کی روح ہے۔ اور اسی کے ذریعہ اس مصلحت کا قوام ہے جو نفس کی تہذیب کی طرف لوٹنے والی ہے (۲) اور خرچ نہ کرنے کی برائی بیان کرنے کی۔ اور مال میں بے رغبت کرنے کی۔ کیونکہ انتہائی حرص ہی نقصان پہنچنے کا مبدا ہے، زکوٰۃ کے لئے مانع ہے اور وہ نقصان پہنچنا: (الف) یا تو دنیا میں ہے۔ اور وہ فرشتہ کا قول ہے: ''اے اللہ! خرچ کرنے والے کو عوض دے!'' اور دوسرے فرشتہ کا قول ہے: ''اے اللہ! خرچ نہ کرنے والے کا مال ہلاک فرما!''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''بچو تم انتہائی حرص سے۔ پس بیشک حرص نے ہلاک کیا تم سے پہلے والوں کو'' آخر حدیث

تک۔اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ’’بیشک صدقہ البتہ ٹھنڈا کرتا ہے پروردگار کے غصہ کو‘ اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ’’بیشک صدقہ بجھاتا ہے غلطی کو جس طرح پانی بجھاتا ہے آگ کو‘ اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ’’پس بیشک اللہ تعالیٰ خیرات کو قبول کرتے ہیں اپنے دائیں ہاتھ سے۔ پھر پرورش کرتے ہیں اس کی اس کے مالک کے لئے‘‘ آخر حدیث تک۔

میں کہتا ہوں: اِن سب (روایات) کا راز یہ ہے کہ انسانوں کی حالت کی اصلاح کے لئے ملأ اعلی کی دعا، اور اس شخص پر اللہ کی مہربانی جو کوشش کرتا ہے معاشرہ کی اصلاح میں یا اپنے نفس کو سنوارنے میں: اس خرچ کرنے والے کی طرف پھرتی ہے (کیونکہ خرچ کرنے سے مملکت کی بھی اصلاح ہوتی ہے اور نفس کی بھی) پس پیدا کرتی ہے وہ دعوت ورحمت علوم کے حاصل کرنے کو ملأ سافل اور انسانوں کے لیے کہ وہ اس خرچ کرنے والے کے ساتھ اچھا معاملہ کریں۔ (یہ پہلی حدیث کا راز ہے) اور وہ خرچ کرنا سبب بنتا ہے اس کی خطاؤں کی بخشش کا (یہ دوسری اور تیسری حدیث کا راز ہے) اور ’’اللہ تعالیٰ خیرات کو قبول کرتے ہیں‘‘ کا مطلب یہ ہے کہ عالم مثال میں عمل کی صورت متمثل ہوتی ہے (یعنی خیرات کا صرف ثواب متحقق نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی صورت بھی وہاں پائی جاتی ہے) درانحالیکہ وہ منسوب ہونے والی ہوتی ہے خیرات کرنے والے کی طرف (پس اس نسبت کی وجہ سے خیرات کرنے والے کو دنیا میں بھی برکات پہنچتی ہیں) پس کامل ہوتی ہے خیرات وہاں یعنی عالم مثال میں ملأ اعلی کی دعاؤں اور بندے پر اللہ کی مہربانی سے۔

(ب) یا وہ نقصان پہنچنا آخرت میں ہے۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ’’نہیں ہے کوئی سونے والا اور نہ کوئی چاندی والا، نہیں ادا کرتا اس میں سے اس مال کا حق مگر جب ہوگا قیامت کا دن تو بنائی جائیں گی اس کے لیے تختیاں‘‘ اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ’’مصوّر کیا جائے گا اس کے لیے اس کا مال قیامت کے دن گنجے سانپ کی صورت میں‘‘ اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد اونٹوں، گایوں اور بکریوں کے بارے میں اس کے قریب۔

میں کہتا ہوں: وہ سبب جو باعث ہونے والا ہے زکوٰۃ نہ دینے کی سزا کے اس صفت پر (ظاہر) ہونے کا: دو چیزیں ہیں: ان میں سے ایک: اصل سبب ہے اور دوسرا اس اصل سبب کے لیے تاکید کرنے والا سبب ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ: (۱) جس طرح یہ بات ہے کہ ایک صورتِ ذہنیہ کھینچتی ہے دوسری صورت کو۔ جیسے خیالات کا سلسلہ، جن کا بعض بعض کو کھینچنے والا ہے (۲) اور جس طرح یہ بات ہے کہ صورتِ تضایفیہ کا ذہن میں حاضر ہونا چاہتا ہے دوسرے متضایف کی صورت کے حاضر ہونے کو، جیسے بیٹا ہونا اور باپ ہونا (۳) اور جس طرح یہ بات ہے کہ منی کے برتنوں کا منی سے بھر جانا، اور اس کی بھاپ کا قوی فکریہ میں ہیجان پیدا کرنا، خواب میں عورتوں کی صورتوں کے مشاہدہ کرنے کے لئے نفس کو ہلاتا ہے (۴) اور جس طرح یہ بات ہے کہ ظلمانی بھاپ سے برتنوں کا بھر جانا: نفس میں اذیت رساں خوفناک چیزوں کی صورتوں کو جیسے ہاتھی کی صورت کو برانگیختہ کرتا ہے — پس اسی طرح ادراک کرنے والی صلاحیتیں چاہتی ہیں اپنی فطرت سے — جب بہائی جاتی ہے نفس پر مثالی قوت — کہ متمثل ہوا موال کے سلسلہ میں نفس کی بخیلی واضح اور کامل طور پر۔

(یہ پہلی چیز ہے) اور یہ کہ کھینچے وہ اس چیز کے تمثّل کو جس میں اس نے بخیلی کی ہے اور اس کی حفاظت میں مشقت اٹھائی ہے اور اس کے قوی فکر یہ اس چیز سے بھر گئے ہیں: واضح کامل طور پر۔ رنجیدہ ہو وہ اس سے جیسا کہ سنتِ الٰہی جاری ہے کہ رنجیدہ ہو اُن اموال سے اُس طرح (یعنی یہ طریقۂ عذاب اللہ کا تجویز کردہ ہے) پس سونے اور چاندی سے داغنا ہے، اور اونٹوں سے روندنا اور کاٹنا ہے۔ اور اسی انداز پر۔

اور جب ملأ اعلیٰ اس بات کو جانتے ہیں۔ اور منعقد ہوا ہے ان میں لوگوں پر زکوٰۃ کا وجوب۔ اور پایا گیا ہے ان کے پاس نفوسِ بشریہ کا تکلیف اٹھانا ان اموال سے تو یہ بات تیار کرنے والی ہوتی ہے حشر کی کسی جگہ میں اس صورت کے فیضان کو۔

اور مال کے سانپ کی صورت میں متمثّل ہونے اور تختیوں کی صورت میں متمثّل ہونے کے درمیان فرق یہ ہے کہ اول اس صورت میں ہے کہ آدمی پر مال کی محبت غالب آئی ہوا جمالی صورت میں۔ پس متمثّل ہوئی اس کے نفس میں مال کی صورت شئ واحد کی طرح۔ اور اس محبت کا نفس کو گھیرنا ہار پہنانے کی صورت میں اور نفس کا اُن اموال سے اذیت پانا ایسے سانپ کے ڈسنے کی صورت میں نمودار ہوا جو زہر میں آخری حد کو پہنچنے والا ہے اور دوم: اس صورت میں ہے کہ آدمی پر متعین طور پر دراہم و دنانیر کی محبت غالب آئی ہو۔ اور اس نے ان کی حفاظت میں مشقت اٹھائی ہو۔ اور اس کے قوی فکر یہ ان کی صورتوں سے بھر گئے ہوں پس وہ صورتیں کامل، تام، تکلیف دہ صورتوں میں متمثّل ہونگی۔

لغات: قِوام: وہ چیز ہے جس کے ذریعہ کوئی چیز وجود پذیر ہو...... مَسَاوِیٌ جمع ہے مَسَــاءَ ۃ کی بمعنی برائیاں، عیوب، نقائص...... زَهَّدَه في الشيئ وعنه: بے رغبت کرنا...... تَضَرُّر: نقصان پہنچنا...... مانِعُ الزکوۃ: خبر بعد خبر ہے...... اِنْسَبَغَ: کامل ہونا، پورا ہونا...... صَفَّحَ الشيئَ: لمبا چوڑا کرنا اور صفائح جمع ہے صفیحۃ کی بمعنی چوڑی چیز...... أقرع: گنجا قرع (س) الرجلُ: گنجا ہونا۔

☆ ☆ ☆

سخی اور بخیل میں موازنہ اور سخی کے رجحان کی وجہ

حدیث ــــــ میں ہے کہ: ”سخی اللہ سے نزدیک، جنت سے نزدیک، لوگوں سے نزدیک، جہنم سے دور ہے۔ اور بخیل اللہ سے دور، جنت سے دور، لوگوں سے دور، جہنم سے نزدیک ہے۔ اور جاہل سخی یقیناً اللہ تعالیٰ کو زیادہ پیارا ہے عابد بخیل سے“ (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۶۹)

تشریح: اس حدیث میں چار طرح سے سخی اور بخیل کے درمیان موازنہ کیا گیا ہے۔ اور اس کا لازمی نتیجہ جنت سے نزدیک ہونا اور دور ہونا بیان کیا گیا ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے:

① ــــ سخی اللہ سے نزدیک اور بخیل دور ہے ــــ ہر عبادت، خواہ بدنی ہو یا مالی، اس کا بنیادی مقصد معرفتِ

الٰہی کی کوشش اور کشف حجاب کی محنت ہے۔ پس جو بندہ اللہ کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتا ہے، وہ اللہ کو پہچاننے کی اور ان سے پردہ ہٹانے کی تیاری میں لگا ہوا ہے۔ اور جوئندہ یابندہ۔ وہ ضرور وصل کی دولت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اور بخیل کو اس کی پڑی ہی نہیں۔ اور مانگے بغیر ماں بھی نہیں دیتی۔ پھر اس کو وصل کی دولت کہاں نصیب ہوگی؟

۲ ـــــ سخی جنت سے نزدیک اور بخیل دور ہے ـــــ سخی جنت کی تیاری میں لگا ہوا ہے، اور بخیل اس سے غافل ہے۔ اور جنت کی تیاری یہ ہے کہ انسان اپنے اندر ملکوتی صفات پیدا کرے۔ اور بہیمی رذائل کا قلع قمع کرے۔ نفس میں سے نکمی ہیئات کو دور کرے تاکہ بہیمیت پر ملکیت کا رنگ چڑھے۔ اور انسان جنت والے اعمال کرے۔ سخی یہ محنت کر رہا ہے اس لئے وہ جنت میں پہنچ کر دَم لے گا۔ اور بخیل اس محنت سے دور ہے، اس لیے وہ جنت سے دور ہوگا۔

۳ ـــــ سخی لوگوں سے نزدیک اور بخیل دور ہے ـــــ لوگ سخی سے محبت کرتے ہیں اور بخیل سے نفرت۔ اور سخی سے لوگ مناقشہ بھی نہیں کرتے، اور بخیل کو کوئی نہیں بخشتا! سخی کی کوتاہیاں لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں اور بخیل کی خُردہ گیری کرتے ہیں۔ اور موت کے بعد لوگ سخی کو روتے ہیں اور بخیل پر لعنت بھیجتے ہیں۔

اور لوگ سخی سے منازعت اس لئے نہیں کرتے اور بخیل سے اس لیے الجھتے ہیں کہ جھگڑوں کی جڑ خودغرضی اور انتہائی درجہ کا حرص ہے۔ سخی اس سے پاک ہے۔ وہ عالی ظرف اور دریا دل ہوتا ہے اور دوسروں کا بھلا چاہتا ہے۔ اس لئے اس سے مناقشہ کی نوبت نہیں آتی۔ اور بخیل کا معاملہ برعکس ہے۔ وہ اپنا ہی بھلا چاہتا ہے، اس لیے ہر کوئی اس سے تکرار کرتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ خودغرضی اور انتہائی حرص سے بچو اسی نے گذشتہ امتوں کو تباہ کیا ہے۔ کیونکہ جب معاشرہ میں یہ رذیلہ پیدا ہوتا ہے تو لوگ ناحق خون کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ نہ جائز ناجائز میں امتیاز کرتے ہیں۔

۴ ـــــ جاہل سخی: عابد بخیل سے اللہ کو زیادہ پیارا ہے ـــــ یہاں جاہل سے مراد وہ شخص ہے جو بدنی عبادت نافلہ کے فوائد سے آشنا نہیں۔ اس لئے وہ اس میں سے حصہ کم لیتا ہے۔ البتہ وہ مالی عبادت نافلہ کے فوائد سے واقف ہے، اس لئے وہ خیرات کا خوگر ہے۔ اور عابد سے مراد بدنی عبادات نافلہ میں دلچسپی رکھنے والا شخص ہے، کیونکہ اس میں کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ اور وہ انفاق کے فضائل سے واقف نہیں ہوتا، اس لیے مال خرچ کرنا اس پر شاق ہوتا ہے۔ اور جب فطرت میں فیاضی ہوتی ہے تو آدمی جو بھی عبادت کرتا ہے: دل کے داعیہ سے کرتا ہے، اس لیے وہ اتم واکمل ہوتی ہے۔ اور جو دُوں ہمت ہوتا ہے: وہ جو بھی کام کرتا ہے، طبیعت پر جبر کر کے کرتا ہے، اس لیے وہ کچھ زیادہ سودمند نہیں ہوتا۔

غرض مذکورہ دو شخصوں میں سے ہر ایک کے اندر ایک خوبی ہے اور ایک کمی۔ حدیث شریف میں دونوں کے مجموعہ کا لحاظ کر کے موازنہ کیا گیا تو جاہل سخی کا پلہ عابد بخیل سے بھاری رہا۔ اس لئے وہ اللہ کو زیادہ پسند ہے۔ اور جاہل سخی کا پلہ بھاری اس لئے رہا کہ وہ خیر لازم میں اگرچہ کوتاہی کرتا ہے مگر خیر متعدی میں کوشاں ہے۔ اور عابد بخیل کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اور اللہ پاک کو خیر لازم سے خیر متعدی زیادہ پسند ہے۔

[۱] قولـه صـلى الله عليه وسلم:" السخي قريب من الله، قريب من الجنة، قريب من الناس، بـعيـد من النار؛ والبخيل بعيد من الله، بعيد من الجنة، بعيد من الناس، قريب من النار؛ ولَجاهلٌ سخي أحب إلى الله من عابد بخيل"

أقول: قُربُه من الله تعالى: كونُه مستعدًا لمعرفته، وكشفِ الحجابِ عنه؛ وقربُه من الجنة: أن يكـون مستعـدًّا بـطرح الهيئات الخسيسة التي تنافي الملكية، لِتَلَوَّن البهيميةُ الحاملةُ لها بـلـون الـمـلكية؛ وقربُه من الناس: أن يحبوه، ولايناقشوه، لأن أصل المناقشة هو الشح، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" إن الشح أهلك من كان قبلكم، حَمَلَهم على أن يسفكوا دماء هم، ويستحلوا محارمهم"

وإنـما كان الجاهل السخي أحبَّ من العابد البخيل: لأن الطبيعة إذا سَمُحَتْ بشئ كان أتمَّ وأوفر ممايكون بالقسر.

ترجمہ: (۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: .... میں کہتا ہوں: سخی کی اللہ تعالیٰ سے نزدیکی: اس کا تیاری کرنے والا ہونا ہے اللہ کی معرفت کے لئے اور اللہ سے پردہ کھولنے کے لیے (عطف تفسیری ہے) —— اور اس کی جنت سے نزدیکی: یہ ہے کہ وہ تیاری کرنے والا ہو نکمی ہیئات کو پھینکنے کے لئے، جو کہ ملکیت کے منافی ہیں، تا کہ وہ بہیمیت جوان نکمی کیفیات کی حامل ہے: وہ ملکیت کے رنگ سے رنگین ہو جائے —— اور اس کی لوگوں سے نزدیکی یہ ہے کہ لوگ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اور اس سے جھگڑا نہیں کرتے۔ کیونکہ جھگڑے کی جڑ: انتہائی درجہ کی حرص ہے۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: "بیشک انتہائی حرص ہی نے ان لوگوں کو تباہ کیا جو تم سے پہلے ہوئے۔ خود غرضی نے ان کو اس بات پر ابھارا کہ انھوں نے اپنوں ہی کا خون بہایا۔ اور ناجائز چیزوں کو حلال کرلیا (اس کا حوالہ پہلے گذر چکا ہے) —— اور جاہل سخی: عابد بخیل سے زیادہ پیارا اس لئے ہے کہ طبیعت جب کسی چیز کے بارے میں فیاض ہوتی ہے تو وہ چیز اتم اور اکمل ہوتی ہے اس چیز کی بہ نسبت جو جبر سے ہوتی ہے۔

☆ ☆ ☆

سخی کا سینہ خرچ کے لیے کھلتا ہے اور بخیل کا دل بھچتا ہے

حدیث —— میں ہے کہ: "بخیل کا اور خیرات کرنے والے کا حال اُن دو شخصوں جیسا ہے، جنھوں نے لوہے کی زِرہیں پہن رکھی ہوں۔ اور ان کے دونوں ہاتھ ان کی چھاتیوں اور چنبروں (ہنسلی کی ہڈیوں) سے چمٹے ہوئے ہوں۔

پس جب بھی خیرات کرنے والا کوئی خیرات کرنا چاہتا ہے تو وہ زِرہ کشادہ ہوتی ہے اور بخیل جب بھی خیرات کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ زِرہ مل جاتی ہے۔ اور اس کے حلقے اپنی جگہ پر بھنچ جاتے ہیں" (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۶۴)

تشریح: اس تمثیل میں انفاق اور امساک کی حقیقت اور ان کے جوہر کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب کسی انسان کے دل میں اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ تقاضا اس کا احاطہ کر لیتا ہے۔ اور آدمی وہ کام کرنا چاہتا ہے۔ تو اگر وہ فیاض طبیعت سخی دل ہوتا ہے تو اس کو روحانی انشراح حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ مال پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اور مال اس کو حقیر و ذلیل نظر آنے لگتا ہے۔ اور اس کو اپنی ذات سے جدا کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ شخص انتہائی حریص ہوتا ہے تو اس کا دل مال کی محبت میں ڈوب جاتا ہے۔ اور مال کی رعنائی اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے۔ اور وہ اس کے دل پر قبضہ جما لیتی ہے۔ پس مال کی دل فریبی سے اس کا دل ہٹ نہیں سکتا۔ اور وہ مال خرچ کرنے سے رُک جاتا ہے۔ اور سارا مدار انہی خصال پر ہے۔ فیاض آدمی کا نفس خسیس ہیئات سے سخت جھگڑا کرتا ہے۔ اور حریص کا نفس اُن ہیئتوں کے ساتھ گُتھ جاتا ہے ——— اس تحقیق سے درج ذیل دو حدیثوں کا مطلب بھی جانا جا سکتا ہے:

حدیث ——— میں ہے کہ: "مکار، بخیل اور احسان جتلانے والے جنت میں نہیں جائیں گے" (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۷۳) کیونکہ یہ خصالِ بد: نفس کو نکمی ہیئتوں سے پاک ہی نہیں ہونے دیتیں۔

اور حدیث ——— میں ہے کہ: "خود غرضی اور ایمان کسی بندے کے دل میں کبھی اکٹھا نہیں ہوتے" (نسائی ۶: ۱۳ فضل من عمل فی سبیل اللہ علی قدمہ) کیونکہ یہ دونوں متضاد کیفیات ہیں اور ضدین کا اجتماع ناممکن ہے۔

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم:" مثلُ البخيل والمتصدِّق كمثل رجلين، عليهما جُنَّتَان" الحديث.

أقول: فيه إشارةٌ إلى حقيقة الإنفاق والإمساك، وروحِهما؛ وذلك: أن الإنسان إذا أحاطت به مقتضياتُ الإنفاق، وأراد أن يفعله، يحصل له ـــ إن كان سخيَّ النفس، سَمِحَهَا ـــ انشراحٌ روحانـي، وصـولةٌ على المال، ويتمثّل المال بين يديه حقيرًا ذليلاً، يكون نفضُه عنه هَيِّنًا، وإن كـان شـحيـحًـا غَاصَتْ نفسُه فى حب المال، وتمثل بين عينيه حُسنُه، وملك قلبَه، فلم يستطع منه محيصًا؛ وتلك الخصلةُ هى العمدة فى لَجَاج النفس بالهيئات الدنية، واشتباكها بها.

ومـن هـذا التـحـقيـق يـنبغي أن تَعلم معنى قوله صلى الله عليه وسلم:" لايدخل الجنةَ خِبٌّ، ولابخيل، ولا مَنَّان" وقوله صلى الله عليه وسلم:" لايجتمع الشح والإيمان فى قلب عبدٍ أبدًا"

ترجمہ: (۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: "بخیل کا اور خیرات کرنے والے کا حال ان دو شخصوں کے حال جیسا ہے۔

جنہوں نے دو زرہیں پہن رکھی ہوں'' آخر تک۔ میں کہتا ہوں: اس مثال میں اشارہ ہے انفاق اور امساک کی حقیقت اور دونوں کے جوہر کی طرف۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب کسی انسان کا احاطہ کر لیتے ہیں انفاق کے تقاضے۔ اور چاہتا ہے وہ کہ خرچ کرے، تو حاصل ہوتی ہے اس کو ـــــ اگر وہ فیاض طبیعت سخی دل ہوتا ہے ـــــ ایک روحانی انبساط اور مال پر حملہ۔ اور متمثّل ہوتا ہے مال اس کے سامنے حقیر وذلیل ہوکر، اپنے سے اس کا جھاڑنا آسان ہوتا ہے۔ اور اگر وہ انتہائی حریص ہوتا ہے تو اس کا نفس مال کی محبت میں ڈوبتا ہے۔ اور متمثّل ہوتی ہے مال کی رعنائی اس کی نگاہوں کے سامنے اور مالک ہوجاتی ہے اس کے دل کی۔ پس نہیں طاقت رکھتا وہ اس سے ہٹنے کی۔ اور اسی خصلت پر مدار ہے نفس کے سخت جھگڑا کرنے کا کمینی ہیئتوں کے ساتھ۔ اور نفس کے گڈمڈ ہونے کا ان ہیئتوں کے ساتھ۔

اور اس تحقیق سے مناسب ہے کہ آپ جانیں آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے معنی: ''نہیں جائے گا جنت میں مکار اور بخیل اور نہ احسان جتلانے والا'' اور آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے معنی: ''نہیں اکٹھا ہوتی خود غرضی اور ایمان کسی بندے کے دل میں کبھی''

☆ ☆ ☆

خیرات کرنے والوں کے لئے جنت کا مخصوص دروازہ

حدیث ـــــ میں ہے: ''جو شخص فی سبیل اللہ (یعنی جہاد میں استعمال کے لئے) کسی بھی چیز کا جوڑا (یعنی ایک سی دو چیزیں) خرچ کرے گا، اس کو جنت کے کسی دروازے سے بلایا جائے گا۔ اور جنت کے متعدد دروازے ہیں۔ پس جو نماز والوں میں سے ہوگا (یعنی نوافل بہت پڑھتا ہوگا یا فرض اچھی طرح سے ادا کرتا ہوگا) اس کو نماز کے دروازے سے بلایا جائے گا۔ اور جو جہاد والوں میں سے ہوگا، اس کو جہاد کے دروازے سے بلایا جائے گا۔ اور جو صدقہ والوں میں سے ہوگا، اس کو صدقہ کے دروازہ سے بلایا جائے گا۔ اور جو روزے والوں میں سے ہوگا، اس کو سیرابی کے دروازے سے بلایا جائے گا ـــــ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: جو کسی بھی دروازے سے بلایا جائے اس کے لئے وہ کافی ہے، مگر کیا کوئی ایسا شخص بھی ہوگا جس کو سبھی دروازوں سے بلایا جائے؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں ایسے بھی ہونگے۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں!'' (مشکوۃ حدیث ۱۸۹۰)

تشریح: جنت کی حقیقت نفس کی راحت ہے۔ جنت میں پہنچنے پر عالم بالا سے نفس پر یہ بات مترشح ہوگی کہ اللہ پاک اس سے خوش ہیں۔ اس کے کام ملکیت کے مناسب ہیں۔ اور اس کو وہاں دلجمعی نصیب ہوگی۔ سورہ آل عمران آیت ۱۰۷ میں ہے کہ: ''قیامت کے دن جن لوگوں کے چہرے سفید (روشن) ہوں گے، وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے'' رحمت: جنت اور اس کی تمام نعمتوں کو شامل ہے۔ اور تہی دستانِ رحمت کا حال سورۃ البقرۃ

آیت ۱۱۶ میں بیان کیا گیا ہے کہ: ''ان پر اللہ کی، فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہوگی۔ اور وہ اس لعنت میں ہمیشہ رہیں گے'' جہنم اور اس کی ہر تکلیف لعنتِ خداوندی کا نتیجہ ہے۔

اور جنت اُن لوگوں کے حصہ میں آئے گی جو بہیمیت کے چنگل سے چُھٹ گئے ہیں۔ اور انھوں نے اعمالِ صالحہ کے ذریعہ ملکیت کو قوی کرلیا ہے۔ اور بہیمیت کی تاریکیوں سے رحمت کی طرف نکلنے کی راہ یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر وہ خوبیاں پیدا کرے جو ظہور ملکیت کی راہ ہموار کرتی ہیں اور بہیمیت کو مغلوب کرتی ہیں۔ اور ان خصال کی تحصیل کچھ مشکل نہیں۔ کیونکہ وہ انسان کے خمیر میں گوندھی ہوئی ہیں۔ ایسی چند خوبیاں یہ ہیں:

پہلی خوبی —— خشوع وطہارت —— جو لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرتے ہیں اور پاکی کا اہتمام کرتے ہیں ان کو نماز کا خصوصی ذوق حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ نماز کی روح اخبات وخشوع ہے، اور پاکی نماز کے لئے شرط ہے۔ ایسے لوگوں کو جنت میں ''باب نماز'' سے بلایا جائے گا۔

دوسری خوبی —— سماحت یعنی سیر چشمی —— جو لوگ عالی ظرف ہیں وہ تین کام کرتے ہیں: خوب صدقہ وخیرات کرتے ہیں، زیادتی کرنے والوں سے درگذر کرتے ہیں، اور وہ خواہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوجائیں: مؤمنین کے لئے بازو بچھاتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ انکساری سے پیش آتے ہیں۔ اس خوبی والوں کو جنت میں ''باب صدقہ'' سے بلایا جائے گا۔

تیسری خوبی —— بہادری —— جب اللہ کی زمین شر وفساد کی آماجگاہ بن جاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی صلاح وفلاح کے لئے جو نظام پسند کرتے، وہ بعض بندوں کے دل میں الہام فرماتے ہیں۔ یہ الہام ان کو بہادر اور جوانمرد بنادیتا ہے۔ اور وہ فتنہ کو فرو کرنے کے لئے اور اللہ کا بول بالا کرنے کے لئے میدان میں نکل آتے ہیں۔ اور شیوۂ سرفروشی اختیار کرتے ہیں۔ انہی مجاہدین کو جنت میں ''باب جہاد'' سے بلایا جائے گا۔

چوتھی خوبی —— بہیمیت کو زیر کرنا —— بعض لوگوں کے مزاج میں ملکیت اور بہیمیت میں کھینچا تانی ہوتی ہے۔ اور وہ بالہامِ خداوندی یا اپنے ذاتی تجربہ سے یہ بات سمجھ لیتے ہیں کہ بہیمیت کو رام کرنے کا طریقہ: روزے رکھنا اور اعتکاف کرنا ہے۔ اسی سے بہیمیت کا زور ٹوٹ سکتا ہے۔ اور نفس: بہیمیت کی تاریکی سے نجات پاسکتا ہے۔ چنانچہ وہ اس الہام کو گوش نیوش سے سنتے ہیں۔ اور خالص جذبہ سے روزے رکھتے ہیں اور اعتکاف کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو بھی آخرت میں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اور جنت میں ان کو ''باب ریّان'' سے بلایا جائے گا۔ ریّان کے معنی ہیں: سیرابی۔ چونکہ یہ باب: روزوں کی تشنگی کی جزائے خیر ہے اس لیے یہ نام دیا گیا ہے۔

مذکورہ چاروں خوبیوں کا تذکرہ آنحضرت ﷺ نے تفصیل سے کیا ہے۔ ان کے علاوہ اسی قبیل کی چند خوبیاں یہ بھی ہیں:

پہلی خوبی —— فقاہت —— کچھ لوگ رات دن ایک کرکے دین میں مہارت اور ملکہ پیدا کرتے ہیں۔ یہ رسوخ

علمی بھی بڑی خوبی ہے۔سورۃ التوبہ آیت ۱۲۲ میں اس کا تذکرہ ہے: ﴿لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ﴾ تاکہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں۔اور احادیث میں بکثرت اس کی فضیلت وارد ہوئی ہے۔

دوسری خوبی — صبر ورضا — کچھ بندے آزمائش میں مبتلا کئے جاتے ہیں۔وہ مصائب کا شکار ہوتے ہیں۔اور کچھ لوگ غربت وافلاس سے دوچار ہوتے ہیں۔ان کٹھن حالات میں جو لوگ ہمت سے کام لیتے ہیں اور صبر شعار بنے رہتے ہیں اور اللہ کے فیصلوں پر دل سے راضی رہتے ہیں۔ان کے لئے بھی آخرت میں بڑا اجر وثواب ہے۔ابن ماجہ (حدیث ۱۶۰۴) میں روایت ہے کہ ''جس کے تین نابالغ بچے فوت ہوجائیں اور وہ صبر کرے تو وہ بچے جنت کے آٹھوں دروازوں پر اس کا انتظار کریں گے۔چاہے جس دروازے سے داخل ہو''

تیسری خوبی — عدل وانصاف — اللہ تعالیٰ جس بندے کو زِمامِ اقتدار سونپیں، وہ اگر انصاف کو شیوہ بنائے تو یہ بھی بڑی خوبی کی بات ہے۔حدیث میں سات قسم کے لوگوں کا تذکرہ آیا ہے، جن کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے سایہ میں رکھیں گے۔ان میں سب سے پہلے انصاف پرور بادشاہ کا تذکرہ کیا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۷۰۱ باب المساجد) اور انصاف پرور حاکم وہ ہے جو لوگوں کو جوڑے۔اور کبھی لوگوں میں عداوت پیدا ہوجائے تو اس کو الفت ومحبت سے بدلنے کی کوشش کرے (''لڑاؤ اور حکومت کرو'' ظالموں کا شیوہ ہے)

چوتھی خوبی — توکل بخدا — مؤمن کی شان یہ ہونی چاہئے کہ وہ ہر معاملہ میں اللہ پر اعتماد کرے۔دوسری طرف نہ دیکھے۔اسی لئے بدشگونی کو شرک قرار دیا ہے۔حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بدشگونی کا وسوسہ آتا ہے، مگر جو اللہ پر توکل کرتا ہے اس کا وسوسہ کافور ہوجاتا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۴۵۸۴ باب الفأل والطِّيَرَةِ) اور حدیث میں ایسے ستر ہزار لوگوں کا تذکرہ آیا ہے جو بے حساب جنت میں جائیں گے۔اور وہ: وہ لوگ ہوں گے جو نہ بدشگونی لیتے ہوں گے۔نہ منتر پڑھواتے ہوں گے، نہ داغ لگواتے ہوں گے، بلکہ اپنے پروردگار ہی پر توکل کرتے ہوں گے (مشکوٰۃ حدیث ۵۲۹۶ باب التوکل، کتاب الرقاق)

اور مہتم بالشان خوبیاں اِن آٹھ میں منحصر نہیں۔ان کے علاوہ خوبیوں کا بھی روایات میں تذکرہ آیا ہے۔مثلاً نمازِ ضُحیٰ پر مداومت کرنے والوں کے لئے بھی ایک دروازہ ہوگا، جس سے قیامت کے دن ان کو پکارا جائے گا۔اور توبہ کرنے والوں کے لئے بھی باب التوبہ ہوگا (مظاہر حق ۲: ۱۳۳)

حاصل کلام: یہ ہے کہ نفس کے بہیمیت کی ظلمت سے رحمتِ خداوندی کی طرف نکلنے کے لئے یہ اہم اعمال ہیں۔پس ان کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرنا چاہئے تاکہ مطلوب حاصل ہو۔اور حکمت خداوندی میں یہ بات طے ہے کہ ان اعمال میں سے ہر ایک عمل کے لئے جنت کا ایک دروازہ ہو، جس سے وہ اعمال کرنے والے داخل ہوں۔

جنت کے کتنے دروازے ہیں: سورۃ الحجر آیت ۴۴ میں جہنم کے سات دروازوں کا تذکرہ ہے: ﴿لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ،

لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَقْسُوْمٌ﴾ یعنی جہنم کے سات دروازے ہیں۔ ہر دروازے کے لئے جہنمیوں کے الگ الگ حصے ہیں۔ اور جنت کے دروازوں کا اجمالی تذکرہ قرآن کریم میں آیا ہے۔ تعداد مذکور نہیں۔ سورۃ الزمر آیت ۷۳ میں ہے: ﴿وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا ﴾ یعنی جب جنتی گروہ گروہ بنا کر جنت کی طرف روانہ کئے جائیں گے تو جنت کے دروازے پہلے سے کھلے ہوں گے۔ البتہ احادیث میں اس کی صراحت ہے کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں یعنی جہنم سے ایک دروازہ زائد ہے۔ یہی حکمتِ خداوندی کا مقتضی ہے کہ جس طرح جہنم کے دروازے ہیں۔ اور جہنمیوں کے الگ الگ حصے ہیں۔ اسی طرح جنت کے بھی دروازے ہوں اور جنتیوں کے بھی الگ الگ حصے ہوں۔ اور ایک دروازے کی زیادتی اس لئے ہے کہ رحمت غضب پر غالب ہے۔

فائدہ:(۱) سابقین میں سے جو لوگ بلند پایہ ہیں ان کے لئے نیکوکاری اور اعمالِ صالحہ کی زیادتی دو، تین اور چار دروازے بھی کھولتی ہے۔ اور وہ قیامت کے دن متعدد دروازوں سے بلائے جائیں گے۔ اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے تو یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ ان کو جنت کے سبھی دروازوں سے بلایا جائے گا۔

فائدہ(۲) حدیث کے شروع میں جہاد کے لئے دل کھول کر خرچ کرنے والے کو جنت کے کسی دروازے سے بلانے کا جو تذکرہ ہے وہ محض اہتمام کی زیادتی کے لئے ہے یعنی جہاد کے لئے خرچ کرنے کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ ورنہ وہ بھی ایک صدقہ ہے اور صدقہ کرنے والوں کے لئے علحدہ دروازہ ہے۔ اسی سے اس کو بھی بلایا جائے گا۔

نوٹ: یہ دونوں فائدے کتاب میں ہیں۔

[۳] قوله صلى الله عليه وسلم: " للجنة أبواب، فمن كان من أهل الصلاة" الحديثَ.

أقول: اعلم أن الجنةَ حقيقتُها راحةُ النفس بما يترشح عليها من فوقها من الرضا، والموافقةِ، والطُّمَأْنينة، وهو قوله تعالى: ﴿فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ، هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ﴾ وقولُه تعالى فى ضدِّها: ﴿ أُوْلٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلاَئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ، خَالِدِيْنَ فِيها﴾

وطريقُ خروج النفس إليها من ظلمات البهيمية: إنما يكون من الخُلُقِ الذى جُبلت النفس على ظهور الملكية فيه، وانقهارِ البهيمية.

فمن النفوس: من تكون مجبولةً على قوة الملكية:

[۱] فى خُلق الخشوع والطهارة، ومن خاصيتها: أن تكون ذاتَ حظ عظيم من الصلاة.

[۲] أو فى خُلُق السماحة، ومن خاصيتها: أن تكون ذاتَ حظ عظيم من الصدقات، والعفو عمن ظلم، وخفض الجناح للمؤمنين مع كِبْرِ النفس.

[۳] أو فی خلق الشجاعة، فَيُنفث تدبيرُ الحق لإصلاح عباده فيها، فيكونُ أولُ ما يقبل النفثَ منه هو الشجاعة، فيكون ذات حظ عظيم من الجهاد.

[٤] أو يكون من الأنفس المتجاذبة، فَيَهْدِیْ لها إلهامٌ أو تجربةٌ على نفسها: أن كسرَ البهيمية بالصوم والاعتكاف مُنْقِذٌ لها من ظلماتها، فيتلقى ذلك بسمعِ قبولٍ، واجتهد من صميم قلبه، فَيُجَازیٰ جزاءً وفاقًا بالريَّان.

فهذه هی الأبواب التی صرح بها النبی صلی الله عليه وسلم فی هذا الحديث؛ ويُشبهُ أن يكون منها: باب العلماء الراسخين، وباب أهل البلايا والمصائب والفقر، وباب العدالة، وهو قوله صلی الله عليه وسلم فی سبعة يظلهم اللّٰه فی ظله: ”إمام عادل“ وآيته: أن يكون عظيمَ السعی فی التأليف بين الناس؛ وباب التوكل وتركِ الطيرة؛ وفی كل باب من هذه الأبواب أحاديثُ كثيرة مشهورة.

وبالجملة: فهذه أعظم أبواب خروج النفس إلى رحمة الله، ويجب فی حكمة الله: أن يكون للجنة التی خَلَقَها الله لعباده أيضًا ثمانية أبواب بإزائها.

والكُمَّلُ من السابقين يَفتح عليهم الإحسانُ من بابين، وثلاثةٍ، وأربعةٍ، فَيُدْعون يوم القيامة منها، وقد وُعِدَ بذلك أبوبكر الصديق رضی الله عنه.

ومعنى قوله صلی الله عليه وسلم: ”من أنفق زوجين“ الحديث: أنه يُدعى من بعض أبوابها، إنما خَصَّه بالذكر زيادةً لاهتمامه.

ترجمہ: (۳) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ”جنت کے لیے متعدد دروازے ہیں، پس جو شخص نماز والوں میں سے ہے“ آخر حدیث تک۔

میں کہتا ہوں: جان لیں کہ جنت کی حقیقت: نفس کی راحت ہے اس چیز کے ذریعہ جو اس پر ٹپکتی ہے اس کے اوپر سے یعنی خوشنودی اور موافقت اور تسلی۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”پس وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے“ اور رحمت کی ضد میں اللہ پاک کا ارشاد ہے: ”یہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے، وہ اس لعنت میں ہمیشہ رہیں گے“ —— اور نفس کے نکلنے کی راہ رحمت کی طرف بہیمیت کی تاریکیوں سے: وہ نکلنا صرف ان اخلاق کے ذریعہ ہوتا ہے جو کہ نفس پیدا کیا گیا ہے ملکیت کے نمودار ہونے پر اس خُلق میں اور بہیمیت کے مغلوب ہونے پر یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان میں جو خوبیاں ودیعت فرمائی ہیں ان کو بڑھا دیا جائے تو ملکیت کو ظہور کا موقعہ ملتا ہے۔ اور بہیمیت مغلوب ہوتی ہے۔

پس بعض نفوس وہ ہیں جو پیدا کئے گئے ہیں ملکیت کی قوت پر: (۱) خشوع اور طہارت کی خصلت میں۔ اور اس کی خصوصیت سے یہ بات ہے کہ وہ بڑا حصہ لینے والا ہو نماز سے —— (۲) یا سیر چشمی کی خصلت میں۔ اور اس کی خصوصیت میں سے یہ بات ہے کہ وہ بڑا حصہ لینے والا ہو خیراتوں سے اور اس شخص سے درگذر کرنے سے جس نے ظلم کیا اور مؤمنین کے لئے بازو بچھانے سے نفس کے بڑا ہونے کے باوجود —— (۳) یا بہادری کی خصلت میں۔ پس پھونکا جاتا ہے اللہ کا انتظام اپنے بندوں کی اصلاح کے لئے اس نفس میں۔ پس پہلی وہ چیز جو اللہ کے الہام کو قبول کرتی ہے: وہ بہادری ہوتی ہے۔ پس ہوتا ہے وہ بڑا حصہ لینے والا جہاد سے —— (۴) یا ہوتا ہے وہ آدمی متجاذب نفوس میں سے۔ پس راہ دکھاتا ہے اس نفس کو الہام یا اس کا اپنا ذاتی تجربہ کہ بہیمیت کو توڑنا روزوں اور اعتکاف کے ذریعہ نجات دلانے والا ہے اس کو بہیمیت کی تاریکی سے۔ پس استقبال کرتا ہے وہ اس چیز کا قبولیت کے کان سے۔ اور انتہائی کوشش کرتا ہے وہ اپنے دل کی تھاہ سے۔ پس بدلہ دیا جاتا ہے وہ پورا پورا بدلہ سیرابی کے ذریعہ۔

پس یہ وہی ابواب ہیں جن کی نبی ﷺ نے صراحت فرمائی ہے اِس حدیث میں۔ اور مشابہ ہے اس سے کہ ہو اُن ابواب میں سے علمائے راسخین کا باب اور ابتلاء، مصائب اور فقر والوں کا باب۔ اور انصاف کا باب۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے اُن سات آدمیوں کے سلسلہ میں جن کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے سایہ میں رکھیں گے: ''انصاف پرور بادشاہ'' اور اس کی علامت یہ ہے کہ ہو وہ بہت زیادہ کوشش کرنے والا لوگوں کے درمیان جوڑ پیدا کرنے میں۔ اور توکل اور بدشگونی چھوڑنے کا باب۔ اور ان ابواب میں سے ہر باب میں بہت سی مشہور احادیث ہیں۔

اور حاصل کلام: پس یہ بڑے ابواب ہیں نفس کے نکلنے کے اللہ کی رحمت کی طرف۔ اور ضروری ہے حکمتِ خداوندی میں کہ ہوں اس جنت کے لئے بھی جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے آٹھ دروازے اُن اعمال کے مقابل —— اور سابقین میں سے اعلیٰ پایہ کے لوگ: نیکوکاری ان پر کھولتی ہے دو اور تین اور چار دروازوں میں سے۔ پس وہ قیامت کے دن اُن دروازوں سے بلائے جائیں گے۔ اور تحقیق وعدہ کئے گئے ہیں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس چیز کا —— اور آپ ﷺ کے ارشاد: ''جس نے خرچ کیا جوڑا'' آخر حدیث تک کا مطلب یہ ہے کہ وہ بلایا جائے گا جنت کے کسی دروازے سے (یعنی باب صدقہ سے) اور ذکر میں اس کو خاص کیا ہے صرف اس کے اہتمام کی زیادتی کے لئے۔

تصحیح: حدیث میں أبواب ثمانية تها ثمانية کو میں نے حذف کیا ہے۔ کیونکہ یہ لفظ نہ مشکوٰۃ میں ہے، نہ بخاری و مسلم میں۔ اور اگرچہ مخطوطہ کراچی میں بھی ہے مگر یہاں مخطوطہ کراچی میں اضطراب اور تکرار پایا جاتا ہے، اس لئے ممکن ہے یہ کاتب کی غلطی ہو۔ پھر آگے شاہ صاحب نے خود آٹھ دروازوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اور وہ اس طرح کیا ہے کہ گویا دیگر احادیث کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

باب ــــــ ۳

زکاتوں کے نصاب

تمام قابل زکوٰۃ اموال کے لئے شریعت نے نصاب متعین کئے ہیں، تاکہ غنیٰ (مالداری) کا تحقق ہو۔ حدیث میں ہے: خیرُ الصدقةِ ما کان عن ظَهْرِ غِنًی: بہترین خیرات وہ ہے جو مالداری کی پیٹھ سے ہو۔ یعنی خیرات کرنے کے بعد بھی مالداری باقی رہے۔ آدمی محتاج ہوکر نہ رہ جائے۔ ورنہ غریب نوازی اور خویش آزاری ہوگی۔

غلّہ اور کھجور کے نصاب کی حکمت: حدیث میں ہے: ''پانچ وسق سے کم کھجوروں میں زکوٰۃ نہیں'' ایک وسق: ساٹھ صاع کا ہوتا ہے۔ اور صاع: چار مُد کا۔ اور مُدّ: احناف کے نزدیک دو رطل کا اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک: ایک رطل اور تہائی رطل کا ہوتا ہے۔ اور رطل عراقی چار سو سات گرام کا ہوتا ہے۔ پس ایک صاع: احناف کے نزدیک: تین کلو دو سو اکسٹھ گرام ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک: دو کلو ایک سو تہتّر گرام ہے۔ اور ایک وسق: احناف کے نزدیک: ایک سو پچانوے کلو اور تین سو ساٹھ گرام ہے۔ اور پانچ وسق: ۹۷۶ کلو آٹھ سو گرام ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک: چھ سو اکیاون کلو نوّے گرام ہے۔

غلّہ اور کھجوروں کا یہ نصاب اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ یہ مقدار ایک چھوٹے کنبہ کی سال بھر کی ضروریات کے لئے کافی ہے۔ چھوٹا کنبہ تین افراد پر مشتمل ہوتا ہے یعنی میاں بیوی اور کوئی نوکر یا دونوں کا کوئی بچہ۔ اور چار افراد ہوں تو وہ بھی چھوٹا کنبہ ہے۔ اور انسان کی عام خوراک ایک رطل یا ایک مدّ ہوتی ہے۔ پس جب ہر ایک اتنی مقدار کھائے گا تو یہ مقدار ایک سال تک ان کے لئے کافی ہوگی۔ اور کچھ بچ بھی جائے گا، جو ہنگامی ضروریات کے لئے مثلاً مہمانداری کے لئے یا لاون کے لئے کام آئے گی۔

فائدہ: مذکورہ حدیث میں عُشر کا بیان ہے یا زکوٰۃ کا؟ اس میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ کھجور کے تاجر کی قابلِ زکوٰۃ مالیت کا بیان ہے یعنی پانچ وسق کھجوریں چاندی کے نصاب کے بقدر ہیں، اس لئے ان میں زکوٰۃ واجب ہے۔ اور دیگر ائمہ کے نزدیک: یہ زمین کی پیداوار کے عُشر کا بیان ہے ان کے نزدیک اُسی غلّہ اور پھلوں میں عُشر واجب ہوتا ہے جو سال بھر باقی رہ سکتے ہوں اور ان کی مقدار کم از کم پانچ وسق ہو۔ اس سے کم پیداوار میں عشر واجب نہیں۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک پیداوار میں مطلقاً عشر واجب ہے۔

چاندی کے نصاب کی حکمت: حدیث میں ہے کہ: ''پانچ اُوقیہ سے کم چاندی میں زکوٰۃ نہیں'' اُوقیہ: چالیس درہم کا وزن ہے۔ اور پانچ اُوقیے: دو سو درہم یعنی چھ سو بارہ گرام چاندی یا اس کی قیمت ہے۔ اور یہ نصاب اس لئے

تجویز کیا گیا ہے کہ اگر اشیاء کے بھاؤ معتدل ہوں، تو ایک چھوٹے کنبہ کی سال بھر کی ضروریات کے لئے اکثر ممالک میں یہ مقدار کافی ہے۔ آپ معتدل ممالک کی گرانی اور ارزانی کا جائزہ لیں، یہی بات پائیں گے۔

اونٹوں کے نصاب کی حکمت: حدیث میں ہے کہ: ''پانچ سے کم اونٹوں کے ریوڑ میں زکوٰۃ نہیں'' اور ان میں سے زکوٰۃ ایک بکری لی جاتی ہے یہاں دو سوال ہیں: ایک یہ کہ زکوٰۃ میں اصل یہ ہے کہ وہ جنسِ مال سے لی جائے۔ پھر اونٹوں کی زکوٰۃ میں بکری کیوں لی جاتی ہے؟ دوم یہ کہ نصاب کوئی مہتمّ بالشان عدد ہونا چاہئے۔ اور پانچ اونٹ کوئی بڑا مال نہیں، پھر اتنے اونٹوں میں زکوٰۃ کیوں واجب ہے؟

سوال دوم کا جواب: یہ ہے کہ پانچ اونٹ: دو اعتباروں سے مال کی کافی مقدار ہیں۔ ایک: یہ کہ اونٹ مویشی میں عظیم الجثہ، کثیر الفائدہ جانور ہے۔ اس کو ذبح کر کے کھایا جاسکتا ہے۔ اس پر سواری کی جاسکتی ہے۔ اس کے دودھ سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس سے نسل حاصل کی جاسکتی ہے۔ اور اس کے بال اور کھال سے گرم کپڑے بنائے جاسکتے ہیں۔ اس اعتبار سے تھوڑے اونٹ بھی بہت ہیں۔ دوم: یہ کہ بعض لوگ ایسی چند عمدہ اونٹنیاں پالنے پر اکتفا کرتے ہیں جو بہت اونٹنیوں کا کام کرتی ہیں۔ اور قیمت کے اعتبار سے بھی پانچ اونٹ: چالیس، پچاس بکریوں کے مساوی ہیں کیونکہ دور نبوی میں اور دور خلافت میں ایک اونٹ: آٹھ، دس یا بارہ بکریوں کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ روایات میں بکثرت یہ بات آئی ہے۔ پس پانچ اونٹ: چالیس، پچاس بکریوں کے برابر ہوئے۔ اور اتنی بکریوں میں سے ایک بکری لی جاتی ہے، اس لئے پانچ اونٹوں میں سے بھی ایک بکری لی جاتی ہے۔

اور سوال اول کا جواب: یہ ہے کہ اونٹ کا کم از کم ایک سالہ بچہ ہی زکوٰۃ میں لیا جاسکتا ہے۔ اس سے چھوٹا نہیں لیا جاسکتا کیونکہ وہ ماں کے دودھ کا محتاج ہوتا ہے۔ اور بنت مخاض کی مالیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ پانچ اونٹوں میں سے اتنی زیادہ زکوٰۃ لی جائے گی تو فریضہ بھاری ہو جائے گا۔ اس لئے پچیس سے کم اونٹوں کی زکوٰۃ میں بکریاں لی جاتی ہیں۔

﴿مقادير الزكاة﴾

[۱] قال النبى صلى الله عليه وسلم: ''ليس فيما دون خمسةِ أَوْسُقٍ من التمْر صدقة، وليس فيما دون خمس أواق من الورِق صدقة، وليس فيما دون خمسِ ذَوْدٍ من الإبل صدقة''

أقول: إنما قدَّر من الْحَبِّ والتمر خمسةَ أوسق، لأنها تكفى أقلَّ أهلِ بيتٍ إلى سنة؛ **وذلك:** لأن أقلَّ البيت: الزوجُ، والزوجة، وثالثٌ: خادمٌ أو ولدٌ بينهما، ومايضا هى ذلك من أقلِّ البيوت؛ وغالبُ قُوْتِ الإنسان رِطْل أو مدٌّ من الطعام، فإذا أكل كلُّ واحد من هؤلاء ذلك المقدار كفاهم لسَنَةٍ، وبقيت بقيةٌ لنوائبهم أو إدامهم.

وإنـمـا قَـدَّرَ مـن الـورِق خـمسَ أواقٍ: لأنها مقدارٌ يكفى أقلَّ أهلِ بيتٍ سنةً كاملةً، إذا كـانـت الأسـعـار مـوافقةً فى أكثر الأقطار؛ واستقرِئْ عاداتِ البلاد المعتدلة فى الرُّخْص والغَلاء تجدْ ذلك.

وإنما قدَّر من الإبل خمسَ ذودٍ، وجعل زكاتَه شاةً، وإن كان الأصلُ ألا تؤخَذَ الزكاةُ إلا من جنس المال، وأن يُجعل النصابُ عددًا له بالٌ: لأن الإبل أعظمُ المواشى جُثَّةً، وأكثرها فائدة، يـمـكن أن تُذبح، وتُركب، وتُحلب، ويُطلب منها النسلُ، ويُستدفأ بأوبارها وجلودها؛ وكان بـعـضُـهـم يَـقْتـنـى نجائبَ قليلةً تكفى كفاية الصِّرْمَةِ؛ وكان البعير يُسوِّى فى ذلك الزمان بعشر شياهٍ، وبثمانِ شياهٍ، واثنتى عشرة شاةً، كما ورد فى كثير من الأحاديث، فجعل خمسَ ذود فى حكم أدنى نصاب من الغنم، وجعل فيها شاةً.

ترجمہ: زکوۃ کی مقداروں کا بیان: (۱) نبی ﷺ نے فرمایا:............ میں کہتا ہوں: نبی ﷺ نے غلہ اور کھجوروں کا پانچ وسقوں سے اندازہ صرف اس وجہ سے مقرر کیا کہ پانچ وسق ایک چھوٹے کنبہ کے لئے ایک سال تک کافی ہوجاتے ہیں۔ اوراس کی تفصیل یہ ہے کہ چھوٹے کنبہ میں: خاوند، بیوی اور تیسرا: کوئی خادم یا دونوں کے درمیان کوئی بچہ ہوتا ہے۔ اور جو چھوٹے کنبوں سے اس کے مشابہ ہے۔ اور انسان کی عام خوراک غلہ کا ایک رطل یا ایک مدّ ہوتی ہے۔ پس جب کھائے گا ہر ایک ان میں سے اتنی مقدار تو کافی ہوگی وہ ان کے لئے ایک سال تک۔ اور باقی رہے گا کچھ ان کی ہنگامی ضروریات کے لئے یا ان کے لاوَن (وہ چیز جس سے روٹی لگا کر کھائیں) کے لئے۔

اور چاندی کے پانچ اُوقیہ آپؐ نے اس لئے تجویز فرمائے کہ وہ ایک ایسی مقدار ہے جو اکثر ملکوں میں کافی ہوجاتی ہے پورے سال تک ایک چھوٹے کنبہ کے لئے جبکہ نرخ معتدل ہو۔ اور آپ جائزہ لیں معتدل ممالک کی عادتوں کا ارزانی اور گرانی میں پائیں گے آپ یہ بات۔

اور اونٹوں میں سے آپؐ نے پانچ کی جماعت کو مقرر کیا اور ان کی زکوۃ ایک بکری تجویز فرمائی۔ اگرچہ اصل یہ ہے کہ زکوۃ نہ لی جائے مگر مال کی جنس سے اور یہ کہ مقرر کیا جائے نصاب کسی مہتم بالشان عدد کو اس لئے کہ اونٹ مویشی میں سب سے بڑے ہیں جسم میں۔ اور ان میں زیادہ ہیں فائدہ میں۔ ممکن ہے کہ ذبح کئے جائیں اور سواری کئے جائیں اور دوہے جائیں اور ان سے بچے حاصل کئے جائے اور ان کے بالوں اور کھالوں سے گرمی حاصل کی جائے۔ اور بعض لوگ پالا کرتے ہیں تھوڑی سی ایسی عمدہ اونٹنیاں جو جماعت کا کام کرتی ہیں۔ اور اونٹ اُس زمانہ میں دس اور آٹھ اور بارہ بکریوں کے برابر ہوتا تھا، جیسا کہ بہت سی حدیثوں میں آیا ہے۔ پس مقرر کیا پانچ اونٹوں کو بکریوں کے ادنی نصاب کے حکم میں اور ان میں ایک بکری متعین کی۔

غلام اور گھوڑے میں زکوٰۃ نہ ہونے کی وجہ

حدیث میں ہے کہ ”مسلمان پر نہ اس کے غلام میں کچھ زکوٰۃ ہے اور نہ اس کے گھوڑے میں“ اور ایک روایت میں ہے کہ ”مسلمان کے غلام میں کچھ زکوٰۃ نہیں۔ البتہ صدقۃ الفطر ہے“ (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۹۵)

تشریح: غلاموں میں جبکہ وہ خدمت کے لئے ہوں زکوٰۃ واجب نہیں۔ البتہ ان کا صدقۃ الفطر مولی پر واجب ہے (اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک صرف مسلمان غلام کا صدقۃ الفطر مولیٰ پر واجب ہے) اور اگر وہ تجارت کے لئے ہوں تو ان کی مالیت میں جبکہ وہ چاندی کے نصاب کے بقدر ہو، اور حولانِ حول کی شرط بھی پائی جائے تو زکوٰۃ واجب ہے۔

اور گھوڑا اگر سواری وغیرہ کاموں کے لئے ہے تو اس میں بھی زکوٰۃ واجب نہیں۔ اگرچہ وہ سائمہ ہو۔ اور تجارت کے لئے ہو تو اس کی مالیت میں زکوٰۃ واجب ہے۔ اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ اور اگر نسل حاصل کرنے کے لئے گھوڑے پالے جائیں تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ان میں زکوٰۃ واجب ہے اور باقی حضرات کے نزدیک واجب نہیں۔

مذکورہ حدیث میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک صرف خدمت کے غلام کا اور سواری کے گھوڑے کا حکم بیان کیا گیا ہے۔ اور ان میں زکوٰۃ واجب نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ:

نسل بڑھانے کے لئے غلاموں کو پالنے کا دنیا میں کہیں بھی رواج نہیں۔ اور یہی حال گھوڑوں کا ہے۔ دنیا کے بہت سے ممالک میں گھوڑے اتنی کثرت سے نہیں پالے جاتے جتنی کثرت سے مویشی پالے جاتے ہیں۔ پس یہ دونوں اموالِ نامیہ میں سے نہیں ہیں، اس لئے ان میں زکوٰۃ نہیں۔ ہاں تجارت کے لئے ہوں تو پھر مالِ نامی ہیں اور ان میں زکوٰۃ واجب ہے۔

فائدہ: نصب الرایہ ۲: ۳۵۹ میں نسل کے لئے پالے ہوئے گھوڑوں میں سے حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا زکوٰۃ لینا مروی ہے۔

> [۲] قوله صلى الله عليه وسلم: ” ليس على المسلم صدقة فى عبده، ولا فى فرسه“
>
> **أقول: ذلك:** لأنـه لـم تَـجْرِ العادةُ باقتناء الرقيق للتناسل، وكذا الخيلُ فى كثير من الأقاليم لاتكثُرُ كثرةً يُعتدُّ بها فى جنب الأنعام، فلم يكونا من الأموال النامية؛ اللهم إلا باعتبار التجارة.

ترجمہ: (۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: .... میں کہتا ہوں: وہ بات یعنی زکوٰۃ کا عدم وجوب اس لئے ہے کہ عادت جاری نہیں نسل بڑھانے کے لئے غلاموں کو پالنے کی۔ اور اسی طرح گھوڑے: بہت سے خطّوں میں: نہیں زیادہ ہوتے ایسی زیادتی جو قابل لحاظ ہو، پالتو جانوروں کی بہ نسبت۔ پس وہ دونوں اموال نامیہ میں سے نہیں۔ اے اللہ! مگر تجارت کے اعتبار سے (یعنی یہ صورت مستثنیٰ ہے۔ پس حدیث عام مخصوص منہ البعض ہے۔ چنانچہ خلفائے راشدین کے عمل

سے: نسل بڑھانے کے لئے پالے گئے گھوڑے بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس حدیث سے مستثنیٰ ہیں)

☆ ☆ ☆

اونٹوں کا نصاب کس طرح تشکیل دیا گیا ہے؟

حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عمرو بن حزم وغیرہم رضی اللہ عنہم کی روایات سے یہ بات درجہ شہرت کو بلکہ تواتر کو پہنچ گئی ہے کہ بیس اونٹوں تک: ہر پانچ اونٹوں میں ایک بکری واجب ہے۔ پھر ۲۵ تا ۳۵ میں بنتِ مَخاض۔ اور ۳۶ تا ۴۵ میں بنتِ لَبون اور ۴۶ تا ۶۰ میں حِقّہ۔ اور ۶۱ تا ۷۵ میں جَذَعہ۔ اور ۷۶ تا ۹۰ میں دو بنتِ لبون۔ اور ۹۱ تا ۱۲۰ میں دو حِقّے واجب ہیں۔ پھر قاعدہ کلیہ ہے کہ ہر چالیس میں بنت لبون اور ہر پچاس میں حقّہ واجب ہے۔

فائدہ: (۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ نامہ روایت کیا ہے جو بخاری شریف میں ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۹۶) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ نامہ روایت کیا ہے جو موطا مالک (۱: ۲۵۷ باب صدقۃ الماشیۃ، کتاب الزکوٰۃ) میں ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ابوداؤد (حدیث ۱۵۷۲ باب زکوٰۃ السائمہ) میں ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت: امام محمد رحمہ اللہ کی کتاب الآثار (حدیث ۳۱۷ باب زکوٰۃ الابل) میں ہے۔ اور حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کی روایت: امام بیہقی کی سنن کبری (۴: ۸۹ باب کیف فرض الصدقۃ؟ کتاب الزکوٰۃ) میں ہے۔

فائدہ: (۲) بنتِ مَخاض: اونٹنی کا ایک سالہ مادہ بچہ۔ مَخاض: دردِ زہ۔ سال بھر کے بعد اونٹنی گابھن ہوجاتی ہے اس لئے یہ نام دیا گیا ہے۔ بنتِ لَبون: دوسالہ مادہ بچہ۔ لَبون دودھ والی۔ دوسال میں اونٹنی دوسرا بچہ جنتی ہے، اور دودھ دیتی ہے، اس لئے یہ نام دیا گیا ہے۔ حِقّہ: تین سالہ مادہ بچہ۔ یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ اب وہ بار برداری کے قابل ہوجاتا ہے۔ جَذَعہ: چار سالہ مادہ بچہ۔ جَذَع: جوان۔ پانچویں سال میں اونٹنی کا مادہ بچہ جوان ہوجاتا ہے۔ اور گابھن ہونے کے قابل ہوجاتا ہے۔

تشریح: اونٹوں کے نصاب کی تشکیل اس طرح عمل میں آئی ہے کہ ان کے ریوڑ بنائے گئے ہیں۔ اور چونکہ عربوں کے عرف میں اونٹوں میں بیس سے زائد ہی پر ریوڑ کا اطلاق ہوتا ہے اس لئے سب سے چھوٹا ریوڑ ۲۵ کا بنایا۔ اور اس میں ایک سالہ مادہ بچہ واجب کیا۔ یہی فریضہ دس کے اضافہ تک یعنی ۳۵ تک باقی رہتا ہے۔ پھر دوسرا ریوڑ ۳۶ کا بنایا۔ اور اس میں دوسالہ مادہ بچہ واجب کیا۔ یہی فریضہ نو کے اضافہ تک یعنی ۴۵ تک باقی رہتا ہے۔ پھر تیسرا ریوڑ ۴۶ کا بنایا اور اس میں تین سالہ مادہ بچہ مقرر کیا۔ یہی فریضہ چودہ کے اضافہ تک یعنی ۶۰ تک باقی رہتا ہے۔ پھر چوتھا ریوڑ ۶۱ کا بنایا۔ اور اس میں چار سالہ مادہ بچہ واجب کیا۔ یہی فریضہ چودہ کے اضافہ تک یعنی ۷۵ تک باقی رہتا ہے۔ اور پہلے دو ریوڑوں میں دس دس کا

اورآخری دوریوڑوں میں پندرہ پندرہ کا اضافہ اس لئے کیا کہ ایک سالہ اور دوسالہ بچہ بہت زیادہ قیمتی نہیں ہوتا۔ اور تین سالہ اور چار سالہ بچہ عربوں کو بہت زیادہ مرغوب ہوتا ہے، کیونکہ اب وہ بار برداری اور حمل کے قابل ہوجاتا ہے، اس لئے اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے، اس لئے ریوڑ میں پندرہ پندرہ کا اضافہ کیا گیا۔ پھر ۳۶ کو دوگنا کرکے ۷۶ کا پانچواں ریوڑ بنایا اور اس میں دو بنتِ لبون واجب کئے یہی فریضہ ۴۵ کے دوگنے تک یعنی ۹۰ تک باقی رہتا ہے۔ پھر ۴۶ کو دوگنا کرکے ۹۱ کا چھٹا ریوڑ بنایا۔ اور اس میں دو حقّے واجب کئے۔ یہی فریضہ ۶۰ کے دوگنے تک یعنی ۱۲۰ تک باقی رہتا ہے۔ پھر قاعدہ کلیہ بیان کیا کہ ہر چالیس میں بنتِ لبون اور ہر پچاس میں حقّہ واجب ہے۔ اس قاعدہ کی تطبیق میں فقہائے عراق اور فقہائے حجاز میں اختلاف ہوا ہے۔ تفصیل کتب فقہ اور شروح حدیث میں ہے۔

[۳] وقد استفاض من روايةِ أبى بكر الصديق، وعمر بن الخطاب، وعلى بن أبى طالب، وابن مسعود، وعَمرو بن حَزْمٍ، وغيرهم، رضى الله عنهم، بل صار متواترًا بين المسلمين: أن زكاةَ الإبل فى كل خمسٍ شاةٌ، فإذا بلغت خمسًا وعشرين إلى خمس وثلاثين: ففيها بنتُ مَخاضٍ، فإذا بلغت ستًا وثلاثين إلى خمس وأربعين: ففيها بنتُ لَبونٍ، وإذا بلغت ستا وأربعين إلى ستين ففيها حِقَّةٌ، فإذا بلغت واحدة وستين إلى خمس وسبعين: ففيها جَذَعَةٌ، فإذا بلغت ستا وسبعين إلى تسعين: ففيها بنتالَبون، فإذا بلغت إحدى وتسعين إلى عشرين ومائةٍ: ففيها حِقَّتان، فإذا زادت على عشرين ومائةٍ: ففى كل أربعين بنتُ لبون، وفى كل خمسين حقة.

أقول: الأصل فى ذلك: أنه أراد توزيعَ النُّوْقِ على الصِّرَمِ، فجعل الناقةَ الصغيرةَ للصِرْمةِ الصغيرة، والكبيرةَ للكبيرة، رعاية للإنصاف؛ ووجد الصرمةَ لاتطلق فى عرفهم إلا على أكثر من عشرين، فضبط بخمس وعشرين، ثم جعل فى كل عشرةٍ زيادةَ سِنٍّ إلا فى الأسنان المرغوبِ فيها عند العرب غايةَ الرغبة، فجعل زيادتَها فى كلِّ خمسةَ عشر.

ترجمہ: (۳) اور تحقیق درجۂ شہرت تک پہنچی ہے ابوبکر صدیق، عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب، ابن مسعود اور عمرو بن حزم رضی اللہ عنہم اور ان کے علاوہ کی روایات سے، بلکہ مسلمانوں کے درمیان وہ بات متواتر ہوگئی ہے کہ اونٹوں کی زکوٰۃ ہر پانچ میں ایک بکری ہے۔ پس جب ہوجائیں ۲۵ تا ۳۵ تو ان میں بنتِ مخاض ہے۔ پھر جب ہوجائیں ۳۶ تا ۴۵ تو ان میں بنتِ لبون ہے۔ اور جب ہوجائیں ۴۶ تا ۶۰ تو ان میں حقّہ ہے۔ پس جب ہوجائیں ۶۱ تا ۷۵ تو ان میں جذعہ ہے۔ پس جب ہوجائیں ۷۶ تا ۹۰ تو ان میں دو بنتِ لبون ہیں۔ پس جب ہوجائیں ۹۱ تا ۱۲۰ تو ان میں دو حقّے ہیں۔ پس جب زیادہ ہوں ایک سو بیس پر تو ہر چالیس میں بنتِ لبون ہے، اور ہر پچاس میں حقّہ ہے (یہ تمام روایات کا خلاصہ ہے) میں کہتا ہوں:

بنیادی بات اس میں یعنی نصاب کی تشکیل میں یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے چاہا اونٹنیوں کو ریوڑ پر تقسیم کرنا۔ پس چھوٹی اونٹنی کو چھوٹے ریوڑ میں اور بڑی کو بڑے میں مقرر کیا۔ انصاف کی رعایت کرتے ہوئے یعنی انصاف کا تقاضہ یہی ہے کہ چھوٹے ریوڑ میں سے چھوٹا بچہ لیا جائے اور بڑے میں سے بڑا۔ اور پایا آپ نے کہ ریوڑ نہیں بولا جاتا عربوں کے عرف میں مگر بیس سے زائد پر (اس لئے بیس تک بکریوں کے ذریعہ زکوٰۃ مقرر کی) پس متعین کیا ریوڑ کو پچیس کے ساتھ، پھر مقرر کیا ہر دس میں عمر کی زیادتی کو۔ مگر ان عمروں میں جو عربوں کے نزدیک بہت ہی زیادہ مرغوب فیہ ہیں۔ پس مقرر کی عمر کی زیادتی ہر پندرہ میں۔

تصحیح: إلا فی الأسنان مطبوعہ میں من الأسنان ہے اور إلا نہیں ہے۔ یہ تصحیف ہے۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے...... اور لاتطلق تمام نسخوں میں لاتنطلق ہے۔ تصحیح اندازہ سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

بکریوں کا نصاب کس طرح تشکیل دیا گیا ہے؟

مذکورہ بالا صحابہ کی روایتوں سے بکریوں کی زکوٰۃ کے سلسلہ میں بھی یہ بات درجۂ شہرت کو پہنچی ہے کہ ۴۰ تا ۱۲۰ بکریوں میں ایک بکری واجب ہے۔ اور ۱۲۱ تا ۲۰۰ میں دو بکریاں ہیں۔ اور ۲۰۱ تا ۳۰۰ میں تین بکریاں ہیں۔ پھر قاعدہ کلیہ ہے کہ سیکڑہ جب پورا ہو تو اس میں ایک بکری ہے۔ پس ۳۹۹ تک تین ہی بکریاں لی جائیں گی۔ جب چار سو پوری ہو جائیں گی تو چار بکریاں واجب ہونگی۔ وھٰکذا۔

تشریح: بکریوں کا ریوڑ چھوٹا بھی ہوتا ہے اور بڑا بھی۔ اور دونوں میں تفاوت فاحش ہوتا ہے۔ کیونکہ بکریوں کا پالنا آسان ہے۔ ہر شخص حسب سہولت ان کو پالتا ہے۔ اس لئے نبی ﷺ نے بکریوں کا چھوٹا ریوڑ چالیس کا تجویز کیا۔ اور اس میں ایک بکری واجب کی۔ اور بڑا ریوڑ تین چالیسوں کا تجویز کیا یعنی ایک سو بیس کے بعد دو بکریاں واجب کیں۔ پھر ضابطہ بنایا کہ ہر سیکڑہ میں ایک بکری ہے۔ پس ۲۰۱ میں تین بکریاں واجب ہونگی۔ یہی فریضہ ۳۹۹ تک رہے گا۔ جب ۴۰۰ بکریاں پوری ہونگی تو چار بکریاں واجب ہوں گی۔ وھٰکذا۔ اور یہاں وقص حساب کی سہولت کے لئے زائد رکھا گیا ہے۔

گایوں بھینسوں کا نصاب کس طرح تشکیل دیا گیا ہے؟

حضرت مُعاذ رضی اللہ عنہ کو جب یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو نبی ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ وہ ہر تیس گایوں بھینسوں میں سے ایک سالہ نر یا مادہ بچہ لیں اور ہر چالیس میں سے دو سالہ نر یا مادہ بچہ لیں (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۰۰)

تشریح: گایوں بھینسوں کے ریوڑ بھی چھوٹے بڑے ہوتے ہیں، اس لئے نبی ﷺ نے چھوٹا ریوڑ تیس کا تجویز کیا۔

اور بڑا ریوڑ چالیس کا۔ کیونکہ گائیں بھینسیں اونٹ اور بکریوں کے بیچ کے جانور ہیں، اس لئے ان میں دونوں کی مشابہت ملحوظ رکھی گئی۔

چاندی اور سونے کا نصاب اور اس میں زکوٰۃ کم ہونے کی وجہ

روایات سے یہ بات بھی درجہ شہرت تک پہنچی ہوئی ہے کہ چاندی کا نصاب پانچ اُوقیہ یعنی ۲۰۰ درہم ہے۔اس سے کم میں زکوٰۃ نہیں۔اور سونا: چاندی پر محمول ہے۔یعنی چھ سو بارہ گرام چاندی کی قیمت کے بقدر سونا زکوٰۃ کا نصاب ہے اور دور نبوی میں ایک دینار کا مبادلہ (Change) دس درہم سے ہوتا تھا۔پس دو سو درہم کے بیس مثقال ہوئے۔اس لئے اسی کو سونے کا نصاب مقرر کیا گیا۔اور سونے، چاندی میں زکوٰۃ چالیسواں حصہ رکھی یعنی ڈھائی روپے فی سکیڑہ۔یہ مقدار زکوٰۃ کی تمام مقداروں سے کم ہے۔کیونکہ یہ اموال کنز یعنی خزانہ (ذخیرہ کی ہوئی قابل رغبت چیز) ہیں۔اور خزائن لوگوں کے نزدیک نفیس ترین اموال شمار ہوتے ہیں۔اس لئے اگر لوگوں کو ان میں سے بہت مقدار خرچ کرنے کے لئے کہا جائے گا تو ان پر بار ہوگا۔اس لئے ان کی زکوٰۃ تمام زکاتوں سے کم رکھی گئی ہے۔

فائدہ: سونے کے نصاب کے سلسلہ میں تین روایتیں ہیں۔مگر ان میں سے ایک بھی اعلی درجہ کی صحیح نہیں۔وہ تین روایتیں یہ ہیں:

پہلی روایت: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہے کہ: ''سونے میں کچھ واجب نہیں، تا آنکہ وہ بیس دینار ہو جائے۔پھر اگر کسی کے پاس بیس دینار ہوں، اور ان پر سال گذر جائے تو ان میں آدھا دینار ہے'' اس روایت کو ابن وہب مصری نے مرفوع بیان کیا ہے اور شعبہ اور ثوری وغیرہما نے موقوف بیان کیا ہے یعنی حضرت علی رضی اللہ کا قول قرار دیا ہے۔امام ابوداؤد نے اس پر سکوت کیا ہے یعنی کوئی جرح نہیں کی۔امام نووی نے حسن یا صحیح کہا ہے اور زیلعی رحمہ اللہ نے حسن قرار دیا ہے (ابوداؤد حدیث ۱۵۷۳ باب زکاۃ السائمۃ، نصب الرایہ ۲: ۳۲۸)

دوسری روایت: حضرت عائشہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ ''نبی ﷺ ہر بیس دینار یا زیادہ میں سے آدھا دینار لیا کرتے تھے'' اس کی سند میں ایک راوی ابراہیم بن اسماعیل بن مُجَمِّع انصاری ہے جو ضعیف ہے۔مگر ضعیف جداً نہیں۔بخاری میں اس راوی کی روایت تعلیقاً ہے (ابن ماجہ حدیث ۱۷۹۱ باب زکاۃ الورِق والذہب)

تیسری روایت: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ: ''دو سو درہم سے کم میں کچھ نہیں اور سونے کے بیس مثقال سے کم میں کچھ نہیں'' حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے درایہ میں اس کی اسناد کو بھی ضعیف کہا ہے۔یہ حدیث ابوعبید اور ابن زنجویہ نے کتاب الاموال میں روایت کی ہے (نصب الرایہ ۲: ۳۶۹ مُغنی ابن قُدامہ ۲: ۵۹۹)

مذکورہ تمام روایات گو الگ الگ ضعیف ہیں، مگر ضُعف شدید نہیں۔پھر مل کر ایک قوت حاصل کر لیتی ہیں اور قابل

استدلال ہوجاتی ہیں۔ اس لئے جمہور کے نزدیک سونے کا نصاب: ایک مستقل نصاب ہے اور اس میں قیمت کا اعتبار نہیں۔ البتہ کچھ حضرات سونے کو چاندی کے نصاب پر محمول کرتے ہیں یعنی ان کے نزدیک سونے کا نصاب: کوئی مستقل نصاب نہیں۔ جتنا بھی سونا چھ سو بارہ گرام چاندی کی قیمت کے برابر ہوجائے اس میں زکوٰۃ واجب ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ ابن قدامہ رحمہ اللہ مُغنی (٥٩٩:٢) میں لکھتے ہیں: قال عامَّةُ الفقهاء: نصابُ الذهب عشرون مثقالاً، من غير اعتبارِ قيمتها، إلا ما حُكى عن عطاء، وطاووس، والزهرى، وسليمان بن حرب، وأيوبَ السختيانى، أنهم قالوا: هو معتَبَر بالفضة، فما كان قيمتُه مائتى درهم ففيه الزكاةُ، وإلا فلا، لأنه لم يثبت عن النبى صلى الله عليه وسلم تقديرٌ فى نصابه، فثبت أنه حمله على الفضة اھ

خلاصہ یہ ہے کہ قابلِ زکوٰۃ اموال کی اجناس چار ہیں یا پانچ؟ اس میں اختلاف ہے۔ مواشی بالاتفاق تین جنسیں ہیں۔ ان میں ایک نصاب کا دوسرے نصاب سے انضمام نہیں کیا جاتا یعنی اگر کسی کے پاس چار اونٹ، بیس گائیں اور تیس بکریاں ہوں تو ان میں کچھ زکوٰۃ نہیں، کیونکہ کوئی نصاب مکمل نہیں۔ اور سونا چاندی دو جنس ہیں یا ایک؟ اس میں اختلاف ہے بعض حضرات کے نزدیک اور شاہ صاحب کے نزدیک دونوں ایک جنس ہیں۔ اور اصل چاندی کا نصاب ہے اور سونے میں اس کی قیمت کا اعتبار ہے۔ اور جمہور ان کو دو جنسیں قرار دیتے ہیں۔ اور دونوں میں وزن کا اعتبار کرتے ہیں۔ چاندی کا نصاب چھ سو بارہ گرام اور سونے کا نصاب ساڑھے ستاسی گرام ہے مگر چونکہ دونوں خلقی ثمن ہیں اور دونوں کی منفعت بھی ایک ہے یعنی دونوں ایک ہی کام کرتے ہیں، اس لئے جمہور دونوں میں انضمام کرتے ہیں یعنی کسی کے پاس نصاب سے کم چاندی ہو اور نصاب سے کم سونا ہو تو بعض حضرات وزن کے اعتبار سے انضمام کرتے ہیں اور احناف دونوں کی قیمت لگا کر انفع للفقراء نصاب بناتے ہیں۔

[٤] وقد استفاض من روايتهم أيضًا فى زكاة الغنم: أنه إذا كانت أربعين إلى عشرين ومائةٍ: ففيها شاةٌ، فإذا زادت على عشرين ومائةٍ إلى مائتين: ففيها شاتان، فإذا زادت على مائتين إلى ثلاثِ مائةٍ ففيها ثلاث شياهٍ، فإذا زادت على ثلاثِ مائةٍ: ففى كل مائة شاة.

أقول: الأصل فيه: أن ثُلَّةً من الشاء تكون كثيرة، وثلة منها تكون قليلة، والاختلاف فيها يتفاحش لأنها يسهل اقتناؤُها، وكلٌّ يقتنى بحسب التيسير، فضبط النبى صلى الله عليه وسلم أقلَّ ثلةٍ بأربعين، وأعظمَ ثلة بثلاث أربعيناتٍ، ثم جعل فى كل مائةٍ شاةً، تيسيرًا فى الحساب.

[٥] وصحَّ من حديث مُعاذ رضى الله عنه فى البقر: فى كل ثلاثين تَبِيْعٌ أو تبيعة، وفى كل أربعين مُسِنٌّ أو مسنة، وذلك: لأنها متوسطة بين الإبل والشاء، فَرُوعى فيها شِبْهُهُما.

[٦] واستفاض أيضًا: أن زكاة الرِّقَّةِ ربعُ العُشر، فإن لم يكن إلا تسعون ومائة: فليس فيها

شيئ، وذلك: لأن الكنوزَ أَنْفَسُ المال، يتضررون بإنفاق المقدار الكثير منها، فمن حقِّ زكاته أن تكون أخفَّ الزكوات؛ والذهبُ محمول على الفضة، وكان فى ذلك الزمان صرفُ دينار بعشرة دراهم، فصار نصابُه عشرين مثقالاً.

ترجمہ: (۴) اور مذکورہ صحابہ کی روایات سے بکریوں کی زکوٰۃ میں بھی یہ بات مشہور ہوچکی ہے کہ جب بکریاں چالیس تا ایک سوبیس ہوں تو ان میں ایک بکری ہے۔ پس جب وہ ایک سوبیس سے زیادہ ہوں: دوسوتک، تو ان میں دو بکریاں ہیں۔ پھر جب وہ زیادہ ہوں دوسو سے تین سوتک تو ان میں تین بکریاں ہیں۔ پس جب وہ تین سو سے زیادہ ہوں تو ہرسو میں ایک بکری ہے۔ میں کہتا ہوں: بنیادی بات اس میں یہ ہے کہ بکریوں کا کوئی ریوڑ زیادہ ہوتا ہے اوران کا کوئی ریوڑ تھوڑا ہوتا ہے۔ اور تفاوت اس میں بہت ہوتا ہے۔ اس لئے کہ بکریوں کا پالنا آسان ہے۔ اور ہرکوئی پالتا ہے حسب سہولت۔ پس متعین کیا نبی ﷺ نے سب سے چھوٹے ریوڑ کو چالیس کے ذریعہ اور بڑے ریوڑ کو تین چالیسوں کے ذریعہ۔ پھر مقرر کی ہرسو میں ایک بکری۔ حساب میں آسانی کرنے کے لئے۔

(۵) اور گایوں اور بھینسوں میں معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت ہوا ہے: ہرتیس میں: ایک سالہ نر یا مادہ بچہ۔ اور ہر چالیس میں: دوسالہ نر یا مادہ بچہ۔ اور وہ بات اس لئے ہے کہ ابقار: اونٹوں اور بکریوں کے درمیان کے جانور ہیں۔ پس ملحوظ رکھی گئی ان میں یعنی ان کے ریوڑ بنانے میں دونوں کی مشابہت۔

(۶) اور نیز یہ بات بھی درجہ شہرت تک پہنچی ہوئی ہے کہ چاندی کی زکوٰۃ چالیسواں ہے۔ پس اگر نہ ہوں مگر ایک سو نوے درہم تو ان میں کچھ نہیں۔ اور وہ بات یعنی ڈھائی فیصد زکوٰۃ اس لئے ہے کہ خزانے نفیس ترین مال ہیں۔ نقصان پہنچتا ہے لوگوں کو ان میں سے بہت مقدار خرچ کرنے سے۔ پس اس کی زکوٰۃ کے حق میں سے یہ بات ہے کہ وہ تمام زکاتوں میں سب سے ہلکی ہو —— اور سونا: چاندی پر محمول ہے۔ اور اس زمانہ میں دینار کی تبدیلی دس درہم کے ساتھ تھی پس سونے کا نصاب بیس مثقال ہوا۔

☆ ☆ ☆

زمین کی پیداوار میں دس فیصد یا پانچ فیصد لگان کی وجہ

حدیث —— حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس پیداوار میں جس کو بارش اور چشموں نے سینچا ہے، یا وہ پانی کے قُرب کی وجہ سے سینچائی کے بغیر پکتی ہے: دسواں حصہ ہے۔ اور اس پیداوار میں جو پانی بردار اونٹنی کے ذریعہ سینچی گئی ہے: بیسواں حصہ یعنی پانچ فیصد ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۹۷)

تشریح: کنوز (سونے، چاندی اور کرنسی) میں نُماء (بڑھوتری) محض تقدیری ہے یعنی مان لی گئی ہے۔ اور تجارت میں نفع کے پیچھے محنت درکار ہوتی ہے، اس لئے ان میں زکوٰۃ ڈھائی فیصد رکھی گئی ہے۔ اور کھیتوں اور باغوں کی پیداوار اللہ کے فضل سے بہت ہوتی ہے، اس لئے اس میں زکوٰۃ زیادہ رکھی گئی ہے۔ پھر جس پیداوار میں محنت درکار ہوتی ہے یا اس کی سینچائی پر خرچ آتا ہے، اس کو وضع کرنے کے بعد فصل کم رہ جاتی ہے، اس لئے اس میں پانچ فیصد فریضہ مقرر کیا گیا ہے۔ اور جو محاصل بے محنت حاصل ہوتے ہیں، وہ زیادہ ہوتے ہیں، اس لئے ان میں دس فیصد عُشر تجویز کیا گیا ہے۔

[۷] وفيما سَقَتِ السماءُ والعيونُ، أو كان عَثَرِيًّا: العُشر، وفيما سُقِيَ بالنضح: نصفُ العشر، فإن الذى هو أقلُّ تعانيا وأكثرُ رَيْعًا أحقُّ بزيادة الضريبة؛ والذى هو أكثر تعانيا وأقل رَيْعًا أحقُّ بتخفيفها.

ترجمہ: (۷) اور کھیتوں اور باغوں کی اس پیداوار میں جس کو بارش اور چشموں نے سیراب کیا ہے یا وہ سیرابی میں خودکفیل ہے: دسواں حصہ ہے۔ اور اس میں جو سیراب کی گئی ہے پانی بردار اونٹنی کے ذریعہ: دسویں کا آدھا (پانچ فیصد) ہے۔ پس بیشک وہ پیداوار جو مشقت کے اعتبار سے کم ہے اور پیداوار کے اعتبار سے زیادہ ہے: وہ لگان کی زیادتی کی زیادہ حقدار ہے۔ اور جو مشقت کے اعتبار سے زیادہ ہے اور پیداوار کے اعتبار سے کم ہے: زکوٰۃ کو ہلکا کرنے کی زیادہ حقدار ہے۔

لغات: العَثَرِىّ: الأشجار التى تكون على شط الماء، وتَشْرَب بعروقها الماءَ، من غير حاجة إلى السَّقْيِ (معارف السنن ۵: ۲۳۵) ...... نَضَحَ (ف ض) نَضْحًا البعير الماءَ: کھیت یا باغ میں ڈالنے کے لئے نہر یا کنویں سے پانی لانا۔ الناضِح: اونٹ جس پر سیراب کرنے کے لئے پانی لایا جائے ...... تَعَانَى الأمْرَ: تکلیف اٹھانا، مشقت برداشت کرنا ...... الرَّيع: ہر چیز کی زیادتی۔ کہا جاتا ہے: ليس له رَيْع: اس کے لئے پیداوار نہیں۔

☆ ☆ ☆

خَرص کرنے اور اس میں سے گھٹا کر عشر لینے کی وجہ

حدیث ـــــ حضرت سہل بن ابی حَثمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے: ''جب تم اندازہ کرو، تو لو، اور تہائی چھوڑو، پس اگر تہائی نہ چھوڑو تو چوتھائی چھوڑو'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۰۵)

تشریح: خَرص کے معنی ہیں: کھیتی اور پھلوں کا اندازہ کرنا۔ جب کھیتی اور پھل آفات سے محفوظ ہوجائیں اور ابھی کھانے کے قابل نہ ہوئے ہوں، اس وقت حکومت آدمی بھیجے، جو پیداوار کا تخمینہ لگا کر اندازہ کرلے۔ پھر جب غلہ سوکھ کر تیار ہوجائے، کھجوریں چھوہارے بن جائیں اور انگور کشمش منقّی بن جائیں تو کارندے پہنچ کر اندراج کے مطابق زکوٰۃ وصول

کریں۔البتہ تہائی یا کم از کم چوتھائی کم کر کے باقی کی زکوٰۃ وصول کریں۔

اور تخمینہ کرنے میں حکمت یہ ہے کہ اربابِ زراعت آزاد ہو جائیں، جس طرح چاہیں کھائیں کھلائیں اور زکوٰۃ وصول کرنے والے بھی بے فکر ہو جائیں، اب ان کو پیداوار کی نگرانی کی مشقت نہیں اٹھانی پڑے گی ——— اور تہائی یا چوتھائی کم کر کے زکوٰۃ وصول کرنے میں حکمت یہ ہے کہ اندازہ غلط بھی ہوسکتا ہے اور چرند و پرند اور چور چکار نقصان بھی کر سکتے ہیں، اس لئے کچھ کم کر کے زکوٰۃ لینا قرینِ انصاف ہے۔

فائدہ: (۱) قابلِ زکوٰۃ غلّوں اور پھلوں کا خرص تو حضرت عتّاب بن اُسید رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۰۴) مگر تہائی یا چوتھائی کم کر کے زکوٰۃ لینے میں اختلاف ہے۔امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی کا قولِ جدید یہ ہے کہ پوری پیداوار کی زکوٰۃ لی جائے گی۔کچھ کم نہیں کیا جائے گا (مظاہر حق) کیونکہ عُشر: غریبوں کا حق ہے۔حکومت کو اس میں سے کم کرنے کا اختیار نہیں۔اور حضرت سہل رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث زکوٰۃ سے متعلق نہیں ہے۔بلکہ خیبر کے یہود کے ساتھ جو مزارعت اور مساقات کا معاملہ تھا، اس سے متعلق ہے۔وہ زمین کے مالکان کا حق تھا، جسے وہ چھوڑ سکتے تھے۔واللہ اعلم۔

فائدہ: (۲) خرص لازم ہے یا محض احتیاط ہے؟ یعنی زکوٰۃ خرص کے مطابق ہی لی جائے گی، خواہ اتنی پیداوار نہ ہوئی ہو، یا جو واقعی پیداوار ہوگی اس کی زکوٰۃ لی جائے گی؟ احناف کے نزدیک خرص لازم نہیں۔کیونکہ تخمینہ اور اندراج دونوں میں غلطی کا احتمال ہے اور زمین کے محاصل پر ناگہانی آفات: سیلاب اُولے وغیرہ بھی پڑ سکتے ہیں۔پس شہادت سے جو پیداوار ثابت ہوگی اسی کی زکوٰۃ لی جائے گی۔خرص کا اعتبار نہیں (یہی بات اس طرح مشہور ہوگئی ہے کہ احناف خرص کے قائل نہیں)

اموالِ تجارت اور کرنسی کا نصاب

جو چیزیں بیچنے خریدنے کے لئے ہیں ان کا نصاب چاندی کے نصاب کی مالیت ہے یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے بقدر سامانِ تجارت ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب ہے، اس سے کم ہو تو زکوٰۃ نہیں۔کیونکہ اس کا یہی معیار ہوسکتا ہے۔اس کی کوئی اور میزان نہیں ہوسکتی۔پس وہ چاندی کے نصاب پر محمول ہے۔

فائدہ: اب سونا چاندی بطور زرِ مبادلہ مستعمل نہیں۔ان کی جگہ بنک نوٹ (کرنسی) نے لے لی ہے۔اور مختلف ملکوں میں رائج کرنسیاں دو قسم کی ہیں: بعض چاندی کی نمائندگی کرتی ہیں جیسے ریال، درہم اور روپیہ۔اور بعض سونے کی نمائندگی کرتی ہیں۔جیسے کویت کا دینار اور برطانیہ کا پاؤنڈ۔پس جو کرنسی جس زر کی نمائندگی کرتی ہے اسی کے نصاب کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا۔اور اس ملک کے تجارتی سامان میں بھی اسی نصاب کی قیمت کا اعتبار رہوگا۔اور اگر کسی کی ملکیت میں چند ملکوں کی کرنسیاں ہوں تو جس نصاب کی قیمت کم ہے اس کا اعتبار رہوگا۔

اور سونا چاندی، کرنسی اور سامانِ تجارت میں انضمام ہوگا یعنی اگر ہر ایک کی تھوڑی تھوڑی مقدار ہے، تو قیمت لگا کر سب کو ملایا جائے گا۔ اگر وہ کم قیمت والے نصاب کے بقدر ہو جائیں تو زکوۃ واجب ہوگی۔

رکاز میں خُمس کی وجہ

ائمہ ثلاثہ معادِن (سونے چاندی کی کانیں) اور رکاز (زمانۂ جاہلیت کے دفینہ) میں فرق کرتے ہیں۔ اول میں زکوۃ واجب کرتے ہیں اور ثانی میں خمس۔ اور حنفیہ کے نزدیک دونوں کا حکم ایک ہے دونوں میں پانچواں حصہ واجب ہے۔ ان کے نزدیک دونوں رکاز ہیں۔ اول اللہ کا گاڑا ہوا مال ہے، اور ثانی لوگوں کا۔ اور دفائنِ اہل اسلام بالاتفاق بحکم لقطہ ہیں۔ شاہ صاحب خمس واجب ہونے کی وجہ بیان فرماتے ہیں:

رِکاز یعنی زمانۂ جاہلیت کا یا بہت قدیم زمانہ کے لوگوں کا دفن کیا ہوا مال: اگر کسی کے ہاتھ لگے تو اس میں سے حکومت پانچواں حصہ لے گی اور مصارفِ غنیمت میں خرچ کرے گی۔ کیونکہ یہ دفینہ ایک اعتبار سے مالِ غنیمت ہے یعنی چونکہ مسلمانوں نے وہ ملک لڑ کر فتح کیا ہے، اس لئے اس کی ہر چیز غنیمت ہے۔ نیز یہ مال مفت ہاتھ لگا ہے، اس لئے اس میں سے زیادہ دینا بار نہیں ہوگا۔ اس لئے اس کی زکوۃ خمس مقرر کی گئی ہے۔

[٨] قوله صلى الله عليه وسلم في الْخَرْص: ''دَعُوا الثُّلث، فإن لم تدعوا الثلثَ فدعوا الربع''

أقول: السر في مشروعية الخرص دفعُ الحرج عن أهل الزِّراعة، فإنهم يريدون أن يأكلوا بُسْرًا وَرُطَبًا، وعنبًا: وَنِيًّا ونضيجًا؛ وعن المُصَدِّقِين: لأنهم لايطيقون الحفظَ عن أهلها إلا بشق الأنفس.

ولما كان الخرصُ محلَّ الشبهة، والزكاةُ من حقّها التخفيف، أمر بترك الثلث، أو الربع.

والذي يُعَدُّ للبيع لايكون له ميزان إلا القيمة، فوجب أن يُحمل على زكاة النقد.

وفي الركاز الخمس، لأنه يُشْبِهُ الغنيمةَ من وجه، ويشبه المجَّان، فجعلت زكاتُه خُمسا.

ترجمہ: (٨) خرص کے سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''چھوڑو تم تہائی۔ پس اگر نہ چھوڑو تہائی تو چھوڑو چوتھائی''

میں کہتا ہوں: خرص کی مشروعیت میں حکمت اربابِ زراعت سے تنگی کو ہٹانا ہے۔ پس بیشک وہ چاہیں گے کہ کھائیں گدر کھجور اور پختہ تازہ کھجور۔ اور (کھائیں وہ) انگور: کالے انگور یعنی نیم پکے ہوئے اور پکے ہوئے۔ اور (تنگی ہٹانا ہے) زکوۃ وصول کرنے والوں سے۔ اس لئے کہ وہ طاقت نہیں رکھتے کھیتی والوں (کی دستبرد) سے حفاظت کی مگر جان کو مشقت میں ڈال کر ——— اور جب اندازہ کرنا شبہ کا محل تھا یعنی اس میں غلطی کا احتمال تھا۔ اور زکوۃ کے حق میں سے تخفیف تھی یعنی زکوۃ کے معاملہ میں آسانی ملحوظ رکھی گئی ہے، تو تہائی یا چوتھائی کے چھوڑنے کا حکم دیا۔

اور وہ سامان جو تیار کیا جاتا ہے خرید وفروخت کے لئے، اس کے لئے قیمت کے علاوہ کوئی معیار نہیں ہوسکتا۔ پس ضروری ہوا کہ وہ محمول کیا جائے نقد کی زکوٰۃ پر ـــــ اور رکاز میں پانچواں حصہ ہے، کیونکہ وہ ایک اعتبار سے غنیمت کے مشابہ ہے اور مفت ملی ہوئی چیز کے مشابہ ہے۔ پس اس کی زکوٰۃ پانچواں حصہ مقرر کی گئی۔

تصحیح: وَنِیًّا مطبوعہ نسخہ میں و نیئًا تھا۔ یہ تصحیف ہے۔ یہ تصحیح تینوں مخطوطوں سے کی گئی ہے۔ الوَنٰی کے معنی ہیں کالا انگور یعنی نیم پختہ۔

☆ ☆ ☆

صدقۃ الفطر ایک صاع مقرر کرنے کی وجہ

حدیث ـــــ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: ''رسول اللہ ﷺ نے روزے ختم کرنے کی زکوٰۃ (پاکیزگی) کھجور یا جو کا ایک صاع مقرر کی: غلام، آزاد، مرد، عورت، چھوٹے اور بڑے پر جو مسلمانوں میں سے ہوں۔ اور صدقۃ الفطر کے بارے میں حکم دیا کہ اس کو عید کی نماز کے لئے لوگوں کے نکلنے سے پہلے ادا کیا جائے'' (مشکوٰۃ ۱۸۱۵)

اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: ''یا اَقِط (سوکھا ہوا دودھ) کا ایک صاع یا خشک انگور کا ایک صاع'' (مشکوٰۃ ۱۸۱۶)

تشریح: ایک صاع کا وزن احناف کے نزدیک: تین کلو ایک سواڑتالیس گرام ہے۔ اور ائمۂ ثلاثہ کے نزدیک: دو کلو ایک سو بہتر گرام ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ اس دوسری مقدار کی حکمت بیان کرتے ہیں۔

صدقۃ الفطر: ایک صاع مقرر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مقدار ایک چھوٹے کنبے کے ایک دن کے گذارے کے لئے کافی ہے۔ پس اتنی مقدار سے ایک مسکین کی حاجت پورے طور پر رفع ہوجاتی ہے۔ اور اتنی مقدار خرچ کرنے سے عام طور پر کسی کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔ (اور ''عید کی نماز کے لئے لوگوں کے نکلنے سے پہلے'' میں اشارہ ہے کہ اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ کی طرح صدقۃ الفطر: حکومت جبراً وصول نہیں کرے گی۔ البتہ لوگ اپنی مرضی سے حکومت کے بیت المال میں جمع کریں تو لے لیا جائے گا)

گندم کا نصف صاع مقرر کرنے کی وجہ

گندم: دورِ اول میں گراں تھا۔ امراء ہی اس کو کھاتے تھے۔ مساکین کو وہ نصیب نہیں ہوتا تھا۔ خاندانِ بنو اُبیرق کے بشیر نامی منافق نے جو چوری کی تھی اس واقعہ میں حضرت قتادہ بن النعمان رضی اللہ عنہ نے یہ بات بیان کی ہے کہ جب شام سے کوئی تاجر میدہ لاتا تو متمول آدمی اس کو خرید لیتا، اور اپنے لئے خاص کر لیتا۔ اور بال بچے کھجور اور جو کھاتے (ترمذی ۲:۱۲۸ کتاب التفسیر، تفسیر سورۂ نساء) چنانچہ بعض روایات میں نصف صاع گندم کو ایک صاع جو پر محمول کیا گیا ہے یعنی اس

زمانہ میں نصف صاع گندم کی قیمت: ایک صاع جَو کی قیمت کے برابر ہوتی تھی، اس لئے نصف صاع گندم: صدقۃ الفطر میں نکالنا کافی قرار دیا گیا۔ مگر بعد میں گندم سستا ہو گیا، پس اس کا بھی ایک ہی صاع نکالنا چاہئے۔ جیسے کپڑوں میں تنگی تھی تو ایک کپڑے میں نماز کو جائز قرار دیا تھا۔ مگر جب اللہ نے کپڑوں میں گنجائش کردی تو حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ تم بھی گنجائش کرو یعنی اب دو کپڑوں میں نماز پڑھو۔ یہی افضل ہے۔ اسی طرح جب گندم سستا ہو گیا تو اس کا بھی ایک صاع نکالنا چاہئے۔

صدقۃ الفطر کی ادائیگی کے لئے یوم الفطر کی تعیین کی وجہ

صدقۃ الفطر کی ادائیگی کے لئے یوم الفطر کی تعیین دو وجہ سے کی گئی ہے:

پہلی وجہ: یوم الفطر کو صدقۃ ادا کرنے سے ایک اسلامی شعار کی تکمیل ہوتی ہے یعنی عید الفطر خوشی کی ایک اسلامی تقریب ہے۔ اس میں دوگانۂ عید ادا کیا جاتا ہے۔ پس اس کی شان اسی وقت بلند ہو سکتی ہے جب ہر مسلمان اس تقریب میں شریک ہو۔ اور یہ بات اسی وقت ممکن ہے کہ مساکین اس دن فکر معاش سے فارغ ہوں۔ اس لئے یوم الفطر کو فطرہ ادا کرنے کا حکم دیا گیا تا کہ غرباء فارغ البال ہو کر خوشی خوشی فریضۂ عید کی ادائیگی میں شریک ہوں۔

دوسری وجہ: یوم الفطر میں صدقہ کرنے سے روزے داروں کی تطہیر اور روزوں کی تکمیل مقصود ہے یعنی روزوں میں جو بے ہودہ باتیں اور برا کلام صادر ہو گیا ہے، اس کا گناہ صدقہ سے دُھل جاتا ہے۔ اور اس کی نظیر نمازوں میں سنن مؤکدہ ہیں۔ ان سے بھی نماز کی تکمیل ہوتی ہے۔

فائدہ: یہ دونوں وجوہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے ماخوذ ہیں۔ آپ نے فرمایا ہے: فَرَضَ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زکٰوةَ الفطر طُهْرَ الصِّیام من اللغو والرفث، وطُعْمَةً للمساکین یعنی رسول اللہ ﷺ نے صدقۃ الفطر بے ہودہ بات اور برے کلام سے روزوں کو پاک کرنے کے لئے اور مساکین کو کھلانے کے لئے لازم کیا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۱۸)

زیورات کی زکوٰۃ بھی احتیاطاً نکالنی چاہئے

امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کے نزدیک عورتوں کے استعمال کے مباح زیورات میں زکوٰۃ واجب نہیں اور حنفیہ کے نزدیک واجب ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زیورات کی زکوٰۃ میں روایات متعارض ہیں: بعض سے وجوب ثابت ہوتا ہے، بعض سے عدم وجوب۔ اور زیورات پر کنز (خزانہ) کا اطلاق مستبعد ہے۔ کیونکہ کنز: ذخیرہ کئے ہوئے مال کو کہتے ہیں، اور زیورات استعمال کئے جاتے ہیں۔ ذخیرہ کر کے نہیں رکھے جاتے۔ پس وہ ﴿اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ﴾ میں شامل نہیں البتہ زیورات میں کنز کے معنی پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ سونے چاندی

کے ہوتے ہیں۔ اور سونا چاندی ثمن خلقی ہیں۔ اس لئے احتیاط کی بات یہ ہے کہ ان کی زکوۃ نکالی جائے۔ اس لئے کہ اختلاف سے بچنا مستحب ہے۔

فائدہ: زیورات کی زکوۃ کے سلسلہ میں مرفوع روایات میں تو کوئی خاص تعارض نہیں۔ کیونکہ عدم وجوب کی صرف ایک مرفوع روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: ''زیورات میں زکوۃ نہیں'' مگر بیہقی نے معرفۃ السنن میں فرمایا ہے کہ یہ روایت باطل ہے، اس کی کچھ اصل نہیں۔ اور وجوب زکوۃ کی زیلعی رحمہ اللہ نے سات روایتیں ذکر کی ہیں۔ ان میں سے ایک روایت میں جو ابوداؤد میں ہے کوئی خاص کلام نہیں۔ باقی روایات میں کلام ہے۔ مگر سب مل کر قوت حاصل کرلیتی ہیں۔ البتہ صحابہ میں اختلاف تھا۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پانچ صحابہ سے عدم وجوب کا قول ثابت ہے (مغنی ٢: ٦٠٦) یعنی حضرت انس، حضرت جابر، حضرت ابن عمر، حضرت عائشہ اور حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین (نصب الرایہ ٢: ٣٧٥) مذکورہ اصحاب خمسہ کے علاوہ تمام اکابر صحابہ وجوب کے قائل تھے۔ پس احتیاط زکوۃ نکالنے میں ہے۔

[٩] ''فرض رسول الله صلى الله عليه وسلم زكاةَ الفطر صاعًا من تمر، أو صاعًا من شعير: على العبد، والحر، والذكر والأنثى، والصغير والكبير: من المسلمين'' وفى رواية: ''أو صاعًا من أَقِطٍ أو صاعًا من زبيب''

وإنما قدَّر بالصاع: لأنه يُشبع أهلَ بيتٍ، ففيه غُنية معتدٌّ بها للفقير، ولا يتضرر الإنسان بإنفاق هذا القدر غالباً، وحُمِلَ فى بعض الروايات: نصفُ صاع من قَمْح على صاع شعير: لأنه كان غالياً فى ذلك الزمان، لايأكله إلا أهلُ التنعُّم، ولم يكن من مَأْكل المساكينِ، بَيَّنه زيد بن أرقم فى قصة السرِقة، ثم قال على رضى الله عنه: ''إذا وَسَّعَ الله فوسِّعوا''

وإنما وقِّت بعيد الفطر لمعانٍ: منها: أنها تكمِّل كونَه من شعائر الله، وأن فيها طُهرةً للصائمين، وتكميلاً لصومهم بمنزلة سنن الرواتب فى الصلاة.

[١٠] وهل فى الْحُلِيِّ زكاةٌ؟ الأحاديث فيه متعارضةٌ، وإطلاق الكنز عليه بعيد، ومعنى الكنز حاصل، والخروج من الخلاف أحوطُ.

ترجمہ: (٩) ''مقرر کیا رسول اللہ ﷺ نے صدقۃ الفطر کھجور کا ایک صاع یا جَو کا ایک صاع: غلام، آزاد، مرد، عورت، چھوٹے (نابالغ) اور بڑے پر: درانحالیکہ وہ مسلمانوں میں سے ہو'' اور ایک روایت میں ہے: ''یا اَقِط کا ایک صاع یا خشک انگور کا ایک صاع''

اور صاع کے ذریعہ تقدیر اس لئے کی ہے کہ وہ ایک گھرانے کو شکم سیر کرتا ہے، پس اس میں فقیر کے لئے قابل لحاظ مالداری ہے۔ اور نہیں نقصان اٹھاتا انسان عام طور پر اتنی مقدار خرچ کرنے سے —— اور محمول کیا گیا ہے بعض روایات میں گندم کے نصف صاع کو جَو کے ایک صاع پر۔ اس لئے کہ گندم گراں تھا اس زمانہ میں۔ نہیں کھاتے تھے اس کو مگر خوش عیش لوگ۔ اور نہیں تھا وہ غریبوں کی خوراک میں سے۔ بیان کیا ہے اس کو زید بن ارقم نے چوری کے قصہ میں (زید بن ارقم کی روایت مجھے نہیں ملی) پھر فرمایا علی رضی اللہ عنہ نے: ''جب اللہ نے گنجائش کردی تو تم بھی گنجائش کرو'' (حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت بھی مجھے نہیں ملی)

اور نبی ﷺ نے متعین کیا (صدقۃ الفطر کو) عید الفطر کے ساتھ چند وجوہ سے: ان میں سے یہ ہے کہ صدقۃ الفطر مکمل کرتا ہے عید الفطر کے شعائر اللہ میں سے ہونے کو۔ اور یہ ہے کہ صدقۃ الفطر میں روزے داروں کے لئے پاکی ہے۔ اور ان کے روزوں کی تکمیل ہے۔ جیسے نماز میں سنن مؤکدہ۔

(۱۰) اور کیا زیورات میں زکوٰۃ ہے؟ احادیث اس میں متعارض ہیں۔ اور کنز کا اطلاق ان پر مستبعد ہے اور کنز کا مقصدان میں موجود ہے۔ اور اختلاف سے نکلنا زیادہ احتیاط کی بات ہے۔

باب —— ۴

مصارِف زکوٰۃ کا بیان

مصارف: مصرف کی جمع ہے۔ اردو میں اس کا تلفظ راء کے زبر کے ساتھ ہے۔ اور عربی میں یہ راء کے زیر کے ساتھ ہے۔ مصرِف: خرچ کرنے کی جگہ۔ مصارف زکوٰۃ کا بیان سورۃ التوبہ آیت ۶۰ میں ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس سے ماقبل کی دو آیتوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اس لئے تینوں آیتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

وَمِنْهُمْ مَنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ، فَإِنْ أُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا، وَإِنْ لَمْ يُعْطَوْا مِنْهَا إِذَاهُمْ يَسْخَطُوْنَ ۝ وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوْا مَا آتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ، وَقَالُوْا: حَسْبُنَا اللّٰهُ، سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ وَرَسُوْلُهُ، إِنَّا إِلَى اللّٰهِ رَاغِبُوْنَ ۝ إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسٰكِيْنِ، وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا، وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ، وَفِي الرِّقَابِ، وَالْغٰرِمِيْنَ، وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، وَابْنِ السَّبِيْلِ، فَرِيْضَةً مِنَ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ.

ترجمہ: اور بعضے منافقین صدقات (کی تقسیم) کے بارے میں آپؐ پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ پس اگر اس میں سے انہیں کچھ دیدیا جائے تو وہ خوش ہوجاتے ہیں۔ اور اگر اس میں سے انہیں کچھ نہ دیا جائے تو وہ اسی وقت بگڑنے لگتے ہیں۔ اور اگر وہ اُتنے پر راضی رہتے جو اللہ نے اور اس کے رسول نے ان کو دیا ہے اور وہ کہتے کہ اللہ ہمارے لئے کافی

ہے! عنقریب اللہ اپنے فضل سے اور اس کے رسول ہمیں اور بھی دیں گے بیشک ہم اللہ ہی کی طرف کو لگائے ہوئے ہیں (تو کیا اچھی بات ہوتی!)

خیراتوں کے حقدار تو صرف افلاس زدہ اور حاجت مند ہیں۔ اور وہ لوگ ہیں جو اس کی تحصیل پر مامور ہیں۔ اور وہ لوگ ہیں جن کی دلجوئی مقصود ہے۔ اور (اسے صرف کیا جائے) گردنوں (کو چھڑانے) میں اور بوجھ اٹھانے والوں (کی امداد) میں اور اللہ کے راستہ میں۔ اور راہ گیروں (کی اعانت) میں۔ یہ اللہ کی طرف سے طے شدہ امر ہے۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والے، بڑی حکمت والے ہیں۔

تفسیر: منافقوں کا ایک گروہ زکوٰۃ وصدقات کی تقسیم کے بارے میں رسول اللہ ﷺ پر نکتہ چینی کیا کرتا تھا۔ ابوالجواظ لوگوں میں کہتا پھرتا تھا: ''دیکھتے نہیں! آنجناب کیا کررہے ہیں! تمہاری خیراتیں چرواہوں کو بانٹ رہے ہیں اور خود کو منصِف بھی کہتے ہیں!'' (روح المعانی) ان لوگوں کو پہلی دو آیتوں میں لتاڑا گیا ہے۔ اور ان کو ادب اور ایمان کا تقاضا سمجھایا گیا ہے۔ پھر تیسری آیت میں ارشاد فرمایا ہے کہ خیراتوں میں دولت مندوں کا کوئی حصہ نہیں۔ وہ تو درج ذیل آٹھ مصارف میں خرچ کرنے کے لئے ہیں:

۱-:افلاس زدہ یعنی انتہائی تنگدست لوگ ۲-مساکین: یعنی وہ حاجت مند جن کے پاس بقدرِ ضرورت سامان نہیں ۳- سرکاری عملہ جو تحصیلِ صدقات پر مامور ہے ۴-: وہ لوگ جن کی تالیفِ قلب اور دلجوئی ملّی مصالح کے لئے منظور ہے ۵-: قیدیوں کی رہائی اور غلاموں کی گلوخلاصی میں ۶-: جن پر قومی نزاعات کے تصفیہ کے سلسلہ میں کوئی ایسا مالی بار آپڑا ہو جس کے برداشت کی ان میں طاقت نہ ہو یا وہ ذاتی مصارف کے سلسلہ میں زیرِ بار ہوگئے ہوں ۷- دین کی نصرت وحفاظت اور اللہ کا بول بالا کرنے کے لئے ۸-وہ مسافر جو راہ میں مدد کا محتاج ہوگیا ہو —— ان آٹھ مصارف میں زکوٰۃ خرچ کی جاسکتی ہے۔ اب حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی بات شروع کی جاتی ہے۔

ممالک کی قسمیں اور ان کی ضروریات کا نظم

مسلمانوں کے ممالک دو قسم کے ہیں:

ایک: وہ ممالک ہیں جن کے باشندے صرف مسلمان ہیں۔ دیگر اقوام کے ساتھ ان کا اختلاط نہیں۔ ایسے ممالک کا میزانیہ (بجٹ) ہلکا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ فوج جمع کرنے اور لڑائی کھڑی کرنے کے محتاج نہیں۔ رہے مفاد عامہ کے کام تو ان ممالک میں ایسے بہت سے حضرات ہوتے ہیں جو ان کاموں کو انجام دیتے ہیں۔ اور محض لوجہ اللہ وہ یہ کام انجام دیتے ہیں۔ اور ان کی اپنی آمدنی وافر مقدار میں ہوتی ہے جس سے وہ یہ کام بسہولت انجام دے سکتے ہیں۔ اور مسلمانوں کی جماعت کثیرہ کبھی ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہوتی۔

دوسرے: وہ ممالک ہیں جن میں دیگر ملّتوں کے لوگ بھی رہتے ہیں یعنی ان میں ذمّی رعایا بھی ہے۔ایسے ممالک کا نظام مضبوط ہونا چاہئے۔سورۃ الفتح آیت ۲۹ میں ہے کہ ''مسلمان: کافروں کے مقابلہ میں تیز ہیں اور آپس میں مہربان ہیں'' پس جہاں سبھی مسلمان ہیں وہاں تو شورش کا کوئی اندیشہ نہیں۔مگر دوسری قسم کے ممالک میں اس کا بہر حال خطرہ ہے۔اس لئے بھاری فوج اور طاقت ور پولس کا انتظام ضروری ہے۔نیز تقسیم کار بھی ضروری ہے یعنی ہر مفید کام کے لئے ایسے لوگوں کو مقرر کیا جائے جو اس کو بخوبی انجام دے سکیں۔اور ان کو حکومت کے فنڈ سے تنخواہ دی جائے۔اس لئے ایسے ملک کے مصارف زیادہ ہوتے ہیں۔

چنانچہ نبی ﷺ نے دونوں طرح کے ملکوں کے لئے مالیہ (Revenue) کا طریقہ مقرر کیا۔اور مصارف کا لحاظ کرکے لگان تجویز کیا۔دوسری قسم کے ملکوں کا جو انتظام کیا ہے اس کی تفصیل کتاب الجہاد میں آئے گی۔

اور پہلی قسم کے ممالک میں چونکہ دو طرح کے مصارف تھے۔اس لئے محاصل کی دو مدّات قائم کیں:

پہلی مدّ: ان اموال کی ہے جن کا کوئی مالک تھا مگر اب نہیں رہا۔جیسے کسی میت کا ترکہ جس کا کوئی وارث نہ ہو۔اور گم شدہ مویشی جن کا کوئی مالک نہ ہو۔اور گری پڑی چیزیں جو حکومت کے کارکنوں نے اٹھائی ہوں، اور ان کا مالک تلاش کیا گیا ہو، مگر کچھ پتہ نہ چلا ہو۔اور اسی طرح کے دیگر اموال (مثلاً وہ چیزیں جن کا شروع ہی سے کوئی مالک نہ ہو جیسے جنگلات کی لکڑیاں۔معدنیات، سمندری حیوانات، گیس اور تیل کے ذخائر وغیرہ۔اس مدّ سے مفاد عامہ کے ایسے کام انجام دینے چاہئیں جن میں تملیک کی ضرورت نہیں۔جیسے نہریں اُگارنا، پُل باندھنا، مساجد بنانا، کنویں اور چشمے کھودنا وغیرہ)

دوسری مد: زکوٰۃ وصدقات واجبہ کی ہے۔ان اموال میں تملیک ضروری ہے۔﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ﴾ الآیۃ میں اسی مد کے مصارف بیان کئے گئے ہیں۔اور جامع بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ان اموال کے مصارف اگرچہ بہت ہیں، مگر ان میں نہایت اہم تین مصارف ہیں:

پہلا مصرف: محتاج لوگ۔فقراء، مساکین، یتامی، مسافر اور مقروض اس زُمرہ میں آتے ہیں۔

دوسرا مصرف: حفاظتی عملہ۔مجاہدین اور زکوٰۃ کی وصولی پر مامور لوگ اس زمرہ میں آتے ہیں۔

تیسرا مصرف: مسلمانوں کے درمیان واقع ہونے والے فتنوں کو رفع دفع کرنے کے لئے یا غیر مسلموں کی طرف سے مسلمانوں کے حق میں متوقع ضرر کو ہٹانے کے لئے مال خرچ کرنا۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ کبھی مسلمانوں کے درمیان کوئی فتنہ پیدا ہوتا ہے اور جھگڑا نمٹانے کے لئے مال خرچ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔مثلاً کوئی قتل ہو گیا اور قاتل کا پتہ نہیں چلا اور مقتول کے ورثاء کو کسی پر قوی شبہ ہے مگر ثبوت کچھ نہیں۔اور فریقین میں ٹھن گئی تو قصہ نمٹانے کے لئے دیت ادا کرنی پڑتی ہے۔یہ دیت حکومت زکوٰۃ کی مدّ سے ادا کر سکتی ہے۔اسی طرح کبھی کوئی شخص دیت کا تاوان سر لیتا ہے اور وہ بذاتِ خود ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تو زکوٰۃ کے صیغہ سے اس کا تعاون کیا جا سکتا ہے۔عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ

کو خیبر میں کسی نے قتل کردیا تھا۔ ورثاء کو یہود پر شبہ تھا مگر ثبوت کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ فتنہ فرو کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ نے بیت المال سے ان کی دیت ادا فرمائی تھی (مشکوٰۃ حدیث ۳۵۳۱ باب القسامۃ) اور حضرت قبیصۃ بن مُخارق رضی اللہ عنہ نے ایک تاوان سر لیا تھا۔ اور وہ اس کی ادائیگی سے قاصر رہ گئے تھے تو آنحضرت ﷺ نے صدقہ کے مال سے ان کا تعاون فرمایا تھا (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۳۷ باب من لاتحل لہ المسألۃ إلخ کتاب الزکوٰۃ) تاوان سر لینے والا یہ شخص بھی غارم ہے۔ غَرِمَ الدینَ: قرض ادا کرنا اور غَرِمَ الحَمالۃَ: مالی ذمہ داری جو سر لی ہے اس کو ادا کرنا۔ غرض جو ذاتی ضروریات میں زیر بار ہو گیا ہو وہ بھی غارم ہے اور تاوان بھرنے والا بھی غارم ہے۔

اور کبھی غیر مسلموں کی طرف سے مسلمانوں کو کسی ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے۔ جس کی دو صورتیں ہوتی ہیں:

پہلی صورت: کچھ کمزور ایمان والے مسلمان کفار کی ہمنوائی کرنے لگتے ہیں۔ جس سے ان کو حوصلہ مل جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر ان کمزور ایمان والے مسلمانوں کو کچھ دیدیا جائے تو وہ کفار کی موافقت سے باز آجائیں گے اور اکیلے کفار مسلمانوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے ایسی صورت میں زکوٰۃ کی مدّ سے ان کو دیا جاسکتا ہے۔

دوسری صورت: کفار میں کھل کر مسلمانوں کے سامنے آنے کی تو ہمت نہیں۔ البتہ وہ کوئی خفیہ چال چلنا چاہتے ہیں جس سے مسلمانوں کو ضرر کا اندیشہ ہے پس زکوٰۃ میں سے ان کو کچھ دیکر ان کی چال کو پھیر دیا جائے تو یہ بھی جائز ہے۔

اور یہ دونوں صورتیں مؤلفۃ القلوب کے لفظ سے مراد لی گئی ہیں۔ مؤلفۃ اسم مفعول ہے اور قلوبُھم اس کا نائب فاعل ہے یعنی وہ لوگ جن کے دل جوڑے گئے یعنی وہ لوگ جن کے دلوں کو ملّی مفاد کے لئے مسلمانوں سے جوڑنا مقصود ہے۔ پہلی صورت میں کمزور ایمان والے مسلمانوں کو کفار سے توڑا گیا ہے اور مسلمانوں سے جوڑا گیا ہے۔ اور دوسری صورت میں کفار کو نرم کیا گیا ہے اور مسلمانوں سے جوڑا گیا ہے۔

نوٹ: شاہ صاحب رحمہ اللہ کی عبارت میں لفّ ونشر مشوّش ہے اور شرح میں مرتّب ہے کتاب سے تقریر ملاتے ہوئے اس کا خیال رکھا جائے۔

فائدہ: آیت میں مذکور مصارف ثمانیہ پر زکوٰۃ کس طرح تقسیم کی جائے؟ کس کو پہلے دیا جائے؟ اور کس کو کتنا دیا جائے؟ یہ باتیں سربراہ مملکت کی صوابدید پر موقوف ہیں۔

﴿المصارف﴾

الأصل فی المصارف: أن البلاد علی نوعین:

منها: ما خَلَص للمسلمین، لایشوبُهم أحدٌ من سائر الملل؛ ومن حقها: أن یُخَفَّفَ علیها، وهی لاتحتاج إلی جمع رجالٍ ونصبِ قتالٍ، وکثیرًا ما یخرج منها من یباشر الأعمال،

المشتركَ نفعُها، تصديقًا لما وعد الله من أجر المحسنين، وله كفافٌ فى خُوَيْصَّةِ مالِه، إذ الجماعاتُ الكثيرة من المسلمين لاتخلو من مثل ذلك.

ومنها: مافيه جماعاتٌ من أهل سائر الملل؛ ومن حقها: أن يُشدَّد فيها، وذلك قوله تعالى: ﴿أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ، رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ وهى تحتاج إلى جنود كثيرة وأعوانٍ قوية، وتحتاج إلى أن يُقَيَّضَ على كل عملٍ نافع من يباشره، ويكون معيشتُه فى بيت المال.

فجعل النبى صلى الله عليه وسلم لكلٍّ من هذين سنةً، وجعل الجِباية بحسب المصارف؛ وسيأتى مباحثُ الثانى فى كتاب الجهاد.

والبلادُ الخاصة بالمسلمين: عمدةُ مايتخلص فيها من المال نوعانِ بإزاء نوعين من المصرف:

نوع: هو المال الذى زالت عنه يدُ مالكِه، كتركة الميت لاوارث له، وضوالَّ من البهائم لامالك لها، ولقطةٍ أخذها أعوانُ بيت المال وعُرِّفَتْ فلم يُعرف لمن هى؟ وأمثالُ ذلك؛ ومن حقه: أن يُصرف إلى المنافع المشتركة، مما ليس فيها تمليك لأحدٍ، ككَرْيِ الأنهار، وبناءِ القناطر والمساجد، وحفرِ الآبار والعيون، وأمثال ذلك.

ونوع: هو صدقات المسلمين، جُمعت فى بيت المال؛ ومن حقه: أن يُصرف إلى ما فيه تمليك لأحد، وفى ذلك قوله تعالى: ﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنِ﴾ الآيةَ.

والجملة فى ذلك: أن الحاجاتِ من هذا النوع وإن كانت كثيرةً جدًا، لكن العمدةَ فيها ثلاثة:

المحتاجون: وضبطهم الشارعُ بالفقراء والمساكينِ، واليتامى، وأبناءِ السبيل، والغارمين فى مصلحة أنفسهم.

والحفظة: وضبطهم بالغزاة، والعاملين على الجبايات.

والثالث: مالٌ يُصرف إلى دفع الفتن الواقعة بين المسلمين، أو المتوقعة عليهم من غيرهم. وذلك: إما أن يكون بمواطَأَةِ ضعيفِ النية فى الإسلام بالكفار، أو برد الكفار عما يريد من المكيدة: بالمال، ويَجمع ذلك أسمُ المؤلفة قلوبهم، أو المشاجراتِ بين المسلمين، وهو الغارِمُ فى حَمالة يتحَمَّلُها.

وكيفية التقسيم عليهم، وأنه بمن يُبدأ؟ وكم يُعطى؟ مفوَّضٌ إلى رأى الإمام.

ترجمہ: زکوٰۃ خرچ کرنے کی جگہیں: مصارف کے سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ ممالک دو قسم کے ہیں:

ان میں سے بعض: وہ ہیں جو مسلمانوں کے لئے خالص ہیں۔ دوسری اقوام میں سے کوئی ان کے ساتھ ملا ہوا نہیں

اور اس کے لئے سزاوار باتوں میں سے یہ ہے کہ ان پر بار ہلکا کیا جائے۔ اور وہ ممالک محتاج نہیں ہیں لوگوں کو جمع کرنے اور لڑائی کھڑی کرنے کے۔ اور بار ہا آگے آتے ہیں ان ممالک میں ایسے لوگ جو اختیار کرتے ہیں ایسے کام جن کا نفع مشترک ہے۔ (وہ یہ کام کرتے ہیں) اس ثواب کی تصدیق کرتے ہوئے جس کا اللہ تعالیٰ نے نیکو کاروں کے لئے وعدہ فرمایا ہے اور اس شخص کے لئے مستغنی کرنے والی آمدنی ہوتی ہے اس کے اپنے ذاتی مال میں یعنی وہ بڑا سرمایہ دار ہوتا ہے اور مفاد عامہ کے اس کام کو اکیلا کر سکتا ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کی جماعتِ کثیرہ ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہوتی یعنی تھوڑے لوگوں میں تو ممکن ہے کہ ایسے بڑے مالدار نہ ہوں مگر جس قوم کی تعداد کروڑوں ہو اس میں ایسے بڑے سرمایہ دار ضرور ہوتے ہیں۔

اور ان میں سے بعض: وہ ممالک ہیں جن میں دیگر ملتوں کو ماننے والوں کی جماعتیں ہوتی ہیں۔ اور ان کے لائق باتوں میں سے یہ ہے کہ سختی کی جائے ان ممالک میں۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''کفار پر سخت اور آپس میں مہربان'' اور وہ ممالک محتاج ہیں بھاری لشکر اور طاقت ور عملہ کے، اور اس بات کے بھی محتاج ہیں کہ ہر مفید کام پر اس شخص کو مقرر کیا جائے جو اس کو انجام دے۔ اور اس کا گذارہ بیت المال میں ہو۔

پس مقرر کیا نبی ﷺ نے ان دونوں میں سے ہر ایک ملک کے لئے ایک طریقہ۔ اور مقرر کیا محصول مصارف کے اعتبار سے۔ اور دوسری قسم کے ملکوں کے مباحث عنقریب کتاب الجہاد میں آئیں گے۔

اور وہ ممالک جو مسلمانوں کے ساتھ خاص ہیں: ان میں بہترین مال جو حاصل ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں، مصارف کی دو قسموں کے مقابلہ میں:

ایک نوع: وہ مال ہے جس سے اس کے مالک کا قبضہ ہٹ گیا ہے، جیسے میت کا وہ ترکہ جس کا کوئی وارث نہیں۔ اور وہ گم شدہ مویشی جن کا کوئی مالک نہیں۔ اور وہ گری پڑی چیز جس کو بیت المال کے کارندوں نے لے لیا اور ان کا مالک تلاش کیا گیا پس نہیں پتہ چلا کہ وہ کس کی ہے؟ اور اس قسم کے اموال۔ اور اس مال کے لائق باتوں میں سے یہ ہے کہ وہ خرچ کیا جائے مشترک منافع یعنی مفاد عامہ کے کاموں میں، ان منافع میں سے جن میں کسی کو مالک بنانا نہیں ہے۔ جیسے نہروں کی مٹی نکالنا اور پُل اور مساجد بنانا۔ اور کنویں اور چشمے کھودنا۔ اور ان کے مانند کام۔

اور دوسری نوع: مسلمانوں کی وہ خیراتیں ہیں جو بیت المال میں جمع کی گئی ہیں۔ اور اس کے لائق باتوں میں سے یہ ہے کہ وہ خرچ کی جائیں اس کام میں جس میں کسی کو مالک بنانا ہے۔ اور ان اموال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''زکاتیں صرف فقراء اور مساکین کے لئے ہیں'' آخر آیت تک۔

اور جامع بات: اس سلسلہ میں یہ ہے کہ اس نوع کی حاجتیں اگرچہ بہت ہی زیادہ ہیں، لیکن ان میں سے نہایت اہم تین ہیں۔ (اول) محتاج لوگ۔ اور منضبط کیا ان لوگوں کو شارع نے فقراء اور مساکین اور یتامی اور مسافرین اور

اپنی ضرورت کے لئے قرض لینے والوں کے ذریعہ۔ اور (دوم) محافظین۔اور منضبط کیا ان کو مجاہدین اور زکوۃ کی وصولی کا کام کرنے والوں کے ذریعہ (مجاہدین کا تذکرہ فی سبیل اللہ کے ذریعہ کیا ہے) اور سوم: وہ مال ہے جو خرچ کیا جاتا ہے ان فتنوں کو دور کرنے میں جو مسلمانوں کے درمیان واقع ہونے والے ہیں یا جو مسلمانوں کے خلاف متوقع ہیں غیر مسلموں کی طرف سے۔اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ یا تو ہوتا ہے وہ اندیشہ اسلام میں کمزور لوگوں کے موافقت کرنے کی وجہ سے کفار کے ساتھ۔یا مال کے ذریعہ کافر کو پھیرنے کے ذریعہ اس خفیہ چال سے جو وہ چلنا چاہتا ہے۔اور جمع کرتا ہے ان (دونوں صورتوں) کو "مؤلفۃ القلوب" کا لفظ۔یا مسلمانوں کے درمیان کے جھگڑوں کو (رفع کرنے میں وہ مال خرچ کیا جاتا ہے) اور وہ شخص تاوان سر لینے والا ہے کسی دیت میں جس کو وہ اٹھاتا ہے۔

اور اُن (مصارِف ثمانیہ) پر تقسیم کا طریقہ اور یہ بات کہ کس سے شروع کیا جائے؟ یا کتنا دیا جائے؟ سونپا ہوا ہے سربراہ کی رائے کی طرف۔

لغات: خلص (ن) خلوصًا: خالص ہونا۔تَخَلَّص: جدا ہونا۔یہاں بمعنی یتحَصَّل ہے...... شاب یشوب شوبًا: ملانا...... الکفاف من الرزق: گذارہ کے لائق اور لوگوں سے مستغنی کرنے والی روزی...... قَیَّض: مسلط کرنا...... مواطأۃ: موافقت...... حَمَالۃ: تاوان، دیت۔

ترکیب: المشاجراتِ کا عطف الفتن پر ہے...... بالمال متعلق ہے برد سے۔

تصحیح: والیتامی تینوں مخطوطوں سے بڑھایا ہے۔

☆ ☆ ☆

مصارفِ زکوۃ آٹھ میں منحصر ہیں؟

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں، کتاب الزکوۃ، باب نمبر ۴۹ میں درج ذیل روایات بیان کی ہیں:

روایت: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ زکوۃ کی رقم سے غلام خرید کر آزاد کرنا درست ہے۔اور زکوۃ کی رقم حج کرنے کے لئے بھی دی جاسکتی ہے۔

روایت: حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے ـــــ جو اکابر تابعین میں سے ہیں ـــــ مروی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی زکوۃ سے اپنے باپ کو خریدے تو درست ہے (اور باپ: خریدتے ہی خود بخود آزاد ہوجائے گا) اسی طرح زکوۃ مجاہدین پر بھی خرچ کی جاسکتی ہے۔اور جس نے حج نہیں کیا اس کو بھی دی جاسکتی ہے۔

پھر دونوں حضرات نے آیت کریمہ: ﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ﴾ آخر تک تلاوت کی۔اور فرمایا: "ان مصارف میں سے جس میں بھی آپ زکوۃ دیں کافی ہے"

روایت: حضرت ابولاس رضی اللہ عنہ نے ـــــ جن کا نام زیاد یا عبداللہ بن عَنَمَۃ ہے اور جن سے دو حدیثیں مروی ہیں ـــ فرمایا کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ کے اونٹوں پر حج کرنے کے لئے سوار کیا یعنی ملکیت کے طور پر سواریاں عطا فرمائیں۔

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ شریف کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا کام مکمل کر کے انھوں نے بتایا کہ تین شخصوں نے زکوٰۃ نہیں دی: ایک: ابن جمیل۔ دوسرے: حضرت عباسؓ اور تیسرے: حضرت خالد بن ولیدؓ۔ آپؐ نے فرمایا: ''ابن جمیل کو تو بس یہ بات ناپسند ہے کہ وہ کنگال تھا، اس نے مجھ سے دعا کرائی۔ اور اللہ نے اپنے فضل سے اس کو نواز دیا!'' یعنی اب اس کو اللہ کا حق دینا بھی بھاری معلوم ہوتا ہے۔ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا: ''میں ان سے دو سال کی پیشگی زکوٰۃ وصول کر چکا ہوں، پس وہ میرے ذمّے ہے!'' اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا: ''آپ لوگ (زکوٰۃ کا مطالبہ کر کے) خالد پر ظلم کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زِرہیں (فولاد کے جالی دار کُرتے جو لڑائی میں پہنے جاتے ہیں) اور سامانِ جنگ راہ خدا میں روک رکھا ہے'' یعنی اپنی زکوٰۃ کی رقم سے یہ سامان خرید کر مجاہدین کے لئے رکھ رکھا ہے۔

اس روایت سے دو باتیں ثابت ہوئیں:

ایک: یہ کہ زکوٰۃ میں استبدال جائز ہے، جبکہ وہ فقراء کے حق میں بہتر ہو۔ مجاہدین کو رقم دینے سے بہتر یہ ہے کہ ان کو زرہیں اور سامانِ جنگ خرید کر دیا جائے۔ کیونکہ رقم کبھی خرچ ہو جاتی ہے اور کبھی مجاہد کے لئے ہتھیاروں کی فراہمی مشکل ہوتی ہے۔ اس لئے حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اپنی زکوٰۃ کی رقم سے یہ سامان خرید کر رکھ رکھا تھا۔

دوسری: یہ کہ مالِ زکوٰۃ کی تملیک ضروری نہیں۔ اس کا سامان خرید کر رکھ لیا جائے اور مجاہدین کو استعمال کے لئے دیا جائے اور جنگ ختم ہونے پر واپس لے لیا جائے تو یہ بھی درست ہے۔

اور آیت کریمہ میں **إِنَّمَا** کے ذریعہ جو حصر کیا گیا ہے: وہ حصر اضافی ہے، حقیقی نہیں۔ اگر حصر حقیقی ہوتا تو مصارفِ زکوٰۃ آٹھ میں منحصر ہوتے۔ اور حصر اضافی کا قرینہ ماقبل کی آیت ہے۔ منافقین نے زکوٰۃ کی تقسیم کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ پر نکتہ چینی کی تھی کہ چرواہوں کو دیتے ہیں اور ہمیں نہیں دیتے۔ حالانکہ چرواہے عام طور پر غریب ہوتے ہیں اور منافقین مالدار تھے۔ اس لئے فرمایا کہ زکوٰۃ میں تمہارا حق نہیں۔ زکوٰۃ تو فقراء، مساکین وغیرہ ہی کے لئے ہے۔ پس یہ حصر منافقین کی خواہش کے اعتبار سے ہے۔ اور مصارف کے آٹھ میں منحصر نہ ہونے میں حکمت یہ ہے کہ ضرورتیں غیر محدود ہیں۔ اور جن ممالک میں صرف مسلمان بستے ہیں: وہاں بیت المال میں زکوٰۃ کے علاوہ بہت زیادہ مال نہیں ہوتا۔ پس دیگر ضروریات کہاں سے پوری کی جائیں گی؟ اس لئے مصارفِ زکوٰۃ میں توسّع ضروری ہے۔ تاکہ مملکت کی ہنگامی ضروریات زکوٰۃ سے پوری کی جاسکیں۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں!

فائدہ: شاہ صاحب قدس سرہ نے حصر کے اضافی ہونے کا جو قرینہ بیان فرمایا ہے، اس سے مضبوط دلیل حصر کے حقیقی ہونے کی موجود ہے۔ اور وہ حضرت زیاد بن حارث صُدائی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک شخص خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا۔ اس نے عرض کیا کہ مجھے مالِ زکوٰۃ میں سے کچھ دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا: إن الله لم يرضَ بحُكمِ نبي ولاغيره في الصدقات، حتى حَكم فيها هو، فجزَّأها ثمانيةَ أجزاء، فإن كنتَ من تلك الأجزاء أعطيتُك ترجمہ: اللہ تعالیٰ زکاتوں کی تقسیم میں نہ تو کسی نبی کے فیصلہ پر راضی ہوئے اور نہ کسی غیر نبی کے۔ بلکہ انھوں نے خود ہی حکم فرمایا اور زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان فرمائے۔ پس اگر تم اُن آٹھ میں سے ہو تو میں تم کو دوں (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۳۵) یہ حدیث حصر کے حقیقی ہونے کی صریح دلیل ہے۔

اور شاہ صاحب نے جو آثار اور جو حدیث ذکر فرمائی ہے وہ توسّع پر صراحۃً دلالت نہیں کرتی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اُن کو باب قول الله تعالىٰ: ﴿وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ کے ذیل میں بیان کیا ہے یعنی یہ سب صورتیں مذکورہ تین مصارف میں داخل ہیں۔ ان سے علحدہ نہیں مثلاً زکوٰۃ سے غلام خرید کر آزاد کرنے کو فی الرقاب میں اور حج کے لئے زکوٰۃ خرچ کرنے کو فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ میں داخل کیا ہے۔ اسی طرح حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جو مالِ زکوٰۃ سے اسباب جہاد خرید کر روک رکھا تھا۔ اس سے وقف کے طور پر روکنا اور مجاہدین کو عاریت پر دینا مراد نہیں۔ بلکہ ضرورت پیش آنے پر مجاہدین کو ملکیت کے طور پر دینے کے لئے رکھا تھا —— رہی مملکت کی ہنگامی ضروریات تو ان کو پورا کرنے کے اور بہت سے ذرائع ہیں۔ شاہ صاحب نے جو تین قلیل آمدنیاں ذکر کی ہیں ان پر انحصار نہیں۔ ہم نے اوپر اور بھی محاصل کا تذکرہ کیا ہے۔ بہرحال امت کا اجماع ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف آٹھ میں منحصر ہیں اور حصر حقیقی ہے۔ واللہ اعلم۔

وعن ابن عباس: يُعتق من زكاة ماله، ويُعطي في الحج، وعن الحسن مثلُه، ثم تلا: ﴿إنما الصدقات للفقراء﴾: في أيِّها أَعْطَيْتَ أَجْزَأَتْ. وعن أبي لاسٍ: حَمَلَنا النبيُّ صلى الله عليه وسلم على إبل الصدقة للحج. وفي الصحيح: "وأما خالدٌ: فإنكم تَظلمون خالدًا، قد احتبس أدراعَه وأَعْتُدَه في سبيل الله" وفيه شيئان: جوازُ أن يُعطِيَ مكانَ شيءٍ شيئًا، إذا كان أنفعَ للفقراء، وأن الحبسَ مُجْزِئٌ عن الصدقة.

قلت: وعلى هذا فالحصرُ في قوله تعالى: ﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ﴾ إضافي، بالنسبة إلى ما طلبه المنافقون من صرفها فيما يشتهون، على ما يقتضيه سياق الآية.

والسِّرُّ في ذلك: أن الحاجاتِ غيرُ محصورة، وليس في بيت المال في البلاد الخاصة للمسلمين غيرَ الزكاة كثيرُ مالٍ، فلا بد من توسِعَةٍ، لتكفي نوائبَ المدينة. والله أعلم.

ترجمہ: اور ابن عباس سے مروی ہے: ''آزاد کرے وہ اپنے مال کی زکوٰۃ سے، اور دے وہ حج میں'' اور حسنؒ سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔ پھر پڑھا دونوں نے: ''صدقات صرف فقراء کے لئے ہیں'' (فرمایا دونوں نے) اُن (مصارفِ ثمانیہ) میں سے جس میں بھی دے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ اور ابو لاسؓ سے مروی ہے: سوار کیا ہم کو نبی ﷺ نے زکوٰۃ کے اونٹوں پر حج کرنے کے لئے (یہ تمام آثار امام بخاری رحمہ اللہ نے تعلیقاً ذکر کئے ہیں) اور صحیح بخاری میں ہے (یعنی یہ روایت سند کے ساتھ ہے:) ''اور رہے خالد: تو تم خالد پر ظلم کرتے ہو۔ تحقیق روک رکھی ہیں انھوں نے اپنی زِرہیں اور اپنا اسبابِ جنگ راہ خدا میں'' اور اس میں دو باتیں ہیں: (۱) اس بات کا جواز کہ دے زکوٰۃ ادا کرنے والا ایک چیز کی جگہ میں دوسری چیز، جبکہ وہ فقراء کے لئے زیادہ نافع ہو (۲) اور یہ کہ روکنا کافی ہونے والا ہے زکوٰۃ سے (قال العلامة السندي رحمه الله: الشيئ الأول يستفاد من اشتراء خالد رضي الله عنه الأدراع والأعتد بالنقد، يُقسم على فقراء الغزاة عند الحاجة. والثاني يستفاد من حبسه الأشياء المذكورة إلى وقت الضرورة اھ)

میں کہتا ہوں: اور اس پر یعنی مذکورہ روایات کے پیشِ نظر: پس حصر ارشاد باری تعالیٰ: ﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ﴾ میں اضافی ہے۔ اس چیز کی بہ نسبت ہے جس کو منافقین نے طلب کیا تھا یعنی اس کو خرچ کرنا اس جگہ میں جس کو وہ چاہتے تھے، اس طور پر جس کو آیت کا ماقبل چاہتا ہے۔

اور راز اس میں یہ ہے کہ ضرورتیں غیر محدود ہیں۔ اور نہیں ہے بیت المال میں ان ممالک میں جو مسلمانوں کے ساتھ خاص ہیں زکوٰۃ کے علاوہ زیادہ مال۔ پس ضروری ہے گنجائش پیدا کرنا، تاکہ زکوٰۃ کافی ہو جائے مملکت کی ہنگامی ضروریات کے لئے۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات: أَدْرَاع جمع ہے دِرْع کی ...... أَعْتُد جمع ہے عَتَاد کی: سامان جو کسی مقصد کے لئے تیار کیا جائے۔ یہاں سامانِ جنگ مراد ہے۔

☆ ☆ ☆

خاندانِ نبوت کے لئے حرمتِ صدقات کی تین وجوہ

حدیث ـــــ حضرت عبدالمطلب بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ زکاتیں لوگوں کا میل ہیں۔ وہ نہ محمد (ﷺ) کے لئے حلال ہیں اور نہ خاندانِ محمد (ﷺ) کے لئے'' (رواہ مسلم، مشکوٰۃ ۱۸۲۳)

تشریح: زکاتیں نبی ﷺ کے لئے اور آپؐ کے خاندان کے لئے حرام ہیں۔ اور حرمت کی تین وجوہ ہیں:

پہلی وجہ: اس حدیث میں یہ بیان کی گئی ہے کہ صدقات لوگوں کے میل ہیں۔ پس وہ آپؐ کے اور آپؐ کے خاندان کے لائق نہیں۔ اور وہ میل اس طرح ہیں کہ اُن سے صدقہ کرنے والوں کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ ان کے

ذریعہ بلائیں رفع ہوتی ہیں اور وہ لوگوں کی بلاؤں کا فدیہ (عوض) بن جاتے ہیں۔ اس لئے وہ ملأ اعلی کو بلائیں محسوس ہوتے ہیں۔ جیسے آگ کا ایک وجود خارجی ہے جو وجود حقیقی ہے، اس لئے وہ جلاتی ہے۔ اور جب ہم آگ کا تصور کرتے ہیں تو ذہن میں بھی وہی خارج میں پائی جانے والی آگ آتی ہے۔ اسی طرح جب ہم منہ سے لفظ ''آگ'' بولتے ہیں یا کاغذ پر لکھتے ہیں تو بھی اسی آگ کا تصور آتا ہے۔ یہ اس آگ کا وجود شبہی (مثل اور مانند وجود) ہے، اس لئے اس میں آثار نہیں پائے جاتے۔ ذہن، زبان اور کاغذ جل نہیں جاتے۔ اسی طرح ملأ اعلی کے احساسات میں صدقات بلائیں نظر آتے ہیں۔ یہ صدقات کا وجود شبہی ہے۔ چنانچہ ملأ اعلی زکاتوں میں تاریکی کا ادراک کرتے ہیں۔ پھر یہ علم ملأ سافل پر اترتا ہے۔ اور انسانوں میں جو صاحبِ کشف ہیں وہ بھی اس ظلمت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب ایسے ہی صاحب کشف بزرگ تھے۔ ان کو اس قسم کی چیزوں کا ادراک ہوتا تھا، اسی طرح منقول ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو وضوء کے غسالہ میں گناہ نظر آتے تھے۔ اور صالحین زنا لواطت جیسے گناہوں کا اور اعضائے مستورہ کا تذکرہ ناپسند کرتے ہیں۔ اور جب اللہ پاک کا نام لیا جاتا ہے تو وہ سراپا توقیر بن جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ اس نام پاک کے انوار محسوس کرتے ہیں۔ اور نبی ﷺ چونکہ اربابِ مکاشفہ کے سردار ہیں، اس لئے آپؐ پر ان اموال کی ظلمت منکشف ہوئی۔ اس لئے آپ نے صدقات کو اپنے لئے اور اپنے خاندان کے لئے حرام کردیا۔ (پس دوسرے باہمت لوگوں کو بھی حتی الامکان زکوٰۃ سے پرہیز کرنا چاہیئے، اگرچہ وہ زکوٰۃ کے مستحق ہوں)

دوسری وجہ: جو مال کسی چیز کے عوض میں لیا جاتا ہے یعنی خرید وفروخت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے یا کسی منفعت کے عوض میں ملتا ہے یعنی ملازمت یا اجارہ کے طور پر حاصل ہوتا ہے: اس میں تو کوئی خبث نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ ہماری چیز یا ہمارے نفع کا عوض ہے۔ پس کمائی کرنے کے بہترین ذرائع یہی ہیں۔ اسی طرح جو ہدیہ ملتا ہے وہ بھی طیّب ہے۔ کیونکہ اس میں مودّت ومحبت اور عزت واحترام کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ مگر ان کے علاوہ جو مال حاصل ہوتا ہے یعنی خیرات کے طور پر ملتا ہے اس کے لینے میں ذلّت واہانت ہے۔ اور دینے والے کی لینے والے پر برتری اور احسان کا پہلو بھی ہے۔ حدیث میں ہے کہ: ''اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے!'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۴۲) اس حدیث میں اسی برتری اور احسان کے پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ اس لئے مال حاصل کرنے کا یہ طریقہ بدترین ذریعہ مُعاش ہے۔ یہ پیشہ نہایت پاکیزہ لوگوں کے لائق نہیں۔ نہ اُن لوگوں کے شایانِ شان ہے جن کو ملت میں نہایت اہم مقام دیا گیا ہو یعنی یہ مال خاندانِ نبوت کے لئے جائز نہیں۔

تیسری وجہ: اگر آپ ﷺ اپنی ذات کے لئے زکوٰۃ لیتے یا اپنے خاندان کے لئے جائز قرار دیتے، جن کا فائدہ آپؐ ہی کا فائدہ ہے، تو اندیشہ تھا کہ بدگمانی کرنے والے آپؐ کی شان میں نازیبا بات کہتے۔ وہ طعن کرتے کہ اپنی عیش کوشی کے لئے لوگوں پر ٹیکس لگایا ہے۔ اس لئے آپؐ نے اس دروازہ کو بالکلیہ بند کردیا اور صاف اعلان کردیا کہ زکوٰۃ کی منفعت لوگوں ہی طرف لوٹنے والی ہے۔ فرمایا: **تُؤخذ من أغنيائهم، وتُرَدُّ على فقرائهم** یعنی زکوٰۃ ان کے

مالداروں سے لی جائے گی اوران کے فقیروں پر لوٹا دی جائے گی (بخاری حدیث ۱۴۵۸) اورزکوۃ کا یہ نظام فقراء پر مہربانی مساکین پر نوازش، حاجت مندوں کی خوش حالی اوران کو فلاکت سے بچانے کے لئے قائم کیا گیا ہے۔اس میں آپؐ کا اورآپؐ کے خاندان کا کچھ حصہ نہیں۔

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم:" إن هذه الصدقات إنما هي من أوساخ الناس، وإنها لاتحل لمحمد، ولا لآلِ محمد"

أقول: إنما كانت أوساخًا: لأنها تُكَفِّرُ الخطايا، وتدفع البلاء وتقع فداءً عن العبد في ذلك، فيتمثَّل في مدارِك الملأ الأعلى أنها هي، كما يتمثل في الصورة الذهنية واللفظية والخطِّية أنها وجوداتٌ للشيئ الخارجي الذي جُعلت بإزائه، وهذا يسمى عندنا بالوجود التشبيهي، فَيُدْرِك بعضُ النفوس العالية: أن فيها ظلمةً، وينزل الأمر إلى بعض الأحياز النازلة، وقد يُشاهِد أهلُ المكاشفة تلك الظلمة أيضًا، وكان سيدي الوالد- قُدِّسَ سِرُّه- يَحْكي ذلك من نفسه؛ كما قد يَكره أهلُ الصلاح ذكرَ الزنا، وذكرَ الأعضاء الخبيثة، ويحبون ذكرَ الأشياء الجميلة، ويعظِّمون اسْمَ الله.

وأيضًا: فإن المال الذي يأخذه الإنسان من غير مبادلةِ عينٍ أو نفع، ولايراد به احترامُ وجهه: فيه ذِلَّةٌ ومهانةٌ، ويكون لصاحب المال عليه فضلٌ ومِنَّةٌ، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" اليد العليا خير من اليد السفلى" فلا جرم أن التكسب بهذا النوع شر وجوه المكاسب، لايليق بالمطهرين، والمنَوَّهِ بهم في الملة.

وفي هذا الحكم سِرٌّ آخَرُ: وهو أنه صلى الله عليه وسلم إن أخذَها لنفسه، وجَوَّزَ أخذها لخاصته، والذي يكون نفعُهم بمنزلة نفعِه، كان مظِنَّةَ أن يَظُنَّ الظانون، ويقولَ القائلون في حقه: ماليس بحق، فأراد أن يَسُدَّ هذا الباب بالكلية، ويَجْهَرَ بأن منافعها راجعةٌ إليهم، وإنما تؤخذ من أغنيائهم، وترد على فقرائهم رحمةً بهم، وحدبًا عليهم، وتقريبًا لهم من الخير، وانقاذًا لهم من الشر.

ترجمہ:(۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:............ میں کہتا ہوں: صدقات میل اسی لئے ہیں کہ وہ گناہوں کو مٹاتے ہیں اور بلاؤں کو دور کرتے ہیں اور وہ فدیہ بن جاتے ہیں بندے کی طرف سے ان بلاؤں کا۔پس متمثل ہوتے ہیں ملأ اعلی کے حواس میں کہ وہ صدقات بلائیں ہیں۔جیسے متمثل ہوتی ہے صورت ذہنیہ،لفظیہ اورخطّیہ کہ وہ خارج میں پائی جانے والی چیز کے وہ وجودات ہیں جو اس چیز کے مقابلہ میں بنائے گئے ہیں۔اور ہماری اصطلاح میں یہ وجود شبہی کہلاتا ہے۔پس ادراک کرتے ہیں بعض نفوسِ عالیہ یعنی ملأ اعلی کہ ان زکاتوں میں تاریکی ہے۔اوراترتا ہے معاملہ یعنی یہ ادراک بعض

اماکنِ سافلہ کی طرف یعنی ملأ سافل کی طرف اور بعض بڑے لوگوں کی طرف اور کبھی اہل مکاشفہ بھی اس ظلمت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور میرے آقا والد ماجد قدس سرہ یہ بات اپنے بارے میں نقل کرتے تھے (اور) جیسا کہ کبھی ناپسند کرتے ہیں نیک لوگ زنا کے تذکرہ کو اور شرم والے اعضاء کے تذکرہ کو۔ اور پسند کرتے ہیں وہ خوبصورت چیزوں کے تذکرہ کو۔ اور توقیر کرتے ہیں وہ اللہ کے نام کی۔

اور نیز: پس بیشک وہ مال جس کو انسان لیتا ہے کسی چیز یا کسی نفع کے مبادلہ کے بغیر، اور نہیں ارادہ کیا جاتا اس مال کے دینے سے اس کے چہرے کے احترام کا: اس مال کے لینے میں ذلت واہانت ہے۔ اور ہوتی ہے مال دینے والے کے لئے اس پر برتری اور احسان۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے'' پس یہ بات یقینی ہے کہ اس طرح کمانا بدترین پیشہ ہے۔ وہ لائق نہیں ہے نہایت پاکیزہ لوگوں کے اور ان لوگوں کے لئے جن کی شان بلند کی گئی ہے ملتِ اسلامیہ میں۔

اور اس حکم میں ایک راز اور بھی ہے: اور وہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ: اگر لیتے زکوٰۃ اپنی ذات کے لئے اور جائز قرار دیتے اس کا لینا اپنے مخصوص لوگوں کے لئے اور ان لوگوں کے لئے جن کا فائدہ اپنے فائدہ کے بمنزلہ ہے، تو ہوگی یہ بات احتمالی جگہ اس کی کہ گمان کریں گمان کرنے والے اور کہنے والے کہیں آپؐ کی شان میں وہ بات جو برحق نہیں ہے۔ پس آپؐ نے چاہا کہ بند کردیں اس دروازہ کو بالکلیہ۔ اور پکار کر کہہ دیں کہ زکوٰۃ کے منافع انہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اور وہ ان کے مالداروں سے لی جائے گی، اور ان کے غریبوں کو لوٹا دی جائے گی۔ ان پر مہربانی کرتے ہوئے اور ان پر شفقت کرتے ہوئے اور ان کو خیر سے نزدیک کرتے ہوئے اور ان کو شر سے بچاتے ہوئے۔

☆ ☆ ☆

حرمتِ سوال کی وجہ اور اس کی سزاؤں کا راز

سخت مجبوری کے بغیر سوال کرنے کی ممانعت دو وجہ سے ہے:

پہلی وجہ ـــــ ذاتی ہے ـــــ اور وہ یہ ہے کہ سوال میں ذلّت کا سامان ہے۔ اس سے حیا کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ اور مروّت کو بٹّا لگتا ہے۔ اس لئے احادیث میں بے ضرورت مانگنے کی سخت ممانعت آئی ہے۔ حدیث میں ہے کہ: ''جو شخص مال بڑھانے کے لئے لوگوں سے مانگتا ہے، وہ اپنے لئے جہنم کا انگارہ ہی مانگتا ہے۔ پس چاہے مانگنے میں کمی کرے یا زیادتی'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۳۸)

دوسری وجہ ـــــ قومی ہے ـــــ اور وہ یہ ہے کہ جب بھیک مانگنے کا رواج چل پڑے گا۔ اور لوگوں کو مانگنے میں عار محسوس نہ ہوگا۔ اور گداگری ذریعۂ معاش بن جائے گی، تو پہلا نقصان یہ ہوگا کہ نہایت ضروری پیشے یا تو رائگاں ہو جائیں

گے یا ان میں کمی واقع ہوگی۔ کیونکہ جب روٹی ملے یوں تو کھیتی کرے کیوں؟ اور دوسرا نقصان یہ ہوگا کہ مانگنے والوں کی کثرت سے مالدار تنگ آجائیں گے، ان کی زندگی اجیرن بن جائے گی (جیسے آج کل رمضان میں بڑے شہروں میں بوگس مدارس کے لئے چندہ مانگنے والوں کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ ارباب خیر دیتے دیتے تنگ آجاتے ہیں)

اس لئے حکمتِ خداوندی نے چاہا کہ مانگنے کا عار قیامت کے دن مانگنے والے کی دونوں آنکھوں کے درمیان ظاہر ہو، تاکہ کوئی شخص ضرورتِ شدیدہ کے بغیر مانگنے کی ہمت نہ کرے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ''جو شخص اپنے مال میں اضافہ کے لئے لوگوں سے مانگتا ہے تو قیامت کے دن اس کا سوال اس کے چہرے پر ایک زخم کی شکل میں نمودار ہوگا۔ اور جہنم کا پتھر ہوگا جسے وہ کھائے گا پس جس کا جی چاہے سوال کم کرے اور جس کا جی چاہے زیادہ کرے'' (مشکوۃ حدیث ۱۸۵۰)

تشریح: مانگ کر لوگوں سے مال لینے کی سزا ایسی چیز کی صورت میں ظاہر ہوگی جس کے پکڑنے سے تکلیف ہوتی ہے جیسے چنگاری یا اس کا کھانا المناک ہوتا ہے جیسے گرم پتھر۔ اور سوال کی ذلت اور سائل کا لوگوں میں بے آب رُو ہونا ایسی صورت میں ظاہر ہوگا جو اس رسوائی کی قریب ترین شبیہ ہے یعنی چہرے کے زخم کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

البتہ سخت مجبوری میں بقدر کفاف سوال کرنا جائز ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت قبیصہ رضی اللہ عنہ نے ایک تاوان سر لیا تھا۔ وہ تعاون حاصل کرنے کے لئے خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا: ''قبیصہ! سوال تین ہی شخصوں کے لئے جائز ہے: ایک: جس نے کوئی تاوان سر لیا ہو۔ اس کے لئے بقدر ضرورت مانگنا جائز ہے۔ پھر رُک جائے۔ دوسرا: وہ شخص جسے کوئی آفت پہنچی ہو، جس نے اس کا مال ہلاک کر دیا ہو۔ اس کے لئے زندگی کے سہارے کے بقدر مانگنا جائز ہے۔ تیسرا: وہ شخص جو فاقہ زدہ ہے۔ اور اس کی قوم کے تین عقلمند آدمی کہیں کہ وہ واقعی فاقہ زدہ ہے تو اس کے لئے حاجت روائی کے بقدر مانگنا جائز ہے۔ ان تین صورتوں کے علاوہ مانگنا حرام کھانا ہے جسے مانگنے والا کھاتا ہے!'' (مشکوۃ حدیث ۱۸۳۷)

[۲] ولما كانت المسألةُ تعرُّضًا للذلّة، وخوضًا فى الوقاحة، وقدحًا فى المروء ة، شدَّد النبيُّ صلى الله عليه وسلم فيها، إلا لضرورة لايجد منها بدًا.

وأيضًا: إذا جرت العادة بها، ولم يَسْتَنْكِفِ الناسُ عنها، وصاروا يستكثرون أموالهم بها، كان ذلك سببًا لإهمال الأكساب التى لابد منها، أو تقليلها، وتضيُّقا على أهل الأموال بغير حق.

فاقتضت الحكمةُ أن يتمثَّل الاستنكاف منها بين أعينهم، لئلا يُقْدِمَ عليها أحدٌ، إلا عند الاضطرار.

[۳] قوله صلى الله عليه وسلم: ''من سأل الناسَ لِيُثْرِىَ مالَه، كان خُموشًا فى وجهه، أو رَضْفًا يأكله من جهنم''

أقول: السر فيه: أنه يتمثَّل تألُّمه مما يأخذه من الناس بصورة ماجرت العادةُ بأن يحصل

الألم بأخذه، كالجمر، أو بأكله كالرضف، وتتمثل ذلتُه في الناس، وذهابُ ماء وجهه، بصورة هي أقرب شبيه له من الخموش.

وجاء في الرجل الذي أصابته جائحة اجْتَاحَتْ مالَه: أنه حلت له المسألة حتى يجد قِوَامًا من عيش.

ترجمہ: (۲) اور جب سوال کرنا ذلت کے درپے ہونا اور بے شرمی میں گھسنا اور بھل منسائی میں عیب لگانا تھا تو نبی ﷺ نے سختی کی سوال کرنے کے سلسلہ میں، مگر کسی ایسی ضرورت کی وجہ سے کہ نہ پائے آدمی اس سے کوئی چارہ۔

اور نیز: جب چل پڑے گی مانگنے کی عادت۔ اور عار نہیں کریں گے لوگ مانگنے میں۔ اور بڑھانے لگیں گے لوگ اپنے مالوں کو مانگنے کے ذریعہ تو ہو جائے گی یہ بات اُن پیشوں کو رائگاں کرنے کا سبب جن کے بغیر چارہ نہیں۔ یا ان کی تقلیل کا سبب اور مالداروں پر ناحق تنگی کا باعث۔

پس چاہا حکمت خداوندی نے کہ مانگنے کا عار متمثل ہو مانگنے والوں کی آنکھوں کے درمیان، تاکہ اس پر کوئی شخص پیش قدمی نہ کرے مگر انتہائی مجبوری کے وقت۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد: .... میں کہتا ہوں: اس میں راز یہ ہے کہ اس کا دُکھی ہونا یعنی سزا پانا اس چیز سے جس کو وہ لوگوں سے لیتا ہے متمثل ہوگا اس چیز کی صورت میں کہ عادت جاری ہے کہ دُکھ پائے آدمی اس کو پکڑنے سے جیسے چنگاری یا اس کے کھانے سے جیسے گرم پتھر اور متمثل ہو لوگوں میں اس کی رسوائی اور اس کے چہرے کا بے آب ہونا اس صورت میں جو قریب ترین شبیہ ہے اس کی یعنی خراش۔

اور آیا ہے اس شخص کے حق میں جس کو کوئی ایسی آفت پہنچی ہو جس نے اس کے مال کو ہلاک کر دیا ہو کہ اس کے لئے سوال کرنا جائز ہے تا آنکہ وہ پائے زندگی کا سہارا۔

لغت: الرَّضْف: گرم پتھر: جس پر گوشت بھونتے ہیں اور اس کو دودھ میں ڈال کر دودھ بھی گرم کرتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

مال کی کتنی مقدار سوال کے لئے مانع ہے؟

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ مال کی وہ مقدار جس کے بعد آدمی دوسروں کا محتاج نہیں رہتا: پچاس درہم یا اس کے بقدر سونا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۴۷) اور قبیلۂ بنو اسد کے ایک صحابی یہ ارشاد نبوی روایت کرتے ہیں کہ: ''جس نے سوال کیا درانحالیکہ اس کے پاس ایک اُوقیہ (۴۰ درہم) یا اس کے برابر مال ہے تو اس نے لپٹ کر (بے جا اصرار کر کے) مانگا'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۴۹) اور حضرت سہل بن حنظلہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ

سے دریافت کیا گیا کہ مالداری کی وہ کیا مقدار ہے جس کے ساتھ سوال کرنا جائز نہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''اتنی مقدار جس سے دن کا اور رات کا کھانا کھا سکے یعنی ایک دن کا گذارہ ہو تو سوال کرنا درست نہیں (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۴۸)

تشریح: مذکورہ روایات میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے، مگر حقیقت میں کوئی تعارض نہیں۔ بلکہ وہ روایات اختلاف احوال واشخاص پر محمول ہیں۔ کیونکہ ہر شخص کا پیشہ جداگانہ ہے۔ اور جو شخص جو پیشہ کرتا ہے: اس کو تبدیل نہیں کرسکتا۔ یعنی پیشہ کی تبدیلی اس کے لئے سخت دشوار ہوتی ہے، اگرچہ ناممکن نہیں۔ مثلاً جو شخص پیشہ ور ہے۔ زرگر یا آہنگر ہے، وہ اس وقت تک مجبور ہے جب تک اس کو اپنے پیشہ کے آلات میسر نہ آجائیں۔ اور جو شخص کھیتی کرتا ہے وہ کھیتی کے آلات کا محتاج ہے۔ اور جو تاجر ہے اس کو پونجی کی ضرورت ہے۔ اور جو مجاہد ہے اور مال غنیمت سے اس کو صبح وشام کھانا ملتا ہے، جیسے صحابہ کو ملتا تھا، تو وہ غنیمت کا محتاج ہے۔ پس ایسے لوگوں کے لئے غِنا کی مقدار ایک اُوقیہ یا پچاس درہم ہے۔ جب مال کی اتنی مقدار حاصل ہوجائے تو وہ دوسروں کا دست نگر نہیں رہے گا۔ اور جو شخص بازار میں بوجھ ڈھو کر کمائی کرتا ہے یا جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا ہے اور بیچتا ہے یا دہاڑی پر کام کرتا ہے، اس کے لئے غِنا کی مقدار دن بھر گذارے کے بقدر مال ہے۔ ایسے بے نیاز کے لئے سوال کرنا ممنوع ہے۔

[٤] وجاء في تقدير الغُنية المانعة من السؤال: أنها أُوقية، أو خمسون درهمًا، وجاء أيضًا: أنها ما يُغَدِّيه أو يعشِّيه.

وهذه الأحاديث ليست متخالفةً عندنا: لأن الناس على منازِلَ شتّى، ولكل واحد كَسْبٌ لايمكن أن يتحوَّل عنه، أعني الإمكانَ المأخوذَ في العلوم الباحثة عن سياسة المدن، لاالمأخوذَ في علم تهذيب النفس؛ فمن كان كاسبًا بالحِرْفة: فهو معذور حتى يجد آلاتِ الحِرْفة، ومن كان زارِعًا: حتى يجد آلاتِ الزرع، ومن كان تاجرًا: حتى يجد البِضاعةَ، ومن كان على الجهاد مسترزقًا بمايروح ويغدو من الغنائم، كما كان أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم، فالضابط فيه: أوقية أو خمسون درهما؛ ومن كان كاسبًا بحمل الأثقال في الأسواق أو احتطابِ الحَطَب وبيعه، وأمثال ذلك، فالضابط فيه: ما يغدِّيه أو يعشيه.

ترجمہ: (۴) اور وارد ہوا ہے اُس غِنا (بے نیازی) کے اندازے میں جو سوال کرنے سے روکنے والا ہے کہ وہ ایک اُوقیہ یا پچاس درہم ہے۔ اور آیا ہے نیز کہ وہ اتنی مقدار ہے جو اس کو صبح کا کھانا کھلائے یا شام کا کھانا کھلائے۔

اور ہمارے نزدیک یہ حدیثیں متعارض نہیں ہیں۔ اس لئے کہ لوگ مختلف مدارج (مراتب) پر ہیں۔ اور ہر ایک کے لئے ایک ذریعۂ معاش ہے، ممکن نہیں کہ وہ اس میں تبدیلی کرلے۔ اور امکان سے میری مراد: وہ امکان ہے جو ان علوم میں

لیا گیا ہے جو بحث کرنے والے ہیں ملکی نظم ونسق سے، وہ امکان مرادنہیں جو لیا گیا ہے نفس کو سنوارنے کے علم میں یعنی علم تصوف میں۔ پس جو شخص کسی پیشہ کے ذریعہ کمائی کرتا ہے: وہ اس وقت تک معذور ہے کہ وہ اپنے پیشے کے آلات پائے۔ اور جو زراعت پیشہ ہے: وہ کھیتی کے آلات میسر آنے تک معذور ہے۔ اور جو شخص تاجر ہے: وہ پونجی بدست آنے تک مجبور ہے۔ اور جو شخص جہاد کرتا ہے، جو روزی طلب کرنے والا ہے اُن غنائم سے جو شام آتی ہیں اور صبح آتی ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ تھے (وہ مالِ غنیمت کا محتاج ہے) پس ضابطہ اس (صورت) میں ایک اوقیہ یا پچاس درہم ہے۔ اور جو شخص بازاروں میں بوجھ ڈھونے کے ذریعہ کمائی کرنے والا ہے یا سوختہ چننے اور اس کو بیچنے کے ذریعہ اور اس قسم کے کاموں کے ذریعہ (کمائی کرنے والا ہے) تو ضابطہ اس صورت میں: وہ مقدار ہے جو اس کو صبح کا کھانا کھلائے یا شام کا کھانا کھلائے۔

فائدہ: عدم امکان: مختلف فنون میں مختلف معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ منطق میں بمعنی امتناع ہے۔ علم تصوف میں ''تقریباً ممتنع'' کے معنی ہیں۔ اور سیاست مدنیہ اور عرف عام میں: بمعنی سخت دشوار ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے **لا یمکن** اسی آخری معنی میں استعمال کیا ہے یعنی پیشہ کی تبدیلی اگرچہ ممتنع یا ممتنع جیسی نہیں ہے مگر سخت دشوار ضرور ہے۔

☆ ☆ ☆

بڑوں کی خوشی اور ناخوشی بھی مقبول دعا کی طرح ہے

حدیث —— حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''(مجھ سے) لپٹ کر مت مانگو۔ قسم بخدا! تم میں سے جو بھی شخص مجھ سے (لپٹ کر) مانگے گا، پھر وہ مانگ کر اور مجھے تنگ کر کے کوئی چیز مجھ سے لے گا درانحالیکہ میں ناخوش ہوں۔ پھر میری دی ہوئی چیزوں میں اس کے لئے برکت ہو جائے (یہ بات ناممکن ہے!) (رواہ مسلم، مشکوۃ حدیث ۱۸۴۰)

تشریح: رسول اللہ ﷺ جس کو ناخوشی کے ساتھ، مجبور ہو کر کوئی چیز دیں گے، اس مال میں برکت نہیں ہوگی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نفوسِ قُدسیہ جو ملأ اعلی کے ساتھ لاحق ہونے والے ہیں یعنی ملکوتی صفات کے حامل ہیں۔ ان کے اذہان میں خوشی اور ناخوشی کی جو صورت آتی ہے: وہ بھی بمنزلۂ مقبول دعا کے ہوتی ہے۔ پس آپ ﷺ کا ناگواری کے ساتھ دینا: عدم برکت کی مقبول دعا کے ساتھ مقارن ہے۔ پھر اس میں برکت کیسے ہو سکتی ہے!

نفس کی فیاضی بھی برکت کا سبب بنتی ہے اور برکت کی حقیقت

حدیث —— حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے مال کا سوال کیا۔ آپؐ نے عنایت فرمایا۔ میں نے پھر سوال کیا۔ آپؐ نے پھر دیا۔ پھر مجھ سے فرمایا: ''اے حکیم! بیشک یہ مال سرسبز وشیریں ہے۔

جواس کونفس کی فیاضی سے یعنی حرص وطمع کے بغیر لیتا ہے،اس کے لئے اس میں برکت کی جاتی ہے۔اور جواس کونفس کی طمع کے ساتھ لیتا ہے،اس کے لئے اس میں برکت نہیں کی جاتی۔اور وہ شخص اُس آدمی کی طرح ہوتا ہے جو کھاتا ہے اور شکم سیر نہیں ہوتا۔اور دستِ بالا دستِ زیریں سے بہتر ہے!'' (مشکوۃ حدیث ۱۸۴۲)

تشریح: کسی چیز میں برکت چند طرح سے ہوتی ہے:

برکت کا ادنی درجہ: یہ ہے کہ نفس اس چیز پر مطمئن ہوجائے۔اور اس کو تسکینِ قلب حاصل ہوجائے۔جیسے دو شخصوں کے پاس بیس بیس درہم ہیں۔مگر ایک شخص افلاس سے ڈرتا ہے اور دوسرے کو فلاکت کا وسوسہ بھی نہیں آتا، ہمیشہ پُر امید رہتا ہے یہی برکت ہے۔

اس کے بعد: نفع کی زیادتی کا درجہ ہے۔مثلاً دو شخصوں کی آمدنی یکساں ہے۔ان میں سے ایک شخص اپنا مال کسی اہم کام میں خرچ کرتا ہے جواس کے لئے نفع بخش ہوتا ہے۔اور اللہ کی طرف سے اس کو خرچ کرنے کا بہترین طریقہ الہام کیا جاتا ہے۔اور دوسرا شخص اپنا مال ضائع کرتا ہے، وہ خرچ میں میانہ روی اختیار نہیں کرتا یہی برکت اور بے برکتی ہے (یہ مضمون مبحث ۶ باب ۲ رحمۃ اللہ ۲: ۶۵ پر بھی گذر چکا ہے۔اور اس پر تفصیلی کلام آگے **آداب الطعام** کے عنوان کے تحت آرہا ہے) اور جس طرح ماں باپ کی دعا سے مال میں برکت،اور بد دعا سے بے برکتی ہوتی ہے،اسی طرح نفس کی حالت (فیاضی اور طمع) سے بھی مال میں برکت اور بے برکتی ہوتی ہے۔حدیث شریف میں اسی کا بیان ہے۔

بلند ہمتی اور اولوالعزمی کی تحصیل کا طریقہ

حدیث ——— حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انصار کے کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا۔آپؐ نے ان کو عطا فرمایا۔انھوں نے پھر مانگا۔آپؐ نے پھر ان کو دیا۔یہاں تک کہ آپؐ کے پاس جو مال تھا وہ ختم ہوگیا۔پس آپؐ نے فرمایا:'' میرے پاس جو مال ہوگا، میں اس کو تم سے ذخیرہ کرکے نہ رکھونگا۔اور جو شخص سوال کرنے سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ اس کو بچاتے ہیں۔اور جو شخص بے نیاز ہونے کی کوشش کرتا ہے،اللہ تعالیٰ اس کو بے نیاز کرتے ہیں۔اور جو شخص بہ تکلف صبر کرتا ہے،اللہ تعالیٰ اس کو صبر دیتے ہیں۔اور کوئی شخص صبر سے فراخ تر بھلائی نہیں دیا گیا یعنی صبر اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی بخشش ہے'' (مشکوۃ حدیث ۱۸۴۴ مسلم شریف ۷: ۱۴۵ مصری)

تشریح: سوال سے دامن کشاں رہنے کے لئے بلند ہمتی اور پختہ ارادے کی ضرورت ہے۔مذکورہ حدیث میں اس کی تحصیل کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔چند نفسانی کیفیات ہیں: اگر ان کو اپنے اندر پیدا کرلیا جائے تو زہے نصیب! بلند ہمتی اور اولوالعزمی پیدا کرنے میں ان کی بڑی تاثیر ہے۔وہ کیفیات یہ ہیں: سوال سے تنفّر، بے نیازی کا جوہر اور صبر کی بے بہا دولت اگر یہ چیزیں حاصل ہوجائیں تو سوال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

[٥] قولـه صـلـى الله عليه وسلم:" لاتُلْحِفُوا في المسألة، فوالله! لا يَسْأَلُنِي أحدٌ منكم شيئًا، فَتُخْرِجُ له مسألتُه مني شيئًا، وأنا كارِهٌ، فَيُبَارَكُ له فيما أُعْطِيه"

أقول: سِرُّه: أن النفوس اللاحقة بالملأ الأعلى تكون الصورةُ الذهنية فيها من الكراهية والرضا بمنزلة الدعاء المستجاب.

[٦] قولـه صلى الله عليه وسلم:" إن هذا المالَ خَضِرٌ حُلْوٌ، فمن أخذه بسخاوة نفس بورك له فيه، ومن أخذه بإشرافِ نفسٍ لم يُبَارَك له فيه، فكان كالذى يأكل ولايشبع"

أقول: البركة في الشيئ على أنواع:

أدناها: طُمَأْنِيْنَةُ النفسِ به، وثَلْجُ الصدر، كرجلينِ عندهما عشرون درهما، أحدهما يخشى الفقر، والآخر مصروفُ الخاطِر عن الخشية، غلب عليه الرجاءُ.

ثم زيادةُ النفع، كرجلين: مقدارُ مالِهما واحدٌ، صرفه أحدُهُما إلى ما يهمُّه وينفعه، وأُلهم التدبيرَ الصالح في صرفه، والآخَرُ أضاعه، ولم يقتصد في التدبير؛ وهذه البركة تَجْلِبُها هيئةُ النفس بمنزلة جلب الدعاء.

[٧] قوله صلى الله عليه وسلم:" من يستعْفِفْ يُعِفَّهُ اللهُ" الحديثَ.

أقول: هذا إشارة إلى أن هذه الكيفيات النفسانية في تحصيلها أَثَرٌ عظيمٌ لجمع الهمَّةِ، وتأَكُّد العزيمة.

ترجمہ: (۵) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:......... میں کہتا ہوں: اس کا یعنی برکت نہ ہونے کا راز یہ ہے کہ وہ نفوس جو ملأ اعلیٰ کے ساتھ لاحق ہونے والے ہیں ان نفوس میں ناخوشی اور خوشی کی صورتِ ذہنیہ بمنزلہ مقبول دعا کے ہوتی ہے۔

(۶) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:......... میں کہتا ہوں: کسی چیز میں برکت چند اقسام پر ہے: برکت کا ادنی درجہ: نفس کا اس چیز پر مطمئن ہونا ہے۔ اور سینہ کا ٹھنڈا ہونا ہے۔ جیسے دو آدمی: دونوں کے پاس بیس درہم ہیں۔ ان میں سے ایک افلاس سے ڈرتا ہے۔ اور دوسرا: اس کا دل اس اندیشہ سے پھرا ہوا ہے۔ اور اس پر امید چھائی ہوئی ہے ــــ پھر نفع کی زیادتی ہے۔ جیسے دو شخص: دونوں کے مال کی مقدار یکساں ہے۔ ان میں سے ایک اس مال کو خرچ کرتا ہے اس کام میں جو اس کو فکر مند بنائے ہوئے ہے اور جو اس کے لئے نفع بخش ہے۔ اور وہ بہترین تدبیر الہام کیا جاتا ہے اس کے خرچ کرنے میں۔ اور دوسرا اس کو ضائع کرتا ہے۔ اور تدبیر میں میانہ روی اختیار نہیں کرتا ــــ اور اس برکت کو نفس کی حالت کھینچتی ہے، دعا کے کھینچنے کی طرح۔

(۷) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''اور جو شخص سوال سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بچاتے ہیں'' آخر حدیث تک ــــ میں کہتا ہوں: یہ حدیث اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ باطنی کیفیات ان کی تحصیل میں بڑا اثر ہے

ہمت کو اکٹھا کرنے میں اور عزیمت کو پختہ کرنے میں۔

باب ـــــــ ۵

زکوٰۃ سے تعلق رکھنے والی باتیں

فیاضی سے زکوٰۃ ادا کرنا

زکوٰۃ کے سلسلہ میں تین باتوں کی تاکید ضروری ہے:

پہلی بات: اربابِ اموال کو تاکید کی جائے کہ وہ خوش دلی اور فیاضی سے زکوٰۃ ادا کریں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ’’جب تمہارے پاس زکوٰۃ وصول کرنے والا پہنچے تو چاہئے کہ وہ تمہارے پاس سے اس حال میں لوٹے کہ وہ تم سے خوش ہو‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۷۶)

اور یہ بات یعنی فیاضی سے زکوٰۃ ادا کرنا دو وجہ سے ضروری ہے:

پہلی وجہ: زکوٰۃ کی جو مصلحت نفس کی طرف راجع ہے وہ بروئے کار آئے۔ کتاب الزکوٰۃ کے شروع میں بیان کیا گیا ہے کہ زکوٰۃ میں دو مصلحتیں ہیں ایک ذاتی دوسری ملکی۔ اول کا تعلق اصلاحِ نفس سے ہے اور ثانی کا مملکت کی بہبودی سے۔ اصلاح نفس سے زکات کا تعلق اس طرح ہے کہ پابندی سے زکوٰۃ ادا کرنے سے خود غرضی کا رذیلہ دور ہوتا ہے۔ اور یہ فائدہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ دریا دلی سے زکوٰۃ ادا کی جائے۔ ٹال مٹول کیا جائے نہ دل میں تنگی محسوس کی جائے۔ ورنہ خاطر خواہ فائدہ حاصل نہ ہوگا۔

دوسری وجہ: آنحضرت ﷺ نے اس بات کا سدّ باب کیا ہے کہ لوگ ظلم کو زکوٰۃ نہ دینے کا بہانہ نہ بنالیں یعنی لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم نے زکوٰۃ اس لئے نہیں دی کہ عمال ہم پر ظلم کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ’’عنقریب تمہارے پاس (زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے) چھوٹا سا قافلہ پہنچے گا، جو تمہیں مبغوض ہوگا۔ جب وہ تمہارے پاس آئے تو اس کو خوش آمدید کہو۔ اور اس کے درمیان اور اس چیز کے درمیان جو وہ لینا چاہتا ہے حائل مت ہوو۔ پھر اگر وہ انصاف کریں گے تو ان کا بھلا ہوگا اور ظلم کریں گے تو ان پر وبال پڑے گا۔ اور ان کو خوش کرو۔ کیونکہ تمہاری زکوٰۃ کی تمامیّت ان کی خوشنودی میں ہے۔ اور چاہئے کہ وہ تمہارے لئے دعا کریں‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۸۲)

دو حدیثوں میں رفع تعارض: **سوال:** اس حدیث میں اور ایک دوسری حدیث میں تعارض ہے۔ اِس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ عامل چاہے ظلم کرے حائل مت بنو۔ جو مانگے دو۔ اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ: ’’اگر عامل زکوٰۃ سے زیادہ مانگے تو مت دو‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۹۶) ان دونوں روایتوں میں تعارض ہے۔

جواب: ان دونوں روایتوں میں کچھ تعارض نہیں۔ کیونکہ ظلم کی دو قسمیں ہیں: **ایک:** وہ ظلم ہے جس کا ظلم ہونا نص سے

ثابت ہے۔مثلاً چالیس تا ایک سوبیس بکریوں میں ایک بکری واجب ہے۔پس اگر عامل دو بکریاں مانگے تو یہ صریح ظلم ہے۔ اس کے بارے میں ارشاد ہے کہ:''مت دو'' دوسری قسم: احتمالی ظلم ہے یعنی اس کا ظلم ہونا یقینی نہیں۔مثلاً عامل نے اپنے گمان میں ایک درمیانی جانور چھانٹا، مالک اس کو عمدہ خیال کرتا ہے۔ایسی صورت میں مالک کو فیاضی سے کام لینا چاہئے۔

عاملین کے لئے ہدایات

دوسری بات: زکوٰۃ وصول کرنے والوں کو تین باتوں کی تاکید کی جائے: ایک: یہ کہ وہ زکوٰۃ لینے میں زیادتی نہ کریں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا کہ:''زکوٰۃ وصول کرنے میں زیادتی کرنے والا زکوٰۃ نہ دینے والے کی طرح گنہ گار ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۰۱) اور فرمایا:'' جائز طریقہ پر زکوٰۃ وصول کرنے والا اللہ کے راستہ میں لڑنے والے کی طرح ہے، یہاں تک کہ وہ گھر لوٹ آئے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۸۵)

دوم: عمال کو تاکید کی جائے کہ وہ لوگوں کا عمدہ مال لینے سے احتراز کریں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:''لوگوں کے عمدہ مال لینے سے بچو اور مظلوم کی بددعا سے ڈرو، کیونکہ مظلوم کی بددعا اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی حائل نہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۷۲)

سوم: عمال کو اس بات کی تاکید کی جائے کہ وہ وصول کردہ زکوٰۃ میں کسی قسم کی خیانت نہ کریں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! تم میں سے جو بھی شخص مالِ زکوٰۃ میں سے کچھ بھی لے گا، وہ قیامت کے دن اس کو اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے آئے گا: اگر اونٹ ہوگا تو وہ بلبلا رہا ہوگا، گائے ہوگی تو وہ بول رہی ہوگی اور بکری ہوگی تو وہ مَمیا رہی ہوگی'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۷۹ بخاری حدیث ۲۵۹۷)

اور پہلی دو ہدایتیں اس لئے ضروری ہیں کہ انصاف بروئے کار آئے۔اور ظلم کا دروازہ بند ہو۔اور تیسری ہدایت اس لئے ضروری ہے کہ مقاصدِ زکوٰۃ کامل طور پر تکمیل پذیر ہوں۔ کیونکہ عمال اگر زکوٰۃ میں خورد بُرد کریں گے تو مستحقین زکوٰۃ کا نقصان ہوگا اور زکوٰۃ کا مقصد پورا نہیں ہوگا۔

اور مالِ زکوٰۃ میں خیانت کرنے والے کی مذکورہ سزا کا راز اُس مضمون کی طرف مراجعت کرنے سے سمجھ میں آجائے گا جو کتاب الزکوٰۃ کے شروع میں بعنوان:'' آخرت میں کنجوسی کا راز'' ذکر کیا گیا ہے۔

حیلہ سازیوں کا سدّباب

تیسری بات: اربابِ اموال کی حیلہ سازیوں کا سدّباب ضروری ہے۔یعنی وجوبِ زکوٰۃ سے بچنے کے لئے یا زکوٰۃ کم واجب ہو اس کے لئے مکروفریب کرنے پر قدغن لگانا ضروری ہے۔ چنانچہ مکائد کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا:''زکوٰۃ کے اندیشہ سے جدا مواشی کو اکٹھا نہ کیا جائے۔اور اکٹھا کو جدا نہ کیا جائے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۹۶)

فائدہ: قولہ: لایُجمع بین متفرِّق یعنی جو مواشی جدا ہیں ان کو زیادہ زکوٰۃ واجب ہونے کے اندیشہ سے جمع نہ کیا

جائے۔ مثلاً دو شخصوں کی چالیس چالیس بکریاں ہیں۔ ان میں دو بکریاں واجب ہوں گی۔ لیکن اگر وہ جمع کر کے ایک شخص کی بکریاں بتلائیں تو ایک بکری واجب ہوگی۔ ایسی حیلہ بازی سے منع کیا گیا۔

قوله: ولا یُفَرَّق بین مجتمِع یعنی جو مواشی جمع ہیں ان کو وجوبِ زکوٰۃ کے اندیشہ سے جدا نہ کیا جائے۔ مثلاً ایک شخص کی چالیس بکریاں ہیں اور دوسرے کی بیس۔ اول پر ایک بکری واجب ہے اور دوسرے پر کچھ نہیں۔ اب اگر پہلا شخص اپنی چند بکریاں دوسرے کے ریوڑ میں شامل کردے تو دونوں پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ مذکورہ حدیث میں ایسا فریب کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

قوله: خشیة الصدقة: یہ دونوں فعلوں کا مفعول لہٗ ہے۔ اس میں تنازع فعلان ہے۔ پس ایک فعل کا ایسا ہی معمول محذوف مانا جائے گا۔

حدیث کا یہ مطلب: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول پر ہے۔ احناف کے نزدیک **لا یُجمع** اور **لا یُفرَّق** دونوں فعل مضارع منفی ہیں فعل نہی نہیں ہیں۔ پس یہ ارشاد انشا نہیں ہے، بلکہ اخبار ہے یعنی جمع و تفریق کے بارے میں خبر دی گئی ہے کہ یہ لغو عمل ہے۔ زکوٰۃ پر اس کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ کیونکہ زکوٰۃ کا مدار ملکیت پر ہے جس کی جتنی ملکیت ہوگی، اس کے اعتبار سے زکوٰۃ لی جائے گی۔ خواہ جانور جمع ہوں یا متفرق۔ اور حدیث میں خطاب مالکانِ مواشی سے بھی ہے جیسا کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بیان فرمایا اور ساعی (زکوٰۃ وصول کرنے والے) سے بھی ہے کہ وہ بھی جمع و تفریق نہ کرے۔ بلکہ مواشی جس حال میں ہوں، خواہ جمع ہوں یا متفرق، ملکیت کا لحاظ کر کے زکوٰۃ وصول کرے۔

اور ائمہ ثلاثہ: **لا یُجمع** اور **لا یفرَّق** کو نہی کہتے ہیں کیونکہ اخبار انشاء کو متضمن ہوتے ہیں۔ اور وہ نہی کا تعلق صرف ساعی سے کرتے ہیں کیونکہ مالکان کو جمع و تفریق کا ہر وقت اختیار رہے، خواہ ان کی نیت کچھ ہو۔ اور ان کے نزدیک حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر جانور متفرق ہوں اور زکوٰۃ واجب نہ ہوتی ہو یا کم واجب ہوتی ہو تو ساعی زکوٰۃ کی خاطر ان کو جمع نہ کرے اور مختلط ہوں تو جدا نہ کرے بلکہ جس حال میں ہوں اس کا اعتبار کرے۔

فائدہ: حدیث فہمی کے مذکورہ بالا اختلاف پر یہ اختلاف مبنی ہے کہ خُلطہ کا اعتبار ہے یا نہیں؟ خُلطہ (بالضّم) کے معنی ہیں: شرکت۔ خاص طور پر مواشی میں شرکت۔ پھر خلطہ کی دو قسمیں ہیں:

ایک: خُلطۃ الشّیوع۔ جس کو خُلطۃ الاعیان اور خُلطۃ الاشتراک بھی کہتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ میراث میں ملنے کی وجہ سے یا بخشش میں ملنے کی وجہ سے یا مشترک رقم سے خریدنے کی وجہ سے مواشی دو شخصوں میں مشترک (غیر منقسم) ہوں وهی: أن تکون المواشی مشترکا مُشاعًا بین المالکین بالإرث، أو الهبة، أو الشراء مثلاً ایک شخص کا انتقال ہوا، اس نے ایک سوبیس بکریاں چھوڑیں۔ اور وارث ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے۔ تو بھائی بہن اَثلاثًا ان بکریوں کے مالک ہونگے۔ اور جب تک وہ بکریاں تقسیم نہیں کریں گے ان میں خلطۃ الشیوع ہوگا۔

دوسری قسم: خُلطۃ الجِوار ہے۔ جس کو خلطۃ الاوصاف بھی کہتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ دو شخصوں کے جانور ملکیت میں متمایز ہوں، مگر دس باتوں میں یا چھ باتوں میں مشترک ہوں۔ جن کی تفصیل کتبِ فقہ میں ہے۔ وهي: أن يكون لكل واحدمنهما ماشيةٌ متمايزة، ولا اشتراك بينهما في الملك، لكنها متجاورة مختلطة في مَرَاحٍ، ومرعى، وراع، ومِحْلَبٍ، وكلب، وفَحْلٍ، وحوضٍ، وحالب، ومَسْرَحٍ، وقصدِ خُلطةٍ (عند الشافعي) وفي مَسْرَحٍ، ومَرَاحٍ، ومحلب، ومشرب، وفحل، وراع (عند مالك وأحمد)

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک: دونوں خلطوں سے دو یا چند مالکان کے مواشی كمالِ رجلٍ واحدٍ (ایک شخص کے مال کی طرح) ہوجاتے ہیں۔ اور خُلطہ وجوب اور تقلیل وتکثیر زکوٰۃ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مگر امام مالک کے نزدیک شرط یہ ہے کہ ہر مالک کی ملکیت بقدر نصاب ہو۔

نفسِ وجوب کی مثال: دو شخصوں کی چالیس بکریاں ہوں اور کوئی بھی خلطہ ہو تو عند الشافعی واحمد: ایک بکری واجب ہوگی۔ ولا يجب عند مالك شيئ۔

تکثیر کی مثال: دو شخصوں کی انصافاً ۲۰۲ بکریاں ہوں تو تین بکریاں واجب ہونگی۔

تقلیل کی مثال: تین شخصوں کی ایک سو بیس بکریاں ہوں تو ایک بکری واجب ہوگی۔

اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک خُلطہ کا مطلق اعتبار نہیں۔ نہ وجوب میں اور نہ تقلیل وتکثیر میں۔ ان کے نزدیک اعتبار ملکیت کا ہے۔ چنانچہ پہلی صورت میں کچھ واجب نہیں۔ دوسری صورت میں دو بکریاں واجب ہیں، کیونکہ ہر ایک: ایک سو ایک کا مالک ہے۔ اور تیسری صورت میں تین بکریاں واجب ہونگی۔ کیونکہ ہر ایک کی ملک میں چالیس بکریاں ہیں۔

نوٹ: جمع وتفریق: ملکیت میں مراد ہے، مکان میں بالاتفاق مراد نہیں۔ کیونکہ مکان میں بالاجماع: جمع وتفریق کی جائے گی۔ مثلاً ایک شخص کی چالیس بکریاں ایک چراہ گاہ میں ہیں، اور دوسری چالیس دوسری چراہ گاہ میں تو دونوں کو جمع کر کے اسّی میں سے ایک بکری لی جائے گی۔

فائدہ: اس کے بعد دوسرا جملہ ہے: وما كان من خَلِيْطَيْنِ فإنهما يتراجعان بالسَّوِيَّةِ یعنی جو جانور زکوٰۃ میں دو شریکوں سے لیا گیا ہے: وہ آپس میں ٹھیک ٹھیک لین دین کرلیں گے ـــــ اس جملہ میں بھی اختلاف ہے۔ اور وہ پہلے جملہ میں اختلاف پر مبنی ہے۔

ائمۂ ثلاثہ کے نزدیک: اس جملہ کا تعلق دونوں خُلطوں سے ہے۔ مگر خلطۃ الشیوع میں کچھ لین دین نہیں ہوگا۔ صرف خلطۃ الجوار میں لین دین ہوگا۔ مثلاً زید کی چالیس بکریاں اور خالد کی بھی چالیس بکریاں ہیں۔ اور انھوں نے خلطۃ الجوار کر رکھا ہے تو اسّی میں سے ساعی ایک بکری لے گا اور وہ جس کی بکریوں میں سے لی گئی ہے وہ اس کی آدھی قیمت دوسرے سے لے گا۔

اور احناف کے نزدیک: اس جملہ کا تعلق صرف خلطۃ الشیوع سے ہے۔ پس اگر اسّی بکریاں اَنصافًا ہوں تو

دو بکریاں واجب ہونگی اور کوئی لین دین نہیں ہوگا ـــــ اور اثلاثاً ہوں تو دوثلث والے پر ایک بکری واجب ہے۔ اور ایک ثلث والے پر کچھ واجب نہیں کیونکہ نصاب مکمل نہیں۔ پس جو ایک بکری زکوٰۃ میں لی گئی ہے اس کا تہائی: دوثلث والا ایک ثلث والے کو دے گا ـــــ اور ایک سو بیس بکریاں اثلاثاً ہوں تو دو بکریاں واجب ہونگی۔ پس دوثلث والا: ایک ثلث والے سے ایک بکری کا ثلث لے گا۔ کیونکہ اس کا ایک ثلث زائد گیا ہے۔ اور اکسٹھ اونٹ ہوں ایک کے ۲۵ اور دوسرے کے ۳۶ اور خلطہ الشیوع ہو یعنی املاک متمائزہ نہ ہوں تو ایک بنت مخاض اور ایک بنتِ لبون واجب ہوگی۔ پھر ۳۶ والا بنت لبون کے اکسٹھ حصوں میں سے پچیس حصے ۲۵ والے کو دے گا اور ۲۵ والا بنت مخاض کے اکسٹھ حصوں میں سے چھتیس حصے ۳۶ والے کو دیگا (یہ دونوں طرف سے لین دین ہوا)

نوٹ: یہ حدیث طالب علموں کے لئے مشکل ہے اس لئے پوری حدیث کی شرح کی گئی ہے۔ ورنہ شاہ صاحب رحمہ اللہ کے کلام کو سمجھنے کے لئے اتنی تفصیل کی ضرورت نہیں تھی۔

﴿أمور تتعلَّق بالزكاة﴾

ثم مسَّت الحاجة:

[۱] إلى وصية الناس أن يؤدوا الصدقةَ إلى المصدِّق بسخاوة نفس، وفيها قولُه صلى الله عليه وسلم: "إذا أتاكم المصدِّقُ فَلْيَصْدُرْ عنكم، وهو عنكم راض" وذلك لتتحقق المصلحة الراجعة إلى النفس؛ وأراد أن يسدّ باب اعتذارهم فى المنع بالجور، وهو قولُه صلى الله عليه وسلم: "فإن عَدَلوا فلأنفسهم، وإن ظلموا فعليهم"

ولا اختلاف بين هذا الحديث، وبين قوله صلى الله عليه وسلم: "فمن سئل فوقها فلا يُعط" إذا الجور نوعان: نوعٌ أظهر النصُّ حكمَه، وفيه "لايعط" ونوع فيه للاجتهاد مساغٌ، وللظنون تعارضٌ، وفيه سَدُّ بابِ الاعتذار.

[۲] وإلى وصيةِ المصدِّق أن لايعتدى فى أخذ الصدقة، وأن يتقى كرائم أموالهم، وأن لايَغُلَّ، ليتحقق الإنصاف، وتتوفَّر المقاصد.

وسِرُّ قوله صلى الله عليه وسلم: "فوالذى نفسى بيده! لايأخذ أحد منكم شيئًا إلا جاء به يومَ القيامة يحمِلُه على رقبته: إن كان بعيرًا له رغاء" يَتَّضِح من مراجعة ما بينا فى مانع الزكاة.

[۳] وإلى سَدِّ مكايد أهل الأموال، وفيها: "لايُجمعُ بين متفرِّقٍ، ولا يُفرَّق بين مجتمِعٍ، خشيةَ الصدقة"

ترجمہ: وہ امور جو زکوٰۃ سے تعلق رکھتے ہیں: پھر حاجت پیش آئی: (۱) لوگوں کو تاکید کرنے کی کہ وہ زکوٰۃ ادا کریں:

زکوۃ کی وصولی کرنے والے کو دل کی فیاضی سے۔ اور اس وصیت کے سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب پہنچے تمہارے پاس زکوۃ وصول کرنے والا تو لوٹے وہ تمہارے پاس سے درانحالیکہ وہ تم سے خوش ہو'' اور یہ بات یعنی سخاوتِ نفس سے زکوۃ ادا کرنا (اس لئے ہے) تاکہ وہ مصلحت پائی جائے جو نفس کی طرف لوٹنے والی ہے۔ اور چاہا آپؐ نے کہ بند کردیں ظلم کے ذریعہ لوگوں کے عذر کرنے کا دروازہ زکوۃ نہ دینے میں۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''پس اگر انصاف کیا انھوں نے تو وہ ان کے حق میں ہے۔ اور اگر ظلم کیا انھوں نے تو اس کا وبال ان پر ہے''

اور کچھ تعارض نہیں اِس حدیث کے درمیان اور آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے درمیان کہ: ''جو مانگے زکوۃ سے زیادہ تو وہ نہ دے'' کیونکہ ظلم کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم: وہ ہے جس کا حکم نص نے واضح کیا ہے۔ اور اس کے بارے میں ہے کہ: ''وہ نہ دے'' اور دوسری قسم: وہ ہے جس میں اجتہاد کے لئے جواز ہے اور گمان میں اختلاف ہے۔ اور اس قسم میں عذر کرنے کا دروازہ بند کرنا ہے یعنی پہلی حدیث اس قسم کے بارے میں ہے۔

(۲) اور (حاجت پیش آئی) زکوۃ وصول کرنے والے کو تاکید کرنے کی کہ نہ زیادتی کرے وہ زکوۃ لینے میں اور یہ کہ بچے وہ لوگوں کے عمدہ اموال لینے سے اور یہ کہ نہ خیانت کرے وہ تاکہ متحقق ہو انصاف اور کامل طور پر پائے جائیں (زکوۃ کے) مقاصد —— اور آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا راز کہ: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! نہیں لے گا تم میں سے کوئی شخص کوئی چیز مگر لائے گا وہ اس کو قیامت کے دن، اٹھائے ہوئے ہوگا وہ اس کو اپنی گردن پر: اگر اونٹ ہے تو اس کے لئے بلبلانا ہے'' (وہ راز) واضح ہوگا اس بات کی مراجعت سے جو ہم نے بیان کی ہے زکوۃ نہ دینے والے کے بیان میں۔

(۳) اور (حاجت پیش آئی) ارباب اموال کے مکر وفریب کا سدّ باب کرنے کی۔ اور ان مکائد میں یہ ارشاد ہے: ''نہ جمع کیا جائے جدا مواشی کے درمیان۔ اور نہ جدا کیا جائے اکٹھا مواشی کے درمیان زکوۃ کے اندیشہ سے''

☆ ☆ ☆

سخاوتِ نفس کی کمی خیرات کی قیمت گھٹا دیتی ہے

حدیث —— میں ہے کہ: ''تندرستی میں آدمی کا ایک درہم خیرات کرنا یقیناً موت کے قریب سو درہم خیرات کرنے سے بہتر ہے'' (مشکوۃ حدیث ۱۸۷۰)

حدیث —— میں ہے کہ: ''اس شخص کا حال جو موت کے قریب خیرات کرتا ہے یا غلام آزاد کرتا ہے، اس شخص جیسا ہے جو کھانا ہدیہ کرتا ہے جب شکم سیر ہو جاتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۱۸۷۱)

تشریح: موت کے قریب جب مال کی کچھ ضرورت باقی نہیں رہتی، اور آئندہ بھی اپنی ذات کے لئے کسی حاجت

کے پیش آنے کا خیال نہیں ہوتا، اس وقت جو صدقہ کیا جاتا ہے اس کا ثواب اس لئے کم ہوجاتا ہے کہ وہ کسی قابل لحاظ سخاوتِ قلب کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ وہ شکم سیر ہونے کے بعد بچا ہوا کھانا ہدیہ کرنے کی طرح ہوتا ہے۔ اللہ کے نزدیک وقعت اس صدقہ کی ہے جو تندرستی کی حالت میں کیا جائے، جب آدمی کے سامنے اپنے مسائل اور اپنی ضروریات ہوں۔ اس وقت کی خیرات سچے جذبۂ قلبی سے ہوتی ہے، اس لئے وہ وقیع ہوتی ہے۔

جو کام صدقات کے ساتھ ثمرات میں شریک ہیں وہ بھی صدقہ ہیں

حدیث ـــــ میں ہے کہ: ''جسم کے ہر جوڑ پر ہر دن میں صدقہ لازم ہے: دو شخصوں کے درمیان انصاف کرنا صدقہ ہے۔ اپنے جانور پر کسی کو سوار کرنا یا بوجھ لادنا صدقہ ہے۔ اور اچھی بات صدقہ ہے۔ اور نماز کے لئے اٹھنے والا ہر قدم صدقہ ہے۔ اور راستہ میں سے کوئی تکلیف دہ چیز ہٹانا صدقہ ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۹۶)

حدیث ـــــ میں ہے کہ: ''ہر تسبیح یعنی سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے۔ اور ہر تکبیر یعنی اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے۔ اور ہر تحمید یعنی الحمد للہ کہنا صدقہ ہے۔ اور ہر تہلیل یعنی لا إلٰہ الا اللہ کہنا صدقہ ہے۔ اور امر بالمعروف صدقہ ہے۔ اور نہی عن المنکر صدقہ ہے۔ اور بیوی سے صحبت کرنا صدقہ ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۹۸)

تشریح: مذکورہ امور سے تین فوائد حاصل ہوتے ہیں: بخل کا ازالہ ہوتا ہے، نفس کی اصلاح ہوتی ہے اور جماعت مسلمین میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ یہی تین فوائد صدقات سے بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے نبی ﷺ نے ان کو صدقہ قرار دیا۔ اور لوگوں کو باخبر کیا کہ یہ کام بھی خیرات کے ساتھ ثمرات وفوائد میں حصہ داری رکھتے ہیں۔ مثلاً اپنے جانور پر کسی کو سوار کرنا یا اس کا سامان لادنا بخل کا ازالہ کرتا ہے۔ اور اذکار وعبادات سے نفس کی اصلاح ہوتی ہے اور دو شخصوں میں انصاف کرنے سے اور بیوی سے ہم بستری سے میل ملاپ پیدا ہوتا ہے۔

[۱] قولـه صلى الله عليه وسلم: " لأن يتصدَّقَ المرءُ في حياته بدرهمٍ، خيرٌ له من أن يتصدَّق بمائةٍ عند موته" وقال صلى الله عليه وسلم: " مثلُه كمثل الذى يُهدى إذا شبِع"

أقول: سِرُّه: أن إنفـاقَ مـالايـحتـاج إليه، ولايتوقع الحاجة إليه لنفسه، ليس بمعتمِدٍ على سخاوةٍ يُعتدَّ بها.

[۲] ثـم إن النبيَّ صلى الله عليه وسلم عمِد إلى خصالٍ ممايفيد إزالةَ البخل، أو تهذيبَ النفس، أو تـألُّفَ الجماعة، فجعلها صدقاتٍ، تنبيها على مشاركتها الصدقاتِ في الثمرات، وهو قولُه صلى الله عـليه وسلم: " يعدِلُ بين الاثنين صدقة، ويُعين الرجلَ على دابته صدقة، والكلمة الطيبة صدقة، وكل خُطوة يخطوها إلى الصلاة صدقة، وكل تهليلة وتكبيرةٍ وتسبيحةٍ صدقة" وأمثالُ ذلك.

ترجمہ: (۱) آنحضرت ﷺ کے دو ارشاد: .... میں کہتا ہوں: اس کا یعنی صدقہ کی قیمت کے کم ہو جانے کا راز یہ ہے کہ اس مال کو خرچ کرنا جس کا وہ محتاج نہیں رہا اور اپنے لئے اس کی حاجت کی توقع بھی نہیں رہی، نہیں ہے وہ خرچ کرنا ٹیک لگانے والا کسی قابل لحاظ سخاوت پر۔

(۲) پھر بیشک نبی ﷺ نے قصد کیا چند باتوں کا، ان باتوں میں سے جو مفید ہیں بخل کے ازالہ میں یا نفس کے سنوارنے میں یا جماعتِ مسلمین کو جوڑنے میں، پس بنایا ان کو خیراتیں، تنبیہ کرتے ہوئے ان کی حصہ داری پر خیراتوں کے ساتھ ثمرات میں۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے الی آخرہ۔

☆　☆　☆

چند اعمالِ خیریہ اور ان کی جزاء میں مماثلت کی وجہ

حدیث ——— میں ہے کہ: ''جس نے کسی مسلمان کو، جس کے پاس کپڑا نہیں ہے، پہننے کو کپڑا دیا، تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کا سبز لباس پہنائیں گے۔ اور جس نے کسی مسلمان کو بھوک کی حالت میں کھانا کھلایا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے میوے کھلائیں گے۔ اور جس نے کسی مسلمان کو پیاس کی حالت میں پانی پلایا، تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی سَر بہ مُہر شرابِ طہور پلائیں گے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۱۳)

تشریح: یہ بات بار بار بیان کی جاچکی ہے کہ جب معانی: مثالی جسم اختیار کرتے ہیں تو وہ جسم اختیار کرتے ہیں جو اس معنی سے قریب تر مشابہت رکھتے ہیں۔ خوابوں میں اور خارجی واقعات میں جو حقائق متجسّم ہوتے ہیں وہ اسی طرح کے پیکروں میں متمثّل ہوتے ہیں۔ کنویں کی مَن پر آنحضرت ﷺ کے ساتھ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا بیٹھنا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا علحدہ بیٹھنا، ان کی قبروں کے احوال کا خارجی تمثّل تھا۔ جیسا کہ حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ اور لوگوں کے مونہوں پر اور شرمگاہوں پر مہر کرنے کا خواب اور ابن سیرین رحمہ اللہ کی تعبیر بھی پہلے گذر چکی ہے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ ہجرت سے پہلے مدینہ وبائی شہر تھا۔ آنحضرت ﷺ نے دعا فرمائی جیسا کہ بخاری، کتاب الحج کے آخر میں ہے۔ چنانچہ آپؐ نے خواب دیکھا کہ ایک سیاہ عورت جس کا سر پراگندہ ہے مدینہ سے نکلی، اور جُحفة پہنچ گئی۔ آپؐ نے اس کی تعبیر یہ بیان فرمائی کہ مدینہ کی وباء جحفة منتقل ہوگئی (بخاری حدیث ۷۰۳۸ کتاب التعبیر باب ۴۱) وباء کی طرح کالی پراگندہ بال عورت بھی لوگوں کو ناپسند ہوتی ہے، اس لئے وباء اس صورت میں متشکل ہوئی۔ اسی طرح بھوکوں کو کھلانے، ننگوں کو پہنانے اور پیاسوں کو پلانے کا ثواب بھی آخرت میں حدیث میں مذکور صورتوں میں ظہور پذیر ہوگا۔ اور عمل سے ان صورتوں کا اقرب ہونا بدیہی ہے۔

[۳] قوله صلى الله عليه وسلم: '' أيما مسلمٍ كسا مسلما ثوبًا على عُرْيٍ'' الحديثَ.

أقول: قد ذكرنا مرارًا: أن الطبيعةَ المثاليةَ تقتضى أن لايكون تجسُّدُ المعانى إلا بصورةٍ هى أقربُ شِبْهٍ من الصور، وأن الإطعام— مثلاً— فيه صورةُ الطعام؛ ولك عبرةٌ بالمناماتِ والواقعاتِ، وتمثُّلِ المعانى بصور الأجسام؛ ومن هناك ينبغى أن تعرِفَ: لم رأى النبيُّ صلى الله عليه وسلم وباءَ المدينة بصورة امرأةٍ سوداء؟

ترجمہ: (۳) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''جونسا مسلمان پہنائے کسی مسلمان کو کوئی کپڑا ننگا پے پر'' آخر تک میں کہتا ہوں: تحقیق ذکر کیا ہم نے بار بار کہ ماہیتِ مثالیہ چاہتی ہے کہ نہ ہو حقائق کا متجسّم ہونا مگر ایسی صورت کے ذریعہ جو کہ وہ صورتوں میں سے قریب ترین مشابہت رکھنے والی ہو۔اور (چاہتی ہے) یہ کہ کھانا کھلانا —— مثال کے طور پر —— اس میں کھانے کی صورت ہے۔اور آپ کو غور وفکر کرنا چاہئے خوابوں میں اور واقعات میں اور معانی کے متمثّل ہونے میں اجسام کی صورتوں کے ساتھ۔اور یہیں سے مناسب ہے کہ آپ جانیں کہ کیوں دیکھا نبی ﷺ نے مدینہ کی وباء کو کالی عورت کی صورت میں؟

☆ ☆ ☆

اہل وعیال اور اقارب پر خرچ کرنا دیگر وجوہِ خیر میں خرچ کرنے سے بہتر ہے

حدیث —— میں ہے کہ: ''ایک دینار جسے آپ راہِ خدا (جہاد) میں خرچ کریں، اور ایک دینار جسے آپ غلام آزاد کرنے میں خرچ کریں، اور ایک دینار جو آپ کسی غریب کو صدقہ دیں، اور ایک دینار جو آپ اپنے گھر والوں پر خرچ کریں، ان میں ثواب کے اعتبار سے سب سے بڑا وہ دینار ہے جو آپ اپنے اہل پر خرچ کریں (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث ۱۹۳۱)

تشریح: کچھ لوگ اہل وعیال اور اعزہ واقارب کو چھوڑ کر دور کے لوگوں پر صدقہ کرتے ہیں، اس میں تین نقصان ہیں: اول: ایسا کرنے میں ان لوگوں کی حق تلفی ہے جن کا خیال رکھنا سب سے زیادہ مؤکد ہے۔دوم: یہ خرچ کرنے میں سوئے تدبیر یعنی بے ڈھنگا پن ہے۔سلیقہ مندی الأهم فالأهم کا خیال رکھنا ہے۔سوم: اس میں نزدیک تر جماعت کی تالیف کو چھوڑنا ہے یعنی صدقہ کا ایک مقصد جماعتِ مسلمین کو جوڑنا ہے۔اور قریب ترین لوگ تالیف کے زیادہ حقدار ہیں۔پس ان کو چھوڑ کر دیگر وجوہِ خیر میں خرچ کرنا اور پرایوں پر نوازش کرنا قرینِ مصلحت نہیں۔اس لئے نبی ﷺ نے مذکورہ ارشاد کے ذریعہ اس دروازے کو بند کر دیا۔اور بتایا کہ اہل وعیال اور اعزّہ واقارب پر ثواب کی نیت سے خرچ کرنا دوسروں پر خرچ کرنے سے بہتر ہے یعنی اس میں ثواب زیادہ ہے۔

خیرات باحیثیت کی بہتر ہے یا نادار کی؟

ایک حدیث میں ہے کہ: ''بہترین خیرات وہ ہے جو غِنا کی پشت سے ہو، اور پہلے ان لوگوں پر خرچ کرو جن کی تم

کفالت کرتے ہو'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۲۹) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مالدار کی خیرات افضل ہے۔ اور دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا: کونسی خیرات بہتر ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''نادار کی انتہائی کوشش!'' یعنی وہ صدقہ افضل ہے جو غریب آدمی اپنی محنت کی کمائی سے کرتا ہے۔'' اور پہلے ان لوگوں پر خرچ کرو جن کی کفالت تمہارے ذمّے ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۳۸) یعنی پہلے اہل وعیال پر خرچ کرو، پھر گنجائش رہے تو دوسرے مصارف میں خرچ کرو۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ نادار کی خیرات افضل ہے۔ اس تعارض کے دو جواب ہیں:

پہلا جواب: یہ ہے کہ دونوں روایتوں کے معنی الگ الگ ہیں۔ پہلی روایت میں جو لفظ غِنا آیا ہے، اس سے اصطلاحی غنی یعنی صاحبِ نصاب ہونا مراد نہیں۔ بلکہ مطلق بے نیازی مراد ہے یعنی اس شخص کی خیرات افضل ہے جو خیرات کرنے کے بعد دوسروں کا دست نگر نہ ہوجائے۔ یا غنا سے اہل وعیال کی کفالت مراد ہے یعنی خیرات کرنے کے بعد بھی گھر کی ضروریات کے بقدر مال بچا رہے۔ اور دوسری حدیث میں بھی نادار سے یہی شخص مراد ہے۔ وہ نادار بایں معنی ہے کہ مالدار صاحبِ نصاب نہیں۔ پس دونوں روایتوں میں کچھ تعارض نہیں۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ دونوں روایتوں کی جہتیں یعنی فضیلت کی وجوہ الگ الگ ہیں۔ صاحب نصاب کی خیرات بایں وجہ افضل ہے کہ اس سے اس کے مال میں خوب برکت ہوتی ہے اور نادار کی خیرات بایں وجہ افضل ہے کہ اس سے اس کے بخل کا خوب ازالہ ہوتا ہے۔

فائدہ: یہ دوسرا جواب قوانین شریعت سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ کیونکہ اس میں الفاظ کو ان کے لغوی معانی پر باقی رکھا گیا ہے۔ غنا سے مالداری اور مقل سے ناداری مراد لی گئی ہے جو ان الفاظ کے اصلی معنی ہیں۔

[٤] ثم كان من الناس من يترك أهلَه وأقاربَه، ويتصدَّقُ على الأباعد، وفيه إهمالُ مَنْ رعايتُه أوجَبُ، وسوءُ التدبير، وتركُ تألُّفِ الجماعة القريبة منه، فمسَّت الحاجة إلى سدِّ هذا الباب، فقال النبيُّ صلى الله عليه وسلم: ''دينارٌ أنفقتَه في سبيل الله، ودينارٌ أنفقته في رقبة'' الحديث.

[٥] ولا اختلافَ بين قوله: ''خير الصدقة ماكان عن ظهر غِنًى، وابدَأْ بمن تعول'' وحديث: قيل: أيُّ الصدقة أفضل؟ قال: ''جُهْدُ المقِلِّ، وابدأ بمن تعول'' لتنزيلِ كلٍّ على معنىً أو جهةٍ، فالغِنىٰ: ليس هو المصطلح عليه، وإنما هو غِنَى النفس، أو كفاية الأهل، أو نقول: صدقةُ الغَنِيِّ أعظم بركةً في ماله، وصدقةُ المقِلِّ أكثر إزالةً لبخله، وهو أَقْعَدُ بقوانين الشرع.

ترجمہ: (۴) پھر بعض لوگ چھوڑ دیتے تھے اپنے گھر والوں کو اور اپنے رشتہ داروں کو، اور خیرات کرتے تھے دور کے لوگوں پر۔ اور اس میں اس شخص کو رائگاں کرنا ہے جس کی رعایت زیادہ ضروری ہے۔ اور اس میں بدتدبیری ہے اور اپنے

سے نزدیک جماعت کی تالیف چھوڑنا ہے، تو حاجت پیش آئی اس دروازہ کو بند کرنے کی، پس نبی ﷺ نے فرمایا: ''ایک دینار جس کو آپ راہِ خدا میں خرچ کریں، اور ایک دینار جس کو آپ غلام آزاد کرنے میں خرچ کریں'' آخر تک۔

(۵) اور کچھ تعارض نہیں آپؐ کے ارشاد کے درمیان کہ: ''بہترین خیرات وہ ہے جو غنا کی پیٹھ سے ہو، اور ان سے ابتداء کر جن کی تو کفالت کرتا ہے'' اور حدیث: (کے درمیان کہ) ''آپؐ سے دریافت کیا گیا: کونسی خیرات بہتر ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''نادار کی انتہائی کوشش، اور ابتدا کران سے جن کی تو کفالت کرتا ہے'' ہر ایک کو اتارنے کی وجہ سے ایک معنی پر یعنی دونوں روایتوں کے معنی الگ الگ کر لئے جائیں یا ایک جہت پر یعنی فضیلت کی وجہ الگ الگ بیان کی جائے۔ (۱) پس غنا: نہیں ہے وہ غنا جس پر رضامند ہو گیا ہے یعنی غنا کے اصطلاحی معنی مراد نہیں ہیں۔ اور وہ نفس کی بے نیازی ہے یعنی لغوی معنی مراد ہیں یا گھر والوں کی کفایت مراد ہے (۲) یا کہیں ہم کہ مالدار کی خیرات زیادہ بڑی ہے برکت کے اعتبار سے اس کے مال میں۔ اور نادار کی خیرات زیادہ ہے اس کے بخل کے ازالہ کے اعتبار سے۔ اور وہ یعنی دوسری توجیہ زیادہ فٹ ہے شریعت کے ضوابط سے۔

☆ ☆ ☆

خازن کو بھی خیرات کرنے سے ثواب ملنے کی وجہ

حدیث —— میں ہے کہ: ''جو امانت دار مسلمان خزانچی وہ چیز دیتا ہے جس کے دینے کا مالک نے حکم دیا ہے، اور پورا دیتا ہے اور خوش دلی سے دیتا ہے اور اسی کو دیتا ہے جس کو دینے کا حکم دیا ہے تو وہ دو خیرات کرنے والوں میں سے ایک ہے'' یعنی اس خازن کو بھی مالک کی طرح ثواب ملتا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۴۹)

تشریح: کچھ خازن تنگ دل اور بخیل ہوتے ہیں۔ ان کو مالک کا مال خرچ کرنا بھی گوارہ نہیں ہوتا۔ وہ اس طرح منہ بسور کر دیتے ہیں گویا اپنی گرہ سے دے رہے ہیں۔ حالانکہ ان پر واجب ہے کہ جو کچھ خیرات کرنے کا مالک نے حکم دیا ہے اس کو نافذ کریں۔ اس سے پہلو تہی ان کے لئے جائز نہیں۔ پس جو خازن خوش دلی سے اور دل کی بشاشت سے مالک کے حکم کی تعمیل کرتا ہے، اور پورا دیتا ہے تو یہ بات اس کے نفس کی فیاضی کی علامت ہے۔ اس لئے اس کو بھی حقیقی خیرات کرنے والے یعنی مالک کے بعد اجر و ثواب ملتا ہے۔

شوہر کے مال سے عورت کیا چیز خرچ کر سکتی ہے؟

(تین حدیثوں میں تعارض کا حل)

ایک حدیث: میں ہے کہ: ''جب عورت اپنے شوہر کی کمائی سے، اس کے حکم کے بغیر خرچ کرے، تو اس کو آدھا ثواب ملتا ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۴۸) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت شوہر کے مال سے بغیر اذن بھی ہر چیز خرچ کر سکتی ہے۔

دوسری حدیث: حجۃ الوداع کی تقریر میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ: ''کوئی عورت اپنے شوہر کے گھر میں سے، اس کی اجازت کے بغیر کچھ خرچ نہ کرے'' دریافت کیا گیا: کھانا بھی نہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''وہ تو ہمارا بہترین مال ہے'' یعنی کھانا بھی بے اجازت نہ دے (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۵۱)

تیسری حدیث: جب رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو بیعت کیا تو ایک باوقار خاتون کھڑی ہوئی، گویا وہ قبیلہ مُضر کی عورت ہے۔ اس نے عرض کیا: ہم اپنے باپوں، بیٹوں اور شوہروں پر بار ہیں یعنی ہمارے مصارف ان کے ذمّے ہیں۔ پس ہمارے لئے ان کے اموال میں سے کیا حلال ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''تر چیز: عورتیں کھا بھی سکتی ہیں اور ہدیہ بھی دے سکتی ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۵۲) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بعض چیزیں خرچ کرسکتی ہیں، ہر چیز خرچ نہیں کرسکتیں۔

تشریح: ان روایات میں کچھ تعارض نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ شوہر کا مال چونکہ غیر کا مال ہے، عورت کا اپنا مال نہیں، اس لئے مالک کی اجازت بہرحال ضروری ہے، اگرچہ وہ بچا ہوا کھانا ہی کیوں نہ ہو۔ دوسری حدیث میں یہی مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ البتہ دو صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں:

پہلی صورت: اگر شوہر نے بیوی کو خرچ کرنے کا اذنِ عام دے رکھا ہے یا دلالۃً اجازت ہے یعنی قرائن وعلامات سے اجازت سمجھی جاتی ہے تو عورت صریح اذن کے بغیر بھی خرچ کرسکتی ہے۔ مثلاً خرچ کرنے کا ایک موقعہ آیا۔ شوہر ساکت ہے، پہل نہیں کررہا اور عورت اس کے دیکھتے خرچ کرتی ہے۔ اور شوہر منع نہیں کرتا تو یہ دلالۃً اجازت ہے۔ پہلی حدیث میں اسی صورت کا بیان ہے۔ اور ''اس کے حکم کے بغیر'' سے مراد صریح اذن کے بغیر ہے۔

دوسری صورت: عورت: شوہر کے مال میں وہ تصرف کرسکتی ہے جو لوگوں میں معروف ہے۔ اور اس تصرف سے شوہر کا مال برباد نہیں ہوتا، بلکہ سنورتا ہے۔ جیسے کھانا بچ گیا۔ اگر وہ کسی غریب کو نہیں دیا جائے گا تو بگڑ جائے گا، ایسی صورت میں عورت شوہر کی اجازت کے بغیر بھی تصرف کرسکتی ہے۔ تیسری حدیث میں اسی کا بیان ہے۔

[٦] قوله صلى الله عليه وسلم: '' الخازنُ المسلم الأمين'' الحديث.

أقول: ربما يكون إنفاذُ ماوجب عليه، وليس له أن يمتنعَ عنه، أيضًا مُعَرِّفًا لسخاوة النفس، من جهة طيب الخاطر، والتوفية، وإثلاج الصدر، فلذلك كان متصدقًا بعد المتصدِّقِ الحقيقى.

[٧] ولا اختلاف بين حديث: '' إذا أنفقت المرأةُ من كَسْبِ زوجها، من غير أمره، فلها نصفُ الأجر'' وبين قوله صلى الله عليه وسلم فى حجة الوداع: '' لا تنفق امرأة شيئًا من بيتِ زوجها إلا بإذنه'' قيل: ولا الطعامَ؟ قال: ''ذلك أفضل أموالنا'' وحديث: قالت امرأةٌ: إِنَّا كَلٌّ على أبنائنا وآبائنا وأزواجنا، فما يحلُّ لنا من أموالهم؟ قال: ''الرَّطْبُ تَأْكُلْنَهُ وتُهْدِيْنَه'' لأن الأولَ فيما أَمَرَهُ عمومًا أو دِلالةً، ولم يأمره خصوصًا ولا صريحًا، ويكون الزوج لايبتدأ

بالصدقة، فلما بدأت المرأةُ سُلِّمَ ذلك منها.
وإنما يجوز التصرف في ماله بما هو معروف عندهم، وفيه إصلاحُ ماله، كالرُّطَبِ لو لم يهده لَفَسَدَ وضاع، ولايجوز في غير ذلك، وإن كان من الطعام.

ترجمہ: (۶) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''مسلمان امانت دار منیجر'' آخر تک۔ میں کہتا ہوں: کبھی ہوتا ہے اس چیز کا نافذ کرنا جو خازن پر واجب ہے، اور اس کے لئے جائز نہیں کہ اس سے باز رہے: یہ بھی نفس کی فیاضی کو پہچانوانے والا ہوتا ہے: دل کی خوشی اور پورا دینے اور تسکینِ قلب کی جہت سے، پس اسی وجہ سے وہ خازن: حقیقی خیرات کرنے والے کے بعد خیرات کرنے والا ہے۔

(۷) اور کوئی تعارض نہیں: درمیان حدیث: ''جب عورت خرچ کرے الخ'' اور حجۃ الوداع میں آپ کے ارشاد کے درمیان: ''نہ خرچ کرے الخ'' اور درمیان حدیث: ''ایک عورت نے کہا الخ'' اس لئے کہ پہلی روایت اس چیز کے بارے میں ہے جس کا شوہر نے حکم دیا ہے: اذنِ عام کے طور پر یا دلالت کے طور پر اور نہیں حکم دیا اس کا خصوصی طور پر اور نہ صریح طور پر۔ اور شوہر ہے کہ ابتدا نہیں کر رہا خیرات کرنے کی، پس جب عورت نے ابتدا کی تو عورت کی یہ بات تسلیم کر لی گئی۔

اور شوہر کے مال میں وہی تصرف جائز ہے جو لوگوں کے نزدیک معروف ہے، اور اس میں شوہر کے مال کو سنوارنا ہے۔ جیسے تر چیز: اگر نہیں ہدیہ کرے گا وہ اس کو تو وہ خراب ہو جائے گی اور ضائع ہو جائے گی۔ اور اس کے علاوہ میں تصرف جائز نہیں۔ اگرچہ وہ کھانے میں سے دینا ہو۔

☆ ☆ ☆

صدقہ کی ہوئی چیز خریدنے کی ممانعت کی وجہ

حدیث ـــــ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسی کو جہاد میں استعمال کرنے کے لئے گھوڑا دیا۔ وہ گھوڑا آپ کو بہت پسند تھا۔ موہوب لہ نے اس کا ناس کر دیا یعنی اچھی طرح دیکھ بھال نہ کی۔ آپ نے اس کو واپس خرید لینا چاہا۔ مگر خیال آیا کہ شاید وہ ان کو سستا بیچے، اس لئے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''اُسے نہ خریدو اور اپنی خیرات واپس نہ لو، اگرچہ وہ ایک درہم میں دے۔ اس لئے کہ بخشش دیکر واپس لینے والا اس کتے جیسا ہے جو اپنی قئی چاٹ لیتا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۵۴)

تشریح: صدقہ کی ہوئی چیز غریب سے خریدنا فی نفسہٖ جائز ہے۔ کیونکہ ملک بدلنے سے وصف بدل جاتا ہے۔ غریب کی ملک ہو جانے کے بعد وہ خیرات نہیں رہتی۔ جیسا کہ حضرت بَریرہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ سے ثابت ہے۔ تاہم دو وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے صدقہ کو خریدنے سے منع کیا:

پہلی وجہ: جب خیرات دینے والا اس چیز کو خریدے گا تو غریب نرمی برتے گا اور اس کو سستا بیچے گا یا وہ خود مراعات کا

مطالبہ کرے گا، پس جتنی قیمت کم کی جائے گی اتنی مقدار میں خیرات کو توڑنا لازم آئے گا۔ کیونکہ خیرات کی روح: مال سے بے تعلق ہوجانا ہے۔ پس جب اس کا اس چیز کی طرف میلان باقی ہے، اور وہ اس کو سستے دام سے حاصل کرنا چاہتا ہے، تو وہ اس مال سے پوری طرح بے تعلق نہیں ہوا۔ اور صدقہ کی روح کامل طور پر نہیں پائی گئی۔

دوسری وجہ: روح کی طرح عمل کی صورت کی تکمیل بھی مطلوب ہے۔ اسی وجہ سے جس سرزمین سے آدمی نے ہجرت کی ہے، وہاں اگر اتفاقاً موت آئے تو بھی ناپسندیدہ ہے، کیونکہ اس سے ہجرت کی صورت باطل ہوتی ہے۔ حجۃ الوداع کے موقعہ پر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ میں سخت بیمار پڑے تو انہیں اندیشہ ہوا کہ اگر میری مکہ میں موت آگئی تو میری ہجرت باطل ہوجائے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے انکو تسلی دی کہ ابھی تمہاری موت کا وقت نہیں آیا (بخاری حدیث ۱۲۹۵)

اسی طرح صدقہ کی روح کے ساتھ اس کی صورت کی تکمیل بھی مطلوب ہے۔ اور اس کی صورت یہی ہے کہ جو چیز دیدی: دیدی۔ اب کوڑی کے بھاؤ ملے تو بھی اس کو واپس نہیں لینا چاہئے۔

[۸] قوله صلى الله عليه وسلم: " لاتَعُدْ فى صدقتك، فإن العائدَ فى صدقته كالعائد فى قيئه"

أقول: سببُ ذلك: أن المتصدِّقَ إذا أراد الاشتراء يُسامَح فى حقه، أو يطلبُ هو المسامحةَ، فيكون نَقْضًا للصدقة فى ذلك القدر، لأن روح الصدقة نفضُ القلب تعلُّقَه بالمال، وإذا كان فى قلبه ميلٌ إلى الرجوع إليها بمسامحة لم يتحقق كمالُ النفض.

وأيضًا: فتوفير صورةِ العمل مطلوب، وفى الاسترداد نقض لها؛ وهو سِرُّ كراهية الموت فى أرض هاجر منها لله تعالىٰ، والله أعلم.

ترجمہ: (۸) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: "مت لوٹ تو تیری خیرات میں، پس بیشک اپنی خیرات میں لوٹنے والا اپنی قئی میں لوٹنے والے کی طرح ہے" —— میں کہتا ہوں: اس کی وجہ یہ ہے کہ خیرات کرنے والا جب خریدنا چاہے گا تو اس کے حق میں چشم پوشی کی جائے گی یا وہ چشم پوشی کا مطالبہ کرے گا۔ پس ہوگا وہ خریدنا خیرات کو توڑنا اتنی مقدار میں۔ اس لئے کہ صدقہ کی روح: دل کا جھاڑ دینا ہے مال کے ساتھ اپنے تعلق کو۔ اور جب اس کے دل میں چشم پوشی کے ذریعہ صدقہ کی طرف رجوع کی طرف میلان ہے یعنی اس کی خواہش ہے کہ سستا مل جائے تو خریدلوں، تو نہیں پایا گیا پورے طور پر دل کا جھاڑنا۔

اور نیز: پس عمل کی صورت کو پورا کرنا مطلوب ہے۔ اور واپس لینے میں اس صورت کو توڑنا ہے۔ اور وہ راز ہے موت کے ناپسند ہونے کا اس سرزمین میں جہاں سے اس نے اللہ کے لئے ہجرت کی ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

دوسری قسم

تفصیل وار احادیث مرفوعہ کے اسرار وحِکم کا بیان

روزوں کا بیان

باب (۱) روزوں کے سلسلہ کی اصولی باتیں

باب (۲) روزوں کی فضیلت کا بیان

باب (۳) روزوں کے احکام کا بیان

باب (۴) روزہ کے متعلقات کا بیان

باب ـــــ ۱

روزوں کے سلسلہ کی اصولیں باتیں

توحید ورسالت کی شہادت کے بعد نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج اسلام کے عناصر اربعہ ہیں یعنی اسلام: اللہ کی فرمانبرداری والے جس طرزِ حیات کا نام ہے اس کی تخلیق وتعمیر اور نشو ونما میں ان ارکانِ اربعہ کا اہم کردار ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نماز اور زکوٰۃ کے بیان سے فارغ ہوکر اب روزوں کا بیان شروع کرتے ہیں۔ مبحث خامس کے باب گیارہ میں بھی روزوں کی حکمتیں اور فوائد گذر چکے ہیں (رحمۃ اللہ ا:۷۵۰-۷۵۹)

روزوں کی مشروعیت کی وجہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو روحانیت اور حیوانیت کا نسخۂ جامعہ بنایا ہے۔ اس کی جبلّت میں وہ سارے مادّی اور سفلی تقاضے بھی رکھے ہیں جو دوسرے حیوانوں میں ہوتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ اس کی فطرت میں روحانیت کا وہ نورانی جوہر بھی رکھا ہے جو ملأ اعلی کی خاص دولت ہے۔ انسان کی سعادت کا مدار اس پر ہے کہ اس کا یہ روحانی جوہر حیوانی عنصر پر غالب اور حاوی رہے۔ اور اس کو حدود کا پابند رکھے۔ اور یہ جبھی ممکن ہے کہ بہیمی پہلو ملکوتی پہلو کی فرمانبرداری اور اطاعت شعاری کا عادی ہوجائے۔ اور اس کے مقابلہ میں سرکشی نہ کرے۔ روزے کی ریاضت کا خاص مقصد یہی ہے کہ اس کے ذریعے بہیمیت کو اللہ کے احکام کی پابندی اور روحانی تقاضوں کی تابعداری وفرمانبرداری کا خوگر بنایا جائے۔ اور چونکہ یہ چیز نبوت کے خاص مقاصد میں سے ہے اس لئے تمام پہلی شریعتوں میں بھی روزہ کا حکم رہا ہے۔ ارشاد پاک ہے: ''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلی امتوں پر فرض کئے گئے تھے، تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو'' (سورۃ البقرۃ آیت ۱۸۳) لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ میں روزوں کی حکمت کا بیان ہے یعنی اس حکم کا مقصد یہ ہے کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔ روزہ رکھنے سے عادت پڑے گی نفس کو اس کے متعدد تقاضوں سے روکنے کی۔ اور وہی بنیاد ہے تقویٰ کی (ماخوذ از معارف الحدیث ۴:۹۳)

شاہ صاحب قدس سرہ نے روزوں کی اسی حکمت پر دو پہلوؤں سے کلام کیا ہے: ایک: اس جہت سے کہ روزوں کی ریاضت سے بہیمیت کا زور ٹوٹتا ہے اور ملکیت کو اپنا جوہر دکھانے کا موقعہ ملتا ہے۔ دوسری جہت: یہ ہے کہ دیگر عبادات

کی طرح روزوں کے ذریعہ بھی بہیمیت کو ملکیت کا تابعدار اور فرمانبردار بنانا مقصود ہے۔اور جب وہ رام ہوجاتی ہے تو اس کی طرف سے کوئی اندیشہ باقی نہیں رہتا، اور آدمی پاکبازی کی راہ پر بے خطر گامزن ہوجاتا ہے۔یہی تقوی کی بنیاد ہے۔فرماتے ہیں:

روزوں کی مشروعیت کی حکمت کے دو پہلو ہیں:

ایک پہلو: ــــ روزوں سے بہیمیت کا زور ٹوٹتا ہے ــــ جب بہیمیت منہ زور ہوجاتی ہے تو وہ ملکیت کے احکام کو ظاہر ہونے کا موقع نہیں دیتی۔اس وقت بہیمیت کا زور توڑنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔اور اس کی صورت یہ ہے کہ بہیمیت کو جن چیزوں سے شہ ملتی ہے ان کو حتی الامکان کم کیا جائے۔بہیمیت کو تین چیزیں قوی کرتی ہیں: کھانا، پینا اور شہوانی لذتوں میں منہمک ہونا۔عورتوں کے ساتھ اختلاط وہ کام کرتا ہے جو آسودگی کے ساتھ کھانا پینا نہیں کرتا۔یعنی اس سے بہیمیت بہت زور پکڑتی ہے۔چنانچہ تمام وہ لوگ جو ملکیت کے احکام کے ظہور کے خواہش مند ہیں: ان اسباب کے کم کرنے پر متفق ہیں۔حالانکہ ان کے زمانے مختلف ہیں اور ان کے ممالک دور دور واقع ہوئے ہیں۔یہ اتفاق اس بات کی دلیل ہے کہ مذکورہ چیزوں میں کمی کرنے سے بہیمیت کا زور ٹوٹتا ہے۔اور ملکیت کو نمود کا موقعہ ملتا ہے۔

دوسرا پہلو: ــــ روزوں کے ذریعہ بہیمیت کو ملکیت کا تابعدار بنانا مقصود ہے ــــ شریعت کا منشا یہ نہیں ہے کہ بہیمیت نابود ہوجائے۔وہ ایک فطری امر ہے۔اور فطری چیزیں ختم نہیں ہوسکتیں۔مقصود صرف اس کو تابعدار اور فرمانبردار بنانا ہے۔اس طرح کہ وہ ملکیت کے اشارہ پر کام کرنے لگے۔اور اس پر ملکیت کا رنگ پوری طرح چڑھ جائے۔ اور ملکیت: بہیمیت سے کنارہ کش ہوجائے۔اس طرح کہ وہ بہیمیت کا گھٹیا رنگ قبول نہ کرے۔اور جس طرح مُہر کی انگوٹھی کے ابھرے ہوئے حروف موم پر نقش ہوجاتے ہیں، ملکیت میں بہیمیت کے خسیس نقوش نہ ابھریں۔

اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ملکیت پوری سنجیدگی سے اپنا کوئی تقاضا بہیمیت کے سامنے پیش کرے، اور وہ تعمیل کرے۔ نہ سرکشی کرے، نہ عملدرآمد سے باز رہے۔پھر اسی طرح بار بار ملکیت: بہیمیت کے سامنے اپنی پسند کے کام پیش کرتی رہے۔اور وہ حکم کی تعمیل کرتی رہے۔پس رفتہ رفتہ بہیمیت اطاعت کی خوگر اور مشّاق ہوجائے گی۔

اور وہ باتیں جن کو ملکیت سنجیدگی سے چاہے۔اور بہیمیت جن کی بجا آوری پر خواہی نخواہی مجبور ہو، وہ دو طرح کے کام ہیں:

ایک: وہ کام ہیں جن سے ملکیت کو انشراح اور بہیمیت کو دل تنگی لاحق ہوتی ہے۔جیسے عبادتوں کے ذریعہ، خاص طور پر روزوں کی ریاضت کے ذریعہ، فرشتوں کے ساتھ مشابہت پیدا کرنا۔اور تلاوتِ قرآن وغیرہ کے ذریعہ خدائے قدوس کے بارے میں آگہی حاصل کرنا یعنی ذات وصفات کے علوم سے واقف ہونا۔یہ دونوں کام ملکیت کا خاصہ ہیں۔بہیمیت ان سے کوسوں دور ہے۔پس جب ملکیت: بہیمیت سے اس نوع کے کام کرائے گی یعنی طبیعت پر زور ڈال کر آدمی یہ کام کرے گا تو ملکیت کو انشراح اور سرور وانبساط حاصل ہوگا۔اور بہیمیت کی ناک خاک آلود ہوگی۔

دوم: بہیمیت جن باتوں کو چاہتی ہے۔جن سے وہ لطف اندوز ہوتی ہے۔اور نشاطِ جوانی میں جن کاموں کی وہ مشتاق ہوتی ہے یعنی شہوتِ بطن وفرج والے کام: ملکیت ان کاموں کو بالکل چھوڑ دے۔اوران سے کنارہ کشی اختیار کرلے تو رفتہ رفتہ بہیمیت رام ہوجائے گی۔یہی روزہ ہے یعنی روزوں کا خاص مقصد یہی ہے اوراسی حکمت سے وہ مشروع کئے گئے ہیں۔

﴿من أبواب الصوم﴾

لما كانت البهيمةُ الشديدةُ مانعةً عن ظهور أحكامِ الملكية: وجب الاعتناء بقهرها. ولما كان سببُ شِدَّتها، وتَراكُمِ طبقاتِها، وغزارَتِهَا؛ هو الأكلُ، والشرب، والانهماكُ فى اللَّذَّاتِ الشهوية، فإنه يفعل مالا يفعله الأكلُ الرَّغَدُ: وجب أن يكون طريقُ القهر تقليلَ هذه الأسباب؛ ولذلك اتفق جميعُ من يريدون ظهورَ أحكامِ الملكية على تقليلها ونَقْصِها، مع اختلاف مذاهِبِهم وتباعُدِ أقطارِهم.

وأيضًا: فالمقصودُ إذعانُ البهيمية للملكية، بأن تتصرف حَسَبَ وَحْيِهَا، وَتَنْصَبِغَ بِصِبْغِها، وتَمَنُّعُ الملكية منها؛ بأن لاتقبل ألوانَها الدَّنِيَّةَ، ولا تنطبع فيها نقوشُها الخسيسةُ، كما تنطبع نقوشُ الخاتَم فى الشمعة.

ولاسبيل إلى ذلك إلا أن تقتضىَ الملكيةُ شيئًا من ذاتها، وتوحيه إلى البهيمية، وتَقْتَرِحَه عليها، فتنقادَ لها، ولاتبغى عليها، ولا تتمنعَ منها، ثم تقتضى أيضًا، وتنقادُ هذه أيضًا: ثم وثم، حتى تعتادَ ذلك وتتمرَّنَ.

وهذه الأشياءُ التى تقتضيها هذه من ذاتها، وتُقْسَرُ تلك عليها، على رغمِ أنفها، إنما تكون من جنس مافيه انشراح لهذه، وانقباض لتلك، وذلك: كالتشبُّهِ بالملكوت، والتطلُّع للجبروت، فإنهما خاصيةُ الملكية، بعيدةٌ عنهما البهيميةُ غايةَ البعد، أو تركِ ما تقتضيه البهيمية، وتستلِذُّه، وتشتاق إليه فى غَلوائها؛ وهذا هو الصوم.

ترجمہ: روزوں کے سلسلہ کی اصولی باتیں: جب سخت بہیمیت: ملکیت کے احکام کے ظہور سے مانع تھی، تو اس کو مغلوب کرنے کا اہتمام کرنا ضروری ہوا۔اور جب بہیمیت کی شدت کا، اوراس شدت کے مراتب کے تو بہ تو جمنے کا اور ان مراتب کی کثرت کا سبب کھانا پینا اور شہوانی لذتوں میں منہمک ہونا تھا، پس بیشک شہوانی لذتوں میں انہماک تو وہ کام کرتا ہے جو آسودگی سے کھانا نہیں کرتا۔تو ضروری ہوا کہ ملکیت کے غلبہ کی راہ اُن اسباب کو کم کرنا ہو۔اوراسی وجہ سے متفق ہیں تمام وہ لوگ جو ملکیت کے احکام کا ظہور چاہتے ہیں اُن اسباب کے کم کرنے پر اوران کو گھٹانے پر، ان کے

مذاہب کے اختلاف اوران کے ممالک کے دوردور ہونے کے باوجود۔

اور نیز: پس مقصود بہیمیت کا ملکیت کا تابع ہونا ہے، بایں طور کہ بہیمیت تصرف کرے ملکیت کے اشارے کے موافق۔ اوروہ رنگین ہوجائے ملکیت کے رنگ سے۔اور(مقصود) ملکیت کا باز رہنا ہے بہیمیت سے، بایں طور کہ وہ بہیمیت کے گھٹیا رنگ قبول نہ کرے۔اوراس میں بہیمیت کے خسیس نقوش نہ چھپیں، جس طرح انگوٹھی کے نقوش موم میں چھپتے ہیں۔

اوراس کی راہ نہیں ہے مگر یہ کہ ملکیت چاہے کوئی چیز اپنی ذات سے یعنی سچے داعیہ سے اوراشارہ کرے اس کا بہیمیت کو،اور مطالبہ کرے اس کا بہیمیت سے، پس وہ ملکیت کی تابعداری کرے۔اوروہ ملکیت کے سامنے سرکشی نہ کرے۔اوروہ ملکیت کی بات ماننے سے باز نہ رہے۔ پھر ملکیت کچھ اور باتیں چاہے اور بہیمیت تابعداری کرے۔ پھر اور پھر۔ یہاں تک کہ بہیمیت اس چیز کی عادی ہوجائے۔اوراس کی مشتاق ہوجائے۔

اور یہ چیزیں جن کو ملکیت اپنی ذات سے چاہے اور بہیمیت ان کاموں کے کرنے پر مجبور کی جائے، خاک میں ناک رگڑ کر، وہ چیزیں انہی کاموں کے قبیل سے ہوتی ہیں جن میں ملکیت کے لئے فرحت ہے۔اور بہیمیت کے لئے دل تنگی ہے۔ اوروہ کام جیسے ملکوت (فرشتوں کے احوال) سے مشابہت پیدا کرنا،اور جبروت (خدائے قدوّس) کی طرف جھانکنا۔ پس بیشک یہ دونوں باتیں ملکیت کا خاصہ ہیں۔ بہیمیت ان سے کوسوں دور ہے۔یا (جیسے) اس چیز کو چھوڑنا جس کو بہیمیت چاہتی ہے۔اور جس سے وہ لطف اندوز ہوتی ہے۔اوراپنے جوش کے وقت میں جس کی وہ مشتاق ہوتی ہے۔اور یہی روزہ ہے۔

ترکیب: تَمَنُّع (مصدر) کا عطف إذعان پر ہے......اور ترکِ کا عطف تشبُّہ پر ہے۔

نوٹ: اسی طرح کی عبارت رحمۃ اللہ (۱:۵۲۱) میں بھی گذر چکی ہے۔وہاں حل لغات بھی ہے۔ضرورت ہوتو اس کو دیکھ لیا جائے۔

☆ ☆ ☆

ہمیشہ روزہ رکھنا ممکن نہیں

ملکیت کو تقویت پہنچانے کے لئے اور بہیمیت کو ناتواں کرنے کے لئے اگرچہ ہمیشہ روزہ رکھنا ضروری ہے، مگر معاشی مہمات اوراموال وازواج کے ساتھ اختلاط کی وجہ سے یہ بات عام لوگوں کے لئے ناممکن ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ مؤمن زمانہ کا ایک وقفہ گذرنے کے بعد روزوں کی اتنی مقدار کا التزام کرے جس سے ملکیت کی نمود کی حالت اوراس کی اپنی پسند کی باتوں پر بہجت وفرحت کا حال معلوم ہوجائے یعنی ملکیت کے ظہور وغلبہ کی حالت واضح ہوجائے اور خوب پتہ چل جائے کہ بہیمیت کے تقاضے تھم گئے ہیں۔اور درمیانی وقفہ میں مؤمن سے جو کوتاہیاں سرزد ہوگئی ہیں، روزوں کے ذریعہ ان کا کفارہ بھی ہوجائے۔اور مؤمن کا حال اس اصیل گھوڑے جیسا ہوجائے، جس کی پچھاڑی ایک حلقہ سے بندھی

ہوئی ہو، اور وہ اِدھر اُدھر دولتّیاں چلا کر اپنے ٹھکانہ پر آ کھڑا ہو۔ اسی طرح مؤمن بھی کوتاہیاں کرنے کے بعد رمضان میں ٹھکانے پر آ جائے۔ اور روزوں کا اس طرح التزام کرنا بھی ایک طرح کی مداومت ہے۔ جب حقیقی مداومت ممکن نہیں تو اسی فی الجملہ مداومت پر اکتفا کرنا چاہئے۔

روزوں کی مقدار کی تعیین ضروری ہے

جب عام لوگوں کے لئے ہمیشہ روزہ رکھنا ممکن نہیں، وہ وقفہ وقفہ ہی سے روزے رکھ سکتے ہیں، تو ضروری ہے کہ روزوں کی مقدار متعین کردی جائے، تاکہ لوگ افراط وتفریط میں مبتلا نہ ہوں۔ اگر روزوں کی مقدار متعین نہیں ہوگی تو کوتاہی کرنے والے اتنے کم روزے رکھیں گے کہ وہ قطعاً بےسود اور غیر مفید ہوں گے۔ اور حد سے تجاوز کرنے والے اتنے زیادہ روزے رکھیں گے کہ ان کے اعضاء کمزور، نشاط کافور اور نفس سست ہوجائے گا اور روزے ان کو قبرستان پہنچادیں گے جبکہ روزے ایک تریاق یعنی زہریلی دوا ہیں۔ وہ اس لئے تجویز کئے گئے ہیں کہ نفس کا زہر دور ہو اور یہ بھی مقصد ہے کہ نسمہ مغلوب ومقہور ہو۔ جو لطیفۂ انسانی یعنی روح ربانی کی سواری اور اس کے کمالات کے ظہور کا چبوترہ ہے۔ پس ضروری ہے کہ روزوں کی مقدار بقدر ضرورت ہی مقرر کی جائے۔ یعنی جن سے مقصد حاصل ہوجائے اور کوئی نقصان نہ ہو۔

ولما لم تكن المواظبةُ على هذه من جمهور الناس ممكنةً، مع ما هم فيه من الارتفاقات المُهِمَّةِ، ومعافسةِ الأموال والأزواج: وجب أن يَلْتَزِمَ بعدَ كل طائفة من الزمان مقداراً يُعَرِّفُ حالةَ ظهور الملكية، وابتهاجِها بمقتَضَيَاتِها، ويكفِّرُ ما فرط منه قبلَها، ويكون مثلُه كمثل حصان طِوَلُه مربوط بآخِيَّةٍ، يَستَنُّ يميناً وشمالاً، ثم يرجع إلى آخِيَّتِهِ؛ وهذه مداومة بعد المداوة الحقيقية.

ثم وجب تعيينُ مقداره: لئلا يفرِّطَ أحد، فيستعمِلَه منه مالا ينفعه ويَنْجَعُ فيه، أو يُفْرِطَ مفرط، فيستعمِلَ منه مايوهن أركانَه، ويذهب نشاطَه، ويُنَفِّهُ نفسَه، ويزيره القبورَ.

وإنما الصوم ترياق يُستعمل لدفع السموم النفسانية، مع مافيه من نِكاية بمطيةِ اللطيفة الإنسانية ومَنَصَّتِهَا، فلا بد أن يُتقدَّر بقدر الضرورة.

ترجمہ: اور جب عام لوگوں کے لئے اِس (روزوں) پر مداومت ممکن نہ تھی، اس چیز کے ساتھ جس میں وہ ہیں یعنی مشغول کرنے والی معاشی تدبیرات نافعہ، اور اموال وازواج کے ساتھ اختلاط: تو ضروری ہوا کہ آدمی التزام کرے زمانہ کے ہر ایک حصہ کے بعد ایک ایسی مقدار کا جو پہچانوائے ملکیت کے ظہور اور اپنے تقاضوں پر اس کی فرحت کی حالت کو (یعنی

روزوں کی اُس مقدار سے ملکیت کا ظہور اور غلبہ واضح ہو جائے) اور روزوں کی وہ مقدار اُن کوتاہیوں کو مٹادے جو اس سے قبل ازیں سرزد ہوگئی ہیں۔ اور اس کا حال اس عمدہ گھوڑے جیسا ہو جائے جس کی رسی کسی حلقہ سے بندھی ہوئی ہو، وہ دائیں بائیں اُچھلے کودے، پھر اپنی کھونٹی کی طرف لوٹ آئے۔ اور یہ بھی ایک طرح کی مداومت ہے مداومتِ حقیقی کے بعد۔

پھر ضروری ہے اُس مقدار کے اندازے کی تعیین: تاکہ کوئی شخص کوتاہی نہ کرے۔ پس استعمال کرے وہ اس مقدار سے اس کو جو اس کے لئے مفید اور سودمند نہیں ہے۔ یا حد سے تجاوز کرے کوئی حد سے بڑھنے والا، پس استعمال کرے وہ اس مقدار سے اس کو جو اس کے عضاء کو کمزور کردے۔ اور اس کے نشاط کو ختم کردے۔ اور اس کے نفس کو سست کردے۔ اور اس کو قبروں کی زیارت پر ابھارے یعنی قبرستان پہنچا کردم لے۔

اور روزہ تو ایک تریاق ہے، جو استعمال کیا جاتا ہے نفسانی زہروں کو دور کرنے کے لئے، اس چیز کے ساتھ یعنی اس فائدہ کے ساتھ جو اس میں ہے یعنی لطیفۂ انسانی (روح ربانی) کی سواری اور اس کے چبوترہ یعنی روح حیوانی کو مغلوب کرنا۔ پس ضروری ہے کہ اس (روزوں) کا اندازہ کیا جائے ضرورت کی مقدار کے ساتھ۔

لغات: المُهِمّ: شدید معاملہ، مشغول کرنے والا معاملہ، جمع مَهَامّ...... عَافَسَه: مزاولت کرنا، اختلاط اور میل جول رکھنا۔ کہا جاتا ہے: بَاتَ يُعافِسُ الأمورَ: وہ رات بھر کاموں میں لگا رہا...... آخِيَّة: وہ رسّی جس کے دونوں سرے زمین میں گاڑ دیتے ہیں، اور اوپر کو حلقہ سا نکلا ہوا ہوتا ہے، جس میں جانوروں کو باندھتے ہیں...... اِسْتَنَّ الفرسُ: دوڑنا، بھاگنا، اُچھل کود کرنا، دولتّی چلانا...... نَجَعَ الطعامُ فى الإنسان: فائدہ مند ہونا (لا محذوف ہے أى لايَنْجَعُ فيه)...... نَفَّهَ الناقةَ: تھکانا، سست کرنا نَفَهَ (ف) نُفُوْهًا الرجلُ: کمزور اور سست ہونا...... أَزَارَه: زیارت کرنے پر برانگیختہ کرنا...... نَكَى يَنْكِيْ نِكايةً العدوَّ: زخمی کر کے غالب آنا...... المَنَصَّة: حجلۂ عروسی، نمایاں کمرہ، وہ چبوترہ جس پر ڈرامہ کھیلا جاتا ہے۔

تشریح: انسان تین چیزوں کا مجموعہ ہے: ایک: بدنِ خاکی جو روح حیوانی (نسمہ) کا لبادہ ہے۔ جب یہ روح بدن سے نکل جاتی ہے تو وہ لاش یعنی لاشئ رہ جاتا ہے۔ دوسری: روح حیوانی یعنی نسمہ۔ یہ غذاؤں کے خلاصہ سے پیدا ہونے والی ایک اسٹیم ہے۔ اس کا بدن سے براہ راست تعلق ہے۔ تیسری: انسان کی مخصوص روح، جس کو روح ربانی اور روح قدسی کہتے ہیں۔ لطیفۂ انسانی سے یہی روح مراد ہے۔ کیونکہ یہ روح انسان کے ساتھ خاص ہے۔ دیگر حیوانات میں یہ روح نہیں ہوتی۔ اس کا براہ راست تعلق نسمہ سے ہے۔ اور اس کے توسط سے بدن سے تعلق ہوتا ہے۔ نسمہ اس کی سواری ہے اور نسمہ ہی اس روح کے کمالات کے ظہور کا اسٹیج ہے۔ روزوں کے ذریعہ اسی نسمہ کو مغلوب و مقہور کرنا مقصود ہے، کیونکہ یہی بہیمیت کی حامل روح ہے۔

تصحیح: مقداراً اصل میں مقدارٌ تھا اس صورت میں یلتزم مجہول ہوگا۔ یہ تصحیح تینوں مخطوطوں سے کی ہے۔ اور من نكاية میں من مخطوطہ کراچی سے بڑھایا ہے۔

☆ ☆ ☆

کھانا پینا کم کرنے کا مناسب طریقہ

کھانا پینا کم کرنے کے دو طریقے ہیں: ایک طریقہ یہ ہے کہ کھانے پینے کی مقدار گھٹا دی جائے یعنی بس برائے نام کھایا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کھانوں کے درمیان عادۃً جو وقفہ (فاصلہ) ہوتا ہے، اس کو بڑھا دیا جائے۔ شرائع سماویہ میں دوسرا طریقہ ہی پسند کیا گیا ہے۔ اور اس کی دو وجہیں ہیں:

پہلی وجہ: کھانوں کے درمیان وقفہ بڑھانے سے بدن ہلکا پڑتا ہے اور نفس تھکتا ہے (اور یہی روزے سے مقصود ہے) اور یہ طریقہ سرِ دست بھوک پیاس کا مزہ بھی چکھاتا ہے (جس سے دل میں غریبوں کی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے) اور یہ طریقہ بہیمیت پر حیرت اور دہشت طاری کرتا ہے۔ اور اس پر واضح طور پر حملہ آور ہوتا ہے (جس سے بہیمیت مغلوب ہوتی ہے۔ اور خشیت وتقوی کی صفت پیدا ہوتی ہے) اور پہلا طریقہ مضر ہے۔ اس سے ایسی لاغری آتی ہے جو محسوس نہیں ہوتی۔ ناتوانی کے ساتھ آدمی چلتا پھرتا رہتا ہے۔ اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ مگر بالآخر وہ بے طاقتی ہلاکت کے کنارے پر پہنچا دیتی ہے۔

دوسری وجہ: کھانے پینے کی مقدار گھٹانے کا معاملہ عام قانون سازی کے دائرہ میں مشکل ہی سے آسکتا ہے، اس لئے کہ کھانے پینے کے معاملہ میں لوگوں کے احوال بہت زیادہ مختلف ہیں۔ کوئی دن بھر میں ایک رطل کھاتا ہے تو کوئی دو رطل۔ اور جس مقدار سے پہلے کا حق پورا ادا ہو جاتا ہے یعنی وہ شکم سیر ہو جاتا ہے، وہ مقدار دوسرے کے پیٹ کی آگ بھی نہیں بجھا سکتی۔

ثم إن تقليلَ الأكل والشرب له طريقان: أحدهما: أن لايتناول منهما إلا قدراً يسيرًا، والثانی: أن تكونَ المدة المتخلِّلَةُ بين الأَكلاَتِ زائدةً على القدر المعتاد؛ والمعتبرُ فی الشرائع هو الثانی، لأنـه يُـخَـفِّفُ ويُـنَفِّهُ، ويُذيق بالفعل مذاقَ الجوع والعطش، ويُلحق البهيميةَ حيرةً ودهشةً، ويأتی عليها إتيانا محسوساً؛ والأولُ إنما يَضَعِّفُ ضعفاً يمرُّ به، ولايجد بالاً حتی يُذْنِفَه.

وأيضًا: فإن الأول لايأتی تحت التشريع العام إلا بجُهدٍ، فإن الناس على منازلَ مختلفةٍ جدًّا، يأكل الواحدُ منهم رَطْلاً، والآخرُ رطلين، والذی يحصل به وَفاءُ الأول هو إجحافُ الثانی.

ترجمہ: پھر کھانے پینے کو کم کرنے کے دو طریقے ہیں: ایک یہ کہ وہ ان دونوں سے نہ لے مگر تھوڑی مقدار۔ اور دوسرا یہ کہ کھانوں کے درمیان واقع ہونے والی مدتِ معتاد مقدار سے زائد ہو۔ اور شریعتوں میں معتبر دوسرا ہی طریقہ ہے، اس لئے کہ وہ بدن کو ہلکا اور لاغر کرتا ہے۔ اور بالفعل بھوک اور پیاس کا مزہ چکھاتا ہے۔ اور بہیمیت سے حیرت ودہشت کو ملاتا ہے اور اس پر محسوس طور پر حملہ کرتا ہے۔ اور پہلا طریقہ صرف ایسا کمزور کرتا ہے جس کے ساتھ آدمی چلتا پھرتا رہتا ہے، اور وہ اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتا، یہاں تک کہ وہ طریقہ اس کو قریب المرگ کر دیتا ہے۔

اور نیز: پس بیشک پہلا طریقہ نہیں آتا ہے تشریع عام کے تحت مگر انتہائی کوشش سے۔ پس بیشک لوگ بہت زیادہ مختلف مراتب پر ہیں: ان میں سے ایک کھاتا ہے ایک رطل، اور دوسرا دو رطل۔ اور وہ مقدار جس کے ذریعہ اول کا حق پورا ادا ہوتا ہے۔ وہی مقدار دوسرے کے لئے بہت ہی کم ہے۔

لغات: مَذَاق (مصدر) ذائقہ، مزہ...... أَتٰى عليه: حملہ کرنا...... أَدْنَفَه: بیماری بڑھ گئی اور اس کو قریب المرگ کر دیا...... إِجْحَاف: جڑ سے مٹا دینا۔ اور بطور استعارہ نقص فاحش۔ یہاں یہی معنی مراد ہیں۔

☆ ☆ ☆

روزہ اور ان کی مقدار کا انضباط

دن بھر مفطرات سے رُکنے کا نام روزہ ہے۔ اور دن: طلوع فجر سے غروبِ شمس تک کا وقت ہے۔ اور روزے ایک ماہ کے ضروری ہیں۔ اور مہینہ: چاند سے چاند تک کا نام ہے۔ یہ چار امور طے کرنے کے لئے پانچ باتیں پیشِ نظر رکھنی ضروری ہیں۔

پہلی بات: ـــــ کھانوں کے درمیان کا وقفہ۔ عرب وعجم اور دیگر صحیح مزاج والے لوگوں کی عام عادت یہ ہے کہ وہ دن میں دو مرتبہ: صبح وشام کھاتے ہیں۔ یا رات دن میں ایک ہی مرتبہ کھاتے ہیں۔ پہلی صورت میں بھوک پیاس کا کوئی خاص احساس نہیں ہوتا۔ البتہ دوسری صورت میں یعنی اگر رات تک کچھ کھایا پیا نہ جائے تو بھوک پیاس کا خوب مزہ آتا ہے۔

دوسری بات: ـــــ کھانے پینے میں کمی کرنے کا کوئی معیار نہیں اور یہ معاملہ رائے مبتلی بہ پر بھی نہیں چھوڑا جاسکتا یعنی لوگوں سے یہ کہہ دیا جائے کہ ہر شخص اتنی مقدار کھائے جس سے اس کی بہیمیت مغلوب رہے۔ ایسا ابہام قانون سازی کے موضوع کے خلاف ہے۔ تعیین کے بغیر لوگ حکم کی تعمیل نہیں کر سکتے۔ نیز عربی کی مشہور کہاوت ہے کہ: ''بھیڑیے کو گلہ بانی سونپنا بکریوں پر ستم ڈھانا ہے'' یعنی کھاؤ سے کم کھانے کی امید کرنا خام خیالی ہے۔ ہاں سلوک واحسان کے باب میں ایسی مجمل ہدایت دی جاسکتی ہے۔ کیونکہ وہ حضرات خود ہی احتیاط شیوہ ہوتے ہیں۔

تیسری بات: ـــــ کھانوں کے درمیان کا وقفہ جان لیوا نہیں ہونا چاہئے۔ مثلاً تین شبانہ روز کا فاصلہ۔ کیونکہ اتنا لمبا وقفہ موضوع شریعت کے خلاف ہے۔ شریعت حسب استطاعت ہی حکم دیتی ہے۔ اور اتنا طویل وقفہ عام لوگوں کے لئے ناقابلِ تحمل ہے۔

چوتھی بات: ـــــ ترکِ مفطرات (روزہ) کا عمل بار بار ہونا چاہئے، تاکہ طبیعت خوگر اور نفس اطاعت شعار ہو جائے۔ صرف ایک دو دن کی بھوک، خواہ وہ کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو، بالکل بے فائدہ ہے یعنی روزے چند دن کے کافی نہیں۔ ان کی ایک معتدبہ مقدار مقرر کرنی ضروری ہے۔

پانچویں بات: ـــــ روزوں کی مقدار وہ متعین کرنی چاہئے جو پہلے سے دیگر ملتوں میں رائج ہو۔ جس سے ہر کہ ومِہ،

شہری اور دیہاتی واقف ہو۔ اور خود اسی مقدار کو یا اس جیسی مقدار کو بڑی ملتیں اپنائے ہوئے ہوں۔ جیسے چلّہ کشی یعنی چالیس دن کی ریاضت کا عام معمول ہے۔ ایسی مقدار تجویز کرنے سے فائدہ یہ ہوگا کہ صبا رفتار سواریاں جہاں تک اس کی تشہیر کریں گی لوگ مانتے ہی چلے جائیں گے۔

مذکورہ بالا ملاحظات (توجہ طلب باتیں) درج ذیل چار باتیں واجب کرتے ہیں:

پہلی بات: روزے کا قانون یہ ہو کہ دن بھر کھانا پینا اور جماع ترک کر دیا جائے۔ کیونکہ ایک دن سے کم رکنا تو ایسا ہے کہ دوپہر کا کھانا ذرا تاخیر سے کھایا۔ اور رات میں کھانا پینا ترک کرنا تو معتاد ہے۔ لوگ رات میں ان چیزوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ پس رات کا روزہ مقرر کرنا بے فائدہ ہے۔

دوسری بات: روزے ایک پورے ماہ کے تجویز کئے جائیں۔ نہ کم نہ زیادہ۔ کیونکہ ہفتہ دو ہفتہ بہت تھوڑی مدت ہے۔ جس کا اثر نہیں ہوسکتا۔ اور دو ماہ کے مسلسل روزے شاق ہیں۔ اس مدت میں آنکھیں دھنس جاتی ہیں اور نفس تھک جاتا ہے۔ ہمارا بار بار کا یہ مشاہدہ ہے۔

تیسری بات: دن کا انضباط صبح صادق سے غروب آفتاب تک کے ذریعہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ یہی عربوں کا حساب ہے۔ دن کی مقدار ان کے نزدیک یہی ہے۔ اسلام سے پہلے عربوں میں عاشوراء (دس محرم) کا روزہ صبح سے شام تک کا مشہور تھا۔

چوتھی بات: مہینہ کا انضباط ایک چاند سے دوسرے چاند کے ذریعہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ یہی عربوں کے نزدیک مہینہ ہے۔ ان میں قمری حساب رائج تھا۔ وہ شمسی حساب سے ناواقف تھے۔

أما المدةُ المتخلّلَةُ بين الأَكَلات: فالعرب والعجم، وسائر أهل الأمزجة الصحيحةِ، يتفقون فيها؛ وإنما طعامُهم غداءٌ وعَشاءٌ، أو أكلةٌ واحدةٌ في اليوم والليلة، ويحصل مَذَاقُ الجوع بالكف إلى الليل.

ولايمكن أن يفوَّض المقدار اليسير إلى المبتلين المكلَّفِين، فيقال مثلاً: لِيأْكلْ كلُّ واحد منكم ماتنقهر به بهيميتُه، لأنه يخالف موضوعَ التشريع، ومن المثل السائر: ''من اسْتَرْعَى الذئْبَ فقد ظلم!'' وإنما يسوغُ مثلُ ذلك في الإحسانيات.

ثم يجب أن تكون تلك المدةُ المتخلَّلَة غيرَ مُجْحِفَةٍ، ولا مُسْتَأْصِلَةٍ، كثلاثة أيام بلياليها، لأن ذلك خلافُ موضوع الشرع، ولايعمل به جمهورُ المكلَّفين.

ويجب أن يكون الإمساك فيها متكرراً، ليحصل التمرُّنُ والانقياد، وإلا فجوعٌ واحدٌ أَيَّ فائدةٍ يفيد، وإن قَوِيَ واشْتَدَّ؟!

ويجب أن يُذْهَبَ في ضبط الانقهار الغير المُجْحِفِ، وضبطِ تكرارِه، إلى مقاديرَ مُسْتَعْمَلَةٍ عندهم، لا تخفى على الخامل والنبيه، والحاضر والبادي، وإلى ما يستعمِلُه، أو يستعمِلُ نظيرَه

طوائفُ عظيمةٌ من الناس، لتذهبَ شُهرتُها وتسليمُها غايةَ النَّعْبِ منهم.

وأوجبت هذه الملاحظات أن يُضْبَطَ الصومُ بالإمساك من الطعام والشراب والجماع يوماً كاملاً، إلى شهر كاملٍ، فإن مادون اليوم هو من باب تأخير الغَداء، وإمساكُ الليل معتادٌ، لايجدون له بالاً، والأسبوعُ والأسبوعان مدةٌ يسيرةٌ لاتؤثِّر، والشهرانِ تَغُوْرُ فيهما الأَعْيُنُ، وتَنْفَهُ النفسُ، وقد شاهدنا ذلك مراتٍ لاتُحصىٰ.

ويُضبط اليومُ بطلوع الفجر إلى غروب الشمس، لأنه هو حساب العرب، ومقدار يومهم، والمشهورُ عندهم في صوم يوم عاشوراء؛ والشهرُ برؤية الهلال إلى رؤية الهلال، لأنه هو شهر العرب، وليس حسابهم على الشهور الشمسية.

ترجمہ:(۱) رہی کھانوں کے درمیان واقع ہونے والی مدت: تو عرب وعجم اور دیگر صحیح مزاج والے لوگ اُس میں متفق ہیں۔اوران کا کھانا صبح وشام کا کھانا ہی ہے۔یا رات دن میں ایک ہی مرتبہ کھانا ہے۔اور بھوک کا مزہ حاصل ہوتا ہے رات تک رُکنے سے۔

(۲) اورنہیں ممکن ہے کہ''تھوڑی مقدار'' سونپ دی جائے مبتلی بہ مکلفین کو۔پس مثال کے طور پر کہا جائے:''چاہئے کہ کھائے تم میں سے ہر ایک اتنی مقدار جس سے اس کی بہیمیت مغلوب ہو جائے'' کیونکہ یہ چیز قانون سازی کے موضوع کے خلاف ہے۔اورلوگوں میں پھیلی ہوئی کہاوتوں میں سے ہے:''جس نے بھیڑیے سے بکریاں چرانے کے لئے کہا اس نے یقیناً ظلم کیا'' اوراس طرح کی بات جائز ہے صرف احسانیات (سلوک وتصوف) میں۔

(۳) پھر ضروری ہے کہ وہ درمیانی مدت جڑ کھودنے والی نہ ہو۔نہ بالکل تباہ کرنے والی ہو۔جیسے تین دن ان کی راتوں کے ساتھ۔اس لئے کہ یہ مدت شریعت کے موضوع کے خلاف ہے۔اورنہیں عمل پیرا ہو سکتے اس پر عام مکلفین۔

(۴) اورضروری ہے کہ اس مدت میں رکنا بار بار ہو، تاکہ حاصل ہو خوگر ہونا اور تابعدار ہونا۔ورنہ پس ایک (دن کی) بھوک کونسا فائدہ دیگی، اگرچہ وہ قوی اور سخت ہو؟!

(۵) اورضروری ہے کہ جایا جائے جڑ نہ کھودنے والی مغلوبیت کے انضباط میں اور بار بار امساک کے انضباط میں ایسی مقداروں کی طرف جو لوگوں کے نزدیک مستعمل ہوں۔نہ پوشیدہ ہوں وہ مقداریں گمنام اور مشہور پر، اورشہری اور دیہاتی پر۔اور (جایا جائے) اس مقدار کی طرف جس کو استعمال کرتے ہوں یا جس کی مانند مدت کو استعمال کرتے ہوں لوگوں کے بہت بڑے گروہ، تاکہ جائے اس کی تشہیر اوراس کو مان لینا، ان کے پاس صبا رفتار سواریوں کے پہنچنے کی آخری حد تک۔

اورواجب کیا ان قابل توجہ باتوں نے کہ منضبط کیا جائے روزہ: کھانے پینے اور جماع سے رکنے کے ذریعہ ایک پورا دن، ایک پورے مہینہ تک۔پس جو رکنا ایک دن سے کم ہے وہ دو پہر کا کھانا مؤخر کرنے کے قبیل سے ہے۔اوررات میں

رکنا معتاد ہے۔نہیں پاتے لوگ اس کے لئے کوئی خیال۔اور ایک ہفتہ اور دو ہفتے تھوڑی مدت ہے جو اثر نہیں کرتی۔اور دو مہینے: دھنس جاتی ہیں ان میں آنکھیں اور تھک جاتا ہے نفس۔اور تحقیق ہم نے اس کا بے شمار مرتبہ مشاہدہ کیا ہے۔

اور منضبط کیا جائے دن: طلوع فجر سے غروب شمس کے ذریعہ، اس لئے کہ وہی عربوں کا حساب ہے اور ان کے دن کی مقدار ہے۔اور ان کے نزدیک مشہور ہے یوم عاشوراء کے روزے میں۔

اور (منضبط کیا جائے) مہینہ: چاند دیکھنے سے چاند دیکھنے کے ذریعہ، اس لئے کہ وہی عربوں کا مہینہ ہے۔اور نہیں ہے ان کا حساب شمسی مہینوں پر۔

لغات: **مُجْحِفَة** (اسم فاعل، واحد مؤنث) **جحفه** (ف) **جَحْفًا**: برباد کردینا۔ **أَجْحَفَ الدهرُ**: جڑ سے مٹانا۔اور بطور استعارہ اِجحاف نقصِ فاحش کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔کمامر...... **اِسْتَأْصَلَ الشيئَ**: جڑ سے اُکھیرنا...... **غارتْ عينُه**: آنکھ کا دھنس جانا...... **نَفِهَتْ** (س) **نفسُه**: تھکنا...... **النَّعْب**: تیز سواری اور تیز ہوا **نَعَبَتِ الإبلُ**: اونٹ کا چلنے میں گردن لمبی کرنا یعنی تیز چلنا اور **رِيْحٌ نَعْبٌ**: تیز ہوا **ناقةٌ ناعبةٌ**: تیز رفتار اونٹنی۔

ترکیب: وضبطِ تکرارہ میں عطف تفسیری ہے۔اور **إلى ما يستعمله** کا عطف **إلى مقادير** پر ہے اور یہ عطف بھی تفسیری ہے۔اور **لتذهب** متعلق ہے **وجب** سے۔

تصحیح: **غداءٌ وعَشاءٌ** اصل میں **غداءً وعشاءً** تھا۔یہ تصحیح تینوں مخطوطوں سے کی گئی ہے...... **غاية النَّعب** (نون کے ساتھ) اصل میں **غاية التَّعب** (تا کے ساتھ) تھا۔مخطوطوں میں بھی یہ لفظ مشتبہ تھا۔کافی غور کے بعد یہ تصحیح کی گئی ہے۔

☆ ☆ ☆

روزں کے لئے رمضان کی تخصیص کی وجہ

جب عام قانون بنانے کا اور سبھی لوگوں کی، عربوں کی بھی اور عجمیوں کی بھی، اصلاح کا موقعہ آیا اور اس کی طرف توجہ دی گئی تو ضروری ہوا کہ ماہِ صیام کے معاملہ میں آزادی نہ دی جائے کہ ہر شخص اپنی سہولت کے مطابق جس ماہ کے چاہے روزے رکھ لیا کرے۔بلکہ کسی ماہ کی تعیین لازمی ہے۔اور یہ بات تین وجوہ سے ضروری ہے:

پہلی وجہ: ایسا اختیار دینے میں چند نقصانات ہیں: اول: اس سے بہانہ بنانے کا اور کھسک جانے کا دروازہ کھل جائے گا۔دوم: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دروازہ بند ہوجائے گا۔سوم: اسلام کی ایک عظیم ترین عبادت گمنام ہوجائے گی یعنی اس کی کوئی شان ظاہر نہ ہوگی۔

دوسری وجہ: اجتماعی عبادت میں دو روحانی فائدے ہیں: اول: ساری دنیا کے مسلمانوں کا کسی عبادت کو ایک ہی وقت میں کرنا عوام وخواص پر ملکیت کی برکات کے نزول کا سبب ہے۔مشہور ہے: بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم دوم:

اجتماعی عبادت میں اس کا زیادہ احتمال ہے کہ کامل بندوں کے انوار کا پَرتو ان سے کمتر لوگوں پر پڑے اور خواص کی دعاؤں سے عوام کو بھی فائدہ پہنچے۔

اور جب ماہ صیام کی تعیین ضروری ہوئی تو اس کے لئے رمضان شریف سے زیادہ موزون کوئی مہینہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس ماہ میں قرآن کا نزول ہوا ہے اور ملت اسلامیہ راسخ ہوئی ہے اور اس میں شبِ قدر کا بھی احتمال ہے، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

وإذا وقع التصدى لتشريع عام، وإصلاحِ جماهير الناس، وطوائفِ العرب والعجم: وجب أن لايُخَيَّرَ فى ذلك الشهر، ليختارَ كلُّ واحدٍ شهرًا يسهل عليه صومُه، لأن فى ذلك فتحاً لباب الاعتذار والتسلل، وسدًّا لباب الأمر بالمعروف، والنهى عن المنكر، وإخمالاً لما هو من أعظم طاعات الإسلام.

وأيضًا: فإن اجتماع طوائف عظيمة من المسلمين على شيئ واحد، فى زمان واحد، يَرى بعضُهم بعضًا، معونةٌ لهم على الفعل، مُيَسِّرٌ عليهم، ومُشَجِّعٌ إياهم.

وأيضًا: فإن اجتماعهم هذا سببٌ لنزول البركات الملكية على خاصتهم وعامتهم، وأدنى أن ينعكس أنوارُ كُمَّلِهِمْ على من دونهم، وتحيط دعوتُهم من ورائهم.

وإذا وجب تعيين ذلك الشهر فلا أحقَّ من شهرٍ نزل فيه القرآنُ، وارتسخت فيه الملةُ المصطفوية، وهو مَظِنَّةُ ليلة القدر، على ما سنذكره.

ترجمہ: اور جب واقع ہوا درپے ہونا عام قانون سازی کے لئے اور عام لوگوں کی اور عرب وعجم کے تمام گروہوں کی اصلاح کے لئے تو ضروری ہوا کہ نہ اختیار دیا جائے اس ماہ میں، تاکہ اختیار کرے ہر ایک کسی ایسے مہینہ کو جس کا روزہ اس پر آسان ہے: اس لئے کہ اس میں بہانہ بنانے اور کھسک جانے کا دروازہ کھولنا ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دروازے کو بند کرنا ہے۔ اور اس عبادت کو جو کہ اسلام کی عبادتوں میں سب سے بڑی عبادت ہے گمنام کرنا ہے۔

اور نیز: پس مسلمانوں کی بہت بڑی جماعتوں کا ایک چیز پر ایک زمانہ میں اکٹھا ہونا درانحالیکہ بعض بعض کو دیکھ رہے ہوں: ان کی عمل پر مدد کرنا ہے اور ان پر عمل کو آسان کرنا ہے۔ اور ان کو عمل کی ہمت دلانا ہے۔

اور نیز: پس لوگوں کا یہ اجتماع سبب ہے۔ ملکوتی برکتوں کے نزول کا ان کے خواص وعوام پر اور قریب تر ہے اس بات سے کہ پلٹیں ان کے کاملوں کے انوار ان کے کمتروں پر۔ اور گھیر لیں ان کی دعائیں ان لوگوں کو جو ان کے پیچھے ہیں۔

اور جب ضروری ہوئی اس ماہ کی تعیین تو نہیں ہے کوئی مہینہ زیادہ حقدار اس مہینہ سے جس میں قرآن اترا ہے اور جس میں ملتِ مصطفویہ راسخ ہوئی ہے۔ اور وہ شب قدر کی احتمالی جگہ ہے۔ جیسا کہ ہم اس کو آگے بیان کریں گے۔

تصحیح: سبب لنزول البرکات میں لفظ سبب مخطوطہ کراچی سے بڑھایا ہے۔

☆ ☆ ☆

عبادتوں کے عمومی اور خصوصی درجات

اس کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ عبادتوں کے درجات واضح کردیئے جائیں۔ عبادتوں کا ایک درجہ تو عمومی ہے۔ جس میں تمام مسلمان برابر ہیں۔ خواہ وہ غیر مشہور ہوں یا مشہور، فارغ ہوں یا مشغول، سب کے لئے وہ عبادتیں ضروری ہیں۔ کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ جو بھی شخص اُن عبادتوں کو ترک کرے گا وہ اصل مشروع امر کا تارک قرار دیا جائے گا۔ یہ فرائضِ اعمال کا درجہ ہے۔ دوسرا درجہ کاملین اور نیکوکاروں کی شاہ راہ اور سابقین کی گھاٹ ہے یعنی وہ بڑے لوگوں کا حصہ ہے۔ یہ نوافل اعمال کا درجہ ہے۔ دونوں درجوں کی عبادتیں درج ذیل ہیں:

پہلے درجے کی عبادتیں: رمضان کے روزے اور پانچ فرض نمازیں ہیں۔ یہ عبادتیں ہر مکلّف پر لازم ہیں۔ حدیث میں ہے کہ: ''جس نے عشا اور فجر کی نماز جماعت سے ادا کی اس نے گویا رات بھر نماز پڑھی'' (مسند احمد ۱:۸۵) اس حدیث میں عبادات کے درجات کی طرف اشارہ ہے۔

دوسرا درجہ: پہلے درجے سے کمّاً اور کیفاً بڑھا ہوا ہے۔ اور وہ عبادتیں یہ ہیں: رمضان کی راتوں میں تراویح پڑھنا۔ روزے میں زبان اور اعضاء کی حفاظت کرنا۔ رمضان کے بعد شوال کے چھ روزے رکھنا۔ ہر ماہ میں تین روزے رکھنا۔ عاشوراء اور عرفہ کے روزے رکھنا اور رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف کرنا۔

یہ ابواب الصیام کے سلسلہ کی اصولی اور تمہیدی باتیں ہیں۔ ان سے فارغ ہوکر اب ہم روزوں کے بارے میں وارد ہونے والی روایات کی شرح کرتے ہیں۔

ثم لابد من بیان المرتبة التی لابد منها لکل خاملٍ ونبیهٍ، وفارغ ومشغول، والتی إن أخطأها أخطأ أصلَ المشروع، والمرتبةِ المکمِّلةِ التی هی مَشْرَعُ المحسنین، ومورِدُ السابقین:

فالأولی: صومُ رمضان، والاکتفاءُ علی الفرائض الخمس، فورد: '' من صلی العشاء والصبح فی جماعة فکأنما قام اللیل''

والثانیة: زائدةٌ علی الأولی کمًّا وکیفًا، وهی قیامُ لیالیه، وتنزیه اللسان والجوارح، وستة من شوال، وثلاثة من کل شهر، وصوم یوم عاشوراء، ویوم عرفة، واعتکاف العشر الأواخر.

فهذه المقدِّماتُ تجری مجری الأصول فی باب الصوم، فإذا تَمَهَّدَتْ حَانَ أن نشتغل بشرح أحادیث الباب.

ترجمہ: پھر اس مرتبہ کو بیان کرنا ضروری ہے جس کے بغیر چارہ ہی نہیں، ہر غیر مشہور اور مشہور کے لئے، اور ہر فارغ ومشغول کے لئے، اور جو کہ اگر چوک گیا آدمی اس کو تو چوک گیا وہ اصل حکم مشروع کو۔ اور کامل ومکمل مرتبہ کو جو کہ وہ نیکوکاروں کی گھاٹ اور سابقین کی پانی لینے کے لئے اترنے کی جگہ ہے۔

پس پہلا مرتبہ: رمضان کے روزے اور پانچ فرض نمازوں پر اکتفا کرنا ہے یعنی نجات کے لئے فرائض وواجبات پر عمل کافی ہے۔ چنانچہ وارد ہوا ہے: ''جس نے عشاء الخ''

اور دوسرا مرتبہ: پہلے مرتبہ پر کم وکیف کے اعتبار سے زائد ہے۔ اور وہ رمضان کے نوافل اور زبان اور اعضاء کو پاک رکھنا اور شوال کے چھ روزے اور ہر ماہ کے تین روزے اور یوم عاشوراء اور یوم عرفہ کے روزے اور آخری عشرہ کا اعتکاف ہے۔

پس یہ تمہیدی باتیں ہیں، جو روزوں کے باب میں اصول کی جگہ میں جاری ہیں۔ پس جب تیار ہوگئیں وہ باتیں تو وقت آگیا کہ ہم باب کی احادیث کی شرح میں مشغول ہوں۔

باب ـــــ ۲

روزوں کی فضیلت کا بیان

حدیث شریف: میں ہے کہ: ''جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں ـــــ اور ایک روایت میں ''جنت کے دروازے'' کے بجائے ''رحمت کے دروازے'' آیا ہے ـــــ اور دوزخ کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں۔ اور شیاطین جکڑ دیئے جاتے ہیں'' (اور فرشتے زمین میں پھیل جاتے ہیں) (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۱۹۵۶)

ایک اہم نکتہ: نصوص میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مضمون کا نصف حصہ بیان کیا جاتا ہے، اور باقی آدھا قرائن احوال اور فہم سامع پر اعتماد کرکے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جیسے سورۂ آل عمران آیت ۲۶ میں ہے: ﴿بِيَدِكَ الْخَيْرُ﴾ یعنی سب بھلائی آپ کے اختیار میں ہے۔ اس کا باقی آدھا مضمون یہ ہے کہ ''ہر برائی کے مالک بھی آپ ہیں'' اسی طرح ''عذاب قبر حق ہے'' یہ آدھا مسئلہ ہے۔ باقی آدھا ہے: ''قبر کی راحتیں بھی برحق ہیں'' اسی طرح مذکورہ حدیث کا یہ مضمون کہ: ''شیاطین جکڑ دیئے جاتے ہیں'' آدھا مضمون ہے۔ دوسرا آدھا مضمون ہے: ''فرشتے زمین میں پھیل جاتے ہیں'' اور قرینہ پہلے مضمون میں متقابلات (جنت وجہنم) کا تذکرہ ہے۔ (یہ نکتہ شارح نے بڑھایا ہے)

فضائل کا تعلق اہل ایمان سے ہے: اس کے بعد جاننا چاہئے کہ مذکورہ حدیث میں جو رمضان کی فضیلتیں بیان کی گئی ہیں انکا تعلق صرف اہل ایمان سے ہے۔ کفار سے ان کا کچھ تعلق نہیں۔ کیونکہ کفار کی حیرانی اور گمراہی دوسرے دنوں کی بہ نسبت رمضان میں سخت اور فزوں ہوجاتی ہے۔ کیونکہ وہ رمضان میں شعائر اللہ کی پردہ دری میں اپنی نہایت کو پہنچ جاتے ہیں۔

وضاحت: فضائل کی نصوص کا تعلق نیک بندوں سے اور نیکوکاروں کے زمرہ میں شامل مؤمنین ہی سے ہوتا ہے۔ کفار سے اور غفلت شعار اور خدا فراموش بندوں سے ان کا تعلق نہیں ہوتا۔ کیونکہ انھوں نے خود ہی اپنے آپ کو رحمتِ الٰہی سے محروم کرلیا ہے۔ جب وہ بارہ مہینے شیطان کی پیروی میں منہمک رہتے ہیں تو اللہ کے یہاں ان کے لئے محرومی کے سوا کچھ نہیں۔ بلکہ بابرکت زمان ومکان میں گناہ کی سنگینی اور بڑھ جاتی ہے۔ مسجد میں گناہ اور مسجد سے باہر گناہ یکساں نہیں۔ اسی طرح جو بندے رمضان میں بھی احکام خداوندی کی خلاف ورزی میں سرگرم رہتے ہیں، اور رمضان کا جو کہ شعائرِ اسلام میں سے ہے کچھ پاس ولحاظ نہیں کرتے ان کا معاملہ اور بھی خطرناک ہوجاتا ہے۔ **اللّٰهمَّ احْفَظْنا منه!**

رمضان کی دو خاص فضیلتیں اور ان کی وجہ

مذکورہ حدیث میں رمضان کی دو خاص فضیلتیں بیان کی گئی ہیں: اول: رمضان میں جنت کے ـــ یا رحمت کے ـــ دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، اور جہنم ـــ یا لعنت ـــ کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں۔ (یہ متقابلات ہیں) دوم: شیاطین جکڑ دیئے جاتے ہیں اور فرشتے زمین میں پھیل جاتے ہیں (یہ بھی متقابلات ہیں) ان فضائل کی وجہ یہ ہے کہ جب مسلمان رمضان میں روزے رکھتے ہیں، اور نمازیں (تراویح) پڑھتے ہیں۔ اور خدا کے کامل بندے انوار الٰہی میں غوطہ لگاتے ہیں۔ اور کاملین کی دعائیں تابعین کو محیط ہوجاتی ہیں۔ اور ان کی روشنی کا پَرتو ان سے کمتر لوگوں پر پڑتا ہے۔ اور ان کی برکتیں جماعتِ مسلمین کے افراد کو شامل ہوجاتی ہیں۔ اور ہر شخص حسب استعداد اعمالِ صالحہ میں سے حصہ لیتا ہے۔ اور گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرتا ہے تو دو باتیں واقعی بن جاتی ہیں:

پہلی بات: جنت کے باب وَا ہوجاتے ہیں اور جہنم کے دروازے مسدود ہوجاتے ہیں۔ اور یہ بات دو وجہ سے متحقق ہوتی ہے:

پہلی وجہ: جنت کی حقیقت رحمت اور جہنم کی حقیقت لعنت ہے۔ جب بندے رحمت والے کاموں میں منہمک ہوجاتے ہیں اور لعنت والے کاموں سے کنارہ کش ہوجاتے ہیں، تو رحمت کی بارش شروع ہوجاتی ہے۔ یہی جنت کے دروازوں کا کھل جانا ہے۔ اور لعنت کی لُو بند ہوجاتی ہے۔ یہی جہنم کے دروازوں کا بند ہوجانا ہے۔

دوسری وجہ: نماز استسقاء کے بیان میں گذر چکی ہے، اور آگے بھی حج کے بیان میں آئے گی کہ جب زمین والے متفق ہوکر اللہ تعالیٰ سے جودوکرم کے طالب ہوتے ہیں تو دریائے رحمت جوش زن ہوتا ہے اور بندوں پر برکات کا فیضان شروع ہوجاتا ہے، اور آفتیں دور ہوجاتی ہیں۔ چنانچہ جب رمضان آتا ہے اور مسلمانوں کی جماعت ہمہ تن عبادتوں کی طرف متوجہ ہوجاتی ہے تو یہ اتفاق واتحاد رحمتِ الٰہی کو برانگیختہ کرتا ہے۔ اور حسب استدعا فیضانِ رحمت عام ہوتا ہے، اور اسباب تکلیف سُکیڑ لئے جاتے ہیں۔

دوسری بات: شیاطین جکڑ دیئے جاتے ہیں اور فرشتے زمین میں پھیل جاتے ہیں۔ اور یہ بات بھی دو وجہ سے متحقق ہوتی ہے:

پہلی وجہ: شیاطین انہی لوگوں پر اثر انداز ہوتے ہیں جن میں ان کا اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اور یہ صلاحیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب بہیمیت جوش زن ہوتی ہے۔ اور رمضان میں چونکہ بہیمیت مغلوب ہوجاتی ہے، اس لئے شیاطین کا مؤمنین پر زور نہیں چلتا۔ سورۃ الحجر آیت ۴۲ میں ہے: ''بیشک میرے منتخب بندوں پر تیرا ذرا بھی بس نہ چلے گا!'' یہی شیاطین کا جکڑ دیا جانا ہے۔ اور جو لوگ اپنے اندر ملائکہ کے قُرب کی صلاحیت پیدا کرلیتے ہیں ان کو فرشتے گھیر لیتے ہیں۔ اور یہ صلاحیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ملکیت کا ظہور ہوتا ہے۔ اور رمضان میں اس کا ظہور اظہر ہے۔ اس لئے ملائکہ روئے زمین پر پھیل جاتے ہیں۔ اور اہل ایمان کو انوار کے گھیرے میں لے لیتے ہیں۔

دوسری وجہ: دستورِ زمانہ ہے کہ جب کوئی اہم دن آتا ہے تو اس دن کے لئے خصوصی انتظامات کئے جاتے ہیں: تمام شر پسندوں کو نظر بند کردیا جاتا ہے، تاکہ وہ فنکشن میں رخنہ انداز نہ ہوں (اور تقریب ختم ہونے کے بعد ان کو چھوڑ دیا جاتا ہے) اور ہمنواؤں کو ہر طرف پھیلا دیا جاتا ہے۔ اور رمضان شریف میں اس رات کا غالب احتمال ہے جس میں ہر دانشمندانہ معاملہ بارگاہِ خداوندی میں پیش ہوکر طے کیا جاتا ہے۔ اس شب کا تذکرہ سورۃ الدخان آیات ۳-۵ میں ہے۔ اس لئے اس موقعہ پر یہ خصوصی انتظامات کئے جاتے ہیں یعنی روحانی اور ملکوتی انوار پھیلا دیئے جاتے ہیں۔ اور ان کی اضداد یعنی ظلمات سکیڑ لی جاتی ہیں۔

نوٹ: شب قدر دو ہیں، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ مذکورہ بالا شب قدر سال بھر والی شب قدر ہے۔ جس کا رمضان میں ہونے کا غالب احتمال ہے۔

فضل الصوم

[۱] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:" إذا دخل رمضانُ فُتحت أبواب الجنَّةِ — وفي رواية أبوابُ الرحمة — وغُلِّقَتْ أبوابُ جهنَّمَ، وسُلْسِلَت الشياطين"

أقول: اعلم أن هذا الفضلَ إنما هو بالنسبة إلى جماعة المسلمين، فإن الكفار في رمضان أشدُّ عَمَهًا وأكثرُ ضلالاً منهم في غيره، لتماديهم في هتك شعائر الله.

ولكن المسلمين إذا صاموا، وقاموا، وغاص كُمَّلُهم في لُجَّةِ الأنوار، وأحاطت دعوتُهم من وراءَ هم، وانعكستْ أضواؤُهم على من دونَهم وشملتْ بركاتُهم جميعَ فِئَتِهم، وتَقَرَّبَ كلٌّ حَسَبَ اسْتعدادِه من المنجيات، وتباعد من المهلكات، صَدَقَ:

[۱] أن أبوابَ الجنةِ تُفتح عليهم، وأن أبواب جهنم تُغلق عنهم:

[الف] لأن أصلَهما الرحمةُ واللعنةُ.

[ب] ولأن اتفاقَ أهلِ الأرض في صفةٍ: يجلب ما يناسبُها من جُوْدِ اللهِ، كما ذكرنا في

الاستسقاء والحج.

وصدق:

[۲] أن الشياطين تُسَلْسَلُ عنهم، وأن الملائكةَ تنتشر فيهم:

[الف] لأن الشياطين لايؤثِّر إلا فيمن استعدَّتْ نفسُه لأثره، وإنما استعدادُها له بغَلَواء البهيمية، وقد انقهرت؛ وأن الملائكة لايقرب إلا من استعدَّ له، وإنما استعدادُه بظهور الملكية، وقد ظهرت.

[ب] وأيضًا: فرمضانُ مَظِنَّةُ الليلة التى يُفْرَقُ فيها كلُّ أمر حكيم، فلا جرم أن الأنوار المثالية والملكية تنتشر حينئذٍ، وأن أضدادَها تَنْقَبِض.

ترجمہ: روزوں کی فضیلت: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:........... میں کہتا ہوں: یہ بات جان لیں کہ یہ فضیلت مسلمانوں کی بہ نسبت ہے۔پس بیشک کفار: رمضان میں تحیر کے اعتبار سے سخت اور گمراہی کے اعتبار سے زیادہ ہیں، ان سے رمضان کے علاوہ میں، ان کے انتہاء کو پہنچنے کی وجہ سے شعائر اللہ کی پردہ دری میں —— لیکن مسلمان جب روزہ رکھتے ہیں اور رات میں نوافل پڑھتے ہیں، اوران کے کامل انوار کے سمندر میں غوطہ زن ہوتے ہیں۔ اوران کی دعائیں ان لوگوں کو گھیر لیتی ہیں جوان کے پیچھے ہیں۔ اوران کی روشنیاں ان لوگوں پر پلٹتی ہیں جو ان سے کم تر ہیں۔ اوران کی برکتیں ان کی جماعت کے تمام لوگوں کو شامل ہوجاتی ہیں۔ اور ہر ایک اپنی استعداد کے موافق نزدیکی حاصل کرتا ہے نجات دینے والے کاموں سے اور دور ہوتا ہے مہلک کاموں سے تو سچی ہوجاتی ہے:

(۱) یہ بات کہ جنت کے دروازے ان پر کھول دیئے گئے اور یہ بات کہ جہنم کے دروازے ان سے بند کردیئے گئے۔ (الف) اس لئے کہ جنت وجہنم کی اصل رحمت ولعنت ہے (ب) اوراس لئے کہ زمین والوں کا کسی صفت (حالت) میں اتفاق: کھینچتا ہے اس چیز کو جو اس حالت کے مناسب ہے اللہ کی سخاوت سے، جیسا کہ بیان کیا ہے ہم نے استسقاء اور حج میں۔

اور یہ بات بھی سچی ہوتی ہے کہ (۲) شیاطین ان سے جکڑ دیئے گئے یعنی روک دیئے گئے۔ اور یہ بات کہ فرشتے ان میں پھیل گئے: (الف) اس لئے کہ شیاطین اثر انداز نہیں ہوتے مگر ان لوگوں پر جن کا نفس تیار ہوگیا ہے شیاطین کے اثر کے لئے۔ اور نفس کا شیطان کے لئے تیار ہونا بہیمیت کے جوش مارنے ہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اور (رمضان میں) بہیمیت مغلوب ہوچکی ہے اور یہ کہ فرشتے نزدیک نہیں ہوتے مگر اس شخص سے جس میں قُرب کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اور قرب کی استعداد ملکیت کے ظہور ہی سے ہوتی ہے۔ اور ملکیت: تحقیق اس کا ظہور ہوچکا ہے (ب) اور نیز: پس رمضان اُس رات کی احتمالی جگہ ہے جس میں ہر پُر حکمت معاملہ طے کیا جاتا ہے۔ پس یہ بات یقینی ہے کہ مثالی اور ملکوتی انوار اس وقت میں پھیلتے ہیں۔ اور یہ کہ ان کی اضداد سُکڑتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

روزوں اور تراویح سے گذشتہ گناہ معاف ہونے کی وجہ

حدیث شریف: میں ہے کہ: ''جس نے رمضان کے روزے ایمان واحتساب کے ساتھ رکھے، اس کے گذشتہ گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں۔ اور جس نے ایمان واحتساب کے ساتھ رمضان کی راتوں میں نفلیں (تراویح) پڑھیں، اس کے گذشتہ گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۵۸)

تشریح: رمضان کے روزوں سے، اسی طرح راتوں کے نوافل سے، جبکہ وہ ایمان واحتساب کے ساتھ ادا کئے گئے ہوں، سابقہ تمام گناہوں کی معافی کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں عمل ملکیت کے غلبہ کی اور بہیمیت کی مغلوبیت کی احتمالی جگہ ہیں۔ یعنی ان اعمال سے اس فائدہ کی پوری امید ہے۔ اور یہ عبادتیں مناسب نصاب (عبادت کی ایک معقول مقدار) ہیں، جن کے ذریعہ بندہ اللہ کی خوشنودی اور مہربانی سے بہرہ ور ہوسکتا ہے۔ اس لئے یہ بات یقینی ہے کہ یہ اعمال نفس کی حالت میں تبدیلی کردیتے ہیں۔ پچھلا میلا رنگ اتر جاتا ہے۔ اور نیا شاندار رنگ چڑھ جاتا ہے۔ اور جب نفس کی حالت بدل جاتی ہے تو سابقہ حالت کی کوتاہیوں پر قلم عفو پھیر دیا جاتا ہے۔

ایمان واحتساب کا مطلب: ایمان بمعنی یقین ہے۔ اور کسی کام کو یقین کے ساتھ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس عمل کو حکم خداوندی سمجھ کر بجالایا جائے۔ اللہ کی خوشنودی ہی عمل کی بنیاد اور محرک ہو۔ قوم کی موافقت، ریت رواج کی پابندی، لوگوں کی ملامت کا اندیشہ یا کوئی دوسرا جذبہ اور مقصد اس کا محرک نہ ہو۔ یہی یقین عمل کی روح ہے۔ اسی سے عمل قیمتی بنتا ہے۔ اس کے بغیر عمل بے جان رہتا ہے، بلکہ کبھی وبالِ جان بن جاتا ہے۔

اور احتساب کے معنی ہیں: ثواب کی امید رکھنا۔ ارشاد پاک ہے: ﴿وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَايَحْتَسِبُ﴾ (سورۃ الطلاق آیت ۳) یعنی اللہ تعالیٰ ایسی جگہ سے روزی پہنچاتے ہیں جہاں سے امید نہیں ہوتی۔ اور حدیث میں احتساب سے مراد یہ ہے کہ عمل پر جو اجر وثواب موعود ہے، اس کی امید باندھ کر عمل کیا جائے۔ اس سے عمل شاندار بھی ہوتا ہے اور اس کی ادائیگی آسان بھی ہوجاتی ہے۔

فائدہ: شاہ صاحب قدس سرہ نے مذکورہ ثواب کی جو وجہ بیان کی ہے، اس سے یہ بات مستفاد ہوتی ہے کہ یہ ثواب نفس کی حالت بدلنے پر موقوف ہے۔ اور ایسے اعمال اور بھی متعدد ہیں، مثلاً: اسلام قبول کرنا، ہجرت اور حج کرنا۔ ان کا بھی یہی ثواب بیان کیا گیا ہے کہ یہ تینوں اعمال سابقہ گناہوں کو مٹادیتے ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۲۸) پس اگر نفس کی حالت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ آئے تو اس موعود ثواب کا استحقاق پیدا نہ ہوگا۔

نوٹ: رمضان کے روزوں کا اور تراویح کا ایک ہی ثواب ہے، اور دونوں کی ایک ہی وجہ ہے۔ اس لئے شاہ صاحب نے ایک کی وجہ بیان کرنے پر اکتفا کی ہے۔ ہم نے حدیث کا دوسرا جزء بھی شامل کرکے دونوں کی وجہ مشترک بیان کی ہے۔

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم:" من صام شهرَ رمضانَ إيماناً واحتساباً غُفرله ماتقدَّم من ذنبه"
أقول: وذلك: لأنه مظنةُ غلبةِ الملكية ومغلوبيَّةِ البهيمية، ونصابٌ صالحٌ من الخوض فى لُجَّةِ الرِّضا والرحمةِ، فلاجرم أن ذلك مُغيِّرٌ للنفس من لون إلى لون.

ترجمہ:(۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:.......... میں کہتا ہوں: اور وہ بات (یعنی سابقہ گناہوں کی مغفرت) اس لئے ہے کہ رمضان: ملکیت کے غلبہ کی اور بہیمیت کی مغلوبیت کی احتمالی جگہ ہے۔ اور اللہ کی خوشنودی اور مہربانی کے سمندر میں غوطہ زنی کا ایک معقول نصاب ہے۔ پس یقیناً یہ بات ہے کہ وہ (رمضان کے روزے) تبدیل کرنے والے ہیں نفس کو ایک رنگ سے دوسرے رنگ کی طرف۔

☆ ☆ ☆

شبِ قدر میں عبادت سے گذشتہ گناہ معاف ہونے کی وجہ

مذکورہ بالا حدیث میں یہ بھی ہے کہ:"جس نے ایمان واحتساب کے ساتھ شب قدر میں نوافل پڑھے، اس کے گذشتہ گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں"

تشریح: شبِ قدر میں عبادت سے سابقہ تمام گناہوں کی معافی کی وجہ یہ ہے کہ شب قدر میں روحانیت پھیلتی ہے۔ اللہ کے حکم سے روح (حضرت جبرئیل علیہ السلام) بےشمار فرشتوں کے ہجوم میں زمین پر اترتے ہیں، تاکہ زمین والوں کو خیر وبرکت سے مستفیض کریں۔ اور عالم مثال (عالم آخرت) کا عالم اجسام (دنیا) پر غلبہ ظاہر ہوتا ہے یعنی ملائکہ کے انوار دنیا میں چھا جاتے ہیں اور ظلمات چھٹ جاتی ہیں۔ ایسے بابرکت وقت میں جو عبادت کی جاتی ہے وہ دل کی تھاہ میں بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ اور نفس کی حالت بدل جاتی ہے۔ دوسرے اوقات میں اگر ایسی متعدد عبادتیں کی جائیں تو بھی یہ اثر مرتب نہیں ہوتا۔ اس رات میں نیکی کرنا ایسا ہے، جیسے ہزار مہینے تک نیکی کرنا، بلکہ اس سے بھی زائد۔ اس لئے گذشتہ گناہوں پر قلم عفو پھیر دیا جاتا ہے۔

[۳] قوله صلى الله عليه وسلم:" من قام ليلةَ القدر إيماناً واحتسابا، غُفرله ما تقدَّم من ذنبه"
أقول: وذلك: لأن الطاعة إذا وُجدت فى وقتِ انتشارِ الروحانية، وظهورِ سلطنةِ المثال، أَثَّرَتْ فى صميم النفس مالايؤثِّر أعدادُها فى غيره.

ترجمہ:(۳) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:.......... میں کہتا ہوں: اور وہ بات یعنی سابقہ تمام گناہوں کی معافی، اس لئے ہے کہ جب عبادت: روحانیت کے پھیلنے کے وقت میں اور عالم مثال کی حکومت کے ظہور کے وقت میں پائی

جاتی ہے، تو وہ صمیم قلب میں ایسا اثر کرتی ہے کہ اس کے علاوہ وقت میں متعدد عبادتیں ایسا اثر نہیں کرتیں۔
ملحوظہ: أعداد جمع ہے عَدَد کی ...... وظہور عطفِ تفسیری ہے۔ دونوں جملوں کا مطلب ایک ہے۔

☆ ☆ ☆

فضائل صیام کی ایک مفصل روایت

اب ختم باب تک شاہ صاحب قدس سرہ نے فضائل صیام کی ایک مفصل روایت کے مختلف اجزاء کے اسرار و رموز بیان کئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پوری حدیث ایک ساتھ پڑھ لی جائے۔

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آدمی کے ہر نیک عمل کا ثواب دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھایا جاتا ہے'' ـــــ یعنی اس امت کے اعمالِ خیر کے متعلق عام قانونِ الٰہی یہ ہے کہ نیکی کا اجر کم از کم دس گنا ضرور دیا جاتا ہے۔ اور عمل کی خاص حالت کے پیشِ نظر اور اخلاص وخشیت کی وجہ سے اجر زیادہ بھی عطا کیا جاتا ہے۔ اور یہ اضافہ سات سو گنا تک ہوتا ہے۔ البتہ انفاق فی سبیل اللہ یعنی جہاد میں خرچ کرنے کا ثواب سات سو گنا سے شروع ہوتا ہے۔ اور بیش از بیش کی کوئی حد نہیں۔ سورۃ البقرۃ آیت ۲۶۱ میں یہ بات بیان کی گئی ہے۔ ارشاد پاک ہے: ''جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے اموال خرچ کرتے ہیں، ان کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت ایسی ہے جیسے ایک دانہ: جس سے سات بالیں جمیں، ہر بال کے اندر سو دانے ہوں (یعنی کم از کم ثواب سات سو گنا ملتا ہے) اور اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتے ہیں، اجر بڑھا دیتے ہیں (یعنی زیادہ سے زیادہ کی کوئی تحدید نہیں) اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے، خوب جاننے والے ہیں کہ کون کتنے اجر کا مستحق ہے۔ روح المعانی میں ہے: قیل: المراد الإنفاق فی الجهاد، لأنه الذی یُضاعَف هذه الأضعاف، وأما الإنفاق فی غیره فلا یُضاعف کذلك، وإنما تجزَی الحسنةُ بعشر أمثالها اھ ـــــ حدیث نبوی کا یہ پہلا جزء حدیثِ نبوی تھا۔ آگے حدیث قُدسی ہے: ''مگر اللہ پاک کا ارشاد ہے کہ: ''روزہ اس قانون سے مستثنیٰ ہے۔ کیونکہ روزہ میرے لئے ہے (اضافت تشریف کے لئے ہے) اور میں ہی اس کا اجر دونگا۔ بندہ میری رضا کے واسطے اپنی خواہشِ نفس (جماع) اور اپنا کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے (پس اس کا صلہ بھی میں ہی دونگا) ـــــ یہاں تک حدیث قدسی تھی۔ آگے پھر حدیث نبوی ہے: ''روزہ دار کے لئے دو مسرتیں ہیں: ایک: افطار کے وقت۔ دوسری: پروردگار کی بارگاہ میں شرفِ باریابی کے وقت'' ـــــ ''اور البتہ روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بہتر ہے'' ـــــ ''اور روزہ ڈھال ہے اور جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو چاہئے کہ وہ شہوانی باتیں نہ کرے، اور نہ شور وشغب کرے، اور اگر کوئی اس سے گالم گلوچ کرے یا جھگڑا کرے تو کہہ دے کہ میرا روزہ ہے!'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۱۹۵۹)

نیکی دو چند ہونے کی وجہ

مبحث اول ودوم میں یہ بات تفصیل سے بیان کی جاچکی ہے کہ مجازات کا سبب: ملکیت کا احساس ہے۔ دنیوی زندگی میں تو چونکہ ملکیت بہیمیت کے زیر اثر رہتی ہے، اس لئے اس کو کئے ہوئے کاموں کی اچھائی یا برائی کا احساس نہیں ہوتا۔ غفلت کا پردہ چھایا رہتا ہے۔ مگر مرتے ہی ملکیت کو شدت کے ساتھ یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اس نے زندگی میں جو کام کئے ہیں، وہ ملکیت کے مناسب ہیں یا نامناسب؟ پہلی صورت میں راحت کی شکلیں وجود میں آتی ہیں، جو اس کے لئے جزائے خیر بنتی ہیں۔ اور دوسری صورت میں رنج وکلفت کی شکلیں رونما ہوتی ہیں جو اس کے لئے سزا بنتی ہیں۔ اسی طرح جب انسان مرتا ہے۔ اور کھانے پینے کے ذریعہ بہیمیت کو جو کمک (تقویت) پہنچ رہی تھی، وہ بند ہوجاتی ہے۔ اور آدمی اُن لذتوں سے جو بہیمیت سے مناسبت رکھتی ہیں یعنی قضائے شہوت سے کنارہ کش ہوجاتا ہے، تو فطری طور پر ملکیت کو ظاہر ہونے کا موقعہ ملتا ہے، اور اسکے انوار چمکنے لگتے ہیں۔ پس اگر اس نے اچھے کام کئے ہیں تو اس وقت تھوڑا عمل بھی ملکیت کے ظہور کی وجہ سے اور اس عمل کے ملکیت کے مناسب ہونے کی وجہ سے زیادہ ہوجاتا ہے۔ جیسے مال کے حریص کو اپنا اندوختہ کم محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس میں وصفِ قناعت پیدا ہوجائے تو وہی تھوڑا مال بہت محسوس ہونے لگتا ہے۔ یا جیسے پس انداز کیا ہوا تھوڑا مال بڑھاپے میں بسا غنیمت معلوم ہوتا ہے۔

ثواب کے عام ضابطہ سے روزوں کے استثناء کی وجہ

اجر وثواب کا عام ضابطہ یہ ہے کہ کم از کم دس گنا اجر ضرور ملتا ہے۔ مگر روزہ اس ضابطہ سے مستثنیٰ ہے۔ اور استثناء کی وجہ جاننے کے لئے پہلے نامۂ اعمال کی نوشت کا طریقہ جاننا ضروری ہے۔ نامۂ اعمال کی کتابت کا طریقہ یہ ہے کہ عالم آخرت کی کسی جگہ میں، جو اس آدمی کے لئے مخصوص ہوتی ہے، ہر عمل کی صورت منقّش ہوجاتی ہے، جس طرح کسی موجود خارجی کا تصور کیا جاتا ہے تو خزانۂ خیال میں اس کی صورت آجاتی ہے۔ یا کیمرے سے فوٹو گرافی کی جائے تو چیزوں کی صورتیں فلم میں آجاتی ہیں۔ نیز وہ صورتیں عالم مثال میں اس طرح ریکارڈ کی جاتی ہیں کہ ان سے ان کی جزاء خود بخود واضح ہوجاتی ہے۔ جیسے کارٹون سے اس کا مدعی سمجھ میں آجاتا ہے۔ اسی طرح ہر عمل کی جزاء، جو موت کے بعد عمل کرنے والے کے حق میں مرتب ہونے والی ہے، اس عمل کی صورت سے واضح ہوجاتی ہے۔ اور ملائکہ اس کو سمجھ کر نامۂ اعمال میں ضبط کرلیتے ہیں۔ شاہ صاحب قدس سرہ نے مکاشفات میں اعمال کا اس طرح متصور ہونا بار بار مشاہدہ کیا ہے۔

اور شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس بات کا بھی مشاہدہ کیا ہے کہ جو اعمال شہواتِ نفس سے ٹکّر لے کر کئے جاتے ہیں، نامۂ اعمال لکھنے والے فرشتے بار ہا نامۂ اعمال میں ان کی جزاء ظاہر نہیں کرپاتے۔ کیونکہ ان کی جزاء کو سمجھنے کے لئے اس خُلق کی مقدار کا جاننا ضروری ہے جس سے وہ عمل صادر ہوا ہے۔ اور ملائکہ ذوق ووجدان سے بھی اس کو نہیں پاسکتے یعنی

انسان اگر چہ وہ معصوم ہو، انسانوں کے اچھے برے جذبات کو سمجھ سکتا ہے مگر ملائکہ اس کا ادراک نہیں کر سکتے، کیونکہ ان میں بہیمیت نہیں ہے، اس لئے وہ اس کے تقاضوں سے آشنا نہیں ہو سکتے۔

اور رحمۃ اللہ الواسعہ (۱:۲۰۶) میں جو روایت آئی ہے کہ ملائکہ نے بحث وتمحیص کے بعد گناہ مٹانے والے اور درجات بلند کرنے والے اعمال طے کئے ہیں، اس کا راز بھی یہی ہے کہ ملائکہ کو ان کاموں کا ادراک آسانی سے نہیں ہوتا، کیونکہ وہ کام مجاہدۂ نفس کے قبیل سے ہیں۔

غرض ایسے اعمال کے بارے میں ملائکہ کی طرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ عمل کو بعینہٖ لکھ لو اور جزاء کا خانہ خالی چھوڑ دو۔ اسے اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دو، وہی قیامت کے دن اس کا ثواب ڈکلیر کریں گے۔

اور روزہ مجاہدۂ نفس کے قبیل کا عمل ہے: یہ بات حدیث کے اس جملہ سے واضح ہے کہ: ''بندہ اپنی خواہشِ نفس اور کھانا پینا میری وجہ سے چھوڑتا ہے'' اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ روزہ گناہ مٹانے والے ان اعمال میں سے ہے جن سے بہیمیت مغلوب ہوتی ہے۔

فائدہ: حدیث میں ایک قراءت: أنا أُجْزىٰ به بھی ہے، اس صورت میں حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ روزہ دار کو اللہ تعالیٰ کا وصال نصیب ہوتا ہے۔ تفصیل رحمۃ اللہ الواسعہ (۱:۷۵۵) میں ہے۔

[٤] قوله صلى الله عليه وسلم: ''كلُّ عمل ابن آدم يُضاعَفُ: الحسنةُ بعشرِ أمثالِها إلى سبعمائةِ ضِعْفٍ، قال اللّٰه تعالىٰ: إلا الصومَ، فإنه لى وأنا أَجْزِىْ به، يَدَعُ شهوتَه وطعامَه من أَجْلى''

أقول: سِرُّ مضاعفة الحسنة: أن الإنسان إذا مات، وانقطع عنه مددُ بهيميته، وأدبر عن اللذات الملائمة لها، ظهرت الملكية ولمع أنوارُها بالطبيعة، وهذا هو سِرُّ المجازاة، فإن كان عمل خيراً فقليلُه كثيرٌ حينئذٍ، لظهور الملكية، ومناسبته بها.

وسر استثناء الصوم: أن كتابة الأعمال فى صحائفها إنما تكون بتصور صورةِ كل عملٍ فى موطنٍ من المثال، مختصٍ بهذا الرجل، بوجهٍ يظهر منها صورةُ جزائه المترتِّبِ عليه، عند تجردِّه عن غواشى الجسد، وقد شاهدنا ذلك مراراً.

وشاهدنا أن الكَتَبَةَ كثيرًا ما تتوقف فى إبداءِ جزاءِ العمل الذى هو من قبيل مجاهدة شهواتِ النفس، إذ فى إبدائه دخلٌ لمعرفةِ مقدارِ خُلُقِ النفس الصادر هذا العملُ منه، وهم لم يَذُوْقُوْهُ ذَوْقًا، ولم يعلموه وِجداناً؛ وهو سِرُّ اختصامِهم فى الكفارات والدرجاتِ على ماورد فى الحديث، فيوحِى اللّٰهُ إليهم حينئذ: أن اكتبوا العملَ كما هو، وفَوِّضوا جزاءَه إلىَّ.

وقوله: '' فإنه يَدَعُ شهوتَه وطعامه من أَجْلِىْ'' إشارة إلى أنه من الكفارات التى لها نِكايةٌ فى

نفسه البهيمية؛ ولهذا الحديث بطنٌ آخر قد أشرنا إليه في أسرار الصوم، فراجِعْه.

ترجمہ: (۴) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:............ میں کہتا ہوں: نیکی کے دو چند ہونے کا راز یہ ہے کہ انسان جب مرجاتا ہے اور اس سے اس کی بہیمیت کی کمک منقطع ہوجاتی ہے۔ اور وہ ان لذتوں سے پیٹھ پھیرتا ہے جو بہیمیت سے مناسبت رکھنے والی ہیں تو ملکیت ظاہر ہوتی ہے۔ اور اس کے انوار فطری طور پر چمکتے ہیں۔ اور یہی مجازات کا راز ہے۔ پس اگر عمل اچھا ہوتا ہے تو تھوڑا عمل بھی زیادہ ہوتا ہے اس وقت میں ملکیت کے ظہور کی وجہ سے اور اس عمل کے ملکیت سے مناسبت کی وجہ سے۔

اور روزے کے استثناء کا راز: یہ ہے کہ اعمال کی نوشت ان کے صحیفوں میں: پس ہوتی ہے وہ عالم مثال (عالم آخرت) کی کسی جگہ میں، ہر عمل کی صورت کے خیال میں لانے کے ذریعہ، مختص ہوتی ہے وہ جگہ اس آدمی کے ساتھ، اس طرح پر کہ ظاہر ہو اس صورت سے اس عمل کے اس بدلہ کی صورت جو اس عمل پر مرتب ہونے والا ہے اس آدمی کے مجرد ہونے کے وقت جسم کے پردوں سے یعنی موت کے بعد، اور تحقیق ہم نے اس کا بارہا مشاہدہ کیا ہے۔

اور ہم نے یہ بھی مشاہدہ کیا ہے کہ نامۂ اعمال لکھنے والے بارہا توقف کرتے ہیں اس عمل کے بدلہ کو (نامۂ اعمال میں) ظاہر کرنے میں جو کہ وہ نفس کی خواہشات کے ساتھ ٹکّر لینے کے قبیل سے ہے، کیونکہ اس کے ثواب کو ظاہر کرنے میں نفس کے اُس خُلق کی مقدار کی معرفت کا دخل ہے جس سے یہ عمل صادر ہونے والا ہے۔ اور ملائکہ نے اس خُلق کو نہ ذوق سے چکھا ہے، نہ وجدان سے جانا ہے۔ اور وہ راز ہے ملائکہ کے بحث کرنے کا کفارات و درجات میں، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ پس وحی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی طرف اس وقت میں کہ تم عمل کو جیسا وہ ہے لکھ لو، اور اس کا بدلہ میرے حوالے کردو۔

اور اللہ پاک کا ارشاد: ''پس بیشک وہ چھوڑتا ہے اپنی خواہش اور اپنا کھانا میری خاطر'' اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ روزہ ان کفارات میں سے ہے جن کے لئے اس کے بہیمی نفس میں زخمی کرکے غالب آنا ہے (فائدہ) اور اس حدیث کے لئے ایک اور بطن ہے۔ اس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے روزوں کی حکمتوں کے بیان میں۔ پس اس کو دیکھ لیں۔

☆　☆　☆

روزہ دار کے لئے دو مسرتیں: فطری اور روحانی

مذکورہ بالا روایت میں یہ بھی ہے کہ ''روزہ دار کے لئے دو مسرتیں ہیں: ایک مسرت افطار کے وقت اور دوسری مسرت اپنے رب سے ملاقات کے وقت'' پہلی مسرت طبعی ہے۔ جب روزہ پورا ہوتا ہے اور کھانا پینا اور صحبت کرنا مباح ہوتا ہے جو کہ نفس کے تقاضے ہیں تو انسان کو فطری طور پر فرحت و شادمانی حاصل ہوتی ہے۔ دوسری مسرت ربانی اور روحانی ہے۔ کیونکہ نمازوں کی طرح روزوں سے بھی موت کے بعد، جبکہ آدمی جسم کے پردوں سے مجرّد ہوجاتا ہے اور عالم بالا سے ذات صفات کا یقین مترشح ہوتا ہے تو جلوۂ خداوندی کو سہارنے کی آدمی میں صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ یہی لقائے رب کا

مطلب ہے۔ اور نمازوں سے دیدار خداوندی کی استعداد کس طرح پیدا ہوتی ہے اس کی تفصیل رحمۃ اللہ الواسعہ (۱:۳۹۷) میں گذر چکی ہے۔ وہاں دیکھ لی جائے۔ حدیث بھی وہاں تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ البتہ نماز اور روزے میں فرق یہ ہے کہ نماز سے تجلی ثبوتی کے اسرار کے ظہور کا فائدہ حاصل ہوتا ہے اور روزوں سے تنزیہ یعنی صفاتِ سلبی کے اسرار کو سہارنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ نماز افعال واقوال کے مجموعہ کا نام ہے جو وجودی چیزیں ہیں اور صفاتِ ثبوتیہ بھی وجودی ہیں۔ اور روزہ ترکِ مفطرات کا نام ہے جو سلبی چیزیں ہیں اور تنزیہ یعنی سلبی صفات بھی منفی امور ہیں۔

فائدہ: روزے دار کے لئے دو مسرتوں کی اور بھی حکمتیں ہیں۔ مثلاً افطار کے وقت کی مسرت بایں وجہ ہے کہ بہ توفیق الٰہی ایک عبادت تکمیل پذیر ہوئی اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے وقت مسرت بے حساب ثواب کے حصول کی بنا پر ہے

[۵] قوله صلى الله عليه وسلم: "للصائم فرحتان: فرحةٌ عند فطره، وفرحةٌ عند لقاء ربه"

[أقول:] فالأولى: طبيعيةٌ من قِبَلِ وجدانِ ما تطلبُه نفسُه، والثانية: إلٰهيةٌ من قِبَلِ تهيئتهِ لظهور أسرار التنزيه عند تجرده عن غواشي الجسد، وترشح اليقينِ عليه من فوقه، كما أن الصلاةَ تُورث ظهورَ أسرار التجلي الثبوتي، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "فلا تُغْلَبُوا على صلاة قبل الطلوع وقبل الغروب" وههنا أسرارٌ يضيق هذا الكتاب عن كشفها.

ترجمہ: (۵) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: .... (میں کہتا ہوں) پس پہلی مسرت فطری ہے۔ اُس چیز کو پانے کی جانب سے جس کو اس کا نفس چاہتا ہے۔ اور دوسری مسرت ربانی ہے، اس کے تیاری کرنے کی جانب سے تنزیہ (عیب سے پاکی) کے رازوں کے ظاہر ہونے کے لئے اس کے مجرد ہونے کے وقت جسم کے پردوں سے، اور اس پر اس کے اوپر سے (ذات وصفات کے) یقین کے ٹپکنے کے وقت یعنی موت کے بعد۔ جیسا کہ نماز پیچھے لاتی ہے تجلی ثبوتی کے رازوں کے ظہور کو، اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: "پس نہ غلبہ کئے جاؤ تم (یعنی مشاغل تم پر غالب نہ آئیں) اس نماز پر جو طلوع آفتاب سے پہلے ہے اور اس نماز پر جو غروب سے پہلے ہے" —— (فائدہ) اور یہاں کچھ اور حکمتیں ہیں، جن کو کھولنے سے یہ کتاب تنگ ہے یعنی اس مختصر کتاب میں ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔

☆　☆　☆

خُلوف مشک کی خوشبو سے زیادہ پسند ہونے کی وجہ

مذکورہ حدیث میں یہ بھی ہے کہ: "یقیناً روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بہتر ہے"

تشریح: خُلوف (خُلوّ معدہ کی وجہ سے روزہ دار کے منہ کی بو) روزہ کا اثر ہے۔ اور عبادت کا اثر: عبادت کی محبت کی وجہ سے محبوب ہوتا ہے۔ عالم بالا میں اس اثر کو بھی عبادت ہی شمار کیا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: "اللہ تعالیٰ کو

دو قطروں سے اور دو نشانوں سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہیں۔ ایک: آنسو کا وہ قطرہ جو اللہ کی خشیت سے نکلے۔ دوسرا: خون کا وہ قطرہ جو راہِ خدا میں بہے۔ اور دو نشان: ایک: راہِ خدا میں لگنے والا نشان، دوسرا: کسی فریضہ کی ادائیگی سے جسم میں پیدا ہونے والا نشان'' (مشکوۃ حدیث ۳۸۳۷ کتاب الجہاد)

اور روزہ کی محبوبیت سمجھانے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے روزہ کی وجہ سے ملائکہ کے انشراح کا اور روزے سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا موازنہ کیا ہے انسانوں کے نفوس کے انشراح سے جب وہ مشک کی خوشبو سونگھتے ہیں، تاکہ ایک غیبی امر یعنی روزہ سے اللہ کی محبت: لوگ محسوس طریقہ پر سمجھ لیں۔ یعنی انسانوں کے لئے مشک کی خوشبو جتنی اچھی اور جتنی پیاری ہے، اللہ کے نزدیک روزہ دار کے منہ کی بو اس سے بھی اچھی ہے۔ اور جب بو اتنی پیاری ہے جو کہ روزہ کا اثر ہے تو خود روزہ اللہ کو کتنا پیارا ہوگا اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔

[٦] قوله صلى الله عليه وسلم:'' لَخُلوف فمِ الصائم أطيبُ عند الله من ريح المِسك''

أقول: سره: أن أثر الطاعة محبوب لحب الطاعة، متمثلٌ فى عالم المثال مقامَ الطاعة، فجعل النبيُّ صلى الله عليه وسلم انشراحَ الملائكة بسببه ورِضا الله عنه فى كَفَّةٍ، وانشراحَ نفوس بنى آدم عند استنشاق رائحة المسك فى كفةٍ، لِيُرِيَهُمُ السرَّ الغيبىَّ رأىَ عينٍ.

ترجمہ: (٦) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:...... میں کہتا ہوں: اس کا یعنی خلوف کی محبوبیت کا راز یہ ہے کہ عبادت کا اثر: عبادت کی محبت کی وجہ سے پسندیدہ ہے۔ عالم مثال میں عبادت کی جگہ میں پایا جانے والا ہے۔ پس نبی ﷺ نے روزے کی وجہ سے ملائکہ کے انشراح کو اور روزے سے اللہ کی خوشنودی کو ایک پلڑے میں رکھا، اور انسانوں کے نفوس کے انشراح کو مشک کی خوشبو سونگھنے کے وقت میں دوسرے پلڑے میں۔ تاکہ آپ لوگوں کو غیبی راز آنکھوں سے دیکھنے کی طرح دکھلائیں۔

☆　☆　☆

کامل روزہ ہی ڈھال بنتا ہے

مذکورہ روایت میں یہ بھی ہے کہ: ''روزہ ڈھال ہے۔ اور جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو چاہئے کہ وہ (بیوی سے) شہوانی باتیں نہ کرے۔ اور نہ شور وشغب کرے۔ اور اگر کوئی اس سے گالم گلوچ کرے یا جھگڑا کرے تو چاہئے کہ کہے کہ میں روزہ سے ہوں''

تشریح: روزہ ڈھال اس طرح ہے کہ وہ شیطان اور نفس کے حملوں سے بچاتا ہے۔ اور انسان سے شیطان اور نفس کی اثراندازی کو دور کرتا ہے۔ اور آدمی پر ان کا قابو نہیں چلنے دیتا۔ مگر روزہ ڈھال اسی وقت ہوتا ہے جب وہ کامل معنی میں روزہ

ہو۔اور روزہ کے معنی کی تکمیل کے لئے دو باتیں ضروری ہیں:

اول: اپنی زبان کو شہوانی اقوال وافعال سے پاک رکھنا یعنی روزہ میں بیوی سے نہ تو بوس وکنار کرے، نہ دل لگی اور مذاق کی باتیں کرے۔فلا یرفث (شہوانی باتیں نہ کرے) میں اس کا بیان ہے۔

دوم: درندگی والے اقوال وافعال سے احتراز کرنا لایَصْخَب (شور وشغب نہ کرے) میں دونوں ہی کی طرف اشارہ ہے۔پھر درندگی والے اقوال کو سَابَّه (کوئی اس سے گالم گلوچ کرے) میں، اور درندگی والے افعال کو قَاتَلَه (اس سے جھگڑا کرے) میں الگ الگ بیان کیا ہے۔

إنی صائم: زبان سے کہے یا دل سے؟

امام نووی نے الأذکار میں اس کو راجح قرار دیا ہے کہ یہ بات زبان سے کہے۔اور متولّی عبدالرحمٰن بن مامون نیشاپوری کی قطعی رائے ہے کہ دل سے کہے، کیونکہ زبان سے کہنے میں ریاء ہے۔اور رویانی کی رائے ہے کہ رمضان میں زبان سے اور غیر رمضان میں دل سے کہے۔شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سب کی گنجائش ہے۔اور نووی شرح مہذب میں فرماتے ہیں: کل منهما حسن، والقول باللسان أقوى، ولو جمعهما لكان حسنا (فتح الباری ۴: ۱۰۵)

[۷] قوله صلى الله عليه وسلم: "الصيام جُنَّةٌ"

أقول: ذلك: لأنه يَقِي شَرَّ الشيطانِ والنفسِ، ويُباعِد الإنسانَ من تأثيرهما، ويخالفه عليهما، فلذلك كان من حقه تكميلُ معنى الجُنَّةِ بتنزيهِ لسانه عن الأقوال والأفعال الشهويةِ، وإليه الإشارة فی قوله: "فلا يرفث" والسبُعية، وإليه الإشارة فی قوله: "ولا يَصْخَبْ" وإلى الأقوال بقوله: "سَابَّه" وإلى الأفعال بقوله: "قاتله"

[۸] قوله صلى الله عليه وسلم: "فليقل: إنی صائم" قيل: بلسانه، وقيل: بقلبه، وقيل: بالفرق بين الفرض والنفل، والكلُّ واسع.

ترجمہ: (۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: .... "روزہ ڈھال ہے" میں کہتا ہوں: وہ بات اس لئے ہے کہ روزہ شیطان اور نفس کے شر سے بچاتا ہے۔اور انسانوں کو دونوں کی اثر اندازی سے دور کرتا ہے۔اور روزہ آدمی پر ان دونوں کا قابو نہیں چلنے دیتا۔پس اسی وجہ سے روزہ کے حق میں سے ہے ڈھال کے معنی کی تکمیل، اس کے اپنی زبان کو پاک رکھنے کے ذریعہ شہوانی اقوال وافعال سے۔اور اس کی طرف اشارہ ہے فلا یرفث میں۔اور درندگی والے اقوال وافعال سے۔اور اس کی طرف اشارہ ہے آپؐ کے ارشاد ولا یصخب میں۔اور اقوال کی طرف اشارہ ہے آپؐ کے ارشاد سَابَّه میں۔

اورافعال کی طرف آپ کے ارشاد قاتلہ میں۔

(۸) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''پس چاہئے کہ کہے: میں روزے سے ہوں'' کہا گیا کہ زبان سے کہے۔اور کہا گیا کہ دل سے کہے۔اور فرق کیا گیا فرض اور نفل کے درمیان۔اور سب کی گنجائش ہے۔

لغت: خَالَفَهُ: ناموافقت کرنا۔فاعل ضمیر ہے جو صیام کی طرف راجع ہے،اور ضمیر منصوب انسان کی طرف راجع ہے۔

باب ـــــــ ۳

روزوں کے احکام

چاند نظر نہ آنے کی صورت میں تیس دن پورے کرنے کی وجہ

حدیث شریف: میں ہے کہ جب تک رمضان کا چاند نہ دیکھو، روزے نہ رکھو۔اور جب تک شوال کا چاند نہ دیکھو، روزے بند نہ کرو۔پھر اگر چاند تم سے چھپا دیا جائے تو اس کا اندازہ کرو'' اور اندازہ کرنے کا طریقہ دوسری روایت میں یہ آیا ہے کہ: ''تیس کا شمار پورا کرو'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۶۹)

تشریح: مسئلہ یہ ہے کہ اگر ۲۹ تاریخ کو مطلع ناصاف ہونے کی وجہ سے رمضان کا یا شوال کا چاند نظر نہ آئے تو اگلا دن تیس تاریخ شمار ہوگی۔اس کے بعد آئندہ مہینہ شروع ہوگا۔جبکہ اس صورت میں دونوں احتمال ہیں: افق پر چاند ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہوسکتا۔پھر سوال یہ ہے کہ بلاوجہ ایک پہلو کا کیوں اعتبار کیا گیا؟ اور اس سلسلہ میں فلکیات کے ضوابط سے کیوں کام نہیں لیا گیا؟ شاہ صاحب قدس سرہ اس کی وجوہ بیان فرماتے ہیں:

پہلی وجہ: روزے ماہِ رمضان کے فرض کئے گئے ہیں، جو ایک قمری مہینہ ہے۔اور مہینہ کے ثبوت میں رویت کا اعتبار کیا گیا ہے۔سورۃ البقرۃ آیت ۱۸۵ میں ارشاد پاک ہے: ''(وہ چند دن جن کے روزے فرض کئے گئے ہیں) ماہِ رمضان ہے۔ جس میں قرآن پاک اتارا گیا ہے، جو لوگوں کے لئے ذریعۂ ہدایت، دین کی واضح دلیلیں اور حق وباطل میں فیصلہ کن کتاب ہے، پس تم میں سے جو شخص اس ماہ کو دیکھے یعنی اس کا چاند دیکھے تو چاہئے کہ وہ اس کا روزہ رکھے'' اور متفق علیہ روایت میں ہے کہ: ''چاند دیکھ کر روزے رکھو، اور چاند دیکھ کر روزے بند کرو'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۷۰) پس اشتباہ کی صورت میں ضروری ہے کہ اس اصل (رویت) کی طرف رجوع کیا جائے۔اور جب تک چاند نظر نہ آئے اگلے مہینہ کا فیصلہ نہ کیا جائے۔

دوسری وجہ: قوانین شرعیہ کا مدار ایسے امور پر ہے جو عربوں کے نزدیک واضح ہیں۔اور عربوں کے نزدیک رویت ہی واضح چیز تھی، اس لئے اس کا اعتبار کیا گیا ہے۔وہ لوگ حساب کی باریکیوں سے اور نجوم وفلکیات کے ضوابط سے ناواقف تھے۔اس لئے شریعت نے اس کا اعتبار نہیں کیا۔بلکہ شریعت نے فلکیات ونجوم کے حسابات کو گمنام وبے قدر کیا ہے۔ارشاد

فرمایا کہ: ''ہم ناخواندہ امت ہیں۔ نہ لکھتے ہیں نہ گنتے ہیں۔ مہینہ کبھی ۲۹ کا اور کبھی ۳۰ کا ہوتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۱۹۷۱)

﴿أحكام الصوم﴾

[۱] قال النبي صلى الله عليه وسلم: '' لاتصوموا حتى تَرَوُا الهلالَ، ولا تُفطروا حتى تَرَوْهُ، فإن غُمَّ عليكم فاقدُروا له'' وفي رواية: '' فَأَكمِلوا العِدَّةَ ثلاثين''

أقول: لما كان وقت الصوم مضبوطاً بالشهر القمري، باعتبار رؤية الهلال، وهو تارة ثلاثون يومًا، وتارة تسعةٌ وعشرون: وجب في صورة الاشتباه أن يُرجع إلى هذا الأصل.

وأيضًا: مبنى الشرائع على الأمور الظاهرة عند الأمِّيين، دون التعمق والمحاسبات النجومية، بل الشريعة واردةٌ بإخمالِ ذكرها، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: '' إنا أمَّةٌ أميَّةٌ، لانكتبُ ولا نحسُبُ''

ترجمہ: روزوں کے احکام: (۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:............ میں کہتا ہوں: جب روزوں کا وقت منضبط کیا ہوا تھا چاند کے مہینہ سے رویتِ ہلال کے اعتبار سے۔ اور چاند کا مہینہ کبھی تیس دن کا ہوتا ہے اور کبھی انتیس دن کا، تو اشتباہ کی صورت میں ضروری ہوا کہ اس اصل (رویت) کی طرف رجوع کیا جائے۔

اور نیز: قوانین کا مدار امیوں کے نزدیک واضح چیزوں پر ہے۔ باریک بینی اور علم نجوم کے حسابات پر نہیں ہے۔ بلکہ شریعت وارد ہوئی ہے اُن حسابات کو گمنام اور بے قدر کرنے کے ساتھ۔ اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ہم ناخواندہ امت ہیں: نہ لکھتے ہیں اور نہ گنتے ہیں''

☆ ☆ ☆

''عید کے دو مہینے گھٹتے نہیں!'' کا مطلب

حدیث ــــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''عید کے دو مہینے یعنی رمضان اور ذوالحجہ گھٹتے نہیں!'' (مشکوۃ حدیث ۱۹۷۲) اس ارشاد کے تقریباً دس مطلب بیان کئے گئے ہیں (دیکھیں معارف السنن ۶: ۲۵) حضرت شاہ صاحب قدس سرہ ان میں سے دو مطلب بیان کرتے ہیں:

پہلا مطلب: امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ دونوں مہینے ایک ساتھ گھٹتے نہیں یعنی دونوں انتیس انتیس دن کے نہیں ہوسکتے۔ اگر ایک انتیس کا ہوگا تو دوسرا ضرور تیس کا ہوگا۔ ہاں البتہ دونوں تیس کے ہوسکتے ہیں۔

دوسرا مطلب: امام اسحاق رحمہ اللہ نے یہ بیان کیا ہے کہ تیس اور انتیس کا ثواب متفاوت (کم وبیش) نہیں ہوتا یعنی

اجر وثواب کے لحاظ سے ۳۰ اور ۲۹ یکساں ہوتے ہیں۔ اس قول پر ایک ہی سال میں دونوں مہینے انتیس انتیس کے ہو سکتے ہیں (یہ دونوں قول امام ترمذی نے بیان کئے ہیں)

راجح مطلب: شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آخری قول: قانون سازی کے ضوابط سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ کیونکہ پہلا قول فلکیات اور حساب سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس کو بیان کرنا نبوت کا کام نہیں ہے۔ اور دوسرا قول تعلیم دین سے تعلق رکھتا ہے اور یہی بات منصب نبوت کے شایانِ شان ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے اس ارشاد سے اس خیال کا قلع قمع کر دیا ہے کہ ۲۹ دن کا رمضان ثواب کے اعتبار سے شاید کم ہو۔

فائدہ: اس راجح قول پر یہ اشکال ہے کہ رمضان اگر ۲۹ کا ہو تو ثواب کی کمی کا خیال پیدا ہوتا ہے، مگر ذوالحجہ ۲۹ کا ہو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ذوالحجہ میں تو عبادت شروع کے دس بارہ روز ہی میں ہوتی ہے۔ اور مہینہ کی کمی بیشی کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اصل مقصود رمضان کا حال بیان کرنا ہے اور ذوالحجہ کا تذکرہ ضمناً اور تبعاً آیا ہے۔ جیسے اسودین یعنی کھجور اور پانی کی ضیافت میں، اصل ضیافت کھجور کی ہے، پانی کا تذکرہ تبعاً ہے۔ اسی طرح قتل الاسودین میں اصل مقصود سانپ کو مار ڈالنے کا امر ہے کہ چاہے نماز توڑنی پڑے، سانپ کو نہ جانے دو۔ اور بچھو کا تذکرہ ضمناً آیا ہے۔ مگر خواہ مخواہ نہیں آیا۔ کھجور کھلانے کے بعد پانی بھی پلایا جاتا ہے اور بچھو کو مار ڈالنا بھی مطلوب ہے۔ اسی طرح ذوالحجہ میں بھی کوئی نادر صورت نکل سکتی ہے۔ اس صورت میں بھی ثواب میں کمی نہ ہوگی۔

اور وہ نادر صورت یہ ہے کہ ذوالحجہ کا چاند بادلوں کی وجہ سے ۲۹ کو نظر نہ آیا۔ چنانچہ ذی قعدہ کے ۳۰ دن پورے کر کے ذوالحجہ شروع کیا گیا۔ پھر چند روز بعد ۲۹ کا چاند ثابت ہو گیا تو ایک تاریخ بڑھ جائے گی اور عشرۂ ذی الحجہ کا ایک دن گھٹ جائے گا، مگر ثواب پورا ملے گا۔

[۲] وقوله صلى الله عليه وسلم:" شهرا عيدٍ لاينقُصانِ: رمضانُ، وذو الحِجَّةِ" قيل: لاينقُصان معاً؛ وقيل: لايتفاوت أجر ثلاثين وتسعةٍ وعشرين؛ وهذا الأخير أقعدُ بقواعد التشريع، كأنَّه أراد سدَّ أن يخطر في قلب أحد ذلك.

ترجمہ: (۲) اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد: عید کے دو مہینے کم نہیں ہوتے یعنی رمضان اور ذوالحجہ'' کہا گیا: دونوں مہینے ایک ساتھ کم نہیں ہوں گے۔ اور کہا گیا: کم وبیش نہیں ہوتا ۳۰ اور ۲۹ کا ثواب۔ اور یہ آخری قول: قانون سازی کے ضوابط سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ گویا آپؐ نے اس بات کا سد باب کرنا چاہا کہ کسی کے دل میں یہ بات گذرے۔

☆ ☆ ☆

روزوں میں تعمق کے سدّ باب کی وجہ

روزوں کے باب میں شریعت نے اس بات کا خصوصی اہتمام کیا ہے کہ تعمق (غلو) کے سارے سوراخ بند کردیئے جائیں۔اور روزوں کے معاملہ میں حد سے گذرنے والوں نے جونئی باتیں نکالی ہیں ان کی مکمل تردید کردی جائے۔کیونکہ روزوں کی عبادت: یہود ونصاری اور عرب کے خدا پرست لوگوں میں رائج تھی۔اور جب انھوں نے دیکھا کہ روزوں کا مقصد قہرِ نفس ہے، تو انھوں نے غلو سے کام لیا۔اور چند ایسی باتیں شروع کیں جن سے نفس خوب مغلوب ہوتا تھا۔حالانکہ وہ دین میں تحریف تھیں۔اس لئے ہماری شریعت نے اس سلسلہ میں پیش بندی سے کام لیا۔

روزوں میں تحریف:

روزوں میں تحریف یا تو کمیّت (مقدار) کے اعتبار سے ہوتی ہے، یا کیفیت کے اعتبار سے:

① —— کمیّت کے اعتبار سے تحریف کا سدّ باب کرنے کے لئے درج ذیل احکام دیئے:

(۱) رمضان کے روزے احتیاطاً ایک دو دن پہلے شروع نہ کردیئے جائیں۔حدیث شریف میں ہے کہ:''تم میں سے کوئی شخص ہرگز رمضان سے آگے نہ بڑھے کہ ایک دن یا دو دن پہلے روزے شروع کردے۔مگر یہ کہ کوئی شخص کسی دن کا مثلاً جمعہ وجمعرات کا روزہ رکھا کرتا تھا تو چاہئے کہ وہ اس دن کا روزہ رکھے''

(۲) آنحضرت ﷺ نے عیدالفطر کے روزے کی ممانعت کردی۔اس کی تفصیل آگے عربی کے پیرا نمبر ۱۵ میں آرہی ہے۔

(۳) یوم الشک یعنی مطلع ناصاف ہونے کی صورت میں شعبان کی تیس تاریخ کے روزے کی ممانعت فرمائی۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس نے یوم الشک کا روزہ رکھا، اس نے ابوالقاسم ﷺ کی نافرمانی کی (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۷۷)

ممانعت کی وجہ: مذکورہ تینوں روزوں کی ممانعت اس لئے کی گئی ہے کہ ان روزوں میں اور رمضان کے درمیان کوئی فصل نہیں اس لئے اندیشہ ہے کہ اگر غلو کرنے والے اس کو سنت بنالیں گے، اور ان سے آئندہ نسل یہ چیز حاصل کرے گی، اور اسی طرح سلسلہ چلتا رہے گا، تو اندیشہ ہے کہ رفتہ رفتہ دین بگڑ کر رہ جائے۔اور یہی تعمق کی اصل ہے۔تعمق کے لغوی معنی ہیں: کسی معاملہ کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا۔اور اصطلاحی معنی ہیں: احکام شرعیہ کو ان کی حدود سے متجاوز کرنا۔اور اس کی بنیاد ہے: احتیاط کی جگہ کو لازم کرلینا، جیسے احتیاطاً یوم الشک کے روزے کو لازم کرلینا (تفصیل مبحث ۶ باب ۱۸ میں گذر چکی ہے۔دیکھیں رحمۃ اللہ ۲: ۳۷۳)

② —— اور کیفیت کے اعتبار سے روزوں میں زیادتی کو روکنے کے لئے درج ذیل احکام دیئے:

(۱) صوم وصال کی ممانعت فرمائی۔تفصیل پیرا نمبر ۸ میں آئے گی۔

(۲) سحری کھانے کی ترغیب دی۔ تفصیل پیرا نمبر ۶ میں آئے گی۔

(۳و۴) سحری کھانے میں تاخیر کرنے کا اور افطار میں جلدی کرنے کا حکم دیا۔ تفصیل پیرا نمبر ۷ میں آئے گی۔

مذکورہ بالا تمام امور تشدّد وتعمق کے باب سے ہیں۔ اور جاہلیت کے طریقوں میں سے ہیں۔ اس لئے ان کی ممانعت کردی تاکہ دین محفوظ رہے۔

[۳] واعلم أن من المقاصد المهمَّة فی باب الصوم: سدُّ ذرائع التعمق، وردُّ ما أحدثه فيه المتعمقون، فإن هذه الطاعة كانت شائعةً فی اليهود، والنصاری، ومُتَحَنِّثِی العرب، ولما رأوا أن أصلَ الصوم هو قهرُ النفس: تعمَّقوا، وابتدعوا أشياءَ، فيها زيادةُ القهر، وفی ذلك تحريف دين الله.

وهو: إما بزيادة الكمِّ، أو الكيف:

فمن الكمِّ: قوله صلی الله عليه وسلم: " لايتقدَّمَنَّ أحدُكم رمضانَ بصومِ يومٍ أو يومين، إلا أن يكون رجل كان يصوم يومًا، فَلْيَصُمْ ذلك اليومَ"، ونهيُه عن صوم يوم الفطر، ويوم الشك.

وذلك: لأنه ليس بين هذه وبين رمضان فصلٌ، فلعله إن أخذ ذلك المتعمقون سنةً، فيُدركه منهم الطبقةُ الأخری وهلم جرًا: يكون تحريفًا؛ وأصل التعمق: أن يؤخذ موضِعُ الاحتياط لازمًا، ومنه يومُ الشك.

ومن الكيف: النهی عن الوصال، والترغيب فی السحور، والأمرُ بتأخيره، وتقديمِ الفطر؛ فكل ذلك تشدُّدٌ وتعمُّقٌ من صُنع الجاهلية.

ترجمہ: (۳) اور جان لیں کہ روزوں کے باب میں اہم مقاصد میں سے: تعمق کے ذرائع کا سدّ باب کرنا ہے۔ اور اس چیز کی تردید کرنا ہے جس کو نیا پیدا کیا ہے حد سے تجاوز کرنے والوں نے روزوں میں۔ پس بیشک یہ عبادت رائج تھی یہود ونصاری اور عرب کے خدا پرست لوگوں میں۔ اور جب دیکھا انھوں نے کہ روزے کا اصل مقصد نفس کو مغلوب کرنا ہے تو انھوں نے معاملہ کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی، اور چند ایسی چیزیں ایجاد کیں جن میں مغلوبیت کی زیادتی تھی۔ حالانکہ اس میں اللہ کے دین میں تبدیلی تھی۔

اور تحریف: یا تو کمیت میں زیادتی سے ہوتی ہے یا کیفیت میں۔ پس کمیت کے باب سے: آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''ہرگز آگے نہ بڑھے تم میں سے کوئی شخص رمضان سے، ایک دن یا دو دن کے روزے کے ذریعہ، مگر یہ کہ کوئی شخص کسی دن کا روزہ رکھا کرتا ہو، پس چاہئے کہ وہ اس دن کا روزہ رکھے'' اور آپ کا عید الفطر اور یوم الشک کے روزوں سے منع کرنا ہے۔

اور وہ ممانعت بایں وجہ ہے کہ ان روزوں کے درمیان اور رمضان کے درمیان کوئی فصل نہیں۔ پس ہوسکتا ہے: اگر

بنالیں اس کو غلو کرنے والے سنت، پھر حاصل کرے اس کو ان کا دوسرا طبقہ، اور اسی طرح سلسلہ چلتا رہے تو ہو جائے تحریف۔ اور تعمق کی جڑ یہی ہے کہ احتیاط کی جگہ کو لازم کرلیا جائے یعنی جو کام صرف احتیاطاً مطلوب تھا اس کو لازم سمجھ لیا جائے، اور منجملۂ ازاں یوم الشک (کا روزہ) ہے۔

اور کیفیت کے باب سے: صوم وصال کی ممانعت ہے۔ اور سحری کھانے کی ترغیب ہے۔ اور سحری کھانے میں تاخیر کرنے کا اور افطار میں جلدی کرنے کا حکم ہے۔ پس یہ سب باتیں تشدد وتعمق ہیں اور جاہلیت کے طریقوں میں سے ہیں۔

لغت: مُتَحَنِّث (اسم فاعل) تحنَّث: بتوں سے علحدہ ہوا، ان کی پرستش چھوڑ دی اور اللہ کی عبادت کرنے لگا۔

☆　☆　☆

شعبان کے نصف ثانی کا روزہ

سوال: ایک حدیث میں آیا ہے کہ: ''جب شعبان کا مہینہ آدھا ہو جائے تو روزے مت رکھو'' (مشکوۃ حدیث ۱۹۷۴) اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو لگاتار دو ماہ کے روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ سوائے شعبان اور رمضان کے (مشکوۃ حدیث ۱۹۷۶) اس روایت سے معلوم ہوا کہ آپؐ شعبان کے نصف ثانی میں بھی روزے رکھتے تھے۔ پس ان دونوں روایتوں میں تعارض ہے۔

جواب: ان دونوں روایتوں میں تعارض نہیں۔ کیونکہ پہلی روایت امت کے لئے تشریع ہے اور دوسری روایت آپ ﷺ کی خصوصیت ہے۔ اس لئے کہ آپؐ اپنے ذاتی معاملہ میں بعض ایسے کام کرتے تھے جن کا آپ لوگوں کو حکم نہیں دیتے تھے۔ اور یہ کام زیادہ تر وہ ہوتے تھے جو سدّ ذرائع اور کلی احتمالی مواقع کی تعیین کے قبیل سے ہوتے تھے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آپؐ اس بات سے محفوظ تھے کہ کسی چیز کو غیر محل میں استعمال کریں۔ یا اس حد سے جو آپؐ کے لئے مقرر کی گئی ہے طبیعت کی کمزوری اور دل کی رنجیدگی کی طرف تجاوز کریں۔ اور دوسرے لوگوں کی صورتِ حال آپؐ سے مختلف تھی، وہ اس اندیشہ سے محفوظ نہیں تھے۔ اس لئے ان کے لئے قانون بنانے کی اور غلو کا دروازہ بند کرنے کی ضرورت تھی۔

مثال: اور وہ نہی جو سدّ ذرائع کے قبیل سے ہے اور ضرر کی عمومی احتمالی جگہ ہے، اس کی مثال: امت کے لئے چار سے زیادہ ازواج سے نکاح کا عدم جواز ہے۔ کیونکہ اس سے ظلم کا دروازہ کھل سکتا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ چونکہ اس اندیشہ سے محفوظ تھے اس لئے آپؐ کے لئے نو بیویاں بلکہ اس سے بھی زائد سے نکاح جائز تھا۔ اور یہ آپؐ کی خصوصیت تھی۔ یہی حال پورے شعبان کے روزوں کا ہے۔ امت کے حق میں ضُعف کا اندیشہ تھا۔ اس لئے ان کو شعبان کے نصف ثانی میں روزوں سے روک دیا۔ اور آپؐ کے حق میں یہ اندیشہ نہیں تھا، اس لئے آپ پورے شعبان کے روزے رکھتے تھے۔

[٤] ولا اختلافَ بين قوله صلى الله عليه وسلم: '' إذا انتصف شعبانُ فلا تصوموا'' وحديثِ أم

سلمة رضی اللہ عنہا: "ما رأیتُ النبیَّ صلی اللہ علیہ وسلم یصوم شهرینِ متتابعینِ إلا شعبان ورمضانَ" لأن النبیَّ صلی اللہ علیہ وسلم کان یفعل فی نفسه مالایأمر به القومَ؛ وأکثرُ ذلك: ما هو من باب سدِّ الذرائع، وضربِ مظناتٍ کلیةٍ، فإنه صلی اللہ علیہ وسلم مأمونٌ من أن یستعملَ الشیئَ فی غیر محله، أو یجاوزَ الحدَّ الذی أُمر به إلی إضعافِ المزاج وملالِ الخاطر؛ وغیرُه لیس بمأمون، فیحتاجون إلی ضرب تشریع، وسدِّ تعمق؛ ولذلك کان صلی اللہ علیہ وسلم ینهاهم أن یجاوزوا أربعَ نسوة، وکان أُحِلَّ له تسعٌ فمافوقَها، لأن علةَ المنع أن لایُفضی إلی جَوْرٍ.

ترجمہ: (۴) اور کچھ تعارض نہیں آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے درمیان کہ "جب شعبان کا مہینہ آدھا ہوجائے تو روزے مت رکھو" اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے درمیان کہ میں نے نبی ﷺ کو لگاتار دو ماہ کے روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ سوائے شعبان اور رمضان کے، اس لئے کہ نبی ﷺ کیا کرتے تھے اپنی ذات میں وہ کام جس کا آپؐ لوگوں کو حکم نہیں دیتے تھے۔ اور ان کے بیشتر: وہ کام ہیں جو ذرائع کے سد باب اور کلی احتمالی مواقع کی تعیین کے قبیل سے تھے (عطف تفسیری ہے) پس بیشک آنحضرت ﷺ محفوظ تھے اس بات سے کہ کسی چیز کو غیر محل میں استعمال کریں۔ یا اس حد سے تجاوز کریں جس کا آپؐ کو حکم دیا گیا ہے، مزاج کو کمزور کرنے اور دل کو رنجیدہ کرنے کی طرف۔ اور آپؐ کا غیر محفوظ نہیں ہے۔ پس وہ محتاج ہیں قانون بنانے اور غلو کا دروازہ بند کرنے کی طرف۔ اور اسی وجہ سے نبی ﷺ لوگوں کو روکا کرتے تھے اس بات سے کہ وہ تجاوز کریں چار بیویوں سے، اور آپ کے لئے جائز کی گئی تھیں نو بیویاں، پس ان سے زیادہ، اس لئے کہ ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ وہ ظلم تک نہ پہنچائے۔

☆ ☆ ☆

رمضان کے چاند میں ایک مسلمان کی خبر معتبر ہونے کی وجہ

اگر مطلع ناصاف ہو تو رمضان کے چاند میں ایک دیندار یا مستور (جس کا دینی حال معلوم نہ ہو) مسلمان کی خبر معتبر ہے۔ احادیث سے یہ دونوں باتیں ثابت ہیں:

دیندار مسلمان کی خبر: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ لوگ چاند دیکھنے کے درپے ہوئے (کسی کو چاند نظر نہ آیا) پس میں نے رسول اللہ ﷺ کو خبر دی کہ میں نے چاند دیکھا ہے، چنانچہ آپؐ نے روزہ رکھا۔ اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۷۹)

مستور مسلمان کی خبر: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک بدوی نبی ﷺ کے پاس آیا۔ اور اس نے کہا کہ میں نے چاند دیکھا ہے — یعنی رمضان کا چاند — آپؐ نے دریافت کیا: کیا تو گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی

معبود نہیں؟ اس نے جواب دیا: ہاں! آپؐ نے دریافت کیا: کیا تو گواہی دیتا ہے کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں؟ اس نے جواب دیا: ہاں! آپؐ نے فرمایا: بلال اعلان کردو کہ لوگ آئندہ کل روزہ رکھیں (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۷۸)

تشریح: دیانات (دینی معاملات) میں ایک دیندار یا مستور مسلمان کی خبر معتبر ہے۔ عدد، عدالت اور شہادت ضروری نہیں۔ یہ امور روایتِ حدیث کی طرح ہیں۔ جیسے پانی کی پاکی ناپاکی یا کسی چیز کی حلت وحرمت کی کوئی شخص خبر دے اور وہ مسلمان ہو اور بہ ظاہر فاسق نہ ہو تو یہ خبر معتبر ہے۔ البتہ شوال کے چاند میں چونکہ الزام (لازم کرنا) ہے، اس لئے دو دیندار مسلمانوں کی گواہی ضروری ہے۔

[٥] ثم الهلال يثبت بشهادة مسلم عدل، أو مستور: أنه رآه، وقد سنَّ رسول الله صلى الله عليه وسلم فى كلتا الصورتين: " جاء أعرابى ، فقال: إنى رأيتُ الهلال، قال: أتشهد؟" وأخبر ابن عمر أنه رآه فصام، وكذلك الحكمُ فى كل ماكان من أمور الملة، فإنه يُشبهُ الرواية.

ترجمہ: (۵) پھر چاند ثابت ہوتا ہے ایک عادل یا مستور مسلمان کی شہادت سے (خبر مراد ہے) کہ اس نے چاند دیکھا ہے۔ اور تحقیق طریقہ رائج کیا رسول اللہ ﷺ نے دونوں ہی صورتوں میں (یعنی دونوں باتیں سنتِ نبوی سے ثابت ہیں۔ مگر روایات میں لفّ ونشر غیر مرتب ہے) آیا ایک بدوی الخ اور یہی حکم ہے ہر اس معاملہ میں جو ملی امور میں سے ہے یعنی باب دیانات سے ہے۔ پس بیشک وہ خبر روایتِ حدیث کے مانند ہے۔

☆ ☆ ☆

سحری کی برکات

حدیث ــــــ میں ہے کہ: "سحری کیا کرو، کیونکہ سحری کھانے میں برکت ہے" (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۸۲)

تشریح: سحری کھانے میں دو برکتیں ہیں:

ایک: کا تعلق بدن کی اصلاح سے ہے یعنی بدن نحیف ونزار نہیں ہوتا۔ کیونکہ روزہ از صبح تا شام مفطرات سے رکنے کا نام ہے، پس اگر سحری نہیں کرے گا تو رات بھی روزہ میں شامل ہوجائے گی۔ اور بھوک پیاس کے امتداد سے ضعف لاحق ہوگا۔

دوسری برکت: کا تعلق انتظام ملت سے ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ لوگ ملی معاملات میں حدود سے تجاوز نہ کریں تا کہ ملت میں تبدیلی اور تغیر در نہ آئے۔

[٦] وقال صلى الله عليه وسلم: " تسحَّروا فإن فى السَّحور بركةً"

أقول: فيه بركتان:

إحداهما راجعة إلى أصلاح البدن: أن لايَنْفَهَ، ولايضعف، إذ الإمساك يوماً كاملاً نصابٌ فلايُضاعف.
والثانية: راجعة إلى تدبير الملة: أن لايتعمق فيها، ولايدخلها تحريف، أو تغيير.

ترجمہ: (۶) اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ سحری کیا کرو، پس بیشک سحری کے کھانے میں برکت ہے۔ میں کہتا ہوں: اس میں دو برکتیں ہیں۔ ان میں سے ایک: لوٹنے والی ہے بدن کی اصلاح کی طرف کہ نحیف ولاغر نہ ہو جائے۔ کیونکہ ایک کامل دن مفطرات سے رکنا روزہ کا نصاب (مقررہ وقت) ہے۔ پس اس پر زیادتی نہیں کی جائے گی۔ اور دوسری برکت: ملت کے انتظام کی طرف لوٹنے والی ہے کہ وہ ملت میں حد سے تجاوز نہ کرے۔ اور ملت میں تبدیلی اور تغیر در نہ آئے۔

لغت: نَفِهَتْ (س) نفسُه نَفْهًا: تھکنا۔

☆　☆　☆

سحری اور جلدی افطار میں حکمت

حدیث ـــ میں ہے کہ: ”لوگ جب تک روزہ افطار کرنے میں جلدی کریں گے خیر میں رہیں گے“ (مشکوۃ حدیث ۱۹۸۴)

حدیث ـــ میں ہے کہ: ”ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں میں صرف سحری کے ایک لقمہ کا فرق ہے“ (مشکوۃ حدیث ۱۹۸۳)

حدیث قدسی ـــ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ”میرے محبوب ترین بندے وہ ہیں جو روزہ افطار کرنے میں جلدی کرتے ہیں“ (مشکوۃ حدیث ۱۹۸۹)

تشریح: ان تمام روایات میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس مسئلہ میں اہل کتاب کی طرف سے تحریف در آئی تھی۔ پس ملتِ اسلامیہ کا قیام وبقا اس پر موقوف ہے کہ اہل کتاب کی مخالفت کی جائے اور ان کی تحریفات کا قلع قمع کیا جائے۔

[۷] وقوله صلى الله عليه وسلم: ”لايزال الناسُ بخير ماعجَّلوا الفطرَ“ وقولُه عليه السلام: ”فصلُ ما بين صيامنا وصيامِ أهل الكتاب أُكْلَةُ السَّحَرِ“ وقال الله تعالى: ”أحبُّ عبادى إلَيَّ أعجلُهم فطراً“
أقول: هذا إشارة إلى أن هذه مسألة دخل فيها التحريف من أهل الكتاب، فبمخالفتهم وردِّ تحريفهم قيامُ الملة.

ترجمہ: (تین روایتیں ذکر کرنے بعد) میں کہتا ہوں: یہ روایات اس طرف مشیر ہیں کہ اس مسئلہ میں اہل کتاب کی طرف سے تحریف در آئی ہے۔ پس اس کی مخالفت سے اور ان کی تبدیلی کی تردید سے ملت کا قیام ہے۔

صوم وصال کی ممانعت کی وجہ

صوم وصال: یہ ہے کہ متواتر دو یا زیادہ دنوں کا روزہ اس طرح رکھا جائے کہ رات میں بھی افطار نہ کیا جائے۔صوم وصال ممنوع ہے۔حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صوم وصال سے لوگوں کو منع فرمایا۔ایک صحابی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ تو صومِ وصال رکھتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ’’تم میں سے کون میری مانند ہے؟! میری رات اس طرح گذرتی ہے کہ میرا رب مجھے کھلاتا پلاتا ہے‘‘ (پس تم خود کو مجھ پر قیاس مت کرو) (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۸۶)

تشریح: صوم وصال کی ممانعت دو وجہ سے ہے:

پہلی وجہ: اس طرح کا روزہ سخت ضعف کا باعث ہوتا ہے اور ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ابواب الصوم کے شروع میں اس کی تفصیل گذر چکی ہے۔

دوسری وجہ: صوم وصال کی ممانعت اس لئے ہے کہ ملت میں تبدیلی نہ ہوجائے۔یعنی جب لوگوں میں یہ روزہ چل پڑے گا تو اصل روزہ لوگ بھول جائیں گے۔لیکن خود رسول اللہ ﷺ کا حال چونکہ یہ تھا کہ آپ کو صوم وصال سے ہلاکت کا اندیشہ نہیں تھا۔آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے روحانی قوت ملتی رہتی تھی اس لئے آپ خود ایسے روزے رکھتے تھے۔

فائدہ: صوم وصال کی ممانعت کا اصل مقصد ومنشأ یہ ہے کہ اللہ کے بندے مشقت اور تکلیف میں مبتلا نہ ہوں۔اور ان کی صحت کو نقصان نہ پہنچے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی متفق علیہ روایت ہے کہ: ’’رسول اللہ ﷺ نے شفقت کی بنا پر صوم وصال سے منع فرمایا ہے‘‘ چنانچہ متعدد صحابہ وتابعین سے صوم وصال رکھنا مروی ہے۔اور سحر تک کے وصال کی تو بخاری کی روایت میں آپؐ نے عام اجازت دی ہے (بخاری حدیث ۱۹۶۷)

[۸] ونهى صلى الله عليه وسلم عن الوصال، فقيل: إنك تُواصل! قال: ” وأيُّكم مِثلي؟! إنى أبيتُ يُطعِمُنى ربى ويَسقِينى“

أقول: النهى عن الوصال إنما هو لأمرين:

أحدهما: أن لايَصِلَ إلى حد الإجحاف، كما بينا.

والثانى: أن لاتُحَرَّفَ الملةُ.

وقد أشار النبى صلى الله عليه وسلم إلى أنه لايأتيه الإجحافُ، لأنه مُؤَيَّدٌ بقوَّةٍ ملكية نورية، وهو مأمون.

ترجمہ: (۸) اور منع فرمایا رسول اللہ ﷺ نے صوم وصال سے الخ ...... میں کہتا ہوں: صوم وصال کی ممانعت دو

باتوں کی وجہ سے ہے: ایک: یہ ہے کہ نہ پہنچے روزہ دار ہلاکت کی حد تک، جیسا کہ بیان کیا ہم نے اور دوسری وجہ: یہ ہے کہ ملت میں تبدیلی نہ آئے —— اور تحقیق نبی ﷺ نے اشارہ فرمایا ہے کہ آپؐ ہلاک نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ آپؐ قوی کئے ہوئے ہیں نورانی ملکوتی انوار سے، اور آپ ہلاکت سے محفوظ ہیں۔

لغت: أَجْحَف الدهر بالناس: ہلاک کرنا، جڑ سے مٹانا۔ اور بطور استعارہ نقص فاحش۔

☆ ☆ ☆

کیا روزے میں نیت رات سے ضروری ہے؟

سوال: حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ: ''جس نے فجر سے پہلے روزے کی نیت نہیں کی اس کا روزہ نہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۸۷) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر روزے کی نیت رات سے کرنا ضروری ہے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ ایک دن نبی ﷺ ان کے پاس تشریف لائے، اور دریافت کیا کہ آپ لوگوں کے پاس کھانے کو کچھ ہے؟ گھر والوں نے نفی میں جواب دیا، تو آپؐ نے فرمایا: ''میں اب روزے سے ہوں'' یعنی آپؐ نے اس وقت روزہ کی نیت کر لی (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۷۶) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دن شروع ہونے کے بعد بھی روزے کی نیت کی جاسکتی ہے۔ پس دونوں روایتوں میں تعارض ہے؟

جواب: یہ ہے کہ ان روایات میں کچھ تعارض نہیں۔ پہلی روایت فرض روزے کے بارے میں ہے اور دوسری نفل کے بارے میں۔ اور جب موضوع بدل گیا تو تعارض رفع ہو گیا۔ یا پہلی حدیث میں کمال کی نفی مراد ہے یعنی کامل روزہ وہ ہے جس کی نیت رات سے کی گئی ہو۔ دن شروع ہو جانے کے بعد بھی نیت کرنے سے گو روزہ درست ہو جاتا ہے۔ مگر وہ کامل روزہ نہیں ہوتا۔

فائدہ: اس میں اختلاف ہے کہ کونسے روزے کی نیت رات سے ضروری ہے اور کونسے روزے کی نیت صبح صادق کے بعد بھی کی جاسکتی ہے؟ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک ہر روزہ کی نیت رات سے ضروری ہے، حتی کہ نفل روزے میں بھی رات سے نیت کرنا شرط ہے۔ ان کی دلیل پہلی روایت ہے۔ اور دوسری روایت کو علامہ ابن عبدالبر مالکی رحمہ اللہ نے مضطرب کہا ہے، حالانکہ وہ مسلم شریف کی روایت ہے (صاوی علی الدردیر ا: ۲۴۵)

اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک نفل کے علاوہ ہر روزہ کی نیت رات سے ضروری ہے۔ اور نفل روزے کی نیت دن شروع ہونے کے بعد بھی کی جاسکتی۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کا پہلا جواب ان حضرات کے مذہب پر ہے۔

اور احناف کے نزدیک: رمضان، نذرِ معین اور نفل روزوں کی نیت رات سے ضروری نہیں۔ اور قضاء، کفارہ اور نذر مطلق کے روزوں کی نیت رات سے ضروری ہے۔ احناف کے دلائل طحاوی اور معارف السنن (۶: ۸۳) میں ہیں۔ شاہ

صاحب رحمہ اللہ کی دوسری توجیہ ان حضرات کے مسلک پر ہے کہ رات سے نیت مستحب ہے۔ اور پہلی حدیث میں نفی کمالِ صوم کی نفی ہے۔

فائدہ: پہلی روایت کے رفع ووقف میں شدید اختلاف ہے۔ اکثر محدثین کے نزدیک وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا فتوی ہے۔ نسائی، ابوداؤد، ترمذی، بخاری وغیرہم نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ وقال البخاری: وهو — أی المرفوع — خطأ، وهو حديث فيه اضطراب اھ (معارف)

> [۹] ولا اختلاف بين قوله صلى الله عليه وسلم: "من لم يُجْمِعِ الصيامَ قبل الفجر فلاصيام له" وبين قوله عليه السلام حين لم يجد طعامًا: "إنی إذًا صائم" لأن الأول فی الفرض، والثانی فی النفل، أو المراد بالنفی نفی الكمال.

ترجمہ: (۹) اور کچھ تعارض نہیں آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے درمیان کہ: "جس نے فجر سے پہلے روزے کا پختہ ارادہ نہ کیا تو اس کا روزہ نہیں" اور آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے درمیان جب آپؐ کھانے کی کوئی چیز نہیں پاتے تھے کہ: "میں اب روزے سے ہوں" اس لئے کہ پہلی حدیث فرض کے بارے میں ہے اور دوسری نفل کے بارے میں یا نفی سے نفیِ کمال مراد ہے۔

تصحیح: أو المراد مطبوعہ میں والمراد تھا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

فجر کی اذان کے بعد کھانے کی روایت صحیح نہیں

ابوداؤد میں روایت ہے کہ: "جب تم میں سے کوئی (فجر کی) اذان سنے، اور (کھانے پینے کا) برتن اس کے ہاتھ میں ہو، تو وہ اس کو نہ رکھے، یہاں تک کہ اس سے اپنی حاجت پوری کرلے" (مشکوۃ حدیث ۱۹۸۸)

تشریح: اس روایت میں اشکال یہ ہے کہ فجر کی اذان صبح صادق کے بعد ہی ہوتی ہے، پھر اب کھانے پینے کی گنجائش کہاں؟ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں فجر کی اذان مراد نہیں، بلکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی وہ اذان مراد ہے جو سحری کے وقت ہوتی تھی۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بیشک بلال رات میں اذان دیں گے۔ پس کھاؤ پیو یہاں تک کہ ابن ام مکتوم اذان دیں" (مشکوۃ حدیث ۶۸۰ باب تاخیر الاذان) شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ مذکورہ روایت: اس روایت کا اختصار ہے، پس روایت پر کوئی اشکال نہیں۔

فائدہ: حدیث کی یہ تاویل خطابی رحمہ اللہ نے کی ہے (مرقات ۴:۲۵۴) مگر یہ تاویل بعید ہے۔ اس سے اشکال ختم

نہیں ہوتا۔ کیونکہ حدیث کا یہ جملہ: ''اور (کھانے پینے کا) برتن اس کے ہاتھ میں ہو'' یہ قید بے فائدہ ہوجاتی ہے۔ مرقات اور بذل (۱۱:۱۵۱ مصری) میں اور بھی تاویلیں کی گئی ہیں۔ مگر کوئی تسلی بخش نہیں۔ ایک تاویل یہ بھی کی گئی ہے کہ روزہ فجر حقیقی سے شروع نہیں ہوتا، بلکہ صبح روشن ہونے سے شروع ہوتا ہے، جیسا کہ سورۃ البقرۃ آیت ۱۸۷ میں ارشاد پاک ہے: ''اور کھاؤ پیو اس وقت تک کہ تم کو سفید خط: سیاہ خط سے خوب متمیز معلوم ہو'' مگر جمہور کا مسلک یہ ہے کہ روزہ فجر حقیقی سے شروع ہوتا ہے۔ حلوانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پہلا قول اَرفق (زیادہ آسان) ہے اور جمہور کا قول اَحوط (زیادہ محتاط) ہے۔ (عالمگیری) پس کہا گیا ہے کہ مذکورہ حدیث پہلے قول کی بنیاد ہے۔ مگر یہ بات اسی وقت درست ہوسکتی ہے کہ فرض کرلیا جائے کہ اذان اول وقت میں ہوئی ہے۔ حالانکہ اس کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔ پس اشکال باقی ہے۔

صحیح بات: یہ ہے کہ یہ روایت ہی صحیح نہیں۔ اس کو صرف ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ کتب ستّہ میں سے کسی اور نے اس کو روایت نہیں کیا۔ اس کو محمد بن عَمرو بن علقمۃ بن وقاص لیثی روایت کرتے ہیں، حضرت ابوسلمۃ بن عبدالرحمٰن بن عوف سے، وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ محمد بن عَمرو اول تو اعلی درجہ کے راوی نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ان کی روایت مقرونا بغیرہ (دوسرے راوی کے ساتھ ملا کر) لی ہے۔ اور امام مسلم رحمہ اللہ نے صرف متابعات میں ان کی روایت لی ہے۔ اصول میں نہیں لی۔ پھر اس راوی کی ایک کمزوری یہ ہے کہ وہ حضرت ابوسلمہ کی رائے کو حدیث مرفوع بنادیا کرتا تھا۔ ابوسلمہ: مدینہ کے فقہائے سبعہ میں سے ہیں۔ اور مجتہد ہیں۔ مذکورہ روایت ابوسلمہ کی رائے ہے۔ محمد بن عَمرو نے اس کو حدیثِ مرفوع بنادیا ہے جو ان کی چوک ہے۔ مزّی رحمہ اللہ تہذیب الکمال میں محمد بن عَمرو کے تذکرہ میں لکھتے ہیں: قال أبوبكر بن أبي خيثمة: سُئل يحيى بن مَعين عن محمد بن عَمرو؟ فقال: مازال الناس يَتَّقون حديثَه! قيل له: وما علة ذلك؟ قال: كان يحدِّث مرة عن أبي سلمة بالشيئ من رأيه، ثم يحدِّث به مرة أخرى: عن أبي سلمة، عن أبي هريرة اهـ.

[۱۰] وقوله صلى الله عليه وسلم: '' إذا سمع النداء أحدكم'' إلخ.
أقول: المراد بالنداء هو نداء خاص، أعني نداءَ بلالٍ؛ وهذا الحديث مختصر حديثِ:'' إن بلالاً ينادي بليل''

ترجمہ: (۱۰) حدیث ذکر کرنے کے بعد: میں کہتا ہوں: اذان سے مراد خاص اذان ہے۔ میری مراد حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان ہے۔ اور یہ حدیث: حدیث ''بلال رات میں اذان دیں گے'' کا اختصار ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ ۳:۳۳۶)

☆ ☆ ☆

کھجور سے افطار کی حکمت

حدیث —— میں ہے کہ: ''جب تم میں سے کوئی روزہ افطار کرے تو چاہئے کہ کھجور سے افطار کرے۔ پس بیشک وہ (کھجور) برکت ہے۔ پس اگر کھجور نہ پائے تو چاہئے کہ پانی سے افطار کرے، اس لئے کہ پانی یقیناً پاک کرنے والا ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۹۰)

تشریح: کھجور سے افطار کرنے میں چند فوائد ہیں: (۱) کھجور میٹھی چیز ہے، اور میٹھی چیز کی طرف طبیعت راغب ہوتی ہے، خصوصاً بھوک کے وقت (۲) میٹھی چیز کو جگر پسند کرتا ہے (۳) عربوں کی طبائع کھجور کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ وہ ان کی بہترین غذا ہے۔ اور جو غذا رغبت سے کھائی جائے وہ جسم کو بہت نفع پہنچاتی ہے۔ اس سے خلطِ صالح پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ بھی برکت کی ایک صورت ہے (تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ ۲: ۶۵)

> [۱۱] وقوله صلى الله عليه وسلم: '' إذا أفطر أحدكم فليُفطر على تمر، فإنه بركة، فإن لم يجد فليفطر على ماء، فإنه طَهور''
>
> أقول: الحُلْو يُقبل عليه الطبع، لاسيما بعد الجوع، ويحبُّه الكَبِدُ، والعرب يميل طبعُهم إلى التمر، وللميل فى مثله أثر، فلا جرم أنه يصرفه فى المحل المناسب من البدن، وهذا نوع من البركة.

ترجمہ: (۱۱) حدیث کے بعد: میں کہتا ہوں: میٹھی چیز کی طرف طبیعت متوجہ ہوتی ہے، خصوصاً بھوک کے بعد۔ اور جگر میٹھی چیز کو پسند کرتا ہے اور عربوں کی طبیعتیں کھجور کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ اور میلان کے لئے اس جیسی صورت میں خاص اثر ہے۔ پس یہ بات یقینی ہے کہ میلان خرچ کرے گا شرین چیز کو بدن میں موزون جگہ میں۔ اور یہ برکت کی ایک صورت ہے۔

☆　☆　☆

افطار کرانے سے روزے کا ثواب ملنے کی وجہ

حدیث —— میں ہے کہ: ''جس نے کسی روزے دار کو افطار کرایا، یا کسی مجاہد کو سامان مہیا کیا، تو اس کے لئے بھی اس کے مانند اجر ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۹۲)

تشریح: جو شخص کسی روزہ دار کو اس وجہ سے افطار کراتا ہے یعنی پیٹ بھر کر کھانا کھلاتا ہے کہ وہ روزہ دار مستحق تعظیم ہے، تو اس کا یہ عمل خیر: خیرات، روزے کی تعظیم اور عابدوں کے ساتھ حسن سلوک ہے۔ اس لئے جب اس کا یہ عمل نامۂ اعمال میں پایا جاتا ہے تو وہ بچند وجوہ روزے کے معنی کو اپنے جلو میں لئے ہوئے ہوتا ہے۔ روزے کے معنی —— ما یُعنیٰ

بہ ـــــ ہیں: ایسی عبادت جس سے بہیمیت وملکیت زیروزبر ہوتی ہیں اور جس سے قہرنفس کا مقصد بدست آتا ہے ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ اور افطار کرانے میں بھی یہ سب باتیں موجود ہیں۔ حاجت مندوں کو کھلانا ایک اہم عبادت ہے۔ قہرنفس کی غرض اس سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ چمڑی دینے سے دمڑی دینا مشکل ہے، اس لئے افطار کرانے والے کو بھی روزے کا ثواب ملتا ہے (یہی تقریر حدیث کے دوسرے جزء کی بھی کرلی جائے)

فائدہ: افطار کرانے کا مطلب: ناشتہ دینا یعنی پیٹ بھر کر کھلانا ہے۔ اور ناداری کی صورت میں: دودھ یا پانی کے ایک گھونٹ سے افطار کرانے پر بھی اللہ تعالیٰ یہ اجر عطا فرماتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں اسکی صراحت ہے (معارف السنن ۶: ۲۳۵)

[۱۲] قوله صلى الله عليه وسلم: " من فطَّر صائماً، أو جَهَّزَ غازيًا، فله مِثلُ أجره"

أقول: من فطَّر صائماً لأنه صائم يستحق التعظيم، فإن ذلك صدقة وتعظيم للصوم، وصلةٌ بأهل الطاعات، فإذا تمثَّلت صورتُه في الصُّحُفِ كان متضمِّنا لمعنى الصوم من وجوهٍ، فجوزى بذلك.

ترجمہ: (۱۲) حدیث کے بعد: میں کہتا ہوں: جو شخص کسی روزہ دار کو افطار کراتا ہے اس لئے کہ وہ روزہ دار ہے، تعظیم کا مستحق ہے، تو بیشک یہ چیز: خیرات اور روزے کی تعظیم اور اہل عبادات کے ساتھ حسن سلوک ہے۔ پس جب پائی جائے گی افطار کرانے کی صورت صحائفِ اعمال میں تو وہ تمثل شامل ہونے والا ہوگا روزے کے معنی کو متعدد وجوہ سے۔ پس بدلہ دیا گیا افطار کرانے والا اس ثواب کے ذریعہ۔

☆　☆　☆

افطار کی دعائیں اور ان کی معنویت

روایات میں افطار کی یہ دعائیں آئی ہیں:

پہلی دعا: ذَهَبَ الظَّمَأُ، وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ، وثَبَتَ الأَجْرُ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ ترجمہ: پیاس ختم ہوئی، اور رگیں تر ہوئیں، اور اجر ثابت ہوا اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا یعنی پیاس اور خشکی کی جو تکلیف ہم نے کچھ دیر اٹھائی، وہ افطار کرتے ہی ختم ہوگئی۔ اب نہ پیاس باقی ہے اور نہ رگوں میں خشکی۔ اور آخرت کا ثواب ان شاء اللہ ثابت وقائم ہوگیا ـــــ اس دعا کے ذریعہ ان حالات پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالایا جاتا ہے جن کو انسانی طبیعت، یا اس کے ساتھ اس کی عقل بھی پسند کرتی ہے (مشکوۃ حدیث ۱۹۹۳)

دوسری دعا: اَللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ، وَعَلٰى رِزْقِكَ أَفْطَرْتُ۔ ترجمہ: اے اللہ! آپ کے لئے میں نے روزہ رکھا اور آپ کے رزق پر میں روزہ کھولتا ہوں ـــــ اس دعا کے پہلے جملہ کے ذریعہ عمل (روزہ) کے اخلاص کو مؤکد کیا گیا

ہے یعنی میں نے روزہ آپ ہی کی رضا کے لئے رکھا ہے۔ اور دوسرے جملہ کے ذریعہ نعمتِ رزق کا شکریہ ادا کیا گیا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۹۴)

فائدہ: مذکورہ بالا دونوں دعاؤں کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ افطار کے بعد یہ کلمات کہتے تھے (معارف السنن ۴: ۱۳۸)

فائدہ: دوسری دعا میں جو وبك آمنتُ، وعليك توكلت بڑھایا جاتا ہے اس کی کچھ اصل نہیں (مرقات ۴: ۲۵۸)

> [۱۳] ومن أذكار الإفطار: " ذهب الظَّمَأُ، وابْتَلَّتِ العروقُ، وثبتَ الأجر إن شاء الله" وفيه بيانُ الشكر على الحالات التي يَسْتَطِيْبُها الإنسان بطبيعته، أو عقله معاً.
> ومنها: " اللهم لك صمتُ، وعلى رزقك أفطرتُ" وفيه تاكيد الإخلاص في العمل، والشكرُ على النعمة.

ترجمہ: (۱۳) اور روزہ کھولنے کے اذکار میں سے ہے: **ذهب إلخ** اور اس ذکر میں اُن حالات پر شکر بجالایا گیا ہے، جن کو انسان اپنی طبیعت سے یا اپنی عقل سے بھی پسند کرتا ہے —— اور ان اذکار میں سے ہے: **اللهم إلخ** اور اس ذکر میں عمل میں اخلاص کی تاکید اور نعمتِ رزق پر شکر بجالانا ہے۔

☆ ☆ ☆

صرف جمعہ کے روزے کی ممانعت کی وجہ

حدیث —— میں ہے کہ: ''کوئی شخص صرف جمعہ کا روزہ نہ رکھے، مگر یہ کہ اس سے پہلے یا اس کے بعد بھی روزہ رکھے'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۲۰۵۱)

حدیث —— میں ہے کہ: ''تم لوگ راتوں میں سے جمعہ کی رات کو نوافل کے لئے مخصوص نہ کرو، اور جمعہ کے دن کو دنوں میں سے روزہ کے لئے مخصوص نہ کرو، الا یہ کہ جمعہ کسی ایسے دن میں پڑے جس کا تم میں سے کوئی روزہ رکھتا ہو'' (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث ۲۰۵۲)

حدیث —— میں ہے کہ: ''جمعہ کا دن عید (خوشی) کا دن ہے، پس تم اپنے عید کے دن کو روزے کا دن مت بناؤ، الا یہ کہ اس سے پہلے یا اس کے بعد روزہ رکھو'' (مسند احمد ۲: ۳۰۳ و ۵۳۲ یہ حدیث شارح نے بڑھائی ہے)

تشریح: صرف جمعہ کے روزے کی ممانعت دو وجہ سے فرمائی گئی ہے:

پہلی وجہ: تعمّق (غلو) کا سدّباب کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ جب شارع نے جمعہ کے دن کی خاص فضیلت بیان فرمائی،

اوراس دن کو چند عبادتوں کے ساتھ خاص کیا تو اس کا امکان تھا کہ غلو پسند لوگ اس دن نفلی روزے کا اہتمام کرنے لگیں۔ اور جمعہ کی عبادتوں میں روزے کا اضافہ کردیں۔ اور جس چیز کو شارع نے فرض وواجب نہیں کیا، اس کے ساتھ فرض وواجب کا سا معاملہ کرنے لگیں۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے صرف جمعہ کے روزے کی ممانعت فرمائی۔ اور جمعرات یا بار کے ساتھ ملا کر جمعہ کا روزہ رکھنے میں یہ اندیشہ نہیں تھا، اس لئے اس کی اجازت دی۔

دوسری وجہ: جمعہ اہلِ اسلام کی عید ہے یعنی خوشی اور لطف اندوز ہونے کا دن ہے۔ اور یہ بات اسی صورت میں واقعہ بن سکتی ہے جبکہ جمعہ کے دن روزہ نہ رکھا جائے۔

اور جمعہ کو عید بنانے میں حکمت: یہ ہے کہ لوگ طبیعت کی رغبت سے، کسی جبر واکراہ کے بغیر، اپنی خوشی سے کاروبار بند کرکے جمعہ کے اجتماعات میں شرکت کریں۔ کیونکہ لوگ تہوار میں وقت فارغ کرتے ہیں۔ اور اجتماعی اعمال فرحت وبشاشت کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ پس اس دن روزہ رکھنے سے اجتماعی کاموں کی طرف رغبت باقی نہیں رہے گی۔

فائدہ: اور آنحضرت ﷺ جو ہمیشہ یا اکثر جمعہ کا روزہ رکھتے تھے تو وہ آپؐ کی خصوصیت تھی۔ جس کی تفصیل ابھی گذر چکی۔

[١٤] وقوله صلى الله عليه وسلم:" لايصومُ أحدُكم يومَ الجمعة، إلا أن يصومَ قبلَه، أو يصوم بعدَه" وقوله صلى الله عليه وسلم:" لاتختصُّوا ليلةَ الجمعة" الحديث.

أقول: السر فيه شيئان:

أحدهما: سدُّ التعمق، لإن الشارع لما خَصَّه بطاعات، وبَيَّن فضلَه، كان مَظِنَّةَ أن يتعمق المتعمقون، فَيُلْحقون بها صومَ ذلك اليوم.

وثانيهما: تحقيق معنى العيد، فإن العيد يُشعر بالفرح واستيفاء اللذة.

وفي جعله عيدًا: أن يُتصوَّر عندهم: أنها من الاجتماعات التي يرغبون فيها من طبائعهم، من غير قسر.

ترجمہ: احادیث کے بعد: میں کہتا ہوں: راز اس میں دو چیزیں ہیں: ان میں سے ایک: غلو کا سد باب کرنا ہے۔ اس لئے کہ شارع نے جب جمعہ کو عبادتوں کے ساتھ خاص کیا۔ اور اس کی فضیلت بیان کی تو جمعہ احتمالی جگہ تھا کہ غلو پسند لوگ تعمق سے کام لیں۔ پس وہ (جمعہ کی) عبادتوں کے ساتھ اس دن کے روزے کو ملائیں۔ اور ان میں سے دوسرا راز: عید کے معنی کو بروئے کار لانا ہے۔ پس بیشک عید آگہی دیتی ہے خوشی کی اور پوری طرح سے لطف اندوز ہونے کی ——— اور جمعہ کو عید بنانے میں راز: یہ ہے کہ خیال پیدا کیا جائے لوگوں میں کہ جمعہ اُن اجتماعات میں سے ہے جن سے لوگ اپنی

طبیعتوں سے رغبت کرتے ہیں، بغیر جبر کے۔

☆　☆　☆

پانچ دنوں میں روزوں کی ممانعت کی وجہ

حدیث ـــــ میں ہے کہ: ’’دودنوں میں یعنی عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ میں روزہ نہیں‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۴۹)

حدیث ـــــ میں ہے کہ: ’’ ایام تشریق: کھانے پینے اور اللہ کی یاد کے دن ہیں‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۵۰)

تشریح: سال کے پانچ دنوں میں یعنی عیدالفطر (یکم شوال) عیدالاضحیٰ (دس ذی الحجہ) اور ایام تشریق (گیارہ، بارہ اور تیرہ ذی الحجہ) میں روزوں کی ممانعت عید (خوشی) کے معنی کو ثابت کرنے کے لئے ہے۔ عید فرحت وشادمانی کا نام ہے۔ اگر ان دنوں میں روزے رکھے جائیں گے تو اس مقصد میں خلل پڑے گا۔ نیز جن دنوں میں سب لوگ خوشیاں منارہے ہوں، اگر کوئی شخص روزہ رکھے گا تو وہ زبردستی کی عبادت ہوگی، اس لئے لوگوں کو زہد خشک اور دین میں غلو سے باز رکھنے کے لئے ان ایام میں روزوں کی ممانعت کردی۔

[۱۵] قولـه صلى الله عليه وسلم:’’ لاصومَ في يومين: الفطرِ والأضحٰى‘‘ قولُه صلى الله عليه وسلم:’’ أيام التشريق أيام أكلٍ، وشُربٍ، وذكرِ اللّٰهِ‘‘

أقول: فيه تحقيق معنى العيد، وكَبْحُ عِنانِهم عن التنسُّك اليابس، والتعمُّق فى الدين.

ترجمہ: (۱۵) احادیث کے بعد: میں کہتا ہوں: اس (ممانعت) میں عید کے معنی کو ثابت کرنا ہے۔ اور خشک عبادت اور دین میں غلو سے لوگوں کو لگام کھینچ کر باز رکھنا ہے۔

☆　☆　☆

شوہر کی اجازت کے بغیر نفل روزہ ممنوع ہونے کی وجہ

حدیث ـــــ میں ہے کہ: ’’عورت کے لئے جائز نہیں کہ وہ روزہ رکھے، جبکہ شوہر (مکان پر) موجود ہو، مگر اس کی اجازت سے (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۳۱ یہ حدیث بخاری میں بھی ہے حدیث ۵۱۹۵ کتاب النکاح)

تشریح: شوہر کی اجازت کے بغیر نفل روزہ رکھنا دووجہ سے ممنوع ہے:

پہلی وجہ: اس سے شوہر کے کچھ حقوق فوت ہوجاتے ہیں۔ یعنی بیوی سے شوہر کو ہر وقت استفادہ کا حق ہے۔ پس اگر عورت روزے سے ہوگی تو شوہر دن میں اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ اس کی حق تلفی ہے۔ البتہ صاحبِ حق (شوہر)

کی اجازت سے نفل روزہ رکھ سکتی ہے۔

دوسری وجہ: نفل روزہ شوہر پر عورت کی بشاشت اور خوش طبعی کو مکدر کر دیتا ہے۔ یعنی عورت کو کبھی نفل روزوں سے دلچسپی ہو جاتی ہے، اور وہ بکثرت روزے رکھنے لگتی ہے۔ ایسی صورت میں عورت کو کمزوری لاحق ہوگی اور اس کی طبیعت میں ابھار باقی نہیں رہے گا۔ اور اس کے بغیر شوہر کا لطف ناقص رہتا ہے۔

[۱۶] قوله صلى الله عليه وسلم: "لايحلُّ للمرأة أن تصوم وزوجُها شاهدٌ إلا بإذنه"
أقول: وذلك: لأن صومَها مُفوِّتٌ لبعضِ حقِّه، ومُنَغِّضٌ عليه بشاشتَها وفُكاهَتَها.

ترجمہ: (۱۶) حدیث کے بعد: میں کہتا ہوں: اور وہ بات اس لئے ہے کہ عورت کا روزہ رکھنا شوہر کے کچھ حقوق کو فوت کرنے والا ہے، اور شوہر پر مکدر کرنے والا ہے عورت کی بشاشت اور اس کی خوش طبعی کو۔

☆ ☆ ☆

نفل روزہ توڑنے سے قضا واجب ہے؟

سوال: ایک واقعہ میں حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا نے نفل روزہ توڑ دیا، تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "نفل روزہ رکھنے والے کو اختیار ہے: چاہے روزہ پورا کرے اور چاہے توڑ دے" (مشکوۃ حدیث ۲۰۷۹) اس روایت سے معلوم ہوا کہ قضا واجب نہیں اور ایک دوسرے واقعہ میں حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما نے نفلی روزہ توڑ دیا تھا تو آپؐ نے فرمایا: "اس کی جگہ کسی دن قضا روزہ رکھو" (مشکوۃ حدیث ۲۰۸۰) اس روایت سے معلوم ہوا کہ نفلی روزہ توڑ دینے کی صورت میں قضا واجب ہے، پس یہ دو روایتوں میں تعارض ہوا؟

جواب: یہ تعارض تین طریقوں سے رفع کیا جا سکتا ہے:

پہلا طریقہ: پہلی روایت کا یہ جملہ: "اگر چاہے تو نفل روزہ توڑ دے" اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ قضا کے التزام کے ساتھ روزہ توڑ دے۔ پس دونوں روایتوں سے قضا کا وجوب ثابت ہوگا۔ اور تعارض رفع ہو جائے گا۔

دوسرا طریقہ: دوسری روایت کی یہ تاویل کی جائے کہ آپؐ نے عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما کو بطور استحباب کے قضا کا حکم دیا۔ اس لئے کہ جس چیز کا التزام کیا جائے اس کا وفا باعثِ اطمینان ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کو قرض دینے کا وعدہ کیا ہو تو وعدہ وفا کرنے سے دل کو سکون حاصل ہوتا ہے۔

تیسرا طریقہ: قضا کا حکم اُن ازواج کے لئے مخصوص حکم قرار دیا جائے یعنی جب آپؐ نے دیکھا کہ دونوں کو روزہ توڑنے سے دل تنگی لاحق ہوئی ہے تو آپؐ نے ان کو قضا کا حکم دیا تا کہ ان کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ جیسے حضرت عائشہ

رضی اللہ عنہا ماہواری کی وجہ سے عمرہ ادا نہیں کرسکی تھیں۔ جب واپسی کا وقت آیا تو انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ حضرات حج اور عمرہ دونوں کر کے چلیں گے اور میں صرف حج کر کے چلوں گی؟! چنانچہ آپؐ نے حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کو حکم دیا کہ اپنی بہن کو تنعیم سے عمرہ کراؤ (بخاری حدیث ۱۷۸۵ کتاب العمرۃ)

فائدہ: تمام ائمہ متفق ہیں کہ نفل حج شروع کرنے سے واجب ہو جاتا ہے، اگر کسی وجہ سے اس کو فاسد کر دیا جائے تو قضا واجب ہوگی۔ اور نفل نماز اور نفل روزوں میں اختلاف ہے: امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک یہ عبادتیں بھی شروع کرنے سے واجب ہو جاتی ہیں، اور بغیر عذر کے ان کو توڑنا جائز نہیں، اور اگر توڑ دی جائیں تو قضا واجب ہے (امام مالک رحمہ اللہ سے ایک روایت عدم وجوب کی بھی ہے) اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک قضا واجب نہیں، اور بغیر عذر کے بھی یہ عبادتیں توڑنا جائز ہے، (امام احمد سے وجوب کی بھی ایک روایت ہے)

غرض پہلی روایت آخری دو اماموں کا متمسک ہے، کیونکہ وہ عدم وجوب پر دلالت کرتی ہے۔ اور دوسری روایت: بڑے دو اماموں کا متمسک ہے، کیونکہ وہ وجوب قضا پر دلالت کرتی ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے پہلی تطبیق بڑے اماموں کے مذہب پر دی ہے۔ اور باقی دو جواب آخری دو اماموں کے مذہب پر دیئے ہیں۔

[۱۷] ولا اختلاف بين قوله صلى الله عليه وسلم: "الصائم المتطوع أمير نفسه، إن شاء صام، وإن شاء أفطر" وقولِه عليه السلام لعائشة وحفصة رضى الله عنهما: "اقضيا يومًا آخر مكانَه" إذ يمكن أن يكون المعنى: إن شاء أفطر مع التزام القضاء، أو أمرهما بالقضاء للاستحباب، فإن الوفاء بما التزمه أَثْلَجُ للصدر، أو كان أَمَرَ لهما خاصةً حين رأى في صدرها حرجًا من ذلك، كقول عائشة رضى الله عنها: "رَجَعُوا بحج وعمرةٍ، ورجعتُ بحجةٍ" فأعمرها من التنعيم.

ترجمہ: (۱۷) اور کچھ تعارض نہیں آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے درمیان کہ:...... اور آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے درمیان عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما سے کہ:...... کیونکہ: (۱) ممکن ہے کہ معنی ہوں: "اگر چاہے روزہ توڑ دے قضا سر لینے کے ساتھ" (۲) یا آپؐ نے دونوں کو استحباباً قضا کا حکم دیا، پس بیشک اس چیز کا وفا جس کا التزام کیا ہے، سینہ کو زیادہ ٹھنڈا کرنے والا ہے (۳) یا آپؐ نے دونوں کو مخصوص حکم دیا تھا، جب آپؐ نے دیکھی دونوں کے سینوں میں اس (روزہ توڑنے) سے تنگی، جیسے عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول: "لوٹے وہ حج اور عمرہ کے ساتھ، اور لوٹی میں حج کے ساتھ" پس آپؐ نے ان کو تنعیم سے عمرہ کرایا۔

☆　☆　☆

روزوں میں بھول معاف ہونے کی وجہ

حدیث ــــــ میں ہے کہ: ''جس نے روزے کی حالت میں بھول کر کھالیا، یا پی لیا (یا صحبت کرلی) تو چاہئے کہ وہ اپنا روزہ پورا کرے، کیونکہ اللہ ہی نے اس کو کھلایا پلایا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۲۰۰۳)

تشریح: ''اللہ ہی نے اس کو کھلایا پلایا ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ روزے میں نسیان کا عذر مقبول ہے، دیگر عبادات میں مقبول نہیں۔ اور وجہ فرق یہ ہے کہ روزے میں حالتِ مذکّرہ (روزہ یاد دلانے والی حالت) نہیں ہے۔ اور نماز اور احرام میں ایسی حالت موجود ہے۔ نماز میں قبلہ رخ کھڑا ہونا اور احرام میں بغیر سلے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے ہونا مذکّر ہے۔ اور روزے میں ایسی کوئی حالت نہیں۔ اس لئے بھول کا بہت زیادہ امکان ہے۔ پس روزہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ اس میں نسیان کا عذر قبول کیا جائے۔

[۱۸] قوله صلى الله عليه وسلم: ''من نسِي وهو صائم، فأكل أو شرب، فَلْيُتِمَّ صومَه، فإنما أَطْعَمَه اللّٰهُ وسقاه''

أقول: إنما عَذَّرَ بالنسيان في الصوم، دون غيره، لأن الصوم ليس له هيئةٌ مذكِّرَةٌ، بخلاف الصلاة والإحرام، فإن لهما هيئاتٍ من استقبال القبلة، والتجرُّد عن المَخيط، فكان أَحَقَّ أن يعذَّر فيه.

ترجمہ: (۱۸) حدیث کے بعد: میں کہتا ہوں: آپؐ نے روزے میں بھولنے کا عذر قبول کیا، نہ کہ اس کے علاوہ میں، اس لئے کہ روزے کے لئے یاد دلانے والی حالت نہیں ہے۔ برخلاف نماز اور احرام کے۔ پس بیشک دونوں کے لئے حالتیں ہیں یعنی قبلہ رخ کھڑا ہونا اور سلے ہوئے کپڑوں سے ننگا ہونا۔ پس روزہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ اس میں عذر قبول کیا جائے۔

☆ ☆ ☆

رمضان کا روزہ عمداً توڑنے میں کفارہ کی وجہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ واقعہ مروی ہے کہ ایک صحابی نے رمضان میں روزے کی حالت میں عمداً اپنی بیوی سے صحبت کرلی۔ آپ ﷺ نے ان کو کفارہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ اور کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کرے۔ اگر اس کی مقدرت نہ ہو تو متواتر دو ماہ کے روزے رکھے۔ اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے (مشکوۃ حدیث ۲۰۰۴)

تشریح: یہ کفارہ رمضان کی بے حرمتی کی ایک طرح کی سزا ہے۔ جب کوئی شخص شعائر اللہ (رمضان) کی بے حرمتی پر کمر بستہ ہوجائے، اور اس کی بنیاد خواہش نفس ہو تو ضروری ہے کہ اس کو ایسی سخت عبادت کا مکلّف کیا جائے جو نہایت

دشوار ہو، تاکہ وہ کفارہ اس کی نگاہوں کے سامنے رہے، اور اس کے نفس کو بے راہ روی سے باز رکھے۔

فائدہ: امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک تینوں مفطرات سے روزہ توڑنے میں کفارہ واجب ہوتا ہے۔ کیونکہ رمضان کی بے حرمتی میں تینوں باتیں یکساں ہیں۔ اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک صرف جماع سے روزہ توڑنے میں کفارہ واجب ہوتا ہے۔ اگر دانستہ کھا پی کر روزہ توڑا تو کفارہ واجب نہیں۔ کیونکہ مذکورہ حدیث میں جماع ہی کا ذکر ہے۔ اور کھانا پینا لذت میں جماع کے برابر نہیں۔ اس لئے قیاس درست نہیں۔ مگر اس سے فساد کا دروازہ کھل جائے گا۔ جسے بھی رمضان میں جماع کرنا ہوگا، وہ ایک گھونٹ پانی پی کر روزہ توڑ دے گا، پھر جماع کرے گا تاکہ کفارہ سے بچ جائے۔

[۱۹] قوله صلى الله عليه وسلم لمن وقع على امرأته في نهار رمضان: "اعتق رقبةً" الحديث.

أقول: لما هَجَمَ على هَتْكِ حرمةِ شعائر الله، وكان مبدؤه إفراطٌ طبيعيٌّ: وجب أن يُقابَل بإيجابِ طاعةٍ شاقَّةٍ غايةَ المشقَّةِ، ليكون بين يديه مثلُ تلك، فَيَزْجِرُه عن غَلَواء نفسه.

ترجمہ: (۱۹) آنحضرت ﷺ کا ارشاد اس شخص سے جس نے رمضان کے دن میں بیوی سے مجامعت کر لی تھی کہ: "ایک غلام آزاد کر" (یہ روایت کا خلاصہ ہے)

میں کہتا ہوں: جب وہ آدھمکا شعائر اللہ کی حرمت کی پردہ دری پر، اور اس کی بنیاد فطری کوتاہی تھی یعنی کوئی مجبوری اس کی بنیاد نہ تھی، تو ضروری ہوا کہ وہ شخص سامنا کیا جائے ایسی دشوار عبادت کے واجب کرنے سے جو نہایت ہی دشوار ہو، تاکہ ہو لے وہ (دشوار عبادت) اس کے سامنے اُس (افراطِ طبعی) کی طرح، پس باز رکھے وہ اس کو اس کے نفس کے ہیجان سے۔

لغات و ترکیب: **مبدؤه**: کان کی خبر مقدم ہے...... **یقابَل**: فعل مجہول ہے۔ **قَابَلَ الشيءَ بالشيءِ**: مقابلہ کے لئے دو چیزوں کو آمنے سامنے کرنا۔ **یقابَل** میں نائب فاعل محذوف ہے، اور وہ **الهتك** ہے...... **لیکون** کا اسم ضمیر ہے جو **إیجاب** کی طرف راجع ہے اور **تلك** کا مشار الیہ: **إفراط طبیعی** ہے۔

☆ ☆ ☆

روزہ میں مسواک جائز ہے

سوال: حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے بے شمار مرتبہ رسول اللہ ﷺ کو روزے کی حالت میں مسواک کرتے دیکھا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۰۹) اور یہ حدیث پہلے گذری ہے کہ: "روزہ دار کے معدہ کے خالی ہونے سے اس کے منہ میں جو بو پیدا ہوتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ محبوب ہے" اس روایت

سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کی حالت میں مسواک نہیں کرنی چاہئے، تاکہ وہ پسندیدہ بو زائل نہ ہو جائے پس دونوں روایتوں میں تعارض ہے؟

جواب: ان روایتوں میں کچھ تعارض نہیں۔ کیونکہ دوسری روایت میں مبالغہ ہے، اس بو کو باقی رکھنا مقصود نہیں۔ اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر روزہ دار کے منہ میں بو پیدا بھی ہو تو وہ محبوب ہے، کیونکہ وہ عبادت کا اثر ہے، اس بو کو باقی رکھنا مطلوب نہیں۔ پس روزے کی حالت میں مسواک کرنا درست ہے۔

[۲۰] ولا اختلاف بين حديث تسوُّكه صلى الله عليه وسلم، وبين قوله عليه السلام: "لَخُلُوف فم الصائم أطيب" الحديث، فإن مِثْلَ هذا الكلام إنما يراد به المبالغةُ، فكأنه قال: إنه محبوب، بحيث لو كان له خُلُوف لكان محبوبًا لِحُبِّه.

ترجمہ: (۲۰) اور کچھ تعارض نہیں آپؐ کے مسواک کرنے کی حدیث کے درمیان، اور آپؐ کے ارشاد کے درمیان کہ: "روزہ دار کے منہ کی بو زیادہ عمدہ ہے" آخر حدیث تک۔ پس بیشک اس طرح کا کلام، اس سے مبالغہ ہی مراد لیا جاتا ہے۔ پس گویا آپؐ نے فرمایا کہ وہ بو محبوب ہے، بایں طور کہ اگر ہو روزہ دار کے لئے خُلوف تو البتہ ہوگا وہ محبوب روزے کی محبت کی وجہ سے۔

☆ ☆ ☆

سفر میں روزہ کب رکھنا بہتر ہے اور کب نہ رکھنا؟

حدیث —— ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کی بھیڑ دیکھی اور ایک آدمی کو دیکھا جس پر سایہ کیا گیا تھا۔ آپؐ نے دریافت کیا: "کیا معاملہ ہے؟" عرض کیا گیا: یہ صاحب روزے سے ہیں (اور ان کی حالت غیر ہو رہی ہے) اس لئے ان پر سایہ کیا گیا ہے اور لوگ جمع ہوئے ہیں، آپؐ نے فرمایا: "سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی کا کام نہیں!" (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۲۱)

حدیث —— ایک سفر میں بعض نے روزہ رکھا اور بعض نے نہیں رکھا۔ سخت گرمی کے دن میں لوگ ایک منزل پر اترے تو روزہ رکھنے والے گر گئے یعنی پڑ گئے۔ اور جنھوں نے روزہ نہیں رکھا تھا وہ اٹھے اور سب کے لئے خیمے لگائے اور سب کی سواریوں کو پانی پلایا، آپؐ نے فرمایا: "آج روزہ نہ رکھنے والے ثواب لے گئے!" (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۲۲)

حدیث —— میں ہے کہ: "جس شخص کے پاس سواری ہو، جو شکم سیری کی طرف ٹھکانہ پکڑے یعنی ایسی منزل پر پہنچا دے جہاں سیر ہو کر کھانا ملے، تو چاہئے کہ وہ رمضان کا روزہ رکھے، جہاں بھی رمضان اس کو پالے" (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۲۶)

حدیث —— فتح مکہ والا سفر آنحضرت ﷺ نے رمضان ۸ ہجری میں کیا ہے۔ اس سفر میں آپ مدینہ سے کُراع الغمیم تک روزہ رکھتے رہے۔ اور لوگ بھی روزے رکھتے رہے۔ جب مکہ صرف دو منزل رہ گیا تو عرض کیا گیا کہ لوگ آپ

کا عمل دیکھتے ہیں۔اور وہ بھی روزے رکھتے ہیں۔مگراب جنگ کا امکان ہے۔اس لئے فوج کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ روزے نہ رکھے۔چنانچہ آپؐ نے لوگوں کو دکھا کر پانی پیا،تاکہ سب مطلع ہوجائیں کہ آپؐ نے روزے بند کردیئے ہیں۔ مگر آپؐ کو اطلاع دی گئی کہ اب بھی کچھ لوگوں نے روزہ رکھا ہے۔تو آپؐ نے فرمایا:''وہی لوگ نافرمان ہیں! وہی لوگ نافرمان ہیں!!''(مشکوۃ حدیث ۲۰۲۷)

تشریح: مذکورہ روایات میں کچھ تخالف نہیں۔کیونکہ پہلی دو روایتیں ـــــ مثال کے طور پر ـــــ درج ذیل صورتوں کے لئے ہیں:

پہلی صورت: جب روزہ مسافر کے لئے سخت دشوار ہو،کمزوری اور بے ہوشی تک پہنچانے والا ہو۔روایات کے یہ الفاظ:''اس پر سایہ کیا گیا''اور''وہ گر گئے''اس کی دلیل ہیں۔

دوسری صورت: جب مسلمانوں کو کوئی ایسی ضرورت درپیش ہو جو روزے بند کئے بغیر پوری نہ ہوسکتی ہو۔مثلاً جنگی ضرورت۔آپؐ کا یہ ارشاد کہ:''وہی لوگ نافرمان ہیں!''اس کی دلیل ہے۔

تیسری صورت: جب رخصت کے موقعوں پر بھی افطار کرنے میں کسی شخص کے دل میں دغدغہ ہو۔اللہ پاک کا ارشاد ﴿ثُمَّ لَايَجِدُوْا فِيْ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ﴾ (النساء ۶۵) اس کی دلیل ہے۔

اور جواز کی قولی اور فعلی روایات اس صورت میں ہیں جبکہ سفر قابل لحاظ مشقت سے خالی ہو۔اور افطار کے وہ اسباب بھی نہ پائے جاتے ہوں جو اوپر مذکور ہوئے۔

نوٹ: تقریر کا نہج بدل گیا ہے۔عبارت سے ملاتے ہوئے اس کا خیال رکھا جائے۔

[۲۱] ولا اختلافَ بين قوله صلى الله عليه وسلم:'' ليس من البر الصيام في السفر، ذهب المُفطِرون بالأجر'' وقولِه عليه الصلاة والسلام:'' من كانت له حَمُوْلَةٌ، تأوى إلى شِبَعٍ، فليصم رمضان حيثُ ما أدركه'' لأن الأول فيما إذا كان شاقًّا عليه، مُفضيا إلى الضعف والغشيِّ، كما هو مقتضى قول الراوى:'' قد ظُلِّلَ عليه''، أو كان بالمسلمين حاجةٌ لاتنجبر إلا بالإفطار، وهو قول الراوى:'' فسقط الصوامُون، وقام المُفْطِرون''، أو كان يرى فى نفسه كراهيةَ الترخُّص فى مظانِّه، وأمثال ذلك من الأسباب؛ والثانى: فيما إذا كان السفر خالياً عن المشقة التى يُعتدُّ بها، والأسبابِ التى ذكرنا ها.

ترجمہ: (۲۱) اور کچھ تعارض نہیں آپؐ کے ارشاد کے درمیان کہ:''سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی کا کام نہیں اور روزہ نہ رکھنے والے ثواب مار لے گئے''(یہ دو حدیثیں ہیں۔شاہ صاحب نے دونوں کو ملادیا ہے) اور آپؐ کے ارشاد کے درمیان

کہ: ’’جس کے پاس...... اس لئے کہ پہلی حدیث اس صورت میں ہے کہ (۱) جب روزہ اس پر سخت دشوار ہو، کمزوری اور بے ہوشی تک پہنچانے والا ہو، جیسا کہ وہ راوی کے قول: ’’تحقیق اس پر سایہ کیا گیا‘‘ کا مقتضی ہے (۲) یا مسلمانوں کو ایسی حاجت (درپیش) ہو، جو افطار کے بغیر پوری نہ ہوسکتی ہو، اور وہ راوی کا قول ہے: ’’پس روزے رکھنے والے پڑ گئے، اور روزہ نہ رکھنے والے اٹھے‘‘ (یہ استدلال محل نظر ہے۔ راوی کا یہ قول بھی پہلی صورت کی دلیل ہے۔ صحیح دلیل: ’’وہی لوگ نافرمان ہیں‘‘ ہے۔ چنانچہ شرح میں اس روایت کا اضافہ کیا گیا ہے) (۳) یا وہ محسوس کرتا ہو رخصت کے موقعوں میں بھی رخصت پر عمل کرنے میں ناپسندیدگی اپنے دل میں اور اس قسم کے دیگر اسباب اور دوسری حدیث: اس صورت میں ہے جبکہ سفر ایسی مشقت سے خالی ہو، جو قابل لحاظ ہے۔ اور ان اسباب سے بھی خالی ہو جن کو ہم نے ذکر کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

وارث کا روزہ رکھنا یا فدیہ ادا کرنا

سوال: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی متفق علیہ روایت ہے کہ: ’’جو شخص اس حال میں مرے کہ اس کے ذمّے روزے ہوں، تو اس کا وارث اس کی طرف سے روزے رکھے‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۳۳) اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت ہے کہ: ’’جو شخص اس حال میں مرے کہ اس پر ماہِ رمضان کے روزے ہوں تو چاہئے کہ اس کا وارث اس کی طرف سے ہر دن کے بدل ایک مسکین کو کھانا کھلائے‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۳۴ یہ مرفوع حدیث ضعیف ہے) غرض ایک ہی صورت میں دو مختلف باتیں مروی ہیں، پس اس کا کیا حل ہے؟

جواب: ان روایتوں میں کچھ تعارض نہیں۔ دونوں باتیں درست ہیں یعنی وارث میت کی طرف سے روزہ بھی رکھ سکتا ہے اور فدیہ بھی ادا کرسکتا ہے۔ دونوں باتیں کافی ہیں۔ اور اس میں دو راز ہیں:

ایک: کا تعلق میت سے ہے یعنی یہ دونوں باتیں میت کے حق میں مفید ہیں۔ کیونکہ بہت سے لوگ موت کے بعد بھی اس بات کا ادراک کرتے ہیں کہ کوئی ایسی عبادت جو ان پر واجب تھی، اور جس کا چھوڑنا قابلِ مؤاخذہ ہے، وہ عبادت ان سے فوت ہوگئی ہے۔ مثلاً فرض نمازیں یا روزے یا زکاتیں باقی رہ گئی ہیں۔ اور اس احساس سے وہ رنجیدہ ہوتے ہیں۔ اور ان پر وحشت اور گھبراہٹ طاری ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں میت کے حق میں شفقت یہ ہے کہ کوئی قریب ترین دوست یا وارث کھڑا ہو، اور وہ میت کے فوت شدہ عمل جیسا کوئی دوسرا عمل کرے یعنی اس کی طرف سے فدیہ ادا کرے تو وہ بھی مفید ہوگا۔ اسی طرح جس نے اس حال میں وفات پائی ہو کہ اس نے کسی صدقہ کی پختہ نیت کررکھی ہو، تو اس کی طرف سے بھی اس کا وارث صدقہ کرے۔ یہ صدقہ بھی میت کے حق میں کارآمد ہوگا۔ اور ہم نے جنائز کے باب میں ایک بات بیان کی ہے۔ اگر اس کو اس مسئلہ میں یعنی زندوں کے اموات کی طرف سے تصدق میں جاری کی جائے تو وہ بات یہاں بھی بالکل

فٹ آجائے گی (دیکھئے میت کے ساتھ حسن سلوک کی دوسری صورت ۔ رحمۃ اللہ ۳:۶۳۶)

اور دوسرے راز: کا تعلق ملت سے ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ان روایات کا مقصود روزوں کی تاکید بلیغ ہے یعنی روزے ایک ایسا فریضہ ہیں جو کسی حال میں ساقط نہیں ہوتا، حتی کہ موت پر بھی ساقط نہیں ہوتا۔ چنانچہ میت کی طرف سے وارث کو اس کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے۔

فائدہ: دو مسئلوں میں قریبی تعلق ہے۔ اور جب ان کے دلائل گڈ مڈ ہوجاتے ہیں تو الجھن کھڑی ہوجاتی ہے: ایک: عبادت میں نیابت کا مسئلہ۔ دوسرا: ایصالِ ثواب کا یعنی میت کو نفع رسانی کا مسئلہ۔ دونوں کی ضروری تفصیل درج ذیل ہے:

عبادت میں نیابت کا مسئلہ: خالص عباداتِ مالیہ میں مثلاً زکوٰۃ میں مطلقاً نیابت درست ہے، کیونکہ نائب کے فعل سے بھی مقصود (غریب کا تعاون) حاصل ہوجاتا ہے۔ اور خالص عبادت بدنیہ میں مثلاً نماز اور روزوں میں مطلقاً نیابت درست نہیں۔ کیونکہ ان عبادات میں مقصود اتعابِ نفس ہے، جو دوسرے کے فعل سے حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ حالتِ درماندگی میں عباداتِ بدنیہ: عباداتِ مالیہ میں منقلب ہوجاتی ہے، جیسے شیخ فانی روزوں کا فدیہ ادا کرسکتا ہے۔ مگر اس وقت بھی نیابت درست نہیں۔ اور جو عبادتیں: مال اور بدن دونوں سے مرکب ہیں، جیسے حج، ان میں بوقتِ عجز نیابت درست ہے۔ بحالتِ اختیار درست نہیں۔ اور اس مسئلہ سے تعلق رکھنے والی روایات درج ذیل ہیں:

پہلی روایت: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا فتوی ہے کہ **لا یصومُ أحدٌ عن أحد، ولا یصلی أحدٌ عن أحد:** کوئی کسی کی طرف سے روزہ نہ رکھے، اور نماز بھی نہ پڑھے (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۳۵)

دوسری روایت: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فتوی ہے کہ: **لا یصلی أحد عن أحد، ولا یصوم أحد عن أحد، ولکن یُطعَم عنه مکانَ کلِّ یوم مدٌّ من حنطة** (اخرجہ النسائی فی الکبری)

تیسری روایت: عَمرۃ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ میری والدہ کا انتقال ہوگیا ہے، اور ان کے رمضان کے روزے باقی ہیں تو کیا میں ان کی طرف سے قضا کرسکتی ہوں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''نہیں، بلکہ ان کی طرف سے خیرات کر، ہر دن کے بدلے ایک مسکین پر (رواہ الطحاوی)

چوتھی روایت: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت ہے جو ابھی بیان ہوئی۔

ایصالِ ثواب کا مسئلہ: انسان اپنے ہر عمل کا ثواب، خواہ وہ نماز ہو یا صدقہ یا روزہ، دوسرے کو بخش سکتا ہے۔ اور مروی ہے کہ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک محض بدنی عبادات کا ایصالِ ثواب درست نہیں۔ مگر مالکیہ اور شوافع کا اس پر فتوی نہیں۔ اور اس مسئلہ کی دلیل میت کی طرف سے تصدّق کی روایت ہے۔ اور مناط (علت) تمام عبادات کو شامل ہے، پس ہر عمل کا ایصالِ ثواب درست ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ شاہ صاحب قدس سرہ نے جو فرمایا ہے کہ: ''دونوں باتیں کافی ہیں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ

موت کے بعد روزے جو عبادت بدنیہ ہیں: عبادتِ مالیہ میں پلٹ جاتے ہیں۔اس لئے وارث میت کی طرف سے نیابۃً فدیہ ادا کرسکتا ہے۔ابن عمرؓ کی روایت میں اسی کا ذکر ہے۔اور اگر وارث فدیہ ادا کرنے کی گنجائش نہ رکھتا ہو تو وہ ایصالِ ثواب کے مسئلہ سے تمسّک کرے یعنی میت کی طرف سے ایصالِ ثواب کی نیت سے روزے رکھے۔اور اللہ کے فضل سے امید باندھے کہ وہ روزے میت کے حق میں محسوب ہوجائیں گے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں اسی کا ذکر ہے۔واللہ اعلم۔

[۲۲] ولا اختلافَ بين قوله صلى الله عليه وسلم: " من مات وعليه صوم، صام عنه وليه" وقوله عليه الصلاة والسلام فيه أيضًا: " فَلْيُطْعِمْ عنه مكان كل يوم مسكيناً" إذ يجوز أن يكون كل من الأمرين مُجْزِئًا؛ والسر فى ذلك شيئان.

أحدهما راجع إلى الميت، فإن كثيرًا من النفوس المُفَارِقَةِ أجسادَها تُدرِك أن وظيفةً من الوظائف التى يجب عليها، وتؤاخذ بتركها، فاتت منها، فَتَتَأَلَّم، ويفتح ذلك باباً من الوحشة، فكان الحَدَبُ على مثله أن يقوم أقربُ الناس منه، وأولاهم به، فيعمل عملَه على قصدِ أن يقع عنه، فإن همتَه تلك تفيد كما فى القَرابين، أو يفعلُ فعلاً آخر مثلَه، وكذلك حالُ من مات وقد أجمع على صدقةٍ: تصدَّق عنه وليُّه، وقد ذكرنا فى الصلاة على الميت: ما إذا عُطف على صدقةِ الأحياء للأموات: انْعَطَفَ.

والثانى: راجع إلى الملة، وهو التأكيد البالغُ، ليعلموا أن الصوم لايسقط بحال حتى الموت.

ترجمہ: اور کچھ اختلاف نہیں آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے درمیان کہ: "جو شخص مرا......اور آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے درمیان اسی صورت میں کہ: "پس چاہئے کہ...... کیونکہ جائز ہے کہ دونوں باتوں میں سے ہر ایک کافی ہو۔اور راز اس میں دو چیزیں ہیں۔

ان میں سے ایک: میت کی طرف لوٹنے والی ہے۔پس بیشک بہت سے نفوس جو اپنے اجسام سے جدا ہونے والے ہیں: ادراک کرتے ہیں کہ عبادات میں سے کوئی ایسی عبادت جو ان نفوس پر واجب تھی، اور اس کے ترک پر ان سے مؤاخذہ کیا جائے گا: وہ عبادت ان سے فوت ہوگئی ہے۔پس وہ رنجیدہ ہوتے ہیں اور یہ چیز وحشت کا کوئی دروازہ کھولتی ہے۔پس ایسے شخص پر جھکاؤ یعنی شفقت یہ ہے کہ اٹھے لوگوں میں جو اس سے سب سے زیادہ نزدیک ہے اور لوگوں میں اس کا سب سے زیادہ حقدار ہے، پس وہ میت کا عمل کرے بایں قصد کہ وہ عمل میت کی طرف سے واقع ہو یعنی ایصالِ ثواب کے طور پر وہی عمل کرے تو بیشک اس کی یہ خصوصی توجہ فائدہ دیگی، جیسا کہ فدیہ کی قربانیوں میں۔یا وہ کوئی دوسرا عمل میت کے عمل کے مانند کرے یعنی نیابۃً فدیہ ادا کرے۔اور اسی طرح اس شخص کی حالت ہے جو وفات پا گیا درانحالیکہ اس نے پختہ نیت کی تھی

کسی چیز کے صدقہ کرنے کی، تو اس کی طرف سے اس کا وارث صدقہ کرے۔ اور تحقیق بیان کی ہے ہم نے میت کی نماز جنازہ کے بیان میں: وہ بات کہ اگر وہ موڑی جائے زندوں کے اموات کے لئے صدقہ کرنے پر: تو وہ مڑ جائے گی۔

اور دوسرا راز: ملت کی طرف لوٹنے والا ہے۔ اور وہ تاکید بلیغ ہے۔ تاکہ لوگ جان لیں کہ روزہ کسی حال میں ساقط نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ موت پر بھی ساقط نہیں ہوتا۔

باب ــــــ ۴

روزوں کے متعلّقات کا بیان

روزوں کی تکمیل دو باتوں پر موقوف ہے

روزوں کی تکمیل دو باتوں پر موقوف ہے:

ایک: روزوں کو شہوانی، درندگی والے اور شیطانی اقوال وافعال سے پاک رکھا جائے۔ کیونکہ یہ باتیں نفس کو اخلاقِ رذیلہ کی یاد دہانی کراتی ہیں، اور نفس کو خراب ہیئتوں پر ابھارتی ہیں۔ جو روزوں کے مقصود کے خلاف ہیں۔ روزوں کا مقصد تقوی اور پرہیزگاری ہے۔

دوسری: روزوں میں ایسی چیزوں سے احتراز کیا جائے جو روزہ توڑنے تک مُفضی ہوتی ہیں۔ اور جو روزہ توڑنے کی دعوت دیتی ہیں۔

پہلی قسم کی تفصیل: حدیث شریف میں ہے کہ: ''روزہ دار شہوانی اور فحش باتیں نہ کرے'' ــــــ بیوی سے بھی زن وشوئی سے تعلق رکھنے والی بے حجابی کی باتیں نہ کرے ــــــ ''اور شور وشغب نہ کرے۔ اور کوئی دوسرا گالیاں بکے یا اس کے ساتھ الجھے تو بھی روزہ دار تحمل سے کام لے۔ اور اس سے کہہ دے کہ بھائی! میرا روزہ ہے'' ــــــ اس حدیث کی شرح پہلے گذر چکی ہے۔ لڑنا جھگڑنا درندگی والا کام ہے۔ اور شور وشغب شیطانی حرکت ہے۔

دوسری حدیث: میں ہے کہ: ''جو شخص روزے میں جھوٹ بولنا اور جھوٹی بات پر عمل کرنا ترک نہ کرے، تو اللہ تعالیٰ کو اس کی کچھ حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے'' (مشکوۃ حدیث ۱۹۹۹) یعنی روزے میں گناہوں سے بچنا ضروری ہے۔ منکرات سے کام ودہن اور دیگر اعضاء کی حفاظت روزے کی قبولیت کے لئے لازمی شرط ہے۔ اور ''اللہ کو کچھ حاجت نہیں'' میں کمال کی نفی ہے یعنی اگر کوئی شخص روزے میں بھی گناہ کی باتیں اور گناہ کے کام نہ چھوڑے تو وہ روزہ بے فائدہ ہے۔ اگرچہ روزہ ہو جائے گا۔

دوسری قسم کی تفصیل: روزے میں، پچھنے لگانے اور لگوانے سے روزہ توڑنے کی نوبت آسکتی ہے۔ حدیث میں ہے

کہ:''پچھنے لگانے والے کا اور لگوانے والے کا روزہ ٹوٹ گیا''(مشکوۃ حدیث ۲۰۱۲) یعنی ان کا روزہ ٹوٹنے کے قریب ہوگیا۔ پچھنے لگوانے والے کا تو اس لئے کہ خون نکل جانے سے کمزوری لاحق ہوسکتی ہے۔اور روزہ توڑنے کی نوبت آسکتی ہے۔اور پچھنے لگانے والے کا روزہ بھی محفوظ نہیں۔ کیونکہ سینگی چوستے وقت احتمال ہے کہ خون پیٹ میں چلا جائے۔اس لئے روزہ میں اس سے احتراز کرنا چاہئے۔ضرورت پیش آئے تو رات میں پچھنے لگوائے۔

اور روزے میں بیوی کو چومنا اور ساتھ لٹانا روزہ توڑنے کی دعوت دیتا ہے۔ نبی ﷺ کا عمل اگرچہ اس سلسلہ میں یہ تھا کہ آپؐ روزے میں بیوی صاحبہ کو چومتے بھی تھے اور ساتھ لٹاتے بھی تھے(مشکوۃ حدیث ۲۰۰۰) مگر آپؐ کا یہ عمل بیانِ جواز کے لئے تھا۔ کیونکہ اہل کتاب خاص طور پر یہود اس معاملہ میں حد سے تجاوز کر گئے تھے۔ان کے نزدیک روزے میں بوس وکنار اور ہم خوابی کی قطعاً گنجائش نہیں تھی۔اور وہ قریب تھے کہ اس کو رکن کا درجہ دیدیں۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے قول وفعل سے اس بات کی وضاحت کی کہ اس سے نہ روزہ ٹوٹتا ہے، نہ اس میں کچھ نقص پیدا ہوتا ہے۔البتہ حدیث میں لفظ رخصت استعمال کرکے اس طرف اشارہ کیا کہ دوسروں کے لئے اس کا ترک اولی ہے۔حدیث میں ہے کہ ایک بوڑھے آدمی نے دریافت کیا کہ روزہ دار: بیوی کو ساتھ لٹا سکتا ہے؟ آپؐ نے گنجائش دی (فَرَخَّصَ له،مشکوۃ حدیث ۲۰۰۶)

رہا خود آپ ﷺ کا معاملہ: تو چونکہ آپؐ اللہ کی طرف سے مامور تھے کہ اپنے قول وفعل سے احکام کی وضاحت کریں، اس لئے آپؐ کے حق میں بیوی کو چومنا اور ساتھ لٹانا ہی اَولی تھا۔اسی طرح وہ تمام کام جو مقربین کے شایان شان نہیں ہیں، مگر عامۂ مومنین کے لئے جائز ہیں۔آپ ﷺ کبھی ان کی طرف تنزل فرماتے تھے۔اور بیانِ جواز کے لئے ان کاموں کو کرتے تھے۔یہ سب کام آپؐ کے حق میں اَولی تھے۔واللہ اعلم۔

﴿أمور تتعلق بالصوم﴾

اعلم أن كمالَ الصوم إنما هو:

[۱] تنزيهُه عن الأفعال والأقوال الشَّهَوِية والسَّبُعية والشيطانية، فإنها تذكِّر النفسَ الأخلاقَ الخسيسةَ، وتُهَيِّجُها لهيئاتٍ فاسدة.

[۲] والاحترازُ عما يُفضى إلى الفِطر، ويدعو إليه.

فمن الأول: قوله صلى الله عليه وسلم:'' فلايرفُث، ولايَصْخَبْ، فإن سابَّه أحد أو قاتَله فليقل: إني صائم'' وقوله صلى الله عليه وسلم:'' من لم يَدَعْ قولَ الزور، والعملَ به، فليس لله حاجةٌ في أن يدع طعامَه وشرابه'' والمراد بالنفي نفي الكمال.

ومن الثاني: ''أفطر الحاجم والمحجوم'' فإن المحجوم تَعَرَّضَ للإفطار من الضعف،

والحاجمَ لأنه لايأمن من أن يصل شيئ إلى جوفه بمصّ المَلاَزِمِ.

والتقبيلُ، والمباشرةُ؛ وكان الناس قد أفرطوا وتعمّقوا، وكادوا أن يجعلوه من مرتبة الركن، فبين النبي صلى الله عليه وسلم قولاً وفعلاً: أنه ليس مفطِّرًا ومُنَقِّصًا للصوم؛ وأَشْعر بأنه تركُ الأَوْلى في حق غيره: بلفظ الرخصة؛ وأما هو فكان مأموراً ببيان الشريعة، فكان هو الأَوْلى في حقه؛ وكذا سائرُ ما تَنَزَّلَ فيه عن درجة المحسنين إلى درجه عامَّة المؤمنين، والله أعلم.

ترجمہ: وہ امور جو روزوں سے تعلق رکھتے ہیں: جان لیں کہ روزے کا کمال بس وہ: (۱) روزے کو پاک رکھنا ہے شہوانی، سَبُعی اور شیطانی افعال واقوال سے۔ پس بیشک یہ امور نفس کو اخلاقِ رذیلہ یاد دلاتے ہیں۔ اور نفس کو خراب حالتوں پر برانگیختہ کرتے ہیں۔ (۲) اور ان چیزوں سے بچنا ہے جو روزہ توڑنے کی طرف پہنچانے والی ہیں۔ اور جو روزہ توڑنے کی دعوت دیتی ہے ـــــ پس اول سے: آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: (اس کے بعد دو حدیثیں ہیں) اور نفی سے مراد کمال کی نفی ہے ـــــ اور ثانی سے ہے: ''پچھنے لگانے اور لگوانے والے کا روزہ ٹوٹ گیا'' پس بیشک پچھنے لگوانے والا درپیش ہوا روزہ توڑنے کے لئے کمزوری کی وجہ سے۔ اور پچھنے لگانے والا اس لئے کہ وہ محفوظ نہیں ہے اس بات سے کہ پہنچے کوئی چیز اس کی پیٹ میں سینگی چوسنے کی وجہ سے۔

اور بیوی کو چومنا اور ایک دوسرے سے بدن کا لگنا یعنی ساتھ لیٹنا ہے۔ اور لوگ (یہود) حد سے تجاوز کر گئے تھے اور غلو میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اور قریب تھے کہ وہ اس کو رکن کے درجہ میں کر دیں۔ پس نبی ﷺ نے اپنے قول وفعل سے بیان کیا کہ اس سے نہ روزہ ٹوٹتا ہے اور نہ روزے میں کچھ نقص آتا ہے۔ اور آگہی دی اس بات کی کہ اس کا ترک بہتر ہے آپؐ کے علاوہ کے حق میں: لفظ رخصت سے ـــــ اور رہے آپؐ: تو آپؐ مامور تھے شریعت کے بیان کے، پس آپؐ کے حق میں وہی اولیٰ تھا ـــ اور اسی طرح دیگر وہ کام جن میں آپؐ نے تنزل فرمایا ہے مقربین کے درجہ سے عامۂ مؤمنین کے درجہ کی طرف۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

نفل روزوں میں انبیاء کے معمول میں اختلاف کی وجہ

نفل روزوں میں حضرات انبیاء علیہم السلام کا معمول مختلف رہا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام ہمیشہ روزہ رکھا کرتے تھے (ابن ماجہ حدیث ۱۷۱۴) اور حضرت داؤد علیہ السلام ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن ناغہ کرتے تھے (بخاری حدیث ۱۹۷۹ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک دن روزہ رکھتے تھے اور دو دن یا کئی دن ناغہ کرتے تھے (مگر کنز العمال حدیث ۲۴۶۲۹ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ آپ ہمیشہ روزے رکھا کرتے تھے) اور ہمارے نبی ﷺ کا اپنی ذات

میں معمول یہ تھا کہ جب روزے شروع کرتے تو اتنے دنوں تک رکھتے چلے جاتے کہ لوگ خیال کرتے کہ اب آپؐ روزے بند نہیں کریں گے۔اور جب بند کردیتے تو اتنے دنوں تک نام نہ لیتے کہ لوگ خیال کرتے کہ اب آپؐ روزے نہیں رکھیں گے۔اور آپؐ نے رمضان کے سوا کسی مہینہ کے مکمل روزے نہیں رکھے (مشکوۃ حدیث ۲۰۳۶)

انبیاء کے معمول میں یہ اختلاف اس وجہ سے تھا کہ روزہ ایک تریاق یعنی زہریلی دوا ہے۔اور زہریلی دوا کا استعمال بقدر ضرورت ہی کیا جاتا ہے۔اور حضرت نوح علیہ السلام کی قوم سخت مزاج تھی۔ان کی اپنے پیغمبر کے ساتھ جو باتیں قرآن میں نقل کی گئی ہیں وہ اس کی واضح دلیل ہیں (دیکھیں رحمۃ اللہ ۲:۹۸) اور حضرت داؤد علیہ السلام طاقت ور اور مضبوط آدمی تھے۔حدیث میں ہے کہ:''جب آپ کی دشمن سے ملاقات ہوتی تو آپ بھاگتے نہیں تھے'' (بخاری حدیث ۱۹۷۹) اور جم کر مقابلہ مضبوط آدمی ہی کیا کرتا ہے۔اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کمزور بدن اور فارغ البال تھے۔نہ اہل رکھتے تھے نہ مال۔چنانچہ ہر پیغمبر نے جو اس کے مناسب حال تھا: اختیار کیا۔اور ہمارے نبی ﷺ چونکہ روزہ رکھنے اور نہ رکھنے کے فوائد سے باخبر تھے۔آپؐ اپنے مزاج سے بھی واقف تھے۔اور اپنے لئے کیا مناسب ہے: اس کو بھی جانتے تھے۔اس لئے آپؐ نے مصلحتِ وقت کے مطابق جو عمل مناسب سمجھا اس کو اختیار کیا۔یعنی کبھی روزے رکھے اور کبھی بند کردیئے۔

واختلف سُنَن الأنبياء عليهم السلام في الصوم: فكان نوحٌ عليه السلام يصوم الدهر، وكان داود عليه السلام يصوم يومًا ويُفطر يومًا، وكان عيسىٰ عليه السلام يصوم يومًا ويُفطر يومين أو أياماً، وكان النبي صلى الله عليه وسلم في خاصَّة نفسه: يصوم حتى يقالَ: لايُفطر، ويُفطر حتى يقال: لايصوم، ولم يكن يستَكْمِلُ صيامَ شهر إلا رمضان.

وذلك: أن الصيام ترياق، والترياقُ لايُستعمل إلا بقدر المرض، وكان قوم نوح عليه السلام شديدَى الأمزجة، حتى رُوى عنهم ما رُوى؛ وكان داود عليه السلام ذاقوَّة ورَزَانة، وهو قوله صلى الله عليه وسلم :'' وكان لايَفِرُّ إذا لاقى'' وكان عيسى عليه السلام ضعيفًا في بدنه، فارغاً لا أهل له ولامال، فاختار كلُّ واحد ماايناسب الحال، وكان نبينا صلى الله عليه وسلم عارفاً بفوائد الصوم والإفطار، مُطَّلِعًا على مزاجه، ومايناسبه، فاختار بحسب مصلحة الوقت ماشاء.

ترجمہ: اوپر ترجمہ ہی ہے، اس لئے ترجمہ نہیں کیا گیا...... رَزُن (ک) رَزَانة: بھاری بھرکم ہونا۔ باوقار اور سنجیدہ ہونا۔ یہاں ذاقوۃ کا مترادف ہے...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کمزور بدن ہونے کا کوئی مأخذ میرے علم میں نہیں ہے...... الحال: مطبوعہ میں الأحوال تھا۔تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے...... مزاجہ اور مایناسبہ کی ضمیریں نبینا کی طرف لوٹتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

منتخب نفل روزے اور ان کی حکمتیں

رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لئے چند نفلی روزے پسند فرمائے ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

① ــــ عاشورہ یعنی دسویں محرم کا روزہ ــــ اس روزہ کے انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ یہ وہ مبارک تاریخی دن ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم سے نجات عطا فرمائی تھی۔ اور فرعون کے لشکر کو غرقاب کیا تھا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے اس انعام کے شکر میں اس دن کا روزہ رکھا۔ اور وہ روزہ بنی اسرائیل میں رائج ہوا (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۶۷) ــــ اور اسی یوم عاشورہ کو حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی جودی پہاڑی پر لگی تھی۔ چنانچہ نوح علیہ السلام نے اس دن کا روزہ رکھا (مسند احمد ۲: ۳۶۰) اور چونکہ یہ واقعہ پوری انسانیت پر اللہ کا احسان عظیم تھا اس لئے زمانۂ جاہلیت میں قریش مکہ کے نزدیک بھی یوم عاشورہ بڑا محترم دن تھا۔ اسی دن خانۂ کعبہ پر نیا غلاف ڈالا جاتا تھا (معارف الحدیث ۴: ۱۶۸) اور قریش اس دن روزہ رکھتے تھے۔ اور خود رسول اللہ ﷺ بھی ہجرت سے پہلے یہ روزہ رکھتے تھے۔ پھر جب آپؐ نے ہجرت فرمائی تو مدینہ میں جلوہ افروز ہو کر بھی آپؐ نے یہ روزہ رکھا۔ اور مسلمانوں کو اس دن روزہ رکھنے کا تاکیدی حکم دیا۔ اس سے بعض ائمہ نے یہ سمجھا کہ شروع میں عاشورہ کا روزہ واجب تھا۔ بعد میں جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشورہ کے روزے کی فرضیت منسوخ ہوگئی۔ مگر اس کے بعد بھی آپؐ یہ روزہ پابندی سے رکھتے رہے۔ اس لئے اب یہ روزہ سنت ہے۔

② ــــ عرفہ یعنی نویں ذی الحجہ کا روزہ ــــ اس روزہ کے انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ اس دن روزہ رکھنے سے حجاج کرام سے مشابہت پیدا ہوتی ہے۔ ان کی طرف شوق کا اظہار ہوتا ہے۔ اور اس رحمت کے درپے ہونا ہے جو حاجیوں پر نازل ہوتی ہے یعنی یوم عرفہ کا روزہ اس دن کی رحمتوں اور برکتوں میں جو میدان عرفات میں حجاج پر نازل ہوتی ہیں، شریک اور حصہ دار ہونے کی ایک کوشش ہے۔

عرفہ کے روزہ کا ثواب عاشورہ کے روزے سے زیادہ ہونے کی وجہ: حدیث میں ہے کہ یوم عرفہ کے روزے سے دو سال کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں: ایک گذشتہ سال اور ایک آئندہ سال اور عاشوراء کے روزے سے گذشتہ ایک سال کے گناہ معاف ہوتے ہیں (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث ۲۰۴۴)

عرفہ کے روزے کی برتری کی وجہ یہ ہے کہ یہ تازہ بہار لوٹنا ہے۔ اور عاشورہ کا روزہ محض ایک یادگار ہے یعنی سال بہ سال عرفات کے میدان میں عرفہ کے دن رحمتِ خاصہ نازل ہوتی ہے، اس کا فیض سارے جہاں میں پہنچتا ہے، اس لئے جو شخص اس دن روزہ رکھتا ہے، وہ اس دن میں نازل ہونے والی رحمت میں غوطہ لگاتا ہے۔ اور یوم عاشورہ میں حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہما السلام پر جو انعام ہوا تھا وہ گذر گیا اور بیت گیا۔ اب اس دن میں صرف یادگار کے طور پر روزہ رکھا جاتا

ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے تازہ رحمت میں غوطہ زن ہونے کا فائدہ یوم عرفہ کے لئے مقرر فرمایا۔ اور وہ فائدہ یہ ہے کہ اس سے گذشتہ ایک سال کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ اہم دنوں میں مجرموں کو معافی دینے کا دستور عام ہے۔ اور آئندہ ایک سال تک عرفہ کا روزہ رکھنے والا گناہوں سے بچا رہتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اس کا دل مجلّٰی ہوجاتا ہے۔ اور وہ صمیم قلب سے گناہوں کو قبول نہیں کرتا، اس لئے آئندہ ایک سال تک اس کو گناہوں کا خیال بھی نہیں آتا۔

حج میں عرفہ کے دن روزہ نہ رکھنے کی وجہ: حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ نے عرفہ کے دن روزہ نہیں رکھا تھا۔ اور حاجیوں کے لئے بھی عرفہ کے دن روزہ رکھنا پسندیدہ نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ عیدین کے باب میں گذر چکی ہے کہ عید الاضحیٰ کی نماز اور قربانی کا حکم حجاج کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے کے لئے ہے۔ اور مشابہت وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو حاجی نہیں ہیں۔ خود حاجیوں کو روزہ رکھ کر مشابہت اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔

③ —— **شوال کے چھ روزے** —— حدیث شریف میں ہے کہ: ''جس نے ماہِ رمضان کے روزے رکھے۔ پھر اس کے بعد شوال میں چھ روزے رکھے، تو اس کا یہ عمل ہمیشہ روزہ رکھنے کے برابر ہوگا'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۴۷) اور ان روزوں کی مشروعیت کی حکمت یہ ہے کہ یہ روزے فرائض کے بعد کی سنن مؤکدہ کی طرح ہیں، جن سے فرائض کی تکمیل ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ روزے ان لوگوں کے رمضان کے روزوں کے فوائد کی تکمیل کرتے ہیں جو کسی وجہ سے کوتاہ دست رہ گئے ہیں۔

صوم دہر کی فضیلت کی وجہ: رمضان کے بعد شوال کے چھ روزے رکھ لئے جائیں تو یہ عمل ہمیشہ روزہ رکھنے کی طرح اس طرح ہوجاتا ہے کہ رمضان کا مہینہ اگر ۲۹ کا بھی ہے، تب بھی ۳۰ روزوں کا ثواب ملتا ہے۔ پس کل ۳۶ روزے ہوئے اور ''نیکی کا ثواب دس گنا'' کے ضابطہ سے ۳۶۰ روزوں کا ثواب ملا۔ اور سال کے دن اس سے کم ہی ہوتے ہیں۔ پس اجر وثواب کے لحاظ سے یہ عمل ایسا ہے جیسے کوئی ہمیشہ روزہ رکھتا رہا ہو۔

④ —— **ہر ماہ کے تین روزے** —— یہ بھی حکماً صوم دہر کی ایک صورت ہے۔ اور وہ اس طرح کہ رمضان کے روزوں کو حساب میں شامل نہ کیا جائے صرف ہر ماہ کے تین روزوں کا حساب لگایا جائے۔ تو ''نیکی کا اجر دس گنا'' کے ضابطہ سے تیس روزوں کا اجر ملے گا۔ اور مہینہ تیس ہی دن کا ہوتا ہے۔ پس یہ شخص بھی حکماً ہمیشہ روزہ رکھنے والا ہے۔

دوسری وجہ: یہ ہے کہ اقلِ جمع تین ہیں۔ پس جس نے ہر ماہ تین روزے رکھے اس نے بہت روزے رکھے۔

کن تاریخوں میں اور کن دنوں میں تین روزے رکھے جائیں؟: اس سلسلہ میں روایات مختلف ہیں۔ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کو آپؐ نے ایام بیض کے روزے رکھنے کا حکم دیا تھا (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۵۷) اور ایک روایت ہے کہ آپؐ ایک مہینہ: بار، اتوار اور پیر کا روزہ رکھا کرتے تھے اور دوسرے مہینے: منگل، بدھ اور جمعرات کا (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۵۹) اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ہر ماہ کی شروع کی تاریخوں میں تین روزے رکھتے تھے (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۵۸) اور آپؐ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو حکم دیا تھا کہ وہ ہر مہینے تین روزے رکھیں۔ اور وہ روزے یا تو پیر سے شروع کریں یا جمعرات

سے (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۶۰)

اور ہر ایک کے لئے وجہ ہے: ایام بیض کے انتخاب کی وجہ تو ان دنوں کا روشن ہونا ہے۔ ان ایام میں چاند پورا ہوتا ہے۔ اور راتیں روشن اور اس کا اثر ہر چیز پر پڑتا ہے۔ طبائع میں نشاط پیدا ہوتا ہے اور رنگ نکھرتا ہے۔ اس لئے ان ایام کا روزہ بھی دل کو روشن کرتا ہے۔ اور ایک نہایت ضعیف روایت میں آیا ہے کہ سب سے پہلے ان دنوں کے روزے حضرت آدم علیہ السلام نے رکھے تھے (کنز العمال حدیث ۲۴۱۹۴)

اور دوسری روایت کی وجہ یہ ہے کہ ہفتہ کے تمام دنوں کو عملِ نبوی کی برکت حاصل ہوجائے۔ رہا جمعہ تو اس کا روزہ شاید ہی آپؐ ناغہ کرتے تھے —— اور مہینہ کی شروع تاریخوں کے انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ پہلی فرصت میں عمل کرلیا جائے۔ نیز ان دنوں میں مہینہ کے آخری دنوں کی تاریخ کے بعد روشنی کی جھلک نظر آتی ہے —— اور بار اور اتوار کے روزوں کی وجہ حدیث میں یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ کفار کے خوشی کے دن ہیں۔ اس لئے ان دنوں میں روزہ رکھ کر ان کی خوشی کی مخالفت کی جاتی ہے (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۶۸)

اور پیر اور جمعرات کے انتخاب کی چند وجوہ ہیں: (۱) ان دو دنوں میں ہر مسلمان کی بخشش کی جاتی ہے۔ بجز تعلقات توڑنے والوں کے (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۷۳) (۲) ان دو دنوں میں اعمال پیش ہوتے ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۵۶) (۳) پیر کے دن آنحضرت ﷺ کی ولادت ہوئی ہے اور آپؐ پر وحی کا نزول شروع ہوا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۴۵)

واختار لأمته صيامًا:

منها: يوم عاشوراء، وسرُّ مشروعيته: أنه وقت نصرِ الله تعالى موسى عليه السلام على فرعون وقومه، فشكر موسى بصوم ذلك اليوم، وصار سنةً بين أهل الكتاب والعرب، فأقرَّه رسول الله صلى الله عليه وسلم.

ومنها: صوم عرفة، والسرُّ فيه: أنه تشبُّهٌ بالحاجِّ، وتشوُّقٌ إليهم، وتعرُّضٌ للرحمة التي تنزل عليهم.

وسرُّ فضله على صوم يوم عاشوراء: أنه خوضٌ في لُجَّة الرحمة النازلة ذلك اليوم، والثاني، تعرُّضٌ للرحمة التي مضت وانقضت، فعمِد النبيُّ صلى الله عليه وسلم إلى ثمرة الخوض في لجة الرحمة —— وهي كفارةُ الذنوب السابقة، والنُّبُوُّ عن الذنوب اللاحقةِ، بأن لا يقبلها صميمُ قلبه —— فجعلها لصوم عرفة.

ولم يَصُمْه رسول الله صلى الله عليه وسلم في حجته، لما ذكرنا في التضحية وصلاةِ العيد: من أن مبناها كلِّها على التشبُّهِ بالحاجّ، وإنما المتشبِّهون غيرُهم.

ومنها: ستة الشوال، قال صلى الله عليه وسلم: "من صام رمضان، فأتْبَعَه ستًا من شوال كان

كصيام الدهر كلِّه"، والسرُّ في مشروعيتها: أنها بمنزلة السنن الرواتب في الصلاة، تُكَمِّلُ فائدتَها بالنسبة إلى أمزجةٍ لم تَتَامَّ فائدتُها بهم؛ وإنما خَصَّ في بيان فضله التشبُّهَ بصوم الدهر: لأن من القواعد المقرَّرة: أن الحسنة بعشر أمثالها، وبهذه الستةِ يتمُّ الحسابُ.

ومنها: ثلاثةٌ من كل شهر، لأنها بحسابِ كلُّ حسنة بعشر أمثالها تُضاهي صيامَ الدهر، ولأن الثلاثة أقلُّ حد الكثرة؛

وقد اختلفتِ الرواية في اختيار تلك الأيام: فورد:" يا أباذرٍّ! إذا صمتَ من الشهر الثلاثةَ، فصم ثلاث عشرة، وأربع عشرة، وخمس عشرة" وورد:" كان يصوم من الشهر السبتَ، والأحدَ، والاِثنين، ومن الشهر الآخر: الثُّلاَثَاءَ، والأَرْبِعَاءَ، والخميس" وورد:" من غُرَّةِ كل شهر ثلاثة أيام" وورد:" أنه أمر أمَّ سلمة بثلاثة: أولها الاثنين والخميس" ولكل وجهٌ.

ترجمہ: اورآپؐ نے اپنی امت کے لئے چند روزے پسند فرمائے: ان میں سے: عاشورہ کا دن ہے۔ اوراس کی مشروعیت کا راز یہ ہے کہ وہ فرعون اوراس کی قوم کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام کی نصرتِ خداوندی کا وقت ہے۔ چنانچہ اس دن کے روزے کے ذریعہ موسیٰ علیہ السلام نے شکریہ ادا کیا۔ اور وہ اہل کتاب اور عربوں میں رائج ہوگیا۔ پس رسول اللہ ﷺ نے اس کو بدستور باقی رکھا ——— اوران میں سے: عرفہ کا روزہ ہے۔ اورراز اس میں یہ ہے کہ وہ حاجیوں سے مشابہت اختیار کرنا، اوران کی طرف شوق ظاہر کرنا، اوراُس رحمت کے درپے ہونا ہے جوان پر نازل ہوتی ہے ——— اور عاشورہ کے روزہ پر عرفہ کے روزے کی برتری کا راز: یہ ہے کہ عرفہ کا روزہ اس رحمت کے سمندر میں گھسنا ہے جواس دن نازل ہوتی ہے۔ اور ثانی یعنی عاشورہ کا روزہ: اس رحمت کے درپے ہونا ہے جو کہ وہ گذرگئی اور نمٹ گئی۔ پس قصد کیا نبی ﷺ نے (تازہ) رحمت کے سمندر میں گھسنے کے ثمرہ کا ——— اور وہ گذشتہ گناہوں کی معافی ہے۔ اورآئندہ گناہوں سے دور ہونا ہے، بایں طور کہ نہ قبول کرے ان گناہوں کواس کے دل کی تھاہ ——— پس مقرر کیا اس ثمرہ کوعرفہ کے روزے کے لئے ——— اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے حج کے موقعہ پر عرفہ کا روزہ نہیں رکھا: اس وجہ سے جس کو ہم نے ذکر کیا ہے قربانی کرنے اور نماز عید کے بیان میں یعنی یہ بات کہ ان تمام ہی باتوں کا مدار حاجیوں کی مشابہت اختیار کرنے پر ہے۔ اور مشابہت اختیار کرنے والے لوگ وہی ہیں جو حاجیوں کے علاوہ ہیں ——— اوران میں سے: شوال کے چھ روزے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا...... اوران کی مشروعیت کا راز: یہ ہے کہ وہ روزے ایسے ہیں جیسے نماز کی سنن مؤکدہ۔ مکمل کرتے ہیں وہ روزے رمضان کے روزوں کے فائدہ کو، ان مزاجوں (لوگوں) کی بہ نسبت جن کوان روزوں کا پورا فائدہ حاصل نہیں ہوا ——— اوران کی فضیلت کے بیان میں صوم دہر کی مشابہت اختیار کرنے کواسی وجہ سے خاص کیا کہ ضوابط مقررہ میں سے یہ بات ہے کہ نیکی کا اجر دس گنا ملتا ہے۔ اوران چھ کے ساتھ حساب پورا ہوجاتا ہے۔ ——— اوران

میں سے: ہر ماہ کے تین روزے ہیں۔ اس لئے کہ وہ تین روزے: ''ہر نیکی کا اجر دس گنا'' کے حساب سے صوم دَہر کے مشابہ ہوجاتے ہیں یعنی حکماً صوم دَہر بن جاتے ہیں۔ اور اس لئے کہ تین کثرت کا ادنی درجہ ہے —— اور روایات مختلف ہیں اُن دنوں کے اختیار کرنے میں۔ پس آیا ہے: ''اے ابوذرؓ! جب آپ مہینے میں تین روزے رکھیں تو ۱۳، ۱۴، ۱۵ کا روزہ رکھیں'' اور آیا ہے: ''نبی ﷺ ایک مہینے میں: بار، اتوار اور پیر کا روزہ رکھا کرتے تھے۔ اور دوسرے مہینے میں: منگل، بدھ اور جمعرات کا'' اور آیا ہے: ''ہر ماہ کی شروع تاریخوں میں تین روزے رکھتے تھے'' اور آیا ہے کہ آپؐ نے ام سلمہؓ کو تین روزوں کا حکم دیا۔ ان کا پہلا پیر یا جمعرات ہو۔ اور ہر ایک کے لئے وجہ ہے۔

لغات: نبَا (ن) نَبْوَۃً الشیئُ: دور ہونا اور پیچھے رہ جانا...... تَتَامٌّ: باب مفاعلہ ہے تمام سے۔ تَتَامَّ القومُ: سب کا آنا۔ تَتَامَّ الفائدۃُ: فائدہ پورا حاصل ہونا...... ضَاھٰی مُضاھاۃً الرجلَ: مشابہ ہونا...... أولھا الاثنین و الخمیس میں واو بمعنی أو ہے اور طبرانی کی روایت میں أو ہی ہے (مظاہر حق)

تصحیح: فشکر اصل میں وشکر تھا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

فصل

شبِ قدر کا بیان

شبِ قدر دو ہیں: یہ بات جان لیں کہ شبِ قدر دو ہیں:

ایک: —— سال بھر والی شبِ قدر —— یہ وہ عظمت و برکت والی رات ہے جس میں حکمت بھرے معاملات طے کئے جاتے ہیں یعنی قضاء قدر کے حکیمانہ فیصلے متعلقہ فرشتوں کے حوالے کئے جاتے ہیں۔ اور جس میں پورا قرآن کریم لوح محفوظ سے سمائے دنیا پر یکبارگی نازل کیا گیا ہے (اور اسی شب میں رسول اللہ ﷺ پر نزول قرآن کی ابتدا ہوئی ہے) پھر تدریج ۲۳ سال میں زمین پر اس کا نزول مکمل ہوا ہے۔ یہ رات پورے سال میں گھومتی رہتی ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ رمضان ہی میں ہو۔ البتہ رمضان میں اس کے واقع ہونے کا غالب احتمال ہے۔ اور یہ محض اتفاق تھا کہ نزول قرآن کے وقت یہ رات رمضان میں تھی (اور رمضان والی شبِ قدر اور سال بھر والی شبِ قدر متفق ہوگئی تھیں اور یہ بھی اتفاقی بات تھی اور سورۃ الدخان میں جس بابرکت رات کا تذکرہ ہے، اس سے یہی شبِ قدر مراد ہے۔ اور جن لوگوں نے شبِ برأت سے تفسیر کی ہے وہ صحیح نہیں)

دوسری: —— خاص رمضان والی شبِ قدر —— اس شب میں خاص نوع کی روحانیت پھیلتی ہے اور ملائکہ زمین پر اترتے ہیں۔ پس مؤمنین اس رات میں عبادت میں لگ جاتے ہیں۔ اور ان کے انوار کا باہم ایک دوسرے پر پَرتو پڑتا

ہے۔اور ملائکہ مؤمنین سے نزدیک ہوتے ہیں۔اور شیاطین ان سے دور ہوتے ہیں۔اور مسلمانوں کی دعائیں اور عبادتیں قبول کی جاتی ہیں۔اور یہ رات ہر رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں ہوتی ہے۔البتہ ان دس راتوں میں آگے پیچھے ہوتی رہتی ہے۔مگر ان سے باہر نہیں نکلتی۔(سورۃ القدر میں اسی شب قدر کا ذکر ہے)

پس جو حضرات کہتے ہیں کہ شبِ قدر سال بھر میں دائر ہے، ان کی مراد پہلی شب قدر ہے۔اور جو کہتے ہیں کہ رمضان کی آخری دس راتوں میں ہوتی ہے، ان کی مراد دوسری شب قدر ہے۔پس دونوں قولوں میں کوئی تعارض نہیں۔اور درج ذیل دو روایتیں دوسری شبِ قدر کے بارے میں ہیں:

حدیث:(۱) ـــــ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ متعدد صحابہ نے خواب میں شب قدر کو رمضان کی آخری سات راتوں میں دیکھا۔آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''میں آپ لوگوں کے خوابوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ متفق ہوگئے ہیں آخری سات راتوں میں۔پس جو کوئی شبِ قدر کو تلاش کرے، وہ اس کو آخری سات راتوں میں تلاش کرے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۸۴)

حدیث:(۲) ـــــ ایک طویل واقعہ میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''مجھے یہ شب (خواب میں) دکھلائی گئی۔پھر میں اس کو بھلا دیا گیا۔اور میں نے خود کو اس رات کی صبح میں کیچ میں سجدہ کرتے دیکھا'' پھر یہ نشانی اکیسویں رات میں پائی گئی (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۸۶)

اور صحابہ سے اس شب کی تعیین میں جو مختلف قول مروی ہیں ان کی بنیاد ادراک و وجدان کا اختلاف ہے یعنی صحابہ نے خوابوں میں اس شب کو دیکھا ہے۔علامتوں سے اس کو پہچانا ہے اور ذوق و وجدان سے اس کو جانا ہے۔اور اس میں اختلاف ہوا ہے۔اس وجہ سے مختلف اقوال ہوگئے ہیں۔

شب قدر کی خاص دعا: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ شبِ قدر کونسی رات ہے تو میں اس میں کیا دعا مانگوں؟ آپؐ نے فرمایا: ''یہ دعا مانگو: اَللّٰھُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ، تُحِبُّ الْعَفْوَ، فَاعْفُ عَنِّیْ ترجمہ: اے اللہ! آپ درگذر کرنے والے ہیں، درگذر کو پسند کرتے ہیں، پس مجھ سے درگذر فرمایئے!'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۹۱)

فائدہ:(۱) شبِ قدر دو ہیں یہ بات امام اعظم اور صاحبین رحمہم اللہ سے مروی ہے۔اور اسی کو شاہ صاحب قدس سرہ نے اختیار کیا ہے۔اور یہ بات حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے ایک قول کی بنا پر اختیار کی گئی ہے۔مسلم شریف (۸: ۶۴ مصری) میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول مروی ہے کہ مَن یَقُمِ الحولَ یُصِبْ لیلةَ القدر یعنی جو سال بھر نوافل پڑھے گا وہ شبِ قدر کو پالے گا۔اس ارشاد سے یہ بات سمجھی گئی ہے کہ شبِ قدر رمضان کے ساتھ خاص نہیں۔مگر حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اس قول کی تاویل کی ہے کہ ابن مسعود نے یہ بات اس لئے فرمائی ہے کہ لوگ رمضان کے

علاوہ راتوں کو ضائع نہ کریں۔ نیز رسول اللہ ﷺ سے بھی پورے سال شب قدر تلاش کرنا مروی نہیں۔آپ رمضان ہی میں شب قدر کو تلاش کیا کرتے تھے۔اور امت میں بھی اس کا تعامل نہیں۔حالانکہ یہ ایسی عظمت وبرکت والی رات ہے کہ خواص اس کو رمضان کی شب قدر کی طرح ضرور سال بھر تلاش کرتے۔اس لئے جمہور کی رائے ہی قرین صواب معلوم ہوتی ہے۔واللہ اعلم۔

فائدہ: (۲) شاہ صاحب رحمہ اللہ نے دوسری شب قدر کو رمضان کی آخری دس راتوں کے ساتھ خاص کیا ہے۔ حالانکہ آنحضرت ﷺ نے ایک رمضان میں شروع ماہ سے شب قدر کی تلاش میں اعتکاف فرمایا تھا۔اس لئے اس مسئلہ میں بھی جمہور کی رائے قوی معلوم ہوتی ہے کہ شب قدر پورے رمضان میں دائر ہے۔البتہ آخر عشرہ میں اس کے ہونے کا غالب احتمال ہے۔واللہ اعلم۔

واعلم أن ليلة القدر ليلتان:

إحداهما: ليلةٌ فيها يُفْرَقُ كلُّ أمر حكيم، وفيها نزل القرآن جملةً واحدةً، ثم نزل بعد ذلك نَـجْمًا نجمًا، وهى ليلة فى السنة، ولا يجب أن تكون فى رمضان، نعم رمضانُ مَظِنَّةٌ غالِبِيَّةٌ لها، واتفق أنها كانت فى رمضان عند نزول القرآن.

والثانية: يكون فيها نوعٌ من انتشار الروحانية، ومجيئ الملائكة إلى الأرض، فيتفقُّ المسلمون فيها على الطاعات، فتتعاكس أنوارُهم فيما بينهم، ويتقرَّب منهم الملائكة، ويتباعد منهم الشياطين، ويُستجاب منهم أدعيتُهم وطاعاتُهم؛ وهى ليلة فى كل رمضان فى أوتار العشر الأواخر، تتقدم وتتأخر فيها، ولا تخرجُ منها.

فمن قَصَدَ الأُولى قال: هى فى كل سنة، ومن قصد الثانية قال: هى فى العشر الأواخر من رمضان، وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "أَرىٰ رؤياكم قد تواطأتْ فى السبع الأواخر فمن كان مُتحرِّيها فليتَحَرَّها فى السبع الأواخر" وقال: "أُريتُ هذه الليلةَ، ثم أُنْسِيتُها، وقد رأيتُنى أَسجُد فى ماء وطين" فكان ذلك فى ليلة إحدى وعشرين.

واختلاف الصحابة فيها مبنى على اختلافهم فى وجدانها؛ ومن أدعية من وجدَها: "اللهم إنك عفوٌّ تحب العَفْوَ فَا عْفُ عنى"

ترجمہ: اور جان لیں کہ شبِ قدر دو راتیں ہیں: ان میں سے ایک: وہ رات ہے جس میں ہر حکمت والا معاملہ طے کیا جاتا ہے۔اور جس میں قرآن یکبارگی نازل ہوا ہے۔ پھر اس کے بعد تھوڑا تھوڑا نازل ہوا ہے۔اور وہ سال بھر میں

گھومنے والی رات ہے۔ اور ضروری نہیں کہ وہ رمضان میں ہو۔ ہاں رمضان اس رات کا اکثری احتمالی موقع ہے۔ اور اتفاقاً ایسا ہوا کہ وہ رات رمضان میں تھی نزول قرآن کے وقت ——— اور دوسری رات: ہوتا ہے اس میں روحانیت کا ایک نوع کا پھیلاؤ، اور فرشتوں کا زمین پر آنا۔ پس مسلمان متفق ہوتے ہیں اس رات میں عبادت پر۔ پس ان کے انوار کا باہم ایک دوسرے پر پرتو پڑتا ہے۔ اور ان سے فرشتے نزدیک ہوتے ہیں۔ اور ان سے شیاطین دور ہوتے ہیں۔ اور ان کی طرف سے ان کی دعائیں اور ان کی عبادتیں قبول کی جاتی ہیں۔ اور وہ رات ہر رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں ہوتی ہے آگے پیچھے ہوتی ہے وہ ان دس راتوں میں۔ اور نہیں نکلتی ان سے۔ پس جس نے پہلی رات کا قصد کیا، اس نے کہا: ''وہ ہر سال میں ہے'' اور جس نے دوسری رات کا قصد کیا، اس نے کہا: ''وہ رمضان کی آخری دس راتوں میں ہے'' اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ...... اور فرمایا ...... پس پائی گئی وہ نشانی اکیسویں رات میں۔

اور صحابہ کا اختلاف شب قدر میں مبنی ہے ان کے اختلاف پر اس رات کے پانے میں ——— اور اس شخص کی دعاؤں میں سے جو اس رات کو پائے: ''الٰہی! ...... ہے

تصحیح: غالبیۃ اصل میں غالبۃ تھا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

فصل

اعتکاف کا بیان

اعتکاف کی حکمت اور اس کی مشروعیت کی وجہ

مسجد میں اعتکاف کرنا یعنی سب سے کٹ کر اور سب سے ہٹ کر اپنے مالک کے آستانے پر جا پڑنا جمعیتِ خاطر کا سبب ہے۔ دل کی صفائی اور پاکیزگی کا ذریعہ ہے۔ اس سے عبادت کے لئے یکسوئی حاصل ہوتی ہے۔ اعتکاف ملائکہ سے مشابہت پیدا کرنے کا بہترین وسیلہ بھی ہے۔ اور اس میں شب قدر کی تلاش میں لگ جانا بھی ہے۔ اس لئے نبی ﷺ نے رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف پسند فرمایا ہے۔ آپؐ ہر سال اہتمام سے آخری عشرہ کا اعتکاف فرماتے تھے۔ اور آپؐ نے اس کو اپنی امت کے نیکوکاروں کے لئے مسنون کیا ہے یعنی یہ خواص امت کی عبادت ہے اور مسنون ہے۔

اعتکاف کے مسائل اور ان کی حکمتیں

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ معتکف پر شرعاً لازم ہے کہ وہ نہ مریض کی عیادت کو جائے اور نہ نماز جنازہ میں شرکت کے لئے باہر نکلے۔ وہ عورت سے صحبت بھی نہ کرے۔ نہ بوس و کنار کرے۔ اور اپنی کسی بھی ضرورت کے

لئے مسجد سے باہر نہ نکلے۔ سوائے ان حوائج کے جو بالکل ناگزیر ہیں (جیسے پاخانہ وغیرہ) اور (ماہِ رمضان کا) اعتکاف روزہ کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اور (مردوں کا) اعتکاف نمازیوں کو جمع کرنے والی مسجد ہی میں ہوسکتا ہے یعنی ایسی مسجد ہی میں اعتکاف ہوسکتا ہے جس میں پانچوں وقت جماعت پابندی سے ہوتی ہو۔

تشریح: اعتکاف کی حقیقت ہے: ہر طرف سے یکسو ہوکر اور سب سے منقطع ہوکر اللہ سے لو لگالینا اور ان کے آستانے پر جا پڑنا اور تمام جھمیلوں اور خرخشوں سے منقطع ہوکر اللہ کی عبادت اور ان کے ذکر وفکر میں لگ جانا۔ اعتکاف کے اس معنی اور مقصود کو بروئے کار لانے کے لئے اور ان کو متحقق وثابت کرنے کے لئے کچھ پابندیاں ناگزیر ہیں تاکہ توجہ سے عبادت ہوسکے، نفس پر کچھ مشقت پڑے، عادت کی خلاف ورزی ہو اور مقصد حاصل ہو۔

فائدہ: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب ''سنت'' کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے شرعی مسئلہ مراد ہوتا ہے۔ جو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد سے یا آپؐ کے طرزِ عمل سے سمجھا ہے۔ اس لئے صحابہ کے ایسے ارشادات حدیث مرفوع ہی کے حکم میں ہوتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اوپر جو اعتکاف کے مسائل بیان فرمائے ہیں وہ بھی نبوی ہدایات سے ماخوذ و مفہوم ہیں۔

ولما كان الاعتكاف فى المسجد سببًا لجمع الخاطر، وصفاءِ القلب، والتفرُّغ للطاعة، والتشبُّهِ بالملائكة، والتعرُّض لوجدانِ ليلةِ القدر: اختاره النبيُّ صلى الله عليه وسلم فى العشر الأواخر، وسَنَّه للمحسنين من أمته.

قالت عائشة رضى الله عنها: " السنَّةُ على المعتكف أن لايعودَ مريضًا، ولايشهَدَ جنازةً، ولايمسَّ المرأة، ولايُباشِرَها، ولايخرجَ لحاجة، إلا لما لابُدَّ منه، ولا اعتكاف إلا بصوم، ولا اعتكاف إلا فى مسجد جامع"

أقول: وذلك تحقيقا لمعنى الاعتكاف، وليكون الطاعةُ لها بالٌ ومشقةٌ على النفس، ومخالفة للعادة، والله أعلم.

ترجمہ: اور جب مسجد میں پڑ جانا جمعیت خاطر، صفائی قلب، عبادت کے لئے یکسوئی، ملائکہ سے تشبہ اور شبِ قدر کو پانے کے درپے ہونے کا سبب تھا تو نبی ﷺ نے آخری عشرہ میں اعتکاف پسند کیا۔ اور اس کو نیکوکاروں کے لئے مسنون کیا۔
اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا......... میں کہتا ہوں: اور وہ پابندیاں اعتکاف کے معنی (مقصود) کو ثابت کرنے کے لئے ہیں۔ اور تاکہ عبادت دل سے ہوئے اور نفس پر مشقت پڑے اور عادت کی خلاف ورزی ہو، باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

دوسری قسم

تفصیل وار احادیث مرفوعہ کے اسرار وحکم کا بیان

حج کا بیان

باب (۱) حج کے سلسلہ کی اصولی باتیں

باب (۲) حج وعمرہ کے ارکان وافعال کا بیان

باب (۳) حجۃ الوداع کا بیان

باب (۴) حج سے تعلق رکھنے والی باتیں

باب ــــــ ۱

حج کے سلسلہ کی اصولی باتیں

حج کی تشکیل کس طرح عمل میں آئی ہے؟

حج میں سات مصلحتوں (مفید باتوں) کا لحاظ رکھا گیا ہے:

پہلی مصلحت: بیت اللہ شریف کی تعظیم۔ کیونکہ بیت اللہ دین کا ایک شعار ہے۔ اور بیت اللہ کی تعظیم اللہ ہی کی تعظیم ہے۔ اس کی طرف منہ کر کے جو نماز پڑھی جاتی ہے وہ بھی حقیقت میں اللہ ہی کی عبادت ہے۔ کعبہ کو اہل نظر ''قبلہ نما'' کہتے ہیں۔ نماز میں کعبہ کی طرف رخ پھیرنا صرف ملت کی شیرازہ بندی کے لئے ہے۔

دوسری مصلحت: حج کے ذریعہ دربار خداوندی کی حاضری اور پیشی کو ثابت کرنا اور واقعہ بنانا مقصود ہے۔ کیونکہ جس طرح بادشاہ وقتاً فوقتاً دربار منعقد کرتے ہیں، تاکہ رعایا اس میں حاضر ہو، اور مختلف فوائد سے دامن پُر کرے، اسی طرح ہر ملت کے لئے کوئی ایسا اجتماع ضروری ہے جس میں قریب و بعید کے لوگ یکے بعد دیگرے آئیں، ایک دوسرے کو پہچانیں، اپنا دین سیکھیں اور ملت کے شعائر کی تعظیم بجالائیں۔ حج ایسی ہی دربار خداوندی کی حاضری ہے، اس کے اجتماع عظیم سے مسلمانوں کی شوکت کا اظہار ہوتا ہے۔ جنود اسلامیہ یعنی مسلمانوں کو اکٹھا ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اور ملتِ اسلامیہ کی شان دوبالا ہوتی ہے۔ سورۃ البقرۃ آیت ۱۲۵ میں ہے: ''اور (یاد کرو) جب ہم نے خانۂ کعبہ کو لوگوں کے لئے اجتماع کی جگہ اور امن بنایا'' ـــــ حج کے اجتماع کے علاوہ چھوٹے بڑے ملّی اجتماعات اور بھی ہیں۔ جیسے فرض نمازوں کی ادائیگی کے لئے اور جمعہ و عیدین کے لئے اجتماعات۔ یہ اجتماعات چونکہ مقامی ہیں، اس لئے ایک ساتھ سب کی حاضری ضروری ہے۔ اور حج کا اجتماع چونکہ ایک عالمی اجتماع ہے، جس میں تمام مسلمانوں کی ایک ساتھ حاضری دشوار ہے، اس لئے فرمایا کہ: ''لوگ یکے بعد دیگرے آئیں''، یعنی کوئی اس سال آئے اور کوئی اگلے سال۔

تیسری مصلحت: حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام سے جو باتیں متوارث چلی آرہی ہیں: حج کے ذریعہ ان کی ہمنوائی مقصود ہے۔ کیونکہ وہ دونوں حضرات ملت حنفی کے پیشوا ہیں۔ انھوں نے ہی عربوں کے لئے احکام مشروع

کئے ہیں یعنی عرب میں انہیں کا دین رائج ہے۔اور ہمارے نبی ﷺ کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ آپؐ کے ذریعہ ملتِ حنفی کا ظہور وغلبہ ہو۔اوراس کا آوازہ بلند ہو۔سورۃ الحج کی آخری آیت میں ارشاد پاک ہے:''اپنے باپ ابراہیم کی ملت کو'' (پھیلاؤ) پس جو باتیں ملت حنفی کے ان دونوں اکابر سے شہرت کے ساتھ منقول ہیں اُن کی حفاظت اور نگہداشت ضروری ہے۔جیسے خصالِ فطرت: لبیں تراشنا، ڈاڑھی بڑھانا وغیرہ (دیکھیں مشکوٰۃ شریف حدیث ۳۷۹ باب السواک) اور جیسے حج کے ارکان۔حدیث شریف میں ہے کہ کچھ لوگ میدانِ عرفات میں موقف (ٹھہرنے کی جگہ) سے فاصلہ پر وقوف کئے ہوئے تھے۔آپؐ نے اطلاع بھجوائی کہ:''اپنی عبادت کی جگہ میں ٹھہرو، اس لئے کہ تم میراث (متابعت) پر ہو اپنے باپ ابراہیم کی'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۵۹۵) یعنی حج میں اُن مقاماتِ حج کی جو ابراہیم علیہ السلام سے منقول ہیں پیروی ضروری ہے۔اوراس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وقوف عرفہ جو حج کا بنیادی رکن ہے موافقت کے باب سے ہے۔

چوتھی مصلحت: حج میں بعض اعمال اس لئے ہیں کہ ایک حالت پر سب حاجیوں کا اجتماع واتفاق ہو جائے، تاکہ عوام وخواص کے لئے سہولت ہو۔جیسے یوم ترویہ یعنی ۸ ذی الحجہ کو منی میں قیام کرنا اور وہاں پانچ نمازیں ادا کرنا، تاکہ وہاں سے ۹ ذی الحجہ کی صبح کو عرفات کی طرف روانگی میں سہولت ہو۔اور جیسے عرفہ سے واپسی پر مزدلفہ میں شب باشی کرنا اور فجر کے بعد وقوف کرنا، تاکہ دس ذی الحجہ کو منی کی طرف روانگی میں سہولت ہو۔اس کی نظیر یہ ہے کہ جب نبی ﷺ مدینہ سے حجۃ الوداع کے لئے روانہ ہوئے، تو ذوالحلیفہ میں —— جو مدینہ سے پانچ سات میل کے فاصلہ پر ہے —— قیام فرمایا۔تاکہ رات میں سب لوگ وہاں جمع ہو جائیں، اور صبح ایک ساتھ سفر ہو سکے۔غرض اس قسم کا اتحاد واتفاق ضروری ہے۔ورنہ لوگوں کے لئے دشواری ہوگی۔اور یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کو اس کا تاکیدی حکم دیا جائے، ورنہ لوگوں کی کثرت اور پھیلاؤ کی وجہ سے ان کا کلمہ متحد نہیں ہوگا۔

پانچویں مصلحت: حج میں بعض اعمال ایسے شامل کئے گئے ہیں جو اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ اُن اعمال کو انجام دینے والا خدا پرست، دین حق کا پیرو، ملت حنفی کا متبع اور ان نعمتوں پر اللہ کا شکر بجالانے والا ہے جو اس ملت کے اگلوں پر اللہ تعالیٰ نے کی ہیں۔جیسے صفا ومروہ کی سعی اُس انعام کی یادگار کے طور پر مناسک میں شامل کی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا پر کیا تھا۔مگر یہ عمل بھی اللہ ہی کو یاد کرنے کے لئے ہے۔حدیث شریف میں ہے کہ جمرات کی رمی اور صفا ومروہ کی سعی:اللہ کے ذکر کو برپا کرنے کے لئے ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۶۲۴)

چھٹی مصلحت: لوگ زمانۂ جاہلیت میں حج کیا کرتے تھے اور حج کو ان کے دین میں بنیادی اہمیت حاصل تھی۔مگر انھوں نے حج میں دو قسم کی غلط باتیں رَلادی تھیں:

ایک: حج میں ایسے اعمال شامل کر لئے تھے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منقول نہیں تھے۔وہ ان پر محض افتراء تھے۔اوران میں غیر اللہ کو شریک بنانا بھی تھا۔جیسے اِساف ونائلہ کی تعظیم کرنا اور منات نامی بُت کے لئے احرام باندھنا۔

اور جیسے مشرکین کا اس طرح تلبیہ پڑھنا کہ: آپ کا کوئی شریک نہیں، مگر ایک شریک جو آپ کا ہے الخ (مشکوٰۃ حدیث ۲۵۵۴) ——— ایسے خودساختہ اعمال کے لئے سزاوار یہ تھا کہ ان کی ممانعت کردی جائے، اوران سے سختی کے ساتھ روک دیا جائے (یہ منفی پہلو سے حج کی تشکیل کا بیان ہے کہ جاہلیت والے حج میں سے بعض امور القط کردیئے گئے ہیں)

فائدہ: اِساف ونائلہ دوبت تھے۔ جن کے بارے میں مشرکین کی روایات یہ تھیں کہ یہ دونوں ایک زمانہ میں مردوزن تھے۔ جنھوں نے کعبہ شریف میں زنا کیا تھا اوروہ مسخ کردیئے گئے تھے اور پتھر بن گئے تھے۔ عبرت کے لئے ان کوصفاومروہ پر رکھ دیا گیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ قابل تعظیم اور معبود بن گئے۔

اور مَنات: قبیلۂ خُزاعہ اور ہُذیل کا بت تھا۔ جس کو مکہ والے بھی مانتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ اسلام سے پہلے انصار منات کے لئے احرام باندھتے تھے۔ سورۃ النجم میں اُس بُت کا تذکرہ ہے۔ طــاغیۃ کے معنی ہیں: بت (فائدہ پورا ہوا)

دوسری: جاہلیت کے لوگوں نے کچھ باتوں کو فخر وغرور کے طور پر دین بنالیا تھا۔ اوران کو حج میں شامل کرلیا تھا، جیسے:

(۱) ——— قریش جب حج کرتے تھے تو مزدلفہ میں ٹھہر جاتے تھے، عرفہ تک نہیں جاتے تھے۔ عرفہ حرم سے باہر ہے اور مزدلفہ حرم میں ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم حرم کے کبوتر ہیں اس لئے حرم سے باہر نہیں نکل سکتے۔ اس سلسلہ میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۹۹ نازل ہوئی کہ: ”تم سب کے لئے ضروری ہے کہ اس جگہ ہوکر واپس آؤ، جہاں اور لوگ جاکر واپس آتے ہیں“ چنانچہ اس رسم کا خاتمہ ہوگیا۔

(۲) ——— منی کے دنوں میں یعنی ۱۱، ۱۲، ۱۳ ذی الحجہ میں مشاعرہ ہوتا تھا۔ ہر شاعر اپنے خاندانی مفاخر بیان کرتا تھا اور زوردار قصیدہ خوانی ہوتی تھی۔ چنانچہ سورۃ البقرہ کی آیت ۲۰۰ نازل ہوئی کہ: ”جب تم اپنے اعمالِ حج پورے کرلو تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو، جس طرح تم اپنے اسلاف کا ذکر کیا کرتے ہو، بلکہ یہ ذکر اس سے بھی بڑھ کر ہو“ چنانچہ یہ رسم بھی موقوف ہوئی۔

فائدہ: منات بُت کے لئے احرام باندھنے کو انصار نے اپنی خاص علامت بنالیا تھا، اس لئے ان کو صفاومروہ کی سعی میں دل تنگی محسوس ہوئی تو سورۃ البقرہ کی آیت ۱۵۸ نازل ہوئی کہ: ”صفا اور مروہ منجملۂ یادگارِ دین الٰہی ہیں۔ پس جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں کہ ان دونوں کی سعی کرے“ یہ انداز بیان انصار کی دل تنگی کو دور کرنے کے لئے ہے، ورنہ صفاومروہ کی سعی واجب ہے (یہ فائدہ شاہ صاحب نے بیان کیا ہے)

وضاحت واستدراک: صفاومروہ پر کفار نے دوبت رکھ رکھے تھے، جیسا کہ ابھی گذرا۔ کفار ان کی تعظیم کرتے تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ یہ سعی ان دوبتوں کی تعظیم کے لئے کی جاتی ہے۔ جب اسلام کا زمانہ آیا تو لوگوں کو خیال ہوا کہ صفا اور مروہ کا طواف تو ان بتوں کی تعظیم کے لئے تھا۔ جب بتوں کی تعظیم حرام ہوئی تو صفاومروہ کا طواف بھی ممنوع ہونا چاہئے!

اور یہ بات وہ بالکل بھول چکے تھے کہ صفا ومروہ کی سعی درحقیقت کس مقصد سے تھی۔ اور انصار مدینہ چونکہ کفر کے زمانہ میں بھی صفا اور مروہ کی سعی کو برا جانتے تھے اس لئے اسلام کے بعد بھی ان کو اس طواف میں خلجان ہوا۔ جس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ اور دونوں فریقوں کو بتلایا کہ صفا اور مروہ کے طواف میں کوئی گناہ نہیں۔ یہ دونوں پہاڑیاں تو اصل سے اللہ کے دین کی نشانیاں ہیں۔ پس بے تکلف ان کی سعی کرو۔

ساتویں مصلحت: اہل جاہلیت نے کچھ فاسد قیاسات گھڑ رکھے تھے، جو دین میں غُلو کے قبیل سے تھے۔ اور وہ لوگوں کے لئے پریشانی کا باعث تھے۔ ایسی باتوں کے لئے بھی یہی سزاوار تھا کہ ان کو منسوخ کردیا جائے۔ اور ان کو بالکلیہ چھوڑ دیا جائے۔ مثلاً:

(۱) —— زمانۂ جاہلیت کا ایک دستور یہ تھا کہ جب احرام باندھ لیتے تھے تو گھر میں دروازے سے داخل نہیں ہوتے تھے پیچھے سے دیوار پھاند کر داخل ہوتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ دروازے سے گھر میں داخل ہونا ایک طرح کا دنیا سے فائدہ اٹھانا ہے، جو احرام کے منافی ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۹ نازل ہوئی کہ: ''یہ نیکی کی بات نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آؤ'' اس آیت کے ذریعہ اس غلط تصور کو باطل کردیا گیا۔

(۲) —— اہل جاہلیت موسم حج میں تجارت کو ناپسند کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے اخلاص میں خلل پڑتا ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۹۸ نازل ہوئی کہ: ''تم پر کچھ گناہ نہیں کہ اپنے رب کا فضل (روزی) تلاش کرو'' رہا اخلاص اور عدم اخلاص کا معاملہ تو اس کا مدار نیت پر ہے۔

(۳) —— زمانۂ کفر میں ایک غلط دستور یہ بھی تھا کہ زادِ راہ کے بغیر، خالی ہاتھ حج کا سفر کرتے تھے۔ اور اس کو کار ثواب اور توکل خیال کرتے تھے۔ مگر وہاں پہنچ کر ہر ایک سے مانگتے پھرتے تھے۔ اور لوگوں کو پریشان کرتے تھے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۹۷ نازل ہوئی کہ: ''خرچ ضرور لے لیا کرو، پس بیشک خرچ ساتھ لینے کا فائدہ گداگری سے بچنا ہے''

(۴) —— زمانۂ جاہلیت سے ایک فاسد خیال یہ بھی چلا آرہا تھا کہ حج کے ساتھ عمرہ کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ: ''بدترین گناہ یہ ہے کہ حج کے دنوں میں عمرہ کیا جائے'' اور وہ یہ بھی کہتے تھے کہ: ''جب صفر کا مہینہ گذر جائے، اور حجاج کے اونٹوں کے زخم مندمل ہوجائیں، اور حجاج کے قافلوں کے نشانات بارش وغیرہ سے مٹ جائیں تو جو عمرہ کرنا چاہے کرسکتا ہے'' حالانکہ اس میں دور دراز کے لوگوں کے لئے سخت پریشانی تھی۔ ان کو عمرے کے لئے نئے سفر کی زحمت برداشت کرنی پڑتی تھی۔ چنانچہ حجۃ الوداع میں عملی طور پر یہ غلط تصور مٹا دیا گیا۔ صحابہ حج کا احرام باندھ کر مکہ آئے تھے۔ ان کو حکم دیا گیا کہ وہ نیت بدل دیں۔ اور افعالِ عمرہ کرکے احرام کھول دیں۔ پھر مکہ ہی سے حج کا احرام باندھیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس سلسلہ میں سختی برتی تاکہ پرانی عادت اور دلوں میں بیٹھی ہوئی بات کا مکمل ازالہ ہوجائے۔

﴿من أبواب الحج﴾

المصالح المرعيَّةُ فی الحج أمورٌ:

منها: تعظيم البيت، فإنه من شعائر اللّٰه، وتعظيمُه هو تعظيمُ اللّٰه تعالى.

ومنها: تحقيقُ معنى الْعَرْضَةِ، فإن لكل دولة أو ملة اجتماعاً يتواردُه الأقاصی والأدانی، ليعرِفَ فيه بعضُهم بعضًا، ويستفيدوا أحكامَ الملّة، ويعظّموا شعائِرَها؛ والحجُّ عَرْضَةُ المسلمين، وظهورُ شوكتهم، واجتماعُ جنودهم، وتنويهُ ملتهم، وهو قولُه تعالى:﴿وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَأَمْنًا﴾

ومنها: موافقةُ ماتوارث الناس عن سيدنا إبراهيم وإسمعيل عليهما السلام، فإنهما إما مَا الملَّةِ الحنيفية، ومُشَرِّعَاها للعرب، والنبیُّ صلى الله عليه وسلم بُعث لِتَظْهَرَ به الملَّةُ الحنيفية، وتعلُو به كلمتُها، وهو قولُه تعالى:﴿مِلَّةَ أَبِيْكُمْ إِبْرَاهِيْمَ﴾فمن الواجب: المحافظةُ على ما استفاض عن أمامَيْهَا، كخصال الفطرة، ومناسكِ الحج، وهو قولُه صلى الله عليه وسلم:" قِفُوا على مشاعركم، فإنكم على أرثٍ من إرث أبيكم إبراهيم"

ومنها: الاصطلاح على حالٍ ليتحقق بها الرفقُ لعامَّتهم وخاصَّتهم، كنزول منى، والمبيتِ بمزدلفة، فإنه لو لم يُصْطَلَحْ على مثل هذا لَشَقَّ عليهم، ولو لم يُسَجَّلْ عليهم لم تجتمع كلمتُهم عليه، مع كثرتهم وانتشارهم.

ومنها: الأعمالُ التی تُعلن بأن صاحِبَها مُوَحِّدٌ، تابعٌ للحق، متدين بالملة الحنيفية، شاكرٌ للّٰه على أنعم على أوائلِ هذه الملة، كالسعی بين الصفا والمروة.

ومنها: أن أهل الجاهلية كانوا يَحُجُّون، وكان الحجُّ أصلَ دينهم، ولكنهم خلطوا:

[۱] أعمالاً ما هی مأثورة عن إبراهيم عليه السلام، وإنما هی اختلاق منهم، وفيها إشراك بغير اللّٰه، كتعظيم إسافٍ ونائلةَ، وكالإهلال لمناة الطاغية، وكقولهم فی التلبية:" لاشريك لك، إلا شريكا هو لك" ومن حق هذه الأعمال أن يُنهى عنها، ويُؤَكَّد فی ذلك.

[۲] وأعمالاً انتحلوها فخرًا وعَجَبًا، كقولِ حُمْسٍ:" نحن قُطَّانُ اللّٰه، فلا نخرج من حرم اللّٰه!" فنزل:﴿ ثُمَّ أَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ﴾ وكذكرهم آباءَ هم أيام منى، فنزل: ﴿فاذكروا اللّٰه كذكركم آباءكم أو أشد ذكرًا﴾

ولما استشعر الأنصارُ هذا الأصلَ تحرَّجوا فی السعی بين الصفا والمروة، حتى نزل:﴿ إِنَّ

الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ﴾

ومنها: أنهم كانوا ابتدعوا قياساتٍ فاسدةً، هي من باب التعمق في الدين، وفيها حرج للناس؛ ومن حقها: أن تُنْسَخَ وتُهْجَرَ، كقولهم: "يجتنب المحرمُ دخولَ البيت من أبوابها" وكانوا يتسوَّرون من ظهورها، ظنًّا منهم: أن الدخول من الباب ارتفاق ينافي هيئة الإحرام، فنزل: ﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوْا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا﴾ وككراهيتهم التجارة في موسم الحج، ظنًّا منهم: أنها تُخِلُّ بإخلاص العمل لله، فنزل: ﴿وَلَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِنْ رَّبِّكُمْ﴾ وكاستحبابهم أن يحجوا بلازاد، ويقولوا: "نحن المتوكلون!" وكانوا يضيقون على الناس ويعتدون، فنزل: ﴿وَتَزَوَّدُوْا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى﴾ وكقولهم: "من أَفْجَرِ الفجورِ العمرةُ في أيام الحج" وقولهم: "إذا انسلخ صَفَرُ، وبَرَأَ الدَّبَرُ، وعَفَا الْأَثَرُ: حَلَّتِ العمرةُ لِمَنِ اعتمر" وفي ذلك حرج للآفاقي، حيث يحتاجون إلى تجديد السفر للعمرة، فأمرهم النبيُّ صلى الله عليه وسلم في حجة الوَداع أن يخرجوا من الإحرام بعمرةٍ، ويحجوا بعد ذلك، وشدَّد الأمر في ذلك، يُنكِّلُهم على عادتهم، وما رَكَزَ في قلوبهم.

ترجمہ: حج کے تمام ابواب سے تعلق رکھنے والی یعنی اصولی باتیں: حج میں چند مصلحتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں: ان میں سے (پہلی مصلحت): بیت اللہ کی تعظیم ہے۔ پس بیشک بیت اللہ شعائر دینیہ میں سے ہے۔ اور بیت اللہ کی تعظیم اللہ تعالیٰ ہی کی تعظیم ہے —— اوران میں سے (دوسری مصلحت): دربار کی حاضری کے معنی (مقصد) کو ثابت کرنا ہے۔ پس بیشک ہر سلطنت یا ملت کے لئے ایک ایسا اجتماع ہوتا ہے، جس میں دور کے اور قریب کے لوگ یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ تاکہ اس اجتماع میں ان کے بعض بعض کو پہچانیں۔ اور وہ ملت کے احکام کو حاصل کریں۔ اور ملت کے شعائر کی تعظیم بجالائیں۔ اور حج مسلمانوں کی دربار خداوندی میں حاضری ہے۔ اور ان کے دبدبہ کا ظہور ہے۔ اور ان کے لشکروں کا اکٹھا ہونا ہے (لشکروں سے مراد مسلمان ہیں۔ کیونکہ ہر مسلمان فوجی ہوتا ہے یا ہونا چاہئے) اور ان کی ملت کی رفعتِ شان ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کا مرجع اور امن کی جگہ بنایا'' —— اور ان میں سے (تیسری مصلحت) ہمنوائی ہے اس کی، جس کے لوگ وارث ہوئے ہیں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام سے۔ پس بیشک وہ دونوں ملت حنیفی کے پیشوا ہیں۔ اور عربوں کے لئے ملت حنیفی کا راستہ کھولنے والے ہیں۔ اور نبی ﷺ مبعوث کئے گئے ہیں تاکہ آپؐ کے ذریعہ ملت حنیفی ظاہر ہو۔ اور آپؐ کے ذریعہ اس کا آوازہ بلند ہو۔ اور وہ اللہ پاک کا ارشاد ہے: ''اپنے باپ ابراہیم کی ملت کو'' (پھیلاؤ) پس ضروری باتوں میں سے ہے: اُن چیزوں کی نگہداشت کرنا جو شہرت کے ساتھ منقول ہیں۔ ملت کے دونوں پیشواؤں سے۔ جیسے فطرت کی باتیں اور حج

کے ارکان۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''اپنی علامتوں پر وقوف کرو۔ پس بیشک تم اپنے باپ ابراہیم کی میراث سے ایک میراث (متابعت) پر ہو ـــــ اوران میں سے (چوتھی مصلحت): کسی حالت پر اتفاق کرنا ہے۔ تاکہ متحقق ہو اس اتفاق کے ذریعہ ان کے عوام وخواص کے لئے نرمی۔ جیسے منیٰ میں اترنا اور مزدلفہ میں رات گذارنا۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ اگر اس قسم کی بات پر اتفاق نہیں کیا جائے گا تو لوگوں پر دشواری ہوگی۔ اور اگر اس کی سخت تاکید نہ کی گئی تو ان کی کثرت کی وجہ سے اوران کے انتشار کی وجہ سے ان کی بات اس پر متفق نہیں ہوگی ـــــ اوران میں سے (پانچویں مصلحت) وہ اعمال ہیں جو اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ ان اعمال کو انجام دینے والا خدا پرست، دین حق کی پیروی کرنے والا، ملت حنفی کو دین ماننے والا، اللہ کا شکر بجالانے والا ہے اُن نعمتوں پر جو اللہ نے کی ہیں اس ملت کے اگلوں پر۔ جیسے صفا ومروہ کے درمیان سعی ـــــ اوران میں سے (چھٹی مصلحت) یہ بات ہے کہ جاہلیت کے لوگ حج کیا کرتے تھے۔ اور حج ان کے دین کی اصل تھی، مگر انھوں نے رَلا ملا دیا ـــــ (۱) ایسے اعمال کو جو ابراہیم علیہ السلام سے منقول نہیں تھے۔ وہ ان کا محض افتراء تھے۔ اوران میں غیر اللہ کو شریک ٹھہرانا تھا۔ جیسے اِساف ونائلہ کی تعظیم اور منات بت کے لئے احرام باندھنا۔ اور جیسے ان کا تلبیہ میں کہنا کہ: ''تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ شریک جو تیری ملک ہے'' اوران اعمال کے حق میں سے ہے کہ ان سے روکا جائے اور تاکید کی جائے اس ممانعت کی ـــــ (۲) اور ایسے اعمال کو جن کو دین بنالیا تھا انھوں نے فخر اور غرور کے طور پر۔ جیسے قریش کا قول: ''ہم اللہ کے گھر کے کبوتر ہیں، پس ہم حرم الٰہی سے باہر نہیں نکلیں گے'' پس نازل ہوا: ''پھر تم لوٹو جہاں سے دوسرے لوگ لوٹتے ہیں'' ـــــ اور جیسے ان کا اپنے اسلاف کا تذکرہ کرنا منیٰ کے دنوں میں۔ پس نازل ہوا: ''تو یاد کرو تم اللہ کو جس طرح تم اپنے اسلاف کو یاد کرتے ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو'' ـــــ (فائدہ) اور جب انصار نے اس اصل کو یعنی خودساختہ باتوں کے دین بنانے کو علامت خاص بنالیا (اور انھوں نے منات کے لئے احرام باندھنا شروع کردیا) تو انھوں نے صفا ومروہ کے درمیان سعی میں تنگی محسوس کی۔ یہاں تک کہ نازل ہوا: ''بیشک صفا اور مروہ اللہ کے دین کی امتیازی علامتوں میں سے ہیں ـــــ اوران میں سے (ساتویں مصلحت): یہ ہے کہ ایجاد کئے تھے انھوں نے فاسد خیالات، جو دین میں غلو کے قبیل سے تھے۔ اوران میں لوگوں کے لئے پریشانی تھی۔ اوران کے حق سے ہے کہ وہ منسوخ کردیئے جائیں اور چھوڑ دیئے جائیں: جیسے (۱) ان کا قول: ''محرم بچے گھر میں جانے سے ان کے دروازوں سے'' اور وہ دیواریں پھاندا کرتے تھے گھروں کی پشت سے۔ اپنی طرف سے گمان کرتے ہوئے کہ دروازے سے داخل ہونا ایسا فائدہ اٹھانا ہے جو حالت احرام کے منافی ہے۔ پس نازل ہوا: ''اور نیکی نہیں ہے کہ آؤ تم گھروں میں ان کی پشت سے'' (۲) اور جیسے ان کا ناپسند کرنا تجارت کو موسم حج میں۔ اپنی طرف سے گمان کرتے ہوئے کہ تجارت خلل ڈالتی ہے اللہ کے لئے عمل کو خالص کرنے میں۔ پس نازل ہوا: ''تم پر کچھ گناہ نہیں کہ تم اپنے پروردگار سے روزی چاہو'' (۳) اور جیسے ان کا اس بات کو پسند کرنا کہ وہ بغیر توشہ کے حج کریں اور کہیں کہ:

''ہم اللہ پر توکل کرنے والے ہیں'' اور وہ تنگی کیا کرتے تھے لوگوں پر اور زیادتی کیا کرتے تھے۔ پس نازل ہوا: ''اور توشہ لے لو، پس بیشک توشہ کا فائدہ سوال سے بچنا ہے'' (۴) اور جیسے ان کا قول: ''سخت ترین گناہوں میں سے ہے: ایام حج میں عمرہ کرنا'' اور ان کا قول: ''جب صفر کا مہینہ ختم ہو گیا اور اونٹ کی پیٹھ کے زخم مندمل ہو گئے اور نشاناتِ راہ مٹ گئے تو عمرہ حلال ہے اس کے لئے جو عمرہ کرنا چاہتا ہے'' اور اس میں تنگی ہے دور دراز کے باشندوں کے لئے، بایں طور کہ محتاج ہوں گے وہ نیا سفر کرنے کی طرف عمرہ کے لئے۔ پس حکم دیا ان کو نبی ﷺ نے حجۃ الوداع میں کہ وہ احرام سے نکلیں عمرہ کے افعال کر کے۔ اور حج کریں وہ اس کے بعد۔ اور سختی برتی آپؐ نے اس سلسلہ میں درانحالیکہ عبرت ناک سزا دے رہے ہیں آپؐ ان کو ان کی عادت کے خلاف کرا کے اور اس بات کے خلاف عمل کرا کے جو ان کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی۔

لغات: **عَرْضَة**: پیشی، دربار میں حاضری **عَرَضَ (ض) الشیئُ**: ظاہر و نمایاں ہونا، سامنے آنا۔ پیش آنا ...... **تَوَارَد القومُ إلی المکان**: یکے بعد دیگرے آنا ...... **حُمْس** جمع ہے **الأَحْمس** کی: دین یا جنگ میں سخت۔ یہ قریش کا لقب تھا ...... **قُطَّانُ مکۃ**: مکہ کے کبوتر، مکہ کے باشندے **قَطَنَ بالمکان**: اقامت کرنا، وطن بنانا ...... **اِسْتَشعر**: شعار بنایا، خاص علامت بنالی ...... **نَکَّلَ وَنَکَّلَ**: عبرتناک سزا دینا یعنی ایسی سزا دینا جس سے دوسروں کو بھی سبق حاصل ہو۔

تصحیح: **لیتحقق بها** تمام نسخوں میں حتی کہ مخطوطہ کراچی میں بھی لام کے بغیر **یتحقق** ہے۔ صرف مخطوطہ برلین میں **لیتحقق** ہے اور وہی ان شاء اللہ صحیح ہے اور **بها** تمام مطبوعہ اور مخطوطہ نسخوں میں ضمیر مؤنث کے ساتھ ہے۔ مگر **به** ضمیر مذکر کے ساتھ ہونا چاہئے، کیونکہ اس کا مرجع **الاصطلاح** ہے، جو مصدر ہے ...... **وإنما هی اختلاق منهم** مطبوعہ میں **اختلاف** ہے۔ یہ تصحیح مطبوعہ صدیقی اور مخطوطات سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

ایک ہی مرتبہ حج فرض ہونے کی وجہ

حدیث —— میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خطابِ عام فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا: ''لوگو! تم پر حج فرض کیا گیا ہے، لہٰذا حج کرو'' ایک صاحب نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا ہر سال حج کرنا فرض ہے؟ آپؐ نے سکوت فرمایا۔ سائل نے یہی بات تین بار عرض کی۔ آپؐ نے فرمایا: ''اگر میں 'ہاں' کہہ دیتا تو ہر سال حج کرنا لازم ہو جاتا۔ اور وہ تمہاری استطاعت سے باہر تھا'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۵۰۵)

تشریح: زندگی میں ایک ہی مرتبہ حج فرض ہونے کی وجہ وہی ہے جو صاحبِ استطاعت ہی پر حج فرض ہونے کی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حج کی فرضیت سورۂ آل عمران آیت ۹۷ سے ہے۔ ارشاد پاک ہے: ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ ترجمہ: اور اللہ کے لئے لوگوں کے ذمے بیت اللہ کا حج کرنا لازم ہے۔ اس پر جو بیت

اللہ تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو۔اس آیت میں حج کی فرضیت استطاعت کی قید کے ساتھ ہے۔اسی سے نبی ﷺ نے عمر میں ایک ہی مرتبہ حج کی فرضیت مستنبط کی ہے۔حدیث کا یہ جملہ: ’’اور وہ تمہاری استطاعت سے باہر تھا‘‘ اس طرف مشیر ہے۔یعنی جس طرح دنیا کا ہر مسلمان بیت اللہ تک پہنچنے کی استطاعت نہیں رکھتا، کچھ ہی لوگ اس کی استطاعت رکھتے ہیں، اس لئے صاحبِ استطاعت ہی پر حج فرض کیا گیا ہے۔اسی طرح عام لوگ ہر سال حج کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔معدودے چند ہی ہر سال حج کر سکتے ہیں۔مگر وہ اتنے تھوڑے ہیں کہ تشریع میں ان کا لحاظ نہیں کیا گیا۔اور زندگی میں ایک ہی مرتبہ حج فرض کیا گیا (یہ مضمون شارح کا اضافہ ہے)

امت کا اشتیاق اور نبی کی طلب بھی نزولِ حکم کا سبب ہے

اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد کہ: ’’اگر میں ’’ہاں‘‘ کہہ دیتا تو ہر سال حج کرنا لازم ہو جاتا‘‘ اس کی وجہ یہ ہے کہ شرائع میں بعض مخصوص احکام اس وقت نازل ہوتے ہیں جب امت کی طرف سے اشتیاق پایا جاتا ہے۔پھر نبی کی طرف سے عزیمت (پختہ ارادہ) اور طلب پائی جاتی ہے تو وہ حکم نازل ہو جاتا ہے۔حدیث میں مذکور واقعہ میں سائل کا بار بار سوال کرنا کہ: ’’کیا ہر سال حج کرنا فرض ہے؟‘‘ اور مجمع کا خاموش رہنا امت کے اشتیاق کی غمازی کرتا ہے۔اب اگر نبی ﷺ بھی ’’ہاں‘‘ کہہ دیتے تو آپؐ کی طرف سے بھی عزیمت وطلب کا تحقق ہو جاتا۔اور ہر سال حج کی فرضیت کا حکم نازل ہو جاتا۔چنانچہ اسی حدیث کے آخر میں آپؐ نے یہ بھی ہدایت فرمائی کہ: ’’جب تک میں خود کسی معاملہ میں حکم نہ دوں تم مجھ سے سوال نہ کرو‘‘ اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ: ’’پہلی امتیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ وہ اپنے نبیوں سے بکثرت سوالات کرتی تھیں، پھر ان کے احکامات کی خلاف ورزی کرتی تھیں۔لہٰذا جب میں تم کو کوئی حکم دوں تو جہاں تک تمہارے بس میں ہو اس کی تعمیل کرو۔اور جب میں تم کو کسی چیز سے روک دوں تو اس کو چھوڑ دو‘‘ —— یہ شاہ صاحب رحمہ اللہ کی عبارت کا مدعا ہے۔اب ان کی بات پیش کی جاتی ہے۔فرماتے ہیں:

وہ امر جو خاص وقت کی تعیین کے ساتھ مثلاً موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں یا ہماری شریعت میں نزولِ وحی کا سبب بنتا ہے: وہ امت کی اس وحی کی طرف توجہ ہے۔اور امت کے علوم کا اور ان کی خصوصی توجہات کا پسندیدگی اور قبولیت کے ساتھ اس وحی کا استقبال کرنا ہے۔اسی کو اوپر امت کے اشتیاق سے تعبیر کیا ہے۔اور لوگ اتنی بات جانتے تھے۔ان میں یہ بات مشہور تھی اور لوگوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا چنانچہ وہ ضروری مسائل دریافت کیا کرتے تھے۔کیونکہ قرآن میں حکم دیا گیا تھا کہ جو باتیں تم نہیں جانتے وہ اہل علم سے پوچھو۔اسی لئے یہ سوال کیا گیا تھا کہ: ’’ہر سال حج کرنا ضروری ہے یا ایک مرتبہ کرنا کافی ہے؟‘‘ پھر نزولِ وحی کا سبب نبی کی طلب اور اس کا پختہ ارادہ ہے (یہ بات لوگ نہیں جانتے تھے) پس جب یہ دونوں باتیں جمع ہو جاتی ہیں تو اس طلب کے موافق وحی ضرور اترتی ہے (تراویح کا معاملہ اسی قبیل سے ہے

لوگوں کے اشتیاق کا عالم یہ تھا کہ تیسرے دن مسجد میں تِل دھرنے کی جگہ نہیں رہی تھی۔ پس اگر نبی ﷺ بھی پابندی سے تراویح کی نماز جماعت سے پڑھاتے رہتے تو یہ عزیمت اور طلبِ فعلی ہوتی اور تراویح کی فرضیت کا حکم نازل ہوجاتا۔اس لئے آپؐ نے توقف فرمایا)

اور یہ مضمون مبحث ۶ باب ۴ میں بیان کیا گیا ہے کہ نزولِ شرائع میں امت کے علوم کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ کی جوبھی کتاب نازل ہوئی ہے وہ نبی کی قوم کی زبان میں نازل ہوئی ہے۔اوراس طرح نازل کی گئی ہے کہ لوگ اس کو سمجھ سکیں۔اور جوبھی حکم یا دلیل اتاری گئی ہے: وہ قابل فہم ہی اتاری گئی ہے۔اوراس کی وجہ یہ ہے کہ نبوت ووحی کا مدار لطف ومہربانی پر ہے۔اورلطف ومہربانی کی بات یہی ہے کہ جو جواب مخاطبین کے لئے اطمینان بخش ہووہی دیا جائے اسی طرح جس حکم کے وہ خواہش مند ہوں وہ ضرور نازل کیا جائے۔

[۱] قال رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم:" يا أيها الناس! قد فُرِض عليكم الحجُّ فَحُجُّوْا!" فقال رجل: أكلَّ عامٍ يارسولَ اللّٰه؟ فسكت، حتى قالها ثلاثاً، فقال:" لو قلتُ:نعم لوجبت، ولما استطعتم"

أقول:سرُّه: أن الأمر الذى يُعِدُّ لنزولِ وحيِ اللّٰه بتوقيتٍ خاصٍ هو إقبالُ القوم على ذلك، وتَلَقِّى علومهم وهِمَمِهم له بالقبول، وكونُ ذلك القدر هو الذى اشتهر بينهم، وتداولوه؛ ثم عزيمةُ النبيِّ صلى الله عليه وسلم، وطلبُه من اللّٰه، فإذا اجتمعا لابدَّ أن ينزل الوحيُ على حسبه.

وللك عبرةٌ بأن اللّٰه ما أنزل كتاباً إلا بلسان قومه، وبما يفهمونه، ولا ألقى عليهم حكماً ولادليلاً إلا مما هو قريب من فَهْمِهم، كيف ، ومبدأُ الوحى اللطفُ، وإنما اللطفُ اختيارُ أقربِ ما يمكن هناك للإجابة.

ترجمہ:(۱) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:............ میں کہتا ہوں: اس کا یعنی" ہاں" کہنے پر ہر سال حج فرض ہونے کا راز یہ ہے کہ وہ امر جو کہ وہ تیار کرتا ہے وحی کے نزول کو خاص وقت کی تعیین کے ساتھ: وہ قوم کا متوجہ ہونا ہے اس وحی کی طرف۔اورقوم کے علوم اوران کی خصوصی توجہات کا قبولیت کے ساتھ استقبال کرنا ہے اس وحی کا۔اوراتنی مقدار کا ہونا ہی وہ تھا جولوگوں کے درمیان مشہور ہوگیا تھا،اوراس کولوگوں نے دست بدست لیا تھا —— پھر نبی ﷺ کا پختہ ارادہ اورآپ کی اللہ سے طلب ہے۔پس جب دونوں باتیں اکٹھا ہوجاتی ہیں تو ضروری ہے کہ اس طلب کے موافق وحی اترے۔

اورآپ کے لئے سبق ہے اس بات میں کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی کتاب نہیں اتاری مگر نبی کی قوم کی زبان میں۔اوراس طرح (اتاری ہے) کہ لوگ اس کو سمجھ سکیں۔اورنہیں ڈالا ان پر کوئی حکم اورنہ کوئی دلیل مگران احکام ودلائل میں سے جو

ان کے افہام سے قریب تھے۔ کیسے؟ (اس کے خلاف ہوسکتا ہے) درانحالیکہ وحی کا مدار مہربانی پر ہے۔ اور مہربانی صرف اس چیز کو اختیار کرنا ہے جو کہ وہ زیادہ نزدیک ہے اس چیز سے جو وہاں جواب دینے کے لئے ممکن ہے یعنی جس سے جواب دیا جاسکتا ہے۔

☆ ☆ ☆

اختلافِ اعتبار سے فضیلت مختلف ہوتی ہے

(دو حدیثوں میں رفع تعارض)

حدیث —— رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا: کونسا عمل افضل ہے؟ فرمایا: ''اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لانا'' پوچھا گیا: پھر کونسا؟ فرمایا: ''راہِ خدا میں جہاد کرنا'' پوچھا گیا: پھر کونسا؟ فرمایا: ''مقبول حج'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۵۰۶)

دوسری روایت: میں ہے کہ: ''کیا میں تم کو نہ بتلاؤں تمہارے اعمال میں سے بہتر، تمہارے شہنشاہ کے نزدیک پاکیزہ تر، تمہارے درجوں کو بہت بلند کرنے والا، راہ خدا میں سونا چاندی خرچ کرنے سے بھی بہتر اور تمہارے لئے اس جہاد سے بھی بہتر جس میں تم اپنے دشمنوں سے بھڑو، پھر تم ان کی گردنیں مارو اور وہ تمہاری گردنیں ماریں؟'' صحابہ نے عرض کیا: کیوں نہیں! فرمایا: ''وہ اللہ کا ذکر ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۲۶۹ باب ذکر اللہ عزوجل والتقرب إلیہ)

تشریح: ان روایات میں تعارض ہے۔ پہلی روایت میں افضل اعمال ایمان کو قرار دیا ہے اور دوسری میں ذکر اللہ کو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اعتبار کے اختلاف سے فضیلت مختلف ہوتی ہے۔ پہلی روایت میں اس اعتبار سے اعمال میں تفاضل کا بیان ہے کہ دین کی شان بلند کرنے والے اور شعائر اللہ کو غالب کرنے والے اعمال کیا ہیں؟ اور ان کی درجہ بندی کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے اعمال میں اول نمبر اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لانے کا ہے۔ اسی سے دین کا آوازہ بلند ہوتا ہے اور دنیا میں دین پھیلتا ہے اور رسول کا جو شعائر اللہ میں سے ہیں غلبہ قائم ہوتا ہے۔ پھر اس مقصد کی تکمیل میں ایمان کے بعد جہاد اور حج ہی کا نمبر ہے۔ اور دوسری روایت میں تہذیبِ نفس یعنی خود کو سنوارنے کے اعتبار سے افضل اعمال کا بیان ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ اللہ کا ذکر ہی ہے۔

[۲] وقيل: أيُّ الأعمال أفضلُ؟ قال: "إيمانٌ بالله ورسوله" قيل: ثم ماذا؟ قال: "الجهادُ في سبيل الله" قيل: ثم ماذا؟ قال: "حَجٌّ مبرورٌ" ولا اختلاف بينه وبين قوله صلى الله عليه وسلم في فضل الذكر: "ألا أنبئكم بأفضل أعمالكم؟" لأن الفضل يختلف باختلاف الاعتبار، والمقصودُ ههنا بيانُ الفضل باعتبار تنويهِ دينِ اللهِ، وظهورِ شعائر اللهِ، وليس بهذا الاعتبار بعد الإيمان كالجهاد والحج.

ترجمہ: (۲) پہلی روایت اور دوسری روایت کے درمیان کچھ اختلاف نہیں، اس لئے کہ فضیلت مختلف ہوتی ہے اعتبار کے اختلاف سے۔ اور مقصود یہاں یعنی پہلی روایت میں فضیلت کا بیان ہے اللہ کے دین کی شان بلند کرنے اور شعائر اللہ کے غلبہ کے اعتبار سے۔ اور اس اعتبار سے ایمان کے بعد جہاد اور حج جیسا کوئی عمل نہیں ہے۔

نوٹ: دوسری حدیث میں بخیر أعمالکم ہے۔ بأفضلِ أعمالکم کسی روایت میں نظر سے نہیں گذرا۔ مگر مطلب ایک ہے۔

☆ ☆ ☆

حج اور عمرہ کے کفارۂ سیئات اور دخولِ جنت کا سبب ہونے کی وجہ

حدیث —— (۱) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس نے اللہ کے لئے حج کیا، پس نہ تو اس نے شہوانی باتیں کیں، نہ ہی کوئی اور گناہ کا کام کیا، تو وہ ایسا لوٹے گا جیسا اس دن تھا جب اس کو اس کی ماں نے جنا تھا'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۵۰۷)

حدیث —— (۲) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ایک عمرہ دوسرے عمرے تک کفارہ ہے ان گناہوں کا جو درمیان میں ہوئے ہیں۔ اور حج مقبول کا جنت کے علاوہ کوئی بدلہ نہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۵۰۸)

حدیث —— (۳) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''حج اور عمرہ پے در پے کیا کرو۔ کیونکہ وہ دونوں محتاجگی اور گناہوں کو اس طرح دور کرتے ہیں جیسے بھٹّی: لوہے، سونے اور چاندی کا میل دور کرتی ہے اور حج مقبول کا صلہ تو بس جنت ہی ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۵۲۴)

تشریح: شعائر اللہ (بیت اللہ) کی تعظیم اور رحمتِ الٰہی کے سمندر میں غوطہ زن ہونا گناہوں کو مٹاتا ہے اور جنت میں پہنچاتا ہے۔ اور حج مقبول اور پے در پے حج اور عمرہ کرنا (یعنی حج کرے پھر عمرہ کرے، پھر حج کرے پھر عمرہ کرے، وہکذا) اور عمرہ کی کثرت چونکہ اللہ کی رحمت کے درپے ہونے والے اعمال کی ایک کافی مقدار تھی اس لئے ان دونوں کے لئے مذکورہ ثواب ثابت کیا ہے —— اور رَفَث وفسوق سے بچنے کی شرط اس لئے لگائی ہے کہ رحمتِ الٰہی کے سمندر میں غوطہ زن ہونا متحقق ہو۔ کیونکہ جو شخص احرام میں بیوی سے مذاق کرتا ہے یا کوئی اور گناہ کرتا ہے، اس سے رحمت الٰہی منہ پھیر لیتی ہے اور رحمت اس کے حق میں مکمل نہیں ہوتی، اس لئے وہ مذکورہ ثواب سے محروم رہتا ہے۔

[۳] قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: '' من حَجَّ للّٰہ فلم یرفُث ولم یفسُق رجع کیوم ولدتْہ أُمُّہ'' وقال علیہ السلام: العمرۃُ إلی العمرۃ کفارۃٌ لِمَا بینہما، والحجُّ المبرور لیس لہ جزاءٌ إلا الجنۃُ'' وقال علیہ السلام: '' تابِعوا بین الحج والعمرۃ''

أقول: تعظیمُ شعائر اللّٰہ والخوضُ فی لُجَّۃِ رحمۃِ اللّٰہ یکفِّر الذنوب ویُدخِل الجنۃ؛ ولما

كان الحج المبرور، والمتابَعَةُ بين الحج والعمرة، والإكثارُ منها نصاباً صالحاً لتعرُّض رحمته: أثبتَ لهما ذلك؛ وإنما شَرَطَ تركَ الرفث والفسقِ ليتحقق ذلك الخوضُ، فإن من فَعَلَهما أعرضت عنه الرحمةُ، ولم تَكْمُلْ في حقه.

ترجمہ: واضح ہے۔اور الإكثار منها میں تمام نسخوں میں واحد مؤنث کی ضمیر ہے۔مگر ممکن ہے یہ تصحیف ہو اور صحیح منهما ہو اور مراد حج وعمرہ ہوں۔واللہ اعلم۔

☆　☆　☆

رمضان کا عمرہ حج کے برابر ہونے کی وجہ

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بیشک رمضان میں عمرہ حج کے برابر ہے'' (مشکوۃ حدیث ۲۵۰۹)

تشریح: عمرہ چھوٹا حج ہے۔کیونکہ حج میں دو باتیں جمع ہوتی ہیں: ایک: شعائر اللہ کی تعظیم دوسری: لوگوں کا اجتماعی طور پر اللہ کی رحمت کے نزول کو طلب کرنا۔اور عمرہ میں صرف پہلی بات پائی جاتی ہے،اس لئے اس کا درجہ حج سے فروتر ہے۔ مگر رمضان کے عمرہ میں دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔کیونکہ رمضان میں نیکوکاروں کے انوار ایک دوسرے پر پلٹتے ہیں۔ اور روحانیت کا نزول ہوتا ہے (اور اب تو رمضان میں عمرہ کے لئے حج ہی کی طرح لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے) اس لئے رمضان کے عمرہ کو حج کے برابر گردانا گیا ہے۔

[٤] وقال النبي صلى الله عليه وسلم: ''إن عمرةً في رمضانَ تَعدِل حجَّةً''

أقول: سرُّه: أن الحج إنما يفضُل العمرةَ بأنه جامع بين تعظيم شعائر الله واجتماع الناس على استنزال رحمة الله، دونها، والعمرةُ في رمضان تفعل فعلَه، فإن رمضان وقتُ تعاكُس أضواء المحسنين، ونزول الروحانية.

ترجمہ: (۴) میں کہتا ہوں: اس کی یعنی برابر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حج کو عمرہ پر اس لئے برتری حاصل ہے کہ وہ جامع ہے شعائر اللہ کی تعظیم اور اللہ کی رحمت کا نزول طلب کرنے کے لئے لوگوں کے اکٹھا ہونے کے درمیان نہ کہ عمرہ یعنی عمرہ میں یہ دونوں باتیں جمع نہیں ہوتیں،صرف شعائر اللہ کی تعظیم پائی جاتی ہے۔اور رمضان کا عمرہ وہی کام کرتا ہے جو حج کرتا ہے۔پس بیشک رمضان نیکوکاروں کے انوار کے ایک دوسرے پر پلٹنے کا اور روحانیت کے نزول کا وقت ہے۔

☆　☆　☆

استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے والے کے لئے ایک خاص وعید کا راز

حدیث —— میں ہے کہ: ''جس کے پاس سفر حج کا خرچ ہو اور ایسی سواری بھی میسر ہو جو بیت اللہ تک اس کو پہنچا سکے پھر بھی وہ حج نہ کرے تو اس کے حق میں کچھ فرق نہیں کہ وہ یہودی ہو کر یا عیسائی ہو کر مرے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اللہ کے لئے لوگوں پر بیت اللہ کا قصد کرنا لازم ہے، ان پر جو اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں، اور جس نے انکار کیا، تو (جان لے کہ) اللہ ساری کائنات سے بے نیاز ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۵۲۱)

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ حج فرض ہونے کے باوجود حج نہ کرنے والا گویا ملت سے خارج ہے۔ کیونکہ حج: اسلام کا ایک رکن ہے۔ اور ارکانِ اسلام میں سے کسی بھی رکن کا چھوڑنا گویا ملت سے نکل جانا ہے۔ حدیث میں ہے: من ترك الصلاة متعمِّدًا فقد كفر: جو جان بوجھ کر یعنی بغیر شرعی عذر کے نماز نہیں پڑھتا، اس نے یقیناً دین اسلام کا انکار کر دیا۔

اور اس حدیث میں حج نہ کرنے والوں کو یہود و نصاریٰ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ اور سورۃ الروم آیت ۳۱ میں نماز چھوڑنے والوں کو مشرکین کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے ﴿وَأَقِيْمُوْا الصَّلٰوةَ وَلَاتَكُوْنُوا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ نماز پڑھتے تھے اور حج نہیں کرتے تھے اور مشرکین عرب حج کرتے تھے اور نماز نہیں پڑھتے تھے۔ اس لئے حج نہ کرنا یہود و نصاریٰ کا وتیرہ اور نماز نہ پڑھنا مشرکوں والا عمل قرار دیا گیا ہے۔

[٥] وقال النبي صلى الله عليه وسلم: '' من ملك زادًا وراحلةً تُبلِّغُه إلى بيت الله، ولم يَحُجَّ، فلا عليه أن يموت يهوديًا أو نصرانيًا''

أقول: تركُ ركنٍ من أركان الإسلام يُشَبَّهُ بالخروج عن الملة؛ وإنما شُبِّهَ تاركُ الحج باليهودي والنصراني، وتاركُ الصلاة بالمشرك: لأن اليهود والنصارى يصلون ولايحجون، ومشركو العرب يحجون ولا يصلون.

ترجمہ: (۵) اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا: .... میں کہتا ہوں: اسلام کے ارکان میں سے کسی بھی رکن کا چھوڑنا ملت سے خروج کے ساتھ تشبیہ دیا جاتا ہے۔ اور حج نہ کرنے والا یہودی اور عیسائی کے ساتھ اور نماز نہ پڑھنے والا مشرک کے ساتھ اسی لئے تشبیہ دیا گیا ہے کہ یہود و نصاریٰ نماز پڑھتے ہیں، اور حج نہیں کرتے تھے اور عرب کے مشرکین حج کرتے تھے اور نماز نہیں پڑھتے تھے۔

حج کے پانچ مسائل اور ان کی حکمتیں

حدیث —— میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ حاجی کی شان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

''وہ سرغبار آلود اور پراگندہ بال ہوتا ہے اور اس کے بدن سے پسینے اور میل کی بو آتی ہے'' ـــــ پھر ایک اور شخص اٹھا اور اس نے پوچھا کہ (ارکانِ حج کے بعد) کونسی چیزیں حج میں بہت ثواب رکھتی ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''بلند آواز سے تلبیہ پڑھنا اور قربانی کرنا'' ـــــ پھر ایک اور شخص اٹھا اور اس نے دریافت کیا کہ کلام اللہ میں جو حج کی آیت میں: ﴿مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلاً﴾ آیا ہے، تو سبیل سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: ''توشہ اور سواری مراد ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۵۲۷)

حدیث ـــــ حضرت ابورَزین عُقیلی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میرے ابا بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ نہ حج کی طاقت رکھتے ہیں نہ عمرے کی اور نہ سوار ہونے کی: آپؐ نے فرمایا: ''اپنے باپ کی طرف سے حج اور عمرہ کرو'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۵۲۸)

تشریح: ان احادیث میں درج ذیل پانچ مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ ـــــ حاجی کی شان کیا ہونی چاہئے؟ ـــــ حاجی کو چاہئے کہ وہ اپنی ذات کو اللہ کے سامنے ذلیل کرے۔ زیب وزینت ترک کرے اور احرام کے تقاضوں کو پورا کرے۔ اگرچہ سر پراگندہ ہو جائے اور جسم سے بو آنے لگے۔

دوسرا مسئلہ ـــــ بلند آواز سے تلبیہ پڑھنے کی حکمت ـــــ حج میں جو مصلحتیں ملحوظ ہیں ان میں سے ایک مصلحت اللہ کا بول بالا کرنا ہے۔ اور زور سے تلبیہ پڑھنا اس مقصد کی تکمیل کرتا ہے۔ اس لئے اس کو بہترین عمل قرار دیا گیا ہے۔

تیسرا مسئلہ ـــــ حج میں قربانی کی اہمیت کی وجہ ـــــ حج میں دوسری مصلحت یہ ملحوظ رکھی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت کی ہمنوائی ہو۔ اور ان پر اللہ نے جو انعام کیا ہے اس کی یاد تازہ کی جائے۔ حج میں ہدی ذبح کرنے کی فضیلت اس مقصد کی تحصیل کے لئے ہے۔

چوتھا مسئلہ ـــــ حج کی فرضیت میں زاد وراحلہ کی شرط کیوں ہے؟ ـــــ یہ شرط اس لئے ہے کہ حج کی ادائیگی میں سہولت ہو۔ کیونکہ حج جیسی پُر مشقت عبادت میں آسانی کا لحاظ رکھنا بے حد ضروری ہے۔

پانچواں مسئلہ ـــــ حج بدل کی حکمت ـــــ پہلے جنائز کے بیان میں، اور میت کی طرف سے روزہ رکھنے کے بیان میں جو حکمت بیان کی گئی ہے اسی کو حج بدل میں بھی سمجھ لیا جائے۔

[٦] قيل: ماالحاجُّ؟ قال: "الشَّعِثُ التَّفِلُ" قيل: أيُّ الحج أفضل؟ قال: "العَجُّ والثَّجُّ" قيل: ما السبيل؟ قال: "زادٌ وراحلةٌ"

أقول: الحاجُّ من شأنه أن يذلِّلَ نفسَه لله، والمصلحةُ المرعية فى الحج إعلاء كلمة الله، وموافقةُ سنة إبراهيم عليه السلام، وتذكُّرُ نعمة الله عليه؛ ووُقِّتَ السبيلُ بالزاد والراحلة: إذ بهما يتحقق التيسير الواجبُ رعايتُه فى أمثال الحج من الطاعات الشاقة؛ وقد ذكرنا فى صلاة الجنازة والصوم عن الميت ما إذا عُطِفَ على الحج عن الغير: انعطف.

ترجمہ: (٦) (شاہ صاحب رحمہ اللہ نے صرف پہلی روایت ذکر کی ہے اور دوسری روایت جو مشکوٰۃ میں اس سے متصل

آئی ہے: اس کو ذکر کئے بغیر اس کی حکمت بیان کی ہے) میں کہتا ہوں: حاجی کی شان سے یہ بات ہے کہ وہ اپنی ذات کو اللہ کے لئے ذلیل کرے ـــــ اور وہ مصلحت جو حج میں ملحوظ رکھی گئی ہے: وہ اللہ کے بول کو بالا کرنا ہے اور ابراہیم علیہ السلام کی سنت کی ہمنوائی کرنا ہے اور ابراہیم علیہ السلام پر اللہ کی نعمت کو یاد کرنا ہے (اس میں دوسرے اور تیسرے مسئلہ کی حکمتیں ایک ساتھ بیان کردی ہیں) ـــــ اور سبیل کی زاد و راحلہ سے تعیین اس لئے کی گئی ہے کہ ان دونوں کے ذریعہ وہ آسانی متحقق ہوتی ہے جس کی رعایت حج جیسی پُر مشقت عبادت میں ضروری ہے ـــــ اور تحقیق ذکر کی ہے ہم نے نماز جنازہ اور میت کی طرف سے روزہ رکھنے کے بیان میں وہ بات کہ اگر اس کو دوسرے کی طرف سے حج کرنے پر موڑا جائے تو وہ مُڑ جائے۔

باب ـــــ ۲

حج وعمرہ کے ارکان وافعال کا بیان

صحابہ و تابعین اور تمام مسلمانوں سے شہرت کے ساتھ یہ بات مروی ہے کہ مناسک چار ہیں: تنہا حج، تنہا عمرہ، حج تمتّع یعنی ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ کرنا اور حج قِران یعنی ایک ہی ساتھ حج وعمرہ کرنا۔ تفصیل درج ذیل ہے:

① ـــــ حج کرنے کا طریقہ ـــــ حج کرنے کے دو طریقے ہیں: ایک: مکہ کے باشندوں کے لئے۔ خواہ وہ مکہ کے اصل باشندے ہوں یا حج تمتع کی نیت سے باہر سے آئے ہوں اور عمرہ کا احرام کھول کر مکہ ہی میں مقیم ہو گئے ہوں۔ دوسرا: آفاقی کے لئے یعنی میقات سے باہر رہنے والوں کے لئے حج کرنے کا طریقہ۔

مکہ سے حج کرنے کا طریقہ: یہ ہے کہ وہ مکہ ہی سے احرام باندھے، خواہ گھر میں سے باندھے یا مسجد حرام میں جا کر باندھے۔ اور احرام میں ان امور سے اجتناب کرے: (۱) جماع اور اس کے اسباب (بوس و کنار) سے (۲) سر منڈوانے سے (۳) ناخن ترشوانے سے (۴) سِلا ہوا کپڑا پہننے سے (۵) سر ڈھانکنے سے (۶) خوشبو لگانے سے (۷) شکار کرنے سے (۸) اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک نکاح کرنے سے۔ یہ آٹھ باتیں ممنوعاتِ احرام کہلاتی ہیں۔ اور ہر احرام میں ممنوع ہیں۔ پھر آٹھ ذی الحجہ کو منیٰ میں پہنچ جائے اور وہاں ظہر سے ۹ ذی الحجہ کی فجر تک پانچ نمازیں ادا کرے۔ پھر ۹ ذی الحجہ کی صبح کو وہاں سے عرفات کے لئے جائے۔ منی کا یہ قیام ضروری نہیں۔ سنت ہے۔ پس اگر کوئی مکہ سے ۹ ذی الحجہ کو سیدھا عرفات میں چلا جائے تو یہ بھی درست ہے۔ اور میدانِ عرفہ میں یوم عرفہ کی شام تک رہے۔ پھر وہاں سے غروب آفتاب کے بعد لوٹے اور مزدلفہ میں رات گذارے۔ اور فجر کی نماز کے بعد وقوف مزدلفہ کرے۔ پھر وہاں سے طلوع آفتاب سے پہلے منی کے لئے روانہ ہو جائے۔ منی میں پہنچ کر جمرۂ عقبہ کی رمی کرے۔ پھر قربانی ساتھ ہو تو اس کو ذبح کرے۔ یہ قربانی (مفرد کے لئے) سنت ہے، پھر احرام کھولدے: خواہ سر منڈوائے یا بال ترشوائے۔ پھر منی کے دنوں میں (۱۰-۱۲ ذی الحجہ میں) طوافِ

زیارت کرے اور اس کے بعد صفا ومروہ کے درمیان سعی کرے (اور اگر مکی نے حج کا احرام باندھ کر نفلی طواف کیا ہے۔ اور اس کے بعد سعی کر لی ہے تو اب طواف زیارت کے بعد سعی نہ کرے۔ پھر منیٰ میں قیام کرے اور روزانہ تینوں جمرات کی رمی کرے۔ ۱۲ کی رمی کے بعد حج مکمل ہو گیا، پھر اگر مکی ہے تو اس پر طوافِ وداع نہیں۔ اور آفاقی ہے تو بوقت روانگی طواف وداع کرے)

آفاق سے حج کرنے کا طریقہ: یہ ہے کہ میقات سے حج کا احرام باندھے۔ پھر اگر سیدھا عرفہ میں چلا جائے تو اس پر طوافِ قدوم نہیں۔ اور اگر وقوفِ عرفہ سے پہلے مکہ میں داخل ہو تو طوافِ قدوم کرے۔ یہ طواف سنت ہے اور اس میں رمل کرے اور اس کے بعد صفا ومروہ کے درمیان سعی کرلے۔ مگر سعی اسی وقت واجب نہیں۔ اس کو مؤخر بھی کرسکتا ہے یعنی طوافِ زیارت کے بعد بھی سعی کرسکتا ہے۔ پھر حالتِ احرام میں رہے یہاں تک کہ وقوف عرفہ کرے، اور ۱۰ ذی الحجہ کو رمی کرے اور سر منڈوا کر یا بال ترشوا کر احرام کھولدے۔ اس کے بعد طوافِ زیارت کرے۔ اور اس میں رمل اور اس کے بعد سعی نہ کرے (لیکن اگر طوافِ قدوم کے بعد سعی نہیں کی تو طواف کے بعد سعی بھی کرے)

② —— عمرہ کرنے کا طریقہ —— یہ ہے کہ اگر عمرہ کرنے والا حرم میں ہے تو حرم سے باہر نکلے اور حِلّ سے عمرہ کی نیت سے احرام باندھے۔ اور اگر آفاقی ہے یعنی میقات کے باہر رہنے والا ہے تو میقات سے احرام باندھے، اور حِلّی ہے تو اپنے گھر سے یا حرم میں داخل ہونے سے پہلے احرام باندھے۔ پھر طواف اور سعی کرے اور احرام کھولدے یعنی سر منڈوا دے یا بال ترشوا دے۔ عمرہ مکمل ہو گیا۔

③ —— حج تمتع کا طریقہ —— یہ ہے کہ آفاقی حج کے مہینوں میں یعنی شوال کا چاند نظر آنے کے بعد عمرہ کا احرام باندھے۔ پھر مکہ پہنچے اور اپنا عمرہ پورا کرے اور احرام کھول دے۔ پھر حلال ہونے کی حالت میں مکہ میں مقیم رہے یعنی وطن نہ لوٹے۔ پھر ۸/ذی الحجہ کو مکہ ہی سے حج کا احرام باندھ کر حج ادا کرے۔ متمتع پر قربانی واجب ہے۔ جو ہدی میسر ہو اس کو ذبح کرے۔

④ —— حج قران کا طریقہ —— یہ ہے کہ آفاقی میقات سے حج اور عمرہ کا ایک ساتھ احرام باندھے۔ پھر احناف کے نزدیک: مکہ پہنچ کر پہلے طوافِ قدوم کرے۔ یہ سنت ہے۔ پھر عمرہ کا طواف کرے اور اس کے بعد عمرہ کی سعی کرے۔ یہ افعال عمرہ ہیں۔ پھر احرام کی حالت میں مکہ میں ٹھہرا رہے اور نفلی طواف وغیرہ عبادات کرتا رہے پھر حج کرے اور وقوفِ عرفہ کے بعد طوافِ زیارت کرے اور اس کے بعد حج کی سعی کرے۔ یہ حج کا طواف اور سعی ہیں۔ پس قارن پر احناف کے نزدیک دو طواف اور دو سعی لازم ہیں ایک: عمرہ کا طواف اور سعی دوسرا: حج کا طواف اور سعی۔

اور ائمۂ ثلاثہ کے نزدیک قارن مکہ میں پہنچ کر صرف طواف قدوم کرے۔ یہ سنت طواف ہے۔ پھر احرام کی حالت میں ٹھہرا رہے۔ یہاں تک کہ حج کے افعال سے فارغ ہو۔ وہ جو طواف زیارت کرے گا اور اس کے بعد سعی کرے گا وہی عمرہ اور حج دونوں کے لئے محسوب ہونگے۔ ائمۂ ثلاثہ کے نزدیک دونوں کے افعال میں تداخل ہو جاتا ہے۔ قارن پر بھی قربانی واجب ہے۔ پس جو ہدی میسر ہو اس کو ذبح کرے۔

طواف وَداع: پھر جب حاجی مکہ سے واپس لوٹنے کا ارادہ کرے تو طواف وداع کرے۔ یہ طواف واجب ہے۔ مگر جو عورت واپسی کے وقت ماہواری میں ہو اس پر واجب نہیں۔ وہ طواف وَداع کئے بغیر بھی وطن لوٹ سکتی ہے۔

فائدہ: جو مکہ کا اصلی باشندہ ہے اور مکہ سے حج کرتا ہے وہ تمتع اور قران نہیں کرسکتا۔ وہ صرف حج کرے گا۔ اور اس پر قربانی اور طواف وداع واجب نہیں۔

نوٹ: آگے پورے باب میں حج وعمرہ کے ارکان وافعال کی حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔ اس کی تمہید کے لئے یہ مضمون بیان کیا گیا ہے۔

﴿صفة المناسك﴾

اعلم أن المناسك ـــ على ما استفاض من الصحابة، والتابعين، وسائرِ المسلمين ـــ أربعة: حجٌّ مفرَدٌ، وعمرة مفردة، وتمتع، وقِرَان:

فالحج:

[۱] لحاضر مكة: أن يُحرِمَ منها، ويَجتنبَ فى الإحرام الجماعَ ودواعيه، والحلقَ، وتقليمَ الأظفار، ولُبْسَ المَخِيْطِ، وتغطيةَ الرأس، والتطيُّبَ، والصيدَ، ويجتنبَ النكاحَ على قول، ثم يخرج إلى عرفاتٍ، ويكونُ فيها عَشِيَّةَ عرفةَ، ثم يرجعَ منها بعد غروب الشمس، ويَبيتُ بمزدلفة، ويَدْفَعَ منها قبل شُروق الشمس، فيأتِيَ منى، ويرمِيَ العقبةَ الكبرى، ويُهْدِيَ إن كان معه، ويَحْلِقَ أو يَقْصِرَ، ثم يطوفَ للإفاضة فى أيام منى، ويسعى بين الصفا والمروة.

[۲] وللآفاقى: أن يُحرمَ من الميقات، فإن دخل مكة قبل الوقوف طاف للقدوم، ورمل فيه، وسعى بين الصفا والمروة، ثم بقى على إحرامه حتى يقوم بعرفة، ويرمِيَ، ويحلقَ ويطوفَ، ولا رملَ ولاسعيَ حينئذ.

والعمرةُ: أن يُحرم من الحِلِّ، فإن كان آفاقياً فمن الميقات، فيطوفُ ويسعىٰ، ويحلقُ أو يقصر.

والتمتع: أن يحرم الآفاقى للعمرة فى أشهر الحج، فيدخلَ مكة، ويتمَّ عمرتَه، ويخرجَ من إحرامه، ثم يبقى حلالاً حتى يَحُجَّ، وعليه أن يذبح ما استيسر من الهدى.

والقِران: أن يحرم الآفاقى بالحج والعمرة معاً، ثم يدخلَ مكة، ويبقى على إحرامه حتى يفرغ من أفعال الحج، وعليه أن يطوف طوافاً واحدًا ويسعى سعيا واحدًا فى قول، وطوافَيْن وسَعْيَيْنِ فى قول، ثم يذبح ما استيسر من الهدى. فإذا أراد أن يَنْفِرَ من مكة طاف للوداع.

ترجمہ: واضح ہے...... العقبة الكبرى کے بجائے مشہور تعبیر الجمرة العقبة ہے یعنی مزدلفہ کی طرف سے منی کا

’’آخری پتھر‘‘ ...... حِلّ: حرم اور میقات کے درمیان کا حصہ...... دوسری جگہ فی قولٍ: مخطوطہ کراچی سے بڑھایا ہے۔

☆ ☆ ☆

احرام وتلبیہ کی حکمتیں

احرام اور تلبیہ میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب حج یا عمرہ کی نیت کر کے تلبیہ پڑھا جاتا ہے تو احرام شروع ہو جاتا ہے۔ اور افعال کی ادائیگی تک باقی رہتا ہے۔ آخر میں اس کو باقاعدہ کھولنا پڑتا ہے۔ جیسے نماز کی نیت کر کے جب تکبیر تحریمہ کہی جاتی ہے تو نماز شروع ہو جاتی ہے۔ اور نماز کے آخر تک تحریمہ باقی رہتا ہے۔ آخر میں سلام کے ذریعہ تحریمہ ختم کیا جاتا ہے۔ پس حج اور عمرہ کے احرام میں تلبیہ کی حیثیت ایسی ہے جیسی نماز میں تکبیر تحریمہ کی۔ پھر احرام اُسی طرح مستمر رہتا ہے جس طرح تحریمہ مستمر رہتا ہے۔ اور احرام وتلبیہ کی چار حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت ـــــ تلبیہ کے ذریعہ حج اور عمرہ کے عمل کو اللہ تعالیٰ کے لئے خالص کیا جاتا ہے۔ اور اللہ کی عظمت وکبریائی کی زمزمہ خوانی کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے: ’’میں حاضر ہوں، خدایا! میں حاضر ہوں۔ میں بار بار حاضر ہوں۔ آپ کا کوئی شریک نہیں (یعنی میں صرف آپ کی بارگاہ میں حاضری دے رہا ہوں) میں آپ کے حضور میں آرہا ہوں۔ تمام حمد وستائش، تمام نعمتیں اور کائنات کی فرمانروائی، بیشک وشبہ آپ ہی کے لئے ہے۔ آپ کا کوئی شریک وسہیم نہیں!‘‘ یہ تلبیہ کا ترجمہ ہے۔ غور کریں کس طرح اخلاص وعظمت کا نقشہ کھینچا گیا ہے!

دوسری حکمت ـــــ نیت: دل کے پختہ ارادہ کا نام ہے۔ پھر اگر زبان سے بھی نیت کے الفاظ کہہ لے تو بہتر ہے۔ اس سے دل اور زبان میں موافقت ہو جاتی ہے اسی طرح احرام وتلبیہ کے ذریعہ حج وعمرہ کے پختہ ارادے کا ایک محسوس فعل کے ذریعہ انضباط (تعیین) کرنا مقصود ہے۔ یعنی قول وفعل کے ذریعہ اس نیت کو امر محسوس بنایا جاتا ہے۔

تیسری حکمت ـــــ احرام کے ذریعہ نفس کو اللہ تعالیٰ کے سامنے خاکساری اور فروتنی کرنے والا بنایا جاتا ہے۔ جب آدمی احرام باندھ لیتا ہے۔ وطن کی آسائشوں کو تج کر چل دیتا ہے۔ اپنی مالوف اور پیاری عادتوں کو چھوڑ دیتا ہے اور زیب وزینت کی تمام شکلوں کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے اور فقیروں اور محتاجوں کی صورت بنا لیتا ہے تو اس سے خوب بندگی اور فروتنی ظاہر ہوتی ہے۔

چوتھی حکمت ـــــ تھکاوٹ، پراگندگی اور خاک آلود ہونا حاجی کی شان ہے۔ سورۃ الحج کی آیت ۲۷ ہے: ﴿وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ، يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ، يَاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ﴾ یعنی لوگوں میں حج کا اعلان کیجئے، لوگ آپؐ کے پاس پیادہ اور دُبلی اونٹنیوں پر آئیں گے۔ جو دور دراز سے پہنچی ہونگی۔ اور سوار کا حال سواری سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ پس یہ آیت حاجی کے تعب ودرماندگی پر دلالت کرتی ہے۔ اور ابھی حدیث گذری ہے کہ حاجی الشَّعِثُ التَّفِلُ ہوتا ہے یعنی وہ

پراگندہ سر ہوتا ہے اور اس کے بدن سے پسینے اور میل کی بو آتی ہے۔ یہ تینوں بہترین حالتیں احرام کے ذریعہ متحقق ہوتی ہیں۔

أقول: اعلم:

[۱] أن الإحرام فی الحج والعمرة بمنزلة التکبیر فی الصلاة، فیه تصویرُ الإخلاص والتعظیم، وضبطُ عزیمةِ الحج بفعلٍ ظاهر، وفیه جعلُ النفسِ متذللةً للّٰه بترك الملاذِّ، والعاداتِ المألوفة، وأنواعِ التجمل، وفیه تحقیقُ معاناة التعب، والتَّشَعُّثِ، والتَّغَبُّرِ للّٰهِ.

ترجمہ: میں کہتا ہوں: جان لیں: (۱) کہ حج اور عمرہ میں احرام بمنزلہ نماز میں تکبیر تحریمہ کے ہے۔ (یہ غایت درجہ ایجاز ہے۔ مفصل بات وہ ہے جو اوپر عرض کی گئی) (۱) اس (تلبیہ) میں اخلاص اور تعظیم کا نقشہ کھینچنا ہے (۲) اور حج کی نیت کو منضبط کرنا ہے ایک محسوس فعل کے ذریعہ (۳) اور اس (احرام) میں نفس کو اللہ کے لئے خاکساری کرنے والا بنانا ہے۔ لذت کی جگہوں (وطن) اور پیاری عادتوں اور زینت کی شکلوں کو چھوڑنے کے ذریعہ (۴) اور اس میں تعب برداشت کرنے کو اور پراگندہ سری کو اور خاک آلود ہونے کو متحقق کرنا ہے۔

نوٹ: جس طرح گذشتہ باب کے آخر میں شاہ صاحب نے حج بدل کی روایت لکھے بغیر اس کی حکمت بیان کی ہے۔ اسی طرح یہاں تلبیہ کا تذکرہ کئے بغیر احرام وتلبیہ کی حکمتیں بیان کی ہیں۔

☆　☆　☆

ممنوعاتِ احرام کی حکمتیں

محرم کے لئے ممنوعاتِ احرام سے بچنا تین وجوہ سے ضروری ہے:

پہلی وجہ ـــــــ حج وعمرہ میں خاکساری، ترکِ زینت اور پراگندہ سری مطلوب ہے۔ اور یہ مقاصد ممنوعاتِ احرام سے بچنے ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

دوسری وجہ ـــــــ حج وعمرہ میں اللہ کا خوف اور اس کی تعظیم کا احساس ضروری ہے۔ اور یہ احساس بھی ممنوعات سے بچنے پر موقوف ہے۔

تیسری وجہ ـــــــ ممنوعاتِ احرام سے بچنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ آدمی اپنے نفس کی پکڑ کر سکے اور اس کو پابند بنا سکے تاکہ وہ اپنی خواہش میں بے لگام نہ ہو جائے۔

یہ ممنوعاتِ احرام سے اجتناب کی عام حکمتیں ہیں۔ آگے ہر ممنوع امر سے بچنے کی خاص وجہ بیان فرماتے ہیں:

(الف) **شکار کی ممانعت کی وجہ:** شکار کرنا دل بہلانا اور ایک طرح کی تفریح ہے۔ اس لئے احرام میں اس لغو مشغلہ

سے احتراز ضروری ہے۔اور شکار کے کھیل ہونے کی دلیل یہ حدیث شریف ہے: مَن اتَّبَعَ الصیدَ غَفَلَ یعنی جو شکار کے پیچھے پڑا (جس کو شکار کا چَر کا لگ گیا) وہ غافل ہوا یعنی اہم مشاغل سے بے خبر ہو گیا (ابوداؤد حدیث ۲۸۵۹ کتاب الصید) اسی لئے نبی ﷺ سے اور کبارِ صحابہ سے شکار کرنا ثابت نہیں۔ کیونکہ یہ بے کار کام ان اکابر کے شایانِ شان نہیں۔اگر چہ غیر احرام میں شکار کرنا جائز ہے۔سورۃ المائدہ کی دوسری آیت میں ہے: ﴿وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا﴾ یعنی جب تم احرام سے باہر آجاؤ تو شکار کرو یعنی شکار کرنا مباح ہے۔ کیونکہ وہ ایک ذریعۂ معاش بھی ہے چنانچہ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے شکار کرنا مروی ہے۔

(ب) جماع ممنوع ہونے کی وجہ: جماع بہیمیت کے تقاضوں میں منہمک ہونا ہے۔مگراس کو بالکلیہ ممنوع بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ یہ شریعت کے موضوع کے خلاف ہے۔شریعت فطری تقاضوں کو پامال نہیں کرتی۔ بلکہ ان کے لئے مناسب راہیں تجویز کرتی ہیں۔پس کم از کم بعض احوال میں اور بعض اماکن میں اس کی ممانعت ضروری ہے۔چنانچہ احرام،اعتکاف،روزوں اور مساجد میں اس کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

(ج) سلا ہوا کپڑا ممنوع ہونے کی وجہ: رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ محرم کیا کپڑے پہن سکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''کرتے،عمامے،پاجامے،بارانی کوٹ اور موزے نہ پہنے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۶۷۸) اور ایک بدوی سے جس نے عمرہ کا احرام باندھ رکھا تھا اور جبّہ پہن رکھا تھا اور خوشبو میں بسا ہوا تھا فرمایا کہ: ''تیرے بدن پر جو خوشبو لگی ہوئی ہے اس کو تین بار دھو ڈال اور جبّہ اتار دے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۶۸۰) ان دونوں روایتوں سے ثابت ہوا کہ باقاعدہ جسم کی وضع پر سِلا ہوا یا بُنا ہوا کپڑا احرام میں ممنوع ہے۔ بے سلا کپڑا پہننا ضروری ہے۔اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ اول انتفاع،تجمل (زیبائش) اور زینت ہے جو احرام کے موضوع کے خلاف ہے اس کے ترک ہی میں اللہ کے لئے فروتنی ہے اور ثانی ستر پوشی ہے جو ضروری ہے۔ننگا بارگاہِ بے نیاز میں پہنچنا بے ادبی اور گستاخی ہے۔

(د) احرام میں نکاح ممنوع ہونے کی وجہ: نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''محرم نہ تو اپنا نکاح پڑھے،نہ دوسرے کا نکاح پڑھائے،اور نہ منگنی بھیجے'' (رواہ مسلم مشکوٰۃ حدیث ۲۶۸۱) اور متفق علیہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے حالتِ احرام میں نکاح کیا (مشکوٰۃ حدیث ۲۶۸۲)

تشریح: مذکورہ روایات میں تعارض کی وجہ سے علماء میں اختلاف ہوا ہے: فقہائے حجاز کے نزدیک احرام کی حالت میں نہ نکاح پڑھنا جائز ہے،نہ پڑھانا۔نکاح منعقد ہی نہ ہوگا۔اسی مسلک کو ائمہ ثلاثہ نے اختیار کیا ہے۔اور فقہائے عراق کے نزدیک نکاح جائز ہے یعنی منعقد ہو جائے گا (مگر احرام کی حالت میں نکاح پڑھنا اور پڑھانا مکروہ ہے۔اور نکاح کے بعد جماع اور دواعئ جماع حرام ہیں) احناف نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہر شخص جانتا ہے کہ احتیاط پر عمل کرنا اولی ہے۔ کیونکہ ضابطہ ہے کہ اگر مذہب کا

مکروہ لازم نہ آئے تو اختلاف کی رعایت اَولی ہے۔ پس اس قاعدہ کی رو سے بہتر یہ ہے کہ احرام کی حالت میں نہ نکاح پڑھے، نہ دوسرے کا پڑھائے۔

پہلے قول کے موافق ممانعت کی وجہ: یہ ہے کہ نکاح دنیوی امور سے ایسا انتفاع ہے جو شکار کرنے سے بڑھ کر ہے۔ پس جب احرام میں شکار کرنا ممنوع ہوا تو نکاح بدرجۂ اولی ممنوع ہوگا۔ اور حالتِ ابتداء کو حالتِ بقا پر قیاس کرنا درست نہیں یعنی یہ خیال کرنا کہ جب احرام باندھنے کے بعد بھی بیوی نکاح میں رہ سکتی ہے تو نکاح کرنے میں کیا حرج ہے؟ یہ خیال اس لئے درست نہیں کہ ابتدائے نکاح میں خوشی اور شادمانی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے لفظ ''دلہن'' سے مثالیں بیان کی جاتی ہیں۔ قبر میں فرشتے کہیں گے: **نَمْ کنومةِ العَروس** یعنی دلہن کی طرح سو جا۔ اور کہا جاتا ہے: **لاعِطْرَ بعدَ عَروس**: شادی نمٹ گئی، اب عطر لگانے سے کیا فائدہ! اور حالتِ بقا میں ایسی خوشی نہیں ہوتی۔ پس دونوں باتیں یکساں نہیں۔ اور ایک کا دوسرے پر قیاس درست نہیں۔

فائدہ: یہ مسئلہ قیاس پر مبنی نہیں۔ بلکہ اختلاف کا مدار نص فہمی اور دلائل میں تطبیق کے اختلاف پر ہے یعنی:

ایک رائے میں: پہلی روایت میں نفی حقیقی ہے یعنی انعقادِ نکاح کی نفی ہے اور دوسری روایت کی توجیہ یہ ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کا پتہ لوگوں کو اس وقت چلا تھا جب آپؐ احرام باندھ چکے تھے، ورنہ نکاح حلال ہونے کی حالت میں ہوا تھا۔ جیسا کہ مسلم شریف میں خود حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے صراحۃً یہ بات مروی ہے کہ ان کا نکاح حلال ہونے کی حالت میں ہوا تھا (مشکوۃ حدیث ۲۶۸۳)

اور دوسری رائے میں: پہلی روایت میں کمال کی نفی ہے یعنی نکاح تو ہو جائے گا مگر یہ فعل مکروہ ہے۔ ان حضرات کے دلائل درج ذیل ہیں:

(۱) **لایَخْطُب** میں بالاتفاق کمال کی نفی ہے۔ اور صحیح ابن حبان میں: **ولایُخْطَب علیه** بھی ہے یعنی محرم کی منگنی نہ بھیجی جائے۔ اس میں بھی بالاتفاق کمال کی نفی ہے۔ کیونکہ اگر احرام میں منگنی بھیجی گئی، پھر حلال ہونے کے بعد نکاح ہوا تو یہ نکاح بالاتفاق درست ہے۔ مگر احرام کی حالت میں منگنی بھیجنا بالاتفاق مکروہ ہے۔ پس یہ ایک قرینہ ہے کہ حدیث کے پہلے دو جملوں میں بھی کمال ہی کی نفی ہے۔

(۲) احرام میں حلّتِ نکاح کی روایت متفق علیہ ہے اور ممانعت کی روایت صرف مسلم شریف میں ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو نہیں لیا۔ اور اصول حدیث میں یہ بات طے ہے کہ متفق علیہ روایت **ما انفرد به أحدُهما** سے مقدم ہوتی ہے اور اقوی ما فی الباب کو اختیار کرنا مجتہدین کا متفق علیہ اصول ہے۔

(۳) واقعات کی ترتیب میں غور کیا جائے تو صحیح صورت یہ ہے کہ آپؐ کا نکاح حالت احرام میں مقام سَرِف میں ہوا تھا۔ مگر اس کا پتہ لوگوں کو اس وقت چلا تھا جب آپؐ نے عمرہ سے فارغ ہو کر مشرکین مکہ کو ولیمہ کی دعوت بھیجی تھی، جس کو

انھوں نے ٹھکرادیا تھا۔

(۵) شکار کیا ہے؟ شکار کی تعریف کسی نص سے ثابت نہیں۔ اس لئے اس کی تعیین ضروری ہے:

سوال: انسان کبھی کسی جانور کو کھانے کے لئے مارتا ہے، کبھی شکار کی تمرین کے لئے مارتا ہے، کبھی اس کے ضرر سے بچنے کے لئے یا دوسروں کو بچانے کے لئے مارتا ہے اور کبھی پالتو جانوروں کو کھانے کے لئے ذبح کرتا ہے، تو ان میں سے شکار کونسا ہے؟

جواب: حدیث میں ہے کہ: ''اس شخص پر کوئی گناہ نہیں جو پانچ جانوروں کو حرم میں یا احرام میں قتل کرتا ہے: چوہا، کوّا، چیل، بچھو اور کٹ کھنا کتّا'' (مشکوۃ حدیث ۲۶۹۸) فقہاء نے اس سے یہ قاعدہ بنایا ہے کہ جو جانور ایذاء پہنچاتا ہے، یا انسان پر یا اس کے سامان پر حملہ کرتا ہے اس کو قتل کرنا درست ہے۔ کیونکہ عرف میں ان جانوروں کے قتل کرنے کو شکار کرنا نہیں کہا جاتا۔ اسی طرح پالتو چوپائے اور مرغی اور ان دونوں کے مانند جانور جن کو گھروں میں عام طور پر پالا جاتا ہے ذبح کرنا شکار کرنا نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے جانور بظاہر شکار ہیں۔

[۲] و إنما شُرِع أن يجتنب المحرمُ هذه الأشياء: تحقيقاً للتذلل وتركِ الزينة والتشعُّث، وتنويهًا لاستشعار خوفِ الله وتعظيمه، ومؤاخذةَ نفسِه، أن لاتسترسل فى هواها.

[الف] و إنما الصيد تَلَهٍّ وتوسُّعٌ، ولذلك قال النبى صلى الله عليه وسلم: '' من اتَّبع الصيد لَهَا'' ولم يثبت فِعلُه عن النبى صلى الله عليه وسلم، ولا كبارِ أصحابه، وإن سَوَّغَه فى الجملة.

[ب] و الجماع انهماك فى الشهوة البهيمية؛ وإذا لم يَجُز سدُّ هذا الباب بالكلية، لأنه يخالف قانونَ الشرع، فلا أقلَّ من أن ينهى [عنه] فى بعض الأحوال، كالإحرام، والاعتكاف، والصوم، وبعضِ المواضع، كالمساجد.

[ج] سئل: ما يَلْبس المحرمُ من الثياب؟ فقال: '' لاتلبسوا القُمُصَ، ولا العمائمَ، ولا السراويلاتِ ولا البَرَانِسَ، ولا الخفافَ'' وقال للأعرابى: '' أما الطِّيْبُ الذى بك فاغْسِلْه ثلاثَ مرات، وأما الجُبَّةُ فانْزِعْها''

والفرق بين المخيط ومافى معناه وبين غيرِ ذلك: أن الأول ارتفاقٌ وتجمُّل وزينةٌ، والثانى سترةُ عورةٍ، وتركُ الأول تواضُعٌ لله، وتركُ الثانى سوء أدب.

[د] قال النبى صلى الله عليه وسلم: '' لايَنكِحُ المحرم، ولا يُنكِحُ، ولا يَخْطُب'' ورُوى: أنه تزوَّج ميمونةَ محرمًا.

أقول: اختار أهل الحجاز من الصحابة والتابعين والفقهاء: أن السنة للمحرم أن لايَنكح، واختار أهل العراق: أنه يجوز له ذلك؛ ولا يخفى عليك أن الأخذ بالاحتياط أولى.

وعلى الأول : السرُّ فيه: أن النكاح من الارتفاقات المطلوبة أكثَرُ من الصيد؛ ولايُقاس الإنشاءُ على الإبقاء، لأن الفرحَ والطربَ إنما يكون فى الابتداء، ولذلك يُضرب بالعَروس المثلُ فى هذا الباب، دون البقاء.

[هـ] ثم لابدّ من ضبط الصيد : فإن الإنسان قد يقتل ما يريد أكلَه، وقد يَقتل مالايريد أكله، وإنما يريد التمرُّنَ بالاصطياد، وقد يقتل يريد أن يَدفع شرَّه عنه، أو عن أبناء نوعه، وقد يذبح بهيمةَ الأنعام، فأيُّها الصيد؟ فقال النبى صلى الله عليه وسلم:" خمسٌ لاجُناحَ على من قتلهنَّ فى الحرم والإحرام: الفأرة، والغراب، والحِدَأَةُ، والعقرب، والكلبُ العَقور" والجامع: المؤذى الصائل على الإنسان، أو على متاعه؛ فإذا رُجِعَ إلى استقراء العُرف لايقال له صيد؛ وكذلك بهيمة الأنعام والدجاج وأمثالُهما مما جرتِ العادةُ باقتنائه فى البيوت لاتسمى صيدًا؛ وأما الأقسامُ الأُخَرُ: فالظاهر أنها الصيد.

ترجمہ:(۲)اور مشروع کیا گیا ہے کہ بچے محرم ان چیزوں سے: صرف فروتنی، ترکِ زینت اور پراگندہ سری کو متحقق کرنے کے لئے ـــــ اور اللہ کے خوف اور اس کی تعظیم کے احساس کرنے کی شان بلند کرنے کے لئے ـــــ اور اپنے نفس کا مؤاخذہ کرنے کے لئے، تاکہ نفس اپنی خواہش میں مطلق العنان نہ ہوجائے (أن سے پہلے لام جارّہ مقدر ہے أی لئلا)

(الف) اور شکار کرنا صرف دل بہلانا اور کشادگی یعنی تفریح ہے۔ اور اسی وجہ سے نبی ﷺ نے فرمایا: ''جو شکار کے پیچھے پڑ گیا وہ غفلت میں پڑ گیا'' اور نہیں ثابت ہوا شکار کرنا نبی ﷺ سے، اور نہ آپ کے بڑے صحابہ سے۔ اگرچہ فی الجملہ یعنی بعض حالات میں اس کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

(ب) اور جماع بہیمی خواہش میں منہمک ہونا ہے۔ اور جب بالکلیہ اس دروازہ کو بند کرنا جائز نہیں، کیونکہ وہ شریعت کے قانون کے خلاف ہے، تو نہیں کم اس سے کہ روکا جائے (اس سے) بعض حالات میں۔ جیسے احرام، اعتکاف اور روزہ اور بعض جگہوں میں جیسے مسجدیں۔

(ج) دریافت کیا گیا...... اور فرق سلے ہوئے اور جو سلے ہوئے کے معنی میں ہیں کے درمیان اور ان کے علاوہ کے درمیان: یہ ہے کہ اول انتفاع، تجمل اور زینت ہے۔ اور ثانی ستر پوشی ہے۔ اور اول کا ترک اللہ کے لئے خاکساری ہے۔ اور ثانی کا ترک بے ادبی ہے۔

(د) نبی ﷺ نے فرمایا...... میں کہتا ہوں: اختیار کیا صحابہ وتابعین اور فقہاء میں سے اہل حجاز نے کہ محرم کے لئے شرعی حکم یہ ہے کہ وہ نکاح نہ کرے۔ اور اہل عراق نے اختیار کیا کہ شان یہ ہے کہ اس کے لئے وہ جائز ہے۔ اور آپ پر پوشیدہ نہیں کہ احتیاط والی صورت اختیار کرنا اولی ہے ـــــ اور پہلے قول پر: رازِ ممانعت میں یہ ہے کہ مطلوبہ انتفاعات میں سے نکاح زیادہ

ہے شکار کرنے سے۔اور ابتداء کو بقاء پر قیاس نہ کیا جائے۔اس لئے کہ خوشی اور شادمانی ابتداء ہی میں ہوتی ہے۔اور اسی وجہ سے ''دلہن'' کے ذریعہ کہاوت بیان کی جاتی ہے اس باب میں یعنی خوشی اور شادمانی کے سلسلہ میں، نہ کہ بقاء کے ذریعہ۔

(ھ) پھر ضروری ہے ''شکار'' کی تعیین کرنا: اس لئے کہ انسان کبھی اس جانور کو مارتا ہے جس کو کھانا چاہتا ہے۔اور کبھی اس جانور کو مارتا ہے جس کو کھانا نہیں چاہتا۔اور چاہتا ہے وہ صرف شکار کرنے کی مشق کرنا۔اور کبھی مارتا ہے اس نیت سے کہ ہٹائے وہ اس کے شر کو اپنی ذات سے یا اپنی نوع کے بیٹوں سے یعنی دوسرے انسانوں سے۔اور کبھی ذبح کرتا ہے پالتو چوپایے۔پس ان میں سے ''شکار'' کون سا ہے؟ــــ پس فرمایا نبی ﷺ نے:......اور قاعدہ کلیہ: ستانے والا انسان پر یا اس کے سامان پر حملہ کرنے والا ہے۔پس جب لوٹا جائے عرف کا جائزہ لینے کی طرف تو اس کو ''شکار'' نہیں کہا جائے گا۔اور اسی طرح پالتو چوپائے اور مرغی اور ان دونوں کے مانند، ان جانوروں میں سے کہ عادت جاری ہے اس کے پالنے کی گھروں میں: نہیں کہلاتا شکار۔اور رہی دیگر اقسام: تو ظاہر یہ ہے کہ وہی شکار ہیں۔

لغات: اِسْتَشْعَرَ الخوف: أَحَسَّ به، ويقال: استشعر خشيةَ الله (معجم وسیط) یعنی دل میں اللہ کا خوف محسوس کرنا......تَلَهٍّ کی اصل تَلَهِّیٌ ہے تَلَهّٰی بکذا: کسی چیز سے دل بہلانا...... لَهَا يَلْهُو لَهْوًا: کھیلنا، فریفتہ ہونا۔ لَهَا عن الشیئ: غافل ہونا۔حدیث میں لَهَا کے بجائے غَفَلَ ہے......(عنه) کا اضافہ کیا گیا ہے۔کسی نسخہ میں یہ لفظ نہیں ہے۔

☆　☆　☆

تعیینِ مواقیت کی حکمت

حدیث ــــ رسول اللہ ﷺ نے ذوالحُلیفہ کو اہل مدینہ کی میقات مقرر کیا۔اور جُحْفَة کو اہل شام کی۔اور قَرْنُ المنازل کو اہل نجد کی۔اور یَلَمْلَم کو اہل یمن کی۔پس یہ چاروں مقامات ان کے باشندوں کے لئے میقات ہیں۔اور دوسرے علاقوں کے ان لوگوں کے لئے بھی جو اِن مقامات سے آئیں۔جن کا ارادہ حج یا عمرہ کا ہو۔اور جو لوگ ان مقامات سے ورے ہیں (یعنی مکہ کی طرف کے رہنے والے ہیں) تو ان کے احرام باندھنے کی جگہ ان کا وطن ہے (اور یہ قاعدہ اسی طرح چلے گا) یہاں تک کہ خاص مکہ کے باشندے مکہ ہی سے احرام باندھیں گے (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۲۵۱۶)

فائدہ: مسلم شریف کی ایک دوسری روایت میں اہل عراق کے لئے ذاتُ عِرْقٍ میقات مقرر کی گئی ہے (مشکوۃ حدیث ۲۵۱۷) ان پانچوں مواقیت کا مختصر تعارف درج ذیل ہے۔

ذوالحُلیفة: مدینہ سے مکہ کے راستہ پر صرف پانچ چھ میل پر واقع ہے۔یہ مکہ سے سب سے بعید میقات ہے۔یہاں سے مکہ تقریباً دوسو میل ہے۔بلکہ آج کل کے راستہ سے تو تقریباً ڈھائی سو میل ہے۔

جُحْفَة: یہ رابغ کے قریب ایک بستی تھی۔اب اس کا نام ونشان نہیں۔مگر محل وقوع معلوم ہے۔یہ میقات مکہ سے

تقریباً ایک سومیل کے فاصلہ پر بجانب مغرب ساحل کے قریب واقع ہے۔

قَرْنُ المنازل: مکہ سے ۳۰،۳۵ ر میل مشرق میں نجد سے آنے والے راستہ پر ایک پہاڑی ہے۔

ذاتُ عِرْق: مکہ سے شمال مشرق میں عراق سے آنے والے راستہ پر ۵۰ ر میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

يَلَمْلَمْ: تہامہ کی پہاڑیوں میں سے ایک معروف پہاڑی ہے۔ جو مکہ سے تقریباً ۴۰ میل جنوب مشرق میں یمن سے آنے والے راستہ پر پڑتی ہے۔

نوٹ: مواقیت کا یہ تعارف معارف الحدیث (۲۰۲:۴) سے ماخوذ ہے۔

تشریح: تعیینِ مواقیت کی حکمت کے سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں اس حالت میں پہنچنا مطلوب ہے کہ سر میں مٹّی بھری ہوئی ہو، جسم سے بو آرہی ہو، اور نفس نشاطِ جوانی میں بے لگام نہ ہو۔ اور یہ مقصد احرام کے ساتھ حاضری ہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔ رہی یہ بات کہ احرام کہاں سے باندھا جائے؟ تو اصل یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے گھروں سے احرام باندھ کر چلیں۔ لیکن ایسا حکم دینے میں لوگوں کے لئے دقّت تھی۔ کیونکہ کسی کا وطن مکہ سے ایک ماہ کی مسافت پر ہے، کسی کا دو ماہ کی، اور کسی کا اور زیادہ دوری پر۔ اس لئے ضروری ہوا کہ مکہ مکرمہ کے گرد احرام باندھنے کے لئے کچھ ایسے مقامات متعین کئے جائیں، جہاں سے لوگ احرام باندھیں۔ ان مقامات سے احرام کو مؤخر نہ کریں۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مقامات واضح اور مشہور ہوں، کوئی بھی ان سے ناواقف نہ ہو۔ اور آفاق والے ان مقامات سے گذرتے ہوں یعنی وہ عام گذرگاہ ہو۔ چنانچہ نبی ﷺ نے ایسے مقامات کا جائزہ لیا۔ اور مذکورہ بالا پانچ مقامات احرام باندھنے کے لئے مقرر فرمائے۔

مدینہ والوں کے لئے بعید ترین میقات مقرر کرنے کی وجہ: مدینہ والوں کے لئے بعید ترین میقات دو وجہ سے مقرر کی گئی ہے:

پہلی وجہ: مدینہ منورہ اپنے جلو میں چند خصوصیات لئے ہوئے ہے: (۱) وہ وحی اترنے کی جگہ ہے یعنی نبی ﷺ کا وطن ثانی ہے (۲) وہ ایمان کے سُکڑنے کی جگہ ہے یعنی وہاں آخر تک شمع ایمان فروزاں رہے گی۔ متفق علیہ روایت ہے: **إِنَّ الإيمان لَيَأْرِزُ إلى المدينة كما تَأْرِزُ الحَيَّةُ إلى جُحْرِها** ترجمہ: بیشک ایمان مدینہ کی طرف سُکڑ جائے گا جس طرح سانپ اپنے بل کی طرف سکڑ جاتا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۶۰ باب الاعتصام إلخ) یعنی جس طرح سانپ گھوم پھر کر اور پیٹ بھر کر اپنے بل کی طرف لوٹ آتا ہے (اور ایک روایت میں ہے کہ جس طرح پہاڑی بکرا نیچے اتر کر اور چر چگ کر پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتا ہے) اسی طرح ایمان بھی دنیا میں پھیل کر اور اپنی تابانی دکھا کر، آخر میں مدینہ منورہ کی طرف (اور ایک روایت میں ہے کہ حجاز کی طرف) سکڑ جائے گا یعنی وہاں آخر تک ایمان کی شمع روشن رہے گی (۳) مدینہ دار الہجرت ہے یعنی وہاں جاں نثارانِ اسلام کا پہلا قافلہ رُکا ہے۔ اور ہر زمانہ میں اللہ کے نیک بندے وہاں فروکش ہوتے ہیں (۴) مدینہ وہ پہلی بستی ہے جو اللہ پر اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائی ہے۔ ان خصوصیات کی وجہ سے مدینہ منورہ کے باشندے

اس کے زیادہ حقدار تھے کہ وہ اللہ کا بول بالا کرنے کی خوب کوشش کریں (احرام کی حالت اور تلبیہ کی زمزمہ خوانی اسی مقصد کے لئے ہے) اور وہ عبادت کی زیادتی کے ساتھ مخصوص کئے جائیں۔ کیونکہ جن کا مرتبہ بڑا ہوتا ہے، ان کو عبادت میں مشقت بھی زیادہ اٹھانی پڑتی ہے: ع: جن کے رتبے ہیں سوا، ان کو مشکل سوا ہے!

دوسری وجہ: مدینہ کی میقات ذو الحُلَیفة ہے، جو مدینہ سے صرف پانچ چھ میل پر واقع ہے گویا مدینہ والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے وطن سے احرام باندھ کر چلیں کیونکہ مدینہ شریف ہی مکہ مکرمہ سے وہ قریب ترین بستی ہے جس کے باشندے زمانۂ نبوی میں ایمان لائے ہیں۔ اور جو اپنے ایمان میں مخلص بھی تھے۔ دوسری کوئی بستی ایسی نہیں۔ جُواثیٰ بھی — جو بحرین کا ایک قلعہ تھا — اگرچہ دورِ نبوی میں ایمان لے آیا تھا۔ اور وہ اپنے ایمان میں مخلص بھی تھے مگر چونکہ وہ مکہ سے بہت دوری پر واقع تھا، اس لئے ان کو ایسا حکم دینے میں کہ وہ اپنے وطن سے احرام باندھ کر چلیں: دقّت تھی۔ اور طائف اور یمامہ بھی اگرچہ دورِ نبوی میں ایمان لائے تھے اور مدینہ کی بہ نسبت مکہ سے قریب بھی تھے۔ مگر ان کے باشندے دورِ نبوی میں ایمان میں مخلص نہیں تھے۔ اس لئے ان کو بھی ایسا حکم دینا مناسب نہیں تھا۔ اور مدینہ والوں کو ایسا حکم دینے میں کوئی دقت نہیں تھی، اس لئے انہیں کو یہ حکم دیا گیا۔

[۳] ووقَّت لأهل المدينة ذاالحُليفة، ولأهل الشام الجُحْفَةَ، ولأهل نجدٍ قَرْنَ المنازلِ، ولأهل اليمن يَلَمْلَمَ؛ فهنَّ لهنَّ، ولمن أتى عليهن من غير أهلنَّ، لمن كان يريد الحج والعمرة، فمن كان دونهنَّ فَمَهَلُّه من أهله، حتى أهلُ مكة يُهِلُّون منها.

أقول: الأصل في المواقيت: أنه لما كان الاتيانُ إلى مكة شَعِثًا تَفِلاً تاركاً لغُلواء نفسه: مطلوباً، وكان في تكليف الإنسان أن يُحرم من بلده حرجٌ ظاهر، فإن منهم من يكون قُطره على مسيرة شهر وشهرين وأكثرَ: وجب أن يُّخَصَّ أمكنةٌ معلومةٌ حولَ مكة يُحرمون منها، ولا يؤخرون الإحرام بعدَها؛ ولابدَّ أن تكون تلك المواضعُ ظاهرةً مشهورةً، ولا تخفى على أحد، وعليها مرورُ أهل الآفاق، فاستَقْرَأَ ذلك، وحَكَمَ بهذه المواضع.

واختار لأهل المدينة أبعدَ المواقيت: لأنها مَهْبِطُ الوحي، ومأرزُ الإيمان، ودارُ الهجرة، وأولُ قرية آمنت بالله ورسوله، فأهلها أحقُّ بأن يُبالغوا في إعلاء كلمة الله، وأن يُخَصُّوا بزيادة طاعة الله.

وأيضًا: فهي أقرب الأقطار التي آمنت في زمان رسول الله صلى الله عليه وسلم، وأخصلتْ إيمانَها، بخلاف جُوَاثَى والطائفِ ويمامَة وغيرها، فلا حرج عليها.

ترجمہ: اور رسول اللہ ﷺ نے میقات مقرر کی الخ (یہ حدیث ہے۔ شاہ صاحب نے وقّتَ کی ضمیر لوٹانے پر اکتفا

کی ہے۔البتہ شاہ صاحب نے حدیث کا ایک جملہ حذف کردیا ہے۔اوروہ ہے: و کذاك و کذاك اوپر بین القوسین میں اسی کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ حتّی جو کہ غایت کے لئے ہے،اس کا مفہوم اس محذوف کے بغیر واضح نہیں ہوتا)

میں کہتا ہوں: مواقیت میں اصل یہ ہے کہ شان یہ ہے کہ جب مکہ کی طرف آنا درانحالیکہ وہ آشفتہ سر ہو، بدن اور کپڑے چرکیں ہوں، اپنے نفس کی نشاطِ جوانی کو خیر باد کہنے والا ہو: مطلوب تھا۔اور انسان کو اس بات کا مکلّف کرنے میں کہ وہ اپنے شہر سے احرام باندھے: کُھلی دقت تھی۔ کیونکہ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کا علاقہ ایک ماہ اور دو ماہ اور اس سے زیادہ مسافت پر ہے۔تو ضروری ہوا کہ مکہ کے گرد کچھ جانی پہچانی جگہیں مخصوص کی جائیں جہاں سے لوگ احرام باندھیں۔اوران کے بعد احرام کو مؤخر نہ کریں۔اور ضروری تھا کہ وہ جگہیں واضح اور مشہور ہوں۔اور کسی پر پوشیدہ نہ ہوں۔اوران پر آفاق والوں کا گذر ہوتا ہو۔پس آپ نے ان جگہوں کا جائزہ لیا۔اوران جگہوں کا فیصلہ فرمایا۔

اور مدینہ والوں کے لئے بعید ترین میقات کو پسند کیا: کیونکہ مدینہ وحی اترنے کی جگہ ہے۔اور ایمان کے سکڑنے کی جگہ ہے۔اور دارالہجرت ہے۔اور وہ پہلی بستی ہے جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائی ہے۔پس اس کے باشندے زیادہ حقدار تھے اس بات کے کہ وہ خوب کوشش کریں اللہ کا بول بالا کرنے میں۔اور یہ کہ وہ مخصوص کئے جائیں اللہ کی عبادت کی زیادتی کے ساتھ —— اور نیز: پس مدینہ اُن اقالیم میں قریب ترین خطّہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایمان لایا ہے۔اوراس نے اپنا ایمان خالص کیا ہے۔برخلاف جُواثی اور طائف اور یمامہ اوران کے علاوہ کے۔پس کچھ دقّت نہیں مدینہ والوں پر (وطن سے احرام باندھنے میں)

☆　☆　☆

وقوفِ عرفہ کی حکمتیں

حج کا اہم ترین رکن نویں ذی الحجہ کو میدانِ عرفات میں پہنچنا ہے۔اوراس میں دو حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: لاکھوں مسلمانوں کا معین وقت اور معین جگہ میں فقیروں اور محتاجوں کی صورت بنا کر جمع ہونا۔اوران کا اللہ تعالیٰ کی طرف راغب ہونا اور رحمت کے لئے دعائیں اور آہ وزاری کرنا، اثر عظیم رکھتا ہے برکات الٰہی کے نازل ہونے میں،اور روحانیت (انوار) کے پھیلنے میں یعنی جب سب بندے مل کر اللہ کے سامنے روتے گڑ گڑاتے ہیں تو رحمتِ خداوندی کا اَتھاہ سمندر جوش میں آتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ بندوں کی مغفرت کا فیصلہ فرماتے ہیں۔جسے دیکھ کر شیطان جل بُھن جاتا ہے اور اپنا سر پیٹ لیتا ہے۔حدیث شریف میں ہے کہ:'' شیطان کسی دن بھی اتنا ذلیل، اتنا خوار، اتنا دھتکارا ہوا اور پھٹکارا ہوا اور اتنا جلا بُھنا نہیں دیکھا گیا جتنا کہ وہ عرفہ کے دن ذلیل وخوار، روسیاہ اور جلا بھنا دیکھا جاتا ہے۔اور یہ بات صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ اس دن اللہ کی رحمت کو برستے ہوئے، اور بڑے بڑے گناہوں کی

معافی کا فیصلہ کرتے ہوئے دیکھتا ہے (اور یہ بات اس لعین کے لئے نا قابل برداشت ہوتی ہے) البتہ وہ جنگ بدر کے موقعہ پر اس سے بھی زیادہ بُرے حال میں تھا (مشکوٰۃ حدیث ۲۶۰۰)

دوسری حکمت: حج کے پہلے باب میں یہ بات بیان کی جاچکی ہے کہ حج کی ایک مصلحت: دربار خداوندی میں حاضری دینا ہے۔ اس مصلحت کا تحقق وقوفِ عرفہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اسی موقعہ پر تمام حجاج ایک جگہ اکٹھے ہوتے ہیں۔ اس لئے وقوفِ عرفہ کو اعظم رکن قرار دیا گیا ہے۔

سوال: دربار خداوندی میں حاضری کے لئے ۹ ذی الحجہ اور میدان عرفات کی تخصیص کیوں ہے؟

جواب: یہ تخصیص موروثی ہے یعنی تمام انبیاء کرام علیہم السلام سے یہ بات متوارث چلی آرہی ہے۔ تاریخی روایات ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام اور بعد کے انبیاء اسی تاریخ میں اور اسی جگہ میں حج کے لئے جمع ہوتے تھے۔ اور سلف صالحین کے طریقہ کو اپنانا تعیینِ اماکن وازمنہ کے باب کی ایک مضبوط بنیاد ہے۔

وضاحت: حج کا لفظ اپنے جلو میں گونہ سفر کے معنی لئے ہوئے ہے۔ حَجَّ إليه (ن) حَجًّا وحِجًّا کے معنی ہیں: کہیں سے آنا۔ حَجَّ المكانَ کے معنی ہیں: کسی جگہ کا قصد کرنا۔ حَجَّ البيتَ کے معنی ہیں: عبادت کے لئے بیت اللہ پہنچنا۔ حَجَّ بنو فلان فلاناً کے معنی ہیں: بکثرت آنا جانا۔ اور حج صرف آفاقی نہیں کرتے، مقامی لوگ بھی کرتے ہیں۔ اور اب مواصلات کی فراوانی کی وجہ سے اگرچہ بیرونی حجاج کا غلبہ ہوتا ہے، مگر پہلے مقامی حجاج کی کثرت ہوتی تھی اور ان کے حق میں سفر کا تحقق اسی طرح ہوسکتا ہے کہ وہ حرم سے باہر نکلیں۔ پھر وہاں سے بیت اللہ کا قصد کریں۔ جیسے عمرہ کے معنی ہیں: زیارت کرنا یعنی بیت اللہ کی ملاقات کے لئے آنا۔ اس کے مفہوم میں بھی گونہ سفر کے معنی شامل ہیں۔ اس لئے جو شخص مکہ مکرمہ سے عمرہ کرنا چاہتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ حرم سے باہر نکلے۔ اور حِلّ سے احرام باندھ کر بیت اللہ کی زیارت کرے۔ اب رہی حج کے اجتماع کے لئے میدانِ عرفات اور ۹ رذی الحجہ کی تخصیص: تو اس کی وجہ وہ ہے جو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بیان فرمائی ہے یعنی یہ چیز موروثی ہے۔

[٤] والسرُّ في الوقوف بعرفة: أن اجتماع المسلمين في زمان واحد ومكان واحد، راغبين في رحمة الله، داعين له، متضرعين إليه: له تأثير عظيم في نزول البركات، وانتشار الروحانية؛ ولذلك كان الشيطانُ يومئذ أَدْ حَرَو أَحْقَرَ مايكون.

وأيضًا: فاجتماعُهم ذلك تحقيقٌ لمعنى العَرْضَة؛

وخصوصُ هذا اليوم وهذا المكان متوارث عن الأنبياء عليهم السلام، على ما يُذكر في الأخبار عن آدم فمن بعدَه، والأخذ بما جرت به سنةُ السلف الصالح أصلٌ أصيلٌ في باب التوقيت.

ترجمہ: (۴) اور عرفہ میں پہنچنے میں راز: یہ ہے کہ مسلمانوں کا اکٹھا ہونا ایک زمانہ میں اور ایک جگہ میں، درانحالیکہ وہ

اللہ کی رحمت میں رغبت کرنے والے ہوں، اللہ تعالیٰ کو پکارنے والے ہوں، اللہ کے سامنے گڑگڑانے والے ہوں: ایسے اجتماع کے لئے تاثیرِ عظیم ہے برکتوں کے نزول میں۔ اور روحانیت کے پھیلنے میں۔ اور اسی وجہ سے شیطان اس دن نہایت ذلیل اور نہایت خوار ہوتا ہے جو وہ ہوسکتا ہے یعنی جس قدر ممکن ہوتا ہے ـــــ اور نیز: پس لوگوں کا یہ اجتماع دربار خداوندی کی حاضری کے مقصد کو بروئے کار لانا ہے ـــــ اور اس دن اور اس جگہ کی تخصیص نسل در نسل نقل ہوتی ہوئی آئی ہے، انبیاء علیہم السلام سے۔ جیسا کہ تاریخی روایات میں ذکر کیا گیا ہے، آدم علیہ السلام سے پھر ان سے جوان کے بعد ہیں۔ اور اس چیز کو اپنانا جس کے ساتھ سلف صالحین کا طریقہ جاری رہا ہے: ایک مضبوط بنیاد ہے تعیین کے باب میں۔

☆ ☆ ☆

منیٰ میں قیام کی حکمت

زمانۂ جاہلیت میں حج کے بعد منیٰ میں بڑا بازار لگتا تھا۔ جیسے عُکاظ، مَجَنّہ اور ذوالمجاز کے بازار[۱]۔ اور بازار لگانے کے لئے منیٰ کا انتخاب دو وجہ سے کیا گیا تھا: ایک: حج کے لئے مکہ میں دور دراز مقامات سے ایک خلقت جمع ہوتی تھی۔ اور تجارت کے لئے اس سے بہتر اور سودمند سیزن اور کوئی نہیں تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مکہ اس بھاری انبوہ کا متحمل نہیں تھا۔ یعنی لوگوں کی کثرت کی وجہ سے مکہ میں یہ بازار نہیں لگ سکتا تھا۔ اس لئے اگر ان کے شہری اور قروی، مشہور اور گمنام اس کام کے لئے منیٰ جیسی کوئی کھلی جگہ تجویز نہ کرتے تو لوگ پریشانی میں پڑ جاتے۔ اور اگر حج کے لئے آنے والوں میں تخصیص کی جاتی کہ اتنے ہی آدمی آئیں یا فلاں فلاں قبائل ہی آئیں تو یہ بات لوگوں کو ناگوار ہوتی۔

پھر جب منیٰ میں قیام کا دستور چل پڑا تو عربوں کی عادت وحمیّت نے یہاں بھی تفاخر وتکاثر کی راہ نکال لی اور شاعری کا دور چلنے لگا۔ جس میں اسلاف کے کارناموں کا تذکرہ، اپنی جلالت وشجاعت کا ذکر اور اپنے ہمنواؤں کی کثرت کا بیان ہوتا تھا، تاکہ قریب وبعید کے لوگ اسے سنیں۔ اور دور دور تک اس کا چرچا پھیلائیں۔

پھر جب اسلام کا دور آیا تو نبی ﷺ نے محسوس فرمایا کہ دینی مقاصد کے لئے یہ اجتماع ضروری ہے۔ تاکہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کا دبدبہ، ان کی تعداد اور ان کے ساز وسامان کا لوگوں کو پتہ چلے۔ اور اللہ کا دین غالب ہو۔ اور دور تک دین کا آوازہ بلند ہو۔ اور تمام ممالک میں اسلام غلبہ پائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس اجتماع کو باقی رکھا۔ لوگوں کو اس کی ترغیب دی اور شوق دلایا (اس طرح کہ منیٰ میں قیام مسنون کیا۔ اور روزانہ جمرات کی رمی واجب کی) البتہ

---

[۱] عُکاظ: عرب کا ایک مشہور بازار تھا۔ مکہ کے قریب: نخلہ اور طائف کے درمیان ہر سال ذی قعدہ میں یہ بازار لگتا تھا۔ اور ۲۰ دن تک چلتا تھا۔ اور مجنہ: مکہ کے زیریں حصہ میں چند میل کی دوری پر ایک چشمہ تھا۔ وہاں بھی بازار لگتا تھا۔ اور ذوالمجاز: عرفات کے قریب ایک جگہ کا نام تھا۔ وہاں بھی بازار لگتا تھا۔ ان میلوں میں شعر وشاعری کا دور چلتا تھا۔ جس میں فخر ومباہات کے جوہر دکھائے جاتے تھے۔ جب اسلام کا زمانہ آیا تو یہ سب بازار بند ہوگئے ۱۲

تفاخر اور اسلاف کے کارناموں کو بیان کرنے کی رسم ختم کردی۔ اور ذکر اللہ کو اس کا قائم مقام کردیا (دیکھیے سورۃ البقرہ آیت ۲۰۰) اور اس کی نظیر یہ ہے کہ عربوں میں جن ضیافتوں اور تقریبات کا رواج تھا، اسلام نے ان سب کو ختم کردیا، مگر دعوتِ ولیمہ اور دعوتِ عقیقہ کو باقی رکھا، کیونکہ خاندانی زندگی میں اس کے بڑے بڑے فوائد ہیں۔

[٥] والسرُّ فی نزول منی: أنها كانت سوقًا عظيمًا من أسواق الجاهلية، مثلُ عُكاظٍ، والمَجَنَّةِ، وذی المَجَاز، وغيرها؛ وإنما اصطلحوا عليه: لأن الحج يجمع أقوامًا كثيرةً من أقطار متباعدة، ولا أحسنَ للتجارة ولا أرفقَ بها من أن يكون موسِمُها عند هذا الاجتماع؛ ولأن مكة تَضِيْقُ عن تلك الجنود المُجَنَّدَةِ، فلو لم يصطلح حاضِرُهم وباديهم، وخاملُهم ونبيهُهم على النزول فی فَضَاءٍ مثلَ منی لَحَرَجُوْا، وإن اخْتُصَّ بعضُهم بالنزول لوجدوا فی أنفسهم.

ولما جرت العادة بنزولها اقتضٰی دَيْدَنُ العرب وحَمِيَّتُهم أن يجتهد كلُّ حَيٍّ فی التفاخر والتكاثر، وذكرِ مآثر الآباء، وإِرَاءَةِ جَلَدِهم، وكثرةِ أعوانهم، ليری ذلك الأقاصی والأدانی، ويبعد به الذكرُ فی الأقطار؛

وكان للإسلام حاجةٌ إلی اجتماعٍ مثله، يظهر به شوكةُ المسلمين وعِدَّتُهم وعُدَّتُهم، ليظهر دينُ اللهِ، ويبعُدَ صِيْتُه، ويغلب علی كل قُطر من الأقطار، فأبقاه النبیُّ صلی الله عليه وسلم، وحثَّ عليه، ونَدَبَ إليه، ونَسَخَ التفاخُر وذكرَ الآباء، وأبدله بذكر الله، بمنزلة ما أبقی من ضيافاتهم وولائمهم: وليمةَ النكاح، وعقيقةَ المولود، لمَّا رأی فيهما من فوائدَ جليلة فی تدبير المنزل.

ترجمہ: (۵) اور منیٰ میں اترنے میں راز: یہ ہے کہ منیٰ جاہلیت کے بازاروں میں سے ایک بڑا بازار تھا۔ جیسے عکاظ، مَجَنّہ، ذوالمجاز اور ان کے علاوہ۔ اور جاہلیت کے لوگوں نے منیٰ کے نزول پر اس لئے اتفاق کیا تھا کہ حج دور دور مقامات سے بہت اقوام کو جمع کرتا ہے۔ اور تجارت کے لئے اس سے بہتر اور اس سے زیادہ مفید نہیں ہے کہ اس کا سیزن اس اجتماع کے موقعہ پر ہو اور اس کے لئے مکہ تنگ تھا اس بھاری انبوہ سے۔ پس اگر نہ اتفاق کرتے ان کے شہری اور ان کے بدوی اور ان کے گمنام اور مشہور منیٰ جیسی کھلی جگہ میں قیام پر تو لوگ دقت میں پڑ جاتے۔ اور اگر خاص کئے جاتے ان کے بعض اترنے پر تو وہ اپنے دلوں میں تنگی پاتے (یہاں اترنے سے مراد حج کے لئے آنا ہے)

اور جب منیٰ میں قیام کی عادت چل پڑی تو عربوں کی عادت اور ان کی حمیت نے تقاضا کیا کہ انتہائی کوشش کرے ہر قبیلہ تفاخر و تکاثر میں اور اسلاف کے کارناموں کے تذکرہ میں، اور اپنی جلادت اور اپنے معاونین کی کثرت دکھانے میں۔ تاکہ قریب وبعید کے لوگ اس کو دیکھیں یعنی سنیں۔ اور دور تک جائے اس کے ذریعہ تذکرہ ممالک میں۔

اور اسلام کو اس طرح کے اجتماع کی حاجت تھی، جس کے ذریعہ ظاہر ہو مسلمانوں کا دبدبہ اور ان کی تعداد اور ان کا سامان، تاکہ غالب آئے اللہ کا دین۔ اور دور تک پھیلے اس کا شہرہ۔ اور غالب آئے خطوں میں سے ہر خطہ پر۔ پس باقی رکھا اس کو نبی ﷺ نے۔ اس پر ابھارا۔ اور اس کا شوق دلایا۔ اور ختم کر دیا تفاخر اور اسلاف کے تذکرے کو۔ اور بدل دیا اس کو ذکر اللہ سے۔ ویسے جیسے باقی رکھا آپؐ نے عربوں کی تقریبات اور دعوتوں میں سے: نکاح کے ولیمہ کو اور نومولود کے عقیقہ کو۔ جب دیکھے آپؐ نے اس میں بڑے بڑے فوائد خاندانی زندگی میں۔

لغات: أنها کی ضمیر منی کی طرف بتاویل بقعہ اور خطّہ لوٹتی ہے...... **دَیْدَن**: عادت...... **حمیّت**: قوتِ غضبیہ جب جوش زن ہو تو حمیت کہلاتی ہے۔ پھر اگر صحیح جگہ جوش میں آئے تو وہ غیرتِ اسلامی ہے، ورنہ حمیت جاہلیہ ہے...... **تفاخر**: خودستائی، بڑائی مارنا...... **تکاثر**: بہتایت، زیادہ طلبی۔ جاہ و دولت یا عزت و مرتبہ یا مال و اولاد کی کثرت کے لئے باہم جھگڑا اور مباحثہ کرنا...... **مآثر** جمع ہے **مَأْثُرة** کی، جس کے معنی ہیں: عمدہ فعل۔ خاندانی عزت...... **الجَلَد**: سخت زمین اور سختی۔ **جلُد** (ک) **جَلْدا و جلادةً**: صبر و استقلال اور قوت دکھلانا...... **أعوان** سے مراد یہاں حلفاء ہیں۔ یعنی وہ قبائل جن سے دوستی ہے...... **العِدَّة**: جماعت، تعداد...... **العُدَّة**: تیاری، سامان حرب وغیرہ...... **الصِیْت**: اچھی شہرت...... **نَدَبَ** (ن) **إليه**: بلانا، برانگیختہ کرنا۔

☆ ☆ ☆

غروب کے بعد عرفہ سے واپسی، مزدلفہ میں شب باشی اور وقوف کی حکمتیں

① —— عرفہ سے غروب کے بعد واپسی کی وجہ —— زمانۂ جاہلیت میں لوگ عرفہ سے غروب آفتاب سے پہلے ہی لوٹ آتے تھے۔ اور مزدلفہ میں پہنچ کر فخر و مباہات کی محفلیں جماتے تھے۔ اور نمود کا بازار گرم ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی مخالفت کی۔ اور حجۃ الوداع میں غروب کے بعد مراجعت فرمائی۔ کیونکہ غروب سے پہلے واپسی کے لئے کوئی ایسا وقت مقرر نہیں کیا جاسکتا تھا، جس میں کسی طرح کا ابہام نہ ہو۔ جبکہ ایسے بڑے اجتماع کے لئے ایسی واضح تعیین ضروری ہے۔ اور غروب ایک ایسی واضح علامت تھی جس میں ذرا ابہام نہیں تھا۔ چنانچہ واپسی کے وقت کا انضباط غروب شمس سے کیا گیا۔

علاوہ ازیں: خطہ گرم ہے۔ علاقہ پہاڑی ہے اور شام کو تپش تیز ہوتی ہے۔ اس لئے غروب سے پہلے واپسی میں پریشانی ہے۔ اور وہاں کی راتیں خنک ہوتی ہیں۔ تہامہ کی رات ضرب المثل ہے: **لاحَرَّ ولا قَرَّ** یعنی نہ سرد ہوتی ہے نہ گرم۔ اس لئے بھی واپسی کے لئے موزوں وقت غروب کے بعد ہے۔ جیسے منی سے عرفہ کے لئے روانگی فجر کے فوراً بعد تجویز کی گئی ہے۔ تاکہ ٹھنڈے وقت میں لوگ ٹھکانے پہنچ جائیں (یہ وجہ شارح نے بڑھائی ہے)

② —— مزدلفہ میں شب باشی کی وجہ —— عرفہ سے واپسی میں مزدلفہ میں رات گذارنا ایک قدیمی دستور تھا۔ شریعت

نے اس کو باقی رکھا ہے کیونکہ حج کا اجتماع: ایک عظیم اجتماع ہے۔ لوگوں نے ایسا اجتماع شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔ اور عرفہ سے واپسی غروب کے بعد ہوتی ہے یعنی رات شروع ہوجاتی ہے۔ اس لئے اندیشہ تھا کہ لوگ واپسی میں دھکّا دھکّی کریں گے۔ اور ایک دوسرے کو چور چور کردیں گے۔ پھر لوگ دن بھر کے تھکے ماندے ہوتے ہیں۔ دور دراز سے چل کر عرفات میں آئے ہوتے ہیں۔ اور اکثریت پاپیادہ لوگوں کی ہوتی ہے۔ اس لئے اگر ان کو حکم دیا جاتا کہ منی میں پہنچو، تو وہ اور بھی ٹوٹ جاتے۔ اور آئندہ کل کام کے قابل نہ رہتے۔ اس لئے راستہ میں قیام تجویز کیا گیا، تاکہ وہاں سستا کر صبح کو اگلی منزل کا رخ کریں۔

(۳) —— مَشعرِ حرام میں وقوف کی وجہ —— مشعرِ حرام ایک پہاڑ کا نام ہے۔ جو مزدلفہ میں واقع ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے پاس وقوف فرمایا ہے۔ پس وہاں وقوف کرنا افضل ہے۔ اور تمام مزدلفہ میں جہاں بھی قیام و وقوف کرے: جائز ہے۔ مزدلفہ میں پہنچ کر لوگ مغرب وعشا ایک ساتھ ادا کر کے سوجاتے ہیں۔ صبح فجر کے بعد وقوف مزدلفہ کا وقت شروع ہوتا ہے۔ یہ وقوف اس لئے مشروع کیا گیا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگ یہاں بھی تفاخر ونمود کی محفلیں جماتے تھے۔ اسلام نے اس کو کثرتِ ذکر سے بدلدیا۔ سورۃ البقرہ آیت ۱۹۸ میں ہے: ﴿فَإِذَآ أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَٰتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِندَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ، وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ، وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّآلِّينَ﴾ یعنی جب تم لوگ عرفات سے واپس لوٹو تو مشعرِ حرام کے پاس اللہ کو یاد کرو۔ اور اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو بتلا رکھا ہے۔ اگرچہ قبل ازیں تم گمراہوں میں سے تھے۔ یعنی جاہلیت میں جو کچھ یہاں کیا جاتا تھا وہ گمراہی تھی —— اور یہاں کثرت سے اللہ کو یاد کرنے کا حکم اس لئے دیا کہ جاہلیت کی عادت کا انسداد ہوجائے یعنی یہ ذکر ان کو تفاخر کا موقعہ ہی نہ دے۔ نیز اس جگہ ذکر الٰہی کے ذریعہ توحید کی شان بلند کرنا: ایک طرح کی منافست اور ریس کی ترغیب بھی ہے کہ دیکھیں تم خدا کی یاد زیادہ کرتے ہو یا مشرکین کی مفاخرت کا پلّہ بھاری ہے!

نوٹ: تقریر میں مضمون میں تقدیم وتاخیر کی گئی ہے یعنی عرفہ سے غروب کے بعد واپسی کا بیان مؤخر تھا اس کو مقدم کیا گیا ہے۔

[٦] والسرُّ فی المبیت بمزدلفة: أنه کان سنةً قدیمةً فیهم، ولعلهم اصطلحوا علیها لَمَّا رأوا من أن للناس اجتماعاً، لم یُعْهَدْ مثلُه فی غیر هذا الموطن، ومثلُ هذا مَظِنَّةُ أن یُزاحم بعضُهم بعضًا، ویحطم بعضُهم بعضًا، وإنما بَرَاحُهم بعد المغرب، وکانوا طولَ النهار فی تعبٍ، یأتون من کل فَجٍّ عمیق، فلو تَجَشَّموا أن یأتوا منی —— والحالُ هذه —— لتعبوا.

وکان أهل الجاهلیة یدفعون من عرفاتٍ قبل الغروب، ولما کان ذلك قدرًا غیر ظاهرٍ، ولایتعین بالقطع، ولابد فی مثل هذا الاجتماع من تعیینٍ، لایحتمل الإبهامَ: وجب أن یُعَیَّنَ بالغروب.

وإنما شُرِع الوقوف بالمشعر الحرام: لأنه کان أهل الجاهلیة یتفاخرون ویتراءون، فأُبدل من ذلك إکثارُ ذکر اللّٰهِ، لیکون کابحًا من عادتهم، ویکون التنویهُ بالتوحید فی ذلك الموطن کالمنافسة، کأنه قیل: هل یکون ذکرُکم اللّٰهَ أکثرَ، أو ذکرُ أهلِ الجاهلیة مفاخِرَهم أکثرَ؟

ترجمہ: (۶) اور مزدلفہ میں شب باشی کا راز: یہ ہے کہ یہ ان کا پرانا طریقہ تھا۔ اور شاید انھوں نے اتفاق کیا مزدلفہ میں قیام پر جب دیکھی انھوں نے یہ بات کہ لوگوں کا اس کے مانند اجتماع جانا پہچانا نہیں گیا اس جگہ کے علاوہ میں۔ اور اس طرح کا اجتماع احتمالی جگہ تھا اس بات کی کہ تنگی کریں ان کے بعض بعض پر، اور چور چور کردیں ان کے بعض بعض کو۔ اور لوگوں کی روانگی مغرب بعد ہی ہوتی ہے۔ اور لوگ دن بھر تھکن میں تھے۔ آئے ہیں وہ دور راہوں سے۔ پس اگر مشقت سے کام لیں وہ کہ آئیں وہ منی میں ــــ درانحالیکہ صورتِ حال یہ ہے ــــ تو ٹوٹ کر رہ جائیں گے وہ۔

اور جاہلیت کے لوگ عرفات سے غروب سے پہلے لوٹتے تھے۔ اور جب تھی یہ بات غیر واضح مقدار۔ اور نہیں متعین ہوتی ہے وہ یقین کے ساتھ۔ اور ضروری ہے اس جیسے اجتماع میں ایسی تعیین جو ابہام کا احتمال نہ رکھتی ہو، تو ضروری ہوا کہ اس کو غروب کے ذریعہ معین کیا جائے۔

اور مشعرِ حرام کے پاس وقوف یعنی مزدلفہ میں وقوف صرف اس وجہ سے مشروع کیا گیا ہے کہ جاہلیت کے لوگ ایک دوسرے پر فخر کیا کرتے تھے اور دکھلاوا کرتے تھے۔ پس بدل دیا اس سے ذکر اللہ کی زیادتی کو، تاکہ ہوے وہ روکنے والا ان کی عادت سے۔ اور ہوے توحید کی شان بلند کرنا اس جگہ میں مانند منافست کے۔ گویا کہا گیا: ''کیا تمہارا اللہ کا ذکر کرنا زیادہ ہے یا اہل جاہلیت کا اپنی خاندانی خوبیوں کا ذکر کرنا زیادہ ہے؟''

☆ ☆ ☆

رمی جمرات کی حکمتیں

جمرہ کے معنی ہیں: پتھر۔ اسی سے اِستِجمَار ہے۔ جس کے معنی ہیں: استنجاء کے لئے پتھر لینا۔ منی میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین جگہوں میں پتھر کے تین ستون نصب کئے گئے ہیں۔ انہی ستونوں کو جمرات کہا جاتا ہے۔ ان ستونوں پر کنکریاں پھینکنا بھی اعمالِ حج میں داخل ہے۔ اور اس کی دو حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: یہ عمل ذکر اللہ کی گرم بازاری کے لئے ہے۔ حدیث میں ہے کہ: ''جمرات پر کنکریاں پھینکنا اور صفا ومروہ کے درمیان سعی کرنا: اللہ کا ذکر برپا کرنے کے لئے ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۶۲۴) منی کے ایام میں ان جمرات پر دوپہر سے لیکر رات تک ذکر اللہ کا وہ غُلغُلہ بلند ہوتا ہے کہ بس دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ ہزاروں آدمی جب ایک ساتھ اللہ کی کبریائی کا نعرہ بلند کرتے ہیں، اور جمروں پر کنکریاں مارتے ہیں، تو اس وقت جو روحانی منظر ہوتا ہے، وہ اہل بصیرت کے لئے ایک ایمان افروز عمل ہوتا ہے۔

سوال: اللہ کا ذکر تو کنکریاں پھینکے بغیر بھی ہوسکتا ہے؟ پھر تکبیر کے ساتھ رمی بھی کیوں تجویز کی گئی ہے؟

جواب: ذکر کے اہتمام کے لئے ذکر کی تعیین ضروری ہے۔ اور تعیین کی سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ ذکر کا وقت

اور جگہ متعین کردی جائے۔ اور ساتھ ہی کوئی ایسی چیز بھی لگادی جائے جو ذکر کی تعداد کی نگہبانی کرے۔ اور ذکر کے پائے جانے کو اس طرح علی الاعلان ثابت کرے کہ اس میں کوئی خفا باقی نہ رہے۔ اسی مقصد سے ہاتھ میں تسبیح لیکر ذکر کیا جاتا ہے۔ غرض ہر تکبیر کے ساتھ ایک کنکری پھینکنے کا عمل بھی اسی مصلحت سے تجویز کیا گیا ہے۔

سوال: جب رمی کا عمل ذکر اللہ کو برپا کرنے کے لئے ہے تو پھر سات تکبیروں پر بس کیوں کیا جاتا ہے؟ اور رمی کے ساتھ اس کو مقید کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ مناسب یہ تھا کہ لوگ وہاں دیر تک ذکر میں مشغول رہیں!

جواب: ذکر اللہ کی دو قسمیں ہیں:

ایک: وہ ذکر اللہ ہے، جس کا مقصد یہ اعلان کرنا ہوتا ہے کہ ذاکر اللہ کے دین کا تابعدار ہے۔ اس نوع کے ذکر کے لئے مجمعوں کا انتخاب کیا جاتا ہے، وہ ذکر تنہائی میں نہیں کیا جاتا۔ اور اس نوع کے ذکر میں تکثیر بھی مطلوب نہیں ہوتی۔ چند بار نعرہ لگانے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ منی میں تنہائی میں ذکر کرنا کافی نہیں قرار دیا گیا۔ بلکہ جمرات کے پاس مجمع میں ذکر ضروری قرار دیا۔ اور اس موقع پر ذکر کی تکثیر کا بھی حکم نہیں دیا۔ سات ہی مرتبہ تکبیر کے ساتھ کنکریاں پھینکنا کافی قرار دیا گیا۔

دوسری نوع: وہ ذکر ہے جس سے مقصود نفس کی تربیت ہے یعنی اس کے ذریعہ نفس کی توجہ خدائے قدوس کی طرف موڑنا مقصود ہوتا ہے۔ اس نوع کے ذکر میں تکثیر مطلوب ہوتی ہے اور تنہائی میں کیا جاتا ہے۔ سالکین اپنی خلوت گاہوں میں پہروں اس نوع کے ذکر میں مشغول رہتے ہیں۔ کیونکہ ایسا ذکر بکثرت کیا جائے تبھی نفس انوار الٰہی سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

دوسری حکمت: بعض تاریخی اور تفسیری روایات میں یہ بات آئی ہے کہ شیطان نے تین مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم الٰہی کی تعمیل سے روکنے کی کوشش کی تھی۔ اور ہر بار آپ نے اسے سات کنکریاں مار کر دفع کیا تھا۔ منی میں آج تک اُنہی مقامات میں یہ محبوب عمل دوہرایا جاتا ہے۔ کیونکہ اکابر کے ایسے بابرکت عمل کی نقل کرنے سے نفس کو نہایت قوی تنبیہ ہوتی ہے کہ اسے بھی اپنے اوپر شیطان کا داؤ نہیں چلنے دینا چاہئے۔

---

[۷] والسرُّ في رمي الجِمار: ما ورد في نفس الحديث: من أنه إنما جُعل لإقامة ذكر الله عَزَّوجلَّ؛ وتفصيلُه: أن أحسنَ أنواع توقيتِ الذكر، وأكملَها، وأجمَعَها لوجوه التوقيت: أن يوقَّت بزمان وبمكان، ويُقامَ معه ما يكون حافظًا لعدده، محقِّقا لوجوده على رء وس الأشهاد حيث لايخفى شيئ.

وذكر الله نوعان:

[الف] نوع يُقصد به الإعلانُ، بانقياده لدين الله؛ والأصل فيه: اختيارُ مجامع الناس، دون الإكثار، ومنه الرمي، ولذلك لم يؤمر بالإكثار هناك.

[ب] ونوع يُقصد به انصباغُ النفس بالتطلع للجبروت، وفيه الإكثار.

وأيضًا: ورد في الأخبار ما يقتضي أنه سَنَّةٌ سَنَّهَا إبراهيم عليه السلام حين طرد الشيطان: ففي حكايةِ مثلِ هذا الفعلِ تنبيه للنفس أيَّ تنبيهٍ.

ترجمہ: (۷) اور جمرات کی رمی میں راز: وہ ہے جو حدیث میں آیا ہے یعنی یہ بات کہ رمی اللہ تبارک وتعالیٰ کے ذکر کو برپا کرنے کے لئے تجویز کی گئی ہے۔ اور اس کی تفصیل: یہ ہے کہ ذکر کی تعیین کی شکلوں میں بہترین اور ان میں کامل ترین اور ان میں جامع ترین تعیین کی صورتوں کے لئے: یہ بات ہے کہ تعیین کی جائے زمانہ اور جگہ کے ساتھ۔ اور قائم کی جائے اس کے ساتھ ایسی چیز جو ذکر کی تعداد کی نگہبانی کرنے والی ہو، اس کے پائے جانے کو ثابت کرنے والی ہو، گواہوں کے روبرو، اس طور پر کہ کوئی بھی چیز پوشیدہ نہ رہے۔ (یہ پہلے سوال مقدر کا جواب ہے)

اور ذکر اللہ کی دو قسمیں ہیں: (الف) ایک قسم: اس کے ذریعہ قصد کیا جاتا ہے اعلان کرنے کا ذاکر کے تابعدار ہونے کا اللہ کے دین کے لئے اور بنیادی بات اس نوع کے ذکر میں لوگوں کے مجامع کا انتخاب ہے، نہ کہ ذکر کی تکثیر۔ اور اسی نوع سے رمی ہے۔ اور اس وجہ سے رمی کے موقع پر ذکر زیادہ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا —— (ب) اور دوسری نوع: ارادہ کیا جاتا ہے اس کے ذریعہ نفس کے رنگین ہونے کا جبروت (خدائے قدوس) کے لئے جھانکنے کے ذریعہ۔ اور اس نوع میں ذکر کی زیادتی ہے (یہ دوسرے سوال مقدر کا جواب ہے) —— اور نیز: تاریخی روایات میں وہ بات آئی ہے جو چاہتی ہے کہ رمی ایک ایسا طریقہ ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے قائم کیا ہے جب انھوں نے شیطان کو دفع کیا۔ پس اس طرح کے فعل کی نقل کرنے میں نفس کے لئے تنبیہ ہے، کیسی کچھ تنبیہ!

☆ ☆ ☆

ہدی (حج کی قربانی) کی حکمت

۱۰ ذی الحجہ کو منیٰ میں رمی کے بعد حج کی قربانی کی جاتی ہے۔ یہ قربانی مُفرد کے لئے مستحب ہے۔ اور متمتع اور قارن پر واجب ہے۔ اور یہ تشبیہی اور تذکاری (یادگار) عمل ہے یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عمل سے مشابہت پیدا کرنا مقصود ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم کی تعمیل میں، اور اللہ سے لو لگاتے ہوئے منیٰ میں اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی پیش کی تھی۔ حجاج بھی آپ کی موافقت کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور عربوں کے جدامجد حضرت اسماعیل علیہما السلام پر جو نعمت فرمائی تھی یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربان ہونے سے بچالیا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امتحان میں کامیاب فرمایا تھا اس کی یاد تازہ کرنا بھی مقصود ہے۔ کیونکہ ان اکابرین کے عمل جیسا عمل اسی وقت میں اور اسی جگہ میں کرنا نفس کو بہت زیادہ چوکنا کرتا ہے کہ ہمیں بھی ہر قربانی کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

اور متمتع اور قارن پر قربانی واجب اس لئے ہے کہ حج کے ساتھ عمرہ کی جو ممانعت اہل جاہلیت نے گھڑ رکھی تھی،

اور دونوں کے لئے علحدہ علحدہ سفر ضروری قرار دیئے تھے: اللہ تعالیٰ نے اس پابندی کو ہٹا دیا۔ اور متمتع اور قارن نے اس سہولت سے فائدہ اٹھایا، اس لئے بطور شکریہ ان پر قربانی واجب ہے۔

[۸] والسرُّ فی الهدی: التشبُّهُ بفعل سیدنا إبراهیم علیه السلام فیما قَصَدَ من ذَبح ولده فی ذلك المكان طاعةً لربه، وتوجهًا إلیه؛ والتذكُّرُ لنعمة اللّٰه به وبأبیهم إسمعیل علیه السلام، وفعلُ مثلِ هذا الفعل فی هذا الوقت والزمان یُنَبِّهُ النفسَ أیَّ تَنَبُّهٍ.

وإنما وجب علی المتمتع والقارن: شكرًا لنعمة اللّٰه، حیث وَضَعَ عنهم إصرَ الجاهلیة فی تلك المسألة.

ترجمہ: (۸) اور ہدی میں راز: مشابہت پیدا کرنا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عمل کے ساتھ، اس بات میں جس کا انھوں نے قصد کیا اپنے لڑکے کے ذبح کرنے سے، اس جگہ (منی) میں، اپنے پروردگار کی فرمانبرداری کرتے ہوئے، اور ان کی طرف توجہ کرتے ہوئے۔ اور یاد کرنا ہے اللہ کی نعمت کو ان پر اور عربوں کے باپ اسماعیل علیہ السلام پر۔ اور اس جیسا عمل کرنا اُس وقت اور اُس جگہ میں نفس کو چوکنا کرتا ہے، کیسا کچھ چوکنا کرنا! ـــــــ اور متمتع اور قارن پر ہدی واجب ہوئی ہے اللہ کی نعمت کے شکریہ کے طور پر۔ بایں طور کہ اللہ نے اُن سے اتار دیا جاہلیت کا بوجھ اس مسئلہ میں۔

☆ ☆ ☆

حلق یعنی سر منڈا کر احرام کھولنے کی حکمت

قربانی کے بعد احرام کھولا جاتا ہے۔ احرام کھولنے کا افضل طریقہ حلق (سر منڈانا) ہے۔ قصر کرانا یعنی سر کے بال چھٹوانا ثانوی طریقہ ہے۔ یہاں افضل طریقہ کی حکمت بیان کی گئی ہے۔ جس طرح نماز کے تحریمہ سے نکلنے کا طریقہ سلام پھیرنا ہے، اسی طرح احرام سے نکلنے کا طریقہ حلق (سر منڈانا) ہے۔ اور یہ طریقہ دو وجہ سے تجویز کیا گیا ہے:

پہلی وجہ: احرام سے نکلنے کا یہ ایک مناسب طریقہ ہے، وقار کے خلاف نہیں، اس لئے یہ طریقہ متعین کیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جاتا کہ وہ جس طرح چاہیں منافیٔ احرام عمل کے ذریعہ احرام سے نکل سکتے ہیں، تو معلوم نہیں لوگ کیا کیا حرکتیں کرتے۔ کوئی جماع کرتا۔ کوئی شکار کرتا اور کوئی کچھ اور عمل کرتا۔ جیسے نماز سے نکلنے میں آزادی دیدی جائے کہ لوگ کوئی بھی منافیٔ نماز عمل کر کے نماز سے نکل سکتے ہیں، تو لوگ معلوم نہیں کیا کیا مناسب نامناسب حرکتیں کر کے نماز سے نکلیں گے۔ اس لئے سلام کے ذریعہ نماز سے نکلنا واجب کیا گیا۔ کیونکہ یہ ایک باوقار طریقہ ہے اور فی نفسہ بھی ایک ذکر ہے۔ اسی طرح احرام سے نکلنے کے لئے بھی ایک ایسی راہ تجویز کی گئی جو متانت کے منافی نہیں ہے۔

دوسری وجہ: احرام میں سر مٹی سے بھر جاتا ہے۔ جڑوں میں گرد اور میل جم جاتا ہے۔ اس لئے سر کا تَفَث (میل کچیل)

اسی وقت خوب دور ہوسکتا ہے جبکہ سر منڈ دیا جائے۔ اس لئے یہ طریقہ افضل ہے۔

سوال: حج کا ایک اہم رکن طوافِ زیارت ابھی باقی ہے۔ پھر اس سے پہلے احرام کیوں کھول دیا گیا؟

جواب: جب لوگ بادشاہوں کے دربار میں حاضری دیتے ہیں تو خوب صفائی کرکے، بن سنور کر حاضر ہوتے ہیں۔ اسی طرح لوگوں کو طوافِ زیارت کے لئے اپنا حال درست کرکے حاضر ہونا چاہئے۔ سر گرد سے صاف کرلیں، بدن سے میل دور کردیں اور سلے ہوئے موزون کپڑے پہن کر دربار خداوندی میں طوافِ زیارت کے لئے حاضری دیں۔ اسی مقصد سے طوافِ زیارت سے پہلے احرام کھولنا مشروع کیا گیا۔ چنانچہ یہ احرام جزوی طور پر کھلتا ہے یعنی صرف تزئین کی حد تک کھلتا ہے۔ بیوی کے ساتھ معاملہ کرنے میں ابھی احرام باقی ہے۔ کیونکہ ابھی حج کا ایک اہم رکن طوافِ زیارت باقی ہے۔

[۹] والسرُّ فی الحَلْق : أنه تعيينُ طريقٍ للخروج من الإحرام، بفعل لاينافى الوقار، فلو تركهم وأنفسَهم لذهب كلٌّ مذهبًا.

وأيضًا: ففيه تحقيقُ انقضاء التشعُّثِ والتغبُّرِ بالوجه الأتم؛ ومثلُه كمثل السلام من الصلاة.

وإنما قُدِّم على طواف الإفاضة: ليكون شبيها بحال الداخل على الملوك، فى مؤاخذتِهِ نفسَه بإزالةِ تشعُّثِهِ وغباره.

ترجمہ: (۹) اور سر منڈانے میں راز: یہ ہے کہ وہ احرام سے نکلنے کے لئے (مختلف راہوں میں سے) ایک راہ کی تعیین ہے، ایک ایسے عمل کے ذریعہ جو متانت کے منافی نہیں ہے۔ پس اگر لوگوں کو چھوڑ دیا جاتا ان کے نفس کے ساتھ یعنی آزادی دیدی جاتی تو ہر ایک جاتا ایک راہ پر (یعنی لوگ مختلف طریقے اختیار کرتے) ——— اور نیز: اس (حلق) میں پراگندگی اور خاک آلودگی کے ختم ہونے کو ثابت کرنا ہے کامل طور پر ——— اور حلق کا معاملہ نماز کے سلام کے حال جیسا ہے۔

اور حلق کو طوافِ زیارت پر صرف اس وجہ سے مقدم کیا گیا ہے کہ وہ بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہونے والوں کی حالت کے مشابہ ہوجائے، اس کے اپنے نفس کو پابند کرنے میں اپنی پراگندگی اور اپنے گرد کو دور کرنے کے ساتھ۔

☆ ☆ ☆

طواف کا طریقہ

احرام کھولنے کے بعد طوافِ زیارت کیا جاتا ہے، اس لئے طواف کا طریقہ بیان کرتے ہیں کہ پہلے حجر اسود پر پہنچے۔ اس کو چھوئے اور چومے۔ پھر دائیں جانب چلے۔ اور سات چکّر لگائے۔ یہ ایک طواف ہوا۔ ہر چکّر میں جب حجر اسود کے پاس پہنچے تو اس کو چھوئے اور چومے۔ یا چھڑی وغیرہ سے اس کی طرف اشارہ کرے اور تکبیر کہہ کر آگے بڑھے۔ اور جب

رکن یمانی پر پہنچے تو اس کو صرف چھوئے، چومے نہیں۔طواف کے لئے نماز کی طرح طہارت اور ستر پوشی ضروری ہے۔ البتہ دورانِ طواف بات کرنا جائز ہے۔مگر بے ضرورت باتیں نہ کرے۔ذکر میں مشغول رہے۔ہاں خیر کی بات کہنے میں کچھ حرج نہیں مثلاً کسی کی مزاج پرسی کرلی یا کسی کو کوئی مسئلہ بتادیا تو اس میں کچھ حرج نہیں۔پھر طواف کے بعد مقام ابراہیم پر آئے اور دوگانۂ طواف ادا کرے۔

حجر اسود سے طواف شروع کرنے کی وجہ: طواف کسی نہ کسی جگہ سے شروع کرنا ہوگا۔اور طواف میں کسی خاص رُخ پر چلنا ہوگا۔اس لئے قانون سازی کا تقاضا ہے کہ دونوں باتوں کی تعیین کی جائے۔اور یہ بات واضح ہے کہ طواف کی ابتدا کے لئے حجر اسود سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہوسکتی۔کیونکہ یہ ایک متبرک پتھر ہے جو جنت سے اترا ہے(مشکوۃ حدیث ۲۵۷۷)اور دائیں جانب بھی ایک مبارک جہت ہے۔بائیں پر اس کو فضیلت حاصل ہے۔اس لئے حجر اسود سے طواف کی ابتدااور دائیں جانب چلنا تجویز کیا گیا۔

طوافِ قدوم کی وجہ: قُدوم کے معنی ہیں: آنا۔جب آفاقی حج کا احرام باندھ کر مکہ مکرمہ پہنچے تو طوافِ قدوم مسنون ہے۔کیونکہ حج کا طواف: طوافِ زیارت ۱۰ ذی الحجہ کو کیا جائے گا۔پس جس طرح نماز کے لئے کوئی شخص مسجد میں پہنچتا ہے اور وقت میں گنجائش ہوتی ہے تو دوگانۂ تحیۃ المسجد مسنون ہے اسی طرح یہ طوافِ قدوم بھی مسنون ہے۔

اور طوافِ قدوم میں دو حکمتیں ہیں: ایک مثبت پہلو سے دوسری منفی پہلو سے:

مثبت پہلو سے یہ حکمت ہے کہ یہ طواف تحیۃ المسجد کی طرح بیت اللہ کی تعظیم کے لئے کیا جاتا ہے یعنی کعبہ شریف کا یہ حق ہے کہ آتے ہی اس کا طواف کیا جائے۔جیسے مسجد کا یہ حق ہے کہ اس میں داخل ہوتے ہی نماز پڑھی جائے۔

اور منفی پہلو سے حکمت یہ ہے کہ بیت اللہ کی بے ادبی سے بچنا ضروری ہے کیونکہ طواف کی جگہ میں یعنی بیت اللہ کے پاس، جب طواف کے لئے موقع بھی ہو اور طواف کے تمام اسباب بھی مہیا ہوں، حیض وغیرہ کوئی چیز مانع نہ ہو، پھر بھی طواف کرنے میں دیر کرنا ایک طرح کی بے ادبی ہے۔

رمل اور اضطباع کی حکمت: رمل: ایک خاص انداز کی چال کا نام ہے۔جس میں طاقت وقوت کا اظہار ہوتا ہے۔اور وہ انداز یہ ہے کہ آدمی چھوٹے چھوٹے قدم رکھ کر، کندھے ہلاتا ہوا ذرا تیز چلے۔جس طرح پہلوان اکھاڑے میں اترتا ہے تو چلتا ہے۔اور اضطباع کے معنی ہیں: دائیں بغل سے چادر نکال کر بائیں کندھے پر ڈال لینا۔یہ وضع رمل میں سہولت کے لئے ہے۔

مسئلہ: کعبہ کے پہلے طواف میں، جس کے بعد سعی بھی کرنی ہو، پہلے تین پھیروں میں رمل کرنا اور باقی چار پھیروں میں حسب عادت چلنا مسنون ہے۔پس عمرہ کے طواف میں اور طواف قدوم میں جبکہ اس کے بعد حج کی سعی کرنے کا ارادہ ہو تو یہ عمل مسنون ہے۔اور اگر اس وقت سعی کرنے کا ارادہ نہ ہو تو طوافِ قدوم میں رمل اور اضطباع نہ کرے۔بلکہ طواف زیارت میں رمل اور اضطباع کرے، اگر اس نے کپڑے نہ پہن لئے ہوں۔اور یہ عمل دو سبب سے مسنون ہے:

پہلا سبب: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ ۷ھ میں جب رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کے ساتھ عمرہ کیا، تو مشرکین نے آپس میں کہا کہ مسلمانوں کو مدینہ کے بخار نے نحیف کر دیا ہے، آؤ، دیکھیں وہ طواف وسعی کیسے کرتے ہیں یعنی اس سے ان کے ضُعف وقوت کا پتہ چل جائے گا۔ جب رسول اللہ ﷺ کو یہ بات پہنچی تو آپؐ نے صحابہ کو طواف میں رمل کرنے کا حکم دیا۔ مشرکین طواف کا منظر دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ اور یہ کہتے ہوئے چل دیئے کہ کون کہتا ہے کہ مسلمان کمزور ہوگئے ہیں؟ یہ تو ہرنوں کی طرح چوکڑیاں بھر رہے ہیں اور کود کود کر طواف کر رہے ہیں! غرض یہ عمل مشرکوں کے دلوں میں ہیبت بٹھانے کے لئے اور مسلمانوں کا غلبہ دکھانے کے لئے کیا گیا تھا۔ پس یہ ایک طرح کا جہادی عمل تھا۔ مگر اب یہ سبب ختم ہوگیا اور نمٹ گیا، کیونکہ اب وہاں کوئی مشرک نہیں ہے۔

دوسرا سبب: رمل واضطباع کے ذریعہ اللہ کی عبادت میں رغبت کی صورت گری، اور اس بات کا اظہار مقصود ہے کہ دور دراز کے سفر نے اور سخت تھکن نے ان کے شوق ورغبت میں اضافہ ہی کیا ہے، ان کو کچھ پژمردہ نہیں کیا۔ بلکہ:

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک ❁ آتشِ شوق تیز تر می گردد

یعنی جب وصلِ محبوب کا وعدہ نزدیک آجاتا ہے، تو شوق وولولہ فزوں ہوجاتا ہے۔ اور عربی شاعر کہتا ہے:

إذا اشْتَكَتْ من كَلالِ السير، وَاعَدَها ❁ روحَ الوصال، فَتُحْيَا عند ميعادِ

ترجمہ: جب اونٹنی تعبِ سفر کی شکایت کرتی ہے، تو مسافر اس کو یاد دلاتا ہے ÷ وصالِ محبوب کا مزہ، تو وعدہ یاد دلانے پر اس میں جان پڑ جاتی ہے۔

فائدہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے خلافت کے زمانہ میں رمل اور اضطباع کو اس کے پہلے سبب کے ختم ہوجانے کی وجہ سے: چھوڑ دینے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر پھر آپ کی سمجھ میں اجمالاً یہ بات آئی کہ شاید اس کا کوئی اور ایسا سبب ہو (مثلاً مذکورہ بالا دوسرا سبب) جو منقضی ہونے والا نہ ہو، اس لئے آپؓ نے رمل اور اضطباع نہیں چھوڑا (ابوداؤد حدیث ۱۸۸۷) اور یہ بات اس طرح سمجھ میں آئی کہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع میں بھی یہ اعمال کئے ہیں۔ جبکہ وہاں کوئی مشرک موجود نہیں تھا۔

[۱۰] وصفة الطواف: أن يأتيَ الحجر، فيستلِمَه، ثم يمشيَ على يمينه سبعة أَطْوِفَةٍ، يقبِّلُ فيها الحجر الأسود، أو يشير إليه بشيئ في يده كالمِحْجَنِ، ويكبر، ويستلم الركنَ اليماني، وليكن في ذلك على طهارة، وسَتْرِ عورةٍ، ولا يتكلم إلا بخير، ثم يأتي مقامَ إبراهيم، فيصلي ركعتين.

[الف] أما الابتداءُ بالحجر: فلأنه وجب عند التشريع أن يعيَّنَ محلُ البداءة وجهةُ المشي، والحجرُ أحسنُ مواضع البيت، لأنه نازل من الجنة؛ واليمينُ أيمنُ الجهتين.

[ب] وطواف القدوم بمنزلة تحية المسجد، إنما شُرع تعظيما للبيت، ولأن الإبطاء بالطواف في مكانه وزمانه، عند تَهَيُّئِ أسبابه: سوءُ أدب.

[ج] وأولُ طوافٍ بالبيت فيه رملٌ واضطباع، وبعده سعي بين الصفا والمروة، وذلك لمعانٍ: منها : ما ذكره ابن عباس رضي الله عنهما: من إخافةِ قلوب المشركين، وإظهارِ صولةِ المسلمين؛ وكان أهل مكة يقولون: "وهَنَتْهم حمى يثرب!" فهو فعل من أفعال الجهاد؛ وهذا السبب قد انقضى ومضى.

ومنها : تصويرُ الرغبة في طاعة الله، وأنه لم يزده السفرُ الشاسعُ والتعبُ العظيمُ إلا شوقًا ورغبةً، كما قال الشاعر:

إذا اشْتَكَتْ من كَلالِ السير، وَاعَدَها ۞ روحَ الوصال، فَتُحْيَا عند ميعادِ

وكان عمر رضي الله عنه أراد أن يترك الرملَ والاضطباع، لانقضاء سَبَبِهما، ثم تفطَّن إجمالاً أن لهما سببًا آخر غير منقضٍ، فلم يتركهما.

ترجمہ: اورطواف کا طریقہ: یہ ہے کہ آئے حجراسود پر، پس اس کو چھوئے۔ پھر اپنی داہنی جانب سات پھیرے چلے۔ ان پھیروں میں حجراسود کو چومے یا اس کی طرف کسی چیز سے اشارہ کرے جو اس کے ہاتھ میں ہو، جیسے مُڑی ہوئی سر والی چھڑی۔ اور تکبیر کہے۔ اور رکن یمانی کو چھوئے۔ اور چاہئے کہ وہ اس طواف میں پاکی اور ستر پوشی پر ہو۔ اور نہ بات چیت کرے مگر عمدہ بات۔ پھر مقام ابراہیم پر آئے۔ پس دو رکعتیں پڑھے۔

(الف) رہا حجراسود سے طواف شروع کرنا: تو اس لئے ہے کہ قانون سازی کے وقت یہ بات ضروری ہے کہ طواف شروع کرنے کی جگہ اور چلنے کا رخ متعین کیا جائے۔ اور حجراسود بیت اللہ کی جگہوں میں بہترین جگہ ہے، اس لئے کہ وہ جنت سے اترا ہے۔ اور دایاں: دو جہتوں میں برکت والی جہت ہے۔

(ب) اور طوافِ قدوم بمنزلۂ تحیۃ المسجد ہے۔ بیت اللہ کی تعظیم ہی کے لئے مشروع کیا گیا ہے۔ اور اس لئے کہ طواف میں دیر کرنا، طواف کی جگہ میں اور اسکے وقت میں اور اس کے اسباب کے مہیا ہونے کے وقت: ایک طرح کی بے ادبی ہے۔

(ج) اور بیت اللہ کے پہلے طواف میں رمل اور اضطباع ہے۔ اور اس کے بعد صفا و مروہ کے درمیان سعی ہے۔ اور وہ بات چند اسباب سے ہے: ان میں سے: وہ سبب ہے جس کو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر کیا ہے۔ یعنی مشرکین کے دلوں میں ہیبت بٹھانا اور مسلمانوں کے غلبہ کا اظہار۔ اور مکہ والے کہا کرتے تھے: "مسلمانوں کو یثرب کے بخار نے کمزور کر دیا ہے" پس وہ اعمالِ جہاد میں سے ایک عمل ہے۔ اور یہ سبب تحقیق ختم ہوگیا اور گذر گیا ——— اور ان اسباب میں سے: اللہ کی عبادت میں رغبت کی صورت گری ہے اور اس بات کا اظہار ہے کہ نہیں زیادہ کیا اس میں دور دراز کے سفر نے اور سخت تھکن نے مگر شوق اور رغبت کو۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے: "جب اونٹنی سفر کی تکان کا شکوہ کرتی ہے تو سوار اس سے وعدہ کرتا ہے۔ وصال کی راحت کا تو وہ زندہ کر دی جاتی ہے وعدہ کے وقت" ——— اور عمر رضی اللہ عنہ نے چاہا

تھا کہ وہ رمل اور اضطباع کو چھوڑ دیں۔ ان دونوں کے سبب کے ختم ہوجانے کی وجہ سے۔ پھر آپ کی سمجھ میں اجمالاً یہ بات آئی کہ ان دونوں کے لئے کوئی دوسرا سبب بھی ہے جو ختم ہونے والا نہیں۔ پس آپ نے ان دونوں کو نہیں چھوڑا۔

☆ ☆ ☆

عمرہ میں وقوفِ عرفہ نہ ہونے کی وجہ

حج کے بنیادی ارکان دو ہیں: وقوفِ عرفہ اور طواف زیارت اور اس کے بعد سعی۔ اور عمرہ: حج اصغر ہے۔ پھر اس میں صرف ایک رکن: طواف مع سعی کیوں ہے؟ اس میں وقوفِ عرفہ کیوں نہیں؟ شاہ صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں کہ عمرہ میں وقوفِ عرفہ اس وجہ سے مشروع نہیں کیا گیا کہ عمرہ کرنے کا کوئی وقت متعین نہیں۔ ایام حج کے علاوہ پورے سال عمرہ کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے میدانِ عرفات میں اجتماعی طور پر جمع ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ اور انفرادی وقوف میں کچھ فائدہ نہیں۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ حج کی طرح عمرہ کے لئے بھی وقت مقرر کردیا جائے تو اس میں کیا حرج ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پھر وہ عمرہ کہاں رہے گا، حج ہوجائے گا۔ اور سال میں دو مرتبہ لوگوں کو حج کی دعوت دینے میں جو زحمت ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ——— اور اصل بات یہ ہے کہ عمرہ میں مقصود بالذات: بیت اللہ کی تعظیم اور اللہ کی نعمتوں کا شکر بجالانا ہے۔ اور یہ مقصد صرف طواف سے پورا ہوجاتا ہے۔ اس کے لئے عرفہ میں جمع ہونے کی ضرورت نہیں۔

[۱۱] وإنما لم يُشْرَعِ الوقوف بعرفة في العمرة: لأنها ليس لها وقت معين، ليتحقق معنى الاجتماع، فلافائدة للوقوف بها؛ ولو شُرع لها وقتٌ معين كانت حجًا، وفي الاجتماع مرتين في السَّنَةِ مالا يخفى؛ وإنما العمدةُ في العمرة تعظيمُ بيت الله، وشكر نعمة الله.

ترجمہ: (۱۱) اور عمرہ میں وقوفِ عرفہ صرف اس وجہ سے مشروع نہیں کیا گیا کہ عمرہ کے لئے کوئی وقت معین نہیں ہے تاکہ اجتماع کا مقصد متحقق ہو۔ پس عمرہ کے وقوف میں کچھ فائدہ نہیں۔ اور اگر مشروع کیا جاتا عمرہ کے لئے کوئی معین وقت تو وہ حج ہوجاتا۔ اور سال میں دو مرتبہ اکٹھا ہونے میں وہ دقّت ہے جو مخفی نہیں۔ اور عمرہ میں مقصود بالذات بیت اللہ کی تعظیم اور اللہ کی نعمت کا شکر بجالانا ہے۔

☆ ☆ ☆

صفا و مروہ کے درمیان سعی کی حکمتیں

عمرہ میں مکہ مکرمہ پہنچتے ہی طواف کے بعد سعی کی جاتی ہے۔ اور حج میں بھی عام طور پر طوافِ قدوم کے بعد سعی کرلی جاتی ہے۔ سعی میں دو حکمتیں ہیں: ایک: یہ یادگاری عمل ہے۔ دوسری: یہ ذکر اللہ کی گرم بازاری کے لئے ہے۔ اور دونوں

حکمتیں منصوص ہیں۔ تفصیل درج ذیل ہے:

پہلی حکمت —— سعی ایک تذکاری عمل ہے —— بخاری شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک طویل حدیث (نمبر ۳۳۶۴) مروی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام پیاس سے بلکنے لگے۔ اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا سے ان کا حال دیکھا نہ گیا، تو وہ ایک پریشان حال انسان کی طرح صفاومروہ کے درمیان سات مرتبہ دوڑیں۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے بطور خرق عادت زمزم کا چشمہ نمودار کیا جس سے دونوں کے دِلدّر دور ہوگئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جُرہم قبیلہ کے دل میں الہام کیا کہ وہ وہاں آباد ہوجائیں۔ چنانچہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی وحشت بھی دور ہوئی۔ پس حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد پر اور ان کے متبعین پر اس نعمت کی شکر گزاری اور زمزم کے معجزہ کو یاد رکھنا ضروری ہوا۔ تاکہ ان کی بہیمیت حیران ہوجائے۔ کیونکہ جب کوئی معجزہ دیکھا جاتا ہے یا اس کا تذکرہ سنا جاتا ہے تو نفس کا دین سے نفور کم ہوتا ہے۔ اور وہ معجزہ ان کی اللہ کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔ یہی معجزہ کا فائدہ ہے۔ اُس سے اللہ کی راہ ملتی ہے۔ اور نعمت کی شکر گزاری اور معجزہ کو یاد رکھنے کی اس سے بہتر کوئی صورت نہیں کہ ان دونوں باتوں کا لوگوں کے دلوں میں جو اعتقاد ہے اس کو کمک پہنچائی جائے ایک ایسے عمل کے ذریعہ جو واضح اور متعین ہو، جو قوم کے مالوف کے خلاف ہو یعنی قوم اس کی عادی نہ ہو اور اس میں خاکساری کا پہلو بھی ہو۔ اور یہ کمک لوگوں کے اعتقاد کو مکہ میں آتے ہی پہنچائی جائے۔ اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے جہد ومشقت کی محاکات کی جائے۔ کیونکہ زبانی تشکر وتذکر سے بہت زیادہ کارگر حکایتِ حال ہے۔ اس لئے مکہ پہنچتے ہی سعی کا عمل تجویز کیا گیا۔

دوسری حکمت —— سعی کا عمل ذکر اللہ کی گرم بازاری کے لئے ہے —— ابھی یہ حدیث گذری ہے کہ "جمرات کی رمی اور صفاومروہ کے درمیان سعی: یہ دونوں عمل ذکر اللہ کے اہتمام کے لئے مقرر کئے گئے ہیں" اور یہ چیز دیدنی ہے، شنیدنی نہیں۔ صفاومروہ کے درمیان رات دن ذکر کا وہ زمزمہ بلند ہوتا ہے، اور وہ انوار ٹپکتے ہیں کہ چشم بصیرت کے دیکھنے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ الفاظ ان کا نقشہ کھینچنے سے قاصر ہیں۔ مجھے یاد آیا جب میں نے پہلی مرتبہ حج کیا تو اہلیہ صاحبہ ہمراہ تھیں۔ جب ہم نے طوافِ زیارت کے بعد سعی کی تو دونوں تھک گئے۔ اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ ہم ایک گھنٹہ تک صفاومروہ کا منظر دیکھتے رہے۔ پھر میں نے اہلیہ سے دریافت کیا: آپ نے اب تک حج کے سارے ہی مناظر دیکھ لئے ہیں۔ بتاؤ: تمہیں سب سے پیارا منظر کونسا نظر آیا؟ کہنے لگیں: یہی منظر موہنی ہے! اور میرا بھی یہی تاثر تھا (یہ دوسری حکمت اضافہ ہے)

[۱۲] والسر فی السعی بین الصفا والمروۃ —— علی ما ورد فی الحدیث —— : أن هاجر أمَّ إسماعيل عليه السلام لما اشتدَّ بها الحالُ سعت بينهما سعيَ الإنسانِ المجهود، فكشف الله عنهما الجهدَ بإبداء زمزمَ، وإلهامِ الرغبةِ فی الناس أن يَعْمُرُوا تلك البقعة، فوجب شكرُ تلك النعمة على أولاده ومن تبعهم، وتذكُّرُ تلك الآية الخارقة، لِتُبْهَتَ بهيميتُهم، وتَدُلَّهم على الله،

ولاشيئَ في مثل هذا مثل أن يُعْضَدَ عقد القلب بهما بفعل ظاهر منضبطٍ، مخالفٍ لمألوف القوم، فيه تذلل، عند أول دخولهم مكة، وهو محاكاة ماكانت فيه من العَنَاء والجهد؛ وحكايةُ الحال في مثل هذا أبلغ بكثير من لسان المقال.

ترجمہ: (۱۲) اور صفا و مروہ کے درمیان سعی میں راز ——— اس طور پر جو حدیث میں آیا ہے ——— یہ ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ حضرت ہاجرہ، جب ان کو سخت پریشانی لاحق ہوئی تو وہ صفا و مروہ کے درمیان سخت پریشان انسان کے چلنے کی طرح چلیں۔ پس ہٹا دیا اللہ تعالیٰ نے دونوں سے مشقت کو آب زمزم ظاہر کر کے، اور لوگوں کے دلوں میں رغبت ڈال کر کے کہ وہ اس خطہ کو آباد کریں۔ پس ضروری ہوا اس نعمت کا شکر بجالانا اسماعیل علیہ السلام کی اولاد پر اور ان لوگوں پر جو ان کی پیروی کریں۔ اور (ضروری ہوا) اس خرقِ عادت معجزہ کو یاد کرنا، تاکہ ان کی قوت بہیمیہ ہلکی ہلکی کردی جائے۔ اور وہ ان کی اللہ کی طرف راہ نمائی کرے۔ اور نہیں ہے کوئی چیز اس معاملہ میں مانند اِس بات کے کہ قوی کیا جائے دل کا اعتقاد ان دونوں (شکر و تذکر) کے ساتھ کسی واضح متعین عمل کے ذریعہ، جو لوگوں کے مالوف کے خلاف ہو، جس میں خاکساری ہو (قوی کیا جائے) لوگوں کے مکہ میں داخل ہوتے ہی۔ اور وہ عمل نقل کرنا ہے اس تکلیف و مشقت کی جس میں حضرت ہاجرہ تھیں۔ اور حکایتِ حال اس جیسے معاملہ میں زبانِ مقال سے بدرجہا زیادہ مؤثر ہے۔

ترکیب: تذکر کا عطف شکر پر ہے...... **یُعضَد قلبُ العقدِ بھما** میں جار مجرور **العقد** سے متعلق ہیں...... **بفعلِ إلخ یُعضد** سے متعلق ہے...... **مخالفٍ** صفت ہے **فعلٍ** کی...... جملہ **فیه تذلل** بھی اس کی صفت ہے...... اور **عند أول إلخ یُعضد** کا ظرف ہے...... **وھو محاکاۃ** کا مرجع مصدر ہے جو **یُعضد** سے منتزع ہے، اسی کا ترجمہ عمل کیا گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

طوافِ وَداع کی حکمت

حدیث ——— حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لوگ (حج سے فارغ ہو کر منیٰ سے) ہر طرف چل دیتے تھے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی ہرگز کوچ نہ کرے، یہاں تک کہ اس کی آخری ملاقات بیت اللہ سے ہوجائے۔ مگر بیشک آپ نے حائضہ سے حکم ہلکا کیا'' (مشکوۃ حدیث ۲۶۶۸)

تشریح: طوافِ وَداع کر کے ہی وطن لوٹنے میں دو حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: مناسک کی ترتیب میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر حج کا اہم مقصد بیت اللہ کی تعظیم و تکریم اور اس کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار ہے۔ چنانچہ مکہ مکرمہ میں حاضری کے بعد سب سے پہلا عمل طوافِ قدوم ہے یعنی حاضری کا طواف۔ مسجد حرام میں داخل ہوتے ہی یہ طواف کیا جاتا ہے تحیۃ المسجد بھی نہیں پڑھی جاتی۔ پھر حج سے فارغ

ہونے کے بعد آفاقی جب وطن کی طرف کوچ کرتا ہے تب بھی یہی حکم ہے کہ آخری وَداعی طواف کرکے لوٹے۔ یہ اس بات کی منظر کشی ہے کہ مقصودِ سفر بیت اللہ ہی ہے۔

دوسری حکمت: لوگ جب بادشاہوں سے رخصت ہوتے ہیں تو الوداعی ملاقات کرکے ہی کوچ کرتے ہیں۔ طواف وَداع میں اس کی موافقت پیش نظر ہے۔ یعنی حجاج کرام کو بھی جو بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوئے ہیں، اللہ پاک سے ملاقات کرکے اپنے وطنوں کو مراجعت کرنی چاہئے۔ اور اللہ کی ملاقات کی یہی صورت ہے کہ ان کے گھر کے پھیرے لگا کر لوٹے، کیونکہ ان کی ہستی غیر محسوس ہے۔

[۱۳] قال النبی صلی اللہ علیه وسلم: "لایَنْفِرَنَّ أحدُکم حتی یکون آخِرُ عهده با لبیت، إلا أنه خَفَّفَ عن الحائض"

أقول: السر فیه: تعظیمُ البیت، بأن یکون هو الأول، وهو الآخر، تصویرًا لکونه هو المقصود من السفر، وموافقةً لعادتهم فی تودیع الوفودِ ملوکَها عند النفر، واللّٰه أعلم.

ترجمہ: (۱۳) نبی صَلَّاللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ نے فرمایا: ...... میں کہتا ہوں: راز طواف وَداع میں: بیت اللہ کی تعظیم ہے، بایں طور کہ ہو بیت اللہ ہی اول اور وہی آخر، تصویر کشی کرنے کے طور پر بیت اللہ ہی کے ہونے کی سفر حج سے مقصود بالذات اور لوگوں کی عادت کی موافقت کرنے کے طور پر، وفود کے رخصت کرنے میں اپنے بادشاہوں کو کوچ کے وقت۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

باب ــــــ ۳

حجۃ الوَداع کا بیان

مکہ مکرمہ رمضان ۸ھ میں فتح ہوا، اور راجح قول کے مطابق ۹ھ میں حج کی فرضیت کا حکم آیا۔ اس سال بعض مصالح کے پیش نظر خود رسول اللہ صَلَّاللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ نے حج نہیں فرمایا۔ لیکن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر الحج بنا کر بھیجا۔ ان کی امارت میں حج ادا ہوا۔ اگلے سال ۱۰ھ میں جو آپؐ کی حیاتِ مبارکہ کا آخری سال تھا۔ آپؐ نے حج کا ارادہ فرمایا۔ اور چونکہ آپؐ کو یہ اشارہ مل چکا تھا کہ اب آپؐ کی دنیوی زندگی کا وقت تھوڑا ہی باقی رہ گیا ہے، اس لئے آپؐ نے مختلف مواقع میں لوگوں کو صاف صاف آگاہی دی کہ اب میرا وقتِ موعود قریب ہے۔ اور لوگوں کو دین کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع اس کے بعد نہیں مل سکے گا، گویا یہ حج الوداعی ملاقات تھی۔ اس لئے اس حج کو حجۃ الوداع یعنی رخصتی حج کہا جاتا ہے۔ شاہ صاحب قدس سرہ مختلف روایات سے اخذ کرکے یہ پورا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی حکمتیں بھی بیان کرتے جاتے

ہیں، جو اس کتاب کا خاص موضوع ہے۔ فرماتے ہیں:

حجۃ الوداع کا بیان حضرت جابر، حضرت عائشہ، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم اور ان کے سوا دیگر صحابہ کی روایات میں مروی ہے۔ اور یہ تمام روایات مشکوۃ شریف، باب قصة حجة الوداع میں ہیں۔

① —— رسول اللہ ﷺ نے مدینہ آکر نو سال تک کوئی حج نہیں کیا۔ پھر ۱۰ھ میں آپؐ نے اعلان کرایا کہ اس سال آپؐ کا حج کا ارادہ ہے۔ چنانچہ لوگ بڑی تعداد میں مدینہ آگئے۔ تاکہ شروع ہی سے آپؐ کی ہمراہی میں حج کریں۔ ۲۴/ ذی قعدہ بروز جمعہ آپؐ نے خطبہ دیا اور سفر حج کے بارے میں ہدایات دیں۔ اگلے روز ۲۵/ ذی قعدہ کو نماز ظہر کے بعد روانگی عمل میں آئی۔ اور عصر کی نماز ذوالحلیفہ میں پہنچ کر ادا فرمائی۔ اگلے دن ۲۶/ ذی قعدہ کی دوپہر تک قیام فرمایا۔ تاکہ سب ساتھی آکر جُڑ جائیں۔ ظہر کے بعد آپؐ نے غسل فرمایا، خوشبو لگائی، احرام پہنا اور مسجد میں دوگانۂ احرام ادا کیا۔ اور تلبیہ پڑھا۔ تلبیہ یہ ہے: لبيك اللهم لبيك، لبيك لاشريك لك لبيك، إن الحمدَ والنعمةَ لك والملكَ، لاشريك لك: ترجمہ پہلے گذر چکا ہے۔

دو باتوں میں اختلاف کا فیصلہ

یہاں دو باتوں میں اختلاف ہوا ہے۔ جو درج ذیل ہیں:

پہلی بات —— رسول اللہ ﷺ کا یہ حج کیسا حج تھا؟ —— یعنی آپؐ نے اِفراد (تنہا حج) کیا تھا۔ یا تمتع کیا تھا یعنی مکہ پہنچ کر حج کی نیت عمرہ سے بدل دی تھی۔ اور افعالِ عمرہ کر کے احرام کھول دیا تھا۔ پھر جب حج کا وقت آیا، تو از سرِ نو حج کا احرام باندھا تھا۔ یا آپؐ نے شروع سے صرف حج کا احرام باندھا تھا۔ پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام کا ایماء پا کر حج کے ساتھ عمرہ کی بھی نیت کر لی تھی۔ اور آپؐ احرام ہی کی حالت میں رہے تھے، کیونکہ آپؐ کے ساتھ قربانیاں تھیں؟

فائدہ: شاہ صاحب قدس سرہ نے اس اختلافی مسئلہ میں کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ اس لئے عرض ہے کہ اس سلسلہ میں روایات میں اختلاف ہے: سترہ صحابہ سے عمدہ سندوں کے ساتھ مروی ہے کہ آپؐ نے قران کیا تھا۔ اور پانچ صحابہ سے تمتع کرنا مروی ہے۔ اور چار صحابہ سے افراد مروی ہے (معارف السنن ۶:۶ ۲۷) مگر صورتِ حال یہ تھی کہ جب آپ نے ذوالحلیفہ سے احرام باندھا تھا تو اس وقت حج کے سفر میں عمرہ کرنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ جاہلیت کے عقیدہ کے مطابق ایسا کرنا بڑا گناہ تھا۔ اور شریعت کا حکم ابھی نازل نہیں ہوا تھا۔ اس لئے آپؐ نے صرف حج کا احرام باندھا تھا۔ افراد کی روایات کا یہی محمل ہے یعنی ان رُوات نے آپؐ کی ابتدائی حالت کا تذکرہ کیا ہے —— پھر مکہ مکرمہ پہنچ کر جب یہ حکم آیا کہ لوگ حج کا احرام عمرہ سے بدل دیں یعنی نیت بدل دیں اور افعالِ عمرہ کر کے احرام کھول دیں، تو آپؐ کے لئے احرام کھولنے میں یہ مجبوری تھی کہ آپ قربانیاں ساتھ لائے تھے۔ جب تک وہ ذبح نہ ہو جائیں آپؐ احرام نہیں کھول سکتے تھے۔ اس لئے آپؐ نے حج کے ساتھ عمرہ کی نیت بھی کر لی۔ اب آپؐ قارن ہو گئے۔ قران کی روایات اسی آخری حالت کے اعتبار سے

ہیں۔ اور تمتع سے لغوی معنی مراد ہیں یعنی آپؐ نے بھی فائدہ اٹھایا یعنی ایک ہی سفر میں حج وعمرہ بصورتِ قران ادا فرمائے۔ قران کو بھی لغوی معنی کے اعتبار سے تمتع کہہ سکتے ہیں۔ پس روایات کا اختلاف ختم ہوگیا اور آپؐ کا قران کرنا متحقق ہوگیا۔ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم (۸: ۱۳۵ مصری) میں مختلف روایات میں یہی تطبیق دی ہے۔ واللہ اعلم۔

دوسری بات ـــــ آپؐ نے پہلا تلبیہ کب پڑھا تھا؟ ـــــ اس سلسلہ میں بھی روایات مختلف ہیں: (۱) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ آپؐ نے پہلا تلبیہ اس وقت پڑھا تھا جب ناقہ آپؐ کو لیکر کھڑی ہوئی تھی (۲) بعض دوسرے صحابہ کا بیان ہے کہ جب آپ بیداء نامی ٹیلے پر چڑھے تھے تو آپؐ نے پہلی بار تلبیہ پڑھا تھا (۳) اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے دوگانۂ احرام کے بعد معاً پہلی بار تلبیہ پڑھا تھا۔

مگر ابوداؤد (حدیث ۱۷۷۰) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس اختلاف کی وجہ اور صحیح صورتِ حال مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ سب لوگ آپؐ کے پاس مجتمع نہیں تھے۔ ٹولیاں ٹولیاں آرہے تھے۔ آپؐ نے دوگانۂ احرام کے بعد ہی پہلا تلبیہ پڑھا تھا۔ مگر اس کا علم صرف ان چند حضرات کو ہوا جو اس وقت وہاں موجود تھے۔ پھر جب ناقہ آپؐ کو لیکر اٹھی تو اس وقت آپؐ نے تلبیہ پڑھا۔ کچھ لوگوں نے یہ تلبیہ سنا اور اسی کو پہلا تلبیہ قرار دیا۔ پھر جب آپ بیداء پر چڑھے تو پھر آپؐ نے تلبیہ پڑھا۔ جن لوگوں نے یہی تلبیہ سنا انھوں نے اسی کو پہلا تلبیہ قرار دیا۔ حالانکہ آپؐ نے نماز کے بعد ہی پہلی مرتبہ تلبیہ پڑھا تھا۔

غسل کر کے احرام باندھنے کی وجہ: یہ ہے کہ احرام شعائر اللہ میں سے ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ توحید کا شہرہ پھیلتا ہے۔ پس نہا کر احرام باندھنے میں اس کی تعظیم ہے۔ جیسے قرآن شعائر اللہ میں سے ہے۔ پس باوضوء قرآن کو ہاتھ لگانے میں اس کی زیادہ تعظیم ہے۔

دوگانۂ احرام کی وجہ: نیت ایک پوشیدہ امر ہے۔ اس کو ایک ایسے فعل کے ذریعہ جو عمل کو اللہ کے لئے خالص کرنے پر اور اللہ کی عبادت کے اہتمام پر دلالت کرنے والا ہے متعین ومنضبط کیا گیا ہے۔ تاکہ نفس کے لئے یہ بات خوب واضح ہوجائے کہ وہ ایک اہم عمل شروع کررہا ہے۔

احرام کے مخصوص لباس کی وجہ: احرام: لنگی اور چادر پہن کر شروع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح لباس کی تبدیلی یعنی محتاجوں اور فقیروں کی صورت بنا کر احرام باندھنے میں نفس کو چوکنا اور بیدار کرنا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے خاکساری کرنے کے لئے تیار ہوجائے، اب وہ فروتنی میں کوتاہی نہ کرے۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ پیشہ ور فقیر جب مانگنے کے لئے نکلتے ہیں تو فقیرانہ وضع بنا کر نکلتے ہیں۔ اب ان کو لوگوں کی منت کرنے میں عار محسوس نہیں ہوتا۔

احرام سے پہلے خوشبو لگانے کی وجہ: چونکہ احرام باندھنے کے بعد محرم خاک آلود ہوجائے گا۔ اس کے جسم سے اور کپڑوں سے پسینہ اور میل کی بو آنے لگے گی، اس لئے ضروری ہے کہ احرام باندھنے سے پہلے اس کی کچھ تلافی کرلی

جائے۔تا کہ صورتِ حال کچھ دیر سے بگڑے۔

تلبیہ کے الفاظ کی معنویت: تلبیہ میں مخصوص الفاظ اس لئے پسند کئے گئے ہیں کہ وہ اپنے مولی کی بندگی پر برقرار رہنے کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اوراس کو یہ بات بھی یاد دلاتے ہیں کہ اب وہ بندگی کے لئے کمر بستہ ہوگیا ہے۔ پس اس کوعبادت کا حق پورا پورا ادا کرنا چاہئے۔

تلبیہ میں لاشریك لك شامل کرنے کی وجہ: تلبیہ میں دومرتبہ لاشریك لك شامل کیا گیا ہے، کیونکہ زمانۂ جاہلیت کے لوگ اپنے بتوں کی تعظیم کیا کرتے تھے اورتلبیہ میں ان کا بھی تذکرہ کیا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے: لاشریك لك، إلا شریگا هو لك، تملِكه وماملَكَ یعنی آپ کا کوئی شریک نہیں،مگر وہ شریک جوآپ کا ہے۔جس کے آپ مالک ہیں، اوروہ مالک نہیں۔ چنانچہ مشرکین کی تردید کرنے کے لئے اور مسلمانوں کے تلبیہ کو مشرکوں کے تلبیہ سے جدا کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے تلبیہ میں یہ جملہ بڑھایا ہے۔

تلبیہ کے بعد دعا: کچھ وقت تلبیہ پڑھنے کے بعد مستحب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے جس میں اللہ تعالیٰ سے اس کی رضا کی زیادتی اورجنت مانگی جائے۔ اوردوزخ کے عذاب سے پناہ چاہی جائے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب تلبیہ سے فارغ ہوتے تو اللہ تعالیٰ سے اس کی خوشنودی اور جنت طلب کرتے تھے۔ اوراس کی رحمت کے طفیل سے دوزخ سے خلاصی مانگتے تھے (مشکوۃ حدیث ۲۵۵۲) اس کے بعد اور بھی دعا کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔

﴿قصة حَجَّةِ الوَداع﴾

الأصل فيها حديث جابر، وعائشة، وابن عمر، وغيرهم رضی الله عنهم:

[۱] اعلم أن رسول الله صلى الله عليه وسلم مكث بالمدينة تسع سنين لم يُحَجَّ، ثم أَذَّنَ فى الناس فى العاشرة: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم حاجٌّ، فقدم المدينة بشر كثير، فخرج حتى أتى ذاالحليفة، فاغتسل، وتطيب، وصلى ركعتين فى المسجد، ولبس إزارًا ورداءً، وأحرم ولبّى:" لبيك اللهم لبيك، لبيك لاشريك لك لبيك، إنَّ الحمدَ والنعمةَ لك والملك، لاشريك لك"

أقول: اختُلف ههنا فى موضعين:

أحدهما: أن نسكه ذلك كان حجًا مفرَدًا، أو متعةً: بأن حلَّ من العمرة، واستأنف الحج، أو أنه أحرم بالحج، ثم أشار له جبرئيل عليه السلام أن يُدخل العمرةَ عليه، فبقى على أحرامه، حتى فرغ من الحج، ولم يحلَّ لأنه كان ساق الهدىَ؟

وثانيهما : أنه أهلَّ حين صلى،أو حين ركب ناقتَه، أو حين أشرف على البَيْداء؟ وبيَّن ابن عباس رضى الله عنهما: أن الناس كانوا يأتونه أرسالاً، فأخبر كل واحد بما رآه؛ وقد كان أولُ إهلاله حين صلى ركعتين.

وإنما اغتسل وصلى ركعتين: لأن ذلك أقربُ لتعظيم شعائر الله، ولأنه ضبطٌ للنية بفعل ظاهر منضبطٍ، يدل على الإخلاص لله، والاهتمامِ بطاعة الله.

و [إنما لبس إزارًا ورداءً] لأن تغيير اللباس بهذا النحو ينبِّهُ النفسَ ويوقظُها للتواضع لله تعالىٰ.

وإنما تطيَّب: لأن الإحرام حالُ الشَّعْثِ والتَّفَلِ، فلابد من تدارُكٍ له قبل ذلك.

وإنما اختار هذه الصيغة فى التلبية: لأنها تعبيرٌ عن قيامه بطاعةِ مولاه، وتُذَكِّرُ له ذلك؛ وكان أهل الجاهلية يعظِّمون شركاءَ هم فأدخل النبيُّ صلى الله عليه وسلم:" لاشريك لك" ردًا على هؤلاء، وتميزًا للمسلمين منهم.

ويُستحب زيادةُ سؤالِ اللهِ رضوانَه، واستِعْفاءَه برحمته من النار.

ترجمہ: حجۃ الوداع کا واقعہ: بنیاد اس واقعہ میں حضرت جابر، حضرت عائشہ، حضرت ابن عمر اور ان کے سوا صحابہ رضی اللہ عنہم کی حدیثیں ہیں: (۱) جان لیں کہ:.......... میں کہتا ہوں: یہاں دو باتوں میں اختلاف کیا گیا ہے: ان میں سے ایک: یہ ہے کہ آپؐ کا حج: حج افراد تھا یا تمتع تھا، بایں طور کہ عمرہ سے باہر آ گئے ہوں، اور از سرِنو حج کیا ہو یا یہ کہ آپؐ نے حج کا احرام باندھا، پھر جبرئیل نے آپؐ کو اشارہ کیا کہ آپؐ اس پر عمرہ داخل کریں۔ پس آپؐ اسی احرام پر قائم رہے یہاں تک کہ حج سے فارغ ہوئے۔ اور احرام سے باہر نہیں آئے۔ اس لئے کہ آپؐ ہدی لے کر آئے تھے؟ —— اور ان میں سے دوسری بات: یہ ہے کہ آپ نے تلبیہ پڑھا جب نماز پڑھی یا جب اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے یا جب بیداء پر چڑھے؟ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ لوگ آپؐ کے پاس آتے تھے یعنی آپؐ کے پاس سے گذرتے تھے ٹولیاں ٹولیاں۔ پس خبر دی ہر ایک نے اس بات کی جو اس نے دیکھی۔ اور تھی آپؐ کے زور سے تلبیہ پڑھنے کی ابتداء جب آپؐ نے دوگانہ پڑھا —— اور آپؐ نے غسل اور دو رکعتیں اسی لئے پڑھیں کہ یہ بات شعائر اللہ کی تعظیم سے قریب تر ہے، اور اس لئے کہ وہ نیت کو متعین کرنا ہے ایک ایسے ظاہر متعین عمل کے ذریعہ جو دلالت کرنے والا ہے اللہ کے لئے عمل کو خالص کرنے پر۔ اور اللہ کی عبادت کے اہتمام پر —— اور آپ نے لنگی اور چادر اسی لئے پہنیں کہ اس طور پر لباس کی تبدیلی نفس کو چوکنا اور بیدار کرتی ہے اللہ کے لئے فروتنی کرنے کے لئے —— اور خوشبو اسی لئے لگائی کہ احرام خاک آلودگی اور بدبودار ہونے کی حالت ہے، پس احرام سے پہلے اس کی تلافی ضروری ہے —— اور تلبیہ میں یہ الفاظ اسی لئے پسند فرمائے کہ وہ اپنے مولی کی عبادت میں برقرار رہنے کی ترجمانی ہیں۔ اور یہ الفاظ اس کو یہ بات یاد بھی دلاتے ہیں —— اور زمانۂ جاہلیت کے

لوگ اپنے بتوں کی تعظیم کیا کرتے تھے، پس آپؐ نے لاشریك لك تلبیہ میں داخل کیا: اُن لوگوں کی تردید کرتے ہوئے اور مسلمانوں کو مشرکوں سے جدا کرتے ہوئے —— اور مستحب ہے اللہ تعالیٰ سے ان کی خوشنودی کی زیادتی کا اور جنت کا سوال کرنا اور اللہ سے ان کی رحمت کے واسطہ سے دوزخ سے درگذر طلب کرنا۔

تصحیح: [إنما لبس إزارًا ورداءً] کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کے بغیر کلام تام نہیں ہوتا۔

☆ ☆ ☆

(۲) —— حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’(حجۃ الوداع کے سفر میں) میرے پاس جبرئیل آئے۔ اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے یہ حکم پہنچایا کہ میں اپنے صحابہ کو حکم دوں کہ وہ تلبیہ بلند آواز سے پڑھیں‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۲۵۴۹) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جو بھی مسلمان تلبیہ پڑھتا ہے تو تلبیہ پڑھتی ہیں وہ چیزیں جو اس کے دائیں بائیں ہیں یعنی پتھر یا درخت یا ڈھیلے، یہاں تک کہ زمین اِس طرف سے اور اُس طرف سے تمام ہوجاتی ہے‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۲۵۵۰) یعنی زمین کے دونوں طرف کے ڈانڈے مل جاتے ہیں۔ پس آپؐ کے دونوں اشارے پوری زمین کو محیط ہوگئے۔

جہراً تلبیہ پڑھنے کی وجہ: تلبیہ حج کا شعار (خاص علامت) ہے اور اس سے ذکر اللہ کی شان بھی بلند ہوتی ہے۔ اور جو چیز اس قبیل سے ہوتی ہے اس کو بہ آوازِ بلند پڑھنا مستحب ہے۔ اور یہ بات بھی مطلوب ہے کہ وہ چیز ہر کہ ومہ کے سامنے آجائے۔ اور وہ جگہ دار الاسلام معلوم ہونے لگے۔ پس جب تلبیہ کا ذکر اس طرح بلند آواز سے کیا جاتا ہے تو نامۂ اعمال میں اُن مقامات کی صورت مرتسم ہوجاتی ہے جہاں وہ ذکر کیا گیا ہے۔ شجر وحجر کے تلبیہ میں شریک ہونے کا یہی مطلب ہے۔

استدراک: اس سے بہتر حدیث کو حقیقت پر محمول کرنا ہے۔ کیونکہ قرآن مجید نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ ہر چیز تسبیح خواں ہے، گو انسان اس کو نہ سمجھ سکے، اور برقی لہروں کی دریافت سے یہ بات مشاہدہ میں آگئی ہے کہ آواز ساری زمین پر پھیلتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس دریافت سے بہت پہلے لوگوں کو اس حقیقت سے باخبر کیا ہے کہ آواز تمام روئے زمین پر گونجتی ہے۔ اور انسان کے علاوہ ہر مخلوق اس کو سنتی ہے۔ اور تلبیہ ہر مخلوق کو اتنا پسند ہے کہ وہ تلبیہ پڑھنے والے کی ہمنوائی کرتی ہے۔ جیسے داؤد علیہ السلام کے ذکر میں پہاڑ اور پرندے ہمنوائی کرتے تھے (سورۂ سبا آیت ۱۰)

[۲] وأشار جبريلُ عليه السلام برفع أصواتهم بالإحرام والتلبية، وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ’’ما من مسلم يُلَبِّي إلا لَبّى ما عن يمينه وشماله: من حجر، أوشجر، أو مَدَرٍ، حتى تنقطعَ الأرضُ من هٰهنا وهٰهنا‘‘

أقول: سرُّه: أنه من شعائر الله، وفيه تنويهُ ذكر الله؛ وكلُّ ما كان من هذا الباب فإنه يستحب الجهرُ به، وجعلُه بحيث يكون على رء وس الخامل والنبيهِ، وبحيث تصير الدارُ دارَ

الإسلام؛ فإذا كان كذلك كُتب فی صحيفة عملِه صورةُ تلك المواضع.

ترجمہ: (۲) اور جبرئیل نے حکم پہنچایا: احرام اور تلبیہ کے ساتھ صحابہ کے آوازوں کو بلند کرنے کا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نہیں کوئی مسلمان جو تلبیہ پڑھے مگر تلبیہ پڑھتی ہیں وہ مخلوقات جو اس کے دائیں اور بائیں ہیں یعنی پتھر یا درخت یا ڈھیلے۔ یہاں تک کہ ختم ہوجاتی ہے زمین یہاں سے اور یہاں سے (اور آپؐ نے دائیں بائیں اشارہ کیا) میں کہتا ہوں: اس کا یعنی جہراً تلبیہ پڑھنے کا راز یہ ہے کہ تلبیہ شعائر اللہ میں سے ہے۔ اور اس میں ذکر اللہ کی شان بلند کرنا (بھی) ہے اور ہر وہ کام جو اس قبیل سے ہو تو مستحب ہے اس کو بلند آواز سے کہنا (جیسے اذان) اور اس کو بنانا بایں طور کہ ہو وہ ذکر گمنام اور مشہور کے سامنے۔ اور بایں طور کہ وہ جگہ دارالاسلام معلوم ہونے لگے۔ پس جب ذکر اس طرح کیا جاتا ہے تو اس کے نامۂ اعمال میں لکھی جاتی ہے ان مقامات کی صورت (أشار به: پہنچانا۔ احرام اور تلبیہ ایک معنی میں ہیں)

☆ ☆ ☆

(۳) ـــــ ذوالحلیفہ میں ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد آپؐ نے اپنی ہدی کی اونٹنیاں منگوائیں۔ اور ان کا اشعار کیا یعنی ان کی کوہان کی دائیں جانب میں ذرا سی کھال چیری۔ اور جو خون نکلا اسے پونچھ ڈالا، اور ان کے گلوں میں چپلوں کا ہار ڈالا۔ اور ان کو حضرت ناجیہ خُزاعی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ کیا (مشکوٰۃ حدیث ۲۶۲۷ و ۲۶۴۱)

اشعار کرنے کی وجہ: ہدی کے اشعار میں چند حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: ہدی حج کا ایک شعار ہے۔ اس کے اشعار کرنے سے یعنی اس پر ہدی ہونے کی نشانی قائم کرنے سے شعائر اللہ کی شان بلند ہوتی ہے۔ اور اس سے ملت حنیفی کا استحکام ہوتا ہے۔ قریب و بعید کے لوگ حاجی کے اس عمل کو دیکھیں گے تو ان کے دل میں بھی حج کا شوق پیدا ہوگا۔

دوسری حکمت: اشعار کرنا دل کے عمل کو ظاہری فعل کے ذریعہ متعین کرنا ہے یعنی محرم نے جو ہدی کی نیت سے جانور ساتھ لیا ہے، جب اس کا اشعار کیا جائے گا تو اس کی نیت پیکر محسوس بن جائے گی۔

تیسری حکمت: رسول اللہ ﷺ کے ہدی کے اونٹ قافلہ کے ساتھ نہیں تھے۔ چند آدمیوں کے ساتھ حضرت ناجیہ رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں علحدہ روانہ کئے گئے تھے۔ اور ملک میں ابھی پوری طرح امن وامان قائم نہیں ہوا تھا۔ اس لئے یہ علامت قائم کی گئی تھی تاکہ لٹیرے اس کو لوٹنے سے باز رہیں۔

چوتھی حکمت: ہدی کے جانور زمانۂ جاہلیت میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ کیونکہ حج کا یہ شعار ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے متوارث چلا آرہا تھا۔ پس یہ نشانی اس لئے بھی لگائی تھی کہ لوگ ان کا احترام کریں، اور ان کی خدمت کریں۔ اور ان کے لئے چارہ پانی فراہم کریں (تیسری اور چوتھی حکمتیں مستزاد ہیں)

[۳] وأشعر رسولُ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم ناقتَه، فی صَفْحَةِ سَنامِها الأیمنِ، وَسَلَتَ الدمَ عنها، وقلَّدها نعلین.

أقول: السرُّ فی الإشعار: التنویهُ بشعائر اللّٰه، وإحکامُ الملة الحنیفیة، یری ذلك منه الأقاصی والأدانی، وأن یکون فعلُ القلب منضبطًا بفعل ظاهر.

ترجمہ: (۳) اور اشعار کیا رسول اللہ ﷺ نے اپنی اونٹنی کا، اس کی دائیں کوہان کی جانب میں۔ اور پونچھ ڈالا اس سے خون اور ہار پہنایا اس کو دو چپلوں کا۔

میں کہتا ہوں: اشعار کرنے میں راز: شعائر اللہ کی شان بلند کرنا ہے، اور ملتِ حنیفی کو مضبوط کرنا ہے۔ دیکھیں اس کی یہ بات دور کے لوگ اور قریب کے لوگ۔ اور یہ کہ دل کا عمل ظاہری فعل کے ذریعہ متعین ہوجائے۔

☆ ☆ ☆

④ —— اور ذوالحلیفہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے گھر میں حضرت اسماء بنت عُمیس رضی اللہ عنہا نے محمد نامی بچہ جنا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ وہ نہا کر، کپڑے کی لنگوٹ باندھ کر، احرام باندھیں (مشکوٰۃ حدیث ۲۵۵۵)

حیض ونفاس میں احرام سے پہلے غسل کرنے کی وجہ: جو عورت احرام باندھتے وقت حیض یا نفاس میں ہو، وہ بھی غسل کر کے احرام باندھے گی۔ البتہ دوگانۂ احرام نہیں پڑھے گی۔ اس مسئلہ کی بنیاد یہ حدیث اور آئندہ حدیث ہے۔ نماز اس لئے نہیں پڑھے گی کہ وہ پاک نہیں ہے۔ اور غسل اس لئے کرے گی کہ احرام کی سنتوں میں سے جن پر آسانی سے عمل کیا جاسکتا ہے کرلیا جائے۔

⑤ —— اسی سفر میں یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ جب قافلہ مقام سَرِف میں پہنچا، جو مکہ سے صرف ایک منزل پر واقع ہے، تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو ماہواری شروع ہوگئی، وہ رونے لگیں۔ اسی حال میں رسول اللہ ﷺ ان کے پاس تشریف لائے۔ اور دریافت کیا کہ: ''شاید تمہارے ایام شروع ہوگئے!'' جواب اثبات میں پاکر آپؐ نے فرمایا: ''یہ ایک ایسی چیز ہے جو اللہ نے آدم کی بیٹیوں پر لازم کی ہے، پس تم وہ سب کام کرو جو حاجی کرتا ہے۔ البتہ جب تک پاک نہ ہوجاؤ بیت اللہ کا طواف نہ کرو'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۵۷۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا احرام تو ذوالحلیفہ میں باندھ چکی تھیں۔ یہ آگے کے اعمال کے بارے میں ہدایت ہے۔

شریعت میں اعذار کا لحاظ ہے: یہ ارشاد کہ: ''یہ ایک ایسی چیز ہے جو اللہ نے بناتِ آدم پر لازم کی ہے'' ترخیص کی تمہید ہے یعنی اس حالت سے ہر خاتون کو سابقہ پڑتا ہے، اس لئے شریعت نے اس عذر کا لحاظ کر کے سہولت دی ہے۔

شریعت ایسی صورت میں متبادل تجویز کرتی ہے۔ جیسے کھڑے ہوکر نماز ادا کرنے پر جو قادر نہیں وہ بیٹھ کر نماز پڑھے۔ چنانچہ حائضہ اور نفساء حج کا ہر عمل کریں گی۔ البتہ طوافِ زیارت اس وقت کریں گی جب وہ پاک ہوجائیں گی۔ اور طواف قدوم اور طواف وَداع ان سے ساقط ہے۔

[٤] وولدتْ أسماءُ بنت عُمَيْسٍ بذى الحليفة، فقال: لها:" اغتسلى، واسْتَثْفِرِى بثوب، وأحرمى"

أقول: ذلك: لِتَأتِّىَ بقدر الميسور من سنة الإحرام.

[٥] وقال النبى صلى الله عليه وسلم حين حاضت عائشةُ رضى الله عنها بِسَرِف:" إن ذلك شيئ كتبه الله على بنات آدم، فافعلى ما يفعلُ الحاجُّ، غير أن لاتطوفى بالبيت حتى تطهرى"

أقول: مَهَّدَ الكلامَ: بأنه شيئ يكثر وقوعُه، فمِثْلُ هذا الشيئ يجب فى حكمة الشرائع: أن يُدفع عنه الحرجُ، وأن يُسَنَّ له سنةٌ ظاهرة، فلذلك سقط عنها طوافُ القدوم، وطوافُ الوَداع.

ترجمہ: (۴) اور بچہ جنا اسماء بنت عُمیس نے ذوی الحلیفہ میں۔ پس آپؐ نے فرمایا: "نہالو، اور کپڑے کی لنگوٹ باندھ لو، اور احرام باندھو" میں کہتا ہوں: وہ بات یعنی غسل کرنا اس لئے ہے کہ حاصل ہو احرام کی سنت آسانی کے بقدر۔

(۵) اور فرمایا نبی ﷺ نے: .... میں کہتا ہوں: بطور تمہید آپؐ نے یہ بات بیان فرمائی کہ یہ ایک چیز ہے جس کا وقوع بکثرت ہوتا ہے۔ پس اس قسم کی چیز: قانون سازی کی مصلحت میں ضروری ہے کہ اس سے تنگی ہٹائی جائے۔ اور یہ (بھی ضروری ہے) کہ اس کے لئے کوئی واضح طریقہ مقرر کیا جائے۔ پس اس وجہ سے ساقط کیا ہے حائضہ سے طواف قدوم اور طوافِ وَداع۔

☆ ☆ ☆

⑥ —— پھر جب مکہ مکرمہ قریب آ گیا تو آپؐ نے ذی طُویٰ میں قیام فرمایا۔ اور اگلے دن ۴ ذی الحجہ کی صبح کو دن میں مکہ شریف کے بالائی حصہ سے داخل ہوئے۔ اور جب حج سے فارغ ہوکر مدینہ کی طرف مراجعت فرمائی تو مکہ کے زیریں حصہ سے نکلے۔

دن میں مکہ میں داخل ہونے کی وجوہ:

پہلی وجہ: تاکہ سکونِ قلبی سے مکہ شریف میں داخلہ ہو، ماندگی کی حالت میں داخلہ نہ ہو۔ تاکہ اللہ کے جلال وعظمت کا خوب دھیان کیا جاسکے۔

دوسری وجہ: آپؐ بیت اللہ کا پہلا طواف لوگوں کے روبرو کرنا چاہتے تھے، تاکہ طواف کی شان بلند ہو۔

تیسری وجہ: آپ کا یہ بھی منشا تھا کہ لوگ مناسک سیکھیں۔ اس لئے آپؐ باہر رک گئے، تا کہ جو لوگ پیچھے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ اکٹھا ہو جائیں۔ اور وہاں سے اعمالِ حج ادا کرنے کا ذہن بنا کر چلیں۔ اور مکہ میں پہنچ کر آپؐ کے ساتھ طواف وغیرہ اعمال میں شریک ہوں تا کہ وہ مناسک سیکھیں۔

اور راستہ بدلنے کی وجہ: وہی ہے جو عیدین میں راستہ بدلنے کی ہے یعنی دونوں ہی راستوں میں مسلمانوں کی شان وشوکت ظاہر ہو۔

[٦] فلما دنا من مكة نزل بذى طُوىٰ، ودخل مكةَ من أعلاها نهارًا، وخرج من أسفلها.

وذلك: ليكون دخولُ مكة في حال اطمئنان القلب، دون التعبِ، ليتمكن من استشعار جلال الله وعظمته.

وأيضًا: ليكون طوافُه بالبيت على أعين الناس، فإنه أَنْوَهُ بطاعة الله.

وأيضًا: فكان النبى صلى الله عليه وسلم يريد أن يعلِّمَهم المناسك، فأمهلَهم حتى يجتمعوا جامِّيْنَ، متهيئين.

وإنما خالف فى الطريق ليظهر شوكةُ المسلمين فى كلتا الطريق، ونظيره العيد.

ترجمہ: (٦) پس جب آپؐ مکہ سے قریب ہوئے تو ذی طُوی میں پڑاؤ کیا۔ اور مکہ میں داخل ہوئے اس کے بالائی حصہ سے دن میں۔ اور مراجعت فرمائی اس کے زیریں حصہ سے۔

اور وہ بات: تا کہ ہو آپؐ کا مکہ میں داخل ہونا دل کے سکون کی حالت میں، نہ کہ ماندگی کی حالت میں۔ تا کہ آپؐ قادر ہوں اللہ کے جلال اور اس کی عظمت کے خوف کو دل میں محسوس کرنے پر ——— اور نیز: تا کہ ہوئے آپ کا بیت اللہ کا طواف لوگوں کی نگاہوں کے سامنے۔ پس یہ بات اللہ کی عبادت (طواف) کی شان زیادہ بلند کرنے والی ہے ——— اور نیز: پس نبی ﷺ چاہتے تھے کہ آپ لوگوں کو اعمالِ حج کا طریقہ سکھلائیں۔ پس آپؐ نے لوگوں کو مہلت دی، تا کہ وہ بکثرت اکٹھا ہو جائیں۔ درانحالیکہ وہ تیار ہونے والے ہوں ——— اور آپؐ نے راستہ اسی لئے بدلا تا کہ دونوں ہی راستوں میں مسلمانوں کی شوکت ظاہر ہو۔ اور اس کی نظیر عید ہے۔

تصحیح: جَامِّیْن: اصل میں جامعین تھا۔ یہ تصحیف ہے۔ تصحیح مطبوعہ صدیقی اور مخطوطہ کراچی وغیرہ سے کی ہے جَمَّ (ن،ض) الماءُ: کثرت سے جمع ہونا۔

☆ ☆ ☆

⑦ ——— پھر جب آپؐ بیت اللہ کے پاس پہنچے تو حجر اسود کا استلام کیا۔ اور سات چکّر لگائے: تین میں رَمَل کیا، اور

چار میں عادت کے مطابق چلے۔ اور یمن کی طرف کے دو کونوں ہی کا استلام کیا۔ اور رکن یمانی اور حجر اسود والے کونے کے درمیان یہ دعا مانگی: ”اے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی بہتری عطا فرما اور آخرت میں بھی۔ اور ہمیں آتشِ دوزخ سے بچا“ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۰۱) پھر طواف سے فارغ ہوکر آپ مقام ابراہیم کی طرف بڑھے، اور یہ آیت تلاوت فرمائی: ”اور بنالو مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ“ (سورۃ البقرۃ آیت ۱۲۵) اور وہاں آپؐ نے اس طرح کھڑے ہوکر دو رکعتیں پڑھیں کہ مقام ابراہیم آپؐ کے اور بیت اللہ کے درمیان تھا۔ اور اس دوگانۂ طواف میں سورۂ اخلاص اور سورۃ الکافرون پڑھیں۔

رمل اور اضطباع کی حکمت گذشتہ باب میں گذر چکی ہے۔

کعبہ کے صرف دو کونوں کے استلام کی وجہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ یہی دو کونے اپنی اصلی بنیادوں پر ہیں حطیم کی طرف کے دو کونے اپنی اصل بنیادوں پر نہیں ہیں مشرکین مکہ نے اس طرف سے کعبہ کا کچھ حصہ کعبہ سے باہر نکال دیا ہے۔ اس لئے آپؐ نے ان کا استلام نہیں کیا (مسلم شریف ۹: ۸۸ مصری کتاب الحج، باب نقض الکعبۃ)

طواف کے لئے طہارت اور ستر عورت شرط ہونے کی وجہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بیت اللہ کا طواف نماز کی طرح ہے، مگر طواف میں تمہیں بات کرنے کی اجازت ہے، پس جو کوئی بات کرے، بھلائی کی بات کرے“ (مشکوۃ حدیث ۲۵۷۶) اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تعظیم خداوندی اور شعائر الٰہی کے احترام میں طواف بھی نماز جیسی ہی ایک عبادت ہے۔ اس لئے اس کو نماز پر محمول کیا گیا ہے یعنی طواف کو بھی نماز کا حکم دیا گیا ہے۔ اور نماز والی بعض شرائط اس کے لئے بھی ضروری قرار دی گئی ہیں۔

دوگانۂ طواف کی وجہ: ہر طواف کے بعد دو رکعتیں بیت اللہ کی تعظیم کی تکمیل کے لئے پڑھی جاتی ہیں۔ بیت اللہ کا طواف بھی اس کی تعظیم ہے۔ مگر کمالِ تعظیم یہ ہے کہ اس کی طرف منہ کرکے نمازیں پڑھی جائیں۔

فائدہ: یہاں سے یہ بات واضح ہوئی کہ کعبہ شریف معبود نہیں۔ البتہ وہ معظّم و محترم مقام ہے، اس لئے اس کا طواف کیا جاتا ہے، اور نمازوں میں اس کی طرف رُخ کیا جاتا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ کعبہ کو بیت اللہ (اللہ کا گھر) کہتے ہیں۔ اور جب کوئی شخص کسی کے گھر کا قصد کرتا ہے تو مقصود بالذات صاحبِ مکان ہوتا ہے۔ مگر انتساب کی وجہ سے مکان کو بھی عظمت کا ایک درجہ حاصل ہوجاتا ہے۔ اور چونکہ اللہ کی ذات غیر مرئی ہے، اس لئے ملت کی شیرازہ بندی کے لئے نمازوں میں اس کے گھر کا رُخ کیا جاتا ہے۔ اور جذبۂ احترام اور عقیدت کے اظہار کے لئے اس کے گھر کے چکر لگائے جاتے ہیں (فائدہ تمام ہوا)

مقام ابراہیم پر دوگانۂ پڑھنے کی وجہ: مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہوکر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانۂ کعبہ تعمیر کیا تھا۔ اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کے نشان ہیں۔ اور اسی پتھر پر کھڑے ہوکر آپ نے لوگوں کو حج کی دعوت دی تھی۔ اور وہ جنت سے لایا گیا تھا، جیسے حجر اسود (فوائد شیخ الہند) اس لئے وہ مسجد حرام کی بزرگ

ترین جگہ ہے۔ اور اللہ کی قدرت کی وہ نشانی ہے جو خلیل اللہ پر ظاہر ہوئی ہے۔ اور حج میں انہیں امور کو یاد کرنا مقصود بالذات ہے۔ اس لئے اس یادگار مقام پر دوگانۂ طواف پڑھنا مستحب ہے۔

رکنِ یمانی اور حجر اسود کے درمیان خاص دعا کی وجہ: ربنا آتنا إلخ قرآن کریم کی تلقین کردہ ایک جامع دعا ہے۔ اس میں سب کچھ مانگ لیا گیا ہے۔ اور اس کے الفاظ نہایت مختصر ہیں، پس اس مختصر وقفہ کے لئے یہی دعا مناسب ہے یعنی رکن یمانی سے چل کر حجر اسود تک پہنچنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی، اس لئے اس موقعہ پر یہی مختصر دعا مناسب ہے۔

[۷] فلما أتى البيت اسْتَلَمَ الركن، وطاف سبعًا: رمل ثلاثًا ومشى أربعًا، وخص الركنين اليمانيين بالاستلام، وقال فيما بينهما: ﴿رَبَّنَا آتِنَا فِيْ الدُّنْيَا حَسَنَةً، وَفِيْ الآخِرَةِ حَسَنَةً، وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ ثم تقدم إلى مقام إبراهيم، فقرأ: ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى﴾ فصلى ركعتين، وجعل المقام بينه وبين البيت، وقرأ فيهما: ﴿قُلْ: هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ﴾ و﴿قُلْ يَاأَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ﴾ ثم رجع إلى الركن فاستلمه.

أقول:

أما سر الرمل والاضطباع: فقد ذكرناه.

وإنما خَصَّ الركنين اليمانيين بالاستلام: لما ذكره ابن عمر: من أنهما باقيان على بناء إبراهيم عليه السلام، دون الركنين الآخرين، فإنهما من تغييرات أهل الجاهلية.

وإنما اشتُرط له شروطُ الصلاة: لماذكره ابنُ عباس رضى الله عنهما: من أن الطواف يُشبه الصلاةَ فى تعظيم الحق وشعائرُه، فَحُمِلَ عليها.

وإنما سَنَّ ركعتين بعده: إتمامًا لتعظيم البيت، فإن تمامه أن يُستقبل فى صلواتهم.

وإنما خص بهما مقامَ إبراهيم: لأنه أشرف مواضع المسجد، وهو آية من آيات الله، ظهرت على سيدنا إبراهيم، وتذكُّرُ هذه الأمور هى العمدة فى الحج.

وإنما استحبَّ أن يقول بين الركنين: ﴿رَبَّنَا آتِنَا فِيْ الدُّنْيَا حَسَنَةً، وَّفِيْ الآخِرَةِ حَسَنَةً﴾ إلخ: لأنه دعاء جامع نزل به القرآن، وهو قصير اللفظ، يناسب تلك الفرصة القليلة.

ترجمہ: (۷) پس جب آئے آپ ﷺ بیت اللہ کے پاس......... میں کہتا ہوں: رہا رمل اور اضطباع کا راز: تو ہم نے اس کو ذکر کردیا ہے ——— اور یمن کی جانب کے دو کونوں ہی کو خاص کیا استلام کے ساتھ: اس بات کی وجہ سے جس کو ابن عمر نے ذکر کیا ہے یعنی یہ بات کہ وہ دونوں کونے ابراہیم علیہ السلام کی بنیاد پر باقی ہیں۔ نہ کہ دوسرے

دوکونے، پس بیشک وہ دونوں کونے اہل جاہلیت کی بتدیلیوں میں سے ہیں ـــــ اور طواف کے لئے نماز کی شرطیں اسی وجہ سے ضروری قرار دی گئی ہیں جو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر کی ہے یعنی یہ بات کہ طواف نماز کے مشابہ ہے اللہ کی اور شعائر اللہ کی تعظیم میں۔ پس لادا گیا ہے طواف کو نماز پر ـــــ اور اس کے بعد دو رکعتیں مسنون کی گئی ہیں بیت اللہ کی تعظیم کی تکمیل کے لئے۔ پس بیشک تعظیم کی تکمیل یہ ہے کہ اس کی طرف منہ کیا جائے اپنی نمازوں میں ـــــ اور دو رکعتوں کے ساتھ مقام ابراہیم کو اسی لئے آپؐ نے خاص کیا کہ وہ مسجد کی جگہوں میں بزرگ ترین جگہ ہے۔ اور وہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ظاہر ہوئی ہے۔ اور ان امور کا یاد کرنا ہی حج میں مقصود بالذات ہے ـــــ اور آپؐ نے پسند فرمایا کہ کہے طواف کرنے والا دو کونوں کے درمیان: رَبنا آتنا إلخ اس لئے کہ وہ جامع دعا ہے، جو قرآن کریم میں نازل ہوئی ہے۔ اور اس کے الفاظ مختصر ہیں۔ اُس مختصر وقفہ کے لئے وہی مناسب ہے۔

☆ ☆ ☆

⑧ ـــــ پھر آپ ﷺ دروازے سے صفا پہاڑی کی طرف نکلے۔ پس جب آپؐ اس کے بالکل قریب پہنچ گئے تو یہ آیت تلاوت فرمائی: ''بیشک صفا اور مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں'' (سورۃ البقرہ آیت ۱۵۸) اور آپؐ نے فرمایا: ''میں اُسی پہاڑی سے سعی شروع کرتا ہوں جس کا ذکر اللہ نے پہلے کیا ہے'' چنانچہ آپؐ نے صفا سے سعی شروع کی۔ اور اس پر اتنا چڑھے کہ آپؐ کو بیت اللہ نظر آنے لگا۔ پھر آپؐ نے قبلہ کی طرف رُخ پھیرا۔ اور اللہ کی یکتائی اور اس کی کبریائی بیان کی، اور فرمایا: ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی تنہا معبود ہیں، ان کا کوئی شریک نہیں۔ انہی کے لئے فرمان روائی ہے۔ اور انہی کے لئے ستائش ہے۔ اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔ بس اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ انھوں نے (دین کو سر بلند کرنے کا) اپنا وعدہ پورا کیا۔ اور اپنے بندے (یعنی خود آپؐ کی) مدد فرمائی۔ اور تنہا انھوں نے (اسلام دشمن) لشکروں کو شکست دی'' آپؐ نے یہ کلمات تین دفعہ فرمائے، اور ان کے درمیان دعا بھی مانگی، پھر اترے اور مروہ کی طرف چلے۔ یہاں تک کہ جب قدم مبارک وادی کے نشیب میں پہنچے تو آپؐ کچھ دوڑے۔ پھر جب آپ نشیب سے اوپر چڑھ گئے تو عام رفتار سے چلے، یہاں تک کہ مروہ پر آئے۔ اور یہاں بھی آپؐ نے ویسا ہی عمل کیا جیسا صفا پر کیا تھا۔

سعی میں صفا کی تقدیم کی وجہ: صفا پہاڑی پر پہنچ کر آیت کریمہ تلاوت فرمانے کے بعد آپ ﷺ کا یہ ارشاد کہ: ''میں اسی پہاڑی سے سعی شروع کرتا ہوں جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے پہلے کیا ہے'' اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ آیت کریمہ میں صفا کی تقدیم محض اتفاقی نہیں ہے، بلکہ مذکور کو مشروع کے ساتھ موافق کرنے کے لئے ہے یعنی اس پر عمل کرنے کے لئے ہے۔ اسی لئے صفا سے سعی شروع کرنا واجب ہے۔

صفا و مروہ پر ذکر کی معنویت: صفا و مروہ پر آپؐ نے جو ذکر کیا ہے، اس میں چند باتیں پیشِ نظر ہیں: (۱) اللہ کی اس نعمت کو یاد کرنا کہ اس نے اسلام کا قدم جما دیا (۲) اللہ کے ظاہر کئے ہوئے بعض معجزات کا تذکرہ کرنا کہ اس نے تمام دشمنان

اسلام کے عزائم خاک میں ملا دیئے (۳) شرک کی جڑ کاٹ دینا چنانچہ صفا ومروہ پر سے اساف ونائلہ کی مورتیں ہٹادی گئیں (۴) جاہلیت کی تمام باتوں کو پیروں تلے روند دینا (۵) اور ایسے اجتماع عظیم کے موقعہ پر اللہ کا اور اللہ کے دین کا بول بالا کرنا۔

[۸] ثم خرج من الباب إلى الصفا، فلما دنا من الصفا، قرأ: ﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ﴾: أبدأُ بما بدأ الله به، فبدأ بالصفا، ورقىٰ عليه حتى رأى البيتَ، فاستقبل القبلة، فوحَّد الله وكبَّره، وقال: "لا إلٰه إلا الله، وحده لاشريك له، له الملك وله الحمد، وهو على كل شيئ قدير، لا إلٰه إلا الله وحده، أنجز وعده، ونصر عبده، وهزم الأحزاب وحده" ثم دعا بين ذلك، قال مثلَ هذا ثلاث مرات، ثم نزل ومشى إلى المروة، حتى إذا انصبَّت قدماه فى بطن الوادى سعى، حتى إذا صَعِدَتا مشىٰ، حتى أتى المروة، ففعل على المروة كما فعل على الصفا.

أقول: فهم النبيُّ صلى الله عليه وسلم من هذه الآية: أن تقديم الصفا على المروة، إنما هو لتوفيق المذكور بالمشروع.

وإنما خصَّ من الأذكار ما فيه توحيد، وبيان لإنجاز الوعد ونصره على أعدائه: تذكُّرًا لنعمة الله، وإظهارًا لبعض معجزاته، وقطعًا لدابر الشرك، وبيانًا أن كل ذلك موضوع تحت قدمه، وإعلاناً لكلمة الله ودينه فى مثل هذا الموضع.

ترجمہ: (۸) میں کہتا ہوں: نبی ﷺ نے اس آیت سے سمجھا کہ صفا کی مروہ پر تقدیم مذکور کو مشروع کے ساتھ موافق کرنے کے لئے ہے ——— اور اذکار میں سے انہی کو خاص کیا جن میں اللہ کی یکتائی ہے۔ اور اللہ کے وعدہ پورا کرنے کا اور آپؐ کے دشمنوں کے مقابل میں آپؐ کی مدد کرنے کا بیان ہے: اللہ کی نعمت کو یاد کرنے کے طور پر، اور اللہ کے بعض معجزات کو ظاہر کرنے کے طور پر، اور شرک کی جڑ کاٹنے کے طور پر، اور یہ بات بیان کرنے کے طور پر کہ وہ سب باتیں آپؐ کے پاؤں تلے روندی ہوئی ہیں۔ اور تشہیر کرنے کے طور پر اللہ کی اور اللہ کے دین کی بات کی، اس جیسی جگہ میں۔

تصحیح: تذكرًا لنعمة الله مطبوعہ نسخہ میں تذكيرًا لنعمه تھا۔ تصحیح مخطوطہ صدیقی اور مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

⑨ ——— پھر جب آپ ﷺ سعی کا آخری پھیرا پورا کر کے مروہ پر پہنچے، تو آپؐ نے مروہ پہاڑی پر سے بلند آواز سے فرمایا، اور لوگ آپؐ سے نیچے تھے کہ: "اگر پہلے سے میرے سامنے ہوتی میرے معاملہ میں سے وہ بات جو غیر متوقع طور پر بعد میں میرے سامنے آئی تو میں قربانی کے جانور ساتھ نہ لاتا۔ اور حج کو عمرہ کر لیتا۔ پس تم میں سے جس کے پاس ہدی نہیں ہے، وہ حلال ہو جائے، اور حج کو عمرہ کر لے" حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: کیا یہ (یعنی حج کے ساتھ

عمرہ کرنا) ہمارے اسی سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کے لئے؟ آپؐ نے جواب دیا: ''نہیں، بلکہ ہمیشہ ہمیش کے لئے!'' پس سبھی لوگوں نے احرام کھول دیا، اور بال ترشوا لئے، مگر نبی ﷺ نے اور ان لوگوں نے جن کے ساتھ ہدی تھی۔

حج کی عمرہ سے تبدیلی کی وجہ: حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ نے چند مصلحتوں کے پیش نظر حج کو عمرہ سے بدلنے کا حکم دیا تھا۔

پہلی مصلحت: زمانۂ جاہلیت کا یہ عقیدہ تھا کہ حاجی کے لئے حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا سخت ترین گناہ ہے۔ حالانکہ یہ بات بالکل من گھڑت تھی۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے چاہا کہ اس تحریف کا بالکلیہ قلع قمع کر دیا جائے، اس لئے حج کی عمرہ سے تبدیلی کا حکم دیا۔

دوسری مصلحت: لوگ اس بات سے بھی دلوں میں گھٹن محسوس کرتے تھے کہ بیوی سے صحبت کرتے ہوئے ایک دم حج کا احرام باندھ کر عرفہ پہنچ جایا جائے۔ چنانچہ جب حجۃ الوداع میں احرام کھولنے کا حکم دیا گیا تو بعض نے کہا: ''کیا ہم عرفہ جائیں گے اور ہمارے ذَکروں سے منی ٹپک رہی ہوگی؟!'' حالانکہ یہ دین میں غلو تھا۔ بتائیں! رمضان میں صبح صادق سے متصل صحبت کرنے سے روزے میں کیا خرابی آتی ہے؟! اس لئے نبی ﷺ نے اس تعمق کا دروازہ بند کرنے کے لئے بھی احرام کھولنے کا حکم دیا۔

تیسری مصلحت: جب حج کا وقت قریب آجائے اُس وقت حج کا احرام باندھنے میں بیت اللہ کی زیادہ تعظیم ہے۔ اس لئے ۲۵/ ذی قعدہ سے باندھا ہوا احرام کھلوا دیا گیا۔ اب لوگ ۸/ ذی الحجہ کو حج کا تازہ احرام باندھیں گے۔

استدراک: یہ تیسری مصلحت غور طلب ہے۔ احناف کے نزدیک قِران افضل ہے اور امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک اِفراد افضل ہے۔ حالانکہ دونوں کا احرام میقات سے باندھا جاتا ہے۔

ہدی احرام کھولنے میں مانع کیوں ہے؟ اس میں اختلاف ہے کہ اگر کوئی شخص میقات سے عمرہ کا احرام باندھ کر آئے اور ہدی بھی ساتھ لائے تو وہ افعالِ عمرہ ادا کر کے ہدی ذبح ہونے سے پہلے احرام کھول سکتا ہے یا نہیں؟ احناف کے نزدیک: جب تک قربانی کے ایام میں ہدی ذبح نہ ہو جائے، احرام نہیں کھول سکتا۔ اور مالکیہ اور شوافع کے نزدیک: افعالِ عمرہ کر کے احرام کھول سکتا ہے، اگرچہ ابھی قربانی ذبح نہ ہوئی ہو۔

مگر یہاں یہ اختلافی مسئلہ زیر بحث نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ میقات سے حج کا احرام باندھ کر تشریف لائے تھے۔ اور قربانیاں بھی ساتھ تھیں، اس لئے احرام تبدیل نہیں کر سکتے تھے۔ ہدی احرام کی تبدیلی میں مانع تھی۔ اس لئے کہ ہدی ساتھ لیکر آنا گویا نذر ماننا ہے اور پختہ عزم کرنا ہے کہ جب تک ہدی ذبح نہیں ہو جائے گی، میں احرام ہی کی حالت میں رہوں گا۔ اس لئے آپؐ نے حج کا احرام عمرہ سے تبدیل نہیں فرمایا اور حلال نہیں ہوئے۔

فائدہ: آدمی جس چیز کی نیت کرتا ہے: اگر وہ محض خیال کے درجہ کی بات ہے یا صرف نیت ہے ابھی اس کو عملی جامہ

نہیں پہنایا تو اس کا کچھ اعتبار نہیں۔ اور اگر نیت عمل کے ساتھ مقارن ہوگئی اور وہ متعین ہوگئی تو اس کی رعایت لازم ہے۔ مثلاً نماز پڑھنے کا خیال ہے یا نیت ہے مگر ابھی نماز شروع نہیں کی تو کوئی بات نہیں۔ لیکن اگر نیت کرکے تکبیر تحریمہ کہہ لی تو اب نماز کو پورا کرنا ضروری ہے۔

اور نیت کے انضباط کی مختلف صورتیں ہیں: ادنی درجہ زبان سے نیت کرنا ہے۔ اور اعلی درجہ: یہ ہے کہ زبانی نیت کے ساتھ کوئی ایسا واضح فعل بھی مقارن ہوجائے جو علانیہ پایا جاتا ہو اور جو اس حالت کے ساتھ مختص ہو جس کا ارادہ کیا گیا ہے۔ صورتِ مذکورہ میں نبی ﷺ نے حج کا ارادہ فرمالیا تھا۔ اور نیت کرکے تلبیہ بھی پڑھ لیا تھا اور ساتھ ہی ہدی بھی ساتھ لے لی تھی، پس یہ عزم مصمم ہوگیا اور ایک طرح کی منت ہوگئی جس کا ایفاء ضروری ہے۔ اب احرام میں بتدیلی نہیں ہوسکتی (یہ فائدہ کتاب میں ہے)

[۹] ثم قال: "لو أنى استقبَلتُ من أمرى ما استَدْبرتُ، لم أَسُقِ الهدىَ، وجعلتُها عمرةً، فمن كان منكم ليس معه هدىٌ فَلْيَحِلَّ وليجعلْها عمرةً" قيل: أَلِعامِنا هذا أم للأَبَد؟ قال: لا، بل لأَبدِ أَبَدٍ!" فحلَّ الناس كلهم وقصروا إلا النبى صلى الله عليه وسلم، ومن كان معه هدى.

أقول: الذى بَدَا لِرسول الله صلى الله عليه وسلم أمور:

منها: أن الناس كانوا قبل النبى صلى الله عليه وسلم يرون العمرة فى أيام الحج من أفجر الفجور، فأراد النبى صلى الله عليه وسلم أن يُبطل تحريفَهم ذلك بأتم وجه.

ومنها: أنهم كانوا يجدون فى صدورهم حرجًا من قُرب عهدِهم بالجماع عند إنشاء الحج، حتى قالوا: أنأتى عرفةَ ومذاكيرُنا تقطُر مَنِيًّا! وهذا من التعمق، فأراد النبى صلى الله عليه وسلم أن يسدَّ هذا الباب.

ومنها: أن إنشاءَ الإحرام عند الحج أتمُّ لتعظيمهم البيتَ.

وإنما كان سَوْقُ الهدى مانعًا من الإحلال: لأن سوق الهدى بمنزلة النذر: أن يبقى على هيئته تلك حتى يذبح الهدى.

والذى يلتزمه الإنسان: إذا كان حديثَ نفس، أو نيةً غيرَ مضبوطةٍ بالفعل: لاعبرةَ به؛ وإذا اقترن بها فعل، وصارت مضبوطةً: وجبت رعايتها.

والضبط مختلف: فأدناه باللسان، وأقواه: أن يكون مع القول فعلٌ ظاهرعلانيةً، يختص بالحالة التى أرادها كالسَّوْق.

ترجمہ: (۹) میں کہتا ہوں: جو ظاہر ہوا رسول اللہ ﷺ کے لئے وہ چند امور ہیں: ان میں سے: یہ ہے کہ نبی ﷺ

سے پہلے لوگ سمجھتے تھے عمرہ کو ایامِ حج میں بدترین گناہ۔ پس چاہا نبی ﷺ نے کہ ان کی اس تحریف کو کامل طور پر باطل کردیں ——— اور ان میں سے: یہ بات ہے کہ لوگ اپنے سینوں میں تنگی پاتے تھے، جماع سے ان کے زمانہ کے نزدیک ہونے کی وجہ سے، حج شروع کرتے وقت۔ یہاں تک کہ انھوں نے کہا: ''جائیں گے ہم عرفہ اور ہمارے ذَکر منی ٹپکا رہے ہوں گے؟!'' اور یہ بات از قبیل تعمق ہے۔ پس چاہا نبی ﷺ نے کہ یہ دروازہ بند کردیں ——— اور ان میں سے: یہ بات ہے کہ احرام شروع کرنا حج کے وقت: زیادہ تام ہے ان کے بیت اللہ کی تعظیم کے لئے۔

اور ہدی کا چلانا احرام کھولنے کے لئے اسی لئے مانع ہے کہ ہدی کا ساتھ لے چلنا اس بات کی منت ماننے کے بمنزلہ ہے کہ وہ باقی رہے گا اپنی اسی حالت پر تا آنکہ وہ ہدی ذبح کرے ——— اور وہ بات جس کا آدمی التزام کرتا ہے: اگر وہ صرف خیال ہے یا ایسی نیت ہے جو کسی عمل کے ذریعہ متعین نہیں کی گئی: تو اس کا کچھ اعتبار نہیں اور جب نیت کے ساتھ کوئی عمل مل جائے اور وہ متعین ہوجائے تو اس کا لحاظ ضروری ہے ——— اور انضباط مختلف ہے: پس اس کا ادنی درجہ زبان سے انضباط ہے۔ اور اس کا اعلی درجہ یہ ہے کہ قول (زبانی نیت) کے ساتھ کوئی ظاہری فعل ہو، جو علانیہ طور پر پایا جاتا ہو، جو اس حالت کے ساتھ مختص ہو جس کا اس نے ارادہ کیا ہے، جیسے ہدی لے چلنا۔

تصحیح: بل لأبدِ أبدٍ مطبوعہ اور مخطوطہ نسخوں میں بل لأبدِ الأبدِ تھا۔ تصحیح مشکوٰۃ شریف اور مسلم شریف سے کی گئی ہے۔

☆　☆　☆

(۱۰) ——— پھر جب ترویہ کا دن آیا، تو سب لوگ منی کی طرف متوجہ ہوئے یعنی منی میں جانے کی تیاری کرنے لگے۔ پس انھوں نے حج کا احرام باندھا۔ اور نبی ﷺ سوار ہوکر منی تشریف لے گئے۔ وہاں آپؐ نے ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر پڑھیں۔ پھر فجر کی نماز کے بعد توقف کیا تا آنکہ سورج نکل آیا۔ پھر آپؐ عرفات کے لئے روانہ ہوئے۔ اور مقام نَمِرہ میں پڑاؤ کیا (نمرہ: جگہ کا نام ہے۔ جہاں حرم کی حد ختم ہوکر، عرفات کی حد شروع ہوتی ہے۔ اب وہاں مسجد نمرہ بنی ہوئی ہے)

عرفہ میں جانے سے پہلے منی میں قیام کی حکمت: مسنون یہ ہے کہ حجاج ۸؍ ذی الحجہ کو، عرفات جانے کے لئے منی میں پہنچ جائیں۔ اور وہاں پانچ نمازیں ادا کریں۔ پھر ۹؍ ذی الحجہ کی صبح کو وہاں سے عرفات کی طرف روانہ ہوں۔ کیونکہ مکہ مکرمہ سے عرفات کے لئے روانگی کی بہ نسبت، منی میں جمع ہوکر وہاں سے روانگی میں لوگوں کے لئے سہولت ہے۔ نبی ﷺ نے اسی مصلحت سے منی میں قیام کیا تھا۔ کیونکہ حج میں اجتماعِ عظیم ہوتا ہے، جن میں کمزور اور بیمار بھی ہوتے ہیں۔ پس اگر لوگ مکہ سے سیدھے ۹؍ ذی الحجہ کو عرفہ جائیں گے تو ممکن ہے کہ کچھ لوگ نہ پہنچ سکیں اور ان کا حج فوت ہوجائے۔

سوال: نبی ﷺ ۸؍ ذی الحجہ ہی کو سیدھے عرفات کیوں تشریف نہیں لے گئے، جبکہ منزلِ مقصود وہی تھی؟!

جواب: اگر نبی ﷺ ایسا کرتے تو لوگ اس کو سنت سمجھ لیتے۔ اور ان کا یہ عقیدہ بن جاتا کہ عرفہ کے دن سے پہلے

ہی عرفات میں پہنچ جانا قربت اور کار ثواب ہے۔ پھر معلوم نہیں لوگ کتنے دن پہلے وہاں پہنچ جاتے۔ اس لئے آپؐ قبل از وقت عرفات میں تشریف نہیں لے گئے۔

[١٠] فلما كان يومُ التروية، توجَّهوا إلى منى، فأهلوا بالحج، وركب النبى صلى الله عليه وسلم، فصلى بها الظهر، والعصر، والمغرب، والعشاء، والفجر، ثم مكث قليلاً حتى طلعت الشمس، فسار حتى نزل بنَمِرَة.

أقول: إنما توجَّه يومَ التروية: ليكون أرفق به وبمن معه، فإن الناس مجتمعون فى ذلك اليوم اجتماعاً عظيمًا، فيهم الضعيف والسقيم، فاستحبَّ الرفقَ بهم؛ ولم يدخل عرفة قبل وقتها: لئلا يتخذَها الناس سنة، ويعتقدوا أن دخولها فى غير وقتها قربة.

ترجمہ: (۱۰) میں کہتا ہوں: ترویہ کے دن آپؐ اسی لئے (منی کی طرف) متوجہ ہوئے، تاکہ یہ متوجہ ہونا آپؐ کے لئے اور آپؐ کے ساتھیوں کے لئے زیادہ آسانی کی بات ہو۔ پس بیشک لوگ اکٹھے ہونے والے ہیں اس دن میں بڑی تعداد میں۔ درانحالیکہ ان میں کمزور اور بیمار ہیں۔ پس پسند فرمایا آپؐ نے ان کے ساتھ آسانی کرنا (سوال کا جواب) اور آپؐ عرفہ میں اس کے وقت سے پہلے داخل نہیں ہوئے تاکہ لوگ اس کو سنت نہ بنالیں۔ اور وہ یہ اعتقاد نہ کرلیں کہ عرفات میں داخل ہونا اس کے وقت کے علاوہ میں نیکی کا کام ہے (یعتقدوا سے پہلے لا مقدر ہے)

☆ ☆ ☆

(۱۱) —— پھر جب مقام نمرہ میں آفتاب ڈھل گیا۔ تو آنحضرت ﷺ نے اپنی ناقہ قصواء پر کجاوا کسنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اس پر آپؐ کے لئے کجاوا کسا گیا۔ پس آپؐ اس پر سوار ہوکر میدان کے نشیب میں آئے۔ اور لوگوں سے خطاب فرمایا۔ جس میں سے درج ذیل پانچ باتیں محفوظ کی گئی ہیں:

پہلی بات —— جان و مال کی حرمت کا اعلان —— فرمایا: ''لوگو! تمہارے خون اور تمہارے مال تم پر حرام ہیں'' یعنی ناحق کسی کا خون کرنا اور ناجائز طریقہ پر کسی کا مال لینا حرام ہے: ''جیسے تمہارے اس دن کی، تمہارے اس شہر کی اور تمہاری اس سرزمین کی حرمت'' یعنی جیسے یوم عرفہ محترم ہے۔ شہر مکہ محترم ہے اور حرم شریف محترم ہے، ان کی بے حرمتی جائز نہیں، اسی طرح لوگوں کے جان و مال بھی محترم ہیں۔ ان میں ناحق دست اندازی جائز نہیں۔

دوسری بات —— جاہلیت کی تمام باتوں کی پامالی —— فرمایا: ''سنو! جاہلیت کی تمام چیزیں میرے قدموں تلے پامال ہیں (پہلی مثال) جاہلیت کے زمانہ کے خون کے سب دعوے پامال ہیں۔ اور سب سے پہلے میں اپنے گھرانے کے ایک خون کا دعوی ختم کرتا ہوں۔ یہ ربیعہ کے لڑکے (یعنی آپؐ کے چچازاد بھائی کے لڑکے) کے خون کا دعوی ہے۔ جو قبیلہ بنو

سعد میں دودھ پیتا تھا۔ اوراس کو قبیلۂ ہُذیل کے لوگوں نے قتل کر دیا ہے (دوسری مثال) اور زمانۂ جاہلیت کے سارے سودی مطالبات سوخت ہیں۔ اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا ایک سودی مطالبہ ختم کرتا ہوں۔ یہ میرے چچا عباس کے سودی مطالبات ہیں، جن کو میں ختم کرر ہا ہوں''۔

تیسری بات —— عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید اور زوجین کے حقوق کا بیان —— فرمایا: ''تم لوگ عورتوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو! کیونکہ تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر ہی لیا ہے۔ اور اللہ کے حکم سے تمہارے لئے ان سے فائدہ اٹھانا حلال ہوا ہے۔ تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ جس شخص کا گھر میں آنا تمہیں ناپسند ہو، وہ اس کو تمہارے گھر میں نہ آنے دیں اور اگر وہ اس کی خلاف ورزی کریں تو تم ان کو ہلکی مار مار سکتے ہو۔ اور ان کا تم پر یہ حق ہے کہ عرف کے مطابق ان کے خورد ونوش اور ان کے لباس کا بندوست کرو''

چوتھی بات —— امت کو کتاب اللہ سے وابستہ رہنے کی وصیت —— فرمایا: ''اور میں تمہارے لئے وہ چیز چھوڑ کر جار ہا ہوں کہ اگر تم اس سے وابستہ رہے تو تم ہرگز گمراہ نہیں ہوو گے: وہ چیز کتاب اللہ ہے!''

پانچویں بات —— فریضۂ نبوت کی انجام دہی کے بارے میں استفسار —— فرمایا: ''اور تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا، بتاؤ! تم کیا جواب دوگے؟'' لوگوں نے عرض کیا: ہم گواہی دیں گے کہ آپؐ نے ہمیں دین پہنچایا اور اچھی طرح پہنچایا اور ہماری خیر خواہی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ آپؐ نے اپنی انگشتِ شہادت آسمان کی طرف اٹھائی۔ پھر آپؐ وہ اشارہ لوگوں کے سروں پر لائے، اور تین بار فرمایا: ''اے اللہ گواہ رہ! اے اللہ! گواہ رہ!! اے اللہ! گواہ رہ!!!''

اس کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی۔ پھر تکبیر کہی اور آپؐ نے ظہر کی نماز پڑھائی۔ پھر بلال رضی اللہ عنہ نے اقامت کہی اور آپؐ نے عصر کی نماز پڑھائی۔ اور دونوں نمازیں بلافصل پڑھائیں یعنی درمیان میں سنتیں اور نفلیں نہیں پڑھیں۔

بڑے اجتماع میں خطاب کا موضوع: عرفہ کا اجتماع اتنا بڑا اجتماع تھا کہ لوگوں نے ایسا بڑا اجتماع کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایسے موقعہ کو غنیمت جانا جاتا ہے۔ اور ایسے موقعہ پر وہ باتیں بیان کی جاتی ہیں جن کی لوگوں کو شدید حاجت ہوتی ہے۔ جن سے بے خبری روا نہیں ہوتی۔ اور جو باتیں عام لوگوں تک پہنچانی ہوتی ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بھی اس خطبہ میں جو آپؐ کی زندگی کا اہم ترین الوداعی خطبہ تھا دین کی بنیادی اہمیت رکھنے والی باتیں بیان فرمائی ہیں، جو اوپر بیان کی گئیں۔ اور یہ سارا خطبہ نہیں ہے بلکہ صرف چند باتیں ہیں جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے یاد رکھی ہیں۔ ان کے علاوہ معلوم نہیں کیا کیا باتیں بیان فرمائی ہونگی۔

عرفہ اور مزدلفہ میں نمازیں جمع کرنے میں حکمت: دو مصلحتوں سے رسول اللہ ﷺ نے عرفہ میں ظہر اور عصر اور مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کو جمع فرمایا ہے:

پہلی مصلحت: عرفہ اور مزدلفہ میں لوگوں کا بڑا بھاری اجتماع ہوتا ہے۔ وہاں دو مرتبہ نمازوں کے لئے حاضری سخت دشوار ہے۔ اور ایک اجتماع تو ضروری ہے تاکہ سب لوگ آنحضرت ﷺ کی زیارت کریں۔ اور اس موقعہ کا اہم ترین بیان سنیں۔ اس لئے ایک ہی اجتماع میں دونوں نمازیں ادا کی گئیں۔

دوسری مصلحت: عرفہ کا خاص مشغلہ ذکر و دعا ہے۔ اور نمازوں کے اوقات کی پابندی سال بھر کا حکم ہے۔ اور عمومی اور خصوصی امروں میں جب تعارض ہوتا ہے تو انوکھی، نئی اور نادر صورت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ چنانچہ ذکر و دعا کی اہمیت کے پیش نظر عرفہ میں دو نمازیں ایک ساتھ ادا کی گئیں۔

فائدہ: تجربہ یہ ہے کہ جب عرفہ میں ذکر و دعا شروع کی جاتی ہے تو ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے۔ جس کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی۔ پھر جب عصر کی نماز کے لئے وقفہ کیا جاتا ہے تو وہ کیفیت دوبارہ حاصل نہیں ہوتی۔ اور مغرب کی نماز مزدلفہ میں پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ وقوفِ عرفہ: غروبِ آفتاب کے بعد ختم کیا جاتا ہے۔ اب اگر لوگ مغرب کی نماز پڑھ کر مزدلفہ کے لئے روانہ ہوں گے تو بہت تاخیر ہوجائے گی۔ اور رات کا بڑا حصہ سفر کی نذر ہوجائے گا۔ اور وقوفِ مزدلفہ میں خلل پڑے گا۔ اس لئے وقوفِ عرفہ ختم کرتے ہی مزدلفہ کے لئے روانگی ہوجاتی ہے۔ لوگ جلد از جلد مزدلفہ پہنچ کر دونوں نمازیں ایک ساتھ ادا کر کے آرام کرتے ہیں۔ اور صبح تازہ دم ہو کر وقوفِ مزدلفہ کرتے ہیں۔

[۱۱] فلما زاغت الشمس بنمرة، أمر بالقَصواء، فَرُحِّلَتْ له، فأتى بطن الوادى، فخطب الناس، وحُفظ من خطبته يومئذ: "إن دماء كم حرام" إلخ، ثم أذّن بلال، ثم أقام فصلى الظهر، ثم أقام فصلى العصر، ولم يصل بينهما شيئًا.

أقول: إنما خطب يومئذ بالأحكام التى يحتاج الناس إليها، ولايَسَعُهم جهلُها: لأن اليومَ يومُ اجتماع، وإنما تُنتهز مثلُ هذه الفرصةِ لمثلِ هذه الأحكام التى يرادُ تبليغُها إلى جمهور الناس.

وإنما جمع بين الظهر والعصر، وبين المغرب والعشاء: لأن للناس يؤمئذ اجتماعاً لم يُعهد فى غير هذا الموطن، والجماعةُ الواحدةُ مطلوبة، ولابد من إقامتها فى مثل هذا الجمع، ليراه جميع من هنالك، ولايتيسر اجتماعهم فى وقتين.

وأيضًا : فلأن للناس اشتغالاً بالذكر والدعاء، وهما وظيفةُ هذا اليوم، ورعايةُ الأوقاتِ وظيفةُ جميع السنة، وإنما يُرَجَّحُ فى مثل هذا الشيئُ البديع النادر.

ترجمہ: (۱۱) میں کہتا ہوں: آج کے دن آپؐ نے خطاب فرمایا انہی احکام کے ذریعہ جن کے لوگ محتاج تھے، اور ان کو نہ جاننے کی لوگوں کے لئے گنجائش نہیں تھی۔ اس لئے کہ آج کا دن اجتماع کا دن ہے۔ اور اس قسم کا موقعہ غنیمت

جانا جاتا ہے اُس قسم کے احکام کے لئے جن کی عام لوگوں تک تبلیغ مقصود ہوتی ہے۔
اور ظہر وعصر کے درمیان اور مغرب عشاء کے درمیان اس لئے جمع کیا کہ لوگوں کے لئے آج ایسا اجتماع ہے جو نہیں جانا گیا اس جگہ کے علاوہ میں۔ اور ایک مرتبہ جماعت تو مطلوب ہے، اور ضروری ہے اس کا قائم کرنا اس طرح کے اجتماع میں، تاکہ دیکھیں آپؐ کو تمام وہ لوگ جو وہاں ہیں۔ اور آسان نہیں ہے ان کا اکٹھا ہونا دو وقتوں میں —— اور نیز: پس اس لئے کہ لوگوں کے لئے ذکر ودعا میں مشغولیت ہے۔ اور وہ دونوں اس دن کا خاص حکم ہیں۔ اور (نمازوں کے) اوقات کا لحاظ کرنا پورے سال کا خاص حکم ہے۔ اور ترجیح دی جاتی ہے اس جیسی صورت میں نادر (اور) انوکھی چیز کو۔

☆ ☆ ☆

(۱۲) —— ظہر اور عصر کی نمازیں ادا فرما کر آپؐ اپنی ناقہ پر سوار ہوئے۔ اور میدانِ عرفات میں خاص وقوف کی جگہ پر تشریف لے گئے۔ اور قبلہ رُو ہو کر برابر ذکر ودعا میں مشغول رہے یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا۔ جب غروب کے بعد کی زردی کچھ کم ہوگئی تو آپؐ مزدلفہ کے لئے روانہ ہوئے۔
عرفہ سے غروبِ آفتاب کے بعد روانگی کی وجہ: پہلی وجہ: زمانۂ جاہلیت میں لوگ عرفہ سے غروبِ آفتاب سے پہلے ہی لوٹ جاتے تھے۔ جو دین میں تحریف تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی مخالفت کی اور غروب کے بعد مراجعت فرمائی۔ دوسری وجہ: غروب سے پہلے واپسی کا وقت متعین نہیں کیا جا سکتا۔ اور غروبِ آفتاب ایک متعین امر ہے۔ اور بڑے اجتماعات میں متعین چیز ہی کا حکم دیا جاتا ہے تاکہ لوگ اس پر صحیح طور پر عمل کر سکیں۔

[۱۲] ثم ركب حتى أتى الموقف، واستقبل القبلة، فلم يزل واقفًا حتى غربت الشمس، وذهبت الصفرة قليلا، ثم دفع.
أقول: إنما دفع بعد الغروب: ردًا لتحريف الجاهلية، فإنهم كانوا لايدفعون إلا قبل الغروب، ولأن قبل الغروب غير مضبوط، وبعد الغروب أمر مضبوط، وإنما يؤمر في مثل ذلك اليوم بالأمر المضبوط.

ترجمہ: (۱۲) میں کہتا ہوں: غروب کے بعد ہی آپؐ روانہ ہوئے جاہلیت کی تحریف کی تردید کرتے ہوئے، پس بیشک جاہلیت کے لوگ واپس نہیں لوٹا کرتے تھے مگر غروب سے پہلے، اور اس لئے کہ غروب سے پہلے (واپسی کا وقت) غیر متعین ہے۔ اور غروب کے بعد ایک متعین امر ہے۔ اور اس جیسے دن میں متعین بات ہی کا حکم دیا جاتا ہے۔

☆ ☆ ☆

(۱۳) —— پھر آپ ﷺ عرفہ سے روانہ ہوئے، یہاں تک کہ مزدلفہ پہنچے۔ مزدلفہ میں آپؐ نے ایک اذان اور دو

تکبیروں سے مغرب اور عشاء ادا فرمائیں۔ اور دونوں کے درمیان آپؐ نے نوافل نہیں پڑھے۔ پھر آپ لیٹ گئے یہاں تک کہ صبح صادق ہوگئی۔ پس آپؐ نے ایک اذان اور ایک تکبیر سے فجر پڑھی، جبکہ آپ کے لئے صبح صادق واضح ہوگئی۔ پھر آپ قصواء اونٹنی پر سوار ہوئے، یہاں تک کہ آپؐ مشعر حرام کے پاس آئے۔ پس آپؐ قبلہ رُو ہوگئے۔ اور اللہ سے دعا مانگی۔ ان کی کبریائی بیان کی اور ان کا تنہا معبود ہونا اور ان کی یکتائی بیان کی۔ اور آپ برابر وقوف کئے رہے یہاں تک کہ اُجالا ہوگیا۔ پھر آپؐ سورج نکلنے سے پہلے منی کے لئے روانہ ہوگئے۔ یہاں تک کہ وادی محسّر کے نشیب میں پہنچے، تو اونٹنی کی رفتار کچھ تیز کردی۔

مزدلفہ میں تہجد نہ پڑھنے کی وجہ: رسول اللہ ﷺ نے مزدلفہ کی رات میں تہجد نہیں پڑھا۔ کیونکہ آپؐ بہت سے مستحب امور مجمع عام میں چھوڑ دیا کرتے تھے۔ تاکہ لوگ ان کو لازمی چیز نہ سمجھ لیں۔ جیسے آپؐ کا معمول ہر فرض نماز کے لئے نئی وضوء کرنے کا تھا۔ مگر فتح مکہ کے موقع پر آپؐ نے پانچ نمازیں: فجر تا عشاء ایک ہی وضوء سے ادا فرمائیں۔ اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ: یا رسول اللہ! آج آپؐ نے وہ کام کیا جو آپؐ کبھی نہیں کرتے تھے! تو آپؐ نے جواب دیا: ''عمر! قصداً میں نے ایسا کیا ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۰۸ باب مایوجب الوضوء) (اور اس ترکِ مستحب میں بھی حکمت ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نو اور دس دونوں دن اعمال سے پُر ہیں۔ اور جسم کا بھی ایک حق ہے، جو مزدلفہ کی رات میں ادا کیا گیا)

اور مشعر حرام کے پاس وقوف کرنے کی حکمت گذشتہ باب میں بیان کی گئی ہے۔

وادی محسّر میں سواری تیز ہانکنے کی وجہ: آپؐ نے وادی محسر میں سواری کی رفتار اس لئے تیز کی تھی کہ بعض تاریخی روایات میں یہ بات آئی ہے کہ وہاں ہاتھی والوں کا لشکر تباہ ہوا تھا۔ پس جو شخص اللہ تعالیٰ سے اور ان کے قہر سے ڈرتا ہے اس کو ایسی غضب کی جگہ میں دل میں خوف محسوس کرنا چاہئے۔ اور وہاں سے بھاگنا چاہئے۔ اور صرف سہم جانا کافی نہیں، بلکہ اس بیم کو کسی ایسے واضح عمل سے متعین کرنا بھی ضروری ہے جو اس واقعہ کو یاد دلائے، اور نفس کو چوکنا کرے جیسے غزوۂ تبوک میں جب آپؐ اصحابِ حجر کے علاقہ سے گذرے تھے تو سر پر کپڑا ڈال لیا تھا اور سواری تیز کردی تھی اور صحابہ کو حکم دیا تھا کہ یہاں سے روتے ہوئے گذرو (بخاری حدیث ۴۴۱۹ کتاب المغازی)

[۱۳] ثم دفع حتى أتى المزدلفة، فصلى بها المغرب والعشاء بأذان وإقامتين، ولم يسبح بينهما، ثم اضطجع حتى طلع الفجر، فصلى الفجر حين تبين له الصبح، بأذان وإقامة، ثم ركب القَصواء حتى أتى المشعر الحرام، فاستقبل القبلة، فدعا الله، وكبره وهلله ووحَّده، فلم يزل واقفًا حتى أسفر جدًا، فدفع قبلَ أن تطلع الشمس، حتى أتى بطن محسِّر، فحرَّك قليلاً.

أقول: إنما لم يتهجد رسول الله صلى الله عليه وسلم في ليلة مزدلفةَ: لأنه كان لايفعل كثيرًا

من الأشياء المستحبة في المجامع، لئلا يتخذها الناس سنة.
وقد ذكرنا سر الوقوف بالمعشر الحرام.
وإنما أوضع بمحسر: لأنه محل هلاك أصحاب الفيل، فمن شأنِ من خاف الله وسطوتَه أن يستشعر الخوف في ذلك الموطِن، ويهرب من الغضب؛ ولما كان استشعارُه أمرًا خفيًا ضبط بفعل ظاهر، مذكرٍ له، منبهٍ للنفس عليه.

ترجمہ: اور وادی محسّر میں سواری کی رفتار اسی لئے تیز کی تھی کہ وہ ہاتھی والوں کی ہلاکت کی جگہ ہے (مگر یہ بات کسی محقق روایت سے ثابت نہیں اس سلسلہ میں روایات مختلف ہیں۔ دیکھئے معارف السنن ۶:۴۴۲) پس اس شخص کے حال سے جو اللہ سے اور اس کے قہر سے ڈرتا ہے: یہ بات ہے کہ وہ دل میں سہم جائے اس جگہ میں اور غضب الٰہی سے بھاگے۔ اور جب آپؐ کا سہمنا ایک مخفی امر تھا تو آپؐ نے (اس کو) متعین کیا ایک واضح عمل کے ذریعہ، جو اس غضب کو یاد دلانے والا ہے اور جو نفس کو اس غضب سے آگاہ کرنے والا ہے۔

☆ ☆ ☆

⑭ —— پھر آپ ﷺ جمرۂ عقبہ پر پہنچے۔ پس آپؐ نے اس پر سات ریزے مارے۔ جن میں سے ہر ایک کے ساتھ آپؐ تکبیر کہتے تھے۔ ٹھیکری کے کنکر کے مانند (یعنی کابلی چنے یا مٹر کے دانے کے برابر) آپؐ نے رمی میدان کے نشیب سے کی۔

پہلے دن رمی کا وقت صبح سے، اور باقی دنوں میں زوال سے ہونے کی وجہ: پہلے دن صرف جمرۂ عقبہ کی رمی کا حکم ہے اور باقی دنوں میں تینوں جمرات کی۔ اور پہلے دن رمی کا وقت ۱۰/ ذی الحجہ کی صبح صادق سے گیارہ کی صبح صادق تک ہے۔ اور ۱۱-۱۳/ میں رمی کا وقت زوال سے اگلی پوری رات یعنی صبح صادق تک ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۰/ ذی الحجہ کو اور بھی بہت سے کام ہیں یعنی رمی کے بعد قربانی کرنا، پھر سر منڈا کر احرام کھولنا، پھر مکہ مکرمہ جا کر طوافِ زیارت کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے لوگوں کی سہولت کے لئے پہلے دن صرف ایک جمرہ کی رمی کا حکم ہے۔ اور اس کا وقت بھی صبح صادق سے شروع ہوتا ہے، اور مستحب وقت طلوع آفتاب سے شروع ہوتا ہے۔ تاکہ لوگ جلدی سے رمی سے فارغ ہو کر دوسرے کام انجام دے سکیں۔ اور باقی دن تجارت اور خرید و فروخت کے ہیں۔ اور ان ایام میں رمی کے علاوہ کوئی اور کام بھی نہیں ہے۔ اور کاروبار سے فراغت عام طور پر دن کے آخری حصہ میں ہوتی ہے۔ اس لئے باقی دنوں میں تینوں جمرات کی رمی کا حکم ہے۔ اور اس کا وقت زوال سے شروع ہوتا ہے۔

رمی اور سعی میں سات کی تعداد کی وجہ: مبحث ۶ باب ۹ میں یہ بات بیان کی جاچکی ہے کہ طاق عدد ایک مبارک

عدد ہے (رحمۃ اللہ ۲: ۱۹۴) اور یہ بات بھی بیان کی جاچکی ہے کہ ایک: امام الاوتار ہے۔ اور تین اور سات اس کے خلیفہ، وصی اور قائم مقام ہیں (رحمۃ اللہ ۲: ۱۹۸) پس اگر سات کے عدد سے کام چل سکتا ہو تو اس سے تجاوز مناسب نہیں۔ اور یہاں یہ تعداد کافی تھی۔ اس لئے رمی اور سعی میں سات کا عدد ملحوظ رکھا گیا ہے۔

ٹھیکری جیسی کنکری سے رمی کرنے کی وجہ: یہ ہے کہ اس سے چھوٹی تو نظر ہی نہیں آئے گی۔ اور اس سے بڑی: ممکن ہے اس مجمع میں کسی کو لگ جائے اور زخمی کردے۔ اس لئے یہ درمیانی سائز اختیار کی ہے۔

[۱٤] ثم أتى جمرةَ العقبةِ فرماه بسبع حصيات، يكبر مع كل حصاة منها، مثل حصى الخَذْفِ، رمى من بطن الوادى.

أقول: إنما كان رمى الجمار فى اليوم الأول غدوةً، وفى سائر الأيام عشيةً: لأن من وظيفة الأول: النحر، والحلق، والإفاضة، وهى كلها بعد الرمى، ففى كونه غدوة تَوْسِعَةً، وأما سائر الأيام: فأيامُ تجارة، وقيام أسواق، فالأسهل أن يُجعلَ ذلك بعد مايَفرغ من حوائجه، وأكثرُ ما كان الفراغُ فى آخر النهار.

وإنما كان رمى الحجار تَوًّا، والسعى بين الصفاوالمروة توًّا: لما ذكرنا: من أن الوتر عدد محبوب، وأن خليفةَ الواحدِ الحقيقى: هو الثلاثةُ، أو السبعة؛ فبالحريِّ أن لايُتعدى من السبعة، إن كان فيها كفاية.

وإنما رمى بمثل حَصَى الخَذَفِ: لأن دونَها غيرُ محسوس، وفوقَها ربما يؤذى فى مثل هذا الموضع.

ترجمہ: (۱۴) میں کہتا ہوں: پہلے دن میں جمرات کی رمی صبح کے وقت میں، اور باقی دنوں میں شام کے وقت میں اس لئے ہے کہ پہلے دن کے خاص کام: قربانی، سر منڈانا اور طوافِ زیارت کرنا ہیں۔ اور وہ سارے کام رمی کے بعد انجام دیئے جاتے ہیں۔ پس رمی کے صبح میں ہونے میں گنجائش (سہولت) ہے۔ اور رہے دیگر ایام: تو وہ تجارت اور بازاروں میں خرید وفروخت کے دن ہیں۔ پس آسان بات یہ ہے کہ رمی لوگوں کی ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد مقرر کی جائے۔ اور عام طور پر فراغت دن کے آخر میں ہوتی ہے —— اور جمرات کی رمی طاق اور صفا ومروہ کے درمیان سعی طاق اُسی وجہ سے ہے جو ہم نے بیان کی ہے یعنی یہ بات کہ طاق محبوب عدد ہے اور یہ بات کہ واحد حقیقی کے خلیفہ تین یا سات ہیں۔ پس مناسب یہ ہے کہ سات سے نہ بڑھا جائے۔ اگر سات کافی ہوں —— اور ٹھیکری جیسی کنکری سے رمی: اس لئے کی جاتی ہے کہ اس سے چھوٹی غیر محسوس ہے۔ اور اس سے بڑی کبھی ایذاء پہنچاتی ہے اس جیسی جگہ میں (التوّ: اکیلا، مراد طاق عدد ہے)

(۱۵) —— پھر آپ ﷺ قربان گاہ کی طرف پلٹے، پس تریسٹھ اونٹ اپنے ہاتھ سے ذبح کئے۔ پھر چھری علی رضی اللہ عنہ کو دی، تاکہ وہ باقی اونٹوں کو ذبح کریں۔ اور آپ نے ان کو اپنی ہدی میں شریک کرلیا۔ پھر ہر اونٹ میں سے ایک ایک بوٹی کاٹنے کا حکم دیا۔ اوران سب بوٹیوں کو ایک ہانڈی میں پکایا گیا۔ پھر دونوں حضرات نے ان کا گوشت کھایا اور ان کا شوربا پیا۔

تریسٹھ اونٹوں کی قربانی کی وجہ: چونکہ آپ ﷺ کی عمر مبارک ۶۳ سال ہوئی ہے اس لئے آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے ۶۳ اونٹوں کی قربانی فرما کر ہر سال کی زندگی کی نعمت کا شکریہ ادا کیا۔

تمام ہدیوں میں سے تناول فرمانے کی وجہ: ایک تو قربانی سے دلچسپی ظاہر کرنا مقصود تھا۔ دوسری: تبرکاً ان کو تناول فرمایا تھا۔

[۱۵] ثم انصرف إلى المنحر، فنحر ثلاثاً وستين بدنة بيده، ثم أعطى علياً رضى الله عنه لينحر ما غبر، وأشركه فى هديه ثم أمر من كل بدنة بِبَضْعة فجعلت فى قِدر فطبخت، فأكلا من لحمها، وشربا من مرقها.

أقول: إنما نحر بيده هذا العدد: ليشكر ما أولاه الله فى كل سنَةٍ من عمره ببدنةٍ.

وإنما أكل منها وشرب: اعتناءً بالهدى، وتبركًا بما كانلله تعالى.

ترجمہ: (۱۵) میں کہتا ہوں: آپؐ نے اپنے ہاتھ سے یہ تعداد اس لئے ذبح کی تاکہ آپ شکر بجالائیں اس نعمت کا جو آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے آپؐ کی زندگی کے ہر سال میں ایک اونٹ کے ذریعہ —— اور ان میں سے کھایا اور پیا۔ ہدی کا اہتمام کرنے کے طور پر اور ان چیز سے برکت حاصل کرنے کے طور پر جو اللہ تعالیٰ کے لئے (قربان) ہوگئی ہے۔

☆　☆　☆

(۱۶) —— رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں نے قربانی اس جگہ کی ہے، اور سارا منیٰ قربانی کی جگہ ہے، پس تم اپنے ڈیروں میں قربانی کرسکتے ہو۔ اور عرفات میں میں نے یہاں (پتھر کی بڑی چٹانوں کے پاس) وقوف کیا ہے۔ اور عرفات سارا وقوف کی جگہ ہے۔ اور مزدلفہ میں میں نے یہاں (مشعر حرام کے پاس) وقوف کیا ہے۔ اور مزدلفہ سارا وقوف کی جگہ ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۵۹۳ باب الوقوف بعرفۃ) اور ایک روایت میں یہ زیادتی ہے کہ: ''مکہ کی ساری راہیں: راستہ اور ذبح کی جگہ ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۵۹۶) یعنی حاجی جس راہ سے چاہے مکہ میں داخل ہوسکتا ہے۔ مکہ کے بالائی حصہ سے، جہاں سے آپؐ داخل ہوئے تھے، داخل ہونا ضروری نہیں۔ اور ہدی ذبح کرنے کی جگہ پورا حرم شریف ہے۔ اور مکہ بھی حرم میں داخل ہے۔ پس مکہ میں بھی ہدی ذبح کی جاسکتی ہے۔

تشریعی اور غیر تشریعی اعمال کے درمیان فرق: تشریعی اعمال: وہ ہیں جو آنحضرت ﷺ نے مسئلۂ شرعی کے

طور پر کئے ہیں یعنی اس لئے کئے ہیں کہ وہ لوگوں کے لئے دینی مسئلہ بنیں اور لوگ اس پر عمل پیرا ہوں۔ پس ان کا اتباع واجب ہے۔ اور غیر تشریعی اعمال: وہ ہیں جو آپؐ نے اتفاقی طور پر، یا کسی وقت کی خاص مصلحت کے پیش نظر، یا محاسن امور کو اختیار کرنے کے طور پر کئے ہیں۔ ان امور میں آپؐ کا اتباع مستحب ہے۔ ضروری نہیں۔ مذکورہ حدیث میں آپؐ نے یہی فرق واضح کیا ہے کہ عرفات میں اور مزدلفہ میں مخصوص جگہ وقوف کرنا اور منی میں مخصوص جگہ قربانی کرنا دوسری قسم کے اعمال میں سے ہیں۔ پس پورے میدان عرفات میں اور پورے مزدلفہ میں وقوف کرنا درست ہے اور سارے حرم میں کسی بھی جگہ ہدی کا جانور ذبح کیا جا سکتا ہے۔

[۱۶] قال صلی اللہ علیہ وسلم: " نحرتُ ھھنا، ومنی کلھا منحر، فانحروا فی رحالکم، ووقفتُ ھھنا، وعرفۃُ کلُّھا موقِفٌ، ووقفتُ ھھنا، وجمعٌ کلھا موقف" وزاد فی روایۃ: "وفجاج مکۃ طریق ومنحر"

أقول: فرق النبی صلی اللہ علیہ وسلم بین مافعلہ تشریعًا لھم، وبین مافعلہ بحسب الاتفاق، أو لمصلحۃٍ خاصۃٍ بذلک الیوم، أو اختیاراً لمحاسن الأمر.

ترجمہ: (۱۶) میں کہتا ہوں: امتیاز کیا نبی ﷺ نے اس کام کے درمیان جس کو آپؐ نے کیا ہے لوگوں کے لئے تشریع (قانون سازی) کے طور پر، اور اس کام کے درمیان جس کو آپؐ نے کیا ہے اتفاقی طور پر، یا اس دن کی خاص مصلحت کے طور پر یا عمدہ بات کو پسند کرنے کے طور پر۔

☆ ☆ ☆

⑰ —— پھر (احرام کھولنے کے بعد) آپؐ اپنی ناقہ پر سوار ہوئے اور بیت اللہ شریف لوٹے، اور مکہ میں ظہر کی نماز ادا فرمائی، اور طواف کیا اور آبِ زمزم نوش فرمایا۔

طوافِ زیارت میں جلدی: دو وجہ سے کی ہے: ایک: اس لئے کہ عبادت اس کے اول وقت میں ادا ہو جائے (طواف زیارت کا وقت ۱۲؍ ذی الحجہ کی شام تک ہے) دوسری وجہ: یہ ہے کہ انسان اس سے مطمئن نہیں کہ اس کو کوئی مانع پیش آ جائے۔ اس لئے حج فرض ہوتے ہی اولین فرصت میں حج کر لینا مستحب ہے۔

زمزم پینے کی وجہ: ایک تو یہ ہے کہ زمزم بھی شعائر اللہ (اسلام کی امتیازی باتوں) میں سے ہے، پس عظمت واحترام کے نقطۂ نظر سے آپؐ نے آبِ زمزم نوش فرمایا۔ دوسری وجہ: یہ ہے کہ آپؐ نے اس کو تبرکاً نوش فرمایا۔ کیونکہ یہ چشمہ اللہ تعالیٰ نے اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا پر مہربانی فرماتے ہوئے نمودار کیا ہے۔ اس لئے یہ پانی متبرک ہے۔

[۱۷] ثم ركب رسول الله صلى الله عليه وسلم، فأفاض إلى البيت، فصلى بمكة الظهرَ، وطاف، وشرب من ماء زمزم.

أقول: إنما بادر إلى البيت: لتكون الطاعةُ في أول وقتها، ولأنه لايأمن الإنسانُ أن يكون له مانع.

وإنما شرب من زمزم: تعظيمًا لشعائر الله، وتبركًا بما أظهره الله رحمةً.

ترجمہ: واضح ہے اور أن يكون سے پہلے مِن محذوف ہے۔

☆　　☆　　☆

⑱ ——— پھر جب منیٰ کے دن پورے ہوگئے، تو آپؐ نے اَبطح میں پڑاؤ کیا۔ اور طوافِ وَداع کیا۔ اور مدینہ کی طرف مراجعت فرمائی۔

اَبطح کا پڑاؤ مناسک میں داخل نہیں: اس میں اختلاف ہے کہ آنحضرت ﷺ کا اَبطح میں پڑاؤ عادت کے طور پر تھا یا عبادت کے طور پر؟ یعنی یہ نزول مناسک میں داخل ہے یا نہیں؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اس کو سنت فرماتے ہیں اور حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما اس کو محض راستہ کی ایک منزل قرار دیتے ہیں۔ مناسک میں شامل نہیں کرتے۔ صدیقہ فرماتی ہیں کہ آپؐ نے وہاں پڑاؤ اس لئے کیا تھا کہ سب ساتھی وہاں جمع ہوجائیں۔ اور وہاں سے ایک ساتھ واپسی عمل میں آئے۔

اور بخاری شریف میں ایک روایت (نمبر ۱۵۹۰) ہے کہ آپؐ نے منیٰ کے ایام میں فرمایا تھا کہ: ''ہم کل خَیفِ بنی کِنانہ میں پڑاؤ کریں گے۔ جہاں قریش اور کنانہ نے باہم قسمیں کھائی تھیں'' یعنی رسول اللہ ﷺ کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا تھا۔ اس روایت سے بعض حضرات نے یہ بات سمجھی ہے کہ آپؐ کا ابطح میں نزول قصدی تھا۔ دین کی رفعتِ شان کے لئے آپ وہاں اترے تھے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ نزول مناسک میں شامل نہیں۔ جیسے آپؐ حج کے موقعہ پر بیت اللہ میں داخل ہوئے تھے۔ مگر اس میں اتفاق ہے کہ وہ مناسک میں شامل نہیں۔

[۱۸] فلما انقضت أيام منى، نزل بالأبطح، وطاف للوداع، ونفر.

أقول: اختُلِف في نزول الأبطح: هل هو على وجه العبادة، أو العادة؟ فقالت عائشة: نزولُ الأبْطَح ليس بسنة، إنما نزل رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: لأنه كان أسْمَحَ لخروجه؛ واستُنبط من قوله: ''حيثُ تقاسموا على الكفر'': أنه قصد بذلك تنويهًا بالدين، والأولُ أصحُّ.

ترجمہ: واضح ہے۔ اس لئے نہیں کیا گیا۔ اور اَبْطح، مُحصّب، خیف بنی کنانہ ایک ہیں۔

باب ــــــ ۴

حج سے تعلق رکھنے والی باتیں

حجر اسود کی فضیلت کا بیان

حدیث:ــــــ (۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’حجر اسود جنت سے اس حال میں اترا تھا کہ وہ دودھ سے زیادہ سفید تھا، پس اس کو انسانوں کے گناہوں نے سیاہ کردیا‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۲۵۷۷)

یعنی گنہ گاروں نے جو اس کو ہاتھ لگائے تو ان کی گندگی سے میلا ہوگیا۔ پس مقصودِ کلام: گناہوں کی شناعت کا بیان ہے کہ گناہ ایسی گندی چیز ہے جو جنت کی چیز کی بھی شان گھٹا دیتی ہے۔ اور حجر اسود کی فضیلت اس سے ضمناً مفہوم ہوتی ہے۔

حدیث ــــــ (۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حجر اسود کے بارے میں فرمایا: ’’قسم بخدا! اللہ تعالیٰ قیامت کے دن حجر اسود کو اس شان سے نئی زندگی دیں گے کہ اس کی دو آنکھیں ہونگی جن سے وہ دیکھے گا اور زبان ہوگی جس سے وہ بولے گا۔ اور اس شخص کے حق میں گواہی دے گا جس نے برحق طور پر اس کو چھویا ہے‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۲۵۷۸) یعنی حجر اسود دیکھنے میں گو ایک پتھر ہے، مگر اس میں ایک روحانیت ہے۔ وہ اس شخص کو پہچانتا ہے جو بہ نیتِ تعظیم اس کا استلام کرتا ہے۔ اور قیامت کے دن اس کے حق میں گواہی بھی دے گا۔

حدیث ــــــ (۳) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: ’’حجر اسود اور مقام ابراہیم جنت کے ہیروں میں سے دو ہیرے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا نور مٹا دیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ان کا نور نہ مٹاتے تو وہ مشرق و مغرب کی درمیانی چیزوں کو روشن کردیتے‘‘ (ترمذی ۱:۱۰۷ حاکم ۱:۴۵۶ یہ روایت ضعیف ہے۔ اور اصح یہ ہے کہ یہ حضرت عبداللہ کا قول ہے)

تشریح: ان حدیثوں کے ذیل میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے تین باتیں بیان کی ہیں:

پہلی بات ــــــ حجر اسود اور مقام ابراہیم واقعی جنت کے پتھر ہیں یا یہ مجاز ہے؟ ــــــ **صحیح بات یہ ہے کہ** یہ دونوں دراصل جنت کے پتھر ہیں۔ جب ان کو زمین پر اتارا گیا تو حکمتِ الٰہی نے چاہا کہ ان پر دنیوی زندگی کے احکام مرتب ہوں۔ کیونکہ جگہ کی تبدیلی سے احکام میں تبدیلی آتی ہے۔ ایک اقلیم کا آدمی دوسری اقلیم میں جا بستا ہے تو رنگ، مزاج اور قد وغیرہ میں تبدیلی آجاتی ہے۔ چنانچہ زمین میں اتارنے کے بعد ان کی روشنی مٹا دی گئی۔ اور وہ زمین کے پتھروں جیسے نظر آنے لگے۔ اس صورت میں ان کی فضیلت کی وجہ: ان کا جنتی پتھر ہونا ہے۔

اور ضعیف قول: یہ ہے کہ یہ زمین ہی کے پتھر ہیں۔ اور حدیث فضیلت کا پیرایۂ بیان ہے۔ شروح مشکوٰۃ: مرقات

وطبی میں یہ قول ذکر کیا گیا ہے۔ مگر کوئی دلیل ذکر نہیں کی۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے والا تبار صاحب زادے حضرت محمد بن الحنفیہ کا قول ذکر کیا ہے کہ حجر اسود زمینی پتھر ہے۔ مگر مجھے یہ قول تلاش کے باوجود کسی کتاب میں نہیں ملا۔ اس صورت میں فضیلت کا راز یہ ہے کہ ان پتھروں کے ساتھ قوتِ مثالیہ یعنی ایک روحانیت مل گئی ہے۔ کیونکہ ملائکہ کی توجہ اُن کی شان بلند کرنے کی طرف مبذول رہتی ہے۔ اور ملأ اعلی کی اور نیک انسانوں کی خصوصی توجہات اُن کے ساتھ جُڑی ہوئی ہیں۔ اس لئے یہ پتھر جنتی پتھر یعنی متبرک ہوگئے ہیں۔ جیسے ایک چیز عرصہ تک کسی نیک آدمی کے استعمال میں رہتی ہے تو وہ متبرک ہوجاتی ہے۔ اب ابن عباس اور ابن الحنفیہ کے اقوال کے درمیان تطبیق کی صورت یہ ہے کہ ابن عباس کا قول: حجر اسود کی فضیلت کی تمثیل (پیرایۂ بیان) ہے۔ اور محمد بن الحنفیہ کا قول: حقیقت کا بیان ہے (مگر اس پر اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ پہلی روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نہیں ہے۔ بلکہ مرفوع روایت ہے اور صحیح ہے۔ اور محمد بن الحنفیہ ایک تابعی ہیں۔ ان کا قول حدیث کے ہم پلہ نہیں ہوسکتا)

نوٹ: شاہ صاحب رحمہ اللہ نے دونوں احتمال مساوی درجہ میں بیان کئے ہیں۔ صحیح اور ضعیف کی تعبیر شارح کی ہے۔

دوسری بات — آخرت میں حجر اسود کے لئے آنکھیں اور زبان ہونے کی وجہ — شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہم نے آنکھوں سے اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ بیت اللہ شریف گویا روحانیت سے بھرا ہوا ہے۔ اور حجر اسود اس کا ایک جزء ہے۔ پس ضروری ہے کہ اس کو آخرت میں وہ چیز دی جائے جو زندوں کی خاصیت ہے یعنی آنکھیں اور زبان دی جائے کیونکہ جو پتھر مدتِ مدید تک الطافِ الٰہی کا مورد رہا ہے، اگر وہ آخرت میں ذی عقل مخلوق بن جائے تو تعجب کی کیا بات ہے! مولانا روم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

سگِ اصحابِ کہف روزے چند　÷　پئے نیکاں گرفت: مردم شُد

تیسری بات — حجر اسود کے گواہی دینے کی وجہ — مبحث اول، باب گیارہ (رحمۃ اللہ ۱: ۳۳۱) میں یہ بات تفصیل سے بیان کی گئی ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ لوگوں کے مونہوں پر مہر کردیں گے۔ اور ان کے ہاتھ پاؤں بولیں گے اور شہادت دیں گے۔ کیونکہ وہ انسانوں کے کرتوتوں سے واقف ہیں۔ اسی طرح جب حجر اسود کو یہ معرفت حاصل ہے کہ کس مؤمن نے اس کو بہ نیتِ تعظیم چھویا ہے، اور کس نے فاسد نیت سے اس کو ہاتھ لگایا ہے، تو ضروری ہے کہ آخرت میں وہ اس کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی بھی دے۔

﴿أمور تتعلق بالحج﴾

[۱] قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: "نزل الحجرُ الأسود من الجنة، وهو أشدُّ بياضاً من اللبن، فسوَّدَتْه خطايا بنی آدم" وقال فيه: "واللہ ليبعثَنَّه يومَ القيامة، له عينان يُبصر بهما،

ولسانٌ ينطق به، يشهدُ على من اسْتَلَمه بحقٍ" وقال:" إن الركن والمقام ياقوتتان"
أقول: يحتمل أن يكونا من الجنة في الأصل، فلما جُعلا في الأرض: اقتضت الحكمةُ أن يُراعى فيهما حكمُ نشأةِ الأرض، فطُمس نورُهما؛ ويحتمل أن يراد أنه خالطتهما قوةٌ مثالية، بسبب توجه الملائكة إلى تنويه أمرهما، وتعلُّق هِمَمِ الملأ الأعلى والصالحين من بني آدمي، حتى صارت فيهما قوة ملكية؛ وهذا وجه التوفيق بين قول ابن عباس رضي الله عنهما هذا وقولِ محمد بن الحَنَفِيَّة رضي الله عنه: إنه حجرٌ من أحجار الأرض.
وقد شاهدنا عياناً: أن البيت كالمحشوِّ بقوة ملكية، ولذلك وجب أن يُعطى في المثال ما هو خاصيةُ الأحياء: من العينين واللسان.
ولما كان معرِّفا لإيمان المؤمنين وتعيظمِ المعظمِين لله، وجب أن يظهر في اللسان بصورة الشهادة له أو عليه، كما ذكرنا من سر نطق الأرجل والأيدي.

ترجمہ: حج سے تعلق رکھنے والی باتیں: (۱) احادیث کے بعد: میں کہتا ہوں: ممکن ہے کہ یہ دونوں اصل میں جنت کے پتھر ہوں۔ پس جب ان کو زمین پر اتارا گیا تو حکمت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ ان دونوں میں لحاظ کیا جائے حیات دنیا کے حکم کا۔ چنانچہ ان دونوں کی روشنی مٹادی گئی۔ اور یہ بھی امکان ہے کہ ان دونوں کے ساتھ مثالی قوت (روحانیت) مل گئی ہو، فرشتوں کے متوجہ ہونے کی وجہ سے ان دونوں کی شان بلند کرنے کی طرف اور ملأ اعلی اور نیک انسانوں کی خصوصی توجہات کے جُڑنے کی وجہ سے۔ یہاں تک کہ پیدا ہوگئی ان میں مثالی قوت یعنی وہ متبرک ہوگئے۔ اور یہ تطبیق کی صورت ہے ابن عباسؓ کے اس قول کے درمیان اور محمد بن الحنفیہ کے قول کے درمیان کہ وہ زمین کے پتھروں میں سے ایک پتھر ہے ——— اور ہم نے آنکھوں سے اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ بیت اللہ گویا بھرا ہوا ہے قوتِ ملکیہ سے۔ اور اس وجہ سے ضروری ہے کہ حجر اسود دیا جائے عالم مثال میں وہ چیز جو کہ وہ زندوں کی خاصیت ہے یعنی دو آنکھیں اور زبان ——— اور جب حجر اسود: مؤمنین کے ایمان کی اور اللہ کے لئے تعظیم کرنے والوں کی تعظیم کی پہچان کرانے والا تھا، تو ضروری ہوا کہ زبان میں ظاہر ہو شہادت کی صورت میں اسکے حق میں یا اس کے خلاف۔ جیسا کہ ذکر کیا ہم نے پیروں اور ہاتھوں کے بولنے کے راز سے۔

☆ ☆ ☆

طواف کی فضیلت کا راز

حدیث ——— رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جس نے اس گھر کے ساتھ پھیرے لگائے یعنی ایک طواف

کیا، درانحالیکہ وہ اُن پھیروں کو یاد رکھے یعنی طواف سے غافل نہ ہو، پھر دوگانۂ طواف ادا کیا: تو وہ ایک غلام آزاد کرنے کی طرح ہوگا۔ اور آدمی جو بھی قدم اٹھاتا یا رکھتا ہے: اللہ تعالیٰ اس کے عوض میں ایک نیکی لکھتے ہیں، ایک برائی مٹاتے ہیں، اور ایک درجہ بلند فرماتے ہیں'' (یہ ابن عمرؓ کی روایت کے مختلف الفاظ جمع کئے ہیں۔ دیکھیں مشکوٰۃ حدیث ۲۵۸۰ کنز العمال حدیث ۱۲۰۱۴)

تشریح: طواف کی مذکورہ فضیلت دو وجہ سے ہے:

پہلی وجہ: یہ ثواب درحقیقت رحمتِ الٰہی میں غوطہ زن ہونے کا ہے جو طواف کے لئے ثابت کیا ہے۔ فرماتے ہیں: طواف رحمتِ الٰہی میں غوطہ زن ہونے کا پیکر محسوس ہے یعنی طواف اس بات کی ظاہری علامت ہے کہ طواف کرنے والا رحمتِ خداوندی سے بہرہ ور ہوا۔ اور طواف: ملأ اعلی کی دعاؤں کے منعطف ہونے کی ظاہری صورت ہے یعنی اس پیکر محسوس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ملأ اعلی طواف کرنے والے کے حق میں دعا گو ہیں۔ اور طواف: ان دونوں باتوں کی احتمالی جگہ ہے یعنی طواف کے ذریعہ رحمت اور دعائیں حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے طواف کی وہی فضیلت بیان فرمائی جو اس کی قریب ترین خاصیت ہے مذکورہ دونوں باتوں سے یعنی قدم قدم پر گناہوں کی معافی اور درجات کی بلندی وغیرہ درحقیقت رحمت ودعاؤں کا فیض ہے، جو طواف کے لئے ثابت کیا گیا ہے۔

دوسری وجہ: یہ ثواب درحقیقت ایمان کا ہے جو اس کے ترجمان کے لئے ثابت کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں: جب انسان طواف کرتا ہے اللہ کے حکم پر یقین کرتے ہوئے اور طواف پر جس اجر کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی تصدیق کرتے ہوئے تو طواف آدمی کے ایمان کی وضاحت اور اس کی شرح ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس شارح اور ترجمان کے لئے بھی وہی ثواب ثابت کیا جو اصل کا تھا۔

> [۲] قال صلى الله عليه وسلم: " من طاف بهذا البيت أسبوعا يُحصيه، وصلى ركعتين، كان كعتق رقبة، وما وضع رجلٌ قدمًا، ولا رفعها، إلا كتب الله له بها حسنة، ومحابها سيئة، ورفع له بها درجة"
>
> أقول: السرُّ فى هذا الفضل شيئان:
>
> أحدهما: أنه لما كان شَبَحًا للخوض فى رحمة الله، وعطفِ دعوات الملأ الأعلى إليه، ومَظِنةً لذلك، ذَكَرَ له أقربَ خاصيته لذلك.
>
> وثانيهما: أنه إذا فعله الإنسان إيمانا بأمر الله، وتصديقًا لموعوده، كان تبيانا لإيمانه، وشرحًا له.

ترجمہ: (۲) حدیث کے بعد: میں کہتا ہوں: اس فضیلت کا راز دو چیزیں ہیں: ایک: یہ کہ طواف جب پیکر محسوس تھا

اللہ کی رحمت میں گھسنے کا اور طواف کرنے والے کی طرف ملأ اعلی کی دعاؤں کے مڑنے کا، اور ان دونوں کی احتمالی جگہ تھا تو آپؐ نے طواف کے لئے ذکر کیا طواف کی قریب ترین خاصیت کو ان دونوں باتوں سے ——— دوسری: یہ ہے کہ جب انسان طواف کرتا ہے، اللہ کے حکم پر یقین کرتے ہوئے، اور اللہ کے وعدہ کئے ہوئے ثواب کی تصدیق کرتے ہوئے، تو طواف اس کے ایمان کی وضاحت کرنے والا اور اس کی شرح کرنے والا ہو جاتا ہے۔

تصحیح: خاصیته: مطبوعہ میں خاصیة تھا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی اور مطبوعہ صدیقی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

یوم عرفہ کی فضیلت اور اس دن کا خاص ذکر

حدیث ——— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی دن ایسا نہیں جس میں اللہ تعالیٰ عرفہ کے دن سے زیادہ اپنے بندوں کے لئے جہنم سے آزادی کا فیصلہ کرتے ہوں، اس دن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے قریب ہوتے ہیں۔ اور ان کے ذریعہ فرشتوں پر فخر کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں: دیکھتے ہو! میرے یہ بندے کس مقصد سے یہاں آئے ہیں؟'' (مشکوۃ حدیث ۲۵۹۴)

تشریح: عرفہ کے دن جب لاکھوں کی تعداد میں مسلمان جمع ہو کر اپنے لئے اور دوسروں کے لئے دعائیں کرتے ہیں، اللہ کے سامنے گڑگڑاتے ہیں اور آہ وزاری کرتے ہیں تو رحمت ورأفت کا اتھاہ سمندر جوش میں آتا ہے اور روحانیت کی باد بہاری چلتی ہے، اور اللہ تعالیٰ وسیع پیمانے پر بندوں کی مغفرت کا فیصلہ فرماتے ہیں۔ ایسا عظیم اجتماع کا دن سال میں اور کوئی نہیں ہے۔

حدیث ——— رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بہترین دعا: عرفہ کے دن کی دعا ہے۔ اور بہترین ذکر جو میں نے اور مجھ سے پہلے انبیاء نے کیا ہے، وہ: لا إلٰه إلا الله، وحدَه لاشريك له، له الملك، وله الحمد، وهو على كل شيئ قدير ہے'' (مشکوۃ حدیث ۲۵۹۸)

تشریح: مذکورہ ذکر یعنی کلمۂ توحید بہترین ذکر اس لئے ہے کہ وہ ذکر کی اکثر انواع کو جامع ہے (ذکر کی انواع دس ہیں جیسا کہ آگے ابواب الاحسان میں آئے گا) اس لئے آنحضرت ﷺ نے عرفہ کے دن اس ذکر کی ترغیب دی۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا ذکر: سبحان الله والحمد لله، ولا إله إلا الله، والله أكبر یعنی کلمۂ تمجید بھی ہے، جس کی آپؐ نے بہت سی جگہوں میں اور بہت سے اوقات میں ترغیب دی ہے۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔ لہٰذا یہ ذکر بھی عرفہ کے دن میں بکثرت کرنا چاہئے۔

[۳] قال صلى الله عليه وسلم: "ما من يوم أكثرَ من أن يُعتقَ الله فيه عبدًا من النار: من يوم

عرفة، وأنه ليدنو، ثم يُباهي بهم الملائكة"

أقول :ذلك: لأن الناس إذا تضرعوا إلى الله بأجمعهم، لم يتراخَ نزول الرحمة عليهم، وانتشار الروحانية فيهم.

[٤] وقال صلى الله عليه وسلم:"خير الدعاء دعاء يوم عرفة، وخير ما قلتُ أنا والنبيون من قبلي: لا إلٰه إلا الله، وحده لاشريك له" إلخ.

[أقول] وذلك: لأنه جامع لأكثر أنواع الذكر، ولذلك رَغَّبَ فيه، وفي: سبحان الله والحمد لله" إلخ في مواطِنَ كثيرة وأوقاتٍ كثيرة، كما يأتي في الدعوات.

ترجمہ:(۳) حدیث کے بعد: میں کہتا ہوں: وہ بات یعنی وسیع پیمانہ پر مغفرت کا فیصلہ اس لئے ہے کہ جب لوگ مل کر اللہ کے سامنے گڑگڑاتے ہیں تو ان پر رحمت کے نزول میں اور ان میں روحانیت کے پھیلنے میں دیر نہیں لگتی۔

(۴) حدیث کے بعد: (میں کہتا ہوں) اور وہ بہترین ذکر اس لئے ہے کہ وہ ذکر کی اکثر انواع کو جامع ہے۔ اور اسی وجہ سے (عرفہ کے دن میں) اس ذکر کی ترغیب دی ہے۔ اور سبحان اللہ الخ کی بھی بہت سی جگہوں اور بہت سے اوقات میں ترغیب دی ہے، جیسا کہ آگے دعوات واذکار کے بیان میں (ابواب الاحسان میں) آئے گا۔

☆　☆　☆

ہدی بھیجنے کی حکمت

رسول اللہ ﷺ ۹ھ میں خود حج کے لئے تشریف نہیں لے گئے تھے، مگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر الموسم بنا کر حج کرانے کے لئے بھیجا تھا۔ اس موقعہ پر آپؐ نے سو بکریاں بطور ہدی روانہ فرمائی تھیں اور کچھ اونٹ بھی بھیجے تھے جو منی میں ذبح کئے گئے تھے۔ پس اگر کسی وجہ سے حج کے لئے خود نہ جاسکے تو بھی کسی کے ساتھ ہدی کے جانور بھیجنا مسنون ہے۔ اور اس میں حکمت: حتی الامکان اعلائے کلمۃ اللہ کی گرم بازاری ہے یعنی اس سے بھی اسلام کا بول بالا ہوتا ہے۔ کیونکہ جہاں جہاں سے ہدی کے جانور گزریں گے، لوگوں کے دلوں میں حج کا شوق انگڑائی لے گا۔ نیز اس میں حاجت مندوں کا تعاون بھی ہے کیونکہ منی میں اُن ہدایا کا گوشت تقسیم ہوگا۔

سر منڈانے کی فضیلت کی وجہ

حجۃ الوداع میں ایک موقعہ پر آنحضرت ﷺ نے دعا فرمائی: "اے اللہ! سر منڈانے والوں پر مہربانی فرما!" لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! بال ترشوانے والوں کے لئے بھی۔ آپؐ نے دوبارہ وہی دعا کی۔ لوگوں نے پھر عرض کیا۔ تیسری

مرتبہ آپؐ نے بال ترشوانے والوں کو بھی دعا میں شامل فرمایا (مشکوٰۃ حدیث ۲۶۴۸ و ۲۶۴۹)

تشریح: سرمنڈانے والوں کے لئے تین بار اور قصر کرانے والوں کے لئے ایک بار دعا کرنے سے حلق کی فضیلت ظاہر کرنا مقصود ہے۔ اور سرمنڈا کر احرام کھولنا دو وجہ سے افضل ہے:

پہلی وجہ: جب لوگ بادشاہوں کے دربار میں جاتے ہیں تو صفائی کا خوب اہتمام کرتے ہیں۔ حجاج بھی احرام کھول کر طوافِ زیارت کے لئے دربار خداوندی میں حاضری دیں گے، پس ان کو بھی خوب صاف ہو کر حاضر ہونا چاہئے۔ اور سرمنڈانے سے سر کا میل کچیل اچھی طرح صاف ہو جاتا ہے، اس لئے یہ افضل ہے۔

دوسری وجہ: سرمنڈا کر احرام کھولنے کا اثر کئی روز تک باقی رہتا ہے۔ جب تک بال بڑھ نہیں جائیں گے، ہر دیکھنے والا محسوس کرے گا کہ اس نے حج کیا ہے۔ پس اس سے عبادت (حج) کی شان بلند ہوگی، اس لئے قصر سے حلق افضل ہے۔

عورتوں کے لئے سرمنڈانے کی ممانعت کی وجہ

حضرت علی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عورت کو اپنا سرمنڈانے سے منع فرمایا (مشکوٰۃ حدیث ۲۶۵۳) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث مروی ہے کہ: ''عورتوں پر حلق نہیں ہے۔ عورتوں پر صرف بال ترشوانا ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۶۵۴)

تشریح: عورتوں کے لئے احرام کھولتے وقت سرمنڈانا دو وجہ سے ممنوع ہے: ایک: اس سے عورت کی شکل بدنما ہو جاتی ہے۔ اور مُثلہ یعنی صورت بگاڑنا مطلقاً ممنوع ہے۔ اور دوسری وجہ: یہ ہے کہ اس سے عورت: مرد کے ہم شکل بن جاتی ہے۔ اور عورتوں کے لئے مردوں کی شکل اختیار کرنا بھی مطلقاً ممنوع ہے۔

[٥] ومن السنة أن يُهدىَ وإن لم يأت الحجَّ: إقامةً لإعلاء كلمة الله بقدر الإمكان.

[٦] وإنما دعا للمحلِّقين ثلاثاً، وللمقصِّرين مرةً: إبانةً لفضل الحلق، و ذلك: لأنه أقرب لزوال الشعث، المناسب لهيئة الداخلين على الملوك، وأدنى أن يبقى أثرُ الطاعة، ويُرى منه ذلك، ليكون أَنْوَهَ بطاعة الله.

[٧] ونهى أن تحلق المرأةُ رأسَها: لأنها مُثْلَةٌ، وتشبُّهٌ بالرجال.

ترجمہ: (۵) اور مسنون یہ ہے کہ ہدی بھیجے اگرچہ نہ آئے وہ حج میں: حتی الامکان اعلائے کلمۃ اللہ کی گرم بازاری کیلئے۔

(۶) اور آپؐ نے سرمنڈانے والوں کے لئے تین بار اور سر ترشوانے والوں کے لئے ایک بار دعا فرمائی۔ سرمنڈانے کی فضیلت کو ظاہر کرنے کے طور پر، اور وہ فضیلت اس لئے ہے کہ سرمنڈانا قریب تر ہے سر کی پراگندگی کے ازالہ کے

لئے، وہ ازالہ جو مناسب ہے بادشاہوں کے پاس جانے والوں کی حالت سے۔ اور قریب تر ہے کہ باقی رہے عبادت کا اثر اور دیکھی جائے اس سے یہ بات، تاکہ ہوے وہ اللہ کی عبادت کی شان زیادہ بلند کرنے والا۔

(۷) اور منع کیا اس بات سے کہ عورت اپنا سر منڈائے: اس لئے کہ وہ مُثلہ ہے اور مردوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرنا ہے۔

☆ ☆ ☆

مناسک منی میں ترتیب کا مسئلہ

۱۰ ذی الحجہ کو منی میں پہنچ کر چار کام کرنے ہوتے ہیں: پہلے رمی، پھر قربانی، پھر سر منڈا کر یا زلفیں ترشوا کر احرام کھولنا پھر طواف زیارت کرنا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ چار مناسک اسی ترتیب سے ادا فرمائے تھے۔ اور یہی ترتیب صحابۂ کرام کو بھی بتائی گئی تھی۔ اب یہ اختلاف ہے کہ یہ ترتیب واجب ہے یا سنت و مستحب؟

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ: کے نزدیک قارن اور متمتع پر رمی، ذبح اور حلق میں ترتیب واجب ہے۔ تقدیم و تاخیر کی صورت میں دم واجب ہوگا۔ اور طواف زیارت میں ترتیب واجب نہیں۔ البتہ مسنون یہ ہے کہ مناسک ثلاثہ کے بعد طوافِ زیارت کرے۔ اور مفرد پر چونکہ قربانی واجب نہیں، اس لئے اس پر صرف رمی اور حلق میں ترتیب واجب ہے۔ احناف کے یہاں فتوی اسی قول پر ہے۔

ائمہ ثلاثہ اور صاحبین: کے نزدیک مذکورہ چاروں مناسک میں ترتیب سنت ہے۔ پس تقدیم و تاخیر سے کوئی دم واجب نہیں ہوگا۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔ آپ نے ان حضرات کی دلیل درج ذیل بیان کی ہے:

منی میں رسول اللہ ﷺ سے مناسک کی تقدیم و تاخیر کے سلسلہ میں متعدد سوالات کیے گئے تھے۔ مثلاً: (۱) کسی نے قربانی کرنے سے پہلے سر منڈا لیا (۲) یا رمی کرنے سے پہلے قربانی کر ڈالی (۳) یا رمی کرنے سے پہلے سر منڈا لیا (۴) یا شام کو رمی کی (۵) یا سر منڈانے سے پہلے طوافِ زیارت کر لیا، تو آپؐ نے سب کو یہی جواب دیا تھا کہ **لاحرج**: کوئی بات نہیں (یہ سب روایات مشکوٰۃ میں باب **التحلل إلخ** میں مذکور ہیں) آپؐ نے کسی کو کفارہ کا حکم نہیں دیا۔ اور حاجت کے موقع پر خاموشی بیان ہوتی ہے یعنی اگر کفارہ واجب تھا تو اس موقع پر اس کی وضاحت ضروری تھی۔ خاموشی اختیار کرنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ دم واجب نہیں۔ اور استحباب کے بیان میں اس سے زیادہ صریح کوئی جملہ میرے علم میں نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ مناسک اربعہ میں ترتیب بس مستحب ہے۔

فائدہ: امام اعظم رحمہ اللہ کی دلیل یہ ہے کہ **لاحرج** والی روایات میں سے ایک روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے (رواہ البخاری، مشکوٰۃ حدیث ۲۶۵۶) پھر ابن عباسؓ کا فتوی یہ ہے: **من قدّم شيئًا من حجه، أو أَخَّره**

فَلْيُهْرِقْ لذلك دمًا یعنی جو مناسک میں تقدیم یا تاخیر کرے اس کو چاہئے کہ دم دے۔اور حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس نے قربانی کرنے سے پہلے ہی سر منڈالیا تو وہ دم دے۔ پھر آپ نے استدلال کے طور پر سورۃ البقرہ کی آیت ۱۹۶ پڑھی: ﴿وَلَاتَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْىُ مَحِلَّهٗ﴾ یعنی اپنے سروں کو اس وقت تک مت منڈاؤ جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے (یہ دونوں روایتیں ابن ابی شیبہ نے سند صحیح سے روایت کی ہیں، اعلاء السنن ۱۰:۱۵۹) اور سورۃ الحج کی آیات ۲۶-۲۹ سے بھی حلق پر قربانی کی تقدیم صاف مفہوم ہوتی ہے۔اور طواف کی ترتیب پر دلالت کرنے والا کوئی حرف نہیں۔رہی رمی کی تقدیم سب مناسک پر تو وہ فعل نبوی اور ارشاد: خُذوا مناسككم سے ثابت ہے۔

اور لاحرج والی مذکورہ روایات میں تشریع کے وقت کی ترخیص ہے یعنی جب کوئی نیا مسئلہ بتایا جاتا ہے، اس وقت جو فوری طور پر الجھن پیش آتی ہے اس میں شریعت کچھ سہولت دیتی ہے۔ دلیل: حضرت براء رضی اللہ عنہ سے ترمذی (۱:۱۸۲ باب فی الذبح بعد الصلاۃ) کی نقل کی ہوئی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے ماموں کو ایک سال سے کم عمر کی بکری کی قربانی کرنے کی اجازت دی تھی۔اور فرمایا تھا: ولا تُجزِئُ جَذَعَةٌ بعدَك یعنی یہ سہولت صرف تمہارے لئے ہے۔ یہی تشریع کے وقت کی ترخیص ہے۔ چونکہ اسلام میں حج کا یہ پہلا موقعہ تھا۔اور لوگوں کو اگرچہ مناسک کی ترتیب سمجھا دی گئی تھی۔مگر عدم مزاولت سے خلاف ورزی ہوگئی تو آپؐ نے درگذر کیا اور کفارہ کا حکم نہ دیا۔اور دلیل یہ ہے کہ ان سوالات میں ایک سوال یہ بھی کیا گیا تھا کہ ایک صاحب نے طوافِ زیارت سے پہلے سعی کرلی؟ تو آپ نے فرمایا: لاحرج: کوئی بات نہیں (رواہ ابوداؤد، مشکوۃ حدیث ۲۶۵۸) حالانکہ اس صورت میں بالاجماع دم واجب ہے۔اور ترتیب کے وجوب کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ منی میں جو سوالات کرنے والوں کا ہجوم ہوگیا تھا، اور لوگ گھبرائے ہوئے طرح طرح کے مسائل دریافت کررہے تھے: وہ اسی وجہ سے تھا کہ مناسک میں ترتیب ضروری تھی۔اور یہ بات صحابہ کو بتا بھی دی گئی تھی۔ اگر ترتیب محض سنت ہوتی تو صحابہ کے لئے پریشانی کی کیا بات تھی۔پس بیان کے موقعہ پر سکوت کی بات یہاں برمحل نہیں۔ کیونکہ صحابہ کو یہ بات پہلے بتائی جا چکی تھی۔واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] وأفتى فيمن حلق قبل أن يذبح، أو نحر قبل أن يرمى، أو حلق قبل أن يرمى، أو رمى بعد ما أمسى، أو أفاض قبل الحلق: أنه لاحرج، ولم يأمر بكفارة؛ والسكوتُ عند الحاجة بيانٌ؛ وليت شعرى! هل فى بيان الاستحباب صيغةٌ أصرحُ من: " لاحرج"؟!

ترجمہ: (۸) اور رسول اللہ ﷺ نے فتوی دیا اس شخص کے حق میں جس نے قربانی سے پہلے سر منڈالیا......اور کاش مجھے معلوم ہوتا! کیا استحباب کے بیان میں لاحرج سے بھی زیادہ واضح کوئی لفظ ہے؟!

☆ ☆ ☆

اعذار کی صورت میں سہولتیں دینے کی وجہ

سخت مجبوری کی صورت میں سہولت دینا قانون سازی کی تکمیل ہے۔ چنانچہ شریعت نے دو معاملوں میں سہولت دی ہے:

پہلا معاملہ ـــــ اگر حالتِ احرام میں کوئی ایسی تکلیف لاحق ہوجائے کہ ممنوعاتِ احرام سے بچنا سخت دشوار ہوجائے، تو اس ممنوع کے ارتکاب کی اجازت ہے، مگر فدیہ ادا کرنا ہوگا۔ سورۃ البقرہ آیت ۱۹۶ میں ارشاد پاک ہے: ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيْضًا، أَوْ بِهِ أَذًى مِّنْ رَّأسِهِ، فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ، أَوْ نُسُكٍ﴾ یعنی اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو، یا اس کے سر میں تکلیف ہو، تو روزے سے یا خیرات سے یا قربانی سے فدیہ دیدے یعنی اس تکلیف کی وجہ سے سر منڈانا پڑے تو منڈا دے، اور فدیہ ادا کرے۔ پھر قربانی کی جگہ تو حرم شریف متعین ہے۔ اور روزے اور صدقے کے بارے میں آیت کریمہ میں تفصیل نہیں ہے۔ اس کی تفصیل حدیث شریف میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت کعب بن عُجرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ: ’’اپنا سر منڈا دو، اور تین روزے رکھو، یا چھ مسکینوں کو آدھا آدھا صاع گندم دو، یا قربانی کرو‘‘ (بخاری حدیث ۴۵۱۷ کتاب التفسیر)

فدیہ مقرر کرنے کی وجہ: شریعت جو سہولتیں دیتی ہے: وہ کبھی تو بدل تجویز کر کے دیتی ہے، اور کبھی بغیر بدل کے۔ مثلاً: حائضہ سے نمازیں معاف کر دیں اور روزوں کی قضا تجویز کی۔ پھر بدل کہیں ہلکا تجویز کرتی ہے اور کہیں بھاری۔ مثلاً: قسم کے کفارے میں تین روزے رکھے، اور رمضان کا روزہ توڑنے میں ساٹھ روزے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سہولت دینے کی بہترین صورت یہ ہے کہ رخصت کے ساتھ بدل بھی تجویز کیا جائے۔ جیسا کہ مبحث ۶ باب ۱۰ (رحمۃ اللہ ۲: ۲۲۵) میں بیان کیا گیا ہے۔ رخصت کے ساتھ بدل تجویز کرنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ اس سے اصل حکم یاد آئے گا۔ آدمی خیال کرے گا کہ میں نے شریعت کا فلاں حکم فوت کیا ہے، جس کا یہ کفارہ ادا کر رہا ہوں۔ اور اس سے اس شخص کے دل کو تسکین حاصل ہوگی جو ہمیشہ عزیمت پر عمل کرنے کا عزم رکھتا ہے، مگر کسی مجبوری یا کوتاہی سے اس کو چھوڑ دیتا ہے۔ ایسا شخص کفارہ ادا کرے گا تو اس کے دل کو ڈھارس بندھے گی کہ میں نے کچھ نہ کچھ تلافی کر لی۔ لیکن کبھی بدل تجویز کرنے میں کوئی چیز مانع ہوتی ہے یا کوتاہی معمولی ہوتی ہے تو بدل تجویز نہیں کیا جاتا۔ جیسے حائضہ کی نمازیں بالکل ہی معاف کر دیں۔ کیونکہ پاک ہونے کے بعد اگر قضا کا حکم دیا جاتا تو فائتہ اور وقتیہ مل کر نمازیں بہت ہوجاتیں۔ اور ان کی ادائیگی دشوار ہوتی ـــــ اور جب ہلکی کوتاہی میں شریعت کفارہ تجویز کرتی ہے تو سنگین کوتاہی میں بدرجۂ اولی کفارہ تجویز کیا جائے گا۔ البتہ کوتاہی کی نوعیت دیکھ کر کفارہ تجویز کیا جائے گا۔

دوسرا معاملہ ـــــ احصار کا ہے یعنی حج یا عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد کوئی مجبوری پیش آجائے تو کیا کرے؟ واقعۂ حدیبیہ میں کفارِ قریش نے آنحضرت ﷺ کو اور صحابہ کو عمرہ کرنے سے روک دیا تھا تو سورۃ البقرہ کی آیت ۱۹۶ نازل ہوئی

کہ: ''اگر (دشمن یا مرض کے سبب) روک دیئے جاؤ، تو جو جانور قربانی کا میسر ہو، اس کو ذبح کر کے احرام سے نکل جاؤ۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ نے حدیبیہ میں قربانیاں ذبح کیں اور سر منڈوایا اور احرام سے نکل گئے۔

فائدہ: یہاں تین مسائل مختلف فیہ ہیں: (۱) دشمن سے تو احصار متحقق ہوتا ہے۔ مگر مرض وغیرہ موانع سے احصار متحقق ہوتا ہے یا نہیں؟ احناف کے نزدیک متحقق ہوتا ہے اور دیگر ائمہ کے نزدیک متحقق نہیں ہوتا (۲) سر منڈانا احرام سے نکلنے کی محض علامت ہے یا احرام سے نکلنے کے لئے شرط ہے؟ احناف کے نزدیک یہ محض علامت ہے۔ احرام قربانی کرتے ہی خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اور دیگر ائمہ کے نزدیک شرط ہے۔ سر منڈانے ہی سے احرام کھلے گا (۳) اس حج یا عمرہ کی قضا ضروری ہے یا نہیں؟ احناف کے نزدیک ضروری ہے، دیگر ائمہ کے نزدیک ضروری نہیں۔ یہ مسائل شاہ صاحب نے نہیں چھیڑے۔ مخطوطہ کراچی میں وقضٰی من قابلٍ لکھ کر اس کو قلم زد کر دیا ہے۔

[۹] ولایتم التشریعُ إلا ببیان الرُّخَص فی وقت الشدائد:

فمنها : أذیً لایستطیع معه الاجتنابَ عما حُرِّمَ علیه فی الإحرام، وفیه قولُه تعالیٰ: ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيْضًا، أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَّأْسِهِ، فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ﴾ الآیة، وقولُه صلی اللہ علیه وسلم لکَعْب بن عُجْرَةَ: '' فاحلق رأسك، وأَطْعِمْ فَرْقًا'' إلخ.

وقد بینا : أن أحسن أنواع الرُّخَصِ: ما یُجعل معه شیئٌ یُذَکِّرُ له الأصلَ، ویُثلج صدرَ المُجْمِعِ علی عزیمة الأصل عند ترکه؛ وحُمل الإفراطُ فی وجوب الکفارة علی ذلك بالطریق الأولی.

ومنها : الإحصار: وقد سَنَّ فیه حین حَالَ کفارُ قریشٍ دون البیت، فنحر هدایاه، وحلق، وخرج من الإحرام.

ترجمہ: (۹) اور نہیں پوری ہوتی قانون سازی مگر سہولتیں بیان کرنے کے ذریعہ: پس ان سہولتوں میں سے: ایسی تکلیف ہے جس کے ساتھ آدمی بچنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو ان باتوں سے جو اس پر احرام میں حرام کی گئی ہیں۔ اور اس میں اللہ پاک کا ارشاد ہے:...... اور تحقیق بیان کیا ہم نے کہ سہولتوں کی انواع میں بہترین: وہ نوع ہے جس کے ساتھ مقرر کی جائے کوئی ایسی چیز جو اس کو اصل حکم یاد دلائے یعنی فدیہ مقرر کیا جائے۔ اور ٹھنڈا کرے اصل عزیمت پر نیت کرنے والے کے سینہ کو، اس کو چھوڑنے کی صورت میں۔ اور کفارہ کے وجوب میں زیادتی کرنا یعنی بھاری کفارہ مقرر کرنا اسی پر محمول کیا گیا ہے بطریقِ اولی ـــــ اور ان سہولتوں میں سے: احصار ہے۔ اور تحقیق نبی ﷺ نے طریقہ رائج کیا احصار میں، جبکہ کفار قریش بیت اللہ کے درمیان حائل ہوئے، تو آپؐ نے اپنی قربانیاں ذبح کیں، اور سر منڈایا اور احرام سے باہر آ گئے۔

فصل

حرمین شریفین کا بیان

محدثین کرام کتاب الحج کے آخر میں حرمین کے فضائل واحکام کی حدیثیں درج کرتے ہیں۔شاہ صاحب قدس سرہ بھی اب باب کے آخر تک حرم مکہ اور حرم مدینہ سے متعلق چند فضائل واحکام کی حکمتیں بیان کرتے ہیں:

حرم مقرر کرنے کی حکمت ——— حَرَم کے معنی ہیں: واجب الاحترام۔ بیت اللہ (مقدس گھر) جہاں ہے اس کو **المسجد الحرام** اور مکہ مکرمہ کو **البلد الحرام** اور اس کے اردگرد کے کئی میل کے علاقہ کو حَرَم کہتے ہیں۔حرم کے خاص آداب واحکام مقرر کئے گئے ہیں۔حرم کی حد بندی سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی اور اس کے نشانات قائم کئے تھے۔پھر رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقعہ پر ان کی تجدید فرمائی۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ کا بھی حَرَم مقرر کیا ہے۔اردگرد کا کئی میل کا علاقہ واجب الاحترام قرار دیا ہے۔یہ حرم بھی عظمت واحترام میں مکہ کے حرم کی طرح ہے۔مگر اس کے احکام بعینہٖ حرم مکی کے نہیں ہیں۔حدیث شریف میں جانوروں کے چارہ کے لئے وہاں کے درختوں کے پتّے جھاڑنے کی اجازت دی گئی ہے (مشکوٰۃ حدیث ۲۷۳۲) جبکہ حرم مکہ میں اس کی اجازت نہیں۔حضرت شاہ صاحب قدس سرہ دونوں حرموں کی بنیاد بیان فرماتے ہیں:

مکہ اور مدینہ قابلِ احترام شہر ہیں۔اور محترم چیزوں کے احترام کے طریقے جدا جدا ہوتے ہیں۔جگہوں کا احترام یہ ہے کہ وہاں کی چیزوں کو بدنیتی سے ہاتھ نہ لگایا جائے۔وہاں کے جنگلی جانوروں کا شکار نہ کیا جائے۔وہاں کے خودرَو جنگلی درخت اور گھاس نہ کاٹی جائے۔وہاں کسی فتنہ کی پشت پناہی نہ کی جائے۔اور وہاں جنگ وجدال سے احتراز کیا جائے۔

اور حرم متعین کرنے کی بنیاد یہ ہے کہ قدیم زمانہ سے سرکاری علاقہ اور شہروں کے اطراف وجوانب کی تخصیص (ریزرو کرنے) کا طریقہ چلا آرہا تھا۔حکومت اپنے مفادات کے لئے سرکاری چراگاہ بناتی تھی،لوگوں کو اس میں جانور چرانے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔اسی طرح لوگوں کی ضروریات کے لئے شہروں کے اطراف وجوانب میں کچھ جگہیں مخصوص کی جاتی تھیں۔جن میں دخل اندازی کا کسی کو حق نہیں تھا۔اور یہ تخصیص لوگ تسلیم کرتے چلے آرہے تھے۔رعایا اس سلسلہ میں اپنے شاہوں کے احکام کی فرمانبرداری کرتی تھی۔اور لوگوں کے دلوں میں جو اپنے بادشاہوں کی تعظیم تھی وہ ان کو اس بات پر آمادہ کرتی تھی کہ وہ خود کو پابند کریں کہ وہ اس علاقہ کے درختوں اور جانوروں سے تعرض نہ کریں۔اور یہ چیز لوگوں کے درمیان مشہور ہو چکی تھی،ان کے دلوں کی تھاہ میں بیٹھ چکی تھی۔اور ان کے دل کے سیاہ نقطہ میں داخل ہو چکی تھی۔چنانچہ ایک حدیث

میں اس کو امر مسلّم کی طرح ذکر فرمایا ہے فرمایا: ”ہر بادشاہ کے لئے ایک مخصوص چراگاہ ہوتی ہے، اور اللہ کا مخصوص علاقہ ممنوعاتِ شرعیہ ہیں“ (مشکوٰۃ حدیث ۲۷۶۲) اسی بنیاد پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ مکرمہ کے لئے، اور رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ کے لئے حرم تجویز کئے ہیں۔

اور حرم کے احترام میں یہ دو باتیں بھی شامل ہیں: ایک: جو کام غیر حرم میں واجب ہے، جیسے انصاف کی گرم بازاری: اس کا وجوب حرم میں اور بھی مؤکد ہوجاتا ہے۔ دوسری: جو کام حرم سے باہر حرام ہیں، ان کی حرمت: حرم شریف میں اور بھی مؤکد ہوجاتی ہے۔ مثلاً ذخیرہ اندوزی حرام ہے، حرم میں اس کی حرمت فزوں ہوجاتی ہے۔ حدیث شریف میں حرم میں ذخیرہ اندوزی کو کج روی اور شرارت قرار دیا گیا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۲۷۲۳)

[۱۰] والسر فی حَرَمِ مکة والمدینة: أن لکل شیئ تعظیما، وتعظیمُ البقاع أن لایُتعرَّض لما فیها بسوء؛ وأصلُه مأخوذ من حِمَی الملوك وحِلَّةِ بلادِهم، فإنه کان انقیادُ القوم لهم وتعظیمُهم إیاهم مساوِقًا لمؤاخذةِ أنفسِهم: أن لایتعرضوا لما فیها من الشجر والدواب، وفی الحدیث: ”إن لکل مَلِكٍ حِمًی، وإن حمَی الله محارمُه“ فاشتهر ذلك بینهم، ورکز فی صمیم قلوبهم وسُوَیْدَاءِ أفئدتهم.

ومن أدب الحرم: أن یتأکَّدَ وجوبُ ما یجب فی غیره: من إقامة العدل، وتحریمُ ما یحرم فیه، وهو قوله صلی الله علیه وسلم: ”احتکار الطعام فی الحرم إلحادٌ فیه“

ترجمہ: (۱۰) اور راز مکہ اور مدینہ کے حرم میں: یہ ہے کہ ہر چیز کے لئے ایک تعظیم ہوتی ہے۔ اور جگہوں کی تعظیم یہ ہے کہ برائی سے ان چیزوں سے تعرض نہ کیا جائے جو ان جگہوں میں ہیں۔ اور حرم کی اصل لی گئی ہے بادشاہوں کی چراگاہوں سے اور ان کے شہروں کے اطراف سے۔ پس بیشک قوم کی بادشاہوں کے لئے تابعداری اور لوگوں کا بادشاہوں کی تعظیم کرنا چلانے والا تھا خود اپنی داروگیر کرنے کی طرف کہ وہ ان درختوں اور جانوروں سے تعرض نہ کریں جوان چراگاہوں اور اطرافِ شہر میں ہیں۔ اور حدیث میں ہے: ”بیشک ہر بادشاہ کیلئے ایک چراہ گاہ ہے، اور بیشک اللہ کی چراگاہ اس کی حرام کی ہوئی باتیں ہیں“ پس مشہور ہوگئی وہ بات لوگوں کے درمیان۔ اور گڑ گئی ان کے دلوں کی تھاہ میں، اور ان کے دلوں کے سیاہ نقطہ میں۔

اور حرم کے احترام میں سے یہ بات ہے کہ مزید پختہ ہوجائے اس چیز کا وجوب: جو غیر حرم میں واجب ہے، یعنی انصاف کی گرم بازاری۔ اور (مزید پختہ ہوجائے) اس چیز کی تحریم: جو غیر حرم میں حرام ہے۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ”حرم میں غلّہ کی ذخیرہ اندوزی: حرم میں کج روی ہے“ (جس پر وعید سورۃ الحج آیت ۲۵ میں آئی ہے)

(الحِلَّة: اترنے کی جگہ۔ مراد اطراف و جوانب ہیں۔ مساوِق: لازم سَاوَقَه: ہانکنے میں فخر کرنا)

☆ ☆ ☆

حرم اور احرام میں شکار کرنے سے جزاء واجب ہونے کی وجہ

سورۃ المائدہ آیت ۹۵ میں ارشاد پاک ہے: ''اے ایمان والو! وحشی جانور کو قتل مت کرو، جبکہ تم حالت احرام میں ہو۔ اور جو شخص تم میں سے اس کو جان بوجھ کر قتل کرے گا: اس پر جزاء واجب ہے۔ وہ جزاء اس جانور کے مثل ہے جس کو اس نے قتل کیا ہے، جس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر شخص کریں۔ درانحالیکہ وہ جزاء ایسی ہدی کا جانور ہو جو کعبہ تک پہنچنے والا ہو، یا کفارہ ہو یعنی غریبوں کا کھلانا، یا اس طعام کے بقدر روزے رکھ لئے جائیں'' (یہی حکم حرم کے جانور شکار کرنے کا ہے گو شکاری احرام میں نہ ہو)

تشریح: حرم میں اور احرام میں شکار کرنا اور احرام میں صحبت کرنا حد سے بڑھ جانا ہے۔ اور اس کا سبب نفس کا اپنے تقاضے پورا کرنے میں دور تک جانا ہے۔ پس نفس کو اس کی بے راہ روی سے روکنے کے لئے یہ پاداش مقرر کی گئی ہے۔

مِثل سے کیا مراد ہے؟ اس میں اختلاف ہے کہ آیت کریمہ میں ''مثل'' سے: مثل صوری یعنی شکل وصورت میں یکسانیت مراد ہے یا مثل معنوی یعنی قیمت میں برابری مراد ہے؟

امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے نزدیک: قیمت کے اعتبار سے مماثلت مراد ہے یعنی شکار کی قیمت لگائی جائے۔ پھر جنایت کرنے والے کو تین باتوں میں اختیار ہے: (۱) اگر اس رقم سے ہدی کا کوئی جانور خریدا جا سکتا ہو، تو وہ خرید کر حرم میں ذبح کرے۔ اور اس کا گوشت غریبوں میں تقسیم کر دے (۲) یا اس رقم کا غلہ خریدے اور صدقۂ فطر کے اصول کے مطابق غریبوں کو بانٹ دے (۳) یا ہر نصف صاع گندم کے بدل ایک روزہ رکھے۔

اور امام محمد، امام شافعی اور امام مالک رحمہم اللہ کے نزدیک: اگر شکار کے ہم شکل پالتو جانور پایا جاتا ہو، تو ہیئت وشکل میں مماثلت کا اعتبار ہے۔ قیمت کا اعتبار نہیں۔ مثلاً: ہرن میں بکری، نیل گائے میں گائے اور شتر مرغ میں اونٹ واجب ہوگا۔ کیونکہ یہ جانور ہم شکل ہیں۔ حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے ایسا ہی مروی ہے۔ اور ابوداؤد میں مرفوع روایت ہے کہ: ''بجّو شکار ہے، اور اس میں مینڈھا مقرر کیا جائے، جب محرم اس کا شکار کرے'' (حدیث ۳۸۰۱ کتاب الأطعمة) اور جن جانوروں کی نظیر نہیں ہے، جیسے چڑیا اور کبوتر تو ان میں امام محمد رحمہ اللہ قیمت کا اعتبار کرتے ہیں۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ صفات میں مماثلت کا اعتبار کرتے ہیں۔ پس کبوتر میں بکری واجب ہوگی۔ کیونکہ دونوں ایک طرح سے پانی پیتے ہیں۔ غرض وہ قیمت کا کسی مرحلہ میں اعتبار نہیں کرتے۔

شاہ صاحب کا فیصلہ: شاہ صاحب کے نزدیک مناسب یہ ہے کہ یہ بات بھی انہی دو معتبر آدمیوں سے دریافت کی

جائے۔ جن صورتوں میں وہ صحابہ کی رائے کے مطابق رائے دیں، ان میں مماثلتِ صوری کا اعتبار کیا جائے۔ اور جن صورتوں میں وہ قیمت کی رائے دیں، ان میں قیمت کا اعتبار کیا جائے۔ گویا شاہ صاحب نے امام محمد رحمہ اللہ کی رائے اختیار فرمائی۔

فائدہ: یہ مسئلہ نہایت پیچیدہ ہے۔ اور اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ آیت کریمہ میں جو لفظ ''مثل'' آیا ہے: اس سے مثل صوری مراد ہے یا مثل معنوی؟ آیت کریمہ میں دو معتبر آدمیوں کے مثلیت کا فیصلہ کرنے کے بعد جو تین باتوں میں اختیار دیا گیا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ مثل معنوی مراد لیا جائے۔ کیونکہ مثل صوری کے فیصلہ کے بعد اختیار موجّہ نہیں۔ اب تو ہدی متعین ہے۔ مگر سلف سے مثل صوری کا اعتبار کرنا مروی ہے۔ جیسے صحابہ نے شتر مرغ میں اونٹ واجب کیا۔ حالانکہ اونٹ کی قیمت شتر مرغ سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے بھی کوئی دوٹوک فیصلہ نہیں کیا۔ بات دو معتبر آدمیوں کے حوالے کر دی ہے۔

[۱۱] قوله تعالى: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لاَتَقْتُلُوْا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ﴾ الآية.

أقول: لما كان الصيد في الحرم والإحرام والجماعُ في الإحرام: إفراطًا ناشئًا من توغُّل النفس في شهوتها: وجب أن يُزجر عن ذلك بكفارة.

واختلفوا في جزاء الصيد: هل تُعتبر المِثْلِيَّةُ في الخَلْق أو القيمة؟ والحق: أنه ينبغي أن يَسأل ذَوَىْ عدلٍ، فإن رأيا رأىَ السلف في تلك الصور فذاك، وإن رأيَا القيمة فذلك.

ترجمہ: (۱۱) میں کہتا ہوں: جب حرم میں اور احرام میں شکار کرنا اور احرام میں جماع کرنا حد سے تجاوز کرنا تھا، جو پیدا ہونے والا تھا نفس کے دور تک جانے سے اپنی خواہش میں: تو ضروری ہوا کہ اس سے کفارہ کے ذریعہ روکا جائے۔

اور علماء نے اختلاف کیا ہے شکار کی جزاء میں: آیا ہیئت میں مماثلت کا اعتبار کیا جائے یا قیمت میں؟ اور حق بات: یہ ہے کہ مناسب ہے کہ دو معتبر آدمیوں سے دریافت کرے۔ پس اگر دیکھیں وہ سلف کی رائے ان صورتوں میں تو وہ ہے۔ اور اگر دیکھیں وہ قیمت تو وہ ہے۔

☆ ☆ ☆

مدینہ شریف کی ایک خاص فضیلت کا راز

حدیث ——— میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میرا جو امتی مدینہ کی تکلیفوں اور سختیوں پر صبر کرے گا یعنی وہاں سے انتقالِ مکانی نہیں کرے گا: قیامت کے دن میں اس کا سفارشی ہونگا'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۷۳۰)

تشریح: مدینہ منورہ کے قیام میں دو فائدے ہیں: ملّی اور ذاتی۔ انہی فوائد کی وجہ سے یہ فضیلت ہے:
ملّی فائدہ: مدینہ شریف وحی کا مہبِط اور مسلمانوں کا ماوی ہے۔ اور اس کو آباد رکھنے میں ایک دینی شعار کی سر بلندی اور مرکز اسلام کی شان دوبالا کرنا ہے۔
ذاتی فائدہ: انتقال مکانی کر کے مدینہ میں آپڑنا اور مسجد نبوی میں نمازوں کے لئے حاضری دینا: نبی ﷺ کے احوال کو یاد دلاتا ہے، جو مؤمن بندے کے لئے ہزار نعمت ہے۔

[۱۲] قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ’’ لایَصبر علی لَأْوَاءِ المدینة وشِدَّتِها أحدٌ من أمتی إلا کنتُ له شفیعًا یومَ القیامة‘‘
أقول: سر هذا الفضل: أن عمارة المدینة إعلاءٌ لشعائر الدین، فهذه فائدة ترجع إلی الملة؛ وأن حضورَ تلك المواضع، والحلولَ فی ذلك المسجد، مذکِرٌ له ما کان النبی صلی اللہ علیه وسلم فیه، وهذه فائدة ترجع إلی نفس هذا المکلَّف.

ترجمہ: نبی ﷺ نے فرمایا: ’’نہیں صبر کرتا مدینہ کی تکلیفوں اور اس کی سختیوں پر میری امت میں سے کوئی مگر میں اس کے لئے قیامت کے دن سفارشی ہونگا‘‘ میں کہتا ہوں: اس فضیلت کا راز یہ ہے کہ مدینہ کو آباد رکھنا ایک دینی شعار کو سر بلند کرنا ہے۔ پس یہ فائدہ ملت کی طرف لوٹتا ہے۔ اور یہ راز ہے کہ اِن مقامات میں حاضر ہونا اور اس مسجد میں اترنا اُس بات کو یاد دلانے والا ہے جس میں نبی ﷺ تھے، اور یہ فائدہ اس مکلّف بندے کی ذات کی طرف لوٹتا ہے (اللَّأْوَاء: سختی، رنج وتکلیف۔ لَأَیَ یَلْأَیُ لَأْیًا: دیر کرنا، رکنا، اَلْأَیُ إِلْآءً: سختی میں پڑنا)

☆ ☆ ☆

مدینہ کی حرمت دعائے نبوی کی وجہ سے ہے

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’بیشک ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو بزرگی دی، پس اس کو محترم گردانا۔ اور بیشک میں نے مدینہ کو بزرگی دی، اور میں اس کی دونوں جانبوں کے درمیان کو بزرگی دیتا ہوں۔ لہٰذا اس میں خوں ریزی نہ کی جائے۔ اس میں جنگ وجدال کے لئے ہتھیار نہ اٹھائے جائیں اور اس کے درختوں کے پتے نہ جھاڑے جائیں۔ البتہ جانوروں کے چارہ کے لئے جھاڑنا مستثنیٰ ہے (مشکوٰۃ حدیث ۲۷۳۲)
تشریح: اس حدیث سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ پیغمبر کا انتہائی خصوصی توجہ سے کسی چیز کے لئے دعا کرنا، اور اس کے عزمِ مصمم کا کسی چیز سے متعلق ہونا: نزولِ احکام کا سبب ہوتا ہے۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کی توجہات سامیہ اور دعوات کاملہ سے

مکہ کے حرم ہونے کے احکام نازل ہوئے اور نبی ﷺ کی مخصوص دعاؤں سے اور انتہائی خواہش کی وجہ سے مدینہ کے حرم ہونے کے احکام نازل ہوئے۔

فائدہ: اور مدینہ کے حرم میں اور مکہ کے حرم میں بعض احکام میں فرق اس لئے ہے کہ مکہ کی حرمت میں دعائے ابراہیمی کے علاوہ بیت اللہ کا بھی دخل ہے۔ اور مدینہ میں دعائے نبوی کے علاوہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

[۱۳] قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: "إن إبراهيم حَرَّم مكة، فجعلها حرامًا، وإنی حَرَّمْتُ المدينة"

أقول: فيه إشارة إلى أن دعاء النبی صلى الله عليه وسلم بجُهْدِ همتِه، وتأكُّدِ عزيمتِه: له دخلٌ عظيم فی نزول التوقيتات. والله أعلم.

ترجمہ: میں کہتا ہوں: اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ نبی ﷺ کی دعا: اپنی انتہائی درجہ خصوصی توجہ سے اور اپنی عزیمت کی پختگی سے: اس کے لئے بڑا دخل ہے تعیینات کے اترنے میں، باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

الحمد للہ! آج ۱۲ ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ میں کتاب الحج کی شرح مکمل ہوئی

دوسری قسم

تفصیل وار احادیث مرفوعہ کے اسرار وحکم کا بیان

سلوک واحسان کا بیان

باب (۱) سلوک واحسان کے سلسلہ کی اصولی باتیں

باب (۲) اذکار اوران کے متعلقات کا بیان

باب (۳) سلوک واحسان کے سلسلہ کی باقی باتیں

باب (۴) احوال ومقامات کا بیان

باب ——۱

سلوک واحسان کے سلسلہ کی اصولی باتیں

احسان: کے لغوی معنی ہیں: نکو کردن اور نیکو کردن یعنی خوب اچھا کرنا اور اچھے اعمال کرنا۔ حدیث میں ہے: إن اللّٰه کتب الإحسانَ علی کل شيئ الحدیث یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں خوب اچھا کرنا لازم کیا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے دو مثالوں سے اس کی وضاحت کی ہے: پہلی مثال: جب جنگ میں دشمن کو قتل کیا جائے تو اچھے طریقہ پر قتل کیا جائے یعنی آگ میں نہ جلایا جائے اور اس کی لاش نہ بگاڑی جائے۔ دوسری مثال: جب کھانے کے لئے جانور ذبح کیا جائے تو عمدہ طریقہ پر ذبح کیا جائے یعنی ذبح کرنے کے لئے چھری خوب تیز کرلی جائے تاکہ جانور کو زیادہ تکلیف نہ ہو (مسلم شریف ۱۳: ۱۰۶ مصری کتاب الصید)

اور احسان کے اصطلاحی معنی ہیں: اعمالِ شرعیہ کو اس طرح ادا کرنا کہ ان سے مطلوبہ فوائد حاصل ہوجائیں۔ مثلاً نماز کا مقصد اخبات یعنی بارگاہ خداوندی میں عجز وانکساری اور نیازمندی کا اظہار ہے۔ یہ مقصد علی وجہ الکمال اس وقت حاصل ہوسکتا ہے جب نماز اس طرح ادا کی جائے کہ گویا نمازی اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ یہ کیفیت اور یہ ملکہ پیدا کرنے کا نام احسان ہے۔

احسان، سلوک، زُہد، طریقت اور تصوف تقریباً ہم معنی اصطلاحات ہیں۔ احادیث میں پہلے دو لفظ آئے ہیں۔ باقی اصطلاحات بعد کی ہیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس کتاب میں لفظ احسان ہی استعمال کیا ہے۔ اور سالکین کے لئے محسنین استعمال کیا ہے۔ صرف ایک جگہ صوفیا کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور تحفّظ (احتیاط) کی وجہ شاید یہ ہے کہ فلسفۂ تصوف میں غیر شرعی چیزوں کی آمیزش ہوگئی ہے۔ نیز تصوف کا اطلاق فلسفۂ تصوف پر بھی ہوتا ہے۔ اور شاہ صاحب کے پیش نظر سلوک واحسان کے اعمال واذکار اور حقائق ومعارف کا بیان ہے، اس لئے شاہ صاحب رحمہ اللہ نے لفظ تصوف استعمال کرنے سے گریز کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

اس مبحث میں چار باب ہیں:

باب اول: میں سلوک واحسان کی تمہیدی اور اصولی باتیں بیان کی ہیں۔ پہلے شریعت وطریقت کی تحدید کی ہے۔

پھر یہ بیان کیا ہے کہ طریقت کا موضوع دو باتیں ہیں۔ پھر چار اصولِ اخلاق و ملکات کی تفصیل کی ہے۔

بابِ دوم: میں اعمالِ سلوک یعنی اذکار و ادعیہ کا بیان ہے۔ کیونکہ یہی نوافل اعمال: سلوک کا سرمایہ ہیں۔

بابِ سوم: میں چار اساسی ملکات (طہارت، اخبات، سماحت اور عدالت) کے اکتساب کا طریقہ بیان کیا ہے اور ان کے موانع اور علامات کی وضاحت کی ہے۔

بابِ چہارم: میں احوال و مقامات کا بیان ہے جو احسان کے ثمرات ہیں۔

شریعت وطریقت

جب انسان اختیار وارادہ سے کوئی اچھا یا برا کام کرتا ہے تو وہ عمل وجود میں آکر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کے نفس کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے یعنی دل اس سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ یہی کیفیتِ نفسانیہ ہے۔ پھر جب تک وہ کیفیت عارضی ہوتی ہے ''حال'' کہلاتی ہے۔ اور جب وہ راسخ ہو جاتی ہے تو ''ملکہ'' کہلاتی ہے۔ تمام اخلاقِ حسنہ اور سیئہ اسی طرح پیدا ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح ملکہ بنتے ہیں۔

پھر اعمال وہیئاتِ نفسانیہ میں ربط وارتباط ہے۔ اعمال: ہیئاتِ نفسانیہ کو کمک پہنچاتے ہیں۔ اور وہی ہیئات نفسانیہ کی تشریح وترجمانی بھی کرتے ہیں[1]۔ کیونکہ اعمال: ان کیفیات کے پیکر اور صورتیں ہیں۔ اور آخرت میں جزاؤ سزا گو اعمال پر ہوگی مگر حقیقت میں مفید یا مضر یہی ملکاتِ حسنہ یا سیئہ ہوں گے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ شارع نے اصالۃً اور بالذات لوگوں کو اعمال ہی کا مکلّف بنایا ہے۔ خواہ اعمال از قبیل اوامر ہوں یا نواہی۔ مگر مطلقاً یعنی ملکات سے قطع نظر کرتے ہوئے مکلّف نہیں بنایا۔ بلکہ اس حیثیت سے مکلّف بنایا ہے کہ وہ اعمال: انہی ہیئاتِ نفسانیہ سے ابھرتے اور وجود میں آتے ہیں۔ اس لئے لوگ ثانوی درجہ میں اس کے بھی مکلّف ہیں کہ اچھے ملکات کی تحصیل کی سعی کریں۔ اور برے ملکات سے اجتناب کریں۔

اور اعمال سے بحث دو حیثیتوں سے کی جاتی ہے:

پہلی حیثیت: اعمال کو عام لوگوں پر لازم کرنے کی جہت ہے۔ اور جامع بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ دیکھا جائے: کونسے اعمال: کن ملکات کے مظنات (احتمالی جگہیں) ہیں یعنی کن اعمال سے اچھے یا برے ملکات پیدا ہو سکتے ہیں۔ پھر ان اعمال کا حکم دیا جائے یا ان سے روکا جائے۔ اور اس معاملہ میں ایسا واضح طریقہ اختیار کیا جائے جس کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ ہو۔ رات بھی دن کی طرح روشن ہو۔ تاکہ برملا لوگوں کی داروگیر کی جاسکے۔ اور کوئی شخص کھسک نکلنے پر قادر ہونہ بہانہ جوئی پر۔ نیز ان اعمال کا انضباط بھی ضروری ہے اور مکلّف بنانے میں میانہ روی سے کام لینا بھی ضروری ہے۔ مثلاً:

[1] تفصیل مبحث اول باب دوازدہم رحمۃ اللہ الواسعہ (۱:۶۳۳) اور مبحث ششم باب پنجم رحمۃ اللہ الواسعہ (۲:۱۲۳-۱۳۸) میں ہے ۱۲

غور کیا تو معلوم ہوا کہ نفس کو پاکیزہ بنانے کی موزون صورت وضوء وغسل ہے۔ چنانچہ حدثِ اصغر واکبر میں یہ طہارتیں لازم کیں۔ اور ان کی جملہ تفصیلات منضبط کیں اور مجبوری میں متبادل صورتیں تجویز کیں۔

دوسری حیثیت: اعمال سے لوگوں کے نفوس کے سنورنے کی اور اعمال کی مطلوبہ ہیئات تک پہنچانے کی جہت ہے۔ یعنی اس بات میں غور کیا جائے کہ کن اعمال سے لوگوں کے نفوس سنورتے ہیں، اور کن سے بگڑتے ہیں؟ اور وہ اعمال کس طرح مطلوبہ ملکات تک پہنچاتے ہیں؟ اور جامع بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ دو چیزوں کی معرفت ضروری ہے: ایک: کیفیت نفسانیہ کی معرفت۔ دوسری: عمل کی جہت ایصال کی معرفت۔ مثلاً: اخبات: ایک مطلوبہ ملکہ ہے اور اس کو نماز وغیرہ کے ذریعہ بدست لایا جاسکتا ہے۔ پس اخبات کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی معرفت بھی ضروری ہے، اور نماز، اذکار، تلاوت وغیرہ آدمی میں اخبات کی صفت کس طرح پیدا کرتے ہیں؟ اس کی معرفت بھی ضروری ہے۔ اور اس معرفت کا مدار وجدان پر ہے یعنی نبی پاک ﷺ (اور آپؐ کے جانشیں) اپنے ذوق ووجدان سے یہ دونوں باتیں جانتے ہیں۔ پس اس معاملہ کو صاحبِ امر کے حوالے کرنا ضروری ہے۔ غرض اعمال سے پہلی حیثیت سے بحث کرنے کا نام شریعت ہے، اور دوسری حیثیت سے بحث کرنے کا نام احسان (طریقت) ہے یعنی دونوں ایک ہیں۔ فرق صرف حیثیات کا ہے۔

﴿من أبواب الإحسان﴾

اعلم: أن ما كلَّف به الشارعُ، تكليفاً أَوَّليا، إيجابا أو تحريمًا: هو الأعمال، من جهة أنها تنبعث من الهيئات النفسانية، التي هي في المعاد للنفوس أو عليها، وأنها تُمِدُّ فيها وتَشْرَحُها، وهي أشباحها وتماثيلها.

والبحثُ عن تلك الأعمال من جهتين:

إحداهما: جهةُ إلزامِها جمهورَ الناس، والعمدة في ذلك: اختيارُ مظانِّ تلك الهيئاتِ من الأعمال، والطريقةِ الظاهرة التي ليلُها نهارُها، يؤاخذون بها على أعين الناس، فلا يتمكّنون من التسلُّلِ والاعتذار؛ ولابد أن يكون بناؤُها على الاقتصاد والأمور المضبوطة.

والثانية: جهةُ تهذيبِ نفوسِهم بها، وإيصالِها إلى الهيئات المطلوبة منها، والعمدة في ذلك: معرفةُ تلك الهيئات، ومعرفةُ الأعمالِ من جهة إيصالها إليها، وبناؤُها: على الوجدان، وتفويض الأمر إلى صاحب الأمر.

فالباحث عنها من الجهة الأولى: هو علم الشرائع، وعن الثانية: هو علم الإحسان.

ترجمہ: احسان کے سلسلہ کی اصولی باتیں: جان لیں کہ وہ چیز جس کا شارع (اللہ تعالیٰ) نے (لوگوں کو) مکلّف

بنایا ہے، تکلیف اوّلی کے طور پر، ایجابی یا تحریمی طور پر: وہ اعمال ہی ہیں۔ بایں جہت کہ وہ اعمال کیفیاتِ نفسانیہ سے ابھرتے ہیں، جو آخرت میں لوگوں کے لئے مفید یا مضر ہیں۔ اور اس جہت سے کہ وہ اعمال: ان کیفیات کو مدد پہنچاتے ہیں۔ اور وہ اعمال: اُن کیفیات کی وضاحت کرتے ہیں۔ اور وہ ان کیفیات کے پیکر اور ان کی ظاہری صورتیں ہیں۔

اور اُن اعمال سے بحث: دو جہتوں سے ہے۔ ان میں سے ایک: عام لوگوں پر ان اعمال کو لازم کرنے کی جہت ہے یعنی عام لوگوں سے وہ اعمال کروانے کی جہت ہے۔ اور بنیادی بات اس سلسلہ میں: اعمال کی ان ہیئتوں (کیفیاتِ نسانیہ) کی احتمالی جگہوں کو اور اس واضح طریقہ کو اختیار کرنا ہے جس کی رات اس کا دن ہے (رات سے مخفی پہلو اور دن سے واضح پہلو مراد ہوتا ہے) (تاکہ) ان کے ذریعہ لوگ سب کے روبرو دارو گیر کئے جاسکیں۔ پس نہ تو وہ کھسک جانے پر قادر ہوں۔ نہ بہانہ جوئی پر۔ اور ضروری ہے کہ اس طریقہ کا مدار میانہ روی اور متعین امور پر ہو —— اور دوسری جہت: ان اعمال سے لوگوں کے نفوس کے سنورنے کی جہت ہے۔ اور ان اعمال کے پہنچانے کی جہت ہے ان سے مطلوبہ ہیئتوں (ملکات) تک۔ اور بنیادی بات اس سلسلہ میں: ان ہیئتوں اور ان عمال کو پہچاننا ہے ان کے پہنچانے کی جہت سے ان کیفیات تک۔ اور اس معرفت کا مدار: وجدان پر اور معاملہ: صاحبِ اختیار کو سپرد کرنے کی طرف ہے —— پس ان اعمال سے پہلی جہت سے بحث کرنے والا علم: احکام الٰہی کا علم ہے اور دوسری جہت سے: وہ احسان کا علم ہے۔

ترکیب: **الطریقةِ** کا عطف **مظان** پر ہے۔

☆ ☆ ☆

سلوک واحسان کی غور طلب باتیں

جب احسان: اعمال سے اس حیثیت سے بحث کرنے کا نام ہے کہ وہ کیفیاتِ نفسانیہ یعنی اخلاق وملکات تک کس طرح مُفضی ہوتے ہیں؟ تو اب جو شخص سلوک واحسان کے مباحث میں غور کرنا چاہتا ہے: اسے دو چیزوں کی حاجت ہے:

پہلی چیز: اعمال میں اس حیثیت سے غور کرنا ضروری ہے کہ وہ ہیئاتِ نفسانیہ تک پہنچاتے ہیں یعنی اس میں غور کیا جائے کہ کس عمل سے کونسی حالت دل میں پیدا ہوتی ہے اور اعمال کے لئے کیا شرائط وآداب ہیں جن کے لحاظ سے مطلوبہ ملکہ حاصل ہوسکتا ہے اور کیا موانع ہیں جن سے دامن کشاں گذرنا ضروری ہے۔ کیونکہ آدمی کبھی اس طرح عمل کرتا ہے کہ اس میں دکھانے سنانے کا جذبہ ہوتا ہے یا اس کو روٹین ورک (عادت) کے طور پر کرتا ہے۔ اور کبھی عُجب وغرور، احسان جتانے اور تکلیف پہنچانے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں عمل سے مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ اور کبھی آدمی اس طرح عمل کرتا ہے کہ نفس عمل کی روح سے آشنا نہیں ہوتا یعنی ایسا آگاہ نہیں ہوتا جو نیکوکاروں کے لئے سزاوار ہے۔ اگرچہ بعض لوگ اس سے کچھ نہ کچھ آگاہ ہوجاتے ہیں۔ مثلاً جو شخص صرف فرائض پر اکتفا کرتا ہے، نہ کمیّت

کے اعتبار سے اس میں کچھ زیادتی کرتا ہے، نہ کیفیت کے اعتبار سے یعنی نہ سنن ونوافل ادا کرتا ہے، نہ خشوع وخضوع سے نماز پڑھتا ہے تو ایسا شخص مزکی نہیں ہے۔ وہ کمالات کے بلند مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

دوسری چیز: کیفیاتِ قلبیہ (اخلاق وملکات) میں غور کرنا اوران کی کماحقہ معرفت حاصل کرنا ضروری ہے تاکہ بصیرت کے ساتھ آدمی وہ اعمال اختیار کرے جو مفید ہیں۔ اعمال: بمنزلۂ اسباب وآلات ہیں۔ ان سے مقصود نفس کا علاج اوراس کی دیکھ بھال ہے۔ پس جس طرح طبیب مریض کا علاج کرتا ہے اوراس کے احوال کوسنوارتا ہے اسی طرح سالک بھی اعمال کے ذریعہ اپنی اصلاح کرتا ہے۔ اور جس شخص کو آلات واسباب کی کماحقہ معرفت حاصل نہیں ہوتی وہ کبھی آلات کو اندھا دھند استعمال کرنے لگتا ہے اور نفع کے بجائے نقصان اٹھاتا ہے۔

والناظر في مباحث الإحسان يحتاج إلى شيئين:

[۱] النظرِ إلى الأعمال، من حيث إيصالها إلى هيئاتٍ نفسانية، لأن العمل ربما يؤدّٰى على وجه الرياء والسُّمعة، أو العادة، أو يُقارِنُه العُجْبُ والمنُّ والأذى، فلايكون موصِلاً إلى ما أُريد منه؛ وربما يؤدّٰى على وجه لاتتنبَّه هذه النفس لأرواحه تنبُّهًا يليق بالمحسنين، وإن كان من النفوس من يتنبه بمثله، كالمُكتفي بأصلِ الفرض، لايزيد عليه كمًّا ولا كيفًا، وهو ليس بزكيٍّ.

[۲] والنظرِ إلى تلك الهيئات النفسانية، ليعرِفها حقَّ معرِفتِها، فيباشر الأعمالَ على بصيرة مما أُريد منها، فيكون طبيبَ نفسِه، يَسُوْسُ نفسَه كما يسوس الطبيبُ الطبيعةَ؛ فإن من لايعرف المقصودَ من الآلات، كاد إذا استعملها أن يخبِطَ خَبْطَ عَشْوَاءَ، أو يكونَ كحاطبِ ليل.

ترجمہ: اوراحسان کے مباحث میں غور کرنے والا دو چیزوں کا محتاج ہے:

(۱) اعمال میں غور کرنا اُن کے پہنچانے کی جہت سے کیفیاتِ قلبیہ تک، اس لئے کہ عمل کبھی ادا کیا جاتا ہے دکھانے اورسنانے یا عادت کے طور پر۔ یا ملتی ہے اس کے ساتھ خود بینی اوراحسان جتانا اور تکلیف پہنچانا۔ پس وہ عمل اس بات تک پہنچانے والا نہیں ہوتا جو اس سے مراد لی گئی ہے۔ اور کبھی ادا کیا جاتا ہے اس طور پر کہ یہ نفس چوکنا نہیں ہوتا اس عمل کی روح سے ایسا چوکنا ہونا جو نیکوکاروں کے لئے سزاوار ہے۔ اگرچہ نفوس میں سے بعض وہ ہیں جو اس کے مانند سے چوکنا ہوتے ہیں۔ جیسے اصل فرض پر اکتفا کرنے والا۔ نہیں اضافہ کرتا وہ اس پر کمیت کے اعتبار سے اور نہ کیفیت کے اعتبار سے۔ اوروہ اچھی نشو ونما پانے والا نہیں ہے۔

(۲) اوران کیفیاتِ قلبیہ میں غور کرنا، تا کہ وہ ان کو پہچانے جیسا کہ ان کو پہچاننے کا حق ہے۔تا کہ وہ اعمال کو اختیار کرے اس بات سے آگہی کے ساتھ جوان اعمال سے مراد لی گئی ہے۔پس وہ اپنے نفس کا معالج ہو۔وہ اپنے نفس کی دیکھ بھال کرے جس طرح طبیب: طبیعت کی دیکھ بھال کرتا ہے۔پس بیشک جو شخص آلات کے مقصود کو نہیں پہچانتا: قریب ہے جب وہ آلات استعمال کرے تو وہ رتوندی اونٹنی کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارے یارات میں سوختہ چننے والے کی طرح ہو۔

☆ ☆ ☆

چار بنیادی اخلاق وملکات

طہارت واخبات کا بیان

اچھی بُری کیفیاتِ نفسانیہ یعنی اخلاق وملکات بہت ہیں۔جیسے بہادری اور بزدلی، سخاوت اور بخیلی، تکبر اور تواضع وغیرہ۔مگران سب کا مرجع اور خلاصہ چار اخلاق وملکات ہیں یعنی طہارت وحدث، اخبات واستکبار، سماحت وخودغرضی اورعدالت وظلم۔یہی بنیادی ملکات ہیں۔جن سے فن احسان میں بحث کی جاتی ہے۔تفصیل درج ذیل ہے۔

① ـــــ طہارت (پاکی) ـــــ کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے عالم ملکوت سے مشابہت پیدا ہوتی ہے۔فرشتے پاک مخلوق ہیں۔پس جو پاکی کا اہتمام کرتا ہے وہ فرشتہ صفت بن جاتا ہے۔اس صفت کو بدست لانے کے لئے شریعت نے وضوء وغسل مشروع کیا ہے۔اورحدیث شریف میں پاکی کی اہمیت اس طرح ظاہر کی گئی ہے کہ اس کو آدھا ایمان قرار دیا ہے (مشکوۃ حدیث ۲۸۱ و ۲۹۶) اورایک دوسری حدیث میں ارشادفرمایا ہے کہ: ”اللہ پاک ستھرے ہیں: وہ پاکیزگی کو دوست رکھتے ہیں“ (رواہ الترمذی، مشکوۃ حدیث ۴۴۸۷ باب الترجل، کتاب اللباس)

② ـــــ اخبات (بارگاہِ خداوندی میں نیازمندی) ـــــ اخبات کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔اس صفت کو بدست لانے کے لئے: نماز، اذکار اور تلاوت مشروع کی گئی ہے۔اس صفت کا تذکرہ حدیث جبرئیل میں اس طرح آیا ہے: ”احسان یہ ہے کہ اللہ کی بندگی اس طرح کی جائے گویا عبادت کرنے والا اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ تو دیکھ ہی رہے ہیں“ عبادت کے لئے یہ دوطریقے اسی لئے تجویز کئے گئے ہیں کہ اظہار نیازمندی علی وجہ الکمال ہو۔

سکینت ووسیلہ: جب طہارت واخبات اکٹھا ہوتے ہیں یعنی کسی شخص میں یہ دونوں صفتیں جمع ہوتی ہیں تو شاہ صاحب قدس سرہ اس حالت کو سکینت ووسیلہ کہتے ہیں۔حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے قول میں وسیلہ سے یہی طہارت واخبات کا آمیزہ مراد ہے۔حاکم (۳: ۳۱۵) میں روایت ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا: ”اکابر صحابہ یہ بات جانتے ہیں کہ ابن مسعود صحابہ میں وسیلہ کے اعتبار سے سب سے زیادہ قریب ہیں“ یعنی

حضرت ابن مسعودؓ پاکیزگی میں اور اللہ کے سامنے عاجزی اور فروتنی کرنے میں صحابہ میں عالی رتبہ ہیں [۱]

تحصیلِ سکینت کا طریقہ: سکینت کو بدست لانے کا بہترین طریقہ یہ ہے: (۱) احکام شرعیہ کی اس طرح تعمیل کی جائے کہ ان کی ارواح وانوار پیش نظر رہیں یعنی جو ہر عمل کی محافظت کے ساتھ حکم کی تعمیل کی جائے (۲) اور اعمال کے اذکار وہیئات کی رعایت اور نگہداشت کرتے ہوئے احکام پر پابندی سے عمل کیا جائے۔

طہارت کی روح: پس طہارت کی روح —— مثبت پہلو سے —— نور باطن اور اُنس وانشراح کی حالت ہے یعنی جب طہارت سے قلب میں نور اور دل میں سرور پیدا ہو تبھی طہارت کا پورا فائدہ حاصل ہوگا۔ وضوء سے گناہوں کے جھڑنے کی روایات میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ گناہ دل میں ظلمت اور وحشت پیدا کرتے ہیں۔ جب وہ نکل جائیں گے تو نور وسرور کی کیفیت پیدا ہوگی۔

اور طہارت کی روح —— منفی پہلو سے —— فریب دہی والے افکار کا ٹھنڈا پڑنا اور تشویشات: بے چینی، پراگندہ بالی، بے قراری اور گھبراہٹ کا ختم ہو جانا ہے۔ حدیث میں غصہ کا علاج وضوء تجویز کیا گیا ہے۔ فرمایا: ''غصہ: شیطان کی وجہ سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے۔ اور آگ کو پانی ہی سے بجھایا جا سکتا ہے۔ پس جب تم میں سے کسی کو (غیر معمولی) غصہ آئے تو چاہئے کہ وہ وضوء کرے'' (رواہ ابوداؤد، مشکوۃ حدیث ۵۱۱۳ باب الغضب، کتاب الآداب، فصل ثانی) اس علاج میں اشارہ ہے کہ طہارت سے تشویشات کا ازالہ ہوتا ہے۔

نماز کی روح: بھی دو باتیں ہیں: (۱) نماز سے حضوری کی دولت اور وصل کی نعمت ہاتھ آتی ہے (۲) اور نماز کے ذریعہ بندہ اللہ کی جلالت وعظمت کو یاد کرتا ہے ایسی تعظیم کے ساتھ جو محبت وطمانینت کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے یعنی وصلِ خداوندی اور عظمت ومحبت کے ساتھ اللہ کو یاد کرنا نماز کی روح ہے۔ حدیث جبرئیل میں ان دونوں باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا: ''احسان یہ ہے کہ آپ اللہ کی اس طرح عبادت کریں گویا آپ اللہ کو دیکھ رہے ہیں (یہی دولتِ وصال ہے) پس اگر آپ ان کو نہیں دیکھتے تو وہ آپ کو دیکھ رہے ہیں'' (پس عظمت ومحبت کے تصور کے ساتھ نماز پڑھو۔ یہ دوسری بات کی طرف اشارہ ہے)

---

[۱] حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا پورا قول اس طرح ہے: عبدالرحمٰن بن یزید کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت حذیفہؓ سے دریافت کیا کہ آپ کسی ایسے شخص کی نشان دہی کریں جو سیرت وخصلت اور دینی حالت میں نبی ﷺ سے قریب ہو، تاکہ ہم اس سے (دین) اخذ کریں۔ حضرت حذیفہ نے فرمایا: ''میرے علم میں سیرت وخصلت اور دینی حالت میں نبی ﷺ سے قریب تر ابن مسعودؓ کے علاوہ کوئی نہیں (بخاری حدیث ۳۷۶۲ کتاب المناقب) جب وہ گھر سے نکلتے ہیں: یہاں تک کہ وہ گھر میں لوٹتے ہیں۔ ان کی خانگی زندگی کا حال میں نہیں جانتا (بخاری حدیث ۶۰۹۷ باب الھدی الصالح، کتاب الآدب) اور اکابر صحابہ جانتے ہیں کہ وہ صحابہ میں سب سے عالی رتبہ ہیں (ترمذی ۲۲۲:۲) وسیلہ کا لفظ صرف مستدرک حاکم میں ہے۔ ترمذی میں زُلفی ہے جس کے معنی ہیں: درجہ، مرتبہ، سورۃ المائدہ آیت ۳۵ میں بھی وسیلہ کا لفظ آیا ہے۔ وہاں بھی اعمال صالحہ کے ذریعہ اللہ کی نزدیکی حاصل کرنے کے معنی ہیں۔ پس حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے قول میں وسیلہ کے معنی: طہارت واخبات کا مجموعہ نہیں بلکہ مجموعی دینی زندگی اور اللہ کی نزدیکی مراد ہے —— اور محفوظ بمعنی معصوم ہے۔ فرق مراتب کا لحاظ کرتے ہوئے انبیاء کے لئے معصوم اور اولیاء کے لئے محفوظ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے ۱۲

تحصیلِ سکینت کی تمرین: اور سکینت حاصل کرنے کے لئے نفس کی تمرین کے دو طریقے ہیں:

پہلا طریقہ: نماز میں سورۂ فاتحہ دھیان سے پڑھنا۔ حدیث قدسی میں ہے: اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں: میں نے نماز یعنی سورۂ فاتحہ اپنے اور بندے کے درمیان آدھی آدھی بانٹ دی ہے۔ اور میرا بندہ (سورۂ فاتحہ میں) جو کچھ مانگتا ہے وہ اس کو ضرور دیا جاتا ہے۔ پس جب بندہ کہتا ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ (تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کے پالنہار ہیں) تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''میرے بندے نے میری تعریف کی!'' اور جب بندہ کہتا ہے: ﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ (جو بے حد مہربان نہایت رحم والے ہیں) تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''میرے بندے نے میری ثنا کی!'' اور جب بندہ کہتا ہے: ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ (جزاء کے دن کے مالک) تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی!'' —— ان تین آیتوں میں صرف اللہ کی حمد وثنا ہے۔ پس یہ اللہ کا حصہ ہیں —— اور وہ آیت جو اللہ اور بندے کے درمیان آدھی آدھی ہے یہ ہے: —— اور جب بندہ کہتا ہے: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ (ہم آپ ہی کی بندگی کرتے ہیں اور ہم آپ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں) تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''یہ آیت میرے اور بندے کے درمیان ہے'' —— یعنی آدھی آیت میں اظہار بندگی ہے جو عبادت ہے۔ اور آدھی آیت میں استعانت (مدد طلبی) ہے جو بندے کا مفاد ہے —— ''اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے مانگا'' یعنی اس کی مدد ضرور کی جائے گی —— اور جب بندہ کہتا ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ، صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ، غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ﴾ (ہمیں سیدھی راہ دکھائیں: ان لوگوں کی راہ جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے، ان لوگوں کی راہ نہیں —— یعنی ان کی راہ سے ہمیں بچائیں —— جن پر آپ کا غصہ بھڑکا اور نہ گمراہ ہونے والوں کی راہ۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''یہ (تین آیتیں) میرے بندے کے لئے ہیں، اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے مانگا'' یعنی میں ضرور اس کو سیدھا راستہ دکھاؤں گا اور مغضوب علیہم اور گمراہوں کی راہوں سے بچاؤں گا (رواہ مسلم، مشکوۃ حدیث ۸۲۳ باب القراءۃ فی الصلاۃ) اس حدیث میں اشارہ ہے کہ جب بندہ نماز پڑھے اور اس میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت کرے تو ہر آیت پر اللہ کے جواب کی طرف دھیان دے اور دل کے کانوں سے اس کو سنے، اس سے حضوری کی دولت نصیب ہوگی۔

دوسرا طریقہ: نماز کے مختلف ارکان میں جو اذکار وادعیہ تجویز کی گئی ہیں ان کا اہتمام کرنا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں (مشکوۃ حدیث ۸۱۳ باب مایقرأ بعد التکبیر) اور دیگر صحابہ کی روایات میں ان کا بیان ہے۔ یہ اذکار کامل توجہ کے ساتھ کرے اور دعائیں دل کی تھاہ سے مانگے۔ اس سے بھی نفس کو طمانینت وسکینت حاصل ہوتی ہے۔

تلاوت کی روح —— نصیحت پذیری ہے —— اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾ ترجمہ: اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے، سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟! (سورۃ القمر ۱۵) پس جب فاتحہ کے بعد سورت پڑھے (اسی طرح جب نماز سے باہر تلاوت کرے) تو آدابِ تلاوت کا لحاظ

رکھے۔یعنی:(۱) شوق وتعظیم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوکر تلاوت کرے (۲) قرآن کریم کی نصیحتوں میں غور وفکر کرے (۳) احکامِ الٰہی کی تابعداری کو شعار بنائے یعنی تعمیل حکم کے وافر جذبہ کے ساتھ تلاوت کرے (۴) قرآن کریم میں مذکور کہاوتوں اور واقعات سے عبرت حاصل کرے (۵) جب آیاتِ صفات اور آیاتِ قدرت (تکوینی نشانیوں) کا تذکرہ آئے تو نماز میں دل سے اور نماز سے باہر زبان سے کہے: سبحان اللہ یعنی اللہ کی ذات پاک ہے!(۶) جب جنت ورحمت کا ذکر آئے تو فضلِ خداوندی طلب کرے (۷) اور جب جہنم وغضب کا تذکرہ آئے تو عافیت طلب کرے ——— یہ تلاوت کے وہ آداب ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے قرآن کریم سے نصیحت پذیری کی مشق وتمرین کے لئے مسنون کئے ہیں۔

ذکر کی روح ——— قرب حاصل کرنا اور اللہ کے دھیان میں ڈوب جانا ہے ——— پس جب نماز میں یا خارج نماز اللہ کا ذکر کرے تو پوری طرح اللہ کی طرف متوجہ ہوکر ذکر کرے تاکہ حجابات مرتفع ہوں اور استغراق کی کیفیت حاصل ہو، اور اس کی مشق وتمرین کا طریقہ حدیث میں یہ آیا ہے کہ جب لا إلٰه إلا الله والله أكبر کہے تو اللہ کا جواب دل کے کان سے سنے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: لا إلٰه إلا أنا، وأنا أكبر (میرے سوا کوئی معبود نہیں اور میں ہی سب سے بڑا ہوں) اور جب کہے: لا إلٰه إلا الله، وحده لاشريك له تو اللہ کا جواب سنے۔ اللہ تعالیٰ جواباً فرماتے ہیں: لا إلٰه إلا أنا، وحدی لاشريك لی (میرے سوا کوئی معبود نہیں، میں یگانہ ہوں، میرا کوئی ساجھی نہیں) اسی طرح ذکر کے ہر جملہ کا اللہ تعالیٰ جواب دیتے ہیں اور بندے کی تصدیق کرتے ہیں (رواہ الترمذی والنسائی وغیرہما، ترغیب وترہیب مُنذری ۴: ۳۲۳) جب اس طرح اللہ کی طرف متوجہ ہوکر ذکر کیا جائے گا تو پردہ اٹھ جائے گا اور محویت حاصل ہوگی۔

دعا کی روح ——— عبدیت کا پیکر بن جانا ہے ——— عبدیت: اللہ تعالیٰ کے حضور میں انتہائی تذلّل، عاجزی ولاچاری اور محتاجی ومسکینی کے مظاہرہ کا نام ہے اور یہ یقین کرتے ہوئے کہ سب کچھ اُسی کے قبضہ واختیار میں ہے، اس کی بارگاہِ بے نیاز میں ہاتھ پھیلانا ہے۔ دعا چونکہ عبدیت کا جوہر اور خاص مظہر ہے اس لئے جب بھی نماز میں یا نماز سے باہر دعا کرے تو طاقت وقوت کا سرچشمہ اللہ کی ذات کو تصور کرے اور نہلانے والے کے ہاتھ میں لاش کی طرح اور حرکت دینے والے کے ہاتھ میں مورتی کی طرح ہوجائے اور مناجات (سرگوشی) کا مزہ لے اور خوب گڑگڑا کر اور ہاتھ پسار کر مانگے۔ اُس در کا فقیر محروم نہیں رہتا۔

دعا کے اوقات، آداب وشرائط: قبولیت دعا کے خصوصی اوقات ہیں۔ اس کے کچھ آداب ہیں اور کچھ شرائط ہیں۔ احادیث میں یہ باتیں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ شاہ صاحب قدس سرہ نے یہ مضمون بہت مختصر لکھا ہے: قبولیتِ دعا کا ایک خاص وقت: تہجد کا وقت ہے۔ حدیث میں ہے کہ: ''رات میں ایک خاص وقت ہے۔ جب مؤمن بندہ اس وقت میں اللہ تعالیٰ سے دنیا یا آخرت کی کوئی بھلائی مانگتا ہے تو وہ ضرور عطا فرماتے ہیں اور یہ کرم ہر رات میں ہوتا ہے'' (رواہ مسلم، مشکوۃ حدیث ۱۲۲۴ باب التحريض على قيام الليل) اور متفق علیہ روایت میں ہے کہ جب رات کا آخری تہائی

حصہ باقی رہ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ سماء دنیا کی طرف نزول فرماتے ہیں۔ اور پکارتے ہیں: ہے کوئی مانگنے والا جسے عطا کروں؟ ہے کوئی بخشش طلب کرنے والا جسے بخشوں؟ ہے کوئی دعا کرنے والا جس کی دعا قبول کروں؟ (مشکوۃ حدیث ۱۲۲۳) پس تہجد کی نماز کے بعد اور تہجد کے دوگانوں کے درمیان خوب لمبی دعا کرے، دنیا وآخرت کی بھلائی مانگے اور مصائب وآفات سے پناہ طلب کرے —— اور دعا کے آداب میں سے یہ ہے کہ دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگے۔ خوب گڑگڑا کر اور اصرار کے ساتھ مانگے۔ حدیث میں ہے کہ جب اللہ سے دعا کرو تو اس یقین کے ساتھ کرو کہ وہ ضرور قبول کریں گے۔ اور یہ بات جان لو کہ اللہ تعالیٰ: غافل بے پَروا دل کی دعا قبول نہیں کرتے (رواہ الترمذی) اور بخاری کی روایت میں ہے کہ دعا میں اس طرح نہ کہے کہ الٰہی! اگر تو چاہے تو بخش دے، بلکہ قطعیت کے ساتھ مانگے۔ کیونکہ جو دعا تذبذب، بے یقینی اور غافل دل سے کی جاتی ہے: وہ بے جان اور روح سے خالی ہوتی ہے۔

اور دعا کے شرائط میں سے یہ بات ہے کہ ایسے وقت دعا کرے جب دل امور دنیوی سے فارغ ہو، دعا مانگنے میں کھیل کرنے والا نہ ہو، بول وبراز کا شدید تقاضا نہ ہو، اور بھوکا ہو نہ غضبناک۔

حضور قلبی کا فقدان اور اس کا علاج: جب انسان حضور قلبی کی کیفیت کو بخوبی معلوم کرلے اور اس حالت کو اچھی طرح سمجھ لے۔ پھر ذکر ودعا میں وہ حالت نصیب نہ ہو، تو محرومی کے سبب کی جستجو کرے اور اس کا مداوا کرے۔ بے کیفی کے اسباب اور علاج درج ذیل ہیں:

پہلا سبب —— طبیعت کا لہرانا —— اگر طبیعت میں امنگیں پیدا ہوتی ہیں اور فطرت لہریں مارتی ہے تو اس کا علاج روزہ رکھنا ہے۔ روزوں سے قوائے جسمانی ضعیف ہوتے ہیں۔ اور طبیعت کی جولانی تھمتی ہے۔ مگر چند روزے کافی نہیں، مسلسل دو ماہ کے روزے رکھنے چاہئیں۔

دوسرا سبب —— جماع کی خواہش، کھانے پکانے کے جھمیلے اور نشاطِ خاطر سے محرومی —— کبھی استفراغ مادۂ منویہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وفور شہوت سے طبیعت پریشان ہوتی ہے۔ کبھی کھانے پکانے کے بکھیڑوں سے نجات حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی عبادت میں نشاطِ خاطر کافور ہوجاتا ہے اور آدمی اس کا اعادہ چاہتا ہے: تو ان سب کا علاج بیوی ہے۔ اس کے ذریعہ مادّہ کے ہیجان کو دفع کرے۔ اس سے گھریلو حوائج میں مدد لے اور دو گھڑی اس سے دل لگی کرے تو نشاط وسرور لوٹ آئے گا۔ مگر بیوی کے ساتھ دل لگی اور اختلاط میں منہمک نہ ہوجائے۔ اس کو اس دواء کی طرح سمجھے جس کا نفع حاصل کیا جاتا ہے۔ اور جس کے ضرر سے بچا جاتا ہے۔

تیسرا سبب —— معاشی امور میں مشغولیت اور لوگوں کے ساتھ میل جول —— کبھی عبادات میں حضور قلبی کی کیفیت سے محرومی کا سبب: معاشی امور کی مشغولیت اور لوگوں کے ساتھ اختلاط ہوتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ان امور کے ساتھ عبادات کو ملائے۔ تفصیل مبحث چہارم، باب ہفتم میں گذر چکی ہے (دیکھیں رحمۃ اللہ الواسعہ ۱: ۵۷۲)

چوتھا سبب ــــــ پراگندہ خیالات اور افکار ناقصہ ــــــ کبھی دل و دماغ پراگندہ خیالات اور عیاری والے افکار سے بھر جاتے ہیں جس سے عبادات میں حضوری سے محرومی ہو جاتی ہے۔ اس کا علاج: ترکِ اختلاط ہے۔ گھر یا مسجد سے چمٹ جانا، ذکر اللہ کے علاوہ باتوں سے زبان کو روک لینا، فکر مند کرنے والی باتوں کو نہ سوچنا اور سوتے جاگتے نفس کی دیکھ بھال کرنا اس کا علاج ہے۔ چاہئے کہ نیند سے اٹھتے ہی اللہ کا ذکر کرے تاکہ سب سے پہلے ذکر اللہ دل میں داخل ہو۔ اور سوتے وقت بھی اللہ کا ذکر کرتا رہے تاکہ دل لغو باتوں سے خالی ہو جائے۔

وأصول الأخلاق: المبحوثُ عنها في هذا الفن أربعةٌ، كما نَبَّهْنَا على ذلك فيما سبق: الطهارة: الكاسبةُ للتشبُّهِ بالملكوت، والإخبات: الجالبُ للتطلُّع إلى الجبروت، وشُرِعَ للأول: الوضوءُ، والغسل، وللثاني: الصلاة، والأذكار، والتلاوة.

وإذا اجتمعتا سميناه سكينة ووسيلةً، وهو قول حذيفة في عبد الله بن مسعود رضي الله عنهما: لقد علم المحفوظون من أصحاب محمد صلى الله عليه وسلم أنه أقربهم إلى الله وسيلةً؛ وقد سماها الشارع إيمانا في قوله:" الطهور شطر الإيمان"

وقد بين النبي صلى الله عليه وسلم حالَ الأول، حيث قال:" إن الله نظيف، يحب النظافة" وأشار إلى الثاني، حيث قال:" الإحسان: أن تعبد الله كأنك تراه، فإن لم تكن تراه فإنه يراك"

والعمدة في تحصيلها: التلبُّسُ بالنواميس المأثورةِ عن الأنبياء، مع ملاحظة أرواحها وأنوارها، والإكثارُ منها، مع رعاية هيئاتها وأذكارها.

فروح الطهارة: هي نورُ الباطن، وحالةُ الأنس والانشراح، وخمودُ الأفكار الجَرْبَزَةِ، وركودُ التشويشات والقلقِ، وتشتتِ الفكر والضَّجَرِ والجزع.

وروح الصلاة: هي الحضور مع الله، والاستشرافُ للجبروت، وتذكُّرُ جلالِ الله، مع تعظيم ممزوجٍ بمحبة وطُمَأْنينة، وإليه الإشارة في قوله صلى الله عليه وسلم:" الإحسان: أن تعبد الله كأنك تراه، فإن لم تكن تراه فإنه يراك"

وأشار إلى كيفية تمرينِ النفس عليها:

[الف] بقوله:" قال الله تعالى: قَسَّمْتُ الصلاةَ بيني وبين عبدي نصفين، ولعبدي ما سأل، فإذا قال العبد: ﴿الحمد لله رب العالمين﴾ قال الله: حَمِدَني عبدي، وإذا قال: ﴿الرحمن الرحيم﴾ قال الله: أثنى عليَّ عبدي، وإذا قال: ﴿مالك يوم الدين﴾ قال: مَجَّدَني عبدي، وإذا قال: ﴿إياك نعبد، وإياك نستعين﴾ قال: هذا بيني وبين عبدي، ولعبدي ما سأل، وإذا قال: ﴿إهدنا الصراط المستقيم،

صراط الذين أنعمت عليهم، غير المغضوب عليهم ولاالضالين﴾ قال: هذا لعبدى، ولعبدى ماسأل" فذلك إشارة إلى الأمر بملاحظة الجواب فى كل كلمة، فإنه ينبِّهُ للحضور تنبيها بليغًا.

[ب] وبأدعية، سَنَّها النبيُّ صلى الله عليه وسلم فى الصلاة، وهى مذكورةٌ فى حديث على رضى الله عنه وغيره.

و روح تلاوة القرآن: أن يتوجَّهَ إلى الله بشوق وتعظيم، ويتدبر فى مواعظه، ويستشعر الانقيادَ فى أحكامه، ويعتبر بأمثاله وقِصَصه، ولايمر بآيةِ صفاتِ الله و آياتِه إلا قال: سبحان الله، ولا بآية الجنة والرحمة إلا سأل الله من فضله، ولا بآية النار والغضب إلا تعوَّذ بالله؛ فهذا ما سنَّ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم فى تمرين النفس بالاتِّعاظ.

وروح الذكر: الحضورُ، والاستغراق فى الالتفاتِ إلى الجبروت؛ وتمرينُه: أن يقول: لا إلٰه إلا الله ، والله أكبر، ثم يَسْمَعُ من الله أنه قال: لا إلٰه إلا أنا، وأنا أكبر! ثم يقول: لا إلٰه إلا الله، وحده لاشريك له، ثم يسمع من الله: لا إلٰه إلا أنا، وحدى لا شريك لى؛ وهكذا حتى يرتفع الحجاب، ويتحقق الاستغراق؛ وقد أشار النبيُّ صلى الله عليه وسلم إلى ذلك.

وروح الدعاء: أن يَرىٰ كلَّ حولٍ وقوَّةٍ من الله، ويصير كالميت فى يد الغسَّال، وكالتمثال فى يد مُحَرِّكِ التماثيل، ويجد لذةَ المناجاة؛

وقد سنَّ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم أن يدعو بعدَ صلاة التهجد، وفى أثناء أشفاعه دعاءً طويلاً، يُقْنِعُ فيها يديه، يقول: يارب! يا رب!! يَسألُ الله خيرَ الدنيا والآخرة، ويتعوَّذ به من البلايا، ويتضرع، ويُلِحُّ.

ويشترط فى ذلك: أن يكون بقلب فارغٍ، غيرِلَاهٍ، ولا يكون حاقنا، ولا حاقبًا، ولا جائعًا، ولا غضبانَ.

فإذا عرف الإنسانُ حالة المحاضرةِ، ثم فقدها، فَلْيَفْحَصْ عن سبب الفقد:

[۱] فإن كان غَزَارَةُ الطبيعة: فعليه بالصوم، فإنه له وِجَاءٌ؛ وأكثرُ ما يكون فى الصوم: أن يصومَ شهرين متتابعين.

[۲] وإن احتاج إلى استفراغ المنى، والتفرغِ من إصلاح المَطعمِ والمشرب، أو كان ذهب نشاطُه، وأراد إعادته: يَملِكُ فرجًا، يدفعُ به سوءَ مَنِيِّهِ، من غير انهماكٍ فى المفاكهة والاختلاطِ، وليجعله كالدواء: يُحَصِّلُ نفعَه، ويحترزُ من فساده.

[۳] وإن كان الاشتغالُ بالارتفاقات، وصحبةِ الناس، فليعالِجْ بضم العبادات معها.
[٤] وإن كان امتلاءُ أوعيةِ الفكر بخيالاتٍ مشوِّشةٍ، أو أفكارٍ جَرْبَزَةٍ، فليعتزِلِ الناس، ويلتزم البيتَ، أو المسجدَ، وليمنع لسانَه إلا من ذكر الله، وقلبَه إلا من الفكر فيما يُهِمُّه؛ ويتعاهد نفسَه عند ما يتيقظ، ليكونَ أولَ ما يدخل في قلبه ذكرُ الله، وعند ما يريد أن ينام: ليتخلىّٰ قلبُه عن تلك الأشغال.

ترجمہ: اور بنیادی اخلاق جن سے اس فن (سلوک واحسان) میں بحث کی جاتی ہے: چار ہیں، جیسا کہ واقف کیا ہے ہم نے ان سے ان ابواب میں جو پہلے گذر چکے ہیں (دیکھیں قسم اول، مبحث ۴ باب ۴) پاکی: جو کمانے والی ہے عالم ملکوت کے ساتھ مشابہت کو یعنی جس کے ذریعہ فرشتوں سے مشابہت پیدا ہوتی ہے۔ اور نیاز مندی: جو کھینچنے والی ہے جبروت کی طرف جھانکنے کو۔ اور مشروع کیا گیا ہے اول کے لئے وضوء اور غسل، اور ثانی کے لئے نماز، اذکار اور تلاوت۔

اور جب دونوں صفتیں اکٹھا ہوتی ہیں تو ہم اس کا سکینت اور وسیلہ نام رکھتے ہیں۔ اور وہ حضرت حذیفہ کا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے بارے میں قول ہے: حضرت محمد ﷺ کے صحابہ میں سے محفوظ حضرات یقیناً جانتے ہیں کہ وہ یعنی ابن مسعود صحابہ میں سب سے زیادہ نزدیک ہیں اللہ تعالیٰ سے وسیلہ (اعمالِ صالحہ) کے اعتبار سے۔ اور شارع نے طہارت کو ایمان سے تعبیر کیا ہے اپنے اس ارشاد میں: ''پاکی آدھا ایمان ہے'' ـــــ اور نبی ﷺ نے اول (طہارت) کا حال بیان کیا بایں طور کہ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ستھرے ہیں اور صفائی کو پسند کرتے ہیں'' اور اشارہ کیا دوم (اخبات) کی طرف بایں طور کہ فرمایا: ''احسان: یہ ہے کہ آپ اللہ کی عبادت کریں: گویا آپ ان کو دیکھ رہے ہیں۔ پس اگر آپ ان کو نہیں دیکھتے تو وہ یقیناً آپ کو دیکھ رہے ہیں''

اور بہترین طریقہ سکینت حاصل کرنے کا: انبیاء سے منقول احکام شرعیہ کے ساتھ تعلق پیدا کرنا ہے، ان کی ارواح اور ان کے انوار کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ اور بکثرت اعمالِ شرعیہ کو کرنا ہے ان کی ہیئات اور ان کے اذکار کی رعایت کے ساتھ ـــــ پس طہارت کی روح: باطن کا نور اور انس وانشراح کی حالت، اور دھوکہ دہی والے افکار کا بجھنا اور تشویشات اور بے چینی اور سوچ کی پراگندی اور بے قراری اور گھبراہٹ کا تھم جانا ہے ـــــ اور نماز کی روح: اللہ کے ساتھ موجود ہونا اور جبروت (اللہ تعالیٰ) کی طرف جھانکنا ہے اور اللہ کے جلال کو یاد کرنا ہے ایسی تعظیم کے ساتھ جو محبت وطمانینت کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔ اور اس کی طرف اشارہ ہے آنحضرت ﷺ کے ارشاد میں: ''احسان یہ ہے کہ آپ اللہ کی عبادت کریں: گویا آپ ان کو دیکھ رہے ہیں۔ پس اگر آپ ان کو نہیں دیکھتے تو وہ آپ کو دیکھ رہے ہیں''

اور آپؐ نے اشارہ فرمایا نفس کو سکینت کا مشاق بنانے کے طریقہ کی طرف: (الف) اپنے اس ارشاد سے...... (ترجمہ گذر چکا) پس وہ اشارہ ہے ہر جملہ میں جواب پیشِ نظر رکھنے کے حکم کی طرف۔ پس بیشک وہ (جواب کو پیش نظر

رکھنا) چوکنا کرتا ہے حضوری کے لئے مؤثر طور پر چوکنا کرنا (ب) اوران دعاؤں کے ذریعہ جن کو نبی ﷺ نے نماز میں مسنون کیا ہے۔اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ کی حدیثوں میں مذکور ہیں۔

اور تلاوتِ قرآن کی روح: یہ ہے کہ متوجہ ہو آدمی اللہ کی طرف شوق و تعظیم کے ساتھ، اور غور کرے قرآن کی نصیحتوں میں، اور شعار بنالے اللہ تعالیٰ کے احکام کی تابعداری کو، اور سبق لے قرآن کے امثال وقصص سے۔اور نہ گذرے اللہ کی صفات اور ان کی نشانیوں کی آیت پر مگر کہے: ''اللہ کی ذات پاک ہے!'' اور نہ جنت ورحمت کی آیت پر مگر اللہ سے ان کا فضل طلب کرے۔اور نہ آگ اور غضب کی آیت پر مگر اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہے۔پس یہ وہ باتیں ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے مسنون کی ہیں نصیحت پذیری کے لئے نفس کی تمرین میں ——— اور ذکر کی روح: حضوری ہے اور جبروت کی طرف توجہ کرنے میں ڈوب جانا ہے اور اس کی تمرین یہ ہے کہ کہے: ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ بزرگ وبرتر ہیں!'' پھر جواب سنے اللہ کی طرف سے کہ انھوں نے فرمایا: ''میرے سوا کوئی معبود نہیں، اور میں ہی سب سے بڑا ہوں!'' پھر کہے: ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، جو یگانہ ہیں، ان کا کوئی ساجھی نہیں'' پھر اللہ کی طرف سے جواب سنے کہ: ''میرے سوا کوئی معبود نہیں میں یگانہ ہوں، میرا کوئی ساجھی نہیں!'' اور اسی طرح (ذکر کرے) یہاں تک کہ پردہ اٹھ جائے اور استغراقی کیفیت پائی جائے۔اور نبی ﷺ نے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے ——— اور دعا کی روح: یہ ہے کہ وہ ہر طاقت وقوت کو اللہ کی طرف سے دیکھے۔اور وہ نہلانے والوں کے ہاتھ میں لاش کی طرح اور مجسموں کو ہلانے والے کے ہاتھ میں مورتی کی طرح ہوجائے اور وہ مناجات کی لذت محسوس کرے ——— اور رسول اللہ ﷺ نے مسنون کیا ہے کہ تہجد کی نماز کے بعد اور اس کے دوگانوں کے درمیان طویل دعا کرے۔اٹھائے دعاؤں میں اپنے دونوں ہاتھ۔کہے وہ: ''اے میرے پروردگار! اے میرے پروردگار!'' وہ اللہ سے دنیا وآخرت کی بھلائی مانگے اور آفات سے اللہ کی پناہ طلب کرے۔اور گڑگڑائے اور اصرار کرے ——— اور شرط ہے دعاؤں میں کہ وہ فارغ القلب، کھیل نہ کرنے والا، بول وبراز نہ روکنے والا نہ بھوکا اور نہ غضبناک ہو۔

پس جب پہچان لے آدمی حضوری کی حالت، پھر گم کرے وہ اس حالت کو تو چاہئے کہ جستجو کرے گم شدگی کے سبب کی: (۱) پس اگر سبب طبیعت کی فراوانی ہو تو روزے لازم پکڑے، پس وہ اس کے لئے آختگی ہیں۔اور زیادہ سے زیادہ مدت جو روزے میں ہو: روزہ رکھے وہ متواتر دوماہ ——— (۲) اور اگر اس کو استفراغ مادّہ منویہ کی اور کھانے پینے کو سنوارنے سے بےفکری کی حاجت ہو یا اس کا نشاط ختم ہوگیا ہو اور وہ اس کو واپس لانا چاہتا ہو تو مالک بنے وہ کسی فرج کا، جس کے ذریعہ اپنے مادہ کی خرابی کو ہٹائے۔مزاح کرنے میں اور میل جول میں منہمک ہوئے بغیر اور چاہئے کہ بنائے وہ اس کو دواء کی طرح: حاصل کرے اس کے نفع کو اور بچے اس کے فساد سے ——— (۳) اور اگر وہ سبب امور معاش میں اشتغال اور لوگوں کے ساتھ میل جول ہو تو چاہئے کہ وہ اس کا علاج کرے ان کے ساتھ عبادتوں کو ملا کر ——— (۴) اور اگر وہ سبب سوچ کے برتنوں کا پراگندہ خیالات یا فریب دہی والے افکار سے بھر جانا ہو تو چاہئے کہ لوگوں سے علحدہ ہوجائے اور گھر یا مسجد سے

چمٹ جائے اور چاہئے کہ اپنی زبان روک لے مگر اللہ کے ذکر سے اور اپنے دل کو روک لے ان چیزوں کے بارے میں سوچنے سے جو اس کو فکر مند بناتی ہیں اور اپنے نفس کی دیکھ بھال کرے جس وقت وہ بیدار ہو، تاکہ اللہ کا ذکر سب سے پہلی وہ چیز ہو جو اس کے دل میں داخل ہو۔ اور جبکہ وہ سونا چاہے تاکہ اس کا دل ان مشاغل سے خالی ہو جائے۔

☆ ☆ ☆

سماحت کا بیان

تیسری بنیادی صفت: سماحت ہے۔ سماحت کے لغوی معنی ہیں: سخاوت، فیاضی اور بلند حوصلگی اس کی ضد بخیلی، تنگ نظری اور دوں ظرفی ہے۔ سماحت: ایک نفسانی کیفیت ہے، اور داد و دہش، خیر خواہی اور سیر چشمی والے اعمال اس کے مظاہر ہیں۔ اور شاہ صاحب کی اصطلاح میں سماحت یہ ہے کہ آدمی کا نفس ایسا عالی ہمت اور بلند حوصلہ ہو جائے کہ وہ بہیمیت کے تقاضوں کی پیروی نہ کرے۔ بہیمیت کے تقاضے بطور مثال یہ ہیں: لذت طلبی (جنسی خواہشات اور کھانے پینے کے تقاضوں کی تکمیل) انتقام کی آز، غصہ، بخیلی اور مال وجاہ کی حرص۔ جب آدمی ایسے کام کرتا ہے جو مذکورہ تقاضوں سے مناسبت رکھتے ہیں تو ضروری ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے نفس میں ان کا رنگ پایا جائے —— پھر موت کے بعد دو صورتیں ہوتی ہیں:

پہلی صورت: اگر آدمی کا نفس فیاض تھا تو اس کے لئے ان نکمّی ہیئتوں کو چھوڑنا آسان ہوتا ہے۔ وہ ان معاملات سے اس طرح نکل جاتا ہے جیسے کبھی وہ ان میں مشغول ہوا ہی نہیں۔ اور وہ اللہ کی رحمت میں پہنچ جاتا ہے اور انوار الٰہی میں غوطے لگاتا ہے، جیسا کہ موانع کے فقدان کی صورت میں فطرتِ انسانی چاہتی ہے یعنی دنیا کے معاملات: دنیا ہی میں رہ جاتے ہیں۔ آخرت میں اس کو اُنس و سرور حاصل ہوتا ہے اور نہایت خوش گوار زندگی نصیب ہوتی ہے۔

دوسری صورت: اور اگر نفس فیاض نہیں تھا تو موت کے بعد ان نکمّی ہیئتوں کے رنگ: نفس میں اس طرح ابھر آتے ہیں جس طرح موم میں مہر کے نقوش ابھر آتے ہیں۔ نفس کے ساتھ دنیوی زندگی کا میل کچیل چپک جاتا ہے اور نفس کے لئے ان نکمّی ہیئتوں کا چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔ پس جب نفس: جسم سے جدا ہوتا ہے تو گناہ چاروں طرف سے اس کو گھیر لیتے ہیں۔ اور نفس اور انوار الٰہی کے درمیان —— جو فطرت کا مقتضی ہے —— گاڑھے پردے حائل ہو جاتے ہیں۔ پس وہ متوحش ہوتا ہے، اور نہایت تنگی کا جینا جیتا ہے۔

سماحت کے مختلف نام: متعلقات کے اختلاف سے سماحت کے مختلف نام ہیں:

(۱) عفت (پاکدامنی) شہوتِ بطن اور شہوتِ فرج کے تعلق سے سماحت کا یہ نام ہے۔ یعنی جنسی خواہشات کے معاملہ میں اور کھانے پینے کے تقاضوں میں بہیمیت کی پیروی نہ کرنے کا نام پاکدامنی ہے۔

(۲) اجتہاد (محنت کوشی) راحت و رِفاہیت کے تعلق سے سماحت کا یہ نام ہے یعنی آرام و آسائش کے معاملہ میں

بہیمیت کی پیروی نہ کرنے کا نام جفاکشی ہے۔

(۳) صبر (سہارنا) بے قراری اور گھبراہٹ کے تعلق سے سماحت کا یہ نام ہے یعنی آلام ومصائب میں اور گھبرا دینے والے معاملات میں بہیمیت کے تقاضوں کی پیروی نہ کرنا یعنی واویلا نہ مچانا اور بھیگی بلّی نہ بن جانا، بلکہ ہمتِ مردانہ سے کام لینا صبر ہے۔

(۴) عفو (درگذر) جذبۂ انتقام کے تعلق سے سماحت کا یہ نام ہے یعنی بدلہ لینے میں بہیمیت کی پیروی نہ کرنا، بلکہ فیاضی سے معاملہ رفع دفع کردینا عفو ہے۔

(۵) سخاوت وقناعت: مال کی محبت کے تعلق سے سماحت کا یہ نام ہے یعنی آزِ دنیا میں بہیمیت کی پیروی نہ کرنا اور حلال وحرام کا خیال چھوڑ کر دنیا نہ سمیٹنا، بلکہ اللہ نے جو دیا ہے اس پر مطمئن رہنا، اور دوسروں کو نوازنا: سخاوت وقناعت ہے۔

(۶) تقوی (پرہیزگاری) شریعت کی خلاف ورزی کے تعلق سے سماحت کا یہ نام ہے یعنی بہیمیت کے جھانسے میں نہ آنا اور راہِ راست سے نہ ہٹنا تقوی ہے۔

اورامر مشترک: جو مذکورہ اقسامِ ستّہ کے لئے جامع ہے: یہ ہے کہ سماحت کی حقیقت: نفس کا بہیمیت کے وساوس کی تابعداری نہ کرنا ہے۔

صوفیا کی تعبیرات: صوفیا اس صفت کو مختلف ناموں سے تعبیر کرتے ہیں: کوئی اس کا نام ''قطع علائقِ دنیویہ'' رکھتا ہے، کوئی ''بشری کمزوریوں کا ختم ہونا'' اور کوئی ''حریّت'' (آزادی) کہتا ہے۔

سماحت کو بدست لانے کا طریقہ: نفس میں سماحت پیدا کرنے کا بہترین طریقہ —— منفی پہلو سے —— یہ ہے کہ جو باتیں سماحت کے برخلاف ہیں یعنی جو بہیمیت کے تقاضے ہیں: ان کی احتمالی جگہوں میں کم سے کم واقع ہونا مثلاً جنسی خواہشات میں بقدرِ ضرورت ہی مشغول ہونا اور —— مثبت پہلو سے —— دل کا اللہ کے ذکر کو ترجیح دینا اور نفس کا اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہونا ہے۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اپنا حال بیان کرتے ہیں کہ: ''میرے نزدیک دنیا کے پتھر اور ڈھیلے یکساں ہیں'' یعنی دنیا کے مال ومنال کی حیثیت مینگنیوں سے زیادہ نہیں۔ یہ عالم تجرد کی طرف میلان کا اثر ہے۔ (حضرت زیدؓ کا یہ قول مجھے کسی کتاب میں نہیں ملا) چنانچہ نبی ﷺ ایک منامی مکاشفہ میں جنت میں داخل ہوئے تو آپؐ نے ایک جوان لڑکی دیکھی۔ پوچھا: تو کس کے لئے ہے؟ اس نے جواب دیا: میں زید بن حارثہ کے لئے ہوں (کنز العمال حدیث ۳۳۲۹۹ و۳۳۳۰۲ سِیَرُ أعلام النبلاء ۱: ۲۳۰) آپؐ نے یہ مکاشفہ حضرت زید کو بتایا، تا کہ وہ اپنے مقام رفیع سے خوش ہوجائیں۔

والثالث: سَمَاحة النفس، وهي: أن لاتنقاد الملكيةُ لدواعي البهيمية: من طلب اللذَّة، وحب الانتقام، والغضب، والبخل، والحرص على المال والجاه؛ فإن هذه الأمورَ: إذا باشر الإنسانُ أعمالَها المناسبةَ لها، تتشبح ألوانُها في جوهر النفس ساعةً مَّا:

[۱] فإن كانت النفسُ سَمِحَةً: يسهلُ عليها رفضُ الهيئات الخسيسة، فصارت كأنه لم يكن فيها شيئ من ذلك الباب قطُّ، وخَلَصَتْ إلى رحمة الله، واستغرقت فى لُجَّة الأنوار التى تقتضيها جبلَّةُ النفوس، لو لا الموانع.

[۲] وإن لم تكن سَمِحَةً: تَشَبَّحُ ألوانُها فى النفس كما تتشبَّحُ نقوش الخاتَم فى الشمعة، ولَصِقَ بها وَضَرُ الحياة الدنيا، ولم يَسْهُلْ عليها رفضُها؛ فإذا فارقَتْ جسدَها: أحاطت بها الخطيئاتُ من بين يديها، ومن خلفها، وعن يمينها، وعن شمالها، وسُدِلَ بينها وبين الأنوار التى تقتضيها جبلةُ النفوس: حُجُبٌ كثيرةٌ غليظةٌ، فكان ذلك سبب تأذِّيها وتألُّمها.

والسماحة إذا اعتُبرت:

[۱] بداعية الشهوتين: شهوةِ البطن، وشهوة الفرج: سميت عِفَّةً.

[۲] أو بداعية الدَّعَةِ والرِّفاهية: سميت اجتهادا.

[۳] أو بداعية الضَّجَرِ والجزع: سميت صبراً.

[٤] أو بداعية حب الانتقام: سميت عَفوا.

[۵] أو بداعية حب المال: سميت سخاوة وقناعة.

[٦] أو بداعية مخالفة الشرع: سميت تقوى.

ويجمعها كلَّها شيئٌ واحد، وهو: أن أصلها عدمُ انقياد النفس للهواجس البهيمية. والصوفية يسمونها بقطع التعلقات الدنيوية، أو بالفناء عن الخسائس البشرية، أو بالحريَّة؛ فيعبرون عن تلك الخصلة بأسماء مختلفة.

والعمدة فى تحصيلها: قلة الوقوع فى مظان هذه الأشياء، وإيثارُ القلب ذكرَ الله تعالى، وميلُ النفس إلى عالَم التجرد، وهو قول زيد بن حارثة: استوى عندى حجرُها ومدرها، إلى أن أُخبر عن المكاشفة.

ترجمہ: اور تیسری صفت: نفس کی سماحت ہے۔ اور سماحت یہ ہے کہ ملکیت: بہیمیت کے تقاضوں کی تابعداری نہ کرے یعنی لذت طلبی اور انتقام کی خواہش، اور غصہ اور بخیلی اور مال وجاہ کا حرص۔ پس بیشک یہ امور: جب انسان اُن اعمال کو کرتا ہے جو ان امور سے مناسبت رکھنے والے ہیں، تو کچھ نہ کچھ وقت کے لئے نفس کی ذات میں ان کے رنگ پائے جاتے ہیں۔ (۱) پھر اگر نفس فیاض ہوتا ہے تو اس کے لئے نکمّی ہیئتوں کا چھوڑنا آسان ہوتا ہے۔ پس ہو جاتا ہے وہ گویا نہیں تھی اس میں اس سلسلہ کی کوئی چیز کبھی بھی۔ اور پہنچ جاتا ہے وہ اللہ کی رحمت میں۔ اور ان انوار کے سمندر میں

غوطہ لگاتا ہے جن کو لوگوں کی فطرت چاہتی ہے، اگر موانع نہ ہوں (یعنی اللہ نے انسان کی فطرت پاک صاف بنائی ہے۔ اس کا نصیب انوار الٰہی ہیں۔ مگر عوارض یعنی گناہوں کی گندیاں محرومی کا باعث بنتی ہیں)

(۲) اور اگر نفس فیاض نہیں ہوتا: تو نفس میں نکمّی ہیئتوں کے رنگ پائے جاتے ہیں، جس طرح انگوٹھی کے نقوش موم میں پائے جاتے ہیں۔ اور نفس کے ساتھ دنیوی زندگی کا میل کچیل چپکتا ہے۔ اور نفس پر ان نکمّی ہیئتوں کو چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔ پس جب وہ نفس اپنے جسم سے جدا ہوتا ہے، تو خطائیں اس کا احاطہ کرلیتی ہیں آگے سے، پیچھے سے، دائیں سے اور بائیں سے۔ اور نفس اور ان انوار کے درمیان جن کو لوگوں کی فطرت چاہتی ہے: گاڑھے بہت سے پردے لٹکا دیئے جاتے ہیں۔ پس ہوتی ہے وہ چیز نفس کے تکلیف اٹھانے اور رنجیدہ ہونے کا سبب۔

اور سماحت: جب اس کا موازنہ کیا جائے دو خواہشوں: پیٹ کی خواہش اور شرمگاہ کی خواہش کے تقاضوں کے ساتھ تو وہ پاکدامنی کہلاتی ہے —— یا راحت وآسائش کے تقاضوں کے ساتھ تو وہ محنت کوشی کہلاتی ہے —— یا بے قراری اور گھبراہٹ کے تقاضوں کے ساتھ تو وہ صبر کہلاتی ہے —— یا انتقام کی محبت کے تقاضوں کے ساتھ تو وہ درگذر کہلاتی ہے —— یا مال کی محبت کے تقاضوں کے ساتھ تو وہ سخاوت وقناعت کہلاتی ہے —— یا مخالفتِ شریعت کے تقاضوں کے ساتھ تو وہ پرہیزگاری کہلاتی ہے۔

اور سب کو یعنی مذکورہ اقسام ستّہ کو ایک چیز جمع کرتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ سماحت کی بنیاد: نفس کا بہیمیت کے وساوس کی تابعداری نہ کرنا ہے۔ اور صوفیا سماحت کا نام رکھتے ہیں: دنیوی تعلقات کو قطع کرنا یا بشری کمزوریوں سے نکل جانا یا آزاد ہوجانا۔ وہ اس خصلت کو مختلف ناموں سے تعبیر کرتے ہیں۔

اور عمدہ بات: سماحت کی تحصیل میں: کم واقع ہونا ہے ان چیزوں کی احتمالی جگہوں میں اور دل کا ترجیح دینا ہے اللہ کے ذکر کو، اور نفس کا مائل ہونا ہے عالم تجرد کی طرف۔ اور وہ زید بن حارثہؓ کا قول ہے: ''میرے نزدیک اس کے پتھر اور ڈھیلے برابر ہیں'' یہاں تک کہ آپ خبر دیئے گئے مکاشفہ کے بارے میں۔

☆ ☆ ☆

عدالت کا بیان

چوتھی صفت: عدالت ہے۔ عدالت: ایک ملکہ یعنی نفس میں راسخ کیفیت ہے، جس سے منصفانہ نظام وجود میں آتا ہے۔ اس سے گھریلو زندگی، ملکی معاملات اور اس قسم کے دوسرے امور سنورتے اور سدھرتے ہیں۔ عدالت: دراصل فطرت اور افتادِ طبع ہے جس سے مفادِ عامہ کے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور وہ سیاسیات اور نظم وانتظامات ابھرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور ملائکہ کے پسندیدہ نظام سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ یعنی عدالت: محض اکتسابی صفت نہیں ہے۔ بلکہ وہ حقیقت

میں جبلّت وفطرتِ انسانی ہے۔اور عادلانہ اعمال سے اس کو تقویت ملتی ہے اور وہ رفتہ رفتہ ملکہ بن جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اور ملائکہ کا پسندیدہ نظام: اللہ تعالیٰ لوگوں کے معاملات کا نظم وانتظام چاہتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ لوگ ایک دوسرے کی مدد کریں۔کوئی کسی پر ظلم وزیادتی نہ کرے۔لوگ باہم مل جل کر رہیں۔اور ایک ایسا جسم بن جائیں جس کا کوئی بھی حصہ رنجیدہ ہو تو دیگر اعضاء ہم دردی کریں۔کسک محسوس کریں اور بخار اور شب بیداری میں ساتھ دیں۔اور اللہ تعالیٰ یہ بھی چاہتے ہیں کہ نسلِ انسانی بڑھے،لوگ پھلیں پھولیں،بداطواروں کو لگام دی جائے۔انصاف پرور کی شان دوبالا کی جائے۔باطل ریت رواج مٹائے جائیں۔بھلائی اور خدائی احکام کا رواج عام ہو۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان سب باتوں کا مجموعی فیصلہ فرمایا۔یعنی یکبارگی طے فرمادیا کہ انسانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کو یہ نظام پسند ہے۔مذکورہ تمام باتیں اسی اجمالی فیصلہ کی تفصیل وتشریح ہیں۔

اور ملائکہ نے اس نظام کی خوبی اور پسندیدگی عالم بالا سے حاصل کی ہے یعنی جو نظام اللہ تعالیٰ کو پسند ہے،وہی ملائکہ کو بھی پسند ہے۔چنانچہ وہ ان لوگوں کے لئے دعائیں کرتے ہیں جو انسانوں کو سنوارنے کی سعی کرتے ہیں۔اور ان لوگوں پر لعنت بھیجتے ہیں جو بگاڑ اور فساد پھیلانے کے درپے رہتے ہیں۔قرآن کریم میں اللہ کے اس پسندیدہ اور ناپسندیدہ نظام کا باربار ذکر آیا ہے۔ذیل میں تین آیتیں پڑھیں۔

پہلی آیت: سورۃ النور آیت ۵۵ میں اللہ پاک نے مؤمنین کاملین سے تین باتوں کا وعدہ فرمایا ہے تاکہ زمین میں اللہ کا پسندیدہ نظام قائم ہو:(۱) اللہ تعالیٰ ان کو زمام حکومت تفویض کریں گے۔کیونکہ اس کے بغیر کسی عادلانہ نظام کو وجود میں نہیں لایا جاسکتا۔(۲) اللہ تعالیٰ دین اسلام کو تمکین عطا فرمائیں گے اور اس کی وجہ سے جو نظام زندگی روبعمل آئے گا وہی اللہ کا پسندیدہ نظام ہے(۳) اللہ تعالیٰ حالات میں تبدیلی لائیں گے اور مؤمنین کو خوف کے بجائے کامل امن واطمینان نصیب ہوگا۔اور وہ بے خوف وخطر نظام عالم کو سنواریں گے۔کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہوگا۔ارشاد پاک ہے:

''اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ضرور ان کو زمین میں اپنی نیابت عطا فرمائیں گے جس طرح ان لوگوں کو نیابت عطا فرمائی جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ ضرور ان کے لئے اس دین کو جمادیں گے جس کو ان کے لئے پسند کیا ہے۔اور اللہ تعالیٰ ضرور ان کو ان کے ڈر کے بدلے میں امن دیں گے۔عبادت کریں گے وہ میری۔نہیں شریک ٹھہرائیں گے وہ میرے ساتھ کسی کو۔اور جس نے بعد ازیں انکار کیا تو وہی لوگ بے حکم ہیں''

اللہ کی بندگی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ صرف اللہ کے احکام کی اطاعت کی جائے۔کیونکہ کسی اور کے احکام کی اطاعت کرنا اس کو ربّ بنانا ہے۔جیسا کہ سورۃ التوبہ آیت ۳۱ میں صراحت ہے ــــــ اور ''جس نے انکار کیا'' اس میں ناپسندیدہ نظام کی طرف اشارہ ہے۔یعنی جو مسلمان حکم عدولی کریں گے:اپنی چلائیں گے یا غیروں کی اطاعت کریں گے:

ان سے اللہ تعالیٰ کا کوئی وعدہ نہیں۔

دوسری آیت: سورۃ الرعد آیات ۲۰-۲۴ میں اللہ کے پسندیدہ نظام کا بیان تفصیل سے آیا ہے۔فرمایا کہ عقل سلیم رکھنے والوں کی زندگیوں میں نو باتیں خاص طور پر نظر آتی ہیں:

۱—— وہ پیمانِ خداوندی کو پورا کرتے ہیں یعنی انھوں نے اللہ سے جو ربوبیت کا عہد کیا ہے اس کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔

۲—— وہ اپنا اقرار نہیں توڑتے یعنی لوگوں کے ساتھ کئے ہوئے قول وقرار کی بھی خلاف ورزی نہیں کرتے۔

۳—— وہ ان تعلقات کو جوڑتے ہیں جن کو جوڑنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔یعنی اقارب اور رشتہ داروں کے ساتھ نیک سلوک کرتے ہیں۔

۴—— وہ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں یعنی اطاعت کے باوجود ان کو دھڑکا لگا رہتا ہے۔یہی فکرمندی ان کو بھلائی سے ہمکنار کرتی ہے۔

۵—— وہ سخت حساب کا اندیشہ رکھتے ہیں یعنی وہ فکرِ آخرت سے کبھی بے پروا نہیں ہوتے۔

۶—— وہ اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مضبوط رہتے ہیں یعنی رنج، دُکھ اور مصائب وآلام میں بے ہمت اور سراسیمہ نہیں ہوتے۔

۷—— وہ نماز کا اہتمام کرتے ہیں۔نماز ہی وہ ستون ہے جس پر دین کی عمارت استوار ہے۔

۸—— وہ اللہ کے دیئے ہوئے رزق میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں یعنی غریبوں کی غم خواری ان کا شیوہ ہے۔

۹—— وہ بدسلوکی کو حسن سلوک سے ٹال دیتے ہیں۔اور اس طرح وہ دشمن کو بھی دوست بنا لیتے ہیں۔

انہی حضرات کے لئے دنیا کا نیک انجام ہے اور آخرت میں وہ تین عظیم انعامات سے نوازے جائیں گے: (۱) ابدی قیام گاہ کے طور پر ان کو باغات ملیں گے (۲) جن میں وہ خود بھی داخل ہوں گے۔اور ان کے آباؤ اجداد اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے جو صالح ہوں گے وہ بھی داخل ہوں گے (۳) اور فرشتے ہر دروازے سے ان کی زیارت کریں گے (اور ان سے کہیں گے:) تمہارے لئے سلامتی ہے، تمہارے (دین پر) مضبوط رہنے کی وجہ سے—— یہ وہ صالح نظام ہے جو اللہ کو اور ملائکہ کو پسند ہے۔اور مذکورہ جزا دنیا وآخرت میں اس پسندیدہ نظام کی برکت اور جزائے خیر ہے۔

تیسری آیت: پھر متصلاً آیت ۲۵ میں نظام صالح کے مقابل نظام طالح کا بیان ہے۔ارشاد فرماتے ہیں: ''اور جو لوگ پیمانِ خداوندی کو توڑ ڈالتے ہیں، اس کو خوب مضبوط باندھ لینے کے بعد، اور ان تعلقات کو کاٹ ڈالتے ہیں جن کو جوڑنے کا اللہ پاک نے حکم دیا ہے اور جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں: انہی پر پھٹکار ہے اور انہی کے لئے اس دنیا کا برا انجام ہے'' اس آیت میں اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ مذکورہ بالا نظام صالح کے برخلاف نظام: وہ برا نظام

ہے جو اللہ تعالیٰ کو اور ملائکہ کو ناپسند ہے۔

عدل وانصاف کی برکات: جو لوگ عدل وانصاف سے کام لیتے ہیں اور نظام عالم کو سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں: اللہ کی رحمتیں اور فرشتوں کی دعائیں ایسی جگہ سے ان کے شاملِ حال ہوتی ہیں کہ ان کو سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ اور مہر الٰہی کے مہین پردے ان کا اس طرح احاطہ کر لیتے ہیں جس طرح چاند سورج کی شعاعیں اُن کو گھیرے ہوئے ہوتی ہیں۔ اور اس کے نتیجہ میں لوگوں کو اور فرشتوں کو الہامات ہوتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں۔ اور ان لوگوں کے لئے آسمان وزمین میں قبولیت اتاری جاتی ہے۔

اور جب وہ لوگ موت کے بعد آخرت کی طرف منتقل ہوتے ہیں تو ان کو ان باریک پردوں کا احساس ہوتا ہے۔ اور وہ اُن سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور وہ آخرت میں کشادگی اور قبولیت پاتے ہیں۔ اور ان کے اور ملائکہ کے درمیان ایک باب وَا ہوتا ہے۔

بگاڑ پھیلانے والوں پر لعنت: اور جو لوگ نظام عالم کو بگاڑنے کے درپے ہوتے ہیں: ان کو اللہ کا غضب اور فرشتوں کی لعنت شامل ہوتی ہے۔ اور ان کو تاریک مہین پردے گھیرتے ہیں، جو اللہ کی ناراضگی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس کے نتیجہ میں فرشتوں اور لوگوں کے دلوں میں الہام ہوتے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ بدمعاملگی کریں: ان کو ستائیں اور ذلیل کریں۔ اور ان کے لئے زمین وآسمان میں سخت نفرت اتاری جاتی ہے، چنانچہ ہر کوئی ان سے نفرت کرنے لگتا ہے۔

اور جب موت کے بعد آخرت میں منتقل ہوتے ہیں تو ان کو اُن ظلمانی باریک پردوں کا احساس ہوتا ہے۔ وہ ان کو کاٹتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور ان کے نفوس ان پردوں سے رنجیدہ ہوتے ہیں۔ اور ہر چہار جانب سے ان کو تنگ حالی اور نفرت کا سامنا ہوتا ہے۔ اور ان پر زمین باوجود اپنی پہنائی کے تنگ ہو جاتی ہے۔

عدالت کے مختلف مظاہر: متعلقات کے اختلاف سے عدالت کے بھی مختلف نام ہیں:

۱ — **سلیقہ مندی اور شائستگی** — انسان کے احوال: نشست وبرخاست، سونا جاگنا، چال ڈھال، بول چال، لباس پوشاک، وضع قطع یعنی بالوں کی تراش خراش میں عدالت کے لحاظ کا یعنی یہ سب کام شریعت کی ہدایت کے مطابق انجام دینے کا نام ادب یعنی سلیقہ مندی اور شائستگی ہے۔

۲ — **کفایت شعاری** — مال اور اس کے جمع وخرچ میں عدالت کے لحاظ کا نام کفایت شعاری ہے۔ عدل وانصاف یہی ہے کہ جائز طریقوں سے مال حاصل کیا جائے اور شریعت کے حکم کے مطابق خرچ کیا جائے۔

۳ — **حرّیت (آزادی)** — گھریلو معاملات میں عدالت کے لحاظ کا نام حریت ہے۔ فیملی لائف میں حدود شرعیہ کا خیال رکھا جائے تو کسی ممبر کو غلامی کا احساس نہیں ہوگا۔ ہر شخص آزاد ماحول میں سانس لے گا۔

۴ — **اسلامی سیاست** — ملکی معاملات میں عدالت کے لحاظ کا نام اسلامی سیاست ہے۔ عدل وانصاف ہی

سے ملک سنورتا ہے اور یہی اسلامی سیاست ہے۔

۵ ـــــ حسنِ معاشرت ـــــ قوم اور برادری کے ساتھ میل جول میں عدالت کے لحاظ کا نام حسن معاشرت ہے۔

تحصیلِ عدالت کا طریقہ: اپنے اندر وصفِ عدالت پیدا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مودّت ومہربانی اور نرم دلی سے کام لیا جائے۔ اور قساوتِ قلبی اور سخت گیری سے احتراز کیا جائے۔ مگر یہ بات مفاد عامہ اور عواقبِ امور کو پیش نظر رکھ کر ہونی چاہئے۔ مثلاً عدالت کا تقاضا یہ ہے کہ بادشاہ کا عزیز قریب بھی جرم کرے تو اسے سزا دی جائے: چوری کرے ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ زنا کرے حد جاری کی جائے۔ اس معاملہ میں مودّت ومحبت سے کام لینا مفاد عامہ اور عواقب امور کے خلاف ہے۔ متفق علیہ روایت میں مخزومیہ کے چوری کے قصہ میں ارشاد ہے: وأَيْمُ اللّٰه! لو أن فاطمةَ بنتَ محمد سرقتْ لقطعتُ يدَها (مشکوٰۃ حدیث ۳۶۱۰) یعنی میں اپنی بچی کے ساتھ بھی اس معاملہ میں کوئی رورعایت نہیں کرسکتا۔ یہی انصاف ہے!

والرابع: العدالة، وهى ملكةٌ يصدر منها إقامةُ النظام العادل المصلِح فى تدبير المنزل، وسياسةِ المدينة، ونحو ذلك بسهولةٍ. وأصلُها: جبلة نفسانية، تنبعث منها الأفكارُ الكلية، والسياساتُ المناسبة بما عند الله، وعند ملائكته.

وذلك: أن الله تعالى أراد فى العالم انتظامَ أمرِهم، وأن يُعاون بعضُهم بعضًا، وأن لايظلم بعضهم بعضا، وأن يتألّف بعضُهم ببعض، ويصيروا كجسد واحد: إذا تألّم عضو منه، تداعى له سائر الأعضاء بالحمى والسَّهَرِ، وأن يكثُر نسلُهم، وأن يُزْجر فاسقُهم، ويُنوَّهَ بعادلهم، ويُخْمَلَ فيهم الرسومُ الفاسدة، ويَشْهَرَ فيهم الخيرُ والنواميسُ الحقَّةُ، فللّٰه سبحانه فى خلقه قضاءٌ إجمالى، كلُّ ذلك شرحٌ له وتفصيل.

وملائكتُه المقرَّبون تَلَقَّوْا ذلك، وصاروا يدعون لمن سعى فى إصلاح الناس، ويلعنون على من سعى فى فسادهم، وهو:

[۱] قوله تعالى: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنكُمْ وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ: لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ، وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا: يَعْبُدُوْنَنِى، لَايُشْرِكُوْنَ بِى شَيْئًا؛ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَأُوْلٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾

[۲] وقوله تعالى: ﴿اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ، وَلَايَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ، وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَا أَمَرَ اللّٰهُ بِهِ أَنْ يُوْصَلَ﴾ الآية.

[۳] وقوله تعالى: ﴿وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهِ، وَيَقْطَعُوْنَ مَا أَمَرَ اللّٰهُ بِهِ أَنْ

يُوْصَلَ﴾ الآية.

فمن باشر هذه الأعمالَ المُصلحةَ: شملتْه رحمةُ الله وصلواتُ الملائكة، من حيث يحتسب أولا يحتسب؛ وكان هنالك رَقَائِقُ تُحيط به، كأَشِعَّةِ النيرين، تُحيط بالإنسان، فتورثُ الإلهامَ فى قلوب الناس والملائكة: أن يُحسنوا إليه، ويُوضع له القبولُ فى السماء والأرض؛ وإذا انتقل إلى عالَم التجرد أحسَّ بتلك الرقائق المتصلة به، والتذَّبها، ووجد سعةً وقبولاً، وفُتح بينه وبين الملائكة بابٌ.

ومن باشر الأعمالَ المُفسدة: شمله غضب الله ولعنة الملائكة، وكانت هنالك رقائقُ مظلمة، ناشئة من الغضب، تُحيط به،فتورث الإلهامَ فى قلوب الملائكة والناس: أن يُسيئوا إليه، ويُوضع له البغضاءُ فى السماوات والأرض؛ وإذا انتقل إلى عالم التجرد أحسَّ بتلك الرقائق الظلمانية عاضَّةً عليه، وتألمت نفسُه بها، ووجد ضيقًا ونفرةً، وأُحيط به من جميع جوانبه، فضاقت عليه الأرض بما رحبت.

والعدالة: إذا اعتُبرت بأوضاع الإنسان فى قيامه، وقعوده، ونومه، ويقظته، ومشيه، وكلامه، وزِيِّهِ، ولباسه، وشَعره: سُميت أدبا؛ وإذا اعتبرت بالأموال، وجَمْعِها، وصَرْفِها: سميت كفايةً؛ وإذا اعتبرت بتدبير المنزل: سميت حُرِّيَّة؛ وإذا اعتبرت بتدبير المدينة: سميت سياسة؛ وإذا اعتبرت بتألُّف الإخوان: سميت حُسْنَ المحاضرة، أو: حسنَ المعاشرة.

والعمدة فى تحصيلها: الرحمةُ، والمودةُ، ورقةُ القلب، وعدمُ قَسوتِه، مع الانقياد للأفكار الكلية، والنظرِ فى عواقب الأمور.

ترجمہ: اور چوتھی صفت: عدالت ہے۔اور وہ ایک ملکہ ہے، جس سے صادر ہوتی ہے منصفانہ نظام کی استواری، جو(منصفانہ نظام) سنوارنے والا ہے تدبیر منزل (گھریلو زندگی) سیاستِ مدنیہ (ملکی معاملات) اور اس کے مانند امور کو بہ سہولت۔اور عدالت کی اصل: وہ نفسانی فطرت ہے، جس سے ابھرتے ہیں افکارِ کلیہ (مفاد عامہ کے خیالات) اور وہ نظم وانتظام جو مناسبت رکھنے والا ہے اس (پسندیدہ) نظام سے جو اللہ اور اس کے فرشتوں کے پاس ہے۔

اور اس کی تفصیل: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے عالم میں لوگوں کے معاملہ کا انتظام، اور یہ کہ معاونت کریں بعض بعض کی، اور یہ کہ نہ ظلم کریں بعض بعض پر، اور یہ کہ اکٹھا ہوں بعض بعض کے ساتھ، اور ہو جائیں وہ ایک جسم کی طرح: جب اس کا کوئی عضو رنجیدہ ہوتا ہے تو ایک دوسرے کو بلاتے ہیں اس عضو کے مفاد کے لئے دیگر اعضاء کو بخار اور شب بیداری میں شرکت کے لئے۔اور یہ کہ زیادہ ہو ان کی نسل اور یہ کہ جھڑ کا جائے ان کا بد اطوار، اور شان بلند کی جائے ان کے انصاف

پسند کی۔اور گمنام ہوں ان میں رسوم فاسدہ اور پھیلے ان میں بھلائی اور برحق احکام۔پس اللہ سبحانہ کے لئے اپنی مخلوقات میں اجمالی فیصلہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ازل میں یکبارگی اپنی مخلوقات کے لئے تمام فیصلے کردیئے ہیں۔وہ سب اس کی تشریح وتفصیل ہے یعنی مذکورہ تفصیل اسی اجمالی فیصلہ کا بیان ہے،کوئی نئی بات نہیں۔

اور اللہ کے مقرّب فرشتوں نے یہ چیز (یعنی مذکورہ نظام کی پسندیدگی عالم بالا سے) حاصل کی ہے۔اور وہ دعائیں کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو لوگوں کی اصلاح کی محنت کرتے ہیں (یعنی لوگوں میں پسندیدہ نظام چلانے کی سعی کرتے ہیں) اور لعنت بھیجتے ہیں ان لوگوں پر جو لوگوں کو بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں (یعنی ناپسندیدہ نظام چلانا چاہتے ہیں) اور وہ: (۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (تینوں آیتوں کا ترجمہ گذر چکا ہے)

پس جو شخص یہ سنوارنے والے اعمال کرتا ہے،اس کو اللہ کی رحمت اور فرشتوں کی دعائیں شامل ہوتی ہیں، جہاں سے وہ گمان کرتا ہے یا گمان نہیں کرتا۔اور وہاں باریک پردے ہوتے ہیں جو اس کا احاطہ کئے ہوئے ہوتے ہیں، جیسے سورج اور چاند کی شعاعیں انسان کو گھیرے ہوئے ہوتی ہیں۔پس وہ الہام کا وارث بناتی ہیں یعنی اس کے نتیجہ میں الہام ہوتا ہے لوگوں کے اور فرشتوں کے دلوں میں کہ وہ اس شخص سے اچھا برتاؤ کریں۔اور اس کے لئے آسمان وزمین میں قبولیت رکھی جاتی ہے۔اور جب وہ عالم تجرّد (آخرت) کی طرف منتقل ہوتا ہے تو وہ ان باریک پردوں کا احساس کرتا ہے جو اس سے ملے ہوئے ہیں۔اور وہ ان کو مزے دار پاتا ہے۔اور وہ کشادگی اور قبولیت پاتا ہے۔اور اس کے اور ملائکہ کے درمیان ایک دروازہ کھولا جاتا ہے۔

اور جو شخص بگاڑ پیدا کرنے والے اعمال کرتا ہے،اس کو اللہ کا غصہ اور فرشتوں کی لعنت شامل ہوتی ہے۔اور وہاں تاریک باریک پردے ہوتے ہیں جو غضبِ الٰہی سے پیدا ہونے والے ہیں۔وہ اس شخص کو گھیرتے ہیں۔پس وہ الہام کا وارث بناتے ہیں فرشتوں (ملأ سافل) اور لوگوں کے دلوں میں کہ وہ اس شخص کے ساتھ بدمعاملہ کریں۔اور اس کے لئے آسمانوں اور زمین میں سخت دشمنی رکھی جاتی ہے۔اور جب وہ عالم تجرد کی طرف منتقل ہوتا ہے تو وہ تاریک باریک پردوں کا احساس کرتا ہے،اس حال میں کہ وہ اس کو کاٹنے والے ہوتے ہیں۔اور اس کا نفس اُن پردوں سے رنجیدہ ہوتا ہے۔اور وہ تنگی اور نفرت پاتا ہے۔اور وہ گھیر لیا جاتا ہے اس کی تمام جوانب سے۔پس اس پر زمین تنگ ہوجاتی ہے باوجود اس کی کشادگی کے یعنی وہاں اس کے لئے سانس لینا بھی دوبھر ہوجاتا ہے۔

اور عدالت: جب اس کا لحاظ کیا جاتا ہے انسان کے احوال میں: اس کی نشست وبرخاست میں،اس کے سونے جاگنے میں،اس کی چال اور گفتگو میں،اس کی پوشاک اور لباس میں اور اس کے بالوں میں تو کہلاتی ہے وہ ادب (سلیقہ مندی) —— اور جب اس کا لحاظ کیا جاتا ہے اموال میں: ان کے جمع وخرچ میں تو کہلاتی ہے وہ کفایت شعاری —— اور جب اس کا لحاظ کیا جاتا ہے تدبیر منزل میں تو کہلاتی ہے وہ آزادی —— اور جب اس کا لحاظ کیا جاتا ہے ملکی نظم وانتظام میں تو کہلاتی

ہے وہ سیاست —— اور جب اس کا لحاظ کیا جاتا ہے برادروں کو اکٹھا کرنے میں تو کہلاتی ہے وہ حسن المحاضرہ (مجلسی اخلاق کی عمدگی) اور حسن المعاشرہ (میل جول کی عمدگی)

اور عمدہ بات عدالت کی تحصیل میں: مہربانی اور مودّت اور رقّت قلبی اور دل کا سخت نہ ہونا ہے، تابعداری کرنے کے ساتھ افکار کلیہ کی اور عواقب امور میں غور کرنے کی۔

☆ ☆ ☆

سماحت وعدالت میں تخالف ہے مگر دونوں کو اپنانا ضروری ہے

سماحت وعدالت میں گونہ تخالف ہے۔ سماحت کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف نفس کا میلان اور عدالت کے لئے مودّت ومہربانی کا برتاؤ کرنا ضروری ہے۔ یہی دونوں کی تحصیل کے طریقے ہیں۔ اور ان دونوں باتوں میں کسی قدر تعارض ہے۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف میلان ہوگا تو مخلوق کی طرف التفات نہیں رہے گا۔ اور جب اہل وعیال کے ساتھ مہر ومحبت کا معاملہ ہوگا تو اللہ سے توجہ ہٹ جائے گی۔ اسی وجہ سے اکثر لوگوں کے حق میں، خاص طور پر ان لوگوں کے حق میں جن کی ملکی اور بہیمی قوتوں میں کشاکشی رہتی ہے: دونوں صفتوں میں تخالف نظر آتا ہے۔ چنانچہ بہت سے اہل اللہ دنیا سے بے تعلق ہوگئے۔ وہ لوگوں سے کٹ گئے، اہل وعیال سے جدا ہوگئے۔ اور لوگوں سے بہت دور نکل گئے۔ اور عام لوگوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ان کو اہل وعیال کے معاملات نے گھیر رکھا ہے۔ وہ ان میں اس قدر محو ہیں کہ ذکر اللہ تک کو بھلا بیٹھے ہیں۔ مگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات میں دونوں مصلحتوں کی رعایت ہے۔ جام شریعت اور سندانِ عشق سے ایک ساتھ کھیلنا ان کے نزدیک ضروری ہے۔ چنانچہ انھوں نے سماحت وعدالت کے لئے قواعد وضوابط منضبط کئے۔ اور دونوں میں مشتبہ امور کو جدا کیا، تاکہ لوگ ان کو اپنا سکیں۔ (تفصیل باب سوم میں آرہی ہے)

اخلاق چار میں منحصر نہیں: شریعتوں میں بنیادی اخلاقِ حسنہ یہی چار ہیں یعنی طہارت، اخبات، سماحت اور عدالت اور ان کی اضداد اخلاقِ سیئہ ہیں۔ مگر اچھے برے اخلاق ان کے علاوہ بھی ہیں۔ اچھے برے افعال واحوال اور بھی ہیں۔ اور وہ یا تو ملکی اور شیطانی مزاج کی دَین ہیں یا وہ نفس کے ملکیت یا بہیمیت کی طرف میلان کی وجہ سے وجود پذیر ہوتے ہیں۔ یہ افعال واحوال بھی شریعتوں میں مامور بہ یا منہی عنہ ہیں۔ اس سلسلہ کی کچھ باتیں پہلے بھی آچکی ہیں۔ درج ذیل روایات میں ایسے ہی افعال واحوال کا ذکر ہے۔

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص نہ تو بائیں ہاتھ سے کھائے اور نہ اس سے پیئے۔ کیونکہ بائیں ہاتھ سے شیطان کھاتا پیتا ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۱۶۳ کتاب الأطعمة) یہ فعل شنیع کی مثال ہے۔

حدیث —— حضرت مسروق رحمہ اللہ خدمتِ فاروقی میں حاضر ہوئے۔ آپؓ نے ان کا نام دریافت کیا۔ انھوں

نے مسروق بن الاجدع نام بتایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تمہارا نام مسروق بن عبدالرحمٰن ہے'' اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ اجدع شیطان ہے (مشکوۃ حدیث ۴۷۶۷ باب الأسامی) یہ بدنما ہیئت کی مثال ہے۔

فائدہ: بدنما افعال وہیئات کو شیطان کی طرف منسوب کرنا شریعت کی اصطلاح ہے۔ اجدع کے معنی ہیں: نکٹا، کن کٹا اور ہونٹ کٹا۔

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کیا تم (نماز میں) اس طرح صف نہیں بناتے جس طرح فرشتے اپنے ربّ کے حضور میں صف بناتے ہیں؟'' پوچھا گیا: فرشتے اللہ کے پاس کس طرح صف بندی کرتے ہیں؟ فرمایا: ''وہ اگلی صفوں کو پورا کرتے ہیں اور باہم مل کر کھڑے ہوتے ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۱۰۹۱ باب تسویۃ الصفوف) یہ ہیئتِ حسنہ کی مثال ہے۔

اخلاقِ اربعہ کے مظانّ: مظانّ (احتمالی جگہیں) وہ افعال واحوال ہیں: جن کے ذریعہ مذکورہ اخلاقِ اربعہ بدست لائے جاسکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان مظان کا حکم دیا ہے تاکہ لوگ ان کے ذریعہ یہ صفات اپنے اندر پیدا کریں۔ تفصیل درج ذیل ہے:

طہارت کے مظانّ: صفتِ طہارت کی تحصیل کے لئے وضوء وغسل اور امورِ فطرت کا حکم دیا ہے۔

اخبات کے مظان: بارگاہِ خداوندی میں نیازمندی اور فروتنی کا جوہر اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے: ایسے اذکار کا حکم دیا ہے جن سے دائمی نیازمندی اور فروتنی پیدا ہوتی ہے۔ تفصیل آئندہ باب میں آرہی ہے۔

سماحت کے مظان: فیاضی یعنی ملکیت کی بالادستی قائم کرنے کے لئے چند کاموں کا حکم دیا ہے: (۱) صبر کرنا (۲) راہِ خدا میں خرچ کرنا (۳) موت کو یاد کرنا (۴) آخرت کو یاد کرنا (۵) دنیا سے دل ہٹانا (۶) اللہ کی عظمت وبزرگی اور ان کی عظیم قدرت میں غور کرنا۔

عدالت کے مظان: عدل وانصاف کی خوبو پیدا کرنے کے لئے چند کاموں کا حکم دیا ہے: (۱) بیمار پرسی کرنا (۲) خاندان کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک کرنا (۳) سلام کو رواج دینا (۴) حدود قائم کرنا (۵) نیک کاموں کا حکم دینا (۶) برے کاموں سے روکنا۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ مظانّ پوری تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے اور تمام مسلمانوں کی طرف سے رحمتِ کائنات ﷺ کو وہ بدلہ عنایت فرمائیں جس کے آپؐ حقدار ہیں ـــــ اور اب جبکہ سلوک واحسان کے سلسلہ کی اصولی باتیں بیان ہوچکیں تو ہم اس کی کچھ تفصیل پیش کرتے ہیں۔

وبين هاتين الخُلَّتين تنافر ومناقضة من وجهٍ: وذلك: لأن ميلَ القلب إلى التجرد، وانقيادَه للرحمة والمودةِ: يتخالفانِ في حق أكثر الناس، لاسيما أهل التجاذب؛ ولذلك ترى كثيرًا من أهل الله: تبتَّلوا، وانقطعوا من الناس، وبَايَنُوا الأهلَ والولدَ، وكانوا من الناس على شِقٍّ بعيد؛ وترى العامَّة

قد أحاطت بهم معافَسَةُ الأزواجِ والأولادِ، حتى أنساهم ذكرَ الله؛ والأنبياءُ عليهم السلام لايأمرون إلا برعاية المصلحتين، ولذلك أكثروا الضبطَ، وتمييزَ المشكل فى هاتين الخلتين.

فهذه هى الأخلاقُ المعتبرة فى الشرائع، وهنالك أفعال وهيئات تفعل فعلَ تلك الأخلاق وأضدادها، من جهة أنها تُعطيها مزاجُ الملائكة والشياطين، أو تنبعث من ميل النفس إلى إحدى القبيلتين، فيؤمر بذلك الباب، وقد ذكرنا بعضَ ذلك.

ومن هذا الباب: قوله صلى الله عليه وسلم: "إن الشيطان يأكل بشماله، ويشرب بشماله" وقولُه عليه السلام: "الأَجْدَع شيطان" وقوله عليه السلام: "ألا تصفُّون كما تصفُّ الملائكة؟"

وقد أمر النبى صلى الله عليه وسلم بمظان تلك الأخلاق: فأمر بأذكارٍ تفيد دوامَ الإخبات والتضرع.

وأمر بالصبر والإنفاق، ورغَّب فى ذكر هاذمِ اللذات وذكرِ الآخرة، وهَوَّن أمْرَ الدنيا فى أعينهم، وحَضَّهم على التفكر فى جلال الله وعظيمِ قدرته: ليحصل لهم السماحة.

وأمر بعيادة المريض، والبر والصلة، وإفشاء السلام،وإقامةِ الحدود، والأمر بالمعروف، والنهى عن المنكر: ليحصل لهم العدالة.

وبَيَّن تلك الأفعالَ والهيئاتِ أَتَمَّ بيانٍ. جزى الله تعالى هذا النبيَّ الكريم كما هو أهله، عنا وعن سائر المسلمين أجمعين.

وإذا علمتَ هذه الأصولَ حان أن نشتغل ببعض التفصيل، والله أعلم.

ترجمہ: اوران دوخصلتوں (سماحت وعدالت) کے درمیان ایک طرح سے تنافر اور تناقض ہے۔ اور وہ بات: اس لئے ہے کہ عالم تجرّد (اللہ تعالیٰ یا آخرت) کی طرف دل کا میلان اور رحمت ومودّت کے لئے دل کا تابعداری کرنا: دونوں ایک دوسرے کے خلاف ہیں اکثر لوگوں کے حق میں، خاص طور پر کشمکش والوں کے حق میں۔ اور اسی وجہ سے آپ بہت سے اہل اللہ کو دیکھتے ہیں کہ وہ دنیا سے بےتعلق ہوگئے۔ اور لوگوں سے کٹ گئے۔ اور اہل وعیال سے جدا ہوگئے۔ اور لوگوں سے دور کنارہ پر چلے گئے۔ اور آپ عام لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ ان کو ازواج واولاد کی مزادلت نے گھیر رکھا ہے۔ یہاں تک کہ ان کو اللہ کی یاد بھلادی۔ اور انبیاء علیہم السلام نہیں حکم دیتے مگر دونوں مصلحتوں کی رعایت کا۔ اور اسی وجہ سے انہوں نے بہت زیادہ تعینات کی ہیں۔ اور ان دونوں خصلتوں میں مشتبہ امور کو جدا کیا ہے۔

پس یہی وہ اخلاق ہیں جو شریعتوں میں معتبر ہیں۔ اور وہاں یعنی نفس الامر میں کچھ ایسے افعال واحوال (بھی) ہیں جو

ان اخلاق کا اور ان کی اضداد کا کام کرتے ہیں یعنی وہ افعال واحوال: حسنہ بھی ہیں اور سیئہ بھی۔ بایں جہت کہ ان افعال واحوال کو ملائکہ اور شیاطین کا مزاج دیتا ہے یا وہ نفس کے: دو قبیلوں (ملائکہ اور شیاطین) میں سے کسی ایک کی طرف مائل ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں یعنی ان اچھے برے افعال واحوال کے دو سبب ہیں: ایک: ملائکہ کا الہام اور شیاطین کے وساوس دوم: نفس کا سنور جانا اور بگڑ جانا۔ پس حکم دیا جاتا ہے اس باب کا یعنی یہ افعال واحوال بھی جو خصالِ اربعہ کے علاوہ ہیں: مامور بہ اور منہی عنہ ہیں۔ اور تحقیق ذکر کیا ہے ہم نے ان کے بعض کو (معلوم نہیں یہ باتیں کہاں بیان کی ہیں) اور اس باب سے ہے آنحضرت ﷺ کا ارشاد (تینوں حدیثوں کا ترجمہ گذر چکا)

اور تحقیق حکم دیا ہے نبی ﷺ نے ان اخلاق کی احتمالی جگہوں کا: (طہارت کے مظانّ بیان نہیں کئے) پس حکم دیا ایسے اذکار کا جو دائمی نیازمندی اور فروتنی کا فائدہ دیتے ہیں —— اور حکم دیا صبر اور انفاق کا اور ترغیب دی مزوں کو مٹانے والی چیز (موت) کو یاد کرنے کی، اور آخرت کو یاد کرنے کی۔ اور بے قدر کیا دنیا کے معاملہ کو لوگوں کی نگاہوں میں۔ اور ابھارا ان کو غور کرنے پر اللہ کی عظمت اور ان کی عظیم قدرت میں تاکہ حاصل ہو ان کے لئے سماحت —— اور حکم دیا بیمار پرسی کرنے کا اور نیکی اور صلہ رحمی کا اور سلام کو رواج دینے کا اور حدود قائم کرنے کا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا: تاکہ حاصل ہو ان کے لئے عدالت —— اور بیان کیا ان افعال واحوال کو پوری طرح سے بیان کرنا۔ بدلہ دیں اللہ تعالیٰ اس دیا لو نبی ﷺ کو جیسا وہ اس کے حقدار ہیں۔ ہماری طرف سے اور دیگر سبھی مسلمانوں کی طرف سے —— جب آپ نے یہ اصولی باتیں جان لیں تو اب وقت آگیا کہ ہم کسی قدر تفصیل میں مشغول ہوں۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

باب —— ۲

اذکار اور ان کے متعلقات کا بیان

باب کے شروع میں متعلقاتِ اذکار کا بیان ہے۔ پھر فصل سے اذکار کا بیان شروع ہوگا۔

اجتماعی ذکر کے فوائد

حدیث —— آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جب بھی کچھ لوگ بیٹھ کر اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں (یعنی کنفِ عنایت میں لے لیتے ہیں) اور رحمتِ الٰہی ان پر چھا جاتی ہے۔ اور ان پر سکینت نازل ہوتی ہے (یعنی ان کے دلوں کو جمعیت اور روحانی سکون حاصل ہوتا ہے) اور اللہ تعالیٰ کرّوبیوں میں ان کا تذکرہ کرتے ہیں (جس طرح لوگ اپنی محافل میں اپنے محبوبوں کا تذکرہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ بھی مقرب فرشتوں میں ان محبوب بندوں کا تذکرہ فرماتے

ہیں)(رواہ مسلم، مشکوۃ حدیث۲۲۶۱)

تشریح: اس میں ذرا شک نہیں کہ مسلمانوں کا جمع ہوکر شوق ورغبت کے ساتھ اللہ کا ذکر کرنا: رحمت وسکینت کو کھینچ لاتا ہے۔اور ملائکہ سے قریب کرتا ہے۔

وضاحت: بیٹھنے کی قید غالب کے اعتبار سے ہے۔مراد عام ہے۔خواہ جماعت میں شامل ہوکر کسی طرح ذکر کرے۔ جیسے طواف، نماز باجماعت، مجلس درس ووعظ وغیرہ۔سالکین عموماً اجتماعی ذکر کرتے ہیں۔اس میں انفرادی ذکر سے زیادہ فوائد ہیں۔ذاکرین کے انوار وانفاس کا ایک دوسرے پر انعکاس ہوتا ہے۔اور ہمت وحوصلہ ملتا ہے۔مگر چلانا ممنوع ہے۔

ذکر سے گناہوں کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے

حدیث —— آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''تنہا ہونے والے قدم بڑھا گئے!'' پوچھا گیا: ''تنہا ہونے والے کون لوگ ہیں؟'' ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا بکثرت ذکر کرنے والے مرد وزن!'' (مشکوۃ حدیث۲۲۶۲)

تشریح: مبحث ۶ باب ۱۶ میں سابقین کی نوقسمیں بیان کی گئی ہیں۔مفرّدون: ان میں سے پہلی قسم ہے۔ یہ لوگ آگے اس لئے نکل گئے کہ ذکر الٰہی نے ان کے گناہوں کا بوجھ ہلکا کر دیا۔پس سبک ساراں سبک تر روند! وہ بڑھے اور مراتب کمال تک پہنچ گئے۔

نوٹ: یہ حدیث مفصل رحمۃ اللہ الواسعہ جلد دوم صفحہ ۴۳۱ میں مذکور ہے۔

﴿الأذكار ومايتعلق بها﴾

[۱] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " لايقعد قوم يذكرون الله إلا حَفَّتْهم الملائكة، وغشِيَتْهم الرحمة"

أقول: لاشك أن اجتماع المسلمين راغبين ذاكرين: يجلبُ الرحمةَ والسكينة، ويقرِّب من الملائكة.

[۲] وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "سبق المفرِّدون!"

أقول: هم قوم من السابقين، سُمُّوا بالمفردين: لأن الذكر خَفَّف عنهم أوزارهم.

ترجمہ: اذکار (اوراد) اور وہ باتیں جو ان سے متعلق ہیں: (۱) آنحضرت ﷺ نے فرمایا:......... میں کہتا ہوں: کچھ شک نہیں کہ مسلمانوں کا چاؤ سے جمع ہونا: اللہ کا ذکر کرتے ہوئے، ہانک لاتا ہے (کھینچ لاتا ہے) رحمتِ الٰہی اور طمانینت کو، اور فرشتوں سے نزدیک کرتا ہے۔

(۲) اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد: .... میں کہتا ہوں: مفردون: سابقین میں سے کچھ لوگ ہیں۔ وہ اس لئے مفردین کہلاتے ہیں کہ ذکر نے ان سے ان کے گناہوں کے بوجھوں کو ہلکا کر دیا ہے۔

☆ ☆ ☆

جبلّت واستعداد ہی نزولِ رحمت کا باعث ہے

حدیث —— آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''میں اپنے بارے میں اپنے بندے کے گمان کے پاس ہوں۔ اور میں اس کے ساتھ ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے۔ پس اگر وہ مجھے تنہائی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اس کو تنہائی میں یاد کرتا ہوں۔ اور اگر وہ مجھے کسی مجمع میں یاد کرتا ہے تو میں اس سے بہتر مجمع میں اس کا تذکرہ کرتا ہوں'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۲۲۶۴)

تشریح: اس حدیث قدسی میں محسنین (سالکین) کے لئے دو بیش بہا ہدایتیں ہیں:

پہلی ہدایت: نیکوکاروں (سالکین) کو چاہئے کہ اپنی سرشت سنواریں[۱]۔ اور اعمال حسنہ کر کے اچھی کیفیاتِ قلبیہ پیدا کریں۔ پھر رحم وکرم کے امیدوار رہیں۔ بلاوجہ کا خوف اپنے اوپر طاری نہ کریں۔ یہی کامیابی کی کنجی ہے۔ اور اس سلسلہ میں ''اصل کلی'' یہ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ بندے کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتے ہیں، جیسا بندہ اللہ سے گمان باندھتا ہے'' کیونکہ انسان کی جبلت وفطرت جو اخلاق وعلوم کا منشا ہے (یعنی جیسی سرشت ہوتی ہے ویسے ہی تصورات آتے ہیں۔ اور ویسے ہی اخلاق ابھرتے ہیں) اور اکتسابی کیفیات قلبیہ (یعنی وہ ملکات جو اعمال کے ذریعہ اپنے اندر پیدا کئے ہیں) ہی بندے کے ساتھ مخصوص رحمت کے نزول کا باعث ہیں۔ مثلاً: ایک شخص بلند اخلاق اور عالی ظرف ہے۔ وہ لوگوں کے ساتھ مسامحت (چشم پوشی) کا معاملہ کرتا ہے۔ وہ اللہ سے بھی یہی امید رکھتا ہے کہ وہ اس کی کوتاہیوں سے درگذر فرمائیں گے۔ خردہ گیری نہیں کریں گے۔ بلکہ فیاضی کا معاملہ کریں گے۔ پس اس کی یہی امید گناہوں کے جھڑنے کا سبب بن جاتی ہے۔ دوسرا شخص مکھی چوس، بدمعاملہ اور تنگ نظر ہے۔ وہ لوگوں کی خردہ گیری کرتا ہے۔ وہ اللہ سے بھی ایسی ہی توقع رکھتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ پروردگار عالم بھی ذرا ذرا سی بات پر اس کی داروگیر کریں گے۔ اور اس کے ساتھ خردہ گیروں کا معاملہ کریں گے۔ اس کے یہی تصورات بعد از مرگ اس لئے وبال جان بن جاتے ہیں۔

فائدہ: یہ بات کہ ''بندوں کے ساتھ ان کے گمان کے مطابق معاملہ کیا جائے گا'' صرف ان امور میں پائی جائے گی جن کا حکم بارگاہ مقدس میں قطعی طور پر طے نہیں ہے یعنی معمولی باتوں میں یہ ضابطہ کارفرما ہے۔ رہے کبائر اور ان جیسے گناہ تو ان میں یہ بات اجمالی طور پر ہی اثر انداز ہوگی۔ ان کے حق میں بالکلیہ بندے کے گمان کے مطابق معاملہ نہیں

---

[۱] رحمۃ اللہ الواسعۃ (۱:۷۱۳) میں یہ مضمون گذر چکا ہے کہ فطرت کو بنانا تو انسان کے بس میں نہیں۔ مگر اس کو سنوارنا اور بگاڑنا اختیاری امر ہے ۱۲

ہوگا (یہ فائدہ کتاب میں ہے)

دوسری ہدایت: ذکر ہی سے وصل نصیب ہوتا ہے۔ پس سالک کو زیادہ سے زیادہ ذکر کرنا چاہئے تا کہ وہ فائز المرام ہو حدیث میں جو فرمایا ہے کہ: ''جب بندہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں'' اس سے ''معیت مکانی'' مراد نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ مکانیت سے منزہ ہیں۔ نہ معیتِ علمی مراد ہے کہ وہ ذاکرین کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ معیت قبولیت مراد ہے۔ یعنی ذکر کرنے والا اللہ کا مقبول بندہ ہے۔ اللہ کے نزدیک اس کا ایک مقام ومرتبہ اور اس کی ایک شان ہے۔

پھر ذکر دو طرح کا ہے: خاص اور عام۔ خاص: وہ ذکر ہے جس کا نفع ذاکر کے لئے مخصوص ہے۔ اور عام: وہ ذکر ہے جس سے دوسرے بھی مستفید ہوتے ہیں۔ اور خاص ذکر وفکر کا صلہ یہ ہے کہ حجابات اٹھ جاتے ہیں اور وصال نصیب ہوتا ہے۔ اور عام ذکر —— یعنی اللہ کے دین کی اشاعت کرنا۔ اور اعلائے کلمۃ اللہ کی محنت کرنا —— کا صلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ملأ اعلی کے قلوب میں اس ذاکر کی محبت القاء کرتے ہیں۔ چنانچہ کرّوبی اس کے لئے دعائیں کرتے ہیں اور برکات کے طالب ہوتے ہیں۔ پھر اس کی مقبولیت زمین میں اتاری جاتی ہے۔ اور ہر مخلوق اس کی دلدادہ ہوجاتی ہے۔

چنانچہ ایسے بہت سے اولیاء گذرے ہیں جن کو مقام وصل نصیب ہوا ہے، مگر ان کا ملأ اعلی میں کوئی ذکر نہیں، نہ اہلِ ارض میں ان کی مقبولیت پائی جاتی ہے۔ دوسری طرف ایسے حضرات بھی گذرے ہیں جنھوں نے دین کی بڑی مدد کی ہے اور ان کو قبول عام حاصل ہوا ہے۔ وہ عظیم برکات سے بہرہ ور ہوئے ہیں مگر اولیائے کبار میں ان کا شمار نہیں۔ کیونکہ ان کے لئے حجابات مرتفع نہیں ہوئے۔ اور مقام وصل ان کو نصیب نہیں ہوا۔

[۳] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: قال تعالى: '' أنا عند ظنِّ عبدى بى، وأنا معه إذا ذكرنى، فإن ذكرنى فى نفسه ذكرتُه فى نفسى، وإن ذكرنى فى ملأٍ ذكرتُه فى ملأٍ خيرٍ منه''

أقول: جبلةُ العبد الناشئُ منها أخلاقُها وعلومُها، والهيئاتُ التى اكتَسَبْتَها نفسُه: هى المخَصِّصةُ لنزولِ رحمةٍ خاصةٍ به؛ فربَّ عبدٍ سَمِحِ الخُلُقِ يظن بربه أنه يتجاوز عن ذنوبه، ولا يؤاخِذ بكل نقير وقطمير، ويعامل معه معاملةَ السماحة؛ فيكون رجاؤُه ذلك سببا لِنَفْضِ خطيئاته عن نفسه؛ وربَّ عبدٍ شحيحِ الخُلُقِ يظن بربه أنه يؤاخذه بكل نقير وقطمير، ويعامل معه معاملةَ المتعمقين، ولايتجاوز عن ذنوبه، فهذا بأشد المنزلة بالنسبة إلى هيئاتٍ دنيوية، تُحيط به بعد موته.

وهذا الفرق: إنما محلُّه: الأمور التى لم يتأكَّد فى حظيرة القدس حكمُها؛ وأما الكبائر وما يُشابهها فلا يظهر فيه إلا بالإجمال.

وقوله:: '' أنا معه'': إشارة إلى معية القبول، وكونِه فى حظيرة القدس ببال؛ فإن ذَكَرَ اللّٰهَ فى نفسه، وسلك طريقَ التفكرفى آلائه، فجزاؤ ہ: أن اللّٰه يرفع الحُجُبَ فى مسيرة ذلك، حتى

يَصِلَ إلى التجلي القائم في حظيرة القدس؛ وإن ذكر اللّٰهَ في ملأٍ، وكان همُّه إشاعةَ الدين، وإعلاءَ كلمة اللّٰه، فجزاؤه: أن اللّٰه يُلهم محبتَه في قلوب الملأ الأعلى: يدعون له، ويبرِّكون عليه، ثم يُنزل له القبولُ في الأرض.

وكم من عارفٍ باللّٰه وصل إلى المعرفة، وليس له قبولٌ في الأرض، ولاذكرٌ في الملأ الأعلى؛ وكم من ناصرِ دينِ اللّٰه، له قبول عظيم وبركة جسيمة، ولم تُرفع له الحجبُ.

ترجمہ: آنحضرت ﷺ نے فرمایا:............ میں کہتا ہوں: بندے کی جبلّت جس سے اس جبلت کے اخلاق وعلوم پیدا ہونے والے ہیں، اور وہ کیفیات جن کا بندے کے نفس نے اکتساب کیا ہے، وہی تخصیص کرنے والی ہیں اس رحمت کے نزول کو جو بندے کے ساتھ خاص ہے یعنی جس کی جیسی سرشت اور ہیئت قلبی ہوگی اس پر ویسی ہی رحمت نازل ہوگی۔ پس کچھ بندے بلند اخلاق ہوتے ہیں، جو اپنے پروردگار کے بارے میں گمان کرتے ہیں کہ وہ اس کے گناہوں سے درگذر فرمائیں گے۔ اور وہ ذرا ذرا سی بات پر مؤاخذہ نہیں کریں گے۔ اور وہ اس کے ساتھ فیاضی کا معاملہ فرمائیں گے۔ پس اس کی یہ امید سبب ہوتی ہے اسکی خطاؤں کو اپنی ذات سے جھاڑنے کا۔ اور کوئی لالچی طبیعت ہوتا ہے، وہ اپنے رب کے متعلق گمان کرتا ہے کہ وہ اسکی داروگیر کریں گے ذرا ذرا سی باتوں پر اور اسکے ساتھ خردہ گیروں جیسا معاملہ کریں گے۔ اور اسکے گناہوں سے درگذر نہیں کریں گے۔ تو یہ شخص نہایت سخت مقام میں ہے اُن دنیوی ہیئات کی بہ نسبت جو اسکو اسکی موت کے بعد گھیریں گی۔ یعنی اس کے وہ دنیوی تصورات موت کے بعد اس کا بری طرح احاطہ کرلیں گے اور اس کی تباہی کا باعث بنیں گے۔

(فائدہ) اور آدمی کے تصورات کا یہ فرق: اس کا محل وہی امور ہیں جن کا حکم بارگاہِ مقدس میں پختہ نہیں ہوا ہے۔ اور رہے کبیرہ گناہ اور جوان کے مشابہ ہیں: پس نہیں ظاہر ہوگی (یہ بات) ان میں مگر اجمالی طور پر۔

اور اللہ کا ارشاد: ''میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں'' معیتِ قبول کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس بندے کے بارگاہ مقدس میں اہم مقام میں ہونے کی طرف اشارہ ہے پس اگر وہ اللہ کو یاد کرتا ہے تنہائی میں اور وہ اللہ کی نعمتوں میں غور وفکر کی راہ چلتا ہے تو اس کا بدلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی راہ (سلوک) میں پردے اٹھادیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اس تجلی تک پہنچ جاتا ہے جو حظیرۃ القدس میں قائم ہے یعنی اس کو مقام وصل نصیب ہوتا ہے۔ اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کو کسی جماعت میں یاد کرتا ہے۔ اور اس کے پیش نظر اللہ کے دین کی اشاعت ہوتی ہے اور اس کا مقصود اللہ کا بول بالا کرنا ہوتا ہے تو اس کا بدلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ملأ اعلی کے دلوں میں اس کی محبت الہام فرماتے ہیں۔ جو اس کے لئے دعا کرتے ہیں اور اس کے لئے برکت کے طالب ہوتے ہیں، پھر اس کے لئے زمین میں قبولیت اتاری جاتی ہے۔

اور بہت سے اللہ کی معرفت رکھنے والے (اولیاء اللہ) ہیں جن کو مقام معرفت حاصل ہوگیا ہے۔ اور نہ ان کے لئے زمین میں قبولیت ہے، نہ ملأ اعلی میں ان کا کوئی ذکر ہے۔ اور بہت سے اللہ کے دین کے مددگار ہیں جن کے لئے بڑی

قبولیت اور عظیم برکت ہے۔ اوران کے لئے حجابات مرتفع نہیں کئے گئے۔

لغات: ملأ سے تقابل کی وجہ سے اس حدیث میں **في نفسه** کے معنی تنہائی کے ہیں۔ جو ذکر سرّی کو بھی شامل ...... **خير منه**: ملأ کی صفت ہے اور ضمیر کا مرجع ملأ ہے...... **والهيئات** کا **جبلة العبد** پر عطف ہے، **أخلاقها** پڑھیں ہے۔ اور **هي** مفرد کی ضمیر اس لئے لائی گئی ہے کہ جبلت وملکات ایک ہی ہیں...... **نقير**: کھجور کی گٹھلی کے گڑھے کا تا گا اور **قطمير**: گٹھلی کی باریک جھلی۔ مراد: چھوٹی چھوٹی باتیں...... **تعمّق في الأمر**: معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا۔ مراد: خُردہ گیری اور ریزہ چینی کرنا...... **أشد المنزلة**: ترکیب مقلوبی ہے اصل: **منزلة شديدة** ہے یعنی سخت مرحلہ...... **بالنسبة** کا مطلب یہ ہے کہ یہ سخت تباہ کن مرحلہ ان دنیوی تصورات کے نتیجہ میں پیش آیا ہے جنھوں نے موت کے بعد اس کو گھیر لیا ہے...... **البال**: اہمیت...... **التجلي القائم إلخ** سے مراد ذاتِ بحت ہے...... **بَرَّك عليه**: برکت کی دعا کرنا۔

☆　☆　☆

تھوڑا رجوع بھی آخرت میں بہت ہے

اور

آخرت میں نہایت کارآمد چیز معرفتِ الٰہیہ ہے

حدیث ــــ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''جو ایک نیکی لاتا ہے، اس کے لئے اس کا دس گنا ثواب ہے، اور میں زیادہ بھی دونگا۔ اور جو برائی لاتا ہے تو برائی کی سزا اس کے برابر ہی ہے، یا میں معاف کر دیتا ہوں۔ اور جو شخص ایک بالشت میری نزدیکی ڈھونڈھتا ہے تو میں اس سے ایک ہاتھ نزدیک ہوتا ہوں۔ اور جو ایک ہاتھ میری نزدیکی ڈھونڈھتا ہے، تو میں اس سے ایک باع (دونوں ہاتھوں کو پھیلانے کی مقدار) نزدیک ہوتا ہوں۔ اور جو میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ اور جو مجھ سے زمین بھر گناہ لے کر ملے گا، درانحالیکہ وہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراتا ہو، تو میں اس کے بقدر بخشش کے ساتھ اس سے ملونگا'' (رواہ مسلم، مشکوۃ حدیث ۲۲۶۵)

تشریح: اس حدیث قدسی میں نیکوکاروں (سالکین) کے لئے دو مضمون ہیں:

پہلا مضمون: یہ ہے کہ اللہ پاک کی طرف بندے کا تھوڑا رجوع بھی آخرت میں بہت ہو جائے گا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں: جب انسان مرتا ہے اور دنیا کو خیر باد کہتا ہے اور اس کی بہیمیت کی تیزی ٹوٹ جاتی ہے۔ اور اس کی ملکیت کے انوار چمکنے لگتے ہیں تو تھوڑی حسنات بھی بہت ہو جاتی ہیں۔ اور بندے کا تھوڑا رجوع بھی بہت التفات کا باعث ہوتا ہے۔ حدیث میں بالشت، گز، باع، چال اور دوڑ کی مثال سے نبی ﷺ نے یہی مضمون سمجھایا ہے۔

البتہ گناہوں میں کوئی زیادتی نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ عارضی اور غیر مقصود ہیں۔ اور عارضی چیزیں: ذاتی چیزوں کی بہ نسبت ضعیف ہوتی ہیں۔ بُھس کی قیمت غلہ کے برابر کب ہوسکتی ہے! اس عالم میں مقصود بالذات نیکیاں ہیں کیونکہ کائنات کے نظم وانتظام کا مدار خیر کے فیضان پر ہے۔ خیر وجود سے اقرب ہے اور شر ابعد یعنی منشأ خداوندی یہ ہے کہ خیر پائی جائے، شر نہ پایا جائے۔ متفق علیہ روایت ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ کی سو رحمتیں ہیں۔ ان میں سے ایک رحمت: جن وانس، چوپایوں اور زہریلے جانوروں کے درمیان اتاری ہے۔ پس اسی کی وجہ سے مخلوقات آپس میں میل کرتی ہیں۔ اور اسی کی وجہ سے ایک دوسرے پر مہربانی کرتی ہیں۔ اور اسی کی وجہ سے وحشی جانور اپنے بچوں پر مہربانی کرتے ہیں۔ اور ننانوے رحمتیں ریزرو (Reserve) رکھی ہیں، ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے (مؤمن) بندوں پر مہربانی فرمائیں گے'' (مشکوۃ حدیث ۲۳۶۵)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ خیر کا وجود مطلوب ہے، شر کا نہیں۔ اللہ تعالیٰ کائنات میں لطف ومہر چاہتے ہیں، بغض وعناد نہیں۔ برائیاں بندے کرتے ہیں۔ اور نیکیوں کا فیضان کیا جاتا ہے۔ اس لئے نیکیوں میں تو آخرت میں اضافہ ہوگا۔ برائیوں اور گناہوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ بلکہ محفوظ ننانوے رحمتوں کا دریا جب موجزن ہوگا تو وہ ان خس وخاشاک کو بہا کر بھی لے جاسکتا ہے۔

دوسرا مضمون: آخرت میں نہایت کارآمد چیز: معرفتِ الٰہیہ اور توجہ الی اللہ ہے۔ مذکورہ بالا حدیث کا یہ جملہ: ''جو مجھ سے زمین بھر گناہ لے کر ملے گا، درانحالیکہ وہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراتا ہو، تو میں اس کے بقدر بخشش کے ساتھ اس سے ملونگا'' اسی حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے یعنی جو بندہ پرستارِ توحید ہے، شرک کے شائبہ سے بھی پاک ہے، اس کی مغفرت کا موقع ہے۔ اور توحید سے تمسّک اور شرک سے تنفر کا مدار معرفتِ الٰہیہ پر ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کو ان کی صفاتِ کاملہ کے ساتھ کما حقہ جانتا ہے وہی جادۂ توحید پر گامزن ہے، جاہل شرک کی دلدل میں پھنس جاتا ہے۔

اور دوسری متفق علیہ روایت میں ہے کہ بندہ گناہ کرتا ہے۔ پھر (پشیمان ہوتا ہے اور توبہ کرتا ہے، اور) عرض کرتا ہے: میرے پروردگار! مجھ سے گناہ ہوگیا! آپ اس کو معاف کردیں! تو اس کے پروردگار (فرشتوں سے) فرماتے ہیں: ''دیکھو! میرا یہ بندہ جانتا ہے کہ اس کا ایک ایسا پروردگار ہے جو گناہوں کو معاف بھی کرتا ہے اور ان پر پکڑ بھی کرتا ہے (سنو!) میں نے اپنے بندے کو بخش دیا!'' (مشکوۃ حدیث ۲۳۳۳) اس حدیث میں بھی صراحت ہے کہ گناہوں کی معافی کی بنیاد معرفتِ الٰہیہ ہے۔

[٤] قال صلى الله عليه وسلم: قال تعالى: ''من جاء بالحسنة فله عشر أمثالها، وأَزِيْدُ؛ ومن جاء بالسيئة فجزاء سيئةٍ مثلُها، أو أَغْفِرُ؛ ومن تقرَّب منى شبرًا تقرَّبتُ منه ذراعًا، ومن تقرب منى ذراعاً تقربت منه باعًا، ومن أتانى يمشى أتيتُه هَرْوَلَةً، ومن لقينى بقُرابِ الأرض خطيئة، لا يُشرك بى شيئًا، لقيتُه بمثلها مغفرة''

أقول: الإنسان: إذا مات، وأَدبر عن الدنيا، وضَعُفت سَورةُ بهيميته، وتَلَعْلَعَتْ أنوار ملكيته:

فقليلُ خيرِه كثير، وما بالعرضِ ضعيفٌ بالنسبة إلى ما هو بالذات، والتدبيرُ الإلٰهي: مبناه على إفاضة الخير، فالخير أقرب إلى الوجود، والشرُّ أبعدُ منه، وهو حديث: ''إن لله مائةَ رحمةٍ، أنزل منها واحدةً إلى الأرض''، فبين النبيُّ صلى الله عليه وسلم ذلك بمثَلِ الشبر، والذراع، والباع، والمشى، والهرولة.

وليس شيئ أنفعَ فى المعاد: من التطلُّع إلى الجبروت، والالتفاتِ تلقاءَ ها، وهو قوله: ''من لقينى بقُراب الأرض خطيئة، لايُشرِك بى شيئًا، لقيتُه بمثلها مغفرة'' وقوله تعالى: ''أعَلِمَ عبدى: أن له ربًا يغفر الذنب، ويأخذ به؟!''

ترجمہ: (۴) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: (ترجمہ آ گیا) میں کہتا ہوں: انسان: جب مرگیا اور دنیا سے اس نے پیٹھ پھیر لی، اور اس کی بہیمیت کی تیزی کمزور پڑ گئی اور اس کی ملکیت کے انوار چمکے تو اس کی تھوڑی خیر (حسنات) بھی بہت ہے (اس مضمون کا تتمہ آگے آرہا ہے۔ درمیان میں اِس بات کی وجہ بیان کی ہے کہ آخرت میں گناہ کیوں نہیں بڑھتا؟) اور عارضی چیزیں: ذاتی چیزوں کی بہ نسبت ضعیف ہوتی ہیں۔ اور تدبیر الٰہی کا مدار خیر کے فیضان پر ہے۔ پس خیر وجود سے اقرب، اور شر وجود سے ابعد ہے۔ اور وہ حدیث ہے کہ: ''بیشک اللہ کی سو رحمتیں ہیں، ان میں سے ایک زمین کی طرف اتاری ہے'' (اس کے بعد پہلے مضمون کا تتمہ ہے) پس نبی ﷺ نے یہ مضمون بیان کیا: بالشت، ہاتھ (گز) باع، چال اور دوڑنے کی مثال سے۔

اور آخرت میں کوئی چیز انفع نہیں جبروت کی طرف جھانکنے سے، اور جبروت کی طرف التفات سے، اور وہ اللہ پاک کا ارشاد ہے: جو مجھ سے ملے...... اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''کیا میرا بندہ جانتا ہے......''

لغات: قِرَابُ الشيئ وقُرابُه: اندازے میں برابر...... تَلَعْلَعَ اور تَلَألَأَ: دونوں کے معنی ہیں: چمکنا۔

☆ ☆ ☆

تقرّب کا بہترین ذریعہ فرائض ہیں

اور

نوافل پر مداومت مقام ولایت تک پہنچاتی ہے

حدیث ــــــ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص میرے کسی دوست سے جھگڑا کرتا ہے (یا دشمنی رکھتا ہے) میں اس کو جنگ کی وارننگ دیتا ہوں۔ اور نہیں نزدیکی ڈھونڈھتا میرا بندہ میری کسی چیز کے ذریعہ جو مجھے بہت محبوب ہو، اس چیز سے جو میں نے اس پر فرض کی ہے یعنی تقرب کا بہترین ذریعہ فرائض ہیں۔ اور میرا بندہ برابر

میری نزدیکی ڈھونڈھتا رہتا ہے نوافلِ اعمال کے ذریعہ یہاں تک کہ میں اس کو دوست بنالیتا ہوں۔ اور جب میں اس کو دوست بنالیتا ہوں تو اس کی شنوائی بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ اور اس کی بینائی بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔ اور اس کا پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اور اگر وہ مجھ سے کوئی چیز مانگتا ہے تو میں اس کو ضرور دیتا ہوں۔ اور اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرتا ہے تو میں اس کو ضرور پناہ دیتا ہوں (یہی مقام ولایت اور قرب خاص ہے) اور میں نہیں ہچکچاتا کسی کام کے کرنے سے جیسا میں ہچکچاتا ہوں مؤمن کی روح قبض کرنے سے۔ اور وہ موت کو ناپسند کرتا ہے، اور میں اس کی ''ناخوشی'' کو ناپسند کرتا ہوں۔ اور اس کے لئے موت کے بغیر کوئی چارہ نہیں'' (رواہ البخاری، مشکوٰۃ حدیث ۲۲۶۶)

تشریح: اس حدیث کی شرح میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے چار باتیں بیان کی ہیں:

پہلی بات: حدیث میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اولیاء سے بگاڑ اللہ سے بگاڑ ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتے ہیں۔ اور اس کی محبت ملأ اعلیٰ میں اترتی ہے۔ پھر اس کے لئے زمین میں قبولیت نازل کی جاتی ہے، تو جو شخص اس نظام محبت کی مخالفت کرتا ہے، اور اس محبوب بندے سے جھگڑا کرتا ہے (یا اس سے دشمنی رکھتا ہے) اور اس کی تحریک کو فیل (Fail) اور اس کی ذات کو رسوا کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو اس ولی کا دشمن: اللہ کا دشمن ہوجاتا ہے۔ اور اس محبوب پر اللہ کی مہربانی: اس دشمن کے حق میں لعنت بن جاتی ہے۔ اور اس محبوب سے اللہ کی خوشنودی: اس دشمن کے حق میں سخت ناراضگی سے منقلب ہوجاتی ہے۔ شہنشاہِ مطلق سے آمادۂ پیکار ہونے کی وارننگ کا یہی مطلب ہے۔

دوسری بات: تقرب کا بہترین ذریعہ فرائض ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی عنایات بندوں کی طرف مبذول ہوتی ہیں۔ اور وہ بندوں کی ہدایت کے لئے ''راہ نما'' بھیجتے ہیں۔ اور ان کے ذریعہ بندوں کو آئین وشریعت عنایت فرماتے ہیں۔ اور کسی دین وملت کو برپا کرتے ہیں۔ اور بارگاہِ عالی میں اس شریعت کے احکام وقوانین لازم کردیئے جاتے ہیں، تو وہی قوانین اور وہی عبادتیں رحمتِ خداوندی کے لئے سب سے زیادہ جاذب ہوجاتی ہیں۔ اور وہی امور اللہ کی خوشنودی سے بہت زیادہ ہم آہنگ ہوجاتے ہیں۔ اور ان کا تھوڑا بھی بہت ہوتا ہے۔ یعنی گو فرائض وواجبات کی مقدار تھوڑی ہوتی ہے۔ مگر وہی آخرت میں نجات کے لئے کافی ہوجاتے ہیں۔

تیسری بات: جب بندہ مقام ولایت تک پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اعضاء بن جاتے ہیں (الی آخرہ) اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بندہ مقام قُرب حاصل کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ رحمتِ الٰہی اس کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ اور انوار الٰہی اس کے اعضاء کو تقویت پہونچاتے ہیں۔ اور اس محبوب کی جان ومال میں اور آل واولاد میں برکت ہوتی ہے۔ اور اس کی دعائیں قبول کی جاتی ہیں۔ اور شرور وفتن سے اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اور ہر طرح سے اس کی مدد کی جاتی ہے۔ اور قُرب کے اس خاص مقام کو شاہ صاحب قدس سرہ کی اصطلاح میں ''قُرب اعمال'' کہا جاتا ہے۔

فائدہ: اس حدیث کا عمودی مضمون یہ ہے کہ اگر بندہ اہتمام سے فرائض وواجبات کی ادائیگی کے ساتھ نوافلِ اعمال کا بھی اہتمام کرے تو مقام ولایت اور قرب خاص حاصل ہوسکتا ہے۔ یہ مضمون سورۂ بنی اسرائیل آیت ۷۹ میں بھی ہے۔ ارشاد پاک ہے:

وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ، نَافِلَةً لَكَ، عَسَى أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا — اور رات کے کچھ حصہ میں: پس قرآن کے ذریعہ تہجد ادا کیجئے۔ یہ حکم آپ کے لئے بطور نفل ہے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مقام محمود سے سرفراز فرمائیں۔

اس آیت کے الفاظ عام ہیں۔ اور مقام محمود (ستودہ مرتبہ) کے عموم میں مقام ولایت بھی داخل ہے۔ پس آیت میں اشارہ ہے کہ مقام قُرب: نوافلِ اعمال کے ذریعہ حاصل ہوسکتا ہے (فائدہ ختم ہوا)

چوتھی بات: حدیث کے آخر میں ایک سوال مقدر کا جواب ہے۔ کسی کو یہ خیال آسکتا ہے کہ جب اولیاء کا یہ مقام ومرتبہ ہے تو پھر انہیں موت کیوں آتی ہے؟ موت تو ہر کسی کو ناگوار ہے، پھر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس سے دوچار کیوں کرتے ہیں؟ حدیث میں اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ انبیاء اور اولیاء کا مقام تو برتر وبالا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو کسی بھی مؤمن کے لئے موت کو پسند نہیں کرتے۔ مؤمن کی روح قبض کرنے میں اللہ تعالیٰ کو جس قدر تذبذب ہوتا ہے اتنا کسی کام کے کرنے میں نہیں ہوتا۔ چنانچہ آخرت میں موت ہی کو موت دیدی جائے گی۔ اور جنتیوں کو ابدی زندگی سے ہمکنار کردیا جائے گا۔ مگر اس عالم کا بھی بہرحال ایک تقاضا ہے۔ جس کی تکمیل ضروری ہے۔ اس عالم میں خیر مطلق سے ہم آہنگ بات یہی ہے کہ ہر کسی کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔

اور اس مضمون کو جو لفظ ''تردد'' سے بیان کیا ہے، اس پر یہ اشکال ہے کہ بارگاہِ عالی ''تذبذب'' سے پاک ہے۔ شاہ صاحب قدس سرہ اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہ ایک رمزی کلام ہے۔ اور تردد سے مراد: مہربانیوں کا تعارض (آمنے سامنے ہونا) ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عنایتیں تمام انواع وافراد کو عام ہیں۔ کوئی نوع اور نوع کا کوئی فرد ان کی مہربانیوں سے بے بہرہ نہیں۔ ہر ایک کا جو تقاضا ہے: اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل فرماتے ہیں۔ اِدھر انسان کے افراد دو چیزوں کا مجموعہ ہیں: کالبُد اور روح۔ اس عالم میں کسی مصلحت سے ڈھانچا کمزور بنایا گیا ہے۔ البتہ روح طاقت ور بنائی گئی ہے۔ چنانچہ ایک وقت کے بعد جسد خاکی: روح کے استعمال کے قابل نہیں رہتا۔ قُوی جواب دیدیتے ہیں۔ اس وقت روح کی جسم سے مفارقت ضروری ہوجاتی ہے۔ اس وقت قالب پر اللہ کی عنایت چاہتی ہے کہ آدمی بیمار پڑے، لاغری اپنی نہایت کو پہنچ جائے اور بالآخر موت آجائے۔ اور جسم کی بے قراری کو قرار آئے۔ دوسری طرف روح ربانی پر اللہ کی عنایت چاہتی ہے کہ اس پر ہر جہت سے آسودگی کا فیضان ہو۔ اور ہر آفت سے اس کی حفاظت کی جائے۔ عنایتوں کے اسی تعارض کو ''تذبذب'' سے تعبیر کیا ہے۔

[٥] وقال صلى الله عليه وسلم: قال تعالىٰ:" من عادى لى وليا فقد آذنتُه بالحرب، وما تقرَّب إلىَّ عبدى بشيئٍ أحبَّ إلىَّ مما افترضتُ عليه، ومايزال عبدى يتقرَّب إلىَّ بالنوافل حتى أُحِبَّه، فإذا أحببتُه كنتُ سمعَه الذى يسمع به، وَبَصَرَه الذى يُبصر به، ويدَه التى يَبْطِش بها، ورجلَه التى يمشى بها، وإن سألنى لأُعطِيَنَّه، ولئن استعاذ نى لأُعيذنَّه، وما تَرَدَّدْتُ فى شيئ أنا فاعله تردُّدى عن نفس المؤمن، يَكره الموتَ وأنا أكرهُ مَسَاءَ تَه، ولا بدَّله منه"

أقول:

[١] إذا أحبَّ الله عبدًا، ونزلت محبتُه فى الملأ الأعلى، ثم نزل له القبولُ فى الأرض، فخالف هذا النظامَ أحدٌ وعاداه، وسعى فى رد أمره وكبتِ حاله: انقلبت رحمةُ الله بهذا المحبوب لعنةً فى حق عدوه، ورِضاه به سَخَطًا فى حقه.

[٢] وإذا تَدَلَّى الحقُّ إلى عباده بإظهار شريعةٍ، وإقامةِ دينٍ، وكَتَبَ فى حظيرة القدس تلك السنن والشرائعَ: كانت هذه السنن والقرباتُ أجلبَ شيئٍ لرحمة الله، وأوفقَه برضا الله، وقليلُ هذه كثير.

[٣] ولايزال العبد يتقرب إلى الله بالنوافل، زيادةً على الفرائض، حتى يحبَّه الله، وتغشَاه رحمتُه، وحينئذ يؤيَّد جوارحُه بنور إلٰهى، ويُبارك فيه، وفى أهله، وولده، وماله، ويستجاب دعاؤه، ويُحفظ من الشر، ويُنصر، وهذا القرب عندنا يسمى بقرب الأعمال.

[٤] والتردد ههنا كناية عن تعارض العنايات: فإن الحقَّ له عناية بكل نظامٍ نوعيٍّ وشخصيٍّ، وعنايتُه بالجسد الإنسانى تقتضى القضاء بموته، ومرضِه، وتضييقِ الحال عليه؛ وعنايتُه بنفسه المحبوبةِ تقتضى إفاضةَ الرفاهية من كل جهة عليه، وحفظِه من كل شيئ.

ترجمہ: (۵) اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا: (ترجمہ گذر چکا) ...... میں کہتا ہوں: (۱) جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتے ہیں۔ اور اس کی محبت ملأ اعلی میں اترتی ہے، پھر اس کے لئے زمین میں مقبولیت اترتی ہے۔ پس اس نظام کی کوئی شخص مخالفت کرتا ہے، اور اس محبوب سے کوئی شخص جھگڑا کرتا ہے (یا اس سے دشمنی رکھتا ہے) اور اس کے معاملہ کو پھیرنے کی اور اس کی شان کو روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو اس محبوب پر اللہ کی مہربانی: اس کے دشمن کے حق میں لعنت سے، اور اس محبوب سے اللہ کی خوشنودی: اس کے دشمن کے حق میں سخت ناراضگی سے پلٹ جاتی ہے۔

(۲) اور جب اللہ تعالیٰ تجلّی فرماتے ہیں اپنے بندوں کی طرف کسی آئین کو ظاہر کرنے اور کسی دین کو برپا کرنے کے ذریعہ۔ اور مقدس بارگاہ میں ان طریقوں اور قوانین کو لکھ دیتے ہیں تو وہ طریقے اور وہ عبادتیں رحمتِ الٰہی کو سب سے زیادہ ہانکنے والی چیز ہوتی ہیں۔ اور اللہ کی خوشنودی سے سب سے زیادہ ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ اور اس کا تھوڑا بھی بہت ہے۔

(۳) اور بندہ برابر نزدیکی ڈھونڈھتا رہتا ہے نوافل اعمال کے ذریعہ، فرائض اعمال پر زیادتی کرتے ہوئے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اور اس پر رحمتِ الٰہی چھا جاتی ہے۔ اس وقت اس کے اعضاء تقویت پہونچائے جاتے ہیں انوار الٰہی کے ذریعہ۔ اور اس محبوب میں اور اس کے گھر والوں میں اور اس کی اولاد میں اور اس کے مال میں برکت فرمائی جاتی ہے۔ اور اس کی دعا قبول کی جاتی ہے، اور شر سے اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اور اس کی مدد کی جاتی ہے۔ اور یہ نزدیکی ہمارے نزدیک ''قرب اعمال'' کہلاتی ہے۔

(۴) اور ''تذبذب'' یہاں کنایہ ہے مہربانیوں کے تعارض سے، پس بیشک اللہ تعالیٰ کے لئے مہربانی ہے ہر نوعی اور شخصی نظام پر۔ اور جسد انسانی کے ساتھ اللہ کی عنایت چاہتی ہے اس کی موت، اس کی بیماری اور اس پر حالت کی تنگی کے فیصلہ کو۔ اور اس کے محبوب نفس کے ساتھ اللہ کی عنایت ہر جہت سے آسودگی کے افاضہ کو اور ہر چیز سے اس کی حفاظت کو چاہتی ہے۔

تصحیح: حدیث کا آخری جملہ: **و لابد له منه** مصادر حدیث سے بڑھایا ہے۔

☆ ☆ ☆

احسان کی تحصیل میں ذکر اللہ کا اہم کردار

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے دریافت کیا: ''کیا میں تمہیں وہ عمل نہ بتاؤں جو تمہارے تمام اعمال میں سب سے بہتر ہے، اور وہ تمہارے مالک کی نگاہ میں پاکیزہ تر ہے، اور تمہارے درجوں کو سب سے زیادہ بلند کرنے والا ہے، اور تمہارے لئے (راہِ خدا میں) سونا، چاندی خرچ کرنے سے بھی بہتر ہے، اور تمہارے لئے اس جہاد سے بھی بہتر ہے جس میں تمہارا اپنے دشمنوں سے مقابلہ ہو، پس تم ان کی گردنیں مارو، اور وہ تمہاری گردنیں ماریں؟'' صحابہ نے جواب دیا: کیوں نہیں! یعنی ایسا قیمتی عمل ضرور بتائیں! آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ اللہ کا ذکر ہے'' (مشکوۃ حدیث ۲۲۶۹)

تشریح: صفتِ احسان کی تحصیل میں سب سے زیادہ مؤثر ''ذکر اللہ'' ہے، اس لئے اس کو ''بہترین عمل'' قرار دیا گیا ہے۔ احادیث میں مختلف اعمال کو مختلف اعتبارات سے بہترین عمل قرار دیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں بروقت نماز ادا کرنے کو بہترین عمل کہا گیا ہے (بخاری حدیث ۲۷۸۲) اور ذکر اللہ بایں اعتبار سب اعمال سے افضل ہے کہ اس سے مُدام اللہ پاک کی طرف توجہ رہتی ہے۔ اور یہ بات بندے کے لئے بے حد نافع ہے۔ خصوصاً ان پاکیزہ نفوس کے لئے جو ریاضتوں (پرمشقت عبادتوں) کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کو صرف مدام اللہ کی طرف متوجہ رہنے کی حاجت ہے۔

[٦] قال صلى الله عليه وسلم: " ألا أنبئكم بخير أعمالكم، وأزكاها عند مليككم، وأرفعها في درجاتكم، وخيرٍ لكم من إنفاق الذهب والورِق، وخيرٍ لكم من أن تَلْقَوا عدوَّكم، فتضربوا أعناقَهم، ويضربوا أعناقَكم؟" قالوا: بلى، قال: " ذكرُ الله"

أقول: الأفضليةُ تختلف بالاعتبار، ولا أفضلَ من الذكر باعتبار تطلُّع النفس إلى الجبروت، ولاسيما في نفوسٍ زكيةٍ، لا تحتاج إلى الرياضاتِ، وإنما تحتاج إلى مداومة التوجه.

ترجمہ: (۶) آنحضرت ﷺ نے فرمایا (ترجمہ گذر چکا) میں کہتا ہوں: برتری اعتبارات کی وجہ سے مختلف ہوتی ہے۔ اور ذکر سے بہتر کوئی چیز نہیں، جبروت کی طرف نفس کے جھانکنے کے اعتبار سے یعنی اللہ کی طرف متوجہ رہنے کے اعتبار سے۔ خصوصاً ان پاکیزہ نفوس کے حق میں جو ریاضتوں کے محتاج نہیں، اور وہ صرف مسلسل متوجہ رہنے کے محتاج ہیں۔

☆ ☆ ☆

ذکر سے غفلت موجبِ حسرات ہے

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص کہیں بیٹھا، اور اس نے اس نشست میں اللہ کا ذکر نہیں کیا، تو اس پر اللہ کی جانب سے بڑی حسرت ہوگی۔ اور جو شخص کہیں لیٹا، اور اس میں اس نے اللہ کا ذکر نہیں کیا تو اس پر اللہ کی جانب سے بڑی حسرت ہوگی'' یعنی ہر حال میں اللہ کا ذکر ہونا چاہئے۔ جو وقت ذکر اللہ سے خالی گذرتا ہے وہ قیامت کے دن موجب حسرت وندامت ہوگا (مشکوٰۃ حدیث ۲۲۷۲)

حدیث —— اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو بھی قوم کسی ایسی مجلس سے اٹھتی ہے جس میں انھوں نے اللہ کا ذکر نہیں کیا تو وہ مردار گدھے کے مانند ہی سے اٹھتے ہیں یعنی گویا وہ مردار کھا کر اٹھے، اور وہ مجلس ان پر حسرت ہوگی (مشکوٰۃ حدیث ۲۲۷۳)

حدیث —— اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے ذکر کے علاوہ زیادہ گفتگو نہ کیا کرو۔ پس بیشک اللہ کے ذکر کے علاوہ زیادہ گفتگو کرنا دل کی سختی (کا باعث) ہے۔ اور لوگوں میں اللہ سے سب سے زیادہ دور: سخت دل ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۲۷۶)

تشریح: ذکر سے لذت آشنا ہونے کے بعد، اور یہ بات جاننے کے بعد کہ کس طرح ذکر موجب طمانینت ہے؟ اور کس طرح ذکر کے ذریعہ دل سے پردے اٹھتے ہیں؟ اور ذکر کرتے کرتے یہ مقام حاصل کر لینے کے بعد کہ گویا وہ اللہ کو آنکھوں سے دیکھ رہا ہے: جب ذکر سے غفلت ہوتی ہے، اور آدمی دنیا کی طرف مائل ہوتا ہے، اور ازواج واملاک کے ساتھ اختلاط ہوتا ہے تو سابقہ بہت سی باتیں بھول جاتا ہے۔ اور ایسا کورا رہ جاتا ہے جیسے وہ کیفیات کبھی نصیب ہی نہیں ہوئیں۔ اور اس کے درمیان اور سابقہ احوال کے درمیان ایک بڑا پردہ حائل ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات موجب حسرت وندامت ہے۔ کیونکہ غفلت کی یہ حالت دوزخ کی طرف اور ہر برائی کی طرف دعوت دیتی ہے۔ جو گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔ اور جب حسرتوں کا انبار لگ جاتا ہے تو نجات کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔

اور نبی ﷺ نے ان حسرتوں کا بہترین علاج تجویز کیا ہے۔اور وہ یہ ہے کہ آپؐ نے ہر حالت کے لئے اس کے مناسب ذکر مقرر کیا ہے، تاکہ وہ غفلت کے زہر کے لئے تریاق کا کام دے۔ نیز آپؐ نے ان اذکار کے فوائد سے بھی آگاہ کیا ہے۔ اور اس سے بھی باخبر کیا ہے کہ ان اذکار کے بغیر آدمی حسرتوں سے دوچار ہوسکتا ہے (پس نیکوکاروں کو ہمیشہ اذکار کا اہتمام کرنا چاہئے تاکہ کل آئندہ حسرتوں کا سامنا نہ ہو)

[۷] وقال صلى الله عليه وسلم:" من قعد مقعدًا لم يَذْكُرِ الله فيه، كانت عليه من الله تِرَةٌ، ومن اضطجع مَضْجعًا لايذكر الله فيه، كانت عليه من الله تِرَةٌ"

وقال:" مامن قوم يقومون من مجلس، لايذكرون الله فيه، إلا قاموا عن مثلِ جيفةِ حمارٍ، وكان عليهم حسرةٌ"

وقال:" لاتكثروا الكلام بغير ذكر الله، فإن كثرة الكلام بغير ذكر الله قسوةٌ للقلب، وإن أبعدَ الناس من الله القلبُ القاسي"

أقول: من وجد حلاوة الذكر، وعرف كيف يحصل له الاطمئنانُ بذكر الله؟ وكيف تَنْقَشِعُ الحجبُ عن قلبه عند ذلك؟ حتى يصير كأنه يرى الله عيانًا: لاشك أنه إذا توجَّه إلى الدنيا، وعافس الأزواجَ والضيعاتِ: يَنْسٰى كثيرًا، ويبقٰى كأنه فَقَدَ ماكان وجد، ويُسْدَلُ حجابٌ بينه وبين ماكان بمرأًى منه. وهذه الخصلة تدعو إلى النار، وإلى كل شر، وفي كل من ذلك ترةٌ، وإذا اجتمعت التِّرَاتُ لم يكن سبيل إلى النجاة.

وقد عالج النبيُّ صلى الله عليه وسلم هذه التراتِ بأتمِّ علاج. وذلك أنْ شَرَعَ في كل حالةٍ ذكرًا مناسبًا له، ليكون ترياقًا دافعًا لِسُمِّ الغفلة؛ فنبه النبيُّ صلى الله عليه وسلم على فائدة هذه الأذكار، وعلى عروض التراتِ بدونها.

ترجمہ: (۷) تین احادیث شریفہ کے بعد: میں کہتا ہوں: جس نے ذکر کی حلاوت پالی، اور یہ بات جان لی کہ اس کو ذکر اللہ سے کس طرح طمانینت حاصل ہوتی ہے؟ اور کیسے ذکر اللہ کے وقت اس کے دل سے پردے ہٹتے ہیں؟ یہاں تک کہ ہوگیا وہ گویا اللہ کو آنکھوں سے دیکھ رہا ہے: اس بات میں ذرا شک نہیں کہ جب وہ دنیا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور بیویوں اور جائدادوں سے اختلاط کرتا ہے تو بہت سی باتیں بھول جاتا ہے۔ اور باقی رہتا ہے گویا اس نے گم کردی ہے وہ بات جو وہ پاتا تھا۔ اور ایک پردہ لٹکا دیا جاتا ہے اس کے درمیان اور اس چیز کے درمیان جو اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ اور یہ بات جہنم کی طرف اور ہر برائی کی طرف دعوت دیتی ہے اور اس میں سے ہر ایک میں حسرت ہے۔ اور جب حسرتیں

جمع ہوجاتی ہیں تو نجات کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔

اور نبی ﷺ نے ان حسرتوں (خساروں) کا کامل ترین علاج کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آپؐ نے ہر حالت میں اس کے مناسب کوئی ذکر مقرر کیا ہے تا کہ وہ غفلت کے زہر کے لئے تریاق بن جائے۔ پھر نبی ﷺ نے ان اذکار کے فوائد سے اور ان کے بغیر حسرتوں کے پیش آنے سے آگاہ کیا ہے۔

لغات: **التِرَة**: حسرت، ندامت، خسارہ اور گھاٹا...... **انْقَشَع عنه الشيئُ**: کسی چیز کا طاری ہونے کے بعد ہٹ جانا...... **عَافَسَ الأمورَ**: کاموں میں لگنا۔

فصل

اذکار عشرہ کا بیان

انضباطِ اذکار کی حاجت

ذکر کے الفاظ کا انضباط ضروری ہے۔ تا کہ لوگ اس میں اپنی نارسا عقلوں سے تصرف نہ کریں۔ اگر لوگ ایسا کریں گے تو وہ اللہ کے ناموں میں کج روی اختیار کریں گے یا اسماء کو ان کا حق نہیں دیں گے۔ کج روی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایسے ناموں اور ایسی صفات کا اطلاق کیا جائے جس کی شریعت نے اجازت نہیں دی اور جو اللہ کی تعظیم و توقیر کے لائق نہیں (تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ ۱: ۶۴۷) اور اللہ کے مخصوص ناموں اور صفتوں کا غیر اللہ پر اطلاق کرنا۔ اور صفات کے معانی میں بے جا تاویلات کرنا۔ اور ان کو معصیت (سحر وغیرہ) میں استعمال کرنا۔ یہ سب کج روی ہے (فوائد عثمانی حاشیہ سورۃ الاعراف آیت ۱۸۰)

اہم اذکار اور ان کی حکمتیں

اذکار بہت ہیں، البتہ اہم اذکار جو محسنین (نیکوکاروں) کے لئے مشروع کئے گئے ہیں: دس ہیں۔ اور وہ یہ ہیں: (۱) تسبیح (۲) تحمید (۳) تہلیل (۴) تکبیر (۵) فوائد طلبی اور پناہ خواہی (۶) اظہار فروتنی و نیاز مندی (۷) توکل (۸) استغفار (۹) اسمائے الٰہی سے برکت حاصل کرنا (۱۰) درود شریف۔

اور تعدّد اذکار میں دو حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: ہر ذکر میں ایک راز (منفعت) ہے جو دوسرے میں نہیں۔ پس کوئی ایک ذکر کافی نہیں۔ اسی لئے نبی ﷺ نے مختلف مواقع میں متعدد اذکار کو جمع فرمایا ہے تا کہ ان کا نفع تام ہو۔

دوسری حکمت: مسلسل ایک ہی ذکر کرتے رہنا عام لوگوں کے حق میں زبان کا لقلقہ (محض آواز) ہو کر رہ جاتا ہے۔

اور ایک ذکر سے دوسرے ذکر کی طرف انتقال نفس کو ہوشیار اور خوابیدہ کو بیدار کرتا ہے۔

پہلا اور دوسرا ذکر

تسبیح وتحمید

پہلا ذکر: تسبیح وتقدیس ہے۔ تسبیح کے معنی ہیں: تمام عیوب ونقائص اور ہر گندگی سے اللہ کی پاکی بیان کرنا۔

دوسرا ذکر: تحمید وتوصیف ہے۔ تحمید کے معنی ہیں: تعریف کرنا یعنی تمام خوبیوں اور ہر صفتِ کاملہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو متصف کرنا۔

جامع ذکر: جب کسی جملہ میں تسبیح وتحمید دونوں جمع ہوجاتے ہیں تو وہ انسان کی معرفتِ ربانی کی بہترین تعبیر ہوتے ہیں۔ کیونکہ انسان اللہ تعالیٰ کو اسی طرح پہچان سکتا ہے کہ وہ ایک ایسی ذات کا تصور کرے جو تمام عیوب ونقائص سے ——— جو مخلوقات میں پائے جاتے ہیں ——— پاک ہو، اور جوان تمام خوبیوں کے ساتھ ——— جو مخلوقات میں خوبیاں تصور کی جاتی ہیں ——— متصف ہو۔ مگر اتصاف صرف خوبی ہونے کی جہت سے مانا جائے۔ مثلاً: بینا شنوا ہونا مخلوقات میں خوبی کی بات ہے۔ پس اللہ کو ان سے متصف کیا جائے۔ ان کو سمیع وبصیر مانا جائے۔ مگر مادّی آنکھ کان ان کے لئے ثابت نہ کئے جائیں کیونکہ یہ کوئی خوبی کی بات نہیں۔

ذکر جامع کے فضائل اور ان کی وجہ: ذکر جامع ——— جو تسبیح وتحمید: دونوں مضامین پر مشتمل ہو ——— کی فضیلت میں درج ذیل روایات آئی ہیں:

حدیث ——— (۱) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تسبیح (اللہ کی تقدیس) نصف ترازو ہے (یعنی سبحان اللہ کہنے سے آدھی میزان عمل بھر جاتی ہے) اور الحمد للہ (اللہ کی تعریف کرنا) ترازو کو بھر دیتا ہے'' یعنی دونوں مضامین سے مل کر ترازو بھر جاتی ہے (مشکوٰۃ حدیث ۲۳۱۳)

حدیث ——— (۲) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''دو جملے ہیں: زبان پر یعنی ادائیگی میں ہلکے، ترازو میں یعنی ثواب میں بھاری اور مہربان ہستی کو پیارے۔ وہ دو جملے یہ ہیں: (۱) **سبحان اللہ وبحمدہ** (اللہ پاک ہیں اور ستودگی کے ساتھ متصف ہیں) (۲) **سبحان اللہ العظیم** (اللہ پاک اور عظیم المرتبت ہیں) **العظیم** میں حمد کا مفہوم ہے۔ بڑا وہی ہوتا ہے جو خوبیوں کے ساتھ متصف ہو (مشکوٰۃ حدیث ۲۲۹۸)

حدیث ——— (۳) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس نے **سبحان اللہ العظیم وبحمدہ** کہا اس کے لئے بہشت میں کھجور کا درخت لگایا جاتا ہے'' اور درختِ خرما کی تخصیص: کثرتِ منفعت، یا پھل کی عمدگی، یا معروف ہونے

کی وجہ سے ہے (مشکوۃ حدیث ۲۳۰۴)

حدیث —— (۴) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص روزانہ **سبحان اللہ وبحمدہ** سو مرتبہ کہے تو اس کی لغزشیں اتار دی جائیں گی، اگرچہ وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں'' (مشکوۃ حدیث ۲۲۹۶)

حدیث —— (۵) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے صبح میں یا شام میں **سبحان اللہ وبحمدہ** سو مرتبہ کہا تو قیامت کے دن اس کے عمل (کے برابر یا اس) سے بہتر عمل کوئی شخص نہیں لائے گا۔ ہاں جس نے یہی عمل کیا یا اس میں اضافہ کیا (مشکوۃ حدیث ۲۲۹۷)

حدیث —— (۶) رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ بہترین کلام (ذکر) کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''وہ کلام (ذکر) جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے لئے منتخب کیا ہے یعنی **سبحان اللہ وبحمدہ** (مشکوۃ حدیث ۲۳۰۰)

تشریح: جب مذکورہ بالا ذکر کی صورت نامۂ اعمال میں ٹھہرتی ہے یعنی وہ ذکر مقبول ٹھہرتا ہے، تو اس میں اللہ کی جس معرفت کا بیان ہے (یعنی اس ذات قدسی صفات کا نقائص سے مبرا ہونا اور خوبیوں سے متصف ہونا) وہ معرفت: جب اس کے کامل ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے (اور یہ فیصلہ اس وقت کیا جاتا ہے جب وہ ذکر فہم وبصیرت کے ساتھ کیا گیا ہو) تو اس وقت وہ معرفت الٰہیہ کامل ومکمل ظاہر ہوتی ہے۔ اور اس ذکر سے قُربِ الٰہی کا وسیع باب وَا ہوتا ہے (مذکورہ روایات میں اُسی ''قُرب'' کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے)

نوٹ: شاہ صاحب رحمہ اللہ نے مذکورہ فضائل کا جو راز بیان کیا ہے، اس سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ وہ ثواب مُدام ذکر کرنے کا ہے۔

نوٹ: شرح میں ترتیب بدل دی ہے۔ یعنی فضائل کی روایات پہلے دی ہیں اور ان کا راز بعد میں بیان کیا ہے۔ اصل کتاب میں راز پہلے ہے اور روایات بعد میں۔

فضائل تحمید کی روایات اور ان کا راز: شاہ صاحب قدس سرہ نے فضائل تحمید کی تین روایتیں بیان کی ہیں اور ان کی وجوہ ذکر فرمائی ہیں:

پہلی روایت: —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن جنت کی طرف سب سے پہلے ان لوگوں کو بلایا جائے گا جو خوشحالی اور تنگ حالی میں اللہ کی تعریف کرتے ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۲۳۰۸)

تشریح: اللہ کی صفات دو طرح کی ہیں: ثبوتی اور سلبی۔

صفاتِ ثبوتیہ: وہ صفات ہیں جن کے ذریعہ اللہ کے لئے کوئی خوبی اور کوئی کمال ثابت کیا جاتا ہے۔ جیسے وحدانیت اور صمدیت یعنی اللہ کا بے ہمہ اور باہمہ ہونا۔ جن کا سورۃ الاخلاص میں ذکر ہے۔ اور تمام صفاتِ حقیقیہ: صفات ثبوتیہ ہیں۔ صفاتِ ثبوتیہ کو صفاتِ جمال بھی کہا جاسکتا ہے۔

اور صفاتِ سلبیہ: وہ صفات ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے نقائص کی نفی کی جاتی ہے۔ جیسے والدیت، ولدیت اور ہم سریت کی نفی، جو سورۃ الاخلاص میں کی گئی ہے۔ صفاتِ سلبیہ کو صفات جلال بھی کہا جاسکتا ہے —— اور صفات ثبوتیہ کا مرتبہ: صفاتِ سلبیہ سے بلند ہے۔ اسی وجہ سے سورۃ الاخلاص میں پہلے صفاتِ ثبوتیہ کا بیان ہے اور بعد میں صفات سلبیہ کا۔

پس مذکورہ روایت میں حمد کی جو فضیلت بیان کی گئی ہے اس کا راز یہ ہے کہ حمد ایک ثبوتی عمل ہے۔ اور مثبت ذہن ہی سے حمد ابھرتی ہے اسی وجہ سے تسبیح کی بہ نسبت تحمید افضل ذکر ہے۔ ابھی جو روایت گذری ہے کہ ''الحمد للہ میزانِ عمل کو بھر دیتا ہے'' اس کا مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ تسبیح سے تو آدھی تراز و بھرتی ہے اور تحمید سے پوری۔ یعنی تحمید کا ثواب: تسبیح سے دوگنا ہے۔ اسی وجہ سے تحمید کرنے والے بہشت کی نعمتوں سے زیادہ بہرور ہیں۔ اور اسی وجہ سے ان کو سب سے پہلے جنت کی طرف بلایا جائے گا۔

دوسری روایت —— رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بہترین دعا الحمد للہ ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۳۰۶)

تشریح: الحمد للہ بہترین دعا اس لئے ہے کہ دعا کی دو قسمیں ہیں: ایک: وہ جن سے دل و دماغ عظمتِ خداوندی سے لبریز ہوجاتے ہیں اور دل میں نیاز مندی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ دوم: وہ جن کے ذریعہ دنیا و آخرت کی خیر طلب کی جاتی ہے اور شر سے حفاظت کی درخواست کی جاتی ہے۔ اور الحمد للہ میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ جب بندہ کہتا ہے کہ ستائشوں کے سزاوار اللہ تعالیٰ ہیں تو اس کا دل نیاز مندی اور عاجزی سے لبالب ہوجاتا ہے۔ اور الحمد للہ کلمۂ شکر بھی ہے۔ اور شکر سے نعمت بڑھتی ہے۔ پس حمد کرنے والا دارین کی سعادتوں سے مالامال کردیا جاتا ہے، اور شرور وفتن سے اس کی حفاظت کی جاتی ہے —— اور اس ذکر کی فضیلت کی یہ وجہ بھی ہے کہ حمد: صفاتِ ثبوتیہ کے اثبات کا نام ہے۔ جس کی اہمیت ابھی بیان کی جاچکی ہے۔

تیسری روایت —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حمد شکر کا سردار ہے، جو حمد نہیں کرتا وہ شکر گزار نہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۳۰۷)

تشریح: حمد (تعریف) صرف زبان سے ہوتی ہے۔ اور شکر: زبان، دل اور اعضاء: سب سے ہوتا ہے۔ پس حمد: شکر کی ایک شاخ ہے۔ اور چونکہ حمد زبان کا فعل ہے۔ اور زبان سے نعمت اور تعریف کا اظہار خوب ہوتا ہے، اس لئے حمد کو شکر کی اہم شاخ اور سردار قرار دیا ہے۔

واعلم: أنه مسَّتِ الحاجة إلى ضبط ألفاظ الذكر، صونًا له من أن يَتصرَّف فيه متصرفٌ بعقله الأبتر، فَيُلْحِدَ فى أسماء الله، أولا يعطى المقامَ حقَّه.

وعمدة ما سُنَّ فى هذا الباب عشرةُ أذكار، فى كل واحد سِرٌّ ليس فى غيره؛ ولذلك سَنَّ النبيُّ صلى الله عليه وسلم فى كل موطن أن يُجمع بين ألوان منها.

وأيضًا: فالوقوف على ذكر واحد يجعله لَقْلَقَةَ اللسان في حق عامة المكلفين؛ والانتقالُ من بعضها إلى بعض ينبه النفسَ، ويوقظ الوسنانَ.

منها: سبحان الله: وحقيقته: تنزيهه عن الأدناس والعيوب والنقائص.

ومنها: الحمد لله: وحقيقته: إثبات الكمالات والأوصاف التامَّةِ له.

فإذا اجتمعتا في كلمة واحدة: كانت أفصحَ تعبيرٍ عن معرفة الإنسان بربه، لأنه لايستطيع أن يعرفه إلا من جهةِ إثباتِ ذاتٍ يُسلب عنها ما نشاهده فينا من النقائص، ويُثبت لها ما نشاهده فينا من جهات الكمال، من جهة كونه كمالاً.

فإن استقَرَّتْ صورةُ هذا الذكر في الصحيفة: ظهرت هناك هذه المعرفة تامةً كاملةً، عندما يُقضى بسُبُوْغها، فيفتح بابًا عظيما من القرب:

وإلى هذا المعنى أشار النبيُّ صلى الله عليه وسلم في قوله: " التسبيحُ نصفُ الميزان، والحمدلله يملؤه"

ولهذا كانت كلمةُ: " سبحان الله وبحمده" كلمةً خفيفة على اللسان، ثقيلةً في الميزان، حبيبةً إلى الرحمن.

ومن يقولها غُرست له نخلة.

وورد فيمن يقولها مائةً: " حُطَّتْ عنه خطاياه، وإن كانت مثلَ زَبَدِ البحر"

"ولم يأت أحد يوم القيامة بأفضل مما جاء به، إلا أحدٌ قال مثل ذلك، أوزاد عليه"

وهي "أفضل الكلام: اصطفاه الله لملائكته"

وأما سِرُّ قوله عليه السلام: " أول من يُدعى إلى الجنة الذين يحمَدون الله في السَّرَّاء والضَّرَّاء" فهو أن عملَهم ثبوتِيٌّ، منبعثٌ من القوى الثبوتية، وأهلَها أَحْظَى الناس بنعيم الجنان.

وسِرُّ قوله عليه السلام: " أفضل الدعاء: الحمدلله" أن الدعاء على قسمين— كما سنذكر— والحمد لله يفيدهما جميعًا، فإن الشكر يزيد النعمة، ولأنها معرفة ثبوتية.

وسِرُّ قوله عليه السلام: " الحمد لله رأس الشكر" أن الشكر يتأتّى باللسان والجنان والأركان، واللسانُ أفصحُ من ذَيْنِكَ.

ترجمہ: اور جان لیں کہ ذکر کے الفاظ منضبط کرنے کی ضرورت ہے، ذکر کو بچاتے ہوئے اس بات سے کہ اس میں تصرف کرے کوئی تصرف کرنے والا اپنی ناقص عقل سے، پس وہ کج روی اختیار کرے اللہ کے ناموں میں یا وہ مقام کو

اس کا حق نہ دے ——— اور بہترین اذکار جو اس باب (احسان) میں مشروع (مقرر) کئے گئے ہیں: دس اذکار ہیں۔ جن میں سے ہر ایک میں وہ راز ہے جو دوسرے میں نہیں ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ہر جگہ میں مسنون کیا کہ ان میں سے کئی اذکار کے درمیان جمع کیا جائے ——— اور نیز: پس ایک ذکر پر ٹھہرنا اس کو زبان کا لقلقہ (سارس کے زور سے بولنے کی آواز) بنا دیتا ہے عام مکلفین کے حق میں۔ اور بعض اذکار سے بعض کی طرف انتقال نفس کو چوکنا کرتا ہے اور اونگھتوں کو بیدار کرتا ہے ——— ان میں سے: سبحان اللہ ہے۔ اور تسبیح کی حقیقت: اللہ کی تقدیس بیان کرنا ہے میل کچیل، اور عیوب اور نقائص سے ——— اور ان میں سے: الحمد للہ ہے۔ اور تحمید کی حقیقت: اللہ کے لئے کمالات اور صفات کاملہ ثابت کرنا ہے ——— پس جب دونوں ایک جملہ میں اکٹھا ہو جائیں: تو وہ فصیح ترین تعبیر ہوتی ہے انسان کے اپنے رب کو پہچاننے کی۔ اس لئے کہ انسان نہیں طاقت رکھتا کہ وہ اللہ کو پہچانے مگر ایسی ذات کو ثابت کرنے کی جہت سے جس سے نفی کی جائے ان نقائص کی جن کا ہم اپنے اندر مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور جس کے لئے ثابت کی جائیں کمال کی وہ جہتیں جن کا ہم اپنے اندر مشاہدہ کرتے ہیں، اس کے کمال ہونے کی جہت سے ——— پس اگر اس ذکر کی صورت نامۂ اعمال میں ٹھہرتی ہے تو وہاں یہ معرفت کامل و مکمل ظاہر ہوتی ہے جبکہ اس کے کامل ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ پس وہ ذکر قُرب الٰہی کا ایک بڑا دروازہ کھولتا ہے" ——— اور اس معنی کی طرف نبی ﷺ نے اشارہ فرمایا ہے اپنے قول میں کہ "تسبیح آدھی ترازو ہے، اور الحمد للہ اس کو بھر دیتا ہے ——— اور اسی وجہ سے جملہ "سبحان اللہ وبحمدہ" زبان پر ہلکا، ترازو میں بھاری اور رحمان کو پیارا ہے ——— اور جو اس جملہ کو کہتا ہے: اس کے لئے کھجور کا ایک درخت لگایا جاتا ہے ——— اور اس شخص کے حق میں وارد ہوا ہے جو اس کو سو مرتبہ کہتا ہے: "اس سے اس کی لغزشیں اتار دی جاتی ہیں، گو وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں ——— اور نہیں لاتا کوئی شخص قیامت کے دن اُس سے افضل جو اس کو لایا ہے، مگر وہ جس نے اس کے مانند کہا یا اس سے زیادہ کیا ——— اور افضلِ کلام: وہ ہے جس کا اللہ نے اپنے فرشتوں کے لئے انتخاب فرمایا ہے ——— اور رہا راز آنحضرت ﷺ کے ارشاد: "سب سے پہلے جنت میں وہ لوگ بلائے جائیں گے جو خوش حالی اور تنگ حالی میں اللہ کی حمد کرتے ہیں" کا: تو وہ یہ ہے کہ حمد کرنے والوں کا عمل ثبوتی ہے، قُوی ثبوتیہ سے ابھرنے والا ہے۔ اور وہ ذکر کرنے والا: لوگوں میں سب سے زیادہ بہرہ ور ہے بہشتوں کی نعمتوں سے ——— اور راز آنحضرت ﷺ کے ارشاد: "بہترین دعا الحمد للہ ہے" کا: یہ ہے کہ دعا کی دو قسمیں ہیں، جیسا کہ ہم عنقریب ذکر کریں گے۔ اور الحمد للہ دونوں قسموں کے لئے مفید ہے۔ پس بیشک شکر نعمت کو بڑھاتا ہے۔ اور اس لئے کہ الحمد للہ ثبوتی عمل ہے ——— اور راز آنحضرت ﷺ کے ارشاد: "الحمد للہ: شکر کا سردار ہے" کا: یہ ہے کہ شکر: زبان اور دل اور اعضاء سے ہوتا ہے۔ اور زبان ان دو سے زیادہ واضح کرنے والی ہے۔

☆ ☆ ☆

تیسرا ذکر: تہلیل

تیسرا ذکر: لا إلٰـہ إلا اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) ہے۔ اس جملہ میں توحید اور شانِ یکتائی کا بیان ہے۔ اور یہی اس کا ظہر (ظاہری پہلو) ہے اور اس کے بطون (مخفی پہلو) بہت ہیں:

پہلا بطن: یہ جملہ شرک جلی کو دفع کرتا ہے۔ شرک جلی کی حقیقت اور اس کے مظاہر کا بیان مبحث ۵ باب ۲ و ۳ میں گذر چکا ہے۔

دوسرا بطن: یہ جملہ شرک خفی (عبادات میں ریاؤ سُمعہ) کو دفع کرتا ہے۔ جو شخص صرف اللہ کی معبودیت کا قائل ہے، وہ عبادت میں ریاء کو راہ نہیں دے سکتا۔

تیسرا بطن: یہ جملہ ان حجابات کو رفع کرتا ہے جو اللہ کی معرفت کی راہ میں حائل ہیں۔ درج ذیل دونوں روایتوں میں اسی بطن کا بیان ہے:

پہلی روایت: وہ ہے جو ابھی گذری کہ: ''تسبیح آدھی ترازو ہے۔ اور الحمد للہ اس کو بھر دیتا ہے'' اس روایت میں یہ بھی ہے: ''اور لا إلٰہ إلا اللہ کے لئے اللہ سے وَرے کوئی حجاب نہیں، یہاں تک کہ وہ کلمہ اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاتا ہے''

دوسری روایت: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: ''اے میرے رب! مجھے کوئی ایسا کلمہ تعلیم فرمائیں جس کے ذریعہ میں آپ کو یاد کروں'' یا یہ فرمایا کہ ''جس کے ذریعہ میں آپ کو پکاروں''۔ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: ''اے موسیٰ! لا إلٰـــہ إلا اللہ کہا کرو'' موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: ''اے میرے رب! یہ کلمہ تو آپ کے سارے ہی بندے کہتے ہیں۔ میں تو کوئی ایسا کلمہ چاہتا ہوں جو آپ خصوصیت سے مجھے ہی عطا فرمائیں'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اے موسیٰ! اگر ساتوں آسمان، اور وہ ساری کائنات جس سے آسمانوں کی آبادی ہے، میرے سوا، اور ساتوں زمینیں ایک پلڑے میں رکھی جائیں، اور لا إلٰہ إلا اللہ کو دوسرے پلڑے میں، تو لا إلٰہ إلا اللہ کا وزن ان سب سے زیادہ ہوگا'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۳۰۹)

تشریح: حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کلمہ کے پہلے دو بطن جانتے تھے۔ مگر اس کلمہ کا عموم: اس کی قدر و قیمت اور عظمت کے سلسلہ میں آپ کے لئے حجاب بن گیا۔ اور آپ نے اس بات کو بعید خیال کیا کہ وہ ذکر جو آپ نے مخصوص طور پر طلب کیا ہے: وہ یہ کلمہ ہو۔ چنانچہ وحی آئی اور صورتِ حال واضح کی گئی، اور آپ پر دو باتیں کھولی گئیں: ایک: یہ کہ اس کلمہ کا قائل کبھی غیر اللہ کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ اور اللہ کے سوا کوئی بھی چیز اس کی نگاہوں کے سامنے متمثل نہیں ہوسکتی۔ دوسری: یہ کہ یہ ذکر زمین وآسمان کی ساری کائنات کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی اور بھاری ہے (پہلی بات جو موسیٰ علیہ السلام پر کھولی گئی ہے: وہ اس کلمہ کا تیسرا بطن ہے)

کلمۂ توحید کی تشکیل اور اس کی فضیلت کی وجہ

چوتھا کلمہ توحید ہے: لا إلٰہ إلا اللّٰہ، وحدہ لاشریک لہ، لہ الملک ولہ الحمد، وھو علی کل شیئ قدیر۔ اس کلمہ کا پہلا جزء لا إلٰہ إلا اللہ: نفی واثبات کے مضامین پر مشتمل ہے۔ اس میں غیر اللہ سے الوہیت کی نفی اور صرف اللہ کے لئے الوہیت کا اثبات ہے۔ ان دونوں مضامین کو ذرا پھیلایا گیا۔ وحدہ لاشریک لہ سے نفی کی مزید تشریح کی گئی۔ اور لہ الملک، ولہ الحمد، وھو علی کل شیئ قدیر سے اثبات کی وضاحت کی گئی۔ اس طرح کلمۂ توحید تشکیل پایا۔ جس کی فضیلت میں درج ذیل روایت آئی ہے:

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے سو مرتبہ کہا: لاإلٰہ إلا اللہ وحدہ لاشریک لہ، لہ الملک ولہ الحمد، وھو علی کل شیئ قدیر (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی ساجھی نہیں۔ اسی کے لئے فرمانروائی ہے، اور اسی کے لئے ستائش ہے، اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے) تو وہ دس غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب کا مستحق ہوگا۔ اور اس کے لئے سو نیکیاں لکھی جائیں گی۔ اور اس کی سو برائیاں مٹائی جائیں گی۔ اور یہ عمل اس کے لئے اس دن شام تک شیطان سے حفاظت کا ذریعہ ہوگا۔ اور کسی آدمی کا عمل اس کے عمل سے افضل نہیں، بجز اس آدمی کے جس نے اُس سے بھی زیادہ یہ عمل کیا ہو'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۲۳۰۲)

تشریح: کلمۂ توحید مثبت ومنفی دونوں مضامین پر مشتمل ہے یعنی اس کلمہ سے دونوں پہلوؤں سے اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اور صفاتِ سلبیہ کے ذریعہ اللہ کی معرفت گناہوں کی معافی میں زیادہ کارگر ہے۔ اور صفاتِ ثبوتیہ کے ذریعہ معرفت: نیکیوں اور جزاؤں کے وجود میں زیادہ مفید ہے۔ اور یہ بات پہلے آچکی ہے کہ ثبوتی معرفت اہم ہے چنانچہ کلمۂ توحید کی فضیلت میں دونوں باتوں کا لحاظ کیا گیا ہے۔

> ومنها: لا إلٰه إلا الله: وله بطون كثيرة: فالبطن الأول: طردُ الشرك الجليّ، والثاني: طردُ الشرك الخفيّ، والثالث: طردُ الحُجُبِ المانعة عن الوصول إلى معرفة الله، وإليه الإشارة فى قوله صلى الله عليه وسلم: " لا إلٰه إلا الله: ليس لها حجاب دون الله حتى تَخْلُصَ إليه"
>
> وكان موسى عليه السلام يعرف من بطونها البطنَيْنِ الأولين، فاستبعد أن يكونَ الذكرُ الذى يَخُصُّه الله به ذاك، فأوحى الله إليه جَلِيَّةَ الحال، وكشف عليه: أنه طارد كلَّ ماسوى الله تعالى عن مُسْتَنِّ الإيثار، وعن التمثل بين عينيه، وأنه لو وُضع جميعُ ماسواه فى كفة، وهذه فى كفة لَمَالَتْ بهن: فإنه يَطْرُدُهن ويحقِّرهن.
>
> والتهليلةُ مع تفصيلٍ مَّا للنفى والإثبات، وهى: " لا إلٰه إلا الله، وحده لاشريك له، له الملك وله

الحمد، وهو على كل شيئ قدير" ورد في فضل من قالَها مائةً:" كانت له عدل عشر رقاب" إلخ.
وذلك: لأنها جامعةٌ بين المعرفة الثبوتية والسلبية، والسلبيةُ أقرب لمحو الذنوب، والثبوتيةُ أفيدُ لوجود الحسنات، وتمثُّلِ الأجزيةِ.

ترجمہ: اوراذکار میں سے: لا إلــٰـه إلا الله ہے۔ اوراس کے بہت بطون ہیں۔ پس بطنِ اول: شرک جلی کا دفعیہ ہے۔ اوردوم: شرکِ خفی کا دفعیہ ہے۔ اورسوم: اُن حجابات کا دفعیہ ہے جو اللہ کی معرفت تک پہنچنے سے روکنے والے ہیں۔ اوراس (بطن سوم) کی طرف اشارہ ہے.......... اورموسیٰ علیہ السلام جانتے تھے اس کلمہ کے بطون میں سے پہلے دو بطنوں کو۔ پس انھوں نے بعید سمجھا کہ وہ ذکر جس کے ساتھ اللہ نے ان کو خاص کیا ہے: وہ یہ ہو۔ پس وحی کی اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف واضح صورتِ حال کی۔ اوران پر یہ بات کھولی کہ (۱) وہ ذکر (لا إلــٰـه إلا الله) دفع کرنے والا ہے کسی بھی غیر اللہ کو ترجیح دینے کی راہ سے، اوراس کی دونوں آنکھوں کے سامنے متمثل ہونے سے (۲) اور یہ بات کہ وہ کلمہ: اگر رکھی جائیں تمام وہ چیزیں جو اللہ کے سوا ہیں ایک پلڑے میں، اور (رکھا جائے) یہ کلمہ دوسرے پلڑے میں تو ضرور یہ پلڑا جھک جائے گا اس کلمہ کی وجہ سے۔ پس بیشک وہ ذکر ان سب کو (جو مقابل پلڑے میں ہیں) دفع کردے گا اوران کو ہیچ کردے گا۔

اور لا إله إلا الله نفی واثبات کی کچھ تفصیل کے ساتھ —— اور وہ (چوتھا کلمہ) لا إله إلا الله إلخ ہے۔ آیا ہے اس شخص کی فضیلت میں جو اس کو سو مرتبہ کہے: "ہوگا وہ کلمہ اس کے لئے دس غلاموں کے برابر" الی آخرہ —— اور وہ فضیلت اس لئے ہے کہ وہ کلمہ ثبوتی اور سلبی معرفت کے درمیان جامع ہے۔ اور سلبی معرفت گناہوں کو مٹانے میں اقرب ہے۔ اور ثبوتی معرفت نیکیوں کے پائے جانے میں اور ثوابوں کے متمثل ہونے میں زیادہ مفید ہے۔

لغات: خلص إليه: پہنچنا...... جلية الحال: واضح صورتِ حال...... مُسْتَنّ: طریق، راستہ...... الإيثار: ترجیح دینا یعنی اللہ کی محبت کو غیر اللہ کی محبت پر ترجیح دینا۔ مخطوطہ کراچی کے حاشیہ میں ہے: الإيثار: هنا عبارة عن اختيار محبة الله على سواه...... طارد: اسم فاعل ہے اور كلَّ ماسوى الله اس کا مفعول ہے...... والتهليلة مع إلخ: مبتداء ہے، اور ورد إلخ اس کی خبر ہے اور وهي جملہ معترضہ ہے، اور ما تقلیل کے لئے ہے اور للنفي والإثبات متعلق ہیں تفصیل سے...... الأجزية: جمع الجزاء: کسی چیز کا بدلہ۔

☆ ☆ ☆

چوتھا ذکر: تکبیر

چوتھا ذکر: الله أكبر (اللہ سب سے بڑا) ہے۔ اس ذکر کے ذریعہ اللہ کی عظمت وقدرت اور سطوت وشوکت کو پیش نظر لایا جاتا ہے۔ اور یہ جملہ اللہ کی مثبت معرفت کی طرف مشیر ہے۔ حدیث شریف میں اس کی فضیلت یہ آئی ہے کہ: "اللہ

أکبر: آسمان وزمین کو بھر دیتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۲۳۲۲)

کلماتِ اربعہ پر مشتمل ذکر کے فضائل: گذشتہ چاروں اذکار پر مشتمل ذکر کے فضائل یہ ہیں:

پہلی روایت: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بہترین کلام چار ہیں: سبحان اللہ اور الحمدللہ اور لا إلٰہ إلا اللہ اور أللہ أکبر'' (مشکوۃ حدیث ۲۲۹۴)

دوسری روایت: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کو سب سے زیادہ محبوب چار کلمات ہیں: سبحان اللہ اور الحمدللہ اور لا إلٰہ إلا اللہ اور أللہ أکبر'' اور آپ جونسے کلمہ سے چاہیں شروع کریں، اس میں کوئی مضائقہ نہیں'' (حوالہ بالا)

تیسری روایت: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''شب معراج میں میری ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی۔ آپ نے فرمایا: ''محمد! اپنی امت کو میری طرف سے سلام کہنا اور انہیں بتلانا کہ جنت کی زمین زرخیز ہے، اس کا پانی شیرین ہے مگر وہ چٹیل ہے اور اس کے پودے: سبحان اللہ اور الحمدللہ اور لا إلٰہ إلا اللہ اور أللہ أکبر ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۲۳۱۵)

ایک اور چار کلماتی ذکر کی فضیلت اور اس کی وجہ

حدیث —— ام المؤمنین حضرت جُویریہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن نمازِ فجر پڑھنے کے بعد ان کے پاس سے باہر نکلے، وہ اُس وقت اپنی نماز پڑھنے کی جگہ میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھیں۔ پھر آپؐ دیر کے بعد جب چاشت کا وقت ہو چکا تھا واپس تشریف لائے۔ حضرت جویریہ اسی طرح بیٹھی اپنے وظیفہ میں مشغول تھیں۔ آپ نے دریافت کیا: ''میں جب سے تمہارے پاس سے گیا ہوں، کیا تم اس وقت سے برابر اسی حال میں اور اسی طرح پڑھ رہی ہو؟'' انھوں نے جواب دیا: جی ہاں! آپؐ نے فرمایا: ''تمہارے پاس سے جانے کے بعد میں نے چار کلمے تین دفعہ کہے، اگر وہ تمہارے اس پورے وظیفہ کے ساتھ تولے جائیں، جو تم نے آج صبح سے پڑھا ہے، تو ان کا وزن بڑھ جائے گا۔ وہ کلمات یہ ہیں: سبحان اللہ وبحمدہ عَدَدَ خَلْقِهِ، وَرِضَاءَ نَفْسِهِ، وَزِنَةَ عَرْشِهِ، وَمِدَادَ كَلِمَاتِهِ (اللہ پاک ہیں اور اپنی خوبیوں کے ساتھ متصف ہیں، اپنی مخلوقات کی تعداد کے برابر، اور اپنے عرش کے وزن کے برابر، اور اپنی ذات کی خوشنودی کے برابر اور اپنی باتوں کی تعداد کے برابر) (مشکوۃ حدیث ۲۳۰۱)

تشریح: مذکورہ ذکر کے بے حد ثواب کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی عمل کی صورت نامۂ اعمال میں ٹھہرتی ہے یعنی وہ عمل مقبول قرار پاتا ہے تو بوقتِ جزاء اس کی کشادگی اور اس کی پہنائی اس کلمہ کے معنی کے بقدر ہوتی ہے۔ پس جب ذکر میں عَدَدَ خلقِه اور اس جیسے جملے ہیں تو اس کی فراخی انہی کے بقدر ہوگی۔

لطیفہ: ایک بادشاہ نے ایک عالم کو: سامنے بھرے رکھے طباق میں سے ایک کھجور عنایت فرمائی۔ انھوں نے ﴿ثانی اثنین﴾ (التوبہ آیت ۴۰) پڑھا تو بادشاہ نے دوسری کھجور دی۔ انھوں نے ﴿ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ﴾ (المائدہ ۷۳) پڑھا تو تیسری دی۔

انھوں نے ﴿ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ ﴾ (النور۴) پڑھا تو چوتھی دی۔ انھوں نے ﴿ وَلَا خَمْسَةٍ ﴾ (المجادلہ۷) پڑھا تو ایک اور دی۔ انھوں نے ﴿ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ ﴾ (المجادلہ۷) پڑھا تو چھٹی دی۔ انھوں نے ﴿وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ ﴾ (الکہف۲۲) پڑھا تو ساتویں دی۔ انھوں نے ﴿ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ﴾ (الکہف۲۲) پڑھا تو آٹھویں دی۔ انھوں نے ﴿ وَتِسْعَةُ رَهْطٍ ﴾ (النمل ۴۸) پڑھا تو ایک اور دی۔ انھوں نے ﴿تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ﴾ (البقرہ۱۹۶) پڑھا تو دس مکمل کیں۔ انھوں نے ﴿ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا ﴾ (یوسف۴) پڑھا تو گیارہ کیں۔ انھوں نے ﴿وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا ﴾ (المائدہ۱۲) پڑھا تو بارہویں دی۔ پھر انھوں نے ﴿ ثَمَانِين جلدة ﴾ (النور۴) پڑھا تو بادشاہ نے پورا طباق الٹ دیا۔ اور کہا کہ اب آپ: ﴿ مِـأَةَ جَلْدَةٍ ﴾ پڑھیں گے۔ پھر: ﴿ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ﴾ پھر ﴿يَغْلِبُوْا أَلْفًا ﴾ پھر ﴿يغلبوا ألفين ﴾ اور آخر میں ﴿ وهم ألوف ﴾ پڑھیں گے۔ میں کہاں تک دونگا! ـــــ مگر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ بے نہایت ہے۔ وہ بے پناہ خزانوں کے مالک ہیں۔ وہ ذکر کی وسعت کے بقدر ثواب عنایت فرماتے ہیں: إن الله يرزق من يشاء بغير حساب۔

ملحوظہ: چار کلمات اس طرح ہیں کہ تسبیح وتحمید کے بعد کے ہر کلمہ کو الگ الگ ان کے ساتھ جوڑا جائے۔

فائدہ: جس شخص کا مقصود: ذکر سے اپنے باطن کو ذکر کے رنگ میں رنگنا ہو یعنی باطن میں احسانی کیفیت (نسبت یاد داشت) پیدا کرنا مقصود ہو، اس کے لئے ذکر کی کثرت مناسب ہے۔ اور جس کے پیش نظر ثواب حاصل کرنا ہو، اس کو ذکر کے ایسے کلمات منتخب کرنے چاہئیں جو معنوی لحاظ سے فائق اور ہمہ گیر ہوں۔ (یہ فائدہ کتاب میں ہے)

سوال: اگر مذکورہ ذکر تین بار کرنا دیگر اذکار سے بہتر ہے تو کثرت ذکر کا اہتمام اور اوقات کو ذکر میں مشغول کرنے کی بات بے فائدہ ہے؟!

جواب: نہیں! کثرت ذکر کی فضیلت اپنی جگہ مسلّم ہے، مگر وہ فضیلت بایں اعتبار ہے کہ اس سے نسبت احسانی پیدا ہوتی ہے۔ اور مذکورہ ذکر کی فضیلت دوسرے اعتبار سے ہے۔ اور وہ ثواب کی زیادتی ہے۔ اور حدیث جویریہؓ کی غرض: زیادہ ثواب حاصل کرنے کے آسان طریقہ کی تعلیم دینا ہے۔ خاص طور پر مشغول لوگوں کو، جو ذکر اللہ کے لئے زیادہ وقت فارغ نہیں کر سکتے۔ ان کو یہ ذکر بتایا گیا ہے۔ وہ اس ذکر کے ذریعہ بڑا ثواب حاصل کر سکتے ہیں۔

مرکب اذکار کا راز: احادیث میں لا إله إلا الله کے ساتھ دیگر کلمات کو ملا کر اذکار ترتیب دیئے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو ذکر مختلف کلمات سے مرکب ہوتا ہے: اس ذکر کے وقت نفس ذکر کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اگر ایک ہی کلمہ بار بار ادا کیا جاتا ہے تو ذہن معنی سے ہٹ جاتا ہے اور وہ ذکر محض ایک آواز ہو کر رہ جاتا ہے۔

> ومنها: الله أكبر: وفيه ملاحظة عظمته، وقدرته، وسلطانه، وهو إشارة إلى معرفة ثبوتية، ولذلك ورد في فضله:" أنه يملأ ما بين السماء والأرض"
>
> وهذه الكلمات الأربع أفضلُ الكلام، وأحبُّه إلى الله، وهي غِراسُ الجنة.

وسِرُّ حديثِ جويرية: ”لقد قلتُ بعدَكِ أربعَ كلماتٍ ثلاثَ مرات: لو وُزِنَتْ بما قلتِ منذُ اليومِ لَوَزَنَتْهُنَّ: سبحان الله وبحمده: عددَ خلقه، ورِضَاءَ نفسه، وزِنَةَ عرشه، ومِدَادَ كلماته“: أن صورةَ العمل إذا استقرَّتْ في الصحيفة: كان انفساحُها وانشراحُها عند الجزاء حسب معنى تلك الكلمة؛ فإن كانت فيه كلمةٌ مثلُ: ”عدد خلقه“ كان انفساحُها مثلَ ذلك.

واعلم أن من كان أكثرُ ميله إلى تلوُّن النفس بلون معنى الذكر، فالمناسب في حقه إكثار الذكر، ومن كان أكثرُ ميلِه إلى محافظة صورةِ العمل في الصحيفة، وظهورِها يومَ الجزاء، فالأنفعُ في حقه اختيارُ ذكرٍ رَابٍ على الأذكار بالكيفية.

وليس لأحد أن يقول: إذا كانت هذه الكلماتُ ثلاث مرات أفضلَ من سائر الأذكار: يكون الاعتناء بكثرة الأذكار، واستعيابُ الأوقات فيها ضائعًا؟ لأن الفضل إنما هو باعتبار دون اعتبار؛ وكأنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم أرشد جويريةَ رضي الله عنها إلى أقرب الأعمال، ورغَّب في ذلك ترغيبا بليغًا.

والسرُّ فيما سنَّه النبي صلى الله عليه وسلم في الذكر: من ضم الله أكبر وسائر الألفاظ مع التهليل: أن يُنَبِّهَ النفس للذكر، ولايكون لقلقةُ لسانٍ.

ترجمہ: اوراذ کار میں سے: الله أكبر ہے۔اوراس میں اللہ کی عظمت، ان کی قدرت اوران کے سطوت کوپیش نظر لانا ہے۔اوروہ ذکر معرفتِ ثبوتیہ کی طرف اشارہ ہے۔اوراسی وجہ سے آیا ہے اس کی فضیلت میں کہ: ”وہ اس فضاء کو بھر دیتا ہے جو آسمان وزمین کے درمیان ہے“ —— اور یہ چار کلمات بہترین کلام ہیں۔اوراللہ کو بہت زیادہ محبوب ہیں۔اوروہ جنت کے پودے ہیں —— اورراز جویریہؓ کی حدیث: ”بخدا! میں نے تمہارے بعد کہے ہیں چار کلمات تین بار، اگرتولے جائیں وہ اس کے ساتھ جوتم نے کہے ہیں شروع دن سے تو وہ ضروران سے بھاری ہوجائیں گے وہ کلمات: سبحان الله وبحمده إلخ ہیں، ان کا راز یہ ہے کہ عمل کی صورت جب نامۂ اعمال میں ٹھہرتی ہے، تو ہوتی ہے اس کی کشادگی اوراس کی وسعت بوقتِ ثواب اس کلمہ کے معنی کے موافق۔پس اگراس میں عَدَدَ خَلْقِه جیسا کلمہ ہوتو اس کلمہ کی کشادگی اس کے معنی کے مانند ہوتی ہے —— اور جان لیں کہ وہ شخص جس کا زیادہ میلان: نامۂ اعمال میں عمل کی صورت کی نگہداشت کی طرف اور بروز جزاء اس صورت کے ظہور کی طرف ہو: پس اس کے حق میں زیادہ مفید ایسے ذکر کو اختیار کرنا ہے جو کیفیت کے ذریعہ اذکار پر فائق ہو۔

اورکسی کے لئے درست نہیں کہ کہے: ”جب یہ کلمات تین بار کہنا دیگر اذکار سے بہتر ہے، تو کثرتِ اذکار کا اوراوقات کو اذکار میں گھیرنے کا اہتمام بے کار ہوگا؟“ اس لئے کہ وہ فضیلت ایک اعتبار سے ہے، نہ کہ دوسرے اعتبار سے۔اور گویا

نبی ﷺ نے جویریہؓ کی راہ نمائی کی قریب ترین عمل کے طرف، اور ترغیب دی اس کی بہت زیادہ ترغیب۔

اور راز اس بات میں جس کو نبی ﷺ نے ذکر میں مسنون کیا ہے یعنی اللہ اکبر اور دیگر کلمات کو ملانا لا إلــٰه إلا الله کے ساتھ: یہ ہے کہ وہ (مرکب ذکر) نفس کو چوکنا کرے اور وہ زبان کا لقلقہ نہ ہو۔

☆ ☆ ☆

پانچواں ذکر: فوائد طلبی اور پناہ خواہی

پانچواں ذکر: ایسی دعائیں ہیں جن میں ایسی مفید چیزیں طلب کی گئی ہیں جو جسم یا روح کے لئے مفید ہیں۔ خلقت کے اعتبار سے نفع ہو یا دل کے سکون کے اعتبار سے۔ جیسے آنکھوں کا نور اور دل کا سرور طلب کرنا۔ اور خواہ ان باتوں کا تعلق اہل وعیال سے ہو یا جاہ ومال سے۔ اور انہی چیزوں کے تعلق سے مضرات سے پناہ چاہنا۔

اور ان اذکار کی مشروعیت کی وجہ: عالم میں اللہ تعالیٰ کی اثر اندازی کا مشاہدہ کرنا، اور غیر اللہ سے طاقت وقوت کی نفی کرنا ہے۔ یعنی یہ بات پیش نظر لانا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ تابع فرمان ہے۔ اور سب کچھ کرنے والے اللہ تعالیٰ ہیں۔ ان کے سوا کسی کے بس میں کچھ نہیں۔ جب بندے کا یہ ذہن بن جائے گا تو وہ ہر چیز اللہ ہی سے مانگے گا اور انہی پر بھروسہ کرے گا۔ اس طرح دعاؤں میں ذکر کا پہلو بھی ہے اور عبادت کا بھی۔

چند جامع دعائیں: جن میں اللہ تعالیٰ سے مفید باتیں طلب کی گئی ہیں:

پہلی دعا: رسول اللہ ﷺ یہ دعا فرمایا کرتے تھے: اللّٰهم! أَصْلِحْ لِیْ دِیْنِیَ الذی هو عِصْمَةُ أَمْرِیْ، وأصلح لی دُنْیَایَ التی فیها مَعَاشِیْ، وأصلح لی آخِرَتِیَ التی فیها معادی، واجْعَلِ الحیاةَ زیادةً لی فی کل خیر، واجْعَلِ الموتَ راحةً لی من کل شَرٍّ: الٰہی! میرے لئے میرا دین سنوار دے جو میرے معاملہ کا بچاؤ ہے یعنی جس پر میری دنیوی اور اخروی صلاح وفلاح کا مدار ہے۔ اور میرے لئے میری دنیا سنوار دے جس میں مجھے زندگی بسر کرنی ہے یعنی رزق وغیرہ ضرورتیں حلال راستوں سے پوری فرما۔ اور میرے لئے میری آخرت سنوار دے جس کی طرف مجھے لوٹنا ہے، اور زندگی کو میرے لئے ہر خیر میں زیادتی کا ذریعہ بنادے، اور موت کو میرے لئے ہر برائی سے راحت کا وسیلہ بنادے (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۸۳)

دوسری دعا: اللّٰهم! إنی أسألك الهُدی والتُّقٰی والعَفافَ والغِنٰی: الٰہی! میں آپ سے ہدایت، پرہیزگاری، پاکدامنی اور بے احتیاجی مانگتا ہوں۔ ہدایت: راہِ حق پر چلنا اور استقامت سے چلتے رہنا۔ تقویٰ: اللہ سے ڈرنا اور گناہوں سے بچنا۔ عفّت: پارسائی اور پاکدامنی۔ غنیٰ: دل کی بے نیازی اور مخلوق کا دست نگر نہ ہونا۔ اپنے مولیٰ کی عطاؤں پر مطمئن رہنا (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۸۴)

تیسری دعا: حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ دعا کیا کر: اللّٰهمَّ! اهْدِنِیْ

وَسَدِّدْنِیْ: الٰہی! مجھے راہِ راست دکھا، اور (افعال وگفتار میں) مجھے سیدھا کر۔ اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''ہدایت طلبی'' میں سیدھی راہ پر چلنے کا تصور کرو، اور ''راستی'' سے تیر جیسی راستی کا خیال کرو (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۸۵)

چوتھی دعا: جب کوئی شخص ایمان لاتا تھا تو رسول اللہ ﷺ اس کو نماز اور یہ دعا سکھاتے تھے: اللّٰھم! اغْفِرْلی وارْحَمْنِیْ واھْدِنِیْ وعَافِنِیْ وَارْزُقْنِیْ: الٰہی! میری بخشش فرما، مجھ پر مہربانی فرما، اور مجھے راہِ راست دکھا، اور مجھے عافیت سے رکھ اور مجھے روزی عطا فرما (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۸۶)

پانچویں دعا: نبی ﷺ اکثر یہ دعا کیا کرتے تھے: اللّٰھم! آتِنا فی الدنیا حسنةً وفی الآخرة حسنةً وقِنا عذابَ النار: الٰہی: ہمیں دنیا میں بھلائی عطا فرما، اور آخرت میں بھلائی عطا فرما، اور ہمیں دوزخ کی آگ سے بچا (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۸۷)

چھٹی دعا: آنحضرت ﷺ کی ایک دعا یہ بھی ہے: رَبِّ! أَعِنِّیْ ولاَتُعِنْ عَلَیَّ، وانْصُرْنی ولا تَنْصُرْ علیَّ، وامْکُرْلِیْ وَلاَتَمْکُرْ عَلَیَّ، واھْدِنِی وَیَسِّرِ الْھُدیٰ لی، وانْصُرْنِی علٰی من بَغٰی علیَّ، ربِّ اجْعَلْنِیْ لك شاکِرًا، لك ذاکرًا، لك رَاھِبًا، لك مِطْوَاعًا، لك مُخْبِتًا، إلیك أَوَّاھًا مُنِیبًا، رَبِّ! تَقَبَّلْ تَوْبَتِیْ، وَاغْسِلْ حَوْبَتِیْ، وَأَجِبْ دعوتی، وثَبِّتْ حُجَّتِی، وسَدِّدْ لسانی، واھْدِ قلبی، واسْلُلْ سَخِیْمَةَ صدری: اے میرے رب! میری مدد فرما اور میرے خلاف مدد نہ فرما۔ اور میری حمایت فرما اور میرے خلاف حمایت نہ فرما۔ اور میرے لئے خفیہ تدبیر فرما اور میرے خلاف خفیہ تدبیر نہ فرما۔ اور مجھے راہِ راست پر چلا۔ اور میرے لئے سیدھے راستہ پر چلنا آسان فرما۔ اور اس شخص کے خلاف میری مدد فرما جو مجھ پر زیادتی کرے۔ پروردگار! مجھے اپنا شکر گزار بنا۔ اپنا ذکر شعار بنا۔ آپ سے ڈرنے والا بنا۔ آپ کا خوب فرمانبردار بنا۔ آپ کے سامنے نیازمندی سے جھکنے والا بنا۔ آپ کے سامنے زاری کرنے والا رجوع ہونے والا بندہ بنا۔ پروردگار! میری توبہ قبول فرما۔ میرے گناہوں کو دھو ڈال۔ میری دعا قبول فرما۔ میری دلیل کو مضبوط فرما۔ میری زبان کو ٹھیک چلا۔ میرے دل کو راہِ راست دکھا۔ اور میرے سینہ کی سیاہی (کینہ، حسد، بغض وغیرہ) کو آہستہ آہستہ نکال دے (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۸۸)

ساتویں دعا: آنحضرت ﷺ کی دعاؤں میں یہ دعا بھی تھی: اللھم ارْزُقْنِی حُبَّك، وحُبَّ مَن یَّنْفَعُنِی حُبُّه عِنْدَكَ، اللھم مَا رَزَقْتَنِی مِمَّا أُحِبُّ فَاجْعَلْه قُوَّةً لی فیما تُحِبُّ، وَمَا زَوَیْتَ عَنِّیْ مِمَّا أُحِبُّ فَاجْعَلْهُ فَرَاغًا لِیْ فِیْمَا تُحِبُّ: الٰہی! مجھے اپنی محبت عطا فرما۔ اور اپنے ان بندوں کی محبت عطا فرما جن کی محبت میرے لئے آپ کے نزدیک سودمند ہو۔ اے اللہ! میری چاہت اور رغبت کی جو چیزیں آپ نے مجھے عطا فرمائی ہیں، اُن سے مجھے ان کاموں میں تقویت پہونچا جو آپ کو پسند ہیں۔ اور میری رغبت کی جو چیزیں آپ نے مجھ سے روک لی ہیں، تو اس نہ دینے کو میرے لئے فرصت کے لمحات بنا جن کو میں آپ کے پسندیدہ کاموں میں خرچ کروں (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۹۱)

آٹھویں دعا: مجلس سے اٹھنے سے پہلے عام طور پر رسول اللہ ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے: اللهم اقْسِمْ لَنَا من خَشْيَتِكَ مَاتَحُوْلُ به بيننا وبين مَعَاصِيْكَ، ومن طاعتِك ما تُبَلِّغُنَا به جَنَّتَكَ، ومن اليقين ما تُهَوِّنُ به علينا مُصِيْبَاتِ الدنيا، ومَتِّعْنَا بِأَسْمَاعِنَا وَأَبْصارِنَا وقُوَّتِنَا ما أَحْيَيْتَنَا، واجْعَلْهُ الوارثَ منا، واجعلْ ثَأْرَنَا على من ظَلَمَنَا، وانصُرْنَا على من عَادَانَا، ولا تَجْعَلْ مُصِيْبَتَنَا فى دِيْنِنَا، وَلَاتَجْعَلِ الدنيا أَكْبَرَ هَمِّنَا، ولامَبْلَغَ عِلْمِنَا، وَلَاتُسَلِّطْ علينا من لايَرْحَمُنَا: الٰہی! ہمیں اپنے ڈر میں سے اتنا نصیب فرما جس کے ذریعہ آپ ہمارے درمیان اور آپ کے گناہوں کے درمیان حائل ہوجائیں، اور اپنی اطاعت میں سے اتنا جس کے ذریعہ آپ ہمیں اپنی بہشت میں پہنچائیں۔ اور یقین میں سے اتنا جس کے ذریعہ آپ ہم پر دنیا کے مصائب آسان کردیں۔ اور ہمیں بہرہ مند فرما ہماری سماعت، بصارت اور قوت سے جب تک آپ ہمیں زندہ رکھیں، اور اس بہرہ مندی کو ہمارا وارث بنا (یعنی آخر عمر تک اس کو باقی رکھ یعنی زندگی بھر ہمارے اعضاء اور حواس کو سلامت رکھ) اور ہمارا بدلہ اس پر گردان جس نے ہم پر ظلم کیا (یعنی ظالموں سے بدلہ لینے پر ہمیں قدرت عطا فرما) اور ہماری ان لوگوں کے خلاف مدد فرما جو ہم سے دشمنی رکھتے ہیں۔ اور ہماری مصیبت ہمارے دین میں نہ گردان (یعنی ایسے کاموں میں مبتلا نہ فرما جو نقصانِ دین کا باعث بنیں) اور دنیا کو ہماری بڑی فکرمندی اور ہمارے علم کا منتہی نہ بنا (یعنی ہماری ساری دوڑ دھوپ دنیا کے لئے نہ ہو، اور ہمارا سارا علم دنیا کی نذر ہوکر نہ رہ جائے) اور ہم پر اس شخص کو مسلط نہ فرما جو ہم پر رحم نہ کرے (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۹۲)

دعواتِ استعاذہ

مذکورہ دعائیں وہ ہیں جن میں اللہ تعالیٰ سے دنیوی یا اُخروی، روحانی یا جسمانی، انفرادی یا اجتماعی بھلائی طلب کی گئی ہے۔ ذیل میں وہ دعائیں ذکر کی جاتی ہیں جن میں دنیا یا آخرت کے کسی شر سے اور کسی بلا اور آفت سے پناہ مانگی گئی ہے اور حفاظت کی استدعا کی گئی ہے۔

پہلی دعا: أَعُوْذُ بالله من جَهْدِ الْبَلَاءِ، وَدَرْكِ الشَّقَاءِ، وسُوْءِ الْقَضَاءِ، وَشَمَاتَةِ الْأَعْدَاءِ ترجمہ: اللہ کی پناہ چاہتا ہوں بلاؤں کی سختی سے (یعنی سخت بلاؤں سے) اور بدبختی لاحق ہونے سے اور فیصلۂ خداوندی کے ضرر سے اور دشمنوں کے خوشیاں منانے سے (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۵۷)

دوسری دعا: اللهم! إنى أعوذ بك من الهَمِّ والحُزْنِ، والعَجْز والْكَسَل، والجُبْن والبُخْل، وضَلَع الدين، وغَلَبَة الرجال ترجمہ: الٰہی! پناہ چاہتا ہوں فکر وغم، بے طاقتی وکاہلی، بزدلی وبخیلی، قرض کے بار اور لوگوں کے دباؤ سے (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۵۸)

تیسری دعا: اللهم! إنى أعوذ بك من الكَسَل، والهَرَم، والمَغْرَم، والمَأْثَم. اللهم! إنى أعوذ بك من

عذاب النار، وفتنة النار، وفتنة القبر، وعذاب القبر، ومن شر فتنة الغِنٰى، ومن شر فتنة الفقر، ومن شر فتنة المسيح الدجال. اللهم! اغْسِلْ خَطَايَایَ بماء الثَّلْجِ و الْبَرَدِ، ونَقِّ قلبی كما يُنَقَّى الثوبُ الأبيضُ من الدَّنَسِ، وبَاعِدْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ خَطَايَایَ كَما بَاعَدتَّ بين المشرق والمغرب: اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں کاہلی، انتہائی پیری، دَین داری اور گناہ سے۔ اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں دوزخ کے عذاب، دوزخ کی آزمائش (آزار) قبر کی آزمائش اور قبر کے عذاب سے۔ اور مالداری کی بری آزمائش سے۔ اور محتاجی کی بری آزمائش سے۔ اور مسیح دجال کی بری آزمائش سے۔ اے اللہ! میری لغزشیں دھودے اولے اور برف کے پانی سے۔ اور میرے دل کو صاف کردے جس طرح سفید کپڑا میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے۔ اور میرے اور میری لغزشوں کے درمیان اتنی دوری کردے جتنی مشرق ومغرب کے درمیان دوری ہے (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۵۹)

چوتھی دعا: اللهم! آتِ نَفْسِیْ تَقْوَاهَا، وزَكِّهَا أَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكّٰهَا، أَنْتَ وَلِيُّهَا ومَوْلاَهَا. اللهم! إنی أعوذ بك من علمٍ لا يَنْفَعُ، ومن قَلْبٍ لاَ يَخْشَعُ، ومن نفسٍ لا تَشْبَعُ، ومن دَعْوَةٍ لا يُسْتَجَابُ لها: اے اللہ! میرے نفس کو تقوی عطا فرما۔ اور اس کا تزکیہ فرما، آپ ہی سب سے اچھا تزکیہ فرمانے والے ہیں۔ آپ ہی اس کے والی اور مولیٰ ہیں۔ اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں ایسے علم سے جو سودمند نہ ہو، اور ایسے دل سے جو نیازمند نہ ہو، اور ایسے نفس سے جو سیر نہ ہو، اور ایسی دعا سے جو قبولیت سے سرفراز نہ کی جائے (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۶۰)

پانچویں دعا: اللهم! إنی أعوذبك من زَوَالِ نِعْمَتِك، ومن تَحَوُّلِ عَافِيَتِكَ، ومن فُجَاءَ ةِ نَقْمَتِكَ، وجَمِيْعِ سَخَطِكَ: اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں آپ کی نعمتوں کے زوال سے، اور آپ کی عافیت کے پھر جانے سے، اور آپ کے انتقام کی ناگہانی سے اور آپ کی ہر ناراضی سے (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۶۱)

چھٹی دعا: اللهم! إنی أعوذ بك من الفَقْرِ والقِلَّةِ، والذِّلَّةِ، وأعوذ بك من أَنْ أَظْلِمَ أو أُظْلَمَ: اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں محتاجی، کمی اور رسوائی سے۔ اور میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ میں ظلم کروں یا مجھ پر ظلم کیا جائے (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۶۷)

ومنها: سؤال ما ينفعه فی بدنه أو نفسه باعتبار خَلْقه، أو باعتبارِ حصولِ السكينة، أو تدبيرِ منزله ومالِه وجاهِه، وتَعَوُّذِه عما يضرُّه كذلك.

والسرُّ فيه: مشاهدةُ تأثير الحق فی العالم، ونفی الحول والقوة عن غيره.

ومن أجمع ما سنَّه النبیُّ صلى الله عليه وسلم فی الباب:

[۱] اللهم أصلح لی دينی الذی هو عِصْمة أمری، واصلح لی دنيای التی فيها معاشی، وأصلح لی آخرتی التی فيها معادی، واجعل الحياةَ زيادة لی فی كل خير، واجعل الموت راحة

لی من کل شر.

[۲] اللهم إنی أسألك الهدی والتقی والعفاف والغنی.

[۳] اللهم اهْدِنی وسَدِّدنی – وقال–: واذكُرْ بالهُدی هدایتَك الطریقَ، وبالسَّدَادِ سدادَ السهم.

[٤] اللهم اغفرلی وارحمنی واهدنی وعافنی وارزقنی.

[٥] اللهم ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة وقنا عذاب النار.

[٦] رب أعنی، ولا تعن علیَّ، وانصرنی ولاتنصر علیّ، وامكُر لی ولا تمكر علیّ، واهدنی ویَسِّرِ الهدی لی، وانصرنی علی من بغیٰ علیّ، رب اجعلنی لك شاكرًا، لك ذاكرًا، لك راهبًا، لك مِطْواعا، لك مخبتًا، إلیك أَوَّاها منیبًا، رب تقبل توبتی، واغسل حوبتی، وأجِبْ دعوتی، وثَبِّتْ حجتی، وسدِّد لسانی، واهد قلبی، واسلُلْ سخیمةَ صدری.

[۷] اللهم ارزقنی حبك، وحبَّ من ینفعنی حبُّه عندك، اللهم ما رزقتنی مما أُحب فاجعله قوة لی فیما تحب، اللهم ما زَوَیْتَ عنی مما أُحب فاجعله فراغا لی فیما تحب.

[۸] اللهم اقسم لنا من خشیتك ما تحول به بینناوبین معاصیك، ومن طاعتك ما تبلِّغنا به جنتك، ومن الیقین ما تهوِّن به علینا مصیباتِ الدنیا، ومتعنا بأسماعنا وأبصارنا وقوتنا ما أحییتنا، واجعله الوارث منا، واجعل ثأرنا علی من ظلمنا، وانصرنا علی من عادانا، ولاتجعل مصیبتنا فی دیننا، ولا تجعل الدنیا أكبرَ همنا، ولا مبلغ علمنا، ولا تسلط علینا من لایرحمنا.

ومن أجمع ما سنَّه النبی صلی الله علیه وسلم فی الاستعاذة:

[۱] أعوذ بالله من جَهْدِ البلاء، وَدَرْكِ الشقاء، وسوء القضاء، وشماتة الأعداء.

[۲] اللهم إنی أعوذ بك من الهم والحُزْن والعَجْز والكَسَل والجُبْنِ والبخل وضَلَع الدین وغَلَبة الرجال.

[۳] اللهم إنی أعوذ بك من الكَسَل، والهَرَم، والمَغْرَم، والمَأْثَم، اللهم إنی أعوذ بك من عذاب النار، وفتنة النار، وفتنة القبر، وعذاب القبر، ومن شر فتنة الغِنی، ومن شر فتنة الفقر، ومن شر فتنة المسیح الدجال، اللهم اغسل خطایایَ بماء الثَّلْج والبَرَد، ونَقِّ قلبی كما یُنَقَّی الثوبُ الأبیض من الدَّنَس، وباعد بینی وبین خطایای كما باعدتَ بین المشرق والمغرب.

[٤] اللهم آتِ نفسی تقواها، وزكها أنت خیر من زكاها، أنت ولیها ومولاها، اللهم إنی أعوذ بك من علم لاینفع، ومن قلب لا یخشع، ومن نفس لا تشبع، ومن دعوة لایُستجاب لها.

[٥] اللهم إني أعوذ بك من زوال نعمتك، وتحوّل عافيتك، وفُجَاءَ ةِ نقمتك، وجميع سخطك.
[٦] اللهم إني أعوذ بك من الفقر، والقلّة، والذلّة، وأعوذ بك من أن أَظْلِمَ، أو أُظْلم.

ترجمہ: اوراذکار میں سے: ان چیزوں کا سوال کرنا ہے جو اس کے لئے مفید ہیں: اس کے بدن میں یا اس کے جی میں: اس کی سرشت کے اعتبار سے یا روحانی سکون حاصل ہونے کے اعتبار سے یا اس کے اہل وعیال، اس کے مال اور اس کے مرتبہ کے نظم کے اعتبار سے۔ اوراس کا پناہ مانگنا ان چیزوں سے جو اس کوضرر پہونچانے والی ہیں انہی اعتبارات سے ـــــ اوراس (پانچویں ذکر) میں راز: جہاں میں اللہ تعالیٰ کی اثر اندازی کا مشاہدہ کرنا ہے۔ اور غیر اللہ سے طاقت وقوت کی نفی کرنا ہے ـــــ اوران جامع ترین اذکار میں سے جو اس باب (یعنی مفید باتوں کے سوال) میں نبی ﷺ نے مقرر کی ہیں: (اس کے بعد آٹھ ادعیہ ہیں، جن کا ترجمہ گذر چکا) ـــــ اوران جامع ترین اذکار میں سے: جو پناہ طلبی کے لئے نبی ﷺ نے مقرر کی ہیں: (اس کے بعد چھ دعائیں ہیں، جن کا ترجمہ گذر چکا)

☆ ☆ ☆

چھٹا ذکر: اظہارِ فروتنی ونیازمندی

چھٹا ذکر: وہ ہے جس سے مقصود: خضوع (فروتنی) اوراخبات (نیازمندی) کا اظہار ہے۔ یہی عبدیت (بندگی) ہے۔ جو انسان کا امتیازی وصف اور بڑا کمال ہے۔ اللہ کے حضور میں انتہائی تذلل وبندگی، عاجزی وسرافگندگی، محتاجی ومسکینی کا اظہار بھی عبادت ہے۔ اور عبادت انسان کا مقصد تخلیق ہے۔ اسی مقصد کی تحصیل کے لئے نماز مقرر کی گئی ہے۔ اور نماز میں اور نماز سے باہر بہت سی دعائیں مشروع کی گئی ہیں۔ نبی ﷺ تہجد کی نماز میں جب سجدۂ تلاوت فرماتے تو یہ ذکر کرتے: سَجَدَ وَجْهِىْ لِلَّذِىْ خَلَقَه، وَشَقَّ سمعَه وبصره بحَوْلِه وقوتِّه: میرے چہرہ نے سجدہ کیا اس ہستی کو جس نے اس کو پیدا کیا۔ اوراپنی قوت وطاقت سے اس میں سماعت وبصارت نمودار کیں (مشکوٰۃ حدیث ۱۰۳۵) اس ذکر کا مقصود بھی اظہار بندگی ونیازمندی ہے۔

ادعیۂ ماثورہ کی انواع

پانچویں اور چھٹے اذکار درحقیقت ادعیہ ہیں۔ اس لئے اب ادعیہ کی بحث شروع کرتے ہیں۔ ماثورہ دعائیں دوقسم کی ہیں:
ایک: وہ دعائیں ہیں جن سے مقصود: قوی فکریہ (دل ودماغ) کو اللہ کے جلال وعظمت کے تصور سے لبریز کرنا، یا نفس میں فروتنی اور نیازمندی پیدا کرنا ہے۔ کیونکہ باطنی حالت کا زبان سے اظہار: نفس کواس حالت سے خوب آگاہ کرتا ہے۔ اور یہ اظہار نفس کواس حالت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جیسے اطاعت شعار بیٹے سے کوئی غلطی ہوجائے، وہ اپنی غلطی پر

پشیمان ہو اور باپ سے معافی مانگے، اور عرض کرے: ''ابا جان! واقعی مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں خطا کار ہوں۔ اپنی غلطی پر نادم ہوں۔ آپ معاف فرمادیں'' تو اس اعتراف سے غلطی کا خوب اظہار ہوگا۔ اور وہ کوتاہی نگاہوں کے سامنے تصویر بن کر آجائے گی (دعاؤں کی یہ قسم چھٹا ذکر ہے)

دوسری: وہ دعائیں ہیں جن کے ذریعہ دنیا و آخرت کی بھلائیاں طلب کی جاتی ہیں۔ اور دونوں جہاں کے شر سے پناہ طلب کی جاتی ہے۔ ان دعاؤں کی دو حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: جب نفس کسی چیز کی طرف پوری طرح متوجہ ہوتا ہے، اور مضبوط عزم سے بندہ کوئی چیز طلب کرتا ہے تو بابِ کرم وَا ہوتا ہے: مَن دَقَّ بابَ کریمٍ انفتح: جو داتا کے دروازے پر دستک دیتا ہے وہ کامیاب ہوتا ہے۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ قیاس کے مقدمات (صغری وکبری) ملائے جائیں تو نتیجہ خود بخود نکلتا ہے۔

دوسری حکمت: جب دردناک حالت پیش آتی ہے اور بے قراری ہوجاتی ہے تو وہ حالت آدمی کو مناجات کی طرف مائل کرتی ہے۔ اور اللہ کی بزرگی اور بڑائی کو نگاہوں کے سامنے لے آتی ہے اور بندے کی توجہ کو اللہ کی طرف پھیرتی ہے۔ پس نیکوکار کو یہ حاجت غنیمت سمجھنی چاہئے کہ اس نے مولی کی طرف متوجہ کردیا (دعاؤں کی یہ قسم پانچواں ذکر ہے)

نوٹ: دعاؤں کی تین حکمتیں رحمۃ اللہ (۱:۷۷) میں بھی بیان کی گئی ہیں۔ اس موقعہ پر ان کی مراجعت مفید ہوگی۔

ومنها: التعبير عن الخضوع والإخبات: كقوله صلى الله عليه وسلم: ''سجد وجهى للذى خلقه'' إلخ.

واعلم: أن الدعواتِ التى أمرَنا بها النبيُّ صلى الله عليه وسلم على قسمين:

أحدهما: مايكون المقصود منه: أن تُمْلَأَ القُوى الفكريةُ بملاحظة جلال الله وعظمته، أو يحصُل حالةُ الخضوع والإخبات؛ فإن لتعبير اللسان عما يناسب هذه الحالةَ أثرًا عظيمًا فى تنبُّه النفس لها، وإقبالها عليها.

والثانى: مايكون فيه الرغبة فى خير الدنيا والآخرة، والتعوذ من شرهما؛ لأن همة النفس، وتأكُّدَ عزيمتِها فى طلب شيئ: يقرعُ بابَ الجود، بمنزلة إعدادِ مقدمات الدليل لفيضان النتيجة.

وأيضًا: فإن الحاجة اللذَّاعَة لقلبه تُوَجِّهُهُ إلى المناجات، وتجعلُ جلالَ الله حاضرًا بين عينيه، وتُصْرِفُ همتَه إليه؛ فتلك الحالةُ غنيمةُ المحسن.

ترجمہ: اور اذکار میں سے: خضوع اور اخبات کا اظہار ہے۔ جیسے آنخضرت ﷺ کا ارشاد: ''سجدہ کیا میرے چہرے نے اس اللہ کے لئے جس نے اس کو پیدا کیا'' الی آخرہ۔

اور جان لیں کہ وہ دعائیں جن کا نبی ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے: دو قسموں پر ہیں: ان میں سے ایک: وہ دعا ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ قوی فکریہ بھر جائیں اللہ کے جلال وعظمت کے ملاحظہ سے یا خضوع اور اخبات کی حالت پیدا ہو، پس بیشک زبان کے اظہار کے لئے ان لفظوں سے جو اس حالت کے مناسب ہیں: بڑی تاثیر ہے نفس کے چوکنا ہونے میں اس حالت کے لئے، اور نفس کا متوجہ ہونا ہے اس حالت کی طرف ——— اور دوسری: وہ دعا ہے جس میں دنیا و آخرت کی بھلائی کی طرف رغبت پائی جاتی ہے، اور ان دونوں کے شر سے پناہ طلب کی جاتی ہے ——— اس لئے کہ نفس کی تمام تر توجہ اور نفس کی عزیمت کی پختگی کسی چیز کی طلب میں: کرم کے دروازے کو کھٹکھٹاتی ہے۔ جیسے دلیل (قیاس) کے مقدمات نتیجہ کے فیضان کو تیار کرتے ہیں ——— اور نیز: پس بیشک دل کے لئے تکلیف دِہ حاجت: بندے کو مناجات (دعاؤں) کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اور اللہ کے جلال کو اس کی نگاہوں کے سامنے حاضر کرتی ہے۔ اور بندے کی توجہ کو اللہ کی طرف پھیرتی ہے۔ پس وہ حاجت نیکوکار کے لئے بسا غنیمت ہے!

☆ ☆ ☆

دعا کے عبادت ہونے کی وجہ

حدیث ——— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دعا ہی عبادت ہے!'' پھر آپؐ نے سورۃ المؤمن کی آیت ۶۰ تلاوت فرمائی۔ ارشاد پاک ہے: ''آپ کے رب کا فرمان ہے کہ مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کرونگا۔ جو لوگ میری عبادت سے روگردانی کرتے ہیں: وہ یقیناً خوار ہوکر جہنم رسید ہوں گے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۲۳۰) اس آیت میں پہلے دعا کرنے کا حکم ہے۔ پھر دعا نہ کرنے کو عبادت سے روگردانی قرار دیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ دعا ہی عبادت ہے۔

تشریح: دعا حصولِ مقصد کا وسیلہ ہونے کے علاوہ بذاتِ خود عبادت ہے۔ کیونکہ عبادت کی حقیقت: عظمت و کبریائی کے تصور کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور میں استغراق ومحویت ہے۔ اور یہ بات دعا کی دونوں قسموں میں بہ درجۂ اتم پائی جاتی ہے، پس دعا عین عبادت ہے بلکہ عبادت کا مغز اور جوہر ہے۔

دعا کے بعد انتظار کی حکمت

حدیث ——— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ سے ان کا فضل مانگو۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ بندے ان سے مانگیں۔ اور بہترین عبادت (دعاء) کشادگی کا انتظار ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۲۳۷)

تشریح: متفق علیہ روایت میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مروی ہے کہ: ''تمہاری دعائیں اس وقت تک قبول ہوتی ہیں، جب تک تم جلد بازی نہ کرو (اور جلد بازی یہ ہے کہ) بندہ کہنے لگے: ''میں نے دعا کی مگر قبول نہ ہوئی!'' (بخاری

حدیث ۶۳۴۰)اور مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ جلدی مچانا کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''دعا مانگنے والا کہے کہ میں نے دعا کی، میں نے دعا کی (یعنی بار بار کی) پھر میں نے دیکھا کہ میری دعا قبول نہیں ہورہی۔ پس اس نے تھک کر دعا مانگنی چھوڑ دی'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۲۲۷) غرض: مایوسی قبولیتِ دعا کا استحقاق کھودیتی ہے، بندے کو چاہئے کہ مسلسل مانگتا رہے، اور یقین رکھے کہ رحمت دیر سویر ضرور متوجہ ہوگی۔ کیونکہ برانگیختہ کرنے والی کامل توجہ: نزولِ رحمت میں عبادت سے زیادہ کارگر ہے یعنی بندگی بھی باعثِ رحمت ہے، مگر اللہ کے حضور میں عاجزی ولاچاری اور محتاجی ومسکینی کا پورا پورا اظہار اور بار بار اظہار دریائے رحمت کو موجزن کردیتا ہے۔

دعا سے شر دفع ہونے کی وجہ

حدیث ـــــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو بھی شخص کوئی دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو وہ چیز عنایت فرماتے ہیں جو اس نے مانگی ہے، یا اس سے ویسا ہی کوئی شر دفع کرتے ہیں، بشرطیکہ اس نے کسی گناہ کی یا قطع رحمی کی دعا نہ کی ہو'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۲۳۶)

تشریح: عالم بالا سے اس عالم میں اشیاء کا ظہور دو طرح پر ہوتا ہے: فطری انداز پر اور غیر فطری انداز پر۔ اگر کوئی خارجی مانع نہیں ہوتا تو چیزیں فطری انداز پر ظاہر ہوتی ہیں۔ اور خارجی اسباب میں کشاکشی ہوتی ہے تو ایک چیز کی جگہ دوسری چیز نمودار ہوتی ہے (تفصیل کے لئے رحمۃ اللہ ۱: ۲۲۸ دیکھیں)

اور دعا کے آثار کے ظہور کا فطری انداز یہ ہے کہ جو چیز بندے نے مانگی ہے وہ دی جائے۔ اور غیر فطری (غیر معروف) طریقہ یہ ہے کہ اس کی جگہ کوئی دوسری مناسب چیز دی جائے مثلاً: آنے والی کوئی اَلا بلا اس دعا کی وجہ سے روک دی جائے یا اس کی وحشت کو انسیت سے بدل دیا جائے اور اس کے مغموم دل کو مسرور کردیا جائے، یا رونما ہونے والا حادثہ جس سے اس کو بدنی نقصان پہنچ سکتا تھا، مال کی طرف پھیر دیا جائے، اور وہ سستا چھوٹ جائے یا اسی قسم کی اور کوئی تبدیلی کردی جائے۔

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم: " الدعاء هو العبادة"

أقول: ذلك: لأن أصلَ العبادة هو الاستغراقُ في الحضور بوصف التعظيم، والدعاءُ بقسمَيْهِ نصاب تام منه.

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم: "أفضلُ العبادةِ انتظار الفرج"

أقول: وذلك: لأن الهمة الحثيثة في استنزال الرحمة تُؤَثِّرُ أشدَّ مما تؤثر العبادة.

[۳] قوله صلى الله عليه وسلم: " ما من أحد يدعو بدعاء إلا آتاه الله ماسأل، أو كفَّ عنه من السوء مثلَه"

أقول: ظهورُ الشيئ من عالَم المثال إلى الأرض: له سَنَنٌ طبيعي يجرى ذلك المجرىٰ إن لم يكن مانع من خارج، وله سَنَنٌ غيرُ طبيعي إن وُجد مزاحمةٌ فى الأسباب؛ فمن غير الطبيعي: أن تنصرف الرحمةُ إلى كف السوء، أو إلى إيناس وَحشتِه، وإلهامِ بهجةِ قلبه، أو ميلِ الحادثة من بدنه إلى ماله، وأمثالِ ذلك.

ترجمہ: (۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''دعا ہی عبادت ہے'' میں کہتا ہوں: وہ بات (یعنی دعا ہی عبادت) اس لئے ہے کہ عبادت کی حقیقت: اللہ کے حضور میں تعظیم کے وصف کے ساتھ محویت ہے۔ اور دعا اپنی دونوں قسموں کے ساتھ اس (محویت) کا نصاب تام ہے۔

(۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''بہترین عبادت فراخی کا انتظار ہے'' میں کہتا ہوں: اور وہ بات (یعنی انتظار کا بہترین عبادت ہونا) اس لئے ہے کہ برانگیختہ کرنے والی کامل توجہ (یعنی تڑپ) رحمت کے اتارنے میں اثر انداز ہوتی ہے اس سے زیادہ جو عبادت اثر انداز ہوتی ہے۔

(۳) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: (ترجمہ گذر گیا) میں کہتا ہوں: عالم مثال سے زمین کی طرف چیزوں کا ظہور: اس کی ایک فطری راہ ہے۔ وہ چیز اس راہ میں چلتی ہے (یعنی اسی راہ سے وہ چیز نمودار ہوتی ہے) اگر کوئی خارجی مانع نہیں ہوتا۔ اور اس کے لئے (دوسری) غیر فطری راہ ہے، اگر اسباب میں کشاکشی پائی جائے۔ پس غیر فطری راہوں میں سے یہ بات ہے کہ رحمتِ خداوندی متوجہ ہوتی ہے برائی روکنے کی طرف یا اس کے ویران دل کو مانوس کرنے کی طرف، اور اس کے دل کو سرور الہام کرنے کی طرف، یا حادثہ کے مائل ہونے کی طرف اس کے بدن سے اس کے مال کی طرف، اور اس کے مانند امور۔

☆　☆　☆

دعا میں عزم بالجزم ضروری ہے

حدیث ——— رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص دعا کرے تو یہ نہ کہے کہ الٰہی! اگر آپ چاہیں تو مجھے بخش دیں، اگر آپ چاہیں تو مجھ پر مہربانی فرمائیں۔ اگر آپ چاہیں تو مجھے روزی عطا فرمائیں، بلکہ چاہئے کہ عزم بالجزم سے مانگے۔ بیشک وہ جو چاہیں کرتے ہیں ان پر کوئی زور ڈالنے والا نہیں'' (مشکوۃ حدیث ۲۲۲۵)

تشریح: دعا کی روح اور اس کا راز یہ ہے کہ بندہ ملائکہ کی مشابہت اختیار کرے یعنی فرشتہ صفت بن جائے اور اللہ کی معرفتِ کاملہ کے ساتھ متلبس ہو کر کوئی چیز مانگے۔ یعنی نیک بندہ دعا کے وقت پوری طرح اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر، اور ان کی شانِ کریمی پر اعتماد کرتے ہوئے یقین کے ساتھ مانگے تو اللہ تعالیٰ ضرور دعا قبول فرماتے ہیں۔ بے یقینی

کے ساتھ مانگنا مؤکد ارادہ کو پراگندہ اور کامل توجہ کو سست کر دیتا ہے یعنی ایسی دعا بے جان اور بے روح ہوتی ہے (نیز اس میں استغناء کا شائبہ بھی پایا جاتا ہے، جو مقام عبدیت کے منافی ہے)

سوال: اللہ تعالیٰ مصالح کا لحاظ فرما کر دیتے ہیں۔ پس بندے کا اصرار کرنا کہ وہ ضرور دیدیں کیونکر مناسب ہوسکتا ہے؟

جواب: حدیث کے آخری حصہ میں اس کا جواب ہے کہ دعا کے بعد اللہ تعالیٰ جو کچھ کریں گے وہ مصلحتِ کلی کا لحاظ فرما کر ہی کریں گے۔ اسباب میں سے کوئی سبب (مثلاً دعا) دوسرے سبب کی رعایت سے ان کو روک نہیں سکتا۔ ایسا کوئی نہیں جو زور ڈال کر ان سے ان کی مشیت کے خلاف کرالے۔

دعا سے تقدیر ٹلتی ہے

حدیث ــــــ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''دعا ہی تقدیر کو پھیرتی ہے اور نیکی ہی عمر میں زیادتی کرتی ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۲۳۳)

تشریح: قضاء (فیصلۂ خداوندی یعنی تقدیر) سے یہاں مراد: واقعہ کی وہ صورت ہے جو عالم بالا میں پیدا کی جاتی ہے۔ جو اس کائنات میں واقعہ کے رونما ہونے کا سبب بنتی ہے۔ پس وہ صورت بھی ایک مخلوق ہے۔ اور مخلوقات محو و اثبات کو قبول کرتی ہیں۔ چیزیں بود و نابود ہوتی رہتی ہیں۔ سورۃ الرعد آیت ۳۹ میں ہے: ﴿یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ جس چیز کو چاہتے ہیں مٹاتے ہیں، اور جس چیز کو چاہتے ہیں ثابت رکھتے ہیں۔ پس مقبول دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ عالم مثال میں وجود پذیر ہونے والے واقعہ کو مٹا دیتے ہیں، چنانچہ وہ واقعہ کائنات میں واقعہ رونما ہونے کا سبب نہیں بنتا۔ دعا سے تقدیر ٹلنے کا یہی مطلب ہے۔

وضاحت: تقدیر کے دو معنی ہیں: ایک: پلاننگ کرنا یعنی ازل میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کائنات کے لئے جو کچھ طے کر دیا ہے اس میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اسی کو تقدیر مبرَم کہتے ہیں۔ اور تقدیر کے دوسرے معنی مقدور کے ہیں۔ اس حدیث میں قضا سے یہی دوسرے معنی مراد ہیں۔ اور مقدورات یعنی مخلوقات میں محو و اثبات یعنی تبدیلی ہوتی ہے۔ اور اسی کو تقدیر معلّق کہتے ہیں۔

دعا ہر حال میں سودمند ہے

حدیث ــــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دعا ان حوادث میں بھی سودمند ہے جو نازل ہو چکے ہیں، اور ان میں بھی جو ابھی نازل نہیں ہوئے۔ پس اے بندگانِ خدا! دعا کا اہتمام کرو'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۲۳۴)

تشریح: جو بلا ابھی نازل نہیں ہوئی۔ البتہ اس کا اندیشہ ہے، اس سے حفاظت کے لئے بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی

چاہیئے۔ان شاء اللہ سود مند ہوگی۔اور جو مصیبت آن پڑی ہے اس کے دفعیہ کے لئے بھی دعا کرنی چاہیئے ،وہ بھی نافع ہوگی اللہ تعالیٰ دعا کی برکت سے عافیت نصیب فرمائیں گے۔شاہ صاحب اس کی صورت بیان فرماتے ہیں:

جب دعا اس بلا سے کشتی کرتی ہے جو ابھی نازل نہیں ہوئی تو وہ بلا نابود ہوجاتی ہے۔اور وہ زمین میں واقعہ رونما ہونے کا سبب نہیں بنتی۔ یہ دعا کے سود مند ہونے کی صورت ہے: ان آفات میں جو ابھی نازل نہیں ہوئیں۔اور جو مصیبت آچکی ہے: جب دعا اس سے جنگ کرتی ہے تو اس بلا کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔اور اللہ کی رحمت متوجہ ہوتی ہے، جو آفت زدہ کا غم ہلکا کردیتی ہے۔اور اس کے ویران دل کو امیدوں سے آباد کردیتی ہے۔

خوش حالی میں بہ کثرت دعا کرنے کی حکمت

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جسے خوشی ہو کہ اللہ تعالیٰ تنگیوں میں اس کی دعا قبول فرمائیں،تو چاہیئے کہ وہ خوش حالی میں بکثرت دعا کیا کرے‘‘(مشکوٰۃ حدیث ۲۲۴۰)

تشریح: خوش حالی میں بکثرت دعا کرنے کا حکم اس لئے ہے کہ دعا اسی کی قبول ہوتی ہے جو قوی رغبت اور پختہ ارادہ سے دعا کرتا ہے اور آفت میں پھنسنے سے پہلے دعا کا خوگر ہے۔جیسے مصائب میں لوگ آشنا کی مدد پہلے کرتے ہیں۔اور صاحبِ معرفت وہ ہے جو بے غرضی کے زمانہ میں بھی آمد ورفت رکھتا ہو۔

[٤] قوله صلى الله عليه وسلم:" إذا دعا أحدكم فلايقل: اللهم اغفرلى إن شئتَ، اِرْحمنى إن شئتَ، اُرزقنى إن شئت، ولْيَعْزِمْ مسألته، إنه يفعلُ مايشاءُ، ولامُكْرِهَ له"

أقول: روح الدعاء وسِرُّها: رغبةُ النفس فى الشيئ، مع تلبسها بتشبه الملائكة وتطلع الجبروت؛ والطلبُ بالشك يُشَتِّتُ العزيمةَ، ويُفَتِّرُ الهمةَ؛ وأما الموافقة بالمصلحة الكلية فحاصلٌ، لأن سببًا من الأسباب لايَصُدُّ الله عن رعايتها، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" إنه يفعل ما يشاء، ولامكره له"

[٥] قوله صلى الله عليه وسلم:" لايرد القضاء إلا الدعاء"

أقول: القضاء ههنا: الصورةُ المخلوقة فى عالم المثال، التى هى سببُ وجود الحادثة فى الكون، وهو بمنزلة سائر المخلوقات، يقبل المحوَ والإثباتَ.

[٦] قال عليه الصلاة والسلام:"إن الدعاء ينفع مما نَزَلَ ، ومما لم ينزل"

أقول: الدعاء إذا عالج مالم يَنْزِلْ اضمحلَّ، ولم ينعقد سببا لوجود الحادثة فى الأرض؛ وإن عالج النازلَ ظهرت رحمةُ الله هناك فى صورة تخفيفِ موجَدَتِه، وإيناس وحشته.

[۷] قال صلى الله عليه وسلم: "من سره أن يستجيب الله له عند الشدائد، فليُكثر الدعاء فى الرَّخاء"

أقول: وذلك: أن الدعاء لايُستجاب إلا ممن قَوِيَتْ رغبتُه، وتأكدَّت عزيمتُه، وتمرَّن بذلك قبل أن يُحيط به ما أحاط.

ترجمہ:(۴)......میں کہتا ہوں: دعا کی روح اور اس کا راز: نفس کا کسی چیز میں رغبت کرنا ہے، ملائکہ کے ساتھ تشبُّہ اور جبروت کی طرف جھانکنے سے متلبس ہونے کے ساتھ۔ اور تذبذب کے ساتھ طلب: مؤکد ارادہ کو پراگندہ کردیتی ہے اور کامل توجہ کو سست کردیتی ہے ـــــــ اور رہی مصلحتِ کلیہ کے ساتھ ہم آہنگی تو وہ حاصل ہے، اس لئے کہ اسباب میں سے کوئی سبب اللہ کو ان (اسباب) کی رعایت سے نہیں روکتا۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: الی آخرہ۔

(۵) میں کہتا ہوں: قضاء سے یہاں مراد: وہ صورت ہے جو عالم مثال میں پیدا کی گئی ہے۔ جو کائنات میں واقعہ کے وجود کا سبب ہے۔ اور وہ صورت دیگر مخلوقات کی طرح ہے، محو واثبات کو قبول کرتی ہے۔

(۶) میں کہتا ہوں: دعا جب جنگ کرتی ہے اس چیز سے جو نازل نہیں ہوئی تو وہ نابود ہوجاتی ہے۔ اور سبب نہیں بنتی زمین میں واقعہ کے پائے جانے کے لئے اور اگر وہ جنگ کرتی ہے نازل شدہ سے تو اللہ کی رحمت ظاہر ہوتی ہے اس وقت اس کے غم کو ہلکا کرنے اور اس کی وحشت کو مانوس کرنے کی صورت میں۔

(۷) میں کہتا ہوں: اور وہ بات (یعنی خوش حالی میں بکثرت دعا کرنے کا حکم) بایں وجہ ہے کہ دعا نہیں قبول کی جاتی مگر اس شخص کی جس کی رغبت قوی ہے اور اس کا عزم پختہ ہے اور وہ دعا کا خوگر ہوگیا ہے اس بلا کے گھیرنے سے پہلے جس نے اس کو گھیرا ہے۔

☆ ☆ ☆

دعا میں ہاتھ اٹھانے اور منہ پر پھیرنے کی حکمت

حدیث ـــــــ رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ جب آپ ہاتھ اٹھا کے دعا مانگتے تو آخر میں اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیر لیتے تھے (مشکوۃ حدیث ۲۲۵۵)

تشریح: دعا میں ہاتھ اٹھانا اور آخر میں ہاتھ منہ پر پھیرنا: رغبت کا ظاہری روپ ہے۔ اور دل کی کیفیت اور بدنی ہیئت کے درمیان ہم آہنگی ہے۔ یعنی اس طرح آدمی سراپا التجا بن جاتا ہے۔ جیسے منگتا ہاتھ پسار کے مانگتا ہے تو اس کا سارا وجود سوال بن جاتا ہے۔ نیز اس سے نفس چوکنا ہوتا ہے کہ وہ کوئی چیز مانگ رہا ہے ـــــــ اور ہاتھ منہ پر پھیرنا: امید برآری کی تصویر ہے کہ یہ پھیلے ہوئے ہاتھ خالی نہیں رہے۔ رب کریم ورحیم کی برکت ورحمت کا کوئی حصہ اسے ضرور ملا ہے، جسے اس

نے اپنے اشرف عضو (چہرے) کا غازہ بنالیا ہے۔

بابِ دعا کُھلنے سے کونسے ابوابِ رحمت کھلتے ہیں؟

حدیث ——— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے جس کے لئے دعا کا دروازہ کھولا گیا، اس کے لئے رحمت کے دروازے کھولدیئے گئے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۲۳۹)

تشریح: جو شخص خلوص دل سے پیدا ہونے والی رغبت سے دعا مانگنے کا طریقہ جانتا ہے، اور یہ بھی جانتا ہے کہ دعا کب قبول ہوتی ہے، اور کیفیتِ حضوری پیدا کرنے کا بھی مشاق ہوگیا ہے تو اس کے لئے دنیا میں رحمت کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اور ہر مصیبت میں اس کی مدد کی جاتی ہے ——— اور موت کے بعد اگر خطائیں اس کا احاطہ کرلیتی ہیں۔ اور اس پر دنیوی علائق کا پردہ پڑجاتا ہے تو وہ شخص بے تابانہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ وہ دنیا میں اس کا خوگر ہوگیا تھا: پس اس وقت بھی اس کی دعا قبول کی جاتی ہے اور رحمتِ الٰہی متوجہ ہوتی ہے۔ اور وہ اپنی کوتاہیوں سے ایسا پاک صاف نکل جاتا ہے جیسا گوندھے ہوئے آٹے میں سے بال کھینچ لیا جاتا ہے۔

[۸] وأما رفع اليدين ومسحُ الوجه بهما: فتصويرٌ للرغبة، ومظاهرةٌ بين الهيئة النفسانية ومايناسبها من الهيئة البدنية، وتنبيه للنفس على تلك الحالة.

[۹] قال صلى الله عليه وسلم: ''من فُتح له باب من الدعاء فتحت له أبواب الرحمة''

أقول: من عَلِمَ كيف يدعو برغبة ناشئة من صميم قلبه؟ وعَلِمَ فى أى الصورة تظهر الإجابةُ؟ وتمرَّن بصفة الحضور: فُتح له بابُ الرحمة فى الدنيا، ونُصرفى كل داهية؛ وإذا مات وأحاطت به خطيئته، وغشِيَتْه غاشيةٌ من الهيئات الدنيوية؛ توجه إلى الله توجها حثيثا كما كان تمرَّن به، فَيُستجاب له، ويخرج نقيا منها كما تُسَلُّ الشَّعْرَةُ من العجين.

ترجمہ: (۸) اور رہا دونوں ہاتھوں کا اٹھانا اور منہ پر ان کو پھیرنا: تو وہ رغبت کی تصویر ہے۔ اور مطابقت ہے ہیئتِ نفسانیہ کے درمیان اور اس ہیئتِ بدنیہ کے درمیان جو اس (ہیئتِ نفسانیہ) کے مناسب ہے۔ اور نفس کے لئے تنبیہ ہے اس (ہیئتِ نفسانیہ) پر۔

(۹) میں کہتا ہوں: جو شخص جانتا ہے کہ کیسے دعا مانگے ایسی رغبت سے جو خلوصِ دل سے پیدا ہونے والی ہے؟ اور جانتا ہے کہ کس صورت میں قبولیت ظاہر ہوتی ہے؟ اور وہ صفتِ حضور کا مشّاق ہوچکا ہے تو دنیا میں اس کے لئے رحمت کا دروازہ کھولدیا جاتا ہے۔ اور وہ ہر مصیبت میں مدد کیا جاتا ہے۔ اور جب مرجاتا ہے اور اس کی لغزشیں اس کا احاطہ کرلیتی

ہیں۔ اور اس پر دنیوی ہیئتوں کا پردہ چھا جاتا ہے تو وہ شخص برانگیختہ کرنے والی توجہ سے اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے جیسا کہ وہ اس کا خوگر ہو چکا ہے۔ پس اس کی دعا قبول کی جاتی ہے اور وہ ان لغزشوں سے پاک صاف نکل جاتا ہے جس طرح گوندھے ہوئے آٹے میں سے بال کھینچ لیا جاتا ہے۔

☆ ☆ ☆

قبولیتِ دعا کے مواقع

کچھ خاص احوال، اوقات اور اماکن ایسے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ سے قبولیتِ دعا کی توقع کی جاتی ہے۔ احادیث میں ان مواقع کا تذکرہ آیا ہے: (۱) فرض نمازوں کے بعد (۲) ختم قرآن کے بعد (۳) اذان واقامت کے درمیان (۴) میدان جنگ میں جب رَن پڑ رہا ہو (۵) بارانِ رحمت کے نزول کے وقت (۶) جب کعبہ شریف پر نظر پڑے (۷) بیابان میں نماز پڑھنے کے بعد جہاں اللہ کے سوا کوئی دیکھنے والا نہیں ہے (۸) میدانِ جہاد میں جبکہ کمزور ساتھیوں نے ساتھ چھوڑ دیا ہو (۹) رات کے آخری حصہ میں (۱۰) شب قدر میں (۱۱) عرفہ کے دن میدان عرفات میں (۱۲) جمعہ کی خاص ساعتِ مرجوّہ میں (۱۳) افطار کے وقت (۱۴) سفر حج اور سفر جہاد میں (۱۵) بیماری کی حالت میں (۱۶) مسافری کی حالت میں وغیرہ وغیرہ۔

اور کچھ ایسے احوال بھی ہیں جن میں قبولیتِ دعا کی امید بالکل نہیں رکھنی چاہئے۔ مثلاً: (۱) گناہ کرنے کی دعا (۲) قطع رحمی کی دعا (۳) بے صبری کی دعا وغیرہ۔

شاہ صاحب قدس سرہ نے آٹھ احوال واماکن بیان کئے ہیں فرماتے ہیں: قبولیت سے قریب تر دعائیں وہ ہیں جو ایسی حالت میں کی گئی ہوں جو نزولِ رحمت کی احتمالی جگہیں ہیں۔ وہ مواقع یہ ہیں:

اول: جب آدمی کسی دینی کمال سے متصف ہو، جیسے فرض نماز کے بعد، روزہ افطار کرتے وقت اور ختم قرآن کے بعد کی دعائیں۔

دوم: جب کوئی ایسی حالت میسر آئے جو ابر کرم کو برسنے کی دعوت دے۔ جیسے عرفہ کے دن حاجی کی دعا۔

سوم: ایسی حالت کی دعا جو نظام عالم کی طرف متوجہ عنایت ربانی سے ہم آہنگ ہو جائے، جیسے مظلوم کی بددعا۔ مظلوم کی دعا اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ عالم میں ظلم کو پسند نہیں کرتے۔ ظالم سے انتقام ضرور لیتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں مظلوم کی بددعا نہر میں ندی کا ملنا ہے۔

چہارم: جب کسی مصلحت سے دنیا کی راحتیں کسی بندے سے منہ موڑ لیتی ہیں۔ بیماریاں گھیر لیتی ہیں یا آفتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے تو رحمتِ الٰہی اس کے حق میں دوسری صورت میں مثلاً قبولیتِ دعا کی شکل میں پلٹ جاتی ہے۔ اور اس حالت کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔

پنجم: وہ حالت جو دعا میں اخلاص کا باعث ہو، اس حال کی دعا بھی مقبول ہے۔ جیسے ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کے لئے غائبانہ دعا کرنا۔ اور ماں باپ کا اولاد کے لئے دعا کرنا صدق دل سے ہوتا ہے، اس لئے وہ دعائیں قبول کی جاتی ہیں۔

ششم: کسی ایسی مبارک گھڑی میں دعا کی جائے جس میں روحانیت پھیلتی ہے اور رحمتِ حق نازل ہوتی ہے۔ جیسے شب قدر اور جمعہ کے دن ساعتِ مرجوّہ کی دعائیں۔

ہفتم: کسی ایسی مبارک جگہ میں دعا کی جائے جہاں ملائکہ کا جم گھٹا رہتا ہے۔ مکہ مکرمہ میں ایسی کئی جگہیں ہیں۔ جیسے کعبہ شریف اور اس کا خاص حصہ ملتزم وغیرہ۔

ہشتم: وہ مقامات جہاں پہنچ کر دل میں حضوری اور نیازمندی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جیسے مقاماتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام۔ جیسے میدانِ بدر، میدانِ احد، اور قبر اطہر وغیرہ۔ جہاں پہنچ کر اللہ کی طرف خصوصی التفات ہوتا ہے، اس لئے ایسے مقامات کی دعائیں بھی قبول کی جاتی ہیں۔

فائدہ: مذکورہ بالا قبولیت کی جگہوں اور ان کی وجوہ کے ساتھ مقارنہ کرنے سے یہ بات واضح ہوگی کہ بعض احوال ومقامات میں دعا قبول کیوں نہیں ہوتی؟ جیسے کسی گناہ کی دعا (مثلاً: کسی عورت سے زنا کرنے میں کامیابی کی دعا) یا قطع رحمی کی دعا (مثلاً بھائیوں میں ناچاقی کی دعا) یا وہ دعا جس میں جلدی مچائی جائے۔ ایسی دعائیں نظام عالم میں اللہ کی مرضی کے خلاف ہوتی ہیں اس لئے قبول نہیں کی جاتیں۔ اور استعجال میں تنگ دلی اور اللہ پر اعتماد کی کمی ہوتی ہے اور قلب غافل کی دعا میں حضوری کی کمی ہوتی ہے۔ قبولیتِ دعا کے لئے ابتہال (گڑگڑا کر دعا کرنا) ضروری ہے۔ (یہ فائدہ کتاب میں ہے)

[۱۰] واعلم: أن أقربَ الدعوات من الاستجابة: ما اقترن بحالة هى مظنةُ نزولِ الرحمة، إما لكونها:

[الف] كمالاً للنفس الإنسانية، كدعاءٍ عقيب الصلوات، ودعوةِ الصائم حين يُفطر.

[ب] أو مُعِدَّةً لاستنزال جود الله، كدعاء يوم عرفة.

[ج] أو لكونها سببًا لموافقة عناية الله فى نظام العالم، كدعوة المظلوم؛ فإن لله عنايةً بانتقام الظالم، وهذا موافقةٌ منه لتلك العناية، وفيه: "فإنه ليس بينها وبين الله حجاب"

[د] أوسببا لازْوِرَارِ راحةِ الدنيا عنه، فتنقلب رحمةُ الله فى حقّه متوجهة فى صورة أخرى، كدعاء المريض والمبتلى.

[هـ] أوسببا لإخلاص الدعاء، مثل دعاء الغائب لأخيه، أو دعاء الوالد للولد.

[و] أوكانت فى ساعة تنتشر فيها الروحانية، وتدلّى فيه الرحمة، كليلة القدر، والساعة

المرجوة يوم الجمعة.

[ز] أو كانت في مكان تحضره الملائكة، كمواضع بمكة.

[ح] أو تتنبهُ النفسُ عند الحلول بها لحالة الحضور والخضوع، كمآثر الأنبياء عليهم السلام.

ويُعلم من مقايسة ما قلنا سرُّ قوله صلى الله عليه وسلم: "يستجاب للعبد مالم يَدْعُ بإثم، أو قطيعة رحم، مالم يستعجل"

ترجمہ: (۱۰) اور جان لیں کہ قبولیت سے قریب تر دعائیں: وہ ہیں جو مقترن ہوں ایسی حالت کے ساتھ جو نزولِ رحمت کی احتمالی جگہ ہیں۔ یا تو اس حالت کے ہونے کی وجہ سے: (الف) نفس انسانی کے لئے کوئی (دینی) کمال۔ جیسے نمازوں کے بعد دعا اور روزہ دار کی بوقتِ افطار دعا (ب) یا وہ حالت تیار کرنے والی ہو کرم الٰہی کے نزول کو، جیسے یوم عرفہ کی دعا (ج) یا اس حالت کے (مثلاً مظلومیت کے) سبب ہونے کی وجہ سے نظام عالم میں اللہ کی عنایت کی موافقت کے لئے، جیسے مظلوم کی دعا۔ پس بیشک اللہ کے لئے التفات ہے ظالم سے انتقام لینے کی طرف۔ اور مظلوم کی یہ دعا اللہ کی اس عنایت سے ہم آہنگ ہے۔ اور اس میں ہے: "پس بیشک مظلوم کی بددعا اور اللہ کے بیچ میں کوئی پردہ نہیں" (د) یا اس حالت کے (مثلاً بیماری اور سفر کے) سبب ہونے کی وجہ سے راحتِ دنیا کے اس سے منحرف ہونے کے لئے۔ پس رحمتِ الٰہی اس کے حق میں پلٹ جاتی ہے، درانحالیکہ وہ متوجہ ہونے والی ہوتی ہے کسی دوسری صورت میں (مثلاً قبولیت دعا کی صورت میں) جیسے بیمار اور مصیبت زدہ کی دعا (ھ) یا اس حالت کے (مثلاً ابوّت کے) سبب ہونے کی وجہ سے دعا میں اخلاص کا۔ جیسے غائبانہ اپنے (مسلمان) بھائی کے لئے دعا کرنا یا باپ کا اولاد کے لئے دعا کرنا (و) یا وہ دعائیں ایسی گھڑی میں کی گئی ہوں جن میں روحانیت پھیلتی ہے اور جس میں رحمتِ حق نازل ہوتی ہے۔ جیسے شب قدر اور جمعہ کے دن کی ساعتِ مرجوّہ (ز) یا وہ دعائیں ایسی جگہ میں کی گئی ہوں جہاں ملائکہ حاضر ہوتے ہیں۔ جیسے مکہ کے مقامات (ح) یا ان جگہوں میں پہنچنے کی صورت میں نفس چوکنا ہوتا ہو حضور وخضوع کے لئے، جیسے مقاماتِ انبیاء علیہم السلام۔

اور اس بات پر قیاس کرنے سے جو ہم نے بیان کی جانا جائے گا راز آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا کہ: "بندے کی دعا قبول کی جاتی ہے جب تک وہ کسی گناہ کی دعا نہ کرے، یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے (اور) جب تک وہ جلدی نہ مچائے"

لغات: اِسْتَنْزَلَه: اتارنا...... اِزْوَرَّ عنه: ہٹنا، منحرف ہونا، کنّی کاٹنا...... مآثر جمع ہے مَأْثُرَةٌ کی: قابل تحسین عمل، عظیم یا شاندار کارنامہ، یہاں مراد وہ مقامات ہیں جن میں انبیاء نے کوئی اہم کارنامہ انجام دیا ہے یا وہاں انھوں نے عبادتیں کی ہیں یا وہاں وہ مدفون ہیں۔ جیسے بدر واحد کے مقامات، مساجد اربعہ اور روضہ مبارک۔

☆ ☆ ☆

ہر نبی کے لئے مقبول دعا کونسی ہے؟

حدیث ——— رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہر نبی کے لئے ایک مقبول دعا ہے۔ پس ہر نبی نے اپنی دعا جلدی یعنی دنیا ہی میں مانگ لی۔ اور میں نے اپنی دعا قیامت کے دن اپنی امت کی شفاعت کے لئے محفوظ کرلی ہے۔ پس وہ ان شاء اللہ میرے ہر اس امتی کو پہنچے گی جو اس حال میں مرا کہ اس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۲۲۳)

تشریح: انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے لئے مقبول دعا ایک ہی نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو بہت سی مقبول دعاؤں سے سرفراز فرمایا ہے۔ خود ہمارے نبی ﷺ نے بہت سے مواقع میں دعائیں فرمائی ہیں اور وہ قبول بھی ہوئی ہیں۔ اس حدیث میں جس دعا کا ذکر ہے اس سے مراد وہ دعا ہے جو ہر نبی کو اس کی نبوت کے تعلق سے دی جاتی ہے یعنی اگر لوگ ایمان لے آئیں تو وہ دعا ان کے لئے رحمت بن جائے۔ پیغمبر ان کے لئے برکتوں کی دعا کریں۔ اور اگر وہ روگردانی کریں تو وہ دعا ان کے لئے عذاب بن جائے۔ پیغمبر ان کے لئے بددعا کریں اور وہ تباہ ہوجائیں۔ جیسے نوح علیہ السلام نے جب لوگ ایمان نہ لائے تو ہلاکت کی دعا کی اور وہ غرقاب ہوگئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعونیوں کے لئے بددعا کی اور وہ نذر آب ہوگئے۔ صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے بددعا کی تو انھیں چنگھاڑ نے پکڑ لیا۔

اور ہمارے نبی ﷺ نے محسوس کیا کہ آپؐ کی بعثت کا عظیم مقصد: لوگوں کے لئے سفارشی بننا اور قیامت کے دن رحمتِ خاصہ کے نزول کا واسطہ بننا ہے چنانچہ آپؐ نے قوم کی ایذا رسانی پر صبر کیا۔ اور اپنی سب سے بڑی دعا کو جو نبوت کے تعلق سے آپ کو دی گئی تھی: قیامت کے دن گنہگار موحّد امتیوں کی سفارش کے لئے ریزرو کرلی۔ فجزاه الله عن أمته أحسنَ الجزاء، ورزقنا شفاعَتَه يومَ القيامة بمنه وكرمه (آمین)

نبی ﷺ نے اللہ سے کیا وعدہ لیا ہے؟

حدیث ——— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے اللہ! میں نے آپ سے ایک عہد لیا ہے۔ اور آپ ہرگز میرے ساتھ کئے ہوئے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ پس میں ایک انسان ہی ہوں۔ پس جس مؤمن کو میں نے ستایا ہو، برا کہا ہو، لعنت کی ہو، کوڑے مارے ہوں، تو آپ اس کو اس کے حق میں رحمت، طہارت اور قُربت بنادیں، جو اس کو قیامت کے دن آپ سے قریب کردے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۲۲۴)

تشریح: امت پر نبی ﷺ کی مہر وعنایت نے چاہا کہ آپؐ دعا کریں اور اللہ تعالیٰ سے پیشگی وعدہ لے لیں۔ اور امت کی طرف جو آپؐ کی توجہ خاص ہے اس کو بارگاہِ مقدس میں متمثّل کریں، جس کے مطابق آپؐ کی امت کے ساتھ اللہ تعالیٰ معاملہ فرمائیں۔ چنانچہ آپؐ نے دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی دعا قبول فرمالی کہ وہ امتِ مرحومہ کے ساتھ

آپ ؐ کی قلبی خواہش کے مطابق معاملہ فرمائیں گے۔ ظاہری برتاؤ کا لحاظ نہیں فرمائیں گے۔
اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ؐ نے مسلمانوں کو جو قول وفعل سے سزائیں دی ہیں، تو آپ ؐ کے پیشِ نظر اس دین کو روبعمل لانا تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے پسند کیا ہے اور لوگوں کی اصلاح اور ان کی کجی کو دور کرنا منظور تھا۔ دل میں کوئی خفگی نہیں تھی۔ جیسے شفیق باپ اور مہربان استاذ کا بچے کے ساتھ ایک ظاہری برتاؤ ہوتا ہے: وہ ڈانٹتے بھی ہیں مارتے بھی ہیں۔ مگر ان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ بچہ پروان چڑھے اور کامیاب ہو، اسی طرح آپ ﷺ پر بھی امت کی ضرر کی بات نہایت گراں گذرتی تھی۔ آپ امت کی منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے تھے اور مؤمنین پر تو بڑے ہی شفیق ومہربان تھے (التوبہ آیت ۱۲۸) مگر دینی مصالح کے پیش نظر اور لوگوں کے فائدہ کے لئے کبھی ظاہری طور پر سختی اور خفگی کا معاملہ بھی کرنا پڑتا تھا۔ اسی لئے آپ نے دعا فرمائی تھی اور اللہ تعالیٰ سے وعدہ لیا تھا کہ وہ آخرت میں آپ کی امت کے ساتھ دنیوی برتاؤ کے لحاظ سے معاملہ نہیں فرمائیں گے۔ بلکہ اس کو خیر ورحمت سے بدل دیں گے۔
رہی کفار پر آپ ؐ کی سختی اور ان کے ساتھ جنگ وپیکار تو وہ منشا خداوندی کی تکمیل تھی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کفار پر غضبناک ہیں اس لئے آپ ؐ بھی ان سے برسر پیکار رہے۔ پس اپنوں اور پرایوں کے ساتھ معاملہ اگرچہ یکساں نظر آتا ہے، مگر گھاٹیں جدا جدا ہیں یعنی مؤمنین کے ساتھ سختی کی وجہ اور ہے اور کفار کے ساتھ اور۔

[۱۱] قوله صلى الله عليه وسلم: "لكل نبى دعوةٌ مستجابةٌ، فتعجَّل كل نبى دعوتَه، وإنى اختبأْتُ دعوتى شفاعةً لأمتى إلى يوم القيامة، فهى نائلة إن شاء الله من مات من أمتى، لايشرك بالله شيئًا"
أقول: للأنبياء عليهم السلام دعوات كثيرة مستجابة، وكذا استُجيب لنبينا صلى الله عليه وسلم فى مواطن كثيرة، لكن لكل نبى دعوةٌ واحدةٌ منبجِسةٌ من الرحمة التى هى مبدأُ نبوته: فإنها إن آمنوا كانت بركاتٍ عليهم، وانبجسَ فى قلب النبى أن يَدْعُوَ لهم، وإن أعرضوا صارت نقماتٍ عليهم، وانبجس فى قلبه أن يدعو عليهم، واستشعر نبينا صلى الله عليه وسلم أن أعظمَ مقاصدِ بعثته أن يكون شفيعًا للناس، وواسطةً لنزول رحمةٍ خاصة يوم الحشر، فاختبأ دعوتَه العظمى المنبجسة من أصل نبوته لذلك اليوم.
[۱۲] قوله صلى الله عليه وسلم: "اللهم إنى اتخذت عندك عهدًا" إلخ.
أقول: اقتضت رحمتُه عليه الصلاة والسلام بأمته، وحَدْبُه عليهم: أن يُقَدِّمَ عند الله عهدًا، ويمثِّل فى حظيرة القدس همتَه، لايزال يصدر منها أحكامُها؛ وذلك: أن يعتبر فى قومه همتَه الضمنية المكنونة، لا الهمةَ البارزةَ.
وذلك: لأن قصدَه فى تعزير المسلمين قولاً أو فعلاً: إقامةُ الدين الذى ارتضى الله لهم

فيهم، وأن يستقيموا، ويذهبَ عنهم اعوجاجُهم؛ وقصدَه في التغليظ على المقضيِّ عليهم بالكفر: موافقةُ الحق في غضبه على هؤلاء، فاختلف المشرعانِ، وإن اتحدت الصورة.

ترجمہ: (۱۱) میں کہتا ہوں: انبیاء علیہم السلام کے لئے بہت مقبول دعائیں ہیں۔ اور اسی طرح ہمارے نبی ﷺ کی بھی بہت سے مقامات میں دعائیں قبول کی گئی ہیں۔ مگر ہر نبی کے لئے ایک دعا ہے جو اس رحمت سے جاری ہونے والی ہے جو کہ وہ اس کی نبوت کا مبدأ ہے (یعنی جو رحمت: بعثت کا باعث ہے اسی نے یہ دعا عنایت فرمائی ہے، اسی کو اوپر ''نبوت کے تعلق'' سے کہا گیا ہے) پس بیشک واقعہ یہ ہے کہ اگر وہ ایمان لے آئیں تو وہ دعا ان پر برکتیں ہوگی اور نبی کے دل میں داعیہ پیدا ہوگا کہ وہ ان کے لئے دعائیں کرے۔ اور اگر وہ روگردانی کریں تو وہ دعا ان کے حق میں عذاب الٰہی ہوجائے گی۔ اور نبی کے دل میں تقاضا پیدا ہوگا کہ وہ ان کے لئے بددعا کرے۔ اور ہمارے نبی ﷺ نے محسوس کیا کہ آپؐ کی بعثت کا بڑا مقصد یہ ہے کہ آپ لوگوں کے لئے سفارشی بنیں۔ اور قیامت کے دن رحمتِ خاصہ کے نزول کے لئے واسطہ بنیں۔ پس آپؐ نے اپنی وہ بڑی دعا چھپالی جو آپؐ کی نبوت کی جڑ سے اس دن کے لئے جاری ہونے والی ہے یعنی جو دعا آپ کو نبوت کے تعلق سے عنایت فرمائی گئی ہے۔

(۱۲) میں کہتا ہوں: اپنی امت پر آپ ﷺ کی مہربانی اور آپؐ کی ان پر شفقت چاہتی ہے کہ پیشتر سے آپؐ اللہ پاک سے وعدہ لے لیں۔ اور بارگاہ مقدس میں اپنی توجہ تام متمثل (پائی جانے والی) کردیں، جس سے اس کے احکام برابر صادر ہوتے رہیں۔ اور وہ (وعدہ کرالینا) یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کی قوم (امت) میں آپؐ کی ضمنی (مشمول) مکنون توجہ تام کا اعتبار کریں، نہ کہ ظاہری توجہ کا۔

اور وہ بات (یعنی ضمنی مکنون توجہ کا اعتبار کرنا) بایں وجہ ہے کہ مسلمانوں کو قول یا فعل سے سزا دینے سے آپؐ کا ارادہ اس دین کو برپا کرنے (روبعمل لانے) کا ہے جس کو اللہ نے لوگوں کے لئے پسند کیا ہے۔ اور یہ مقصد ہے کہ لوگ درست ہوجائیں اور ان کی کجی دور ہوجائے — اور ان لوگوں پر جن کے کفر کا فیصلہ کردیا گیا (یعنی جن کے دلوں پر مہر کردی گی) آپؐ کا ارادہ سختی کرنے میں اللہ تعالیٰ کی ہمنوائی ہے، ان پر اللہ کے غضبناک ہونے میں۔ پس گھاٹیں مختلف ہوگئیں، گو صورت متحد ہے۔

☆ ☆ ☆

ساتواں ذکر: توکل

ساتواں ذکر: توکل ہے یعنی وہ اذکار جن میں توکل کی تعلیم ہے۔ توکل کے معنی ہیں: اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا۔ اور اس کی روح ہے: اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ تام: اس اعتقاد سے کہ سب کچھ کرنے والی ذات اللہ ہی کی ہے۔ بندہ خود کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ انسان کے تمام معاملات پر مکمل غلبہ انہی کو حاصل ہے۔ انہی کی تدبیر کارگر ہے۔ باقی تمام تدابیر مقہور

ومغلوب ہیں۔ سورۃ الانعام آیت ۱۸ میں غور کرنے سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے۔ ارشاد ہے: ﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ﴾ ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں پر غالب ہیں اور وہ بڑی حکمت والے پوری خبر رکھنے والے ہیں۔ یعنی دنیا و آخرت میں جو تکلیف یا راحت خدا کسی کو پہنچانا چاہے: نہ کوئی مقابلہ کر کے اس کو روک سکتا ہے، نہ اس کے غلبہ واقتدار کے نیچے سے نکل کر بھاگ سکتا ہے۔ وہی پوری طرح خبردار ہیں کہ کس بندے کے کیا حالات ہیں، اور اُن کے حالات کے مناسب کس قسم کی کاروائی قرین حکمت ہوگی (فوائد عثانی)

فائدہ: توکل کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ظاہری اسباب اختیار نہ کرے۔ صحیح توکل یہ ہے کہ اسباب اختیار کرنے کے بعد اعتماد اللہ کی ذات پر کرے۔ کام کا انجام اُن پر چھوڑ دے۔ اور غیب سے جو کچھ ظاہر ہو اس پر مطمئن رہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک بدوی نے آپؐ سے سوال کیا: میں اپنے اونٹ کی ٹانگ ران ملا کر، رسّی سے باندھ کر توکل کروں یا یونہی چھوڑ دوں اور اللہ پر بھروسہ کروں؟ آپؐ نے فرمایا: اِعْقِلْهَا وتَوَكَّلْ: ٹانگ باندھ پھر اللہ پر بھروسہ کر (ترمذی عن انس، کنز العمال حدیث ۵۶۸۷)

توکل والے اذکار: رسول اللہ ﷺ نے چند اذکار مقرر فرمائے ہیں، جن میں توکل کی تعلیم ہے:

پہلا ذکر: لاحول ولاقوة إلا بالله العلي العظيم: کچھ قوت وطاقت نہیں، مگر اللہ کی مدد سے جو بلند اور عظمت والے ہیں۔ حدیث شریف میں اس کلمہ کی فضیلت یہ آئی ہے کہ وہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے (مشکوۃ حدیث ۲۳۱۹) یعنی یہ کلمہ بڑی قدر و قیمت والا ہے۔ یہ جنت کے جواہرات میں سے ایک جوہر ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ اللہ کی عظیم معرفت حاصل ہوتی ہے۔ ان کی قدرتِ کاملہ کا اور اپنی درماندگی کا ایقان حاصل ہوتا ہے، جو ثبوتی معرفت ہے۔

دوسرا ذکر: جہاد میں رسول اللہ ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے اللهم! أنت عَضُدِيْ ونصيرى، بِكَ أَحُوْلُ، وَبِكَ أَصُوْلُ، وبك أُقَاتِل: الٰہی! آپ ہی میرا بازو ہیں اور میرے مددگار ہیں۔ آپ ہی کی مدد سے حیلہ کرتا ہوں اور آپ ہی مدد سے حملہ کرتا ہوں، اور آپ ہی کی مدد سے (دشمنانِ دین سے) جنگ کرتا ہوں (مشکوۃ حدیث ۲۴۴۰) اور دیگر وہ اذکار جو اسی انداز پر وارد ہوئے ہیں۔

تیسرا ذکر: گھر سے نکلنے پر یہ ذکر مقرر کیا گیا ہے: بسم الله! توكلتُ على الله! لاحول ولاقوة إلا بالله: بنام خدا! اللہ پر بھروسہ کیا میں نے! کچھ طاقت وقوت نہیں مگر اللہ کی استعانت سے (مشکوۃ حدیث ۲۴۴۳)

چوتھا ذکر: رسول اللہ ﷺ نے اپنی ایک صاحب زادی کو یہ ذکر تلقین فرمایا کہ وہ صبح میں کہا کریں: سبحان الله وبحمده، ولاقوة إلا بالله، ماشاء الله كان، وما لم يَشَأْ لم يكن، أَعْلَمُ أن الله على كل شيئ قدير، وأن الله قد أحاط بكل شيئ علمًا (اللہ پاک ہیں اور اپنی خوبیوں کے ساتھ ہیں۔ اور کچھ قوت نہیں مگر اللہ کی مدد سے۔ جو اللہ نے چاہا ہوا اور جو نہ چاہا نہ ہوا۔ میں جانتی ہوں یعنی اعتقاد رکھتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو علم میں گھیر رکھا ہے) جو شخص صبح یہ کلمات کہہ لے وہ شام تک اور شام کو کہے تو صبح

تک بلاؤں سے محفوظ رہتا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۲۳۹۳)

ومنها : التوكل: وروحُه: توجهُ النفس إلى الله بوجه الاعتمادِ عليه، ورؤيةِ التدبير منه، ومشاهدةِ الناس مقهورين في تدبيره، وهو مَشْهَدُ قولِه تعالى:﴿وهو القاهر فوق عباده،ويرسل عليكم حفظةً﴾

وقد سنّ رسول الله صلى الله عليه وسلم فيه أذكاراً:

منها :" لاحولَ ولاقوة إلا بالله العليّ العظيم" وفيه:" أنه كنز من كنوز الجنة" و ذلك: لأنه يُعِدُّ النفس لمعرفة جليلة.

ومنه: قوله صلى الله عليه وسلم:" بك أصول، وبك أَحُوْل" وماورد على هذا الأسلوب.

ومنه: قوله عليه الصلاة والسلام:" توكلت على الله" وقوله عليه الصلاة والسلام:" أَعْلَمُ أن الله على كل شيئ قدير، وأن الله قد أحاط بكل شيئ علما" ونحو ذلك.

ترجمہ: اوراذ کار میں سے: توکل ہے۔ اوراس کی روح: نفس کا اللہ کی طرف متوجہ ہونا ہے، ان پر اعتماد کرنے اور ان کی طرف سے تدبیر دیکھنے اور لوگوں کو اللہ کی تدبیر کے سامنے مغلوب مشاہدہ کرنے کی جہت سے۔ اور وہ مقام غور ہے ارشاد باری تعالیٰ: "اور وہ غالب ہیں اپنے بندوں پر اور وہ نگہبان فرشتے بھیجتے ہیں" کا (یعنی اس آیت میں غور کیا جائے تو توکل کا مفہوم نکلتا ہے) اور توکل میں رسول اللہ ﷺ نے چند اذکار مسنون کئے ہیں۔ الی آخرہ۔

ملحوظہ: مذکورہ آیت سورۃ الانعام کی آیت ۶۱ ہے۔ یہ آیت اس موقع کے مناسب نہیں۔ اس موقع کی آیت ۱۸ ہے جو اوپر شرح میں لکھی گئی ہے۔

فائدہ: مَشْہَد: تصوف کی اصطلاح ہے۔ غور کرنے سے جو بات ذہن میں آتی ہے، اسی طرح آیات کے معانی میں غور کرنے سے جو بات مفہوم ہوتی ہے وہ مشہد کہلاتی ہے (حاشیہ عربی حجۃ اللہ)

☆ ☆ ☆

آٹھواں ذکر: استغفار

آٹھواں ذکر: استغفار ہے۔ استغفار کے معنی ہیں توبہ کرنا یعنی اپنے گناہوں اور قصوروں کی معافی مانگنا اور بخشش طلب کرنا۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: استغفار کی حقیقت اور اس کی روح یہ ہے کہ آدمی اپنے ان گناہوں کو سوچے جنھوں نے اس کے نفس کو گھیر رکھا ہے یعنی اس کو میلا اور گندہ کر رکھا ہے۔ اور اسبابِ مغفرت اختیار کر کے نفس کو

ان گناہوں سے پاک کرے۔ اسبابِ مغفرت: مثلاً مددِ روحانی اور فیضِ ملکوتی۔ جن کا بیان آگے آرہا ہے۔

اسبابِ مغفرت: تین ہیں: بہترین عمل، فیضِ ملکوتی اور مدد روحانی۔ تفصیل درج ذیل ہے:

پہلا سبب ــــ بہترین نیک عمل ــــ آدمی کوئی ایسا نیک عمل کرے کہ رحمتِ حق اس کے شاملِ حال ہوجائے، اور ملائکہ اس کے عمل سے خوش ہوکر اس کے لئے دعا گو بن جائیں تو اس کی خطائیں خود بخود معاف ہوجاتی ہیں۔ جیسے کفر ونفاق سے توبہ کرنا اور مخلص مؤمنین کے زُمرہ میں شامل ہونا ایسا نیک عمل ہے کہ اس سے سابقہ تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں اور سورۃ المؤمن آیت سات میں ایمان لانے والوں کے لئے ملأاعلی کے استغفار کا تذکرہ ہے۔

یا آدمی کوئی ایسا نیک عمل کرے کہ اللہ تعالیٰ انتظامِ عالم میں جو کچھ چاہتے ہیں اس کی تکمیل ہو۔ یعنی بندہ اللہ کے کاز میں آلۂ کار بن جائے۔ ایسے کام بہت ہیں۔ مثلاً: (۱) وہ کام جو عام لوگوں کے لئے بے حد مفید ہیں، جیسے جہاد میں شہادت: ایسا عمل ہے کہ اس سے حقوق العباد کے علاوہ تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں (۲) کسی محتاج کی حاجت روائی، جیسے مجاہد کی اعانت، تنگ دست مقروض کی رعایت حتی کہ پیاس سے جاں بلب کتّے کو پانی پلانے سے ایک بدکار عورت کو معاف کردیا گیا تھا۔

دوسرا سبب ــــ فیضِ ملکوتی ــــ آدمی فرشتہ صفت بن جائے۔ اپنے احوال میں ملائکہ کی مشابہت اختیار کرے۔ ملکوتی انوار سے بہرہ ور ہو۔ اپنی بہیمیت کو ذرا لگام دے، اس کی تیزی توڑے اور اس کے شر سے محفوظ ہوجائے۔ یعنی زندگی کا دھارا موڑ دے اور پاکیزہ زندگی اختیار کرے تو بھی گناہوں پر قلمِ عفو پھیر دیا جاتا ہے جیسے حجِ مقبول سے تمام سابقہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں، کیونکہ ایسے حج سے زندگی کا رخ بدل جاتا ہے۔

تیسرا سبب ــــ مدد روحانی ــــ جب گنہگار بندہ ندامت کے آنسو بہاتا ہے۔ اور کوتاہی کے احساس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور وہ اس یقین سے معافی طلب کرتا ہے کہ رب کریم ضرور نظرِ کرم فرمائیں گے تو لطف کی بارش ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ متفق علیہ روایت ہے: ''اللہ کے ایک بندے نے گناہ کیا۔ پھر ملتجی ہوا: اے میرے پروردگار! مجھ سے گناہ ہوگیا، مجھے معاف فرما۔ تو اللہ تعالیٰ (ملائکہ سے) فرماتے ہیں: میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی مالک ہے جو گناہوں پر پکڑتا بھی ہے، اور معاف بھی کرتا ہے (سنو!) میں نے اپنے بندے کا گناہ بخش دیا اور اس کو معاف کردیا'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۳۳۳) غرض جب بندہ توبہ میں یہ مددِ روحانی استعمال کرتا ہے تو اس کے گناہ پاش پاش ہوجاتے ہیں۔

استغفار کے جامع ترین کلمات: درج ذیل ہیں:

پہلا استغفار: نبی ﷺ اس طرح دعا فرمایا کرتے تھے: اللّٰهم! اغْفِرلی خَطِيْئَتِیْ وَجَهْلِیْ، وإِسْرَافِیْ فی أمری، وما أنت أعلم به منی. اللهم اغفرلی جِدِّیْ وَهَزْلِیْ وَخَطَئِیْ وعَمْدِیْ، وكلُّ ذلك عندی، اللهم اغفرلی ما قَدَّمْتُ وما أَخَّرْتُ، وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ، وَمَا أَنْتَ أَعلمُ به منی، أنت المقدِّم وأنت المؤخِّرُ، وأنت علی كل شیئٍ قدير: اے اللہ! میرے لئے معاف فرمائیں میری خطا اور میری نادانی اور میرا اپنے معاملہ میں حد سے تجاوز کرنا، اور میرے وہ

قصور جن کو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ اے اللہ! میرے لئے معاف فرمائیں وہ گناہ جو میں نے آگے بھیجے ہیں اور وہ گناہ جو میں نے پیچھے رکھے ہیں یعنی آئندہ کرونگا۔ اور وہ گناہ جو میں نے چپکے سے کئے ہیں اور وہ گناہ جو میں نے علانیہ کئے ہیں، اور وہ گناہ جن کو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ آپ ہی آگے کرنے والے ہیں اور آپ ہی پیچھے کرنے والے ہیں اور آپ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۸۲)

دوسرا استغفار: رسول اللہ ﷺ نے ایک کلمہ کو سید الاستغفار (سب سے بڑا استغفار) کہا ہے۔ اور وہ یہ ہے: اللھم أنتَ ربی، لا إلٰہ إلا أنت، خَلَقْتَنِیْ وأنا عبدُك، وأنا علی عھدِك ووَعْدِكَ ما استطعتُ، أعوذ بك من شر ما صَنَعْتُ، أَبُوْءُ لك بنعمتك علیَّ، وأَبُوْءُ بذنبی، فاغفرلی، فإنہ لایغفر الذنوبَ إلا أنت (اے اللہ! آپ ہی میرے رب ہیں، آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، آپ نے مجھے پیدا کیا اور میں آپ کا بندہ ہوں۔ اور میں آپ کے ساتھ کئے ہوئے پیمان پر اور آپ کے ساتھ کئے ہوئے وعدے پر قائم ہوں، جہاں تک میرے بس میں ہے۔ میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں ان کاموں کے شر سے جو میں نے کئے ہیں۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے نعمتوں سے نوازا ہے، اور میں اقرار کرتا ہوں اپنے گناہ کا، پس مجھے معاف فرمادیں، کیونکہ آپ کے سوا گناہوں کو بخشنے والا کوئی نہیں) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو بندہ یقین کے ساتھ دن کے کسی حصہ میں یہ کلمات کہے اور اُسی دن اس کو موت آگئی تو وہ بلاشبہ جنت میں جائے گا۔ اور جو رات کے کسی حصہ میں یہ کلمات کہے اور اسی رات وہ چل بسا تو وہ بلاشبہ جنت میں جائے گا'' (رواہ البخاری، مشکوٰۃ حدیث ۲۳۳۵)

استغفار سے دل کا ابر چھٹتا ہے!

حدیث ——— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بیشک میرے دل پر ابر آجاتا ہے، اور میں دن میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں'' (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث ۲۳۲۴)

تشریح: قلب نبوت پر جو ابر آتا تھا اس کی حقیقت سمجھنے کے لئے چار باتیں جاننی ضروری ہیں:

پہلی بات: دل کا حال ہمیشہ یکساں نہیں رہتا۔ وہ احوالِ متواردہ سے متأثر ہوتا ہے۔ وہ کبھی حالت علو (بلندی) میں ہوتا ہے تو کبھی حالت نزول (پستی) میں۔ اول ملکیت کا فیض ہے اور ثانی بہیمیت کا غَین (گھرا ہوا ابر) مسلم شریف (کتاب التوبہ ۱:۱۷ ۲۶) میں حضرت حنظلہ اُسیدی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ صحابہ جب مجلس نبوی میں ہوتے تھے تو حال اور ہوتا تھا، اور جب وہاں سے نکل کر ازواج واولاد اور جائداد سے اختلاط ہوتا تھا تو دل کی وہ کیفیت باقی نہیں رہتی تھی۔ یہی حالتِ علو اور حالتِ نزول ہے۔

دوسری بات: نبی ﷺ مامور تھے کہ خود کو عام لوگوں کے ساتھ روکیں یعنی فریضۂ نبوت کی ادائیگی کے لئے عوام سے اختلاط اور میل جول ضروری تھا۔ سورۃ الکہف آیت ۲۸ میں ہے: ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ﴾

الآیۃ یعنی آپؐ خود کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھیں جو صبح وشام اپنے رب کو پکارتے ہیں الی آخرہ۔

تیسری بات: عام لوگوں کے ساتھ اختلاط محض حالتِ علو میں مفید نہیں، کچھ نزول بھی ضروری ہے۔ ورنہ لوگ آپؐ سے کماحقہ استفادہ نہیں کرسکیں گے۔ کتاب میں ملکیت وبہیمیت کی امتزاجی کیفیت سے یہی حالت مراد ہے۔

چوتھی بات: تشریع احکام کے لئے بشری احوال کی واقفیت ضروری ہے۔ مثلاً: کھانا پینا، بھوک پیاس، نکاح جماع، بیع شراء وغیرہ کی معرفت ضروری ہے۔ اور یہ واقفیت محض عقلی نہیں ہونی چاہئے، بلکہ فطری ہونی چاہئے۔ کیونکہ انبیاء کچھ احکام ذوق ووجدان سے مقرر کرتے ہیں، محض قیاس وتخمین سے مقرر نہیں کرتے۔ اور بشری احوال کا چکھنا اور جاننا بحالت علو ممکن نہیں۔ اسی وجہ سے ملائکہ بشری احوال کا کماحقہ ادراک نہیں کرسکتے۔ اس کے لئے بہیمیت کا امتزاج یعنی کچھ نزول بھی ضروری ہے۔

اب شاہ صاحب قدس سرہ کی بات پیش کی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:

اس ابر کی حقیقت: یہ ہے کہ نبی ﷺ مامور تھے کہ ملکیت اور بہیمیت کے درمیان ملی جلی کیفیت کے ساتھ خود کو عام لوگوں کے ساتھ روکیں یعنی ان کے ساتھ میل جول رکھیں۔ تاکہ آپؐ قیاس وتخمین سے نہیں، بلکہ ذوق ووجدان سے جو احکام مشروع کریں ان میں آپ لوگوں کے لئے پیشوا ہوں یعنی وہ احوال آپ کے لئے صرف فہمیدہ نہ ہوں بلکہ چشیدہ بھی ہوں اور علی وجہ البصیرت ان کے احکام مقرر کریں۔ اور اس ہیئتِ امتزاجیہ کے لئے ابر لازم ہے یعنی جب حالتِ علو کے ساتھ حالتِ نزول بھی ملے گی تو ضرور قلب نبوت بشری احوال کی طرف بھی ملتفت ہوگا۔ یہی دل کا ابر (پردہ) ہے۔ اور وہ استغفار سے چھٹتا ہے، اس لئے آپؐ بکثرت استغفار کیا کرتے تھے۔ پس **محسنین** (سالکین، نیکوکاروں) کو بھی غفلت کا پردہ ہٹانے کے لئے بکثرت استغفار کرنا چاہئے۔

ومنها: الاستغفار، وروحه: ملاحظةُ ذنوبِه التى أحاطت بنفسه، ونَفْضُها عنها بمدد روحانى وفيض ملكى، وله أسباب:

منها: شمول رحمة الله إياه بعملٍ يَصْرِفُ إليه دعوات الملأ الأعلى، أو يكون هو فيه جارحة من جوارح التدبير الإلٰهى فى إظهار نافعة للجمهور أو سدِّ خَلَّةٍ للمحتاج، أو ما يُضاهى ذلك.

ومنها: التشبه بالملائكة فى هيئتهم، ولمعانِ أنوار الملكية، وخمود شرور البهيمية، باضمحلال أجزائها، وكسر سورتها.

ومنها: التطلع إلى الجبروت، ومعرفةُ الحق، واليقينُ به، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "قال الله تعالى: أَعَلِمَ عبدى أن له ربا يغفر الذنب، ويأخذ به؟ غفرت لعبدى" فإذا استعمل العبد هذه الإمدادَ الروحانية فى نَفْضِ ذنوبه عن نفسه اضمحلت عنها.

ومن أجمع صيغ الاستغفار:

[۱] اللهم اغفرلي خطيئتي، وجهلي، وإسرافي في أمري، وما أنت أعلم به مني، اللهم اغفرلي جِدّي وهزلي، وخَطَئِيْ وعمدي، وكلُّ ذلك عندي، اللهم اغفرلي ما قدمت وماأخرت، وما أسررت وما أعلنت، وما أنت أعلم به مني، أنت المقدّم وأنت المؤخِّر، وأنت على كل شيئ قدير.

[۲] وسيد الاستغفار:" اللهم أنت ربي، لا إله إلاأنت، خلقتني وأنا عبدك، وأنا على عهدك ووعدِك ما استطعتُ، أعوذ بك من شر ماصنعتُ، أبوءُ لك بنعمتك عليّ، وأبوء بذنبي، فاغفرلي، فإنه لايغفر الذنوب إلا أنت"

قال صلى الله عليه وسلم:" إنه لَيُغان على قلبي، وإني لأستغفر الله تعالى في اليوم مائة مرة"

أقول: حقيقة هذا الغين: أنه صلى الله عليه وسلم مأمور أن يَصْبِرَ نفسَه مع عامة المؤمنين في هيئةٍ امتزاجيةٍ بين الملكية والبهيمية، ليكون قدوةً للناس فيما يَسُنُّ لهم على وجه الذوق والوجدان، دون القياس والتخمين، وكان من لوازمها الغَيْنُ، والله أعلم.

ترجمہ: اوراذکار میں سے استغفار ہے۔ اوراس کی روح: اپنے گناہوں کو پیش نظر لانا ہے، جنھوں نے اس کے نفس کو گھیر رکھا ہے۔ اوران گناہوں کو نفس سے جھاڑنا ہے روحانی مدداور ملکوتی فیض کے ذریعہ —— اورنفض (جھاڑنے) کے لئے اسباب ہیں: ازانجملہ: کسی عمل کی وجہ سے اللہ کی رحمت کا بندے کو شامل ہونا ہے۔ پھیرتا ہے وہ عمل بندے کی طرف ملأاعلیٰ کی دعاؤں کو —— یا بندہ اس عمل میں انتظام الٰہی کے اعضاء میں سے کوئی عضو ہوتا ہے یعنی وہ آلہ کار ہوتا ہے کسی مفید بات کو عام لوگوں کے لئے ظاہر کرنے میں یا محتاج کی کسی حاجت کو بند کرنے میں یا وہ کام جو اس کے مشابہ ہیں —— اور ازانجملہ: ملائکہ کی مشابہت اختیار کرنا ہے ان کی حالت میں، اور ملکوت کے انوار کے چمکنے میں، اور بہیمیت کی برائیوں کے بجھنے میں، بہیمیت کے اجزاء کو مضمحل کرنے کے ذریعہ اوراس کی تیزی کو توڑنے کے ذریعہ —— اورازانجملہ: جبروت (اللہ تعالیٰ) کی طرف جھانکنا ہے۔ اوراللہ کی معرفت اوراللہ کا یقین ہے (عطف تفسیری ہے، دونوں جملوں کا مطلب ایک ہے) اوروہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:.......... پس جب بندہ اپنے نفس سے اپنے گناہوں کو جھاڑنے میں یہ روحانی امداداستعمال کرتا ہے تو وہ ذنوب نفس سے پاش پاش ہوجاتے ہیں۔

اوراستغفار کے جامع ترین کلمات میں سے: (پھر دو استغفار ہیں۔ جن کا ترجمہ گذر چکا)

آنحضرت ﷺ نے ارشادفرمایا: ''بیشک شان یہ ہے کہ میرے دل پر ابر آجاتا ہے اور بیشک میں دن میں سو بار اللہ تعالیٰ سے بخشش چاہتا ہوں''

میں کہتا ہوں: اس ابر کی حقیقت یہ ہے کہ نبی ﷺ مامور ہیں کہ خود کو روکیں عام لوگوں کے ساتھ: ملکیت و بہیمیت

کے درمیان امتزاجی حالت میں، تاکہ آپ لوگوں کے لئے پیشوا ہوں ان باتوں میں جو آپ مقرر کریں لوگوں کے لئے ذوق ووجدان کی جہت سے، نہ کہ قیاس وتخمین کی جہت سے۔ اوراس ہیئتِ امتزاجیہ کے لوازم میں سے ابر ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

فائدہ: غَیْن اور غَیْم تقریباً مترادف ہیں۔ دونوں کے معنی ہیں: ابر۔ ایک اور لفظ رَیْن ہے۔ جس کے معنی ہیں: زنگ اور میل۔ عام لوگوں کا ذہن اس لفظ کی طرف چلا گیا ہے، اس لئے حدیث ان کے لئے مشکل ہوگئی ہے۔ اور غَیْنٌ کا فعل عربی میں مجہول آتا ہے، مگر اردو میں معروف سے ترجمہ کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: أُغِیْن علی قلبه اور غِیْنَ علی قلبه: اس کے دل پر پردہ آگیا۔ غرض: زنگ اور میل تو شانِ نبوت کے خلاف ہے، مگر حجاب میں کوئی قباحت نہیں۔

تصحیح: فی هیئتهم مطبوعہ میں فی هیئاتهم تھا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

نواں ذکر: اللہ کے نام سے برکت حاصل کرنا

نواں ذکر: اللہ کے نام سے برکت حاصل کرنا ہے۔ اور اللہ کے ناموں میں برکت اس وجہ سے ہے کہ مخلوقات کی ہر نوع میں کچھ چیزیں اللہ کی تجلیات کا مورد ہوتی ہیں، اس وجہ سے وہ متبرک ہوجاتی ہیں۔ جیسے انسانوں میں انبیاء اور زمین میں کعبہ۔ اسی طرح الفاظ کی دنیا میں اللہ تعالیٰ کے وہ نام بابرکت ہیں جو غیب کے ترجمان حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے ذریعہ نازل کئے گئے ہیں، اور جو ملأ اعلی میں مروّج ہیں۔ پس جب بندہ ان ناموں کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ اللہ کی رحمت کو قریب پاتا ہے۔

اللہ کے نام یاد رکھنے کی فضیلت کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے ننانوے، ایک کم سو، نام ہیں، جو ان کو یاد رکھے گا جنت میں جائے گا'' (مشکوۃ حدیث ۲۲۸۷)

تشریح: اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام یاد رکھنے کی فضیلت دخولِ جنت ہے، اور اس کے تین اسباب ہیں:

پہلا سبب: ان ناموں سے اللہ تعالیٰ کی معرفتِ کاملہ حاصل ہوتی ہے، کیونکہ جو صفات اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کی جانی چاہئیں، اور جن چیزوں کی ان کی ذات سے نفی کی جانی چاہئے: ان ننانوے ناموں میں وہ سب کچھ آگیا ہے۔ پس یہ ننانوے نام اللہ تعالیٰ کی معرفت کا مکمل نصاب ہیں۔

دوسرا سبب: یہ نام اللہ تعالیٰ کو بے حد پسند ہیں، کیونکہ یہ بابرکت ہیں اور عالم قُدس میں ان کو قبولیت کا مقام خاص

حاصل ہے۔

تیسرا سبب: یہ نام بارگاہِ بے نہایت کی ترجمانی کرتے ہیں، اس لئے اجرِ عظیم کے مستحق ہیں۔ جب بندے کے نامۂ اعمال میں ان ناموں کی صورت ٹھہرتی ہے یعنی وہ بندے کا مقبول عمل قرار پاتے ہیں تو ضروری ہے کہ ان کی پہنائی بے پناہ رحمت کی طرف ہو۔

اسم اعظم کی اہمیت کی وجہ

اللہ تعالیٰ کے کچھ نام اہم ترین نام ہیں جو ''اسم اعظم'' کہلاتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر ان کے ذریعہ مانگا جائے تو اللہ تعالیٰ مراد پوری فرماتے ہیں۔ اور اگر ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو پکارا جائے تو وہ جواب دیتے ہیں۔ یہ وہ نام ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جامع ترین تجلیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اور وہ نام ملأ اعلی کے درمیان بکثرت مروّج ہیں۔ اور غیب کے ترجمان حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی زبانوں پر ہر زمانہ میں چڑھے رہے ہیں۔ اور ان ناموں میں سے ہر نام میں عالم بالا میں اللہ کی مخصوص تجلی جلوہ فرما ہے۔ اور پہلے (رحمۃ اللہ ۳:۵۲۲ میں) زید شاعر کاتب (محرّر) کی مثال گذر چکی ہے۔ یہ زید کے دو کمال ہیں اور ان دونوں کی صورتیں علحدہ علحدہ ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ہر نام پاک کی صورت علحدہ ہے اور وہ علحدہ تجلی کی جلوہ گاہ ہے۔

اسم اعظم کیا ہے؟ اسم اعظم صراحت کے ساتھ متعین نہیں کیا گیا۔ کسی درجہ میں اس کو مبہم رکھا گیا ہے۔ جیسے شب قدر کو اور جمعہ کی ساعتِ مرجوّہ کو مبہم رکھا گیا ہے۔ احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ درج ذیل نام اسم اعظم ہو سکتے ہیں:

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے ایک صاحب کو اس طرح دعا کرتے سنا اللّٰهم إني أسألك بأنك أنت اللّٰهُ، لا إلٰه إلا أنتَ الْأَحدُ الصَّمَدُ الذي لم يلد ولم يولد ولم يكن له كفوًا أحد تو آپؐ نے فرمایا: ''اس بندے نے اللہ سے اس کے اس اسم اعظم کے وسیلہ سے دعا کی ہے جس کے ذریعہ مانگا جائے تو وہ دیتا ہے، اور پکارا جائے تو وہ جواب دیتا ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۲۸۹)

حدیث ـــــ ایک دوسرے صاحب کو رسول اللہ ﷺ نے اس طرح دعا کرتے سنا: اللّٰهم إني أسألك بأن لك الحمدُ، لا إلٰه إلا أنت الْحنَّانُ الْمَنَّانُ، بديعُ السماوات والأرض، ياذا الجلال والإكرام، ياحَيُّ يا قيوم أسألك تو آپؐ نے فرمایا کہ اس بندے نے اس اسم اعظم کے وسیلہ سے دعا کی ہے کہ اس کے ذریعہ مانگا جائے تو وہ دیتے ہیں اور پکارا جائے تو وہ جواب دیتے ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۲۲۹۰)

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کا اسم اعظم ان دو آیتوں میں ہے: ﴿وَإِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ، لا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرحيم﴾ (سورۃ البقرہ آیت ۱۶۳) اور دوسری سورہ آل عمران کی ابتدائی آیت: الٓمٓ اللّٰهُ لا إلٰه إلا هو

الحی القیوم ہے (مشکوۃ حدیث ۲۲۹۲)

ومنها: التبرك باسم الله تعالى :وَسِرُّه: أن الحق له تَدَلٍّ فى كل نَشْأَةٍ، ومن تدلّيه فى النشأة الحرفيةِ: الأسماءُ الإلّهية، النازلةُ على ألسنةِ التَرَاجِمَة، والمتداولةُ فى الملأ الأعلى، فإذا توجَّه العبدُ إليه وجد رحمة الله قريبةً.

• قال صلى الله عليه وسلم:" إن لله تسعةً وتسعين اسماً مائةً إلا وحدًا، من أحصاها دخل الجنة"

أقول: من أسباب هذا الفضل: أنها نصابٌ صالحٌ لمعرفة ما يُثْبَتُ للحق، ويُسْلَبُ عنه، وأن لها بركةً وتمكنًا فى حظيرة القدس، وأن صورتَها إذا استقرَّت فى صحيفةِ عمله وجب أن يكون انفساحُها إلى رحمة عظيمة.

واعلم: أن الاسم الأعظم الذى إذا سُئل به أعطى، وإذا دُعى به أجاب: هو الاسم الذى يدل على أَجْمَعِ تَدَلٍّ من تدليات الحق، والذى تداوله الملأ الأعلى أكثرَ تداولٍ، ونطقت به التراجِمَةُ فى كل عصر؛ وقد ذكرنا أن زيدًا الشاعِرَ الكاتبَ له صورةُ أنه شاعر، وصورةُ أنه كاتب، وكذلك للحق تدلّيات فى موطن من المثال.

وهذا المعنى يصدق:

[الف] على:" أنتَ الله، لا إلّه إلا أنت الأحد الصمد، الذى لم يلد ولم يولد، ولم يكن له كفوًا أحدٌ"

[ب] وعلى:" لك الحمد، لا إلّه إلا أنت الحنان المنان، بديع السماوات والأرض، يا ذا الجلال والإكرام، يا حى يا قيوم"

[ج] ويصدق على أسماءَ تُضاهى ذلك.

ترجمہ: اوراذکار میں سے: اللہ کے ناموں سے برکت حاصل کرنا ہے۔ اوراس (برکت) کا راز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہر عالم میں تجلی ہے۔ اور عالم حروف میں اس کی تجلی میں سے اسماءِ الٰہیہ ہیں۔ جو مترجمین کی معرفت نازل ہوئے ہیں، اور جو ملأ اعلی میں متداول ہیں۔ پس جب بندہ اللہ کے نام کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ اللہ کی رحمت کو نزدیک پاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں، ایک کم سو، جو شخص ان کو یاد رکھے گا جنت میں داخل ہوگا'' میں کہتا ہوں: اس فضیلت (دخول جنت) کے اسباب میں سے: (۱) یہ ہے کہ وہ ننانوے نام کافی مقدار ہیں اُن باتوں کو جاننے کے لئے جو حق تعالیٰ کے لئے ثابت کی جاتی ہیں، اور جن کی حق تعالیٰ سے نفی کی جاتی ہے (۲) اور یہ بات ہے کہ ان ناموں کے لئے برکت اور مقام ومرتبہ ہے بارگاہِ مقدس میں (۳) اور یہ بات ہے کہ ان ناموں کی صورت جب بندے کے نامۂ اعمال میں ٹھہرتی ہے تو ضروری ہے کہ اس کی کشادگی بڑی رحمت کی طرف ہو۔

اور جان لیں کہ وہ اسم اعظم: جس کے ذریعہ طلب کیا جائے تو عنایت فرماتے ہیں۔ اور جب اس کے ذریعہ پکارا جائے تو جواب دیتے: وہ وہ نام ہیں جو حق تعالیٰ کی تجلیات میں سے جامع ترین تجلی پر دلالت کرتے ہیں۔ اور وہ نام ہیں جن کو ملأ اعلیٰ عام طور پر برتتے ہیں۔ اور جن کے ساتھ ہر زمانہ میں مترجمین کی زبانیں گویا ہوئی ہیں۔ اور ہم نے یہ بات ذکر کی ہے کہ زید شاعر و منشی: اس کے لئے اس کی صورت ہے کہ وہ شاعر ہے، اور اس کی صورت ہے کہ وہ منشی (مضمون نگار) ہے۔ اور اسی طرح عالم مثال میں کسی جگہ میں حق تعالیٰ کے لئے تجلیات ہیں۔

اور یہ معنی (جامع ترین تجلیات پر دلالت کرنا) صادق آتے ہیں: (الف) أنت الله إلخ پر (ب) اور لك الحمد إلخ پر (ج) اور ان ناموں پر صادق آتے ہیں جو ان ناموں کے مشابہ ہیں۔

☆ ☆ ☆

دسواں ذکر: درود شریف اور اس کی حکمتیں

دسواں ذکر: نبی ﷺ پر درود بھیجنا ہے۔ درود: فارسی کلمہ ہے۔ اس کے لئے عربی لفظ ''صلوٰۃ'' ہے، جس کے معنی ہیں: غایتِ انعطاف یعنی آخری درجہ کا میلان۔ میلان: محسوس بھی ہوتا ہے اور معقول (فہمیدہ) بھی۔ جیسے عُلو (بلندی) اور فوقیت: محسوس بھی ہوتی ہے اور معقول بھی۔ عرش پر اللہ تعالیٰ کی فوقیت معنوی ہے، اور چھت پر زید کی فوقیت محسوس۔ اسی طرح نماز میں بندے کا اللہ کی طرف میلان محسوس ہے۔ رکوع وسجود اس کے پیکر ہائے محسوس ہیں۔ اور درود شریف میں میلان معنوی ہے۔ پھر اس معنوی میلان کی بھی نوعیتیں مختلف ہیں۔ اللہ کا میلان: انعام واکرام اور الطاف واحسان ہے۔ ملائکہ کا: استغفار اور مؤمنین کا: دعا (تفصیل کے لئے دیکھیں التعلیق الصبیح ۱:۲۶۲)

نبی ﷺ پر درود بھیجنے کا حکم سورۃ الاحزاب آیت ۵۶ میں بڑے مؤثر انداز میں آیا ہے۔ ارشاد ہے: ''بیشک اللہ تعالیٰ اور ان کے فرشتے اِس نبی پر درود بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی آپ پر درود بھیجو، اور خوب سلام بھیجو'' یعنی اللہ تعالیٰ اور ملائکہ کا یہ دستور و معمول ہے، پس تم بھی اس کو اپنا معمول بنالو۔ اور اس محبوب ومبارک عمل میں شریک ہوجاؤ۔ اور احادیث میں بھی درود شریف کے بڑے فضائل آئے ہیں۔ ذیل میں دو روایتیں ذکر کی جاتی ہیں:

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر دس مرتبہ درود بھیجتے ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۹۲۱)

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن مجھ سے قریب تر وہ شخص ہوگا جو مجھ پر سب سے زیادہ درود بھیجتا ہوگا'' (مشکوٰۃ حدیث ۹۲۳)

تشریح: نبی ﷺ پر صلوٰۃ وسلام بھیجنے میں تین حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت —— رحمت کے جھونکوں سے استفادہ —— انسانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ رحمتِ الٰہی کے جھونکوں کے سامنے آئیں اوران سے بہرہ ور ہوں۔ حدیث میں ہے کہ: ''رحمتِ الٰہی کے جھونکوں کے درپے ہوو۔ اللہ کی رحمت کے جھونکے ضرور چلتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں ان سے بہرہ ور فرماتے ہیں'' (درمنثور ۳: ۳۱۸ و ۴: ۲۵) اور اللہ کی رحمت کے جھونکوں کے درپے ہونے کی بہترین صورت: شعائر اللہ کی تعظیم ہے۔ اور بڑے شعائر اللہ چار ہیں: قرآن، کعبہ، نبی اور نماز۔ تفصیل رحمۃ اللہ ۱: ۷۰۴-۱۴۷ میں گذر چکی ہے۔ کعبہ شریف: انوار وتجلیات کے اترنے کی جگہ اور زمین میں اللہ کے دین کی امتیازی نشانی ہے، اس لئے اس کی تعظیم ضروری ہے۔ اور اس کی تعظیم کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے پاس پہنچا جائے یعنی حج یا عمرہ کیا جائے۔ اور اس کے پاس ہاتھ پسار کر دعائیں مانگی جائیں۔ اس کے پاس ٹھہرا جائے یعنی اعتکاف وطواف کیا جائے تو ضرور رحمت کے جھونکوں سے حصہ ملے گا۔

اور نبی ﷺ کی روح پاک کا ملأ اعلی میں بزرگ ترین مقام ہے۔ آپؐ زمین والوں پر جودِ الٰہی کے نزول کا واسطہ ہیں، اس لئے آپؐ کی تعظیم بھی واجب ہے۔ اور آپؐ کی تعظیم کا طریقہ یہ ہے کہ عظمت ومحبت کے ساتھ آپ کا ذکر کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ سے آپؐ کے حق میں دعا کی جائے۔ اور آپؐ کی ذات سے اپنی ایمانی وابستگی اور وفا کیشی کا اظہار کیا جائے۔ ایسا مؤمن بھی رحمتِ الٰہی کے جھونکوں سے ضرور بہرہ ور ہوگا۔

دوسری حکمت —— درود شریف دین کو تحریف سے بچاتا ہے —— اس سے شرک کی جڑ کٹتی ہے۔ درود بھیجنے سے یہ بات ذہن نشیں ہوتی ہے کہ سید کائنات ﷺ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت وعنایت اور نظر کرم کے محتاج ہیں۔ اور محتاج ہستی: بے نیاز ذات کی شریک وسہیم نہیں ہوسکتی۔ تحریف ہی کے سدّ باب کے لئے یہ حکم دیا گیا ہے کہ قبر اطہر کی زیارت ضرور کی جائے مگر اس زیارت کو میلا ٹھیلا نہ بنایا جائے (مشکوۃ حدیث ۹۲۶) جس طرح یہود ونصاری نے اپنے نبیوں کی قبروں کے ساتھ (اور جاہل مسلمانوں نے اولیاء کی قبروں کے ساتھ) یہ معاملہ کر رکھا ہے۔ موسم حج کی طرح یعنی جس طرح سال میں ایک مرتبہ کعبہ شریف کی زیارت کے لئے حج کیا جاتا ہے: یہود ونصاری اور جہلاء مسلمین نے بھی ان قبور کی زیارت کے لئے عرس تجویز کر رکھے ہیں، جو دین میں بگاڑ کا باعث ہیں، اس لئے مذکورہ ارشاد کے ذریعہ اور درود شریف کے ذریعہ اس کا سدّ باب کیا گیا ہے۔

تیسری حکمت —— روح نبوی سے استفادہ —— کاملین کی ارواح اپنے جسموں سے جدا ہونے کے بعد یعنی موت کے بعد رکی ہوئی موج کی طرح ہوجاتی ہیں۔ اب ان میں جدید ارادہ اور عارضی داعیہ کوئی تحریک پیدا نہیں کرتا یعنی جس طرح پانی کی موج کو کوئی پہاڑ وغیرہ روک دے تو اس کا تموّج ختم ہوجاتا ہے، اسی طرح موت کے بعد کاملین کی ارواح مشاہدۂ حق میں مشغول ہوجاتی ہیں۔ اب کسی چیز کی طرف ان کا التفات نہیں رہتا —— اور جو نفوس ان سے ورے ہیں یعنی زندہ ہیں وہ اس بات کے محتاج ہیں کہ توجہ تام کے ذریعہ ان کاملین کی ارواح سے استفادہ کریں۔ درود شریف: روح پاک

کے ساتھ ارتباط کی ایسی ہی ایک کوشش ہے۔ جب مؤمن بندہ درود بھیجتا ہے تو درود روح نبوی سے نور اور مناسب حالت درود بھیجنے والے کی طرف ہانک لاتی ہے۔ایک حدیث میں ہے: ''جب بھی کوئی شخص مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ میری روح مجھ پر واپس کرتے ہیں، تاکہ میں اس کے سلام کا جواب دوں'' (مشکوۃ حدیث ۹۲۵) یعنی روح پاک جو مشاہدۂ حق میں مشغول ہے اور جس کا کسی طرف التفات باقی نہیں رہا، باذنِ الٰہی وہ سلام پیش کرنے والے کی طرف ملتفت ہوتی ہے، اور جواب دیتی ہے یعنی روح پاک سے سلام کرنے والے کو فیض پہنچتا ہے۔شاہ صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں: میں نے ۱۱۴۴ھ میں جب میرا قیام مدینہ منورہ میں تھا، اس بات کا بار بار مشاہدہ کیا ہے۔یعنی روح نبوی سے فیض پایا ہے۔

ومنها: الصلاة على النبى صلى الله عليه وسلم:

قال صلى الله عليه وسلم: "من صلى عليّ واحدةً صلى الله عليه عشرًا"

وقال عليه السلام: "أولى الناس بى يوم القيامة أكثرُهم عليّ صلاةً"

أقول: السر فى هذا: أن النفوس البشرية لابد لها من التعرُّض لنفحات الله، ولاشيئَ فى التعرض لها كالتوجه إلى أنوار التدلِّيات، وإلى شعائر الله فى أرضه، والتكفُّفِ لديها، والإمعانِ فيها، والوقوفِ عليها، لاسيما أرواح المقربين الذين هم أفاضل الملأ الأعلى، ووسائطُ جودِ الله على أهل الأرض، بالوجه الذى سبق ذكره. وذكر النبى صلى الله عليه وسلم بالتعظيم، وطلبُ الخير من الله تعالى فى حقه: آلةٌ صالحة للتوجه إليه. مع ما فيه عن سدّ مدخل التحريف، حيث لم يذكره إلا بطلب الرحمة له من الله تعالى.

وأرواحُ الكُمَّلِ: إذا فارقت أجسادها صارت كالموج المكفوف، لايَهُزُّها إرادةٌ متجددة، وداعيةٌ سانحةٌ، ولكن النفوسَ التى هى دونها تلتصق بها بالهمة، فيجلب منها نورًا، وهيئةً مناسبةً بالأرواح، وهى المكنِّيُ عنه بقوله عليه السلام: "مامن أحد يسلّم علّى إلا ردّ الله علىّ روحى، حتى أَرُدَّ عليه السلامَ" وقد شاهدتُ ذلك مالا أحصى فى مجاورتى المدينةَ، سنةَ ألفٍ ومائةٍ وأربع وأربعين.

قال صلى الله عليه وسلم: "لاتجعلوا زيارة قبرى عيدًا"

أقول: هذا إشارة إلى سدِّ مدخل التحريف، كما فعل اليهود والنصارى بقبور أنبيائهم، وجعلوها عيدًا وموسِمًا بمنزلة الحج.

ترجمہ: اور اذکار میں سے: نبی ﷺ پر درود ہے (اس کے بعد دو حدیثیں ہیں) میں کہتا ہوں: اس میں (یعنی درود کے حکم میں) راز یہ ہے کہ نفوس بشریہ کے لئے ضروری ہے: اللہ کی رحمت کے جھونکوں کے سامنے آنا۔اور کوئی چیز نہیں رحمت سے تعرض میں: تجلیات کے انوار کی طرف اور زمین میں شعائر اللہ کی طرف متوجہ ہونے کی طرح اور اس کے پاس

ہاتھ پسارنے کی طرح، اوراس کے پاس ٹھہرنے کی طرح۔ خاص طور پران مقربین کی ارواح جو کہ وہ بزرگ ترین ملأاعلی ہیں، اورزمین والوں پرکرم الٰہی کے وسائط ہیں۔ اس طور پر جس کا تذکرہ پہلے آچکا ہے (یعنی کعبہ اور نبی کی تعظیم کا طریقہ پہلے مبحث خامس، باب ہفتم میں گذر چکا ہے) نبی ﷺ کا تعظیم کے ساتھ تذکرہ، اوراللہ تعالیٰ سے آپؐ کے حق میں خیر طلب کرنا (جو درود کا حاصل ہے) بہترین ذریعہ ہے آپؐ کی طرف متوجہ ہونے کا —— اس چیز کے ساتھ جواس میں ہے یعنی تحریف کے دروازے کو بند کرنا، بایں طور کہ نہیں تذکرہ کرتا درود بھیجنے والا آپ ﷺ کا مگر آپؐ کے لئے اللہ تعالیٰ سے رحمت طلب کرنے کے ذریعہ۔

اور کاملین کی ارواح: جب وہ اپنے جسموں سے جدا ہوتی ہیں تو وہ رکی ہوئی موج کی طرح ہوجاتی ہیں۔ ان کو نیا ارادہ اور عارضی داعیہ متحرک نہیں کرتا۔ لیکن وہ نفوس جوان سے وَرے ہیں، ان اوراح کے ساتھ متصل ہوتے ہیں توجہ تام کے ذریعہ، پس وہ اتصال ہانک لاتا ہے ان ارواح سے نور کو، اوران ارواح کے مناسب حالت کو، اور وہی بات مراد لی گئی ہے آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد میں کہ: ''جب بھی کوئی مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ مجھ پر میری روح پھیر دیتے ہیں، یہاں تک کہ میں اس کو جواب دیتا ہوں'' اور میں نے بے شمار مرتبہ اس بات کا مشاہدہ کیا ہے، سنہ گیارہ سو چوالیس کے میرے قیام مدینہ کے زمانہ میں۔

اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''میری قبر کی زیارت کو میلا ٹھیلا نہ بناؤ'' (زیارت کا لفظ حدیث میں نہیں۔ یہ روایت بالمعنی ہے) میں کہتا ہوں: یہ اشارہ ہے تحریف کے دروازے کو بند کرنے کی طرف۔ جیسا یہود ونصاری نے اپنے نبیوں کی قبروں کے ساتھ کیا ہے، اوران کو عید (جشن کا دن، تہوار) بنالیا، اور حج کی طرح سیزن بنالیا (یہ مضمون تقریر میں دوسری حکمت کے ضمن میں لیا گیا ہے)

لغت: کَنٰی به وعنه: کنایہ کرنا یعنی لفظ بولنا اوراس کے غیر مدلول کا ارادہ کرنا۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ زید کثیر الرماد اور مراد زید کی سخاوت لی جائے تو یہ سخاوت الفاظ کا مکنی عنہ ہے۔

فصل

اذکار کی توقیت: ضرورت اور طریقہ

اذکار کے اوقات کی تعیین ضروری ہے، گو وہ تعیین احکام کی تعیین سے فیاضانہ ہو یعنی درجہ استحباب میں ہو۔ کیونکہ اوقات کی تعیین نہیں کی جائے گی تو کاہل سُستی برتے گا —— اذکار کی توقیت میں درج ذیل امور کا لحاظ رکھا گیا ہے:

اول ودوم: اوقات واسباب کے ذریعہ تعیین کی گئی ہے:

اوقات کا بیان: تین اوقات میں اذکار تجویز کئے گئے ہیں۔ اول: جبکہ روحانیت پھیلتی ہے، جیسے صبح وشام۔ اور اس کی تفصیل رحمۃ اللہ (۱۷۸:۲) میں گذر چکی ہے۔ دوم: جبکہ دل پراگندہ نہیں ہوتا، جیسے نیند سے بیدار ہونے کا وقت۔ سوم: جبکہ معاشی امور اور دنیوی باتوں سے فراغت ہو جاتی ہے، جیسے سونے کا وقت، اس وقت میں ذکر آلۂ صیقل کا کام دیتا ہے۔

اسباب کا بیان: جب کوئی ایسا سبب پایا جائے جو اللہ کی یاد بھلانے والا ہو، اور دل کا اللہ کی بارگاہ کی طرف التفات نہ رہے۔ جیسے بازار جانا غفلت کا باعث ہے۔ اس وقت اذکار اس لئے رکھے گئے ہیں کہ غفلت دور ہو، ذکر بے التفاتی کے لئے تریاق بن جائے اور خلل کا سدّ باب ہو جائے۔

سوم: ایسی عبادت میں بھی اذکار مسنون کئے گئے ہیں جن کا نفع اذکار کے بغیر تام اور فائدہ مکمل نہیں ہوتا۔ جیسے نماز کے مسنون اذکار (اس کی تفصیل کتاب الصلوٰۃ، باب (۱۰) میں گذر چکی ہے)

چہارم: جس حالت میں نفس اللہ کے خوف سے آشنا اور دل اللہ کی سلطنت کی عظمت سے چوکنا ہوتا ہے۔ جیسے سخت آندھی چلتی ہے یا دن میں تاریکی چھا جاتی ہے یا چاند یا سورج گہناتا ہے تو آدمی کو عظمتِ کبریائی کا احساس ہوتا ہے وہ حالت باعثِ خیر ہوتی ہے، خواہ اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔

پنجم: جب کوئی ایسی حالت پیش آئے جس میں ضرر کا اندیشہ ہو۔ اس وقت بھی اذکار رکھے گئے ہیں تاکہ مقدّم اللہ کا فضل طلب کر لیا جائے اور ضرر سے پناہ چاہ لی جائے۔ جیسے سوار ہونا ہو یا سفر کرنا ہو تو اس وقت بھی ذکر رکھا گیا ہے۔

ششم: جب کوئی ایسی حالت پیش آئے جس میں اہل جاہلیت جھاڑ پھونک کراتے تھے، جن کے پیچھے مشرکانہ عقائد کارفرما تھے یا بدشگونی لیتے تھے یا جنات کی پناہ لیتے تھے، اس حالت کے لئے بھی اذکار متعین کئے گئے ہیں۔

ہفتم: نیا چاند نظر آنے پر بھی دعا تجویز کی گئی ہے۔

فضائلِ اذکار کی بنیادیں: نبی ﷺ نے بعض اذکار کے فضائل اور ان کے دنیوی واخروی ثمرات بھی بیان فرمائے ہیں، تاکہ ان کا فائدہ تمام اور ان کی ترغیب مکمل ہو۔ اور اس سلسلہ میں اہم باتیں چار ہیں:

پہلی بات: جس ذکر سے نفس سنورتا ہے، اس ذکر پر وہ فائدہ مرتب فرمایا ہے جو نفس کے سنورنے پر مرتب ہوتا ہے، مثلاً کسی ذکر کے بارے میں فرمایا: ''جو یہ ذکر کرے، پھر موت آجائے تو وہ دینِ اسلام پر مرا'' یا فرمایا: ''وہ جنت میں گیا'' یا فرمایا: ''اس کی بخشش کر دی گئی'' اور اس قسم کے دیگر جملے۔

دوسری بات: کسی ذکر کی یہ فضیلت بیان کی کہ ذکر کرنے والے کو کوئی چیز ضرر نہیں پہنچائے گی یا وہ ہر برائی سے محفوظ رکھا جائے گا۔ اور یہ بات اس طرح حاصل ہوگی کہ رحمتِ الٰہی اس کے شاملِ حال ہوگی اور ملائکہ کی دعائیں اس کا احاطہ کر لیں گی اس لئے ضرر نہیں پہنچے گا اور وہ ہر آفت سے محفوظ رہے گا۔

تیسری بات: کسی ذکر کی فضیلت میں گناہوں کا مٹانا اور نیکیوں کا لکھنا بیان کیا ہے۔ اور اس فضیلت کی وجہ پہلے

بیان کی جا چکی ہے کہ اللہ کی طرف توجہ اور رحمت کے پردے میں لپٹ جانا گناہوں کو مٹاتا ہے اور ملکیت کو ابھارتا ہے۔

چوتھی بات: کسی ذکر کی یہ فضیلت بیان فرمائی ہے کہ ذکر کرنے والا شیطان سے دور ہو جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ جو اللہ کا ہو گیا اور رحمتِ الٰہی نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا: شیطان اس کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا۔

واعلم: أنه مست الحاجةُ إلى توقيت الأذكار، ولوبوجهٍ أَسْمَحَ من توقيت النواميس: إذ لو لم تُوَقَّتْ لتساهل المتساهلُ. وذلك:

[۱و۲] إما بأوقاتٍ أو أسباب: وقد ذكرنا تصريحًا أو تلويحًا:

[الف] أن المخصص لبعض الأوقات دون بعض: إما ظهورُ الروحانية فيه، كالصبح والمساء، أو خلوُّ النفس عن الهيئات الرذيلة، كحالة التيقظ من النوم، أو فراغُها من الارتفاقات وأحاديثِ الدنيا، ليكون كالمِصْقَلَة، كحالة إرادة النوم.

[ب] وأن المخصص للسببية: أن يكون سببا لنسيان ذكر الله، وذهولِ النفس عن الالتفات تلقاءَ جناب الله، فيجب في مثل ذلك أن يُعالَج بالذكر، ليكون ترياقًا لِسَمِّها، وجابرًا لخَلَلِها.

[۳] أو طاعةٍ لايتم نفعُها، ولا تكمُلُ فائدتُها إلا بمزج ذكرٍ معها، كالأذكار المسنونة في الصلوات.

[٤] أو حالةٍ تُنَبِّهُ النفسَ على ملاحظة خوف الله، وعظيمِ سلطانِه؛ فإن هذه الحالة سائقةٌ لها إلى الخير، من حيث يدري ومن حيث لايدري، كأذكار الآيات من الريح، والظلمة، والكسوف.

[٥] أو حالةٍ يخشى فيها الضررَ، فيجب أن يسأل اللّٰه من فضله، ويتعوذ منه في أولها، كالسفر، والركوب.

[٦] أو حالةٍ كان أهلُ الجالية يَسْتَرِقُوْنَ فيها لاعتقاداتٍ تميل إلى إشراك باللّٰه، أو طيرة، أو نحو ذلك، كما كانوا يُعُوْذُوْنَ بالجن.

[۷] وعند رؤية الهلال.

وقد بين النبي صلى الله عليه وسلم فضائلَ بعض هذه الأذكار، وآثارَها في الدنيا والآخرة، إتمامًا للفائدة، وإكمالاً للترغيب.

والعمدةُ في ذلك أمور:

منها: كون الذكر مظنةً لتهذيب النفس، فأدار عليه ما يترتب على التهذيب، كقوله صلى الله عليه وسلم:" من قالهنّ، ثم مات: مات على الفطرة" أو:" دخل الجنة" أو:" غفرله" ونحو ذلك.

ومنها: بيان أن صاحب الذكر لايضره شيئ، أو حُفظ من كل سوء؛ وذلك: لشمول الرحمة الإلٰهية، وإحاطةِ دعوةِ الملائكة به.

ومنها: بيان محو الذنوب، وكتابة الحسنات؛ وذلك: لِمَا ذكرنا: أن التوجه إلى الله، والتلفُّع بغاشية الرحمة، يزيل الذنوب ويُمِدُّ الملكية.

ومنها: بُعد الشاطين منه، لهذا السر بعينه.

ترجمہ: اور جان لیں کہ ضرورت پیش آئی اذکار کی تعیین کی، اگرچہ وہ احکام کی تعیین سے زیادہ رواداری سے ہو، کیونکہ اگر تعیین نہیں کی جائے گی تو کاہل سستی کرے گا۔ اور وہ تعیین: (۱و۲) یا تو اوقات کے ذریعہ کی جائے یا اسباب کے ذریعہ۔ اور ہم نے صراحۃً یا اشارۃً یہ بات بیان کی ہے: (الف) کہ بعض اوقات کو بعض پر ترجیح دینے والی چیز: یا تو اس وقت میں روحانیت کا ظہور ہے، جیسے صبح وشام، یا نفس کا نکمی ہیئتوں سے خالی ہونا ہے، جیسے نیند سے بیدار ہونے کی حالت، یا نفس کا معاشی امور اور دنیوی باتوں سے فارغ ہو جانا ہے، تاکہ ذکر مانجھنے والے آلہ کی طرح ہو جائے، جیسے سونے کا ارادہ کرنے کی حالت —— (ب) اور یہ کہ سبب ہونے کے لئے ترجیح دینے والی چیز: یہ بات ہو کہ وہ (سبب) سبب ہو اللہ کی یاد بھولنے کا، اور اللہ کی بارگاہ کی طرف التفات سے نفس کے ذہول کا، پس ایسی صورت میں ضروری ہے کہ اس کا ذکر سے مداوا کیا جائے، تاکہ ذکر غفلت کے زہر کے لئے تریاق بن جائے۔ اور اس کے خلل کی تلافی کرنے والا ہو جائے۔

(۳) یا کسی ایسی عبادت کے ذریعہ (اذکار کی توقیت کی جائے) جس کا نفع تام نہیں ہوتا، اور جس کا فائدہ مکمل نہیں ہوتا مگر اس کے ساتھ ذکر کو ملانے سے، جیسے نماز کے اذکار مسنونہ —— (۴) یا کسی ایسی حالت کے ذریعہ جو نفس کو چوکنا کرے اللہ کے خوف اور ان کی سلطنت کی عظمت کو پیش نظر لانے پر۔ پس بیشک یہ حالت نفس کو ہانکنے والی ہے خیر کی طرف، ایسی جگہ سے کہ وہ جانتا ہے یا نہیں جانتا۔ جیسے اللہ کی (قدرت کی) نشانیوں: آدھی، تاریکی اور گہن کے اذکار۔

(۵) یا کسی ایسی حالت کے ذریعہ جس میں ضرر کا اندیشہ ہو، پس ضروری ہے کہ پیشگی اللہ کے فضل کی درخواست کی جائے، اور ضرر سے پناہ چاہ لی جائے، جیسے سفر اور سوار ہونا —— (۶) یا ایسی حالت کے ذریعہ جس میں زمانہ جاہلیت کے لوگ منتر طلب کیا کرتے تھے، ایسے اعتقاد کی بنا پر جو اللہ کے ساتھ شریک کرنے کی طرف مائل ہوتا تھا، یا بدشگونی لیا کرتے تھے، یا اس کے مانند جیسے وہ جنات کی پناہ لیتے تھے —— (۷) اور چاند دیکھنے کے وقت۔

اور نبی ﷺ نے ان میں سے بعض اذکار کے فضائل اور ان کے دنیوی اور اخروی آثار بیان فرمائے، فائدہ تام کرنے کے لئے اور ترغیب مکمل کرنے کے لئے —— اور اس سلسلہ میں اہم چند باتیں ہیں —— از انجملہ: ذکر کا احتمالی جگہ ہونا ہے تہذیب نفس کے لئے، پس ذکر پر وہ بات دائر کی جو تہذیبِ نفس پر مرتب ہوتی ہے۔ جیسے آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''جو ان کلمات کو کہے، پھر مر جائے تو وہ دین اسلام پر مرا'' یا ''جنت میں گیا'' یا ''اس کی بخشش کردی گئی''

اوراس کے مانند ـــــ اورازانجملہ: یہ بات بیان کرنا ہے کہ صاحب ذکر کوکوئی چیز ضرر نہیں پہنچائے گی یا وہ ہر برائی سے بچایا جائے گا۔اور وہ بات: رحمتِ الٰہی کے شامل ہونے کی وجہ سے ہے،اور ملائکہ کی دعاؤں کا اس کا احاطہ کرنے کی وجہ سے ہے ـــــ اورازانجملہ: گناہوں کا مٹانا اور نیکیوں کا لکھنا: بیان کرنا ہے،اور وہ بات: اس وجہ سے ہے جس کو ہم بیان کر چکے ہیں کہ اللہ کی طرف توجہ،اور رحمت کے پردے میں لپٹنا: گناہوں کو زائل کرتا ہے،اور ملکیت کو کمک پہنچاتا ہے ـــــ اورازانجملہ: ذکر کرنے والے سے شیطان کا دور ہونا ہے، بعینہٖ اسی راز کی وجہ سے۔

☆ ☆ ☆

صبح وشام کے اذکار

رسول اللہ ﷺ نے تین اوقات: صبح وشام اور سونے کے وقت کے اذکار متعین فرمائے ہیں۔اور اکثر اذکار میں آپؐ نے بیداری کے وقت کی تعیین نہیں فرمائی، کیونکہ بیدار ہونے کا وقت عام طور پر صبح صادق کے طلوع ہونے کا وقت یا اسفار یعنی روشنی پھیلنے کا وقت ہے۔

صبح وشام کے چند اذکار یہ ہیں:

پہلا ذکر: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: مجھے ایسے کلمات بتلائیں جن کو میں صبح وشام کہہ لیا کروں۔آپؐ نے فرمایا: یہ کہو: اللهم فاطِرَ السموات والأرضِ، عالِمَ الغيبِ والشهادة، ربَّ كلِّ شيئٍ ومَلِيْكَهُ، أشهد أن لا إله إلا أنت، أعوذ بك من شَرِّ نفسي، وشر الشيطان وشِرْكِه (اے اللہ! اے زمین وآسمان کے پیدا کرنے والے! اے چھپی اور کھلی چیزوں کے جاننے والے! اے ہر چیز کے پروردگار اور مالک! میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں۔میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں اپنے نفس کے شر سے اور شیطان اور اس کے شرک کے شر سے) آپؐ نے فرمایا: ''یہ ذکر صبح وشام اور سونے کے لئے بستر پر لیٹتے وقت کیا کرو'' (مشکوۃ حدیث ۲۳۹۰)

نوٹ: اگر آخری کلمہ شَرَكِهِ (بفتحتین) ہے تو اس کے معنی ہیں ''شیطان کے جال سے'' جن میں وہ لوگوں کو پھانستا ہے۔جیسے زناں دام شیطان ہیں۔

دوسرا ذکر: جب شام ہوتی تھی تو رسول اللہ ﷺ یہ ذکر کیا کرتے تھے: أَمْسَيْنَا وَأَمْسَى الْمُلْكُ لِلّٰهِ، وَالحمد لله، ولا إله إلا الله وحده لاشريك له، له الملك وله الحمد، وهو على كل شيئ قدير، اللهم! إني أسألك من خيرِ هٰذه الليلةِ، وخيرِ مافيها، وأعوذ بك من شَرِّهَا وَشَرِّ مافيها، اللهم! إني أعوذ بك من الكَسَلِ، والهَرَمِ، وسُوْءِ الْكِبَرِ، وفتنة الدنيا وعذاب القبر (شام میں داخل ہوئے ہم،اور شام میں داخل ہوا ملک اللہ کے لئے۔اور تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔اور کوئی معبود نہیں اللہ کے سوا، وہ یگانہ ہیں، ان کا کوئی ساجھی نہیں، انہی کے لئے ملک ہے اور انہی کے

لئے تعریف ہے، اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔ اے اللہ! میں اِس رات کی خیر اور جو کچھ اس میں ہونے والا ہے اس کے خیر کی درخواست کرتا ہوں اور اس کے شر سے اور جو کچھ اس میں ہونے والا ہے اس کے شر سے پناہ چاہتا ہوں۔ اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں آلکس سے، نکمّے بڑھاپے سے، اور کبرسنی کی برائی سے اور دنیا کی آزمائش سے اور قبر کے عذاب سے) ـــــ اور جب صبح ہوتی تو بھی رسول اللہ ﷺ یہی ذکر کیا کرتے تھے، البتہ أَمْسَيْنَا کو أَصْبَحَ سے اور أَمْسیٰ کو أَصْبَحَ سے بدل دیتے تھے (مشکوۃ حدیث ۲۳۸۱) اسی طرح هذه الليلة کو هذا اليوم سے بدلیں گے اور آگے کی تمام مؤنث ضمیروں کو مذکر کی ضمیروں سے بدلیں گے یعنی کہیں گے: خير ما فيه اور من شره وشر مافيه۔

تیسرا ذکر: رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کو تلقین فرماتے تھے کہ جب صبح کرو تو یہ کہا کرو: اللهم! بك أَصْبَحْنَا وبك أَمْسَيْنَا، وبك نَحْيَا وبك نَمُوْتُ، وإليك المصير :اے اللہ! آپ کی وجہ سے ہم صبح میں داخل ہوتے ہیں اور آپ کی وجہ سے ہم شام میں داخل ہوتے ہیں۔ اور آپ کی وجہ سے ہم زندہ ہوتے ہیں اور آپ کی وجہ سے موت آتی ہے، اور آپ ہی کی طرف لوٹنا ہے ـــــ اور جب شام ہو تو یہ کہا کرو: اللهم بك أَمْسَيْنا وبك أَصْبَحْنَا، وبك نَحْيَا وبك نَمُوْتُ، وإليك النشور :اے اللہ! آپ کی وجہ سے ہم شام میں داخل ہوتے ہیں اور آپ کی وجہ سے ہم صبح میں داخل ہوتے ہیں، اور آپ کی وجہ سے ہمیں زندگی ملتی ہے اور آپ کی وجہ سے ہمیں موت آتی ہے۔ اور (قیامت کے دن) زندہ ہو کر آپ کے حضور میں حاضر ہونا ہے (ترمذی ۲:۱۷۵ و مشکوۃ حدیث ۲۳۸۹)

چوتھا ذکر: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو بھی بندہ ہر دن کی صبح میں اور ہر رات کی شام میں تین بار کہے: بسم اللّٰه الذی لایَضُرُّ مع اسْمِهِ شيئٌ فی الأرض ولا فی السماء، وهو السميع العليم (اس اللہ کے نام سے جن کے نام کے ساتھ زمین وآسمان کی کوئی چیز ضرر نہیں پہنچا سکتی، اور وہ سب سننے والے خوب جاننے والے ہیں) تو اسے کوئی مضرت پہنچے گی نہ وہ کسی حادثہ سے دوچار ہوگا (مشکوۃ حدیث ۲۳۹۱)

پانچواں ذکر: نبی ﷺ نے اپنی ایک صاحب زادی کو یہ ذکر سکھلایا ہے: سبحان الله وبحمده، ولاقوة إلا بالله، ماشاء الله كان، ومالم يَشَأ لم يكن، أَعْلَمُ أَنَّ الله على كل شيئ قدير، وأن الله قد أحاط بكل شيئ علمًا (اللہ تعالیٰ پاک ہیں اور اپنی خوبیوں کے ساتھ ہیں، کچھ طاقت نہیں مگر اللہ کی مدد سے، جو اللہ نے چاہا ہوا اور جو انھوں نے نہیں چاہا نہیں ہوا۔ میں جانتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتے ہیں اور میں جانتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو احاطۂ علمی میں لیے ہوئے ہیں) آپ نے فرمایا: ''جو یہ کلمات صبح کہے گا اس کی شام تک حفاظت کی جائے گی اور جو شام کے وقت کہے گا اس کی صبح تک حفاظت کی جائے گی'' (مشکوۃ حدیث ۲۳۹۳)

چھٹا ذکر: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی سورۂ روم کی یہ تین آیتیں صبح ہونے پر تلاوت کرے: وہ اس دن کی ساری برکتیں پالے گا جو اس سے فوت ہوگئی ہیں۔ اسی طرح جو کوئی شام میں یہ آیتیں تلاوت کرے گا وہ اس رات کی

ساری برکتیں پالے گا جو اس سے فوت ہوگئی ہیں۔ وہ آیات یہ ہیں: ﴿فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ. وَلَهُ الْحَمْدُ فِيْ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ، وَعَشِيًّا، وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ. يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ، وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ، وَيُحْيِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا، وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ﴾ ترجمہ: سوتم اللہ کی پاکی بیان کیا کرو جب تم شام میں داخل ہو اور جب تم صبح میں داخل ہو، اور انہی کے لئے تعریف ہے آسمانوں میں اور زمین میں، اور (اس کی پاکی بیان کیا کرو) چوتھے پہر اور جب تم دوپہر میں داخل ہو۔ وہ جاندار کو بے جان سے برآمد کرتے ہیں اور بے جان کو جاندار سے برآمد کرتے ہیں۔ اور وہ زمین کو زندہ کرتے ہیں اس کے مردہ ہونے کے بعد، اور اسی طرح تم بھی نکالے جاؤ گے (سورۃ الروم آیات ۱۷-۱۹) (ابوداؤد حدیث ۵۰۷۶ یہ حدیث نہایت ضعیف ہے۔ اس کی سند میں دو نہایت ضعیف راوی ہیں۔ سعید بن بشیر نجّاری اور محمد بن عبدالرحمٰن بیلمانی، مشکوٰۃ حدیث ۲۳۹۴)

ساتواں ذکر: جب شام ہوتی یا صبح ہوتی تو رسول اللہ ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے: اللهم! إني أسألك العافيةَ في الدنيا والآخرة، اللهم! إني أسألك العفوَ والعافيةَ في ديني ودنيايَ، وأهلي ومالي، اللهمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِيْ، وآمِنْ رَوْعَاتِيْ، اللهم احْفَظْنِيْ من بين يَدَيَّ ومن خلفي، وعن يميني وعن شمالي، ومن فوقي، وأعوذ بِعَظْمَتِكَ أن أُغْتَالَ من تحتي: اے اللہ! میں آپ سے دنیا وآخرت کی عافیت کا طالب ہوں۔ اے اللہ! میں آپ سے معافی مانگتا ہوں اور عافیت طلب کرتا ہوں اپنے دین اور اپنی دنیا اور اپنے اہل وعیال اور اپنے مال میں۔ اے اللہ! میری شرم کی باتوں کی پردہ داری فرما۔ اور میرے خوف کو امن سے بدل دے۔ اے اللہ! میری حفاظت فرما میرے سامنے سے اور میرے پیچھے سے، اور میرے دائیں سے اور میرے بائیں سے، اور میرے اوپر سے، اور میں آپ کی عظمت کی پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ نیچے کی جانب سے مجھ پر کوئی آفت آئے (مراد دھنسایا جانا ہے) (مشکوٰۃ حدیث ۲۳۹۷)

آٹھواں ذکر: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو مسلمان بندہ صبح وشام تین دفعہ کہے: رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا، وَبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا، وبمحمدٍ نبيًا (میں اللہ تعالیٰ کے پروردگار ہونے پر، اور اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ﷺ کے نبی ہونے پر خوش ہوں) تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرلیا ہے کہ وہ اس بندے کو قیامت کے دن ضرور خوش کردیں گے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۳۹۹)

نواں ذکر: ایک صحابی حاضر خدمت ہوئے۔ عرض کیا: مجھے رات بچھو نے ڈس لیا۔ پوری رات بے چینی میں گذری۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم نے شام کی اس وقت یہ کہہ لیا ہوتا: أعوذ بكلمات الله التَّامَّاتِ من شَرِّ ماخَلَقَ تو بچھو تمہیں نقصان نہ پہنچاتا (مسلم ۱۷: ۳۲ مشکوٰۃ حدیث ۲۴۲۳) ترجمہ: اللہ کی کامل باتوں کی پناہ چاہتا ہوں اس مخلوق کے شر سے جو اللہ نے پیدا کی ہے (اسی طرح جب صبح کرے اس وقت بھی یہ کلمات کہہ لے تو دن بھر ضرر سے بچا رہے گا)

دسواں ذکر: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص صبح ہونے پر کہے: اللهم! ما أَصْبَحَ بي من نِعْمَةٍ، أو بأحدٍ من خَلْقِكَ، فَمِنْكَ وَحْدَكَ، لاشريك لك، لك الحمد ولك الشكر (اے اللہ! اس صبح میں جو بھی نعمت مجھ کو نصیب ہے،

یا آپ کی مخلوق میں سے کسی کو بھی میسر ہے، وہ تنہا آپ ہی کے کرم کا نتیجہ ہے، آپ کا کوئی شریک نہیں۔ آپ ہی کے لئے تعریف ہے۔ اور آپ ہی کے لئے شکر ہے) تو اس نے اس دن کی ساری نعمتوں کا شکر ادا کر دیا۔ اور جس نے شام ہونے پر یہی کہا: اس نے پوری رات کی نعمتوں کا شکر ادا کر دیا۔ (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۰۷)

گیارہواں ذکر: سید الاستغفار ہے۔ جو اذکارِ عشرہ کے بیان میں آٹھویں ذکر میں گذر چکا ہے۔

وسَنَّ رسول الله صلى الله عليه وسلم الذكر في ثلاثة أوقاتٍ: عند الصباح، والمساء، والمنام؛ وإنما لم يوقت اليقظة في أكثر الأذكار: لأنه هو وقت طلوع الصبح، أو إسفاره غالباً.

فمن أذكار الصباح والمساء:

[١] اللهم! عالمَ الغيب والشهاة، فاطِرَ السماوات والأرض، ربَّ كل شيئ ومَلِيْكَه، أشهد أن لا إلٰه إلا أنت، أعوذ بك من شر نفسي، ومن شر الشيطان وشِرْكِه.

[٢] أمسينا، وأمسى الملك لله، والحمد لله! ولا إلٰه إلا الله وحده، لاشريك له، له الملك وله الحمد، وهو على كل شيئ قدير، اللهم! إني أسألك من خير هذه الليلة، وخيرِ ما فيها، وأعوذ بك من شرها، وشر ما فيها، اللهم! إني أعوذ بك من الكسل، والهرم، وسوءِ الكِبَرِ، وفتنة الدنيا، وعذاب القبر.

وفي الصباح: يُبَدَّل: "أمسينا" بأصبحنا، و"أمسى" بأصبح، و"هذه الليلة" بهذا اليوم.

[٣] بك أصبحنا، وبك أمسينا، وبك نحيا، وبك نموت، وإليك المصير.

وفي المساء: بك أمسينا، وبك أصبحنا، وبك نحيا، وبك نموت، وإليك النشور.

[٤] باسم الله الذي لايضر مع اسمه شيئ في الأرض ولافي السماء، وهو السميع العليم. ثلاث مرات.

[٥] سبحان الله وبحمده، ولاقوة إلا بالله، وماشاء الله كان، ومالم يشألم يكن، أَعلَمُ أن الله على كل شيئ قدير، وأن الله قد أحاط بكل شيئ علما.

[٦] ﴿فسبحان الله حين تمسون، وحين تصبحون، وله الحمد في السمٰوات والأرض، وعشيا، وحين تظهرون﴾ إلى﴿ تخرجون﴾

[٧] اللهم! إني أسألك العافية في الدنيا والآخرة، اللهم: إني أسألك العفو والعافية في ديني، ودنياي، وأهلي، ومالي. اللهم! استُرعوراتي، وآمن روعاتي. اللهم! احفظني من بين يديَّ، ومن خلفي، وعن يميني، وعن شمالي، ومن فوقي، وأعوذ بعظمتك أن أُغتال من تحتي.

[۸] رضيت بالله ربا، وبالإسلام دينا، وبمحمد نبيا: ثلاث مرات.
[۹] أعوذ بكلمات الله التامَّات من شر ماخلق.
[۱۰] اللهم! ما أصبح بى من نعمة، أو بأحد من خلقك، فمنك وحدك لاشريك لك، فلك الحمد، ولك الشكر.
[۱۱] وسيِّد الاستغفار.

ترجمہ: اور رسول اللہ ﷺ نے تین اوقات میں ذکر مقرر کیا ہے: صبح وشام اور سونے کے وقت میں۔ اور اکثر اذکار میں بیداری کی تعیین نہیں فرمائی۔ کیونکہ جاگنے کا وقت عام طور پر وہی صبح کے طلوع ہونے کا یا اس کے روشن ہونے کا وقت ہے —— پس صبح وشام کے اذکار میں سے چند: (اس کے بعد ترجمہ کی حاجت نہیں)

☆ ☆ ☆

سونے کے وقت کے اذکار

نیند موت کے مشابہ ہے۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے خاص سونے کے وقت کے لئے اذکار مشروع فرمائے ہیں۔ جب آدمی سونے کے لئے بستر پر لیٹ جائے تو درج ذیل اذکار میں سے ایک یا زیادہ ذکر کر کے سوئے:

پہلا ذکر: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی شخص سونے کے لئے بستر پر پہنچے تو پہلے بچھونا جھاڑ لے، پھر لیٹنے کے بعد کہے: بِاسْمِكَ رَبِّيْ وَضَعْتُ جَنْبِيْ، وَبِكَ أَرْفَعُهُ، إِن أَمْسَكْتَ نفسى فَارْحَمْهَا، وإن أَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا بما تَحْفَظُ بِهِ عِبَادَكَ الصالحين (پروردگار! آپ کے نام سے میں نے پہلو رکھا، اور آپ کی مدد سے میں اس کو اٹھاؤں گا۔ اگر آپ میری جان روک لیں تو اس پر مہربانی فرمائیں۔ اور اگر آپ اس کو بھیج دیں تو اس کی نگہداشت فرمائیں اس چیز کے ذریعہ جس سے اپنے نیک بندوں کی حفاظت کرتے ہیں) پھر داہنی کروٹ پر لیٹ جائے'' (مشکوۃ حدیث ۲۳۸۴)

دوسرا ذکر: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم سونے کا ارادہ کرو تو پہلے وضوء کرو، پھر داہنی کروٹ پر لیٹ جاؤ، اور کہو: اللّٰهم! أَسْلَمْتُ نَفْسِيْ إِلَيك، وَوَجَّهْتُ وجهى إليك، وفَوَّضْتُ أمرى إليك، وَأَلْجَأْتُ ظَهْرِيْ إِلَيك، رَغْبَةً وَرَهْبَةً إليك، لا مَلْجَأَ ولا مَنْجَأَ منك إلا إليك، آمنتُ بكتابك الذى أنزلتَ، ونبيك الذى أرسلتَ: (اے اللہ! میں نے اپنی روح آپ کے سپرد کر دی۔ اور اپنا رخ آپ کی طرف پھیر دیا۔ اور اپنا معاملہ آپ کے سپرد کر دیا۔ اور سپرد کر دی میں نے اپنی پیٹھ آپ کو، آپ کی طرف رغبت کرتے ہوئے اور آپ سے ڈرتے ہوئے۔ کوئی جائے پناہ نہیں اور کوئی بچاؤ کی جگہ نہیں آپ سے بھاگ کر مگر آپ ہی کی طرف۔ میں آپ کی کتاب پر ایمان لایا جس کو آپ نے نازل

فرمایا ہے۔ اور آپ کے نبی پر ایمان لایا جن کو آپ نے بھیجا ہے) اس دعا کے بعد کوئی بات نہ کرو، اگر اسی حال میں موت آ گئی تو تمہاری موت دین فطرت پر ہوگی'' (مشکوۃ حدیث ۲۳۸۵)

تیسرا ذکر: جب رسول اللہ ﷺ بستر پر لیٹتے تو کہتے: الحمد لله الذی أَطْعَمَنَا، وَسَقَانَا، وَكَفَانَا، و آوانا، فَكَمْ مِمَّنْ لَّا كَافِيَ لَهُ وَلاَ مُؤْوِيَ لَهُ: تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے ہمیں کھلایا اور پلایا، اور ہماری ضرورتیں پوری کیں، اور ہمیں ٹھکانا دیا۔ کتنے ہی ایسے بندے ہیں جن کی نہ کوئی ضرورت پوری کرنے والا ہے اور نہ کوئی انہیں ٹھکانا دینے والا ہے (مشکوۃ حدیث ۲۳۸۶)

چوتھا ذکر: بستر پر لیٹنے کے بعد ۳۳ بار سبحان الله، ۳۳ بار الحمد لله اور ۳۴ بار الله أكبر کہے۔ یہ تسبیح رسول اللہ ﷺ نے اپنی لاڈلی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اور اپنے داماد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بتلائی تھی، جبکہ وہ گھر کے کام سے تھک جاتی تھیں اور انھوں نے خادم مانگا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: ''یہ تسبیح تمہارے لئے خادم سے بہتر ہے!'' (مشکوۃ حدیث ۲۳۸۷ و ۲۳۸۸)

پانچواں ذکر: رسول اللہ ﷺ جب سونے کا ارادہ فرماتے تو داہنا ہاتھ رخسار کے نیچے رکھ کر لیٹ جاتے اور تین بار کہتے: اللّٰهم قِنِیْ عَذَابَكَ يَوْمَ تَبْعَثُ عِبَادَكَ: الٰہی! مجھے اپنے عذاب سے بچائیں جبکہ آپ اپنے بندوں کو دوبارہ زندہ کریں (مشکوۃ حدیث ۲۴۰۰)

چھٹا ذکر: رسول اللہ ﷺ بوقت خواب کہتے تھے: اللّٰهم! إنی أعوذ بوجهك الكريم، وكَلِمَاتِكَ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا أَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهِ، اللّٰهم! أَنْتَ تَكْشِفُ الْمَغْرَمَ وَالْمَأْثَمَ، اَللّٰهم! لَايُهْزَمُ جُنْدُكَ، وَلَايُخْلَفُ وَعْدُكَ، وَلَايَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ، سبحانك وبحمدك: اے اللہ! بیشک میں آپ کے بزرگ چہرے کے وسیلہ سے اور آپ کے کامل کلمات کے وسیلہ سے: اس چیز کی برائی سے پناہ چاہتا ہوں جس کی پیشانی کے بال آپ پکڑنے والے ہیں یعنی وہ چیز آپ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اے اللہ! آپ ہی قرض کو اور گناہوں کو دور فرماتے ہیں۔ اے اللہ! آپ کا لشکر شکست نہیں کھاتا، اور نہ آپ کا وعدہ خلاف ہوتا ہے۔ اور نہیں سود مند ہے دولت مند کے لئے آپ کے سوا دولت مندی یعنی آپ ہی کام آتے ہیں، دولت مندی کچھ کام نہیں آتی۔ آپ کی ذات پاک ہے اور آپ اپنی خوبیوں کے ساتھ ہیں (مشکوۃ حدیث ۲۴۰۳)

ساتواں ذکر: رسول اللہ ﷺ صحابہ کو ہدایت فرماتے تھے کہ وہ داہنی کروٹ پر لیٹیں اور یہ دعا پڑھیں: اللّٰهم! رَبَّ السماواتِ، وربَّ الأرض، وربَّ كلِّ شيئٍ، فَالِقَ الْحَبِّ والنَّوىٰ، مُنْزِلَ التوراةِ والإنجيل والقرآن، أَعوذ بك من شَرِّ كُلِّ ذِیْ شَرٍّ، أَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهِ، أَنْتَ الأولُ فليس قبلك شيئٌ، وأنت الآخر فليس بعدك شيئٌ، وأنت الظاهر فليس فوقك شيئٌ، وأنت الباطن فليس دُوْنَكَ شيئٌ، اِقْضِ عَنِّی الدينَ، وأَغْنِنِیْ من الْفَقْرِ: اے اللہ! آسمانوں کے پروردگار! اور زمین کے پروردگار! اور ہر چیز کے پروردگار! دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والے!

تورات، انجیل اور قرآن کے نازل فرمانے والے! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں ہر برائی والی چیز کی برائی سے، جس کی پیشانی کے بالوں کو آپ پکڑنے والے ہیں۔ آپ ہی سب سے پہلے ہیں، آپ سے پہلے کوئی چیز نہیں۔ اور آپ ہی سب کے بعد ہیں، آپ کے بعد کوئی چیز نہیں۔ اور آپ ہی ظاہر (غالب) ہیں۔ آپ سے اوپر کوئی چیز نہیں۔ اور آپ ہی باطن ہیں، آپ سے وَرے کوئی چیز نہیں۔ چکائیے میری طرف سے قرضہ اور فقر سے مجھے بے نیاز کردیں (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۰۸)

آٹھواں ذکر: رسول اللہ ﷺ جب رات میں لیٹتے تو کہتے: بسم اللّٰه، وَضَعْتُ جَنْبِیْ لِلّٰهِ، اللهم اغفر لی ذنبی، وَاخْسَأْ شیطانی، وفُكَّ رِهَانِیْ، واجعلنی فی النَّدَی الأعلیٰ: بنام خدا سوتا ہوں، میں نے اپنی کروٹ اللہ کے لئے رکھی۔ اے اللہ! میرے گناہ بخش دے۔ اور دھتکار میرے شیطان کو، اور چھڑا میری گردن، اور گردان مجھے مجلس بالا (ملائکہ مقربین) میں (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۰۹)

نواں ذکر: رسول اللہ ﷺ جب رات میں لیٹتے تو کہتے: الحمد لله الذی كَفَانِیْ، وأَطْعَمَنِیْ وَسَقَانِیْ، والذی مَنَّ عَلَیَّ فَأَفْضَلَ، والذی أعطانی فَأَجْزَلَ، الحمد لله علی كل حال، اللهم! ربَّ كلِّ شئ ومَلِيكَه، وإلَهَ كل شيئ، أعوذ بك من النار: تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے میرا کام بنایا اور مجھے ٹھکانا دیا اور مجھے کھلایا اور مجھے پلایا اور جس نے مجھ پر احسان کیا پس زیادہ دیا اور جس نے مجھے دیا پس خوب دیا۔ ہر حالت میں تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ اے اللہ! ہر چیز کے پروردگار اور اس کے مالک! اور ہر چیز کے معبود! میں دوزخ سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۱۰)

دسواں ذکر: رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ جب رات میں سونے کے لئے لیٹتے تو سورۂ اخلاص، سورۂ فلق اور سورۂ ناس پڑھ کر دونوں ہاتھوں پر دَم کرتے، اور جہاں تک آپؐ کے ہاتھ پہنچ سکتے۔ ان کو جسم پر پھیرتے۔ پہلے سر اور چہرے پر اور جسم کے سامنے کے حصے پر پھیرتے اور تین دفعہ یہ عمل کرتے (مشکوٰۃ حدیث ۲۱۳۲ فضائل القرآن)

گیارہواں ذکر: ایک لمبے واقعہ میں ہے کہ جو شخص بستر پر لیٹنے کے بعد آیت الکرسی پڑھے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر مسلسل ایک نگران رہے گا اور صبح تک شیطان اس کے قریب نہیں پھٹک سکے گا (مشکوٰۃ حدیث ۲۱۲۳ فضائل القرآن)

ومن أذكار وقت النوم: إذا أَوىٰ إلی فراشه:

[۱] باسمك ربی وضعتُ جنبی، وبك أرفعه، إن أمسكتَ نفسی فارْحَمْها، وإن أرسلتَها فاحفظها بما تحفظ به عبادَك الصالحين.

[۲] و"اللهم! أسلمتُ نفسی إليك، ووجَّهت وجهی إليك، وفوَّضت أمری إليك، وألجأت ظهری إليك، رغبةً ورهبةً إليك، لاملجأ ولا منجأ منك إلا إليك، آمنت بكتابك الذی أنزلت، ونبيك الذی أرسلت"

[۳] الحمد لله الذی أطعمنا، وسقانا، وكفانا، وآوانا، فكم ممن لا كافی له، ولا مُؤْوِیَ له.

[٤] ويسبح الله ثلاثا وثلاثين، ويحمدَ الله ثلاثا وثلاثين، ويكبر الله أربعًا وثلاثين.

[٥] اللهم! قِنِیْ عذابَك يومَ تبعث عبادك: ثلاثاً.

[٦] أعوذ بوجهك الكريم، وكلماتك التامّاتِ، من شر ما أنت آخذ بناصيته، اللّٰهم! أنت تكشف المغرمَ والمأثَمَ، اللّٰهم! لايُهْزَمُ جندُك، ولا يُخْلَف وعدُك، ولاينفع ذا الجد منك الجد، سبحانك وبحمدك.

[٧] اللهم! ربَّ السماوات، وربَّ الأرض، وربَّ كل شيئ، فالقَ الحَبِّ والنوى، مُنْزِلَ التوراة والإنجيل والقرآن، أعوذ بك من شر كل ذی شر، أنت آخذ بناصيته، أنت الأول فليس قبلك شيئ، وأنت الآخر فليس بعدك شيئ، وأنت الظاهر فليس فوقك شيئ، وأنت الباطن فليس دونك شيئ، اقضِ عنی الدينَ، وأعذنی من الفقر.

[٨] باسم الله وضعتُ جنبی لله، اللّٰهم اغفرلی ذنبی، واخْسَأْ شيطانی، وفُكَّ رِهَانی، واجعلنی فی الندیِّ الأعلی.

[٩] الحمد لله الذی كفانی، وآوانی، وأطعمنی، وسقانی، والذی مَنَّ علیَّ فأَفْضَلَ، والذی أعطانی فأَجْزَلَ، الحمد لله علی كل حال، اللهم! ربَّ كل شيئ وَمَلِيْكَه، وإلٰهَ كل شيئ، أعوذ بك من النار.

[١٠] وجمع كَفَّيْه، فقرأ فيهما: ﴿قُلْ هو اللّٰه أحد﴾ و﴿قل أعوذ برب الفلق﴾ و﴿قل أعوذ برب الناس﴾ ثم مسح بهما ما استطاع من جسده.

[١١] وقرأ آية الكرسی.

ترجمہ: اور سونے کے وقت کے اذکار میں سے: جب ٹھکانا لے اپنے بستر پر الی آخرہ (آگے ترجمہ آگیا ہے)

☆ ☆ ☆

مختلف اوقات واحوال کے اذکار

شادی یا حیوان خریدنے کا ذکر: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی کسی عورت سے نکاح کرے، یا کوئی خادم (غلام یا باندی) خریدے تو یہ دعا کرے: اللّٰهم! إنی أسألك خَيْرَها، وخَيْرَمَا جَبَلْتَها عليه، وأعوذ بك من شرها، وشَرِّ ما جَبَلْتَها عليه (الٰہی! میں اس (بیوی یا باندی) کی خیر کی اور اس فطرت کی خیر کی جس پر آپ نے اس کو پیدا کیا ہے: استدعا کرتا ہوں۔ اور اس کی برائی سے اور اس فطرت کی برائی سے جس پر آپ نے اس کو پیدا کیا ہے پناہ چاہتا ہوں) اور جب کوئی اونٹ خریدے تو اس کی کوہان کا بالائی حصہ پکڑے اور یہی دعا کرے'' (ایک روایت میں ہے:

''پھر بیوی اور باندی کے پیشانی کے بال پکڑے اور برکت کی دعا کرے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۴۶)

شادی کی مبارک باد دینے کی دعا: رسول اللہ ﷺ شادی کرنے والے کو ان الفاظ سے مبارک باد دیا کرتے تھے: بَارَكَ اللهُ لك، وَبَارَكَ عَلَيْكُما، وجمع بَيْنَكُما في خير: اللہ تعالیٰ آپ کے لئے مبارک کریں اور تم دونوں پر برکتیں نازل کریں اور تم دونوں کو خیر میں جوڑے رکھیں (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۴۵)

مباشرت کی دعا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی بیوی سے صحبت کا ارادہ کرے تو کہے: بسم اللّٰه، اللهم جَنِّبْنَا الشيطانَ، وجَنِّبِ الشيطانَ مارَزَقْتَنا: (بنام خدا مقاربت کرتا ہوں۔ اے اللہ! آپ شیطان کے شر سے ہمیں بچائیں اور اس اولاد کو بھی شیطان کے شر سے بچائیں جو آپ ہمیں عنایت فرمائیں) فرمایا: ''اگر اس مباشرت سے بچہ مقدر ہوا تو شیطان اس کو کبھی نقصان نہیں پہنچا سکے گا'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۱۶)

بیت الخلاء جانے کی دعا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ بیت الخلاء جنات کے اڈے ہیں، پس جب کوئی بیت الخلاء جائے تو کہے: أعوذ بالله من الْخُبُثِ وَالْخبائث: اللہ کی پناہ خبیث جنوں سے اور جنوں کی خبیث عورتوں سے (مشکوٰۃ حدیث ۳۵۷ کتاب الطہارۃ، باب آداب الخلاء)

بیت الخلاء سے نکلنے کی دعا: نبی ﷺ جب بیت الخلاء سے نکلتے تو کہتے: غُفْرَانَكَ! خدایا معاف فرما (مشکوٰۃ حدیث ۳۵۹)

پریشانی کے وقت کا ذکر: جب رسول اللہ ﷺ کو کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو کہتے: لا إله إلا الله العظيم الحليم، لا إله إلا اللّٰهُ ربُّ العرش العظيم، لا إله إلا الله ربُّ السماوات وربُّ الأرض وربُّ العرش الكريم: کوئی معبود نہیں اس اللہ کے سوا جو عظیم المرتبت اور بردبار ہیں۔ کوئی معبود نہیں اس اللہ کے سوا جو عرش عظیم کے پروردگار ہیں۔ کوئی معبود نہیں اس اللہ کے سوا جو آسمانوں کے رب اور زمین کے رب اور عرش کریم کے رب ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۱۷)

غصے کے وقت کا ذکر: رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں دو آدمیوں میں کچھ سخت کلامی ہوئی۔ ایک غصہ میں لال ہو گیا اور اپنے ساتھی کو برا بھلا کہنے لگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں ایک کلمہ جانتا ہوں، اگر یہ آدمی اسے کہہ لے تو اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے۔ وہ کلمہ: أعوذ بالله من الشيطان الرجيم ہے۔ یعنی میں پناہ چاہتا ہوں مردود شیطان سے'' لوگوں نے اس سے کہا: تو نبی ﷺ کا ارشاد نہیں سنتا؟ اس نے جواب دیا: میں پاگل نہیں! (یعنی سن رہا ہوں) (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۲۴۱۸)

فائدہ: غصہ کی بُحرانی کیفیت میں چونکہ آدمی دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے، اس لئے خیر خواہوں کو چاہئے کہ اسے یہ زرین دعا یاد دلائیں۔

جب مرغ کی بانگ سنے: تو اللہ کا فضل طلب کرے، کیونکہ اس نے فرشتہ کو دیکھا ہے (یعنی کہے: اللهم! إني أَسْأَلُكَ من فَضْلِكَ: الٰہی! میں آپ سے آپ کے فضل کی استدعا کرتا ہوں) (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۱۹)

جب گدھا رینکے: تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ طلب کرے، کیونکہ اس نے شیطان کو دیکھا ہے۔ (یعنی کہے: أعوذ باللّٰه من الشيطان الرجيم) (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۲۴۱۹)

سوار ہونے کی دعا: جب رکاب میں پیر رکھے تو کہے: بسم الله اور جب پیٹھ پر ٹھیک بیٹھ جائے تو کہے: الحمد لله پھر کہے: ﴿سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ، وَإِنَّا إِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ﴾ (پاک ذات ہے وہ جس نے اس سواری کو ہمارے بس میں کر دیا، اور ہم ایسے نہ تھے کہ اس کو قابو میں کر لیتے، اور ہم کو اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے (الزخرف آیات ۱۳و۱۴) پھر تین بار الحمد لله کہے اور تین بار اللّٰه أكبر کہے، (پھر کہے:) سبحانك! إني ظلمتُ نفسي، فاغفرلي، فإنه لايغفر الذنوب إلا أنت (آپ کی ذات پاک ہے! بیشک میں نے اپنی ذات پر ظلم کیا، پس آپ مجھے بخش دیں، کیونکہ گناہوں کو آپ کے سوا کوئی نہیں بخشتا) (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۳۴)

سفر شروع کرنے کی دعا: رسول اللہ ﷺ جب سفر میں روانگی کے لئے اونٹ پر سوار ہوتے تو تین مرتبہ الله أكبر کہتے، پھر سبحان الذى سخر إلخ پڑھتے، پھر یہ دعا کرتے: اللهم! إنا نسألك في سفرنا هذا الْبِرَّ والتقوى، ومن العمل ما تَرْضٰى، اللهم! هَوِّنْ علينا سَفَرَنَا هذا، وَاطْوِلَنَا بُعْده، اللهم! أنت الصاحبُ في السفر، والخليفةُ في الأهل والمال، اللهم! إني أعوذ بك من وَعْثَاءِ السفر، وكَآبَةِ الْمَنْظَرِ، وسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ في المال والأهل (اے اللہ! ہم آپ سے اپنے اس سفر میں نیکی اور پرہیزگاری طلب کرتے ہیں، اور اعمال میں سے جن سے آپ خوش ہوں، اے اللہ! ہم پر اس سفر کو آسان فرما اور ہمارے لئے اس کی دوری کو لپیٹ دے۔ اے اللہ! آپ ہی سفر میں ساتھی ہیں اور آپ ہی اہل وعیال اور اموال میں نائب ہیں۔ اے اللہ! بیشک میں آپ کی پناہ طلب کرتا ہوں سفر کی مشقت (تھکن) سے اور منظر (جائے نظر) کے رنج سے یعنی سفر میں کوئی رنج دِہ بات نہ دیکھوں اور مال وآل میں بری واپسی سے یعنی لوٹ کر کوئی بری بات نہ پاؤں) اور جب سفر سے واپسی ہوتی تو بھی یہی ذکر کرتے اور ان کلمات کا اضافہ فرماتے: آئِبُوْنَ تائبون عابدون لربنا حامدون (ہم واپس لوٹنے والے، توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے اور اپنے پروردگار ہی کی ستائش کرنے والے ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۲۰)

سفر میں کسی منزل پر اترنے کی دعائیں: (۱) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو کسی منزل پر اترے اور کہے: أعوذ بكلماتِ الله التَّامَّاتِ من شَرِّ ما خَلَقَ تو جب تک اس منزل سے کوچ نہیں کرے گا کوئی چیز اس کو ضرر نہیں پہنچائے گی (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۲۲)

(۲) رسول اللہ ﷺ جب سفر کرتے اور رات آتی تو کہتے: يا أرضُ! ربي وربُّكِ اللّٰهُ، أعوذ بالله من شَرِّكِ وشَرِّ ما فيكِ، وشَرِّ ما خُلِقَ فيكِ، وَشَرِّ ما يَدِبُّ عليكِ، وأعوذ بالله من أَسَدٍ وأَسْوَدَ، ومن الحية والعقرب، وشَرِّ ساكنِ البلدِ، ومن والدٍ وما وَلَدَ: اے زمین! میرا اور تیرا پروردگار اللہ ہے۔ میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں تیرے

شر سے اور اس چیز کے شر سے جو تیرے اندر ہے اور اس چیز کے شر سے جو تیرے اندر پیدا کی گئی ہے اور اس چیز کی برائی سے جو تجھ پر رینگتی ہے اور اللہ کی پناہ چاہتا ہوں شیر اور کالے سانپ سے اور ہر سانپ اور بچھو سے اور بستی میں بسنے والوں کے شر سے اور جننے والے کی برائی سے اور اس کی برائی سے جو اس نے جنا۔

سفر میں وقتِ سحر کا ذکر: نبی ﷺ جب سفر میں ہوتے اور وقتِ سحر ہوتا تو کہتے: سَمِعَ سَامِعٌ بحمد الله، وحُسْنِ بَلائِهِ علينا، رَبَّنَا! صَاحِبْنَا، وأَفْضِلْ علينا، عَائِذًا بالله من النار: سنی سننے والے نے یعنی ہر سننے والا سن لے میری اللہ کی تعریف کو اور ہم پر ان کی عمدہ نعمتوں کو، اے ہمارے رب! ہمارے ساتھی بنیں اور ہم پر احسان کریں (ہم یہ بات کہتے ہیں) اللہ کی پناہ چاہتے ہوئے دوزخ سے (مشکوۃ حدیث ۲۴۲۴)

سفر سے واپسی کا ذکر: جب رسول اللہ ﷺ جہاد یا حج یا عمرہ سے واپس لوٹتے تو ہر بلندی پر تین بار تکبیر کہتے، پھر کہتے لا إلٰه إلا الله، وحده لاشريك له، له الملك وله الحمد، وهو على كل شيئ قدير، آيبون تائبون، عابدون ساجدون، لربنا حامدون، صَدَقَ الله وعدَه، ونَصرَ عبدَه، وَهَزَمَ الأَحْزَابَ وَحْدَه (مشکوۃ حدیث ۲۴۲۵)

کافروں کے لئے بددعائیں: (۱) غزوۂ خندق میں رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کے لئے یہ بددعا کی تھی: اللهم! مُنْزِلَ الكتاب، سريعَ الحساب، اللهم! اهْزِمِ الأَحْزَابَ، اللهمَّ اهْزِمْهُمْ وَزَلْزِلْهُمْ: اے اللہ! اے کتاب (قرآن) کے اتارنے والے! اے جلد حساب لینے والے! اے اللہ! کفار کے گروہوں کو شکست دیجئے۔ اے اللہ! ان کو شکست دیجئے اور ان کو ہلا دیجئے یعنی ثابت قدم نہ رکھئے (مشکوۃ حدیث ۲۴۲۶)

(۲) جب رسول اللہ ﷺ کو کسی قوم سے اندیشہ ہوتا تو کہتے: اللهم! إنا نَجْعَلُكَ في نُحُوْرِهم، ونَعُوْذُ بك من شُرُوْرِهِمْ: اے اللہ! ہم آپ کو ان کے سینوں کے بالائی حصہ میں کرتے ہیں یعنی آپ مقابلہ کرکے ان کو دفع فرمائیں اور ان کے شرور سے ہم آپ کی پناہ چاہتے ہیں (مشکوۃ حدیث ۲۴۴۱)

(۳) آنحضرت ﷺ جہاد میں یہ دعا کرتے تھے: اللهم! أنت عَضُدِيْ ونصيري، بك أَحُوْلُ، وبك أَصُوْلُ، وبك أُقَاتِل: اے اللہ! آپ میرے بازو ہیں اور میرے مددگار ہیں۔ آپ ہی کی مدد سے حیلہ کرتا ہوں اور آپ ہی کی استعانت سے حملہ کرتا ہوں اور آپ ہی کے ذریعہ جنگ کرتا ہوں (مشکوۃ حدیث ۲۴۴۰)

کسی کے یہاں کھانا کھانے کے بعد دعا: رسول اللہ ﷺ نے بُسر اسلمی رضی اللہ عنہ کے گھر کھانا کھا کر ان کو یہ دعا دی: اللهم بَارِكْ لَهُمْ فيما رَزَقْتَهُمْ، واغْفِرْ لهم وَارْحَمْهُمْ: اے اللہ! برکت فرما میزبانوں کے لئے اس روزی میں جو آپ نے ان کو عطا فرمائی ہے اور ان کی بخشش فرما اور ان پر مہربانی فرما (مشکوۃ حدیث ۲۴۲۷)

نیا چاند دیکھنے کی دعا: رسول اللہ ﷺ جب نیا چاند دیکھتے تو کہتے: اللهم! أَهِلَّه عَلَيْنَا بِالْأَمْنِ والإيمان والسلامة والإسلام، رَبِّي وربُّك الله: اے اللہ! اس چاند کو ہمارے لئے امن وایمان اور سلامتی واسلام کا چاند بنا

(اے چاند!) میرا اور تیرا رب اللہ ہے (مشکوۃ حدیث ۲۴۲۸)

دُکھی کو دیکھ کر دعا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب آدمی کی نظر کسی مبتلائے مصیبت پر پڑے، اور کہے: **الحمد لله الذی عافانی مِمَّا ابْتَلاكَ به، وفَضَّلَنِیْ علی کثیر ممن خَلَقَ تفضیلا** (تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے عافیت بخشی اس بلا سے جس میں تجھ کو مبتلا کیا، اور اپنی بہت سی مخلوقات پر اس نے مجھے برتری بخشی) تو وہ شخص اس بلا سے محفوظ رہے گا، خواہ کوئی بھی مصیبت ہو (مگر یہ دعا اس طرح آہستہ پڑھے کہ مبتلائے مصیبت سن نہ سکے، ورنہ اس کا دل دکھے گا) (مشکوۃ حدیث ۲۴۲۹)

بڑے بازار میں جانے کا ذکر: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو بڑے بازار میں گیا اور وہاں یہ ذکر کیا: **لا إلٰه إلا الله، وحده لاشریك له، له الملك وله الحمد، یحیی ویمیت، وهو حَیٌّ لّاَیموت، بیده الخیر، وهو علی کل شیئ قدیر** تو اس کے لئے ہزاروں ہزار نیکیاں لکھی جائیں گی، اس کے ہزاروں ہزار گناہ مٹائے جائیں گے۔ اس کے ہزاروں ہزار درجے بلند کئے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک حویلی بنائیں گے (مشکوۃ حدیث ۲۴۳۱)

کفارۂ مجلس: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو کسی ایسی مجلس میں بیٹھے جس میں بے فائدہ باتیں بہت ہوئی ہوں، پھر اس نے اٹھنے سے پہلے کہا: **سبحانك اللهم وبحمدك، أشهد أن لا إلٰه إلا أنت، اَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلیك** (آپ کی ذات پاک ہے، اے اللہ! اور آپ اپنی خوبیوں کے ساتھ ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں آپ سے بخشش چاہتا ہوں اور میں آپ کے سامنے توبہ کرتا ہوں) تو وہ تمام باتیں جو اس مجلس میں ہوئی ہیں بخش دی جاتی ہیں (مشکوۃ حدیث ۲۴۳۳)

رخصت کرنے کی دعائیں: (۱) رسول اللہ ﷺ جب کسی کو رخصت کرتے تو اس کا ہاتھ پکڑتے اور کہتے: **أَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِیْنَكَ وَأَمَانَتَكَ وَآخِرَ عَمَلِكَ**: میں اللہ کے سپرد کرتا ہوں تیرا دین، تیری امانت داری اور تیرے آخری اعمال (مشکوۃ حدیث ۲۴۳۵)

(۲) ایک شخص نے عرض کیا: میں سفر میں جا رہا ہوں مجھے توشہ دیجئے یعنی مجھے دعا دیجئے۔ آپ نے دعا دی: **زَوَّدَكَ الله التقویٰ** (اللہ تعالیٰ تیرا زادِ راہ تقوی بنائیں یعنی تجھے پرہیز گاری نصیب ہو) اس نے عرض کیا: مجھے اور دیجئے: آپ نے فرمایا: **وغَفَرَ ذَنْبَك** (اور اللہ تیری بخشش فرمائیں) اس نے عرض کیا: میرے ماں باپ آپؐ پر قربان! مجھے اور دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا: **وَیَسَّرَ لك الخَیْرَ حَیْثُمَا کنتَ** (اور اللہ تعالیٰ آپ کے لئے خیر میسر کریں جہاں بھی آپ ہوں) (مشکوۃ حدیث ۲۴۳۷)

(۳) ایک سفر میں جانے والے شخص کو آنحضرت ﷺ نے یہ دعا دی: **اللهمَّ اطْوِ له البُعْدَ، وهَوِّنْ علیه السَّفَرَ**: اے اللہ! اس کے لئے منزل کی دوری لپیٹ دیجئے اور اس پر سفر آسان فرمائیے (مشکوۃ حدیث ۲۴۳۸)

گھر سے نکلنے کے اذکار: (۱) نبی ﷺ جب گھر سے نکلتے تو کہتے: بسم الله، توكلتُ على الله، اللهم! إنا نعوذبك من أن نَزِلَّ أو نَضِلَّ، أَو نَظْلِمَ أُونُظْلَمَ، أَو نَجْهَلَ أو يُجْهَلَ علينا: بنام خدا نکلتا ہوں۔ اللہ ہی پر میرا بھروسہ ہے۔ اے اللہ! ہم آپ کی پناہ مانگتے ہیں اس سے کہ ہم پھسلیں یا ہم غلط راہ پر چلیں یا ہم زیادتی کریں یا ہم پر زیادتی کی جائے یا ہم نادانی کریں یا ہمارے ساتھ نادانی کا برتاؤ کیا جائے (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۴۲)

(۲) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص گھر سے نکلتے وقت کہے: بسم الله، توكلتُ على الله، لاحولَ ولاقوةَ إلا بالله تو اس سے کہا جاتا ہے: تو راہ دکھایا گیا، تیرا کام بن گیا، تو بچالیا گیا اور شیطان تجھ سے دور ہو گیا (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۴۳)

گھر میں داخل ہونے کا ذکر: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی شخص اپنے گھر میں داخل ہو تو کہے: اللهم! أسألك خَيْرَ المَوْلَجِ وخَيْرَ المَخْرَجِ، بسم الله وَلَجْنَا، وبسم الله خَرَجْنَا، وعلى الله رَبِّنَا توكلنا: اے اللہ! میں آپ سے داخل ہونے کی بھلائی اور نکلنے کی بھلائی مانگتا ہوں یعنی اندر آنا اور باہر نکلنا بھلائی کے ساتھ ہو۔ بنام خدا داخل ہوئے ہم اور بنام خدا نکلے ہم اور اللہ پر جو ہمارے پروردگار ہیں بھروسہ کیا ہم نے (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۴۴ ابوداؤد حدیث ۵۰۹۶)

قرض اور تنگ حالی سے نجات کی دعا: (۱) ایک صحابی پر قرضوں کا بہت بوجھ ہو گیا تھا اور فکروں نے ان کو گھیر لیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''صبح وشام یہ پڑھا کرو: اللهم! إنى أعوذ بك من الهَمِّ والحُزْنِ، وأعوذ بك من الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ، وأعوذ بك من الْجُبْنِ والبُخْلِ، وأعوذ بك من غَلْبَةِ الدَّيْنِ وَقَهْرِ الرجالِ (اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں فکر وغم سے۔ اور میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں درماندگی وکاہلی سے۔ اور میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں بزدلی وبخیلی سے۔ اور میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں قرضہ کے دبانے سے اور لوگوں کے غلبہ سے) وہ صحابی فرماتے ہیں کہ میں نے اس ہدایت پر عمل کیا، خدا کے فضل سے میری ساری فکریں ختم ہو گئیں۔ اور میرا قرضہ بھی ادا ہو گیا (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۴۸)

(۲) ایک مکاتب نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عرض کیا: میں زرِ کتابت ادا کرنے سے عاجز ہوں، آپ میری مدد کریں۔ آپ نے فرمایا: میں تجھے وہ دعا بتاتا ہوں جو مجھے رسول اللہ ﷺ نے تلقین فرمائی ہے۔ اگر تجھ پر پہاڑ کے برابر بھی قرضہ ہوگا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ادا ہو جائے گا۔ وہ دعا یہ ہے: اللهمَّ اكْفِنِى بِحَلاَلِكَ عن حَرَامِكَ، وأَغْنِنِى بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ: اے اللہ! مجھے حلال طریقے سے اتنی روزی دے جو میرے لئے کافی ہو جائے اور حرام کی ضرورت نہ ہو، اور اپنے فضل وکرم سے مجھے اپنے ماسواء سے بے نیاز کردے (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۴۹)

نیا لباس پہننے کی دعائیں: (۱) جب نیا کپڑا پہنے تو کہے: اللهم! لك الحمد أنت كسوتنى هذا — هذا کے بعد اس کپڑے کا نام لے مثلاً هذا القميص یا هذه العِمامةَ وغیرہ — أسألك خيره، وخيرَ ما صُنِعَ له، وأعوذ بك من شره، وشر ما صُنِعَ له: اے اللہ! آپ کے لئے تعریف ہے، آپ ہی نے مجھے یہ — کرتا یا پگڑی وغیرہ — پہنائی۔ میں آپ سے اس کی خیر کی اور اس چیز کے خیر کی جس کے لئے وہ بنایا گیا ہے استدعا کرتا ہوں۔ اور میں آپ کی پناہ چاہتا

ہوں اس کی برائی سے اور اس چیز کی برائی سے جس کے لئے وہ بنایا گیا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۴۳۴۲ کتاب اللباس)

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے نیا کپڑا پہنا اور کہا: الحمد للہ الذی کسانی ما أُوَارِیْ به عَوْرَتِیْ، وَأَتَجَمَّلُ به فی حَیَاتِی (تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں، جس نے مجھے وہ لباس پہنایا جس سے میں اپنے ستر کو چھپاتا ہوں، اور جس کے ذریعہ میں اپنی زندگی میں مزین ہوتا ہوں) پھر پرانا لباس صدقہ کردے، تو وہ زندگی میں اور مرنے کے بعد اللہ کی حفاظت میں رہے گا۔ اور اللہ تعالیٰ اس کی پردہ داری فرمائیں گے (مشکوٰۃ حدیث ۴۳۷۴ کتاب اللباس)

کھانے پینے کی دعائیں: (۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کھاتے یا پیتے تو کہتے: الحمد للہ الذی أَطْعَمَنَا وَسَقَانَا، وَجَعَلَنَا مُسْلِمِیْنَ: اس اللہ کے لئے حمد وشکر ہے جس نے ہمیں کھلایا اور ہمیں پلایا، اور ہمیں مسلمانوں میں شامل فرمایا (ترمذی ۲: ۱۸۴ ابوداؤد حدیث ۳۸۵۰ مشکوٰۃ حدیث ۴۲۰۴ کتاب الأطعمة)

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص کھانا کھائے، پھر کہے: الحمدللہ الذی أَطْعَمَنِیْ هذا، ورزقنیه من غیر حَوْلٍ منی ولا قُوَّةٍ (ساری حمد اس اللہ کے لئے ہے جس نے مجھے یہ کھانا کھلایا، اور مجھے یہ روزی عطا فرمائی میری قوت وطاقت کے بغیر) تو اس کے سارے گناہ بخش دیئے جائیں گے (ترمذی ۲: ۱۸۴)

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھانے پینے کے بعد کہتے تھے: الحمد للہ الذی أَطْعَمَ وَسَقٰی، وسَوَّغَهُ، وَجعلَ له مَخْرجًا: تمام ستائشیں اس اللہ کے لئے ہیں جنہوں نے کھلایا پلایا، اور اس کو خوشگوار بنایا اور اس کے لئے نکلنے کا راستہ رکھا (مشکوٰۃ حدیث ۴۲۰۷ کتاب الأطعمة)

دسترخوان اٹھاتے وقت کی دعا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دسترخوان اٹھایا جاتا تھا تو آپ کہتے: الحمد للہ حمدًا کثیرًا طیبًا مبارکاً فیه، غَیْرَ مَکْفِیٍّ ولا مُوَدَّعٍ، ولا مُسْتَغْنیً عنه رَبَّنا: ہر حمد اللہ کے لئے ہے، بہت زیادہ حمد، پاکیزہ حمد، جس میں برکت کی گئی، نہ کفایت کرنے والا اور نہ رخصت کیا ہوا، اور نہ اس سے بے نیاز ہوا ہوا، اے ہمارے پروردگار! (مشکوٰۃ حدیث ۴۱۹۹)

مسجد جانے کی دعا: ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز کے لئے مسجد چلے تو یہ ذکر کیا: اللھم اجعل فی قلبی نوراً، واجعل فی لسانی نورًا، واجعل فی سمعی نورًا، واجعل فی بصری نورًا، واجعل خلفی نورًا، وأما می نورًا، واجعل من فوقی نورًا، ومن تحتی نورًا، وأَعْظِمْ لی نورًا: اے اللہ! میرے دل میں نور پیدا فرما اور میری زبان میں نور پیدا فرما اور میری سماعت میں نور پیدا فرما اور میری نگاہ میں نور پیدا فرما اور میرے پیچھے نور گردان اور میرے آگے نور، اور میرے اوپر نور بنا اور میرے پیچھے نور، اور بڑا کر میرے لئے نور (ابوداؤد حدیث ۱۳۵۳)

مسجد میں داخل ہونے کی دعائیں: (۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب (صبح) مسجد میں داخل ہوتے تو کہتے: أعوذ باللّٰه العظیم، وبوجهه الکریم، وسلطانه العظیم، من الشیطان الرجیم (میں پناہ چاہتا ہوں عظیم الشان اللہ پاک کی، ان

کی بزرگ ذات کی اوران کی قدیم سلطنت کی، مردود شیطان سے) فرمایا: ''جب داخل ہونے والا یہ کہتا ہے تو شیطان کہتا ہے: دن بھر مجھ سے محفوظ ہو گیا'' (مشکوۃ حدیث ۷۴۹ باب المساجد)

(۲) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی مسجد میں داخل ہو تو کہے: اللهم افْتَحْ لی أبوابَ رحمتك: الٰہی! میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دیں!

مسجد سے نکلنے کی دعا: اور جب مسجد سے نکلے تو کہے: اللهم! إنی أسألك من فضلك: الٰہی! میں آپ سے آپ کے فضل کی استدعا کرتا ہوں (مشکوۃ حدیث ۷۰۳)

گرج اور کڑک کے وقت کی دعا: رسول اللہ ﷺ جب بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک سنتے تو یہ دعا کرتے: اللهم! لاتَقْتُلْنَا بِغَضَبِكَ، ولاتُهْلِكْنَا بِعَذَابِكَ، وَعَافِنَا قَبْلَ ذلك: الٰہی! ہمیں اپنے غصہ سے مار نہ ڈالیں، اور اپنے عذاب سے ہلاک نہ کردیں، اور ہمیں اس سے پہلے عافیت بخشیں (ترمذی ۲: ۱۸۳)

آندھی کے وقت کی دعا: نبی ﷺ جب تیز آندھی چلتی تو یہ دعا کرتے: اللهم! إنی أسألك خَيْرَها، وخَيْرَ ما فيها، وخَيْرَ ما أُرْسِلَتْ به، وأعوذ بك من شرها، وشر مافيها، وشر ما أُرْسِلَتْ به: الٰہی! میں آپ سے اس ہوا کی خیر، اور اس میں جو مشمول ہے اس کی خیر اور وہ جس مقصد کے لئے بھیجی گئی ہے اس کی خیر طلب کرتا ہوں۔ اور میں آپ کی پناہ طلب کرتا ہوں اس کے شر سے، اور اس کے مضمرات کے شر سے اور وہ جس مقصد سے بھیجی گئی ہے اس کے شر سے (مشکوۃ حدیث ۱۵۱۳ باب الریاح، کتاب الصلاۃ)

چھینکنے کی دعا، اس کا جواب اور جواب الجواب: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب کسی کو چھینک آئے تو کہے: الحمد لله (اللہ کے لئے حمد وشکر ہے) اور سننے والا کہے: يَرْحَمُكَ الله (آپ پر اللہ کی رحمت ہو) اور چھینکنے والا جواب الجواب میں کہے: يَهْدِيْكُمُ اللهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ (اللہ آپ کو صحیح راہ پر چلائیں اور آپ کا حال درست فرمائیں) (مشکوۃ حدیث ۴۷۳۳ باب العطاس، کتاب الآداب) اور ایک روایت میں ہے کہ چھینکنے والا کہے: الحمدلله على كل حال (مشکوۃ حدیث ۴۷۳۹)

نوٹ: شاہ صاحب نے چھینکنے کی جو دعا لکھی ہے یعنی الحمدلله حمدًا كثيرًا طيباً مباركاً: یہ دعا کسی روایت میں نظر سے نہیں گذری۔

نوٹ: چھینکنے والی عورت ہو تو کاف کے زیر کے ساتھ يَرْحَمُكِ الله کہے۔

سونے جاگنے کی دعائیں: رسول اللہ ﷺ جب رات میں لیٹتے تو اپنا ہاتھ اپنے رخسار کے نیچے رکھتے، پھر کہتے: اللهم! بِاسْمِكَ أَمُوْتُ وأَحْيَا (الٰہی! آپ کے نام پر مرتا ہوں اور زندہ ہوتا ہوں) اور جب بیدار ہوتے تو کہتے: الحمد لله الذی أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وإليه النشور: تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے ہمیں زندہ کیا ہم کو

مارنے کے بعد اور انہی کی طرف قیامت کے دن زندہ ہوکر جانا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۲۳۸۲)

اذان کے وقت کے اذکار: اذان کے وقت پانچ اذکار مشروع کئے گئے ہیں:

اول: اذان کا جواب دے۔ جو کلمہ مؤذن کہے وہی جواب میں کہے۔ البتہ حَیعلتین کا جواب حوقلہ سے دے (مشکوٰۃ حدیث ۶۵۸)

دوم: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو اذان سن کر کہے: أشهدُ أن لا إلٰه إلا اللّٰه، وحده لاشريك له، وأن محمدًا عبده ورسوله، رَضِيْتُ باللّٰه رَبًّا، وبمحمدٍ رَّسُوْلاً، وَبالإسلام دينًا تو اس کے گناہ معاف کردیئے جائیں گے (مشکوٰۃ حدیث ۶۶۱)

فائدہ: یہ ذکر شہادتین کے جواب میں بھی کیا جاسکتا ہے، اور اذان کے بعد کی دعا کے طور پر بھی۔

سوم: درود بھیجنا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم اذان سنو تو وہی کلمات کہو جو مؤذن کہتا ہے، پھر مجھ پر درود بھیجو، جو مجھ پر ایک بار درود بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دس بار درود بھیجتے ہیں، پھر میرے لئے وسیلہ (قرب خداوندی کا خاص مقام) مانگو۔ یہ جنت میں ایک مقام ہے جو کسی ایک ہی بندے کو ملے گا، اور میں امیدوار ہوں کہ وہ مقام مجھے ملے، پس جو میرے لئے وسیلہ کی دعا کرے گا اس کے لئے میں ضرور سفارش کرونگا'' (مشکوٰۃ حدیث ۶۵۷)

چہارم: اذان کے بعد یہ دعا کرے: اللهم ربّ هٰذه الدعوة التامَّة، والصلاة القائمة، آتِ محمد الوسيلة والفضيلة، وابعثه مقامًا محمودًا الذى وعدته، إنك لاتخلف الميعاد۔ حدیث شریف میں ہے کہ جو یہ دعا کرے گا اس کے لئے قیامت کے دن میری شفاعت ضرور اترے گی (مشکوٰۃ حدیث ۶۵۹ سنن بیہقی ۱: ۴۱۰)

فائدہ: والدرجة الرفيعة کسی روایت میں نہیں۔ یہ وسیلہ اور فضیلہ کے معنی ہیں جو کسی نے دعا میں شامل کئے ہیں۔ اسی طرح وارزقنا شفاعته يومَ القيامة بھی دعا میں شامل نہیں۔ یہ اس دعا کی جزء ہے۔

پنجم: اذان کے بعد اپنے لئے بھی دنیا وآخرت کی بھلائیاں طلب کرے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اذان واقامت کے درمیان کسی کی دعا ردّ نہیں کی جاتی (مشکوٰۃ حدیث ۶۷۱)

عشرۂ ذی الحجہ کے اذکار: ذوالحجہ کے عشرۂ اولی میں بکثرت ذکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے: ذوالحجہ کے عشرۂ اولی میں اعمال جس قدر محبوب وافضل ہیں: دوسرے دنوں میں اتنے محبوب نہیں، لہٰذا ان ایام میں تہلیل وتکبیر بکثرت کرو (درمنثور ۶: ۳۴۵)

تکبیراتِ تشریق: صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین سے بہ طریق شہرت: یوم عرفہ اور ایام تشریق کی تکبیرات مختلف طرح سے مروی ہیں۔ ان میں اقرب الی الصواب یہ بات ہے کہ یوم عرفہ کی فجر سے ۱۳ ذی الحجہ کی عصر تک ہر فرض نماز کے بعد یہ تکبیر کہے: ألله أكبر، ألله أكبر، لا إلٰه إلا الله، والله أكبر، الله أكبر ولله الحمد۔

فائدہ: تکبیر تشریق کے بارے میں مرفوع حدیثیں دو تین ہیں، مگر سب ضعیف ہیں۔ اور صحابہ وتابعین کے آثار مختلف

ہیں اور ائمہ مجتہدین میں بھی اختلاف ہے۔امام اعظم کے نزدیک: یوم عرفہ کی فجر سے یوم النحر (۱۰ ذی الحجہ) کی عصر تک تکبیرات ہیں۔اور صاحبین کے نزدیک: یوم عرفہ کی فجر سے ۱۳ ذی الحجہ کی عصر تک ہیں۔فتوی اور عمل صاحبین کے قول پر ہے۔تفصیل کے لئے نصب الرایہ (۲۲۲:۲) دیکھیں۔

ملحوظہ: نماز کے اذکار وادعیہ اور دیگر مواقع کے اذکار پہلے کتاب الصلوٰۃ میں اور ابواب الاحسان میں گذر چکے ہیں۔وہاں دیکھ لئے جائیں۔

مصافحہ کی دعا: جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے مصافحہ کرے تو کہے **یغفر اللہ لنا ولکم** (اللہ ہماری اورآپ کی بخشش فرمائیں) اور دوسرا بھی یہی کہے۔اور دونوں —— سلام کی طرح —— یہ ذکر ذرا جہراً کریں۔ابوداؤد شریف میں روایت ہے کہ:"جب دو مسلمان ملاقات کریں،اور مصافحہ کریں،اور دونوں اللہ کی تعریف کریں،اور دونوں اللہ سے بخشش طلب کریں تو دونوں کی بخشش کردی جاتی ہے (مشکوٰۃ حدیث ۴۶۷۹ باب المصافحة) اور مسند احمد میں روایت ہے کہ اللہ نے اپنے ذمہ لازم کیا ہے کہ دونوں کی دعا میں حاضر ہوں یعنی ان کی دعا قبول فرمائیں (مجمع الزوائد ۳۶:۸ باب المصافحة)

نوٹ: مسنون دعاؤں کی کتابوں میں کسی وجہ سے یہ دعا شامل نہیں ہوسکی،اس لئے لوگوں کے مصافحے بے دعا ہوکر رہ گئے ہیں۔اس لئے شارح نے یہ دعا بڑھائی ہے۔لوگوں کو چاہئے کہ اس کا اہتمام کریں۔اور مصافحہ کے ساتھ یا بعد میں مزاج پرسی کے وقت ہر حال میں اللہ کی تعریف کریں۔

حاصل کلام: جو بندہ ان اذکار کا خود کو پابند بناتا ہے،اور مختلف احوال میں اذکار پابندی سے ادا کرتا ہے،اور ان کے معانی میں غور وفکر کرتا ہے: وہ مُدام ذاکر وشاغل سمجھا جائے گا۔اور سورۃ الاحزاب آیت ۳۵ میں جن بکثرت اللہ کو یاد کرنے والے مردوں اور عورتوں کا تذکرہ آیا ہے،ان میں شامل ہوگا۔جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔الٰہی! ہمیں بھی اپنے مقبول بندوں اور بندیوں میں شامل فرما (آمین)

> **وسَنَّ رسول الله صلى الله عليه وسلم:**
>
> **لـمـن تزوَّج امرأةً، أو اشترى خادمًا:" الـلـهـم! إنى أسألك خيرَها، وخيرَ ما جَبَلْتَها عليه، وأعوذ بك من شرها، وشر ما جبلتها عليه"**
>
> **وإذا رَفَّأَ إنسانا: "بارك الله لك، وبارك عليكما، وجمع بينكما فى خير"**
>
> **وإذا أراد أن يأتى أهله:" باسم الله، اللهم! جنبنا الشيطانَ، وجنب الشيطان ما رزقتنا"**
>
> **ولمن أراد أن يدخل الخلاء:" أعوذ بالله من الخبث والخبائث"**
>
> **وللخارج منه:" غفرانك!"**
>
> **وعند الكرب:" لا إله إلا الله الحليم العظيم، لا إله إلا الله رب العرش العظيم، لا إله إلا الله**

رب السماوات ورب الأرض ورب العرش الكريم“
وعند الغضب: ” أعوذ بالله من الشيطان الرجيم“
وعند صياح الديكة: السؤالَ من فضل الله.
وعند نهيق الحمار: التعوذَ.
وإذا ركب: كبر ثلاثا، ثم قال:﴿سبحان الذى سخرلنا هذا وماكنا له مقرنين، وإنا إلى ربنا لمنقلبون﴾ الحمد لله – ثلاثا– الله أكبر– ثلاثا– سبحانك اللّٰهم! ظلمت نفسى، فاغفرلى، إنه لايغفر الذنوب إلا أنت“
وإذا أنشأ سفرًا: اللّٰهم إنا نسألك فى سفرنا هذا البرَّ والتقوى، ومن العمل ما ترضى، اللّٰهم هوِّن علينا سفرنا هذا، وَاطْوِلنا بُعدَه، اللّٰهم أنت الصاحب فى السفر، والخليفةُ فى الأهل، اللّٰهم إنى أعوذ بك من وَعْثَاءِ السفر، وكَآبَةِ المنقلَب، وسوء المنظر فى المال والأهل“
وإذا نزل منزلاً:
[۱] أعوذ بكلمات الله التامَّات من شر ما خلق.
[۲] يا أرضُ! ربى وربكِ الله! أعوذ بالله من شركِ، ومن شر مافيكِ، ومن شر ما خُلق فيك، ومن شر ما يَدِبُّ عليكِ، وأعوذ بالله من أسدو أَسْوَدَ، ومن الحية والعقرب، ومن شر ساكن البلد، ومن والد وماولَدَ.
وإذا أَسْحَرَفى سفر :سمع سامع بحمد الله، وحسن بلائه علينا، ربنا! صاحِبْنا وأَفْضِلْ علينا، عائذًا بالله من النار.
وإذا فقل: يكبر على كل شرف من الأرض ثلاث تكبيرات، ثم يقول:” لا إلٓه إلا الله، وحده لاشريك له، له الملك وله الحمد، وهو على كل شيئ قدير، آيبون تائبون عابدون ساجدون لربنا حامدون، صدق الله وعده، ونصر عبده، وهزم الأحزاب وحده“
وإذا دعا على الكافرين:
[۱] ” اللّٰهم! مُنزلَ الكتاب، سريعَ الحساب، اللّٰهم! اهزِمِ الأحزاب، اللّٰهم اهزمهم وزلزلهم“
[۲] ”اللّٰهم إنا نجعلك فى نحورهم، ونعوذ بك من شرورهم“
[۳] ”اللّٰهم أنت عضُدى ونصيرى، بك أصولُ وبك أحول، وبك أقاتل“
وإذا ضاف قومًا: ”اللّٰهم بارك لهم فيما رزقتهم، واغفرلهم، وارحمهم“

وإذا رأى الهلال:" اللّٰهم أَهِلَّه علينا بالأمن والإيمان والسلامة والإسلام، ربى وربك الله!"

وإذا رأى مبتلى:" الحمد لله الذى عافانى مما ابتلاك به، وفضَّلنى على كثير ممن خلق تفضيلاً"

وإذا دخل فى سوق جامع: لا إلٰه إلا الله، وحده لاشريك له، له الملك وله الحمد، يحيى ويميت، وهو حى لايموت، بيده الخير، وهو على كل شيئ قدير"

وإذا أراد أن يقوم من مجلس كثر فيه لَغَطُه: "سبحانك اللّٰهم وبحمدك،أشهد أن لا إلٰه إلا أنت، أستغفرك وأتوب إليك"

وإذا ودَّع رجلا:

[۱] "أَسْتَوْدِعُ الله دينك وأمانتك وآخِرَ عملك"

[۲] و"زَوَّدَكَ الله التقوى، وغفر ذنبك، ويسر لك الخير حيثما كنت"

[۳] "اللهم اطْوِله البعد، وهوِّن عليه السفر"

وإذا خرج من بيته:

[۱] " باسم الله، توكلت على الله، اللّٰهم إنا نعوذ بك من أن نَزِلَّ، أو نَضِلَّ، أو نَظلم، أو نُظلم، أو نَجهل، أو يُجهل علينا"

[۲] "باسم الله! توكلت على الله لاحول ولاقوة إلا بالله"

وإذا ولج بيته:" اللهم إنى أسألك خير المولَج، وخير المخرج، بسم الله ولجنا، وباسم الله خرجنا، وعلى الله ربِّنا توكلنا"

وإذا لزمته ديون وهموم:

[۱] قال إذا أصبح وإذا أمسى:" اللّٰهم إنى أعوذبك من الهم والحُزْنِ، وأعوذبك من العجز والكسل، وأعوذبك من البخل والجبن، وأعوذبك من غلبة الدين وقهر الرجال"

[۲] و"اللهم اكْفِنِىْ بحلالك عن حرامك، وأَغْنِنِىْ بفضلك عمن سواك"

وإذا استجد ثوبًا:

[۱] "اللّٰهم لك الحمد! أنت كسوتَنى هذا— ويسميه باسمه— أسألك خيره، وخيرَ ما صُنع له،وأعوذبك من شره، وشر ما صنع له"

[۲] " الحمد لله الذى كسانى ما أوارى به عورتى، وأتجمل به فى حياتى"

وإذا أكل أو شرب:

[۱] " الحمدلله الذى أطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمين"

[۲] " الحمدلله الذى أطعمنى هذا الطعام، ورَزَقَنِيْه من غير حول منى ولا قوة"

[۳] "الحمدلله الذى أطعم وسَقٰى وسوَّغه، وجعل له مخرجا"

وإذا رُفع مائدتُه: الحمدلله حمدًا كثيرًا طيبا مباركًا فيه، غير مَكْفِيٍّ ولا مُودَّع، ولا مستغنىً عنه، ربنا!"

وإذا مشى إلى المسجد:" اللهم اجعل فى قلبى نورًا" إلخ.

وإذا أراد أن يدخل المسجد:

[۱] "أعوذ بالله العظيم، وبوجهه الكريم، وسلطانه القديم، من الشيطان الرجيم"

[۲] "اللّٰهم افتح لى أبواب رحمتك"

وإذا خرج منه:" اللّٰهم! إنى أسألك من فضلك"

وإذا سمع صوت الرعد والصواعق: " اللهم! لا تقتلنا بغضبك، ولا تهلكنا بعذابك، وعَافِنَا قبل ذلك، اللهم! إنى أعوذبك من شرها"

وإذا عصفت الريح:" اللهم! إنى أسألك خيرها، وخير ما فيها، وخير ما أُرسلت به، وأعوذ بك من شرها، وشر مافيها، وشرما أرسلت به"

وإذا عطس:" الحمد لله حمدًا كثيرًا طيبا مباركا"

وليقل صاحبه:" يرحمك الله!"

وليقل هو:" يهديكم الله، ويُصلح بالكم!"

وإذا نام:" اللهم! باسمك أموت وأحيا"

وإذا استيقظ:" الحمد لله الذى أحيانا بعد ما أماتنا وإليه النشور"

وشُرع عند الأذان خمسة أشياء:

[۱] أن يقول مثل ما يقول المؤذن، غير" حى على الصلاة، وحى على الفلاح" فإنه يقول مكانه:" لاحول ولاقوة إلا بالله"

[۲] ويقول:" رضيت بالله رباً، وبالإسلام دينا، وبمحمد رسولاً"

[۳] ويصلى على النبى صلى الله عليه وسلم.

[٤] ويقول:" اللهم رب هذه الدعوة التامة، والصلاة القائمة، آت محمدًا الوسيلة والفضيلة، والدرجة الرفيعة، وابعثه مقامًا محمودًا، الذى وعدته، إنك لاتخلف الميعاد"

[٥] ويسأل الله لآخرته ودنياه.

وأمر فى عشر ذى الحجة بإكثار الذكر.

وقد استفاض من الصحابة والتابعين وأئمة المجتهدين: تكبيرُ يوم عرفة، وأيام التشريقِ على وجوه: أقربها: أن يكبر دبر كل صلاة، من فجر عرفة إلى آخر أيام التشريق:" الله أكبر، الله أكبر، لا إله إلا الله والله أكبر، الله أكبر ولله الحمد"

وقدمر أدعية الصلاة وغيرها فيما سبق، فراجع.

وبالجملة: فمن صبر نفسَه على هذه الأذكار، وداوم عليها فى هذه الحالات، وتدبَّر فيها: كانت له بمنزلة الذكر الدائم، وشَمَلَه قوله تعالى:﴿ وَالذَّاكِرِيْنَ اللهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرَاتِ﴾ والله أعلم.

ترجمہ: اور رسول اللہ ﷺ نے مسنون کیا اس شخص کے لئے جو کسی عورت سے نکاح کرے یا کسی خادم کو خریدے ...... اور جب شادی کی مبارک باد دے کسی کو: ...... اور ارادہ کرے کہ اپنی بیوی سے صحبت کرے ...... اور (مسنون کیا) اس شخص کے لئے جو بیت الخلاء جانا چاہتا ہے ...... اور بیت الخلاء سے نکلنے والے کے لئے: ...... اور بے چینی کے وقت ...... اور غصہ کے وقت ...... اور مرغ کے بانگ دینے کے وقت: اللہ کے فضل کے سوال کو، اور گدھے کے رینکنے کے وقت پناہ چاہنے کو، اور جب سوار ہو تو تین بار تکبیر کہے: ...... اور جب سفر شروع کرے: ...... اور جب کسی منزل میں اترے: ...... اور جب صبح کرے کسی سفر میں: ...... اور جب سفر سے لوٹے: ...... اور جب کفار کے لئے بددعا کرے ...... اور جب کسی کا مہمان بنے: ...... اور جب نیا چاند دیکھے: ...... اور جب کسی آفت زدہ کو دیکھے: ...... اور جب کسی بڑے بازار میں داخل ہو: ...... اور جب ارادہ کرے کہ اٹھے کسی ایسی محفل سے جس میں اس کی بے فائدہ باتیں بہت ہوئی ہیں: ...... اور جب رخصت کرے کسی کو: ...... اور جب اپنے گھر سے نکلے: ...... اور جب اپنے گھر میں داخل ہو: ...... اور جب اس پر آپڑیں قرضے اور افکار: ...... اور جب کوئی نیا کپڑا پہنے: ...... اور جب کھائے یا پیئے: ...... اور جب اس کا دسترخوان اٹھایا جائے: ...... اور جب مسجد کی طرف چلے: ...... اور جب مسجد میں داخل ہونے کا ارادہ کرے: ...... اور جب مسجد سے نکلے: ...... اور جب گرج اور کڑاکوں کی آواز سنے: ...... اور جب آندھی چلے: ...... اور جب چھینکے: ...... اور چاہئے کہ کہے اس کا ساتھی: ...... اور چاہئے کہ کہے وہ: ...... اور جب سوئے: ...... اور جب بیدار ہو: ...... اور مشروع کیں اذان کے وقت پانچ چیزیں: ...... اور حکم دیا ذی الحجہ کے دس دنوں میں بکثرت ذکر کرنے کا۔ اور تحقیق شہرت کے ساتھ مروی ہے صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین سے: عرفہ اور ایام تشریق کی تکبیر مختلف طرح سے۔ ان میں نزدیک تر یہ ہے کہ تکبیر کہے ہر نماز کے

بعد عرفہ کی فجر سے ایام تشریق کے آخر تک —— اور تحقیق گذر چکیں نماز اور اس کے علاوہ کی دعائیں گذشتہ ابواب میں، پس اس کو دیکھ لیں .... اور حاصل کلام: پس جو شخص روکے اپنے نفس کو ان اذکار پر اور پابندی کرے ان پر ان حالات میں اور غور کرے ان میں تو ہونگی وہ دعائیں اس کے لئے دائمی ذکر کے بمنزلہ، اور شامل ہوگا اس کو اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ''اللہ تعالیٰ کا بکثرت ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں'' باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

باب —— ۳

سلوک واحسان کی باقی باتیں

سلوک واحسان میں بنیادی اہمیت ''ذکر وفکر'' کو حاصل ہے۔ یہی وہ دو بازو ہیں جن کے ذریعہ سالک پرواز کرتا ہے۔ اور منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔ اس لئے اذکار کے بیان سے فارغ ہوکر اب تفکر وتدبّر کا بیان شروع کرتے ہیں۔ نیز اذکار میں جامع ترین ذکر قرآن کریم کی تلاوت ہے مگر اذکارِ عشرہ میں اس کو شامل نہیں کیا۔ اب اس کا مستقل تذکرہ کرتے ہیں۔ اور خصالِ اربعہ: اخبات، طہارت، سماحت اور عدالت: جو تعلیماتِ اسلامیہ کا نچوڑ اور سعادتِ حقیقیہ کا موقوف علیہ ہیں۔ ان کی بھی اس باب میں تفصیل ہے[1] البتہ طہارت کا بیان اس باب میں نہیں ہے[2]

صفتِ اخبات کا بیان

اذکار کے ساتھ تفکر وتدبر ضروری ہے

اخبات کی تحصیل کا عمدہ طریقہ فکر ومراقبہ ہے۔ بارگاہِ خداوندی میں نیازمندی کے فروغ کے لئے، گوشۂ عظمت وکبریائی کی طرف بغور دیکھنے کے لئے، ملأ اعلی کے رنگ میں رنگین ہونے کے لئے، بشری آلائشوں سے پاک ہونے کے لئے اور نفس دنیوی زندگی کے نقوش قبول نہ کرے اور دنیائے دَنی پر مطمئن نہ ہو اس کے لئے تفکر وتدبر سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ حدیث شریف میں ہے: ''ایک ساعت کی فکر ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے'' (کنز العمال حدیث ۵۷۱۰)

اور غور وفکر کی چند صورتیں ہیں:

اول —— ذاتِ حق میں غور وفکر کرنا —— یہ غور وفکر ممنوع ہے۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اس سے روکا

---

[1] صفاتِ اربعہ کا تفصیلی بیان: قسم اول، مبحث چہارم، باب چہارم (رحمۃ اللہ ۱: ۵۳۹-۵۵۴) میں، اور ابواب الاحسان کے باب اول میں گذر چکا ہے ۱۲

[2] طہارت کے اسباب وموانع تفصیل سے: قسم اول، مبحث رابع، باب خامس (رحمۃ اللہ ۱: ۵۶۰) میں گذر چکے ہیں۔ باقی تین ملکات کے اسباب کو بھی مختصراً بیان کیا ہے۔ تفصیلی بیان اس باب میں ہے ۱۲

ہے۔ اس لئے کہ یہ فکر عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہے۔ حدیث میں ہے: ''اللہ کی نعمتوں میں غور کرو، اور اللہ (کی ذات) میں غور مت کرو'' (مجمع الزوائد ۱:۸۱) دوسری حدیث میں جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بسند جیّد موقوفاً مروی ہے: یہ ہے کہ ''ہر چیز میں غور کرو، اور اللہ کی ذات میں غور مت کرو'' (فتح الباری ۱۳:۳۸۳)

وضاحت: ذاتِ حق میں غور کرنے کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک صورت: وہ ہے جس کا حدیث میں ذکر آیا ہے کہ: ''لوگ برابر ایک دوسرے سے پوچھتے رہیں گے کہ مخلوقات اللہ نے پیدا کیں، اللہ کو کس نے پیدا کیا؟'' (مشکوٰۃ حدیث ۶۷) ایسا خیال آئے تو ذہن کو جھٹک دے۔ اور کہے: ﴿اَللّٰہُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ﴾ اللہ بے نیاز ہیں، نہ ان کی کوئی اولاد اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ دوسری صورت: اس بات میں غور کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کے ساتھ کس طرح متصف ہیں؟ یہ بھی ذاتِ حق میں غور کرنا ہے اور ممنوع ہے کیونکہ یہ بات سمجھنا عوام کے بس کی بات نہیں۔

دوم —— اللہ تعالیٰ کی صفات میں غور کرنا —— یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات کا مخلوقات کے ساتھ جو تعلق قائم ہوتا ہے: اس میں غور وفکر کرنا۔ مثلاً: یہ سوچنا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتے ہیں، ہمارا کوئی حال اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں ہے۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ ان کے علم میں ہے۔ وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔ ان کی رحمت ہر چیز کو شامل ہے اور وہ ہر چیز کو احاطۂ علمی میں لئے ہوئے ہیں۔ یہی فکر وتدبر اہل سلوک کی اصطلاح میں ''مراقبہ'' کہلاتا ہے۔ حدیث میں ہے: ''احسان: یہ ہے کہ آپ اس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں: گویا آپ ان کو دیکھ رہے ہیں، پس اگر آپ ان کو نہیں دیکھتے تو وہ بیشک آپ کو دیکھ رہے ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۲) دوسری حدیث میں ہے: ''اللہ تعالیٰ کی نگہداشت کر، ان کو اپنے سامنے پائے گا'' (ترمذی ۲:۷۴ ابواب القیامہ)

وضاحت: پہلی حدیث میں کیفیتِ احسانی کی تحصیل کے لئے صفت بَصِیْر کا مراقبہ تجویز کیا گیا ہے۔ جب آدمی تصور کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہے ہیں تو ضرور کأنك تراہ کے درجہ تک پہنچ جائے گا۔ اور دوسری حدیث میں جو اللہ کی نگہداشت کا حکم ہے اس کی صورت یہی ہے کہ اللہ پاک کا ان کی صفات کے ذریعہ مراقبہ کیا جائے پس ضرور کیفیتِ احسانی حاصل ہوگی، جس کی جملہ جزائیہ میں خبر دی گئی ہے۔

صفاتِ الٰہیہ کے ذریعہ مراقبہ کا طریقہ: جو شخص اللہ تعالیٰ کی صفات میں غور وفکر کرنے کی استطاعت رکھتا ہے، وہ ایسے وقت میں جبکہ تشویشات سے فارغ ہو۔ چھوٹے بڑے استنجاء کا تقاضا نہ ہو، بھوک پیاس اور غصہ نہ ہو اور نیند کا غلبہ بھی نہ ہو ایسے وقت میں علحدہ بیٹھ کر درج ذیل آیات واحادیث میں سے کوئی ایک یا زیادہ پڑھے، پھر اس کے معنی میں غور کرے، مگر اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے مشابہ یا کسی جہت میں تصور نہ کرے۔ صرف اللہ تعالیٰ کا ان صفات کے ساتھ متصف ہونا ذہن میں لائے۔ اور جب یہ تصور دھندلا پڑ جائے تو دوبارہ آیت یا حدیث پڑھے۔ اور ازسرِ نو سوچنا شروع کرے۔ وہ آیات واحادیث درج ذیل ہیں:

پہلی آیت: سورۃ الحدید آیت ۴ ہے: ’’اللہ تعالیٰ وہ ہیں جنھوں نے آسمانوں اورزمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہوئے۔ جانتے ہیں وہ چیز جو زمین میں داخل ہوتی ہے، اور جو اس سے نکلتی ہے، اور جو آسمان سے اترتی ہے، اور جو اس میں چڑھتی ہے، اور وہ تمہارے ساتھ ہیں جہاں بھی تم ہو، اور وہ تمہارے سب اعمال کو دیکھتے ہیں‘‘

دوسری آیت: سورۂ یونس آیت ۶۱ ہے: ’’اور آپ خواہ کسی حال میں ہوں اور آپ کہیں سے قرآن پڑھتے ہوں، اور تم جو کام بھی کرتے ہو، ہم کو سب کی خبر ہے، جبکہ تم اس کام کو کرنا شروع کرتے ہو۔ اور آپ کے پروردگار سے ذرّہ برابر کوئی چیز بھی غائب نہیں۔ نہ زمین میں اور نہ آسمان میں، اور نہ کوئی چھوٹی چیز اور نہ کوئی بڑی چیز مگر وہ کتابِ مبین میں ہے‘‘

تیسری آیت: سورۃ المجادلہ آیت ۷ ہے: ’’کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتے ہیں، جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کوئی سرگوشی تین آدمیوں کی ایسی نہیں ہوتی جس میں وہ چوتھے نہ ہوں۔ اور نہ پانچ کی مگر وہ ان میں چھٹے ہوتے ہیں۔ اور نہ اس سے کم اور نہ زیادہ مگر وہ ان کے ساتھ ہوتے ہیں، جہاں بھی وہ ہوتے ہیں‘‘

چوتھی آیت: سورہ قٓ آیت ۱۶ ہے: ’’اور ہم نے انسان کو پیدا کیا۔ اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں اور ہم اس سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں‘‘

پانچویں آیت: سورۃ الانعام آیت ۵۹ ہے: ’’اور اللہ ہی کے پاس مخفی خزانوں کی چابیاں ہیں۔ ان کو بجز اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ اور وہ ان تمام چیزوں کو جانتے ہیں جو خشکی اور تری میں ہیں۔ اور کوئی پتہ نہیں گرتا مگر وہ اس کو جانتے ہیں۔ اور نہ کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں اور نہ کوئی تر اور نہ کوئی خشک چیز ہے مگر وہ کتابِ مبین میں ہے‘‘

چھٹی آیت: سورہ حٰمٓ السجدہ کی آخری آیت ہے: ’’بیشک وہ ہر چیز کو (اپنے علم کے) احاطہ میں لئے ہوئے ہیں‘‘

ساتویں آیت: سورۃ الانعام آیت ۱۸ ہے: ’’اور وہی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر غالب و برتر ہیں‘‘

آٹھویں آیت: سورۃ المائدہ کی آخری آیت ہے ’’اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی، اور ان چیزوں کی جو ان میں ہیں، اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں‘‘

پہلی حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ کی نگہبانی کر، اللہ تیری نگہبانی کریں گے۔ اللہ کی نگہبانی کر اللہ کو تو اپنے سامنے پائے گا۔ اور جان لے کہ لوگوں کا گروہ اگر اکٹھا ہو جائے اس پر کہ تجھے فائدہ پہنچائے کسی چیز کے ذریعہ، تو نہیں فائدہ پہنچا سکتا ہے مگر اس چیز کے ذریعہ جو اللہ تعالیٰ نے تیرے نفع کے لئے مقدر کی ہے۔ اور اگر وہ اکٹھا ہو جائے اس پر کہ تجھے ضرر پہنچائے کسی چیز کے ذریعہ، تو نہیں ضرر پہنچا سکتا مگر اس چیز کے ذریعہ جو اللہ نے تیرے ضرر کے لئے مقدر کی ہے، قلم اٹھا لئے گئے ہیں اور صحیفے خشک ہو گئے ہیں‘‘، یعنی اب تحریر میں تبدیلی نہیں ہو سکتی (ترمذی ۲:۷۴)

دوسری حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’بیشک اللہ کے لئے سو رحمتیں ہیں، ان میں سے ایک رحمت جن وانس اور بہائم وحشرات کے درمیان اتاری ہے۔ پس اس کے ذریعہ بعض بعض پر مہربانی کرتے ہیں۔ اور اسی کی وجہ

سے ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں۔ اور اسی کی وجہ سے وحشی جانور اپنے بچے پر شفقت کرتا ہے۔ اور ننانوے رحمتیں اللہ نے باقی رکھی ہیں، ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں پر مہربانی کریں گے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۳۶۵)

سوم —— اللہ کے عظیم کارناموں میں غور کرنا —— اس مراقبہ کی بنیاد سورہ آل عمران کی آیات ۱۹۰و۱۹۱ ہیں۔ ارشاد ہے: ''بیشک آسمانوں اور زمین کے بنانے میں، اور شب وروز کے یکے بعد دیگرے آنے جانے میں، اُن اصحابِ بینش کے لئے نشانیاں ہیں جو کھڑے بھی، بیٹھے بھی اور لیٹے بھی اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں۔ اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں (کہتے ہیں:) خدایا! آپ نے یہ سب لایعنی پیدا نہیں کیا (بلکہ خاص مقصد کے لئے یہ کارخانہ بنایا ہے) آپ کی ذات پاک ہے (کہ فضول کام کرے) سو ہمیں عذابِ دوزخ سے بچایئے'' اس میں تخلیقِ کائنات کے مقصد کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اللہ کی بندگی کر کے جنت حاصل کرنا ہے۔

اور اس مراقبہ کا طریقہ: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عظیم انعامات واحسانات کو یاد کرے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے بارشیں برسائیں اور سبزہ اُگایا جن کے ساتھ ہماری اور تمام حیوانات کی زندگی وابستہ ہے۔ اور اس قسم کے دیگر انعامات واحسانات میں غور کرے، اور اس میں پوری طرح مستغرق ہو جائے۔ اس سے جذبہ تشکر ابھرے گا۔

چہارم —— پاداشِ اعمال کے واقعات میں غور کرنا —— یعنی یہ سوچے کہ اللہ تعالیٰ ایک قوم کو بلند کرتے ہیں اور دوسری قوم کو پست کرتے ہیں۔ جس کو چاہتے ہیں عزت سے نوازتے ہیں، اور جس کو چاہتے ہیں ذلیل وخوار کرتے ہیں۔ اس مراقبہ کی بنیاد سورہ ابراہیم کی آیت ۵ ہے۔ ارشاد ہے: ''ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا (اور حکم دیا کہ) اپنی قوم کو تاریکیوں سے روشنی میں لایئے، اور ان کو ''اللہ کے دنوں'' کے ذریعہ فہمائش کیجئے، بیشک ان میں ہر صابر وشاکر بندے کے لئے عبرتیں ہیں'' —— پاداشِ عمل کے واقعات میں غور وفکر کرنے سے نفس دنیا سے اکھڑتا ہے۔ آدمی اپنے اعمال کی فکر کرتا ہے، تاکہ وہ انجام بد سے دوچار نہ ہو۔

پنجم —— موت اور اس کے بعد کے احوال میں غور کرنا —— اس مراقبہ کی بنیاد یہ حدیث ہے: ''مزوں کو توڑنے والی موت کو بکثرت یاد کیا کرو'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۶۰۷) اور مراقبۂ موت کا طریقہ یہ ہے کہ یہ سوچے کہ ایک دن مرنا ہے اور اس دنیا کو چھوڑنا ہے۔ موت کے بعد صرف اچھے برے اعمال ہی ساتھ رہ جائیں گے، پھر انجام یا جنت ہوگا یا جہنم!

مفید غور وفکر: آخری دو مراقبے زیادہ مفید ہیں یعنی پاداشِ عمل کے واقعات میں اور موت اور اس کے بعد کے احوال میں غور کرنا نفس کی اصلاح کے لئے زیادہ مفید ہے۔ یہ باتیں سوچنے سے نفس دنیا کے نقوش قبول کرنے سے احتراز کرتا ہے۔ دنیا دل سے نہیں چپکتی۔ کیونکہ جب انسان مشاغلِ معاش سے منقطع ہو کر، اور ڈوب کر یہ باتیں سوچتا ہے، اور ان باتوں کو نگاہوں کے سامنے لاتا ہے تو بہیمیت مغلوب اور ملکیت غالب آتی ہے۔

﴿بقية مباحث الإحسان﴾

اعلم : أن لهذه الأخلاق الأربعة أسبابا: تُكتَسَبُ بها، وموانعَ: تَمْنَعُ عنها، وعلاماتٍ: يُعرف تحقُّقُها بها:

فالإخبات لله تعالى : والاستشراف تلقاء صَقْع الكبرياء، والانصباغُ بصبغ الملأ الأعلى، والتجردُ عن الرذائل البشرية، وعدمُ قبولِ النفس نقوشَ الحياةِ الدينا، وعدمُ اطمئنانها بها: لاشيئَ فى ذلك كلِّه كالتفكر، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" فكرُ ساعةٍ خير من عبادة ستين سنة"

وهو على أنواع:

منها :التفكر فى ذات الله تعالى : وقد نهى الأنبياءُ ــــ صلوات الله عليهم ــــ عنه، فإن العامةَ لايطيقونه، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" تفكروا فى آلاء الله، ولاتفكروا فى الله" ويُروى:" تفكروا فى كل شيئ، ولا تفكروا فى ذات الله"

ومنها : التفكر فى صفات الله تعالى : كالعلم، والقدرة، والرحمة، والإحاطة؛ وهو المعبَّرُ عنه عند أهل السلوك بالمراقبة، والأصلُ فيه قوله صلى الله عليه وسلم:" الإحسان: أن تعبد الله كأنك تراه، فإن لم تكن تراه فإنه يراك" وقوله صلى الله عليه وسلم:" احْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجاهَكَ"

وصفته لمن أطاق ذلك: أن يقرأ:﴿ وهو معكم أينما كنتم﴾ أو قوله تعالى:﴿ وماتكون فى شأن، وما تتلوا منه من قرآن، ولاتعملون من عمل، إلا كنا عليكم شهودا إذ تفيضون فيه؛ ومايعزب عن ربك من مثقال ذرة فى الأرض ولا فى السماء، ولا أصغر من ذلك ولا أكبر إلا فى كتاب مبين﴾ أو قوله تعالى:﴿ ألم ترأن الله يعلم ما فى السماوات ومافى الأرض، مايكون من نجوى ثلاثة إلا هو رابعهم، ولا خمسة إلا هو سادسهم، ولا أدنى من ذلك ولا أكثر إلا هو معهم أينما كانوا﴾ أو قوله تعالى:﴿ ونحن أقرب إليه من حبل الوريد﴾ أو قوله تعالى:﴿ وعنده مفاتح الغيب، لايعلمها إلا هو، ويعلم ما فى البر والبحر، وما تسقط من ورقة إلا يعلمها، ولا حبة فى ظلمات الأرض ولارطب ولايابس إلا فى كتاب مبين﴾ أو قوله تعالى:﴿إنه بكل شيئ محيط﴾ أو قوله تعالى﴿ وهو القاهر فوق عباده﴾ أو قوله تعالى:﴿ وهو على كل شيئ قدير﴾ أو قوله صلى الله عليه وسلم:" اعلم أن الأمة لو اجتمعت على أن ينفعوك بشيئ لم ينفعوك بشيئ إلا قد كتبه الله لك، ولو اجتمعوا على أن يضروك بشيئ لم يضروك إلا بشيئ قد كتبه

الله عليك؛ رُفعت الأقلام، وجفَّت الصحف" أو قوله صلى الله عليه وسلم:" إن لله مائةَ رحمة أنزل منها واحدة في الأرض" الحديثَ؛ ثم يتصوَّر معنى هذه الآيات من غير تشبيهٍ ولاجهةٍ، بل يستحضر اتصافَه تعالى بتلك الأوصاف فقط، فإذا ضَعُفَ عن تصوُّرها أعاد الآية، وتصوَّرها أيضًا. ولْيَخْتَرْ لذلك وقتًا: لايكون فيه حاقبًا، ولا حاقنًا، ولاجائعًا، ولاغضبانَ، ولا وَسْنان، وبالجملة: فارغَ القلب عن التشويش.

ومنها: التفكر في أفعال الله تعالى الباهرة: والأصل فيه قوله تعالى:﴿ الذين يتفكرون في خلق السماوات والأرض، ربنا ما خلقت هذا باطلا﴾ وصفته: أن يلاحظ إنزالَ المطر، وإنبات العشب، ونحو ذلك، ويستغرق في منة الله تعالى.

ومنها: التفكر في أيام الله تعالى: وهو تذكر رفعه قومًا، وخفضه آخرين، والأصل فيه قوله تعالىٰ لموسى عليه السلام:﴿وذكرهم بأيام الله﴾ فإن ذلك يجعل النفسَ مجردةً عن الدنيا.

ومنها: التفكر في الموت ومابعدَه: والأصل فيه قوله صلى الله عليه وسلم:" اذكروا هاذمَ اللذات" وصفته: أن يتصوَّر انقطاعَ النفس عن الدنيا، وانفرادَها بما اكتسبت من خير وشر، وما يَرِدُ عليها من المجازاة.

وهذان القسمان أفيدُ الأشياء لعدم قبول النفس نقوش الدنيا، فالإنسان إذا تفرغ من أشغال الدنيا للفكر المُمْعِنِ في هذه الأشياء، وأحضرها بين عينيه: انقهرت بهيميته، وغلبت ملكيته.

ترجمہ: مباحثِ احسان کی باقی باتیں: جان لیں کہ اِن اخلاقِ اربعہ کے لئے کچھ اسباب ہیں جن کے ذریعہ وہ حاصل کئے جاتے ہیں۔ اور کچھ موانع ہیں جو ان سے باز رکھتے ہیں۔ اور کچھ علامتیں ہیں جن کے ذریعہ ان کا پایا جانا: جانا جاتا ہے ـــــ پس اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نیازمندی، اور گوشۂ عظمت کی طرف بغور دیکھنا، اور ملأ اعلیٰ کے رنگ میں رنگین ہونا، اور بشری کمزوریوں سے خالی ہونا، اور نفس کا دنیوی زندگی کے نقوش کو قبول نہ کرنا، اور نفس کا دنیوی زندگی پر مطمئن نہ ہونا: ان تمام باتوں میں "غوروفکر" سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: "ایک گھڑی کی سوچ ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے" ـــــ اور وہ یعنی غوروفکر چند قسموں پر ہے ـــــ از انجملہ: اللہ کی ذات میں غوروفکر کرنا ہے۔ اور بالتحقیق انبیاء ـــــ اللہ کی ان پر خصوصی رحمتیں ہوں ـــــ نے اس سے روکا ہے۔ پس بیشک عوام اس کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: "اللہ کی نعمتوں میں غور کرو، اور اللہ میں غور مت کرو" اور روایت کیا گیا: "ہر چیز میں غور کرو، اور اللہ میں غور مت کرو" ـــــ اور از انجملہ: اللہ تعالیٰ کی صفات میں غوروفکر کرنا ہے۔ جیسے علم، قدرت، رحمت اور احاطہ۔ اور یہی غوروفکر اہل سلوک کے نزدیک "مراقبہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور بنیاد اس میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: (

اس کے بعد دو حدیثیں ہیں) اور اس کا طریقہ: اس شخص کے لئے جو اس کی طاقت رکھتا ہے یہ ہے کہ پڑھے: (اس کے بعد آٹھ آیتیں اور دو حدیثیں ہیں، جن کا ترجمہ گذر چکا) پھر سوچے ان آیات کے معانی میں، تشبیہ اور جہت کے بغیر، بلکہ ذہن میں لائے صرف اللہ تعالیٰ کا ان صفات کے ساتھ متصف ہونا۔ پس جب کمزور پڑ جائے ان کے سوچنے سے تو آیت دوبارہ پڑھے، اور پھر اس کو سوچے۔ اور چاہئے کہ اس کے لئے ایسا وقت ہو کہ نہ ہو وہ اس میں بڑا استنجاء روکنے والا، اور نہ چھوٹا استنجاء روکنے والا، اور نہ بھوکا اور نہ غضبناک اور نہ اونگھنے والا، اور خلاصہ: تشویش سے فارغ القلب ہو۔

اور از انجملہ: اللہ تعالیٰ کے افعالِ عظیمہ میں غور وفکر کرنا ہے۔ اور بنیاد اس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:............اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ بارش برسانا اور سبزہ اگانا اور اس کے مانند انعامات کو پیش نظر لائے اور اللہ تعالیٰ کے احسانات میں مستغرق ہو جائے ــــــ اور از انجملہ: پاداشِ عمل کے واقعات میں غور کرنا ہے۔ اور وہ سوچنا اللہ تعالیٰ کے ایک قوم کو بلند کرنے اور دوسری قوم کو پست کرنے کو یاد کرنا ہے۔ اور بنیاد اس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے موسیٰ علیہ السلام سے کہ: ''ان کو اللہ کے دنوں سے فہمائش کیجئے'' پس بیشک یہ چیز نفس کو دنیا سے خالی کر دیتی ہے ــــــ اور از انجملہ: موت میں اور اس کے بعد کے حالات میں غور وفکر کرنا ہے۔ اور اصل اس میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''لذتوں کو توڑنے والی چیز کو یاد کرو'' اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ سوچے نفس کا دنیا سے منقطع ہونا، اور نفس کا تنہا ہونا اس خیر وشر کے ساتھ جو اس نے کمائی ہے۔ اور اس کا تنہا ہونا اس مجازات کے لئے جو اس نفس پر وارد ہوگی۔

اور یہ دو قسمیں تمام اقسام میں مفید تر ہیں نفس کے دنیا کے نقوش کو قبول نہ کرنے کے لئے۔ پس جب انسان دنیا کی مشغولیات سے ان چیزوں میں گہری سوچ کے لئے فارغ ہو جاتا ہے، اور وہ ان تصورات کو اپنی آنکھوں کے سامنے لے آتا ہے تو اس کی بہیمیت مغلوب اور اس کی ملکیت غالب ہو جاتی ہے۔

☆ ☆ ☆

قرآن کریم اور بعض احادیث

تفکر وتدبر کی تمام انواع کے لئے جامع ہیں

مراقبات کی مذکورہ بالا انواع عوام کے لئے ممکن الحصول نہیں۔ عامۃ الناس کے لئے یہ بات آسان نہیں کہ دنیوی علائق سے یکسر کنارہ کش ہو کر مراقبہ میں مستغرق ہو جائیں اور مذکورہ امور نگاہوں کے سامنے لے آئیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان تصورات کے لئے ایسے پیکر ہائے محسوس تجویز کئے جائیں جن میں غور وفکر کی مذکورہ پانچوں انواع مرتب شکل میں موجود ہوں۔ اور ان کے لئے ایسے ہیاکل اور ایسے مجسمے تجویز کئے جائیں جن میں ان انواع کی روح پھونک دی جائے، تاکہ عام لوگ ان کا قصد کریں۔ اور وہ باتیں ان کو پڑھ کر سنائی جائیں تاکہ وہ بقدر نصیب ان سے فائدہ اٹھائیں۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ کو قرآن کریم عطا فرمایا گیا، جو مذکورہ انواع کے لئے نسخۂ جامعہ ہے۔ نیز قرآن کریم کے ساتھ ''اس کے مانند'' اور بھی مضامین دیئے گئے، جو احادیث میں مروی ہیں اور وہ مراقبات کے لئے مفید ہیں۔ شاہ صاحب قدس سرہ کی رائے میں ان دونوں میں یعنی قرآن کریم میں اور احادیث کے اس مخصوص حصہ میں آپ ﷺ کو غور وفکر سے تعلق رکھنے والی وہ تمام چیزیں عطا فرمائی گئی ہیں، جو اگلی امتوں کو مختلف زمانوں میں دی گئی تھیں۔ واللہ اعلم

اور چونکہ قرآن کریم میں یہ تمام باتیں جمع ہیں اس لئے حکمتِ الٰہی نے چاہا کہ:

① —— قرآن کریم کی تلاوت کی ترغیب دی جائے۔ تلاوت کے فضائل بیان کئے جائیں اور بعض مخصوص سورتوں اور آیتوں کے فضائل بیان کئے جائیں۔ چنانچہ:

(الف) ایک روایت میں قرآن کریم کی آیتوں کے پڑھنے اور سیکھنے کو موٹی تازی اونچی کوہان والی اونٹنیوں سے بہتر قرار دیا گیا (مشکوۃ حدیث ۲۱۱۰) اور دوسری حدیث میں نماز میں تین آیتیں پڑھنے کو جاندار گابھن اونٹنیوں سے بہتر قرار دیا (مشکوۃ حدیث ۲۱۱۱) یہ روایات تمثیلی پیرایۂ بیان ہیں۔ آیات کریمہ کی تلاوت سے حاصل ہونے والے معنوی فائدہ (اجر وثواب) کو ایک ایسی محسوس مثال کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے جس سے بہتر کوئی مال عربوں کے نزدیک نہیں تھا۔

(ب) اور جس نے قرآن میں مہارت پیدا کرلی: اس کو ملائکہ کے ساتھ تشبیہ دی (مشکوۃ حدیث ۲۱۱۲)

(ج) اور بتایا کہ جس نے قرآن پڑھا اس کو ہر حرف کے بدلے ایک نیکی ملے گی۔ پھر وہ ایک نیکی بھی دس نیکیوں کے برابر ہوگی (مشکوۃ حدیث ۲۱۳۷)

(د) اور تلاوتِ قرآن کے تعلق سے لوگوں کے درجات بیان کئے کہ جو مسلمان قرآن پڑھتا ہے، وہ تُرنج لیموں کی طرح ہے جس کی بو اور مزہ دونوں عمدہ ہوتے ہیں۔ اور جو مسلمان قرآن نہیں پڑھتا وہ کھجور کی طرح ہے کہ اس میں بو تو نہیں مگر مزہ ہوتا ہے۔ اور جو منافق قرآن نہیں پڑھتا وہ اندرائن جیسا ہے۔ اس میں خوش بو بھی نہیں اور مزہ بھی تلخ ہے۔ اور جو منافق قرآن پڑھتا ہے وہ خوشبودار پھول کی طرح ہے، جس کی بو اچھی ہے، مگر اس کا مزہ تلخ ہے (مشکوۃ حدیث ۲۱۱۴)

(ھ) اور یہ بات بتائی کہ قرآن کی سورتیں قیامت کے دن پیکر محسوس اختیار کریں گی، جن کو دیکھا چھویا جاسکے گا، وہ اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے جھگڑا کریں گی (مشکوۃ حدیث ۲۱۲۰ و ۲۱۲۱) اور اس جھگڑے کی حقیقت یہ ہے کہ قاری کی نجات وعذاب کے اسباب میں تعارض سامنے آئے گا۔ اس کے گناہ اس کی بربادی کو چاہیں گے، اور اس کی تلاوت نجات کو۔ اور بالآخر سبب نجات یعنی تلاوتِ قرآن کو دیگر اسباب ہلاکت پر ترجیح حاصل ہوگی، اور وہ بندہ ناجی ہوگا۔

(و) اور احادیث میں خاص سورتوں اور آیتوں کی فضیلت بیان کی۔ جیسے سورۂ کہف، سورۃ الملک، سورۃ الفاتحہ، سورۃ البقرہ اور سورۂ آل عمران وغیرہ کے فضائل۔ اور آیت الکرسی، سورۃ الاخلاص، مؤذتین وغیرہ کا امتیاز بیان کیا گیا تا کہ لوگ ان کو وظیفہ بنائیں۔

اور یہ تفاضل بچند وجوہ ہے:

اول: وہ سورت یا آیت: صفاتِ الٰہیہ میں غور وفکر کے لئے زیادہ مفید ہے۔ اور اس میں صفاتِ الٰہیہ کے تعلق سے جامعیت اور ہمہ گیری کی صفت پائی جاتی ہے۔ جیسے آیت الکرسی، سورۂ حشر کی آخری تین آیتیں اور سورۃ الاخلاص وغیرہ۔ ان آیتوں کا درجہ قرآن کریم میں ایسا ہے جیسا اسماءِ الٰہیہ میں ''اسم اعظم'' کا درجہ۔

دوم: وہ سورت ایسی ہے کہ اس کا نزول بندوں کے ورد (وظیفہ) کے لئے ہوا ہے۔ تاکہ لوگ جانیں کہ وہ اپنے پروردگار کا تقرب کیسے حاصل کریں؟ جیسے سورۂ فاتحہ۔ سورۂ فاتحہ کا درجہ قرآن کی دوسری سورتوں کے مقابلہ میں ایسا ہے جیسا عبادات میں فرائض کا درجہ۔

سوم: وہ سورتیں جامع ترین سورتیں ہیں۔ جیسے زَہراوَین یعنی سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران (سورۂ بقرہ میں اسلام کے اصول وعقائد اور احکام شریعت کا جتنا تفصیلی تذکرہ ہے اتنا کسی دوسری سورت میں نہیں ہے۔ اسی لئے اس سورت کو قرآن میں سب سے مقدم رکھا گیا ہے، اور اس کو ''قرآن کی کوہان'' قرار دیا گیا ہے۔ اور حدیث میں خبر دی گئی ہے کہ جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جاتی ہے، اس گھر میں شیطان نہیں آسکتا۔ اور سورۂ آلِ عمران میں مجادلات اور جنگی معاملات کی جتنی تفصیل ہے، اتنی کسی دوسری سورت میں نہیں ہے)

(ز) رسول اللہ ﷺ نے یٰسٓ شریف کے متعلق فرمایا کہ: ''وہ قرآن کا دل ہے!'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۱۴۷)

اور یٰسٓ کو قرآن کا دل تین وجہ سے فرمایا ہے:

پہلی وجہ: دل سے اشارہ ''درمیان'' کی طرف ہوتا ہے۔ اور یٰسٓ مثانی میں سے ہے، جو مئین اور سبع طُول سے چھوٹی اور مفصلات سے بڑی ہیں[1]

دوسری وجہ: دل سے اشارہ جسم کے اہم جزء کی طرف بھی ہوتا ہے۔ اور اس سورت میں شہر اَنطاکیہ کے ایک بزرگ حبیب نجار رحمہ اللہ کی جو تقریر بیان ہوئی ہے: اس میں توکل، تفویض اور توحید کی تعلیم ہے۔ یہ مضامین آیت ۲۲-۲۵ میں آئے ہیں۔ ان اہم مضامین کی وجہ سے اس کو قرآن کا دل قرار دیا ہے۔

تیسری وجہ: دل پر حیات کا مدار ہے، وہی مایۂ زندگانی ہے۔ اور اس سورت میں تفکر وتدبر (مراقبوں) کی پانچوں انواع کامل ومکمل صورت میں موجود ہیں۔ اس لئے اس کو قرآن کا قلب کہا ہے۔

(ح) رسول اللہ ﷺ نے سورۃ الملک کے متعلق فرمایا ہے کہ ایک سورت نے جو صرف تیس آیتوں کی ہے: ایک شخص

---

[1] قرآن پاک کی سورتیں آیات کی تعداد وغیرہ کے اعتبار سے چار حصوں میں منقسم ہیں: (۱) طُول: لمبی سورتیں (۲) مئین: جن میں سو یا کچھ زیادہ یا کچھ کم آیتیں ہیں (۳) مثانی: جن میں سو سے کافی کم آیتیں ہیں (۴) مفصّل: جن میں بہت کم آیات ہیں۔ پھر ان کی تحدید وترتیب میں اختلاف ہے۔ یٰسٓ شریف میں ۸۳ آیتیں ہیں اور اس کا شمار مثانی میں ہے ۱۲

کی سفارش کی یہاں تک کہ وہ بخش دیا گیا (مشکوۃ حدیث ۲۱۵۳) یہ کسی امتی کا واقعہ ہے جس کو نبی ﷺ نے اپنے مکاشفہ میں دیکھا ہے۔

فائدہ: یہ امتی کوئی ایسے صحابی بھی ہوسکتے ہیں جن کی آپؐ کے سامنے وفات ہوگئی ہو۔ اور بعد میں موجود ہونے والا امتی بھی ہوسکتا ہے، کیونکہ کشف میں آئندہ پیش آنے والے واقعات بھی نظر آتے ہیں۔

نوٹ: سورۂ سجدہ میں بھی تیس آیتیں ہیں، مگر وہ اس حدیث میں مراد نہیں۔

(۲) —— اور حکمتِ الٰہیہ اس کی بھی مقتضی ہوئی کہ:

(الف) قرآن کریم کی دیکھ بھال کرنے کی اور اس کو یاد رکھنے کی ترغیب دی جائے۔ اور لوگوں کو بتایا جائے کہ جتنی جلدی اونٹ اپنی رسّی سے نکل بھاگتا ہے اس سے بھی جلدی قرآن سینہ سے نکل جاتا ہے۔

(ب) اور قرآن کریم کو ترتیل سے یعنی ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کی ترغیب دی جائے۔ سورۃ المزمل آیت ۴ میں حکم دیا گیا ہے: ﴿وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا﴾ یعنی قرآن کو خوب صاف صاف پڑھو (ایک ایک حرف الگ الگ کرکے پڑھو) اس میں قرآن کریم کی تعظیم بھی ہے اور تفکر و تدبر کا مقصد بھی حاصل ہوتا ہے۔

(ج) اور ایسے وقت میں تلاوت کرنے کی ترغیب دی جائے جب دل قرآن کی طرف مائل ہو، جمعیّتِ خاطر حاصل ہو اور نشاط خوب ہو، تاکہ قرآن میں خوب غور کیا جاسکے (مشکوۃ حدیث ۲۱۹۰)

(د) قرآن کریم کو اچھی آواز سے پڑھنے کی بھی ترغیب دی جائے ارشاد فرمایا: زَيِّنوا القرآن بأصواتكم: قرآن کو اپنی آوازوں سے مزین کرو یعنی ترتیل و تجوید کے ساتھ عربی لہجہ میں پڑھو (مشکوۃ حدیث ۲۱۹۹) دوسری حدیث میں فرمایا کہ: ''قرآن کو اپنی آوازوں سے خوبصورت بناؤ، کیونکہ اچھی آواز سے قرآن کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۲۲۰۸)

(ھ) اس کی بھی ترغیب دی جائے کہ قرآن کریم روتے ہوئے پڑھا جائے یا رونے کی صورت بنائی جائے تاکہ مراد بر آئے اور مراد غور و فکر کرنا ہے (ابن ماجہ حدیث ۱۳۳۷)

(و) قرآن کریم کے بھولنے کو حرام قرار دیا جائے اور اس پر وعید سنائی جائے۔ فرمایا: ''جو بھی شخص قرآن پڑھے، پھر اس کو بھول جائے تو وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے کٹے ہوئے ہاتھ کے ساتھ ملاقات کرے گا'' (مشکوۃ حدیث ۲۲۰۰)

(ز) رسول اللہ ﷺ نے تین دن سے کم میں قرآن ختم کرنے کی ممانعت فرمائی (مشکوۃ حدیث ۲۲۰۱) کیونکہ اس سے جلدی ختم کرنے والا معنی نہیں سمجھتا۔

(ح) عربوں کے مختلف لہجوں میں قرآن پڑھنے کی اجازت دی جائے۔ کیونکہ قرآن پڑھنے والے ناخواندہ، بوڑھے اور بچے سبھی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اس لئے اس سلسلہ میں سہولت پیدا کرنی ضروری ہے۔

وہ احادیث شریفہ جو مراقبات میں مفید ہیں: اللہ عزوجل کی جانب سے قرآن حکیم کے علاوہ آنحضرت ﷺ

کو جو مضامین عطا فرمائے گئے ہیں، اور جو مراقبات میں مفید ہیں، وہ درج ذیل قسم کی روایات ہیں:

حدیث (۱) ——— حدیث قُدسی ہے: اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں: ''میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کر دیا ہے، اور اس کو تمہارے درمیان بھی حرام ٹھہرایا ہے، پس ایک دوسرے پر ظلم مت کرو۔ میرے بندو! تم سب گمراہ ہو مگر جسے میں راہ دکھاؤں، پس مجھ سے ہدایت طلب کرو، میں تمہیں راہ دکھاؤنگا۔ میرے بندو! تم سب بھوکے ہو مگر جسے میں کھلاؤں۔ پس مجھ سے کھانا طلب کرو، میں تمہیں کھلاؤنگا۔ میرے بندو! تم سب ننگے ہو مگر جسے میں پہناؤں، پس مجھ سے پوشاک مانگو، میں تمہیں پہناؤنگا۔ میرے بندو! تم شب و روز خطائیں کرتے ہو، اور میں سب گناہوں کو بخشتا ہوں، پس مجھ سے بخشش طلب کرو، میں تم کو معاف کرونگا۔ میرے بندو! تم ہرگز مجھے کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ اور نہ کوئی نفع پہنچا سکتے ہو۔ میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے اور جنّ وانس سب نہایت درجہ پرہیزگار بن جائیں تو میرے ملک میں کچھ اضافہ نہ ہوگا۔ میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے اور جن وانس سب ایک مقام میں کھڑے ہوکر مجھ سے مانگنے لگیں اور میں سب کو عطا کروں تو اس سے میرے خزانوں میں کچھ کمی نہیں ہوگی۔ مگر جتنا سوئی گھٹاتی ہے جب وہ سمندر میں ڈوبائی جاتی ہے۔ میرے بندو! وہ تمہارے کام ہی ہیں جن کو میں تمہارے لئے ریکارڈ کر رہا ہوں، پھر وہ تمہیں پورے پورے چکاؤنگا۔ پس جو جزائے خیر پائے، وہ اللہ کی تعریف کرے اور جو اس کے سوا پائے، وہ ہرگز ملامت نہ کرے مگر اپنی ذات کو'' (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث ۲۳۲۶ باب الاستغفار، کتاب الدعوات)

حدیث (۲) ——— رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا کہ گذشتہ امتوں میں ایک آدمی تھا، جس نے ننانوے قتل کئے تھے (پھر اسے آخرت کی فکر ہوئی) تو اس نے لوگوں سے دریافت کیا: اس علاقہ میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ وہ ایک درویش کی نشاندہی کیا گیا۔ پس وہ اس کے پاس پہنچا، اور عرض کیا کہ اس نے ننانوے خون کئے ہیں، تو کیا ایسے شخص کے لئے توبہ کی کوئی صورت ہے؟ بزرگ نے جواب دیا: نہیں! اس نے اس بزرگ کو بھی قتل کر دیا۔ اب سو کی گنتی پوری ہوگئی (مگر پھر اس کے دل میں فکر پیدا ہوئی) اور اس نے لوگوں سے دریافت کیا: اس علاقہ میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ وہ ایک عالم کی راہ نمائی کیا گیا۔ وہ ان کے پاس پہنچا۔ اور عرض کیا کہ اس نے سو خون کئے ہیں، تو کیا ایسے شخص کے لئے توبہ کی کوئی صورت ہے؟ عالم نے جواب دیا: ہاں! کون ہے جو اس کے اور توبہ کے درمیان حائل ہو؟! تو فلاں بستی میں چلا جا۔ وہاں اللہ کے کچھ عبادت گذار بندے رہتے ہیں، تو بھی ان کے ساتھ عبادت میں لگ جا۔ اپنی بستی میں واپس نہ جا، وہ بڑی خراب بستی ہے۔ چنانچہ وہ نیک لوگوں کی بستی کی طرف چل پڑا۔ جب آدھا راستہ طے کر لیا تو موت کا وقت آ گیا۔ پس اس کے بارے میں رحمت کے فرشتوں اور عذاب کے فرشتوں میں نزاع ہوا۔ رحمت کے فرشتوں نے کہا: یہ توبہ کر کے آیا ہے، اور اس نے سچے دل سے اپنا چہرہ اللہ کی طرف پھیر لیا ہے (اس لئے یہ رحمت کا مستحق ہے اور اس کی روح ہم قبض کریں گے) اور عذاب کے فرشتوں نے کہا: اس نے کبھی بھی کوئی نیک عمل نہیں کیا (اس لئے یہ عذاب کا مستحق ہے، اور

اس کی روح ہم قبض کریں گے) اس وقت ایک فرشتہ آدمی کی شکل میں آیا۔ فرشتوں کی دونوں جماعتوں نے اس کو فیصلہ سونپا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ دونوں بستیوں تک پیمائش کرلی جائے۔ جس بستی سے وہ قریب ہو اس کو اُس بستی کا مان لیا جائے۔ چنانچہ پیمائش کی گئی۔ وہ اس بستی سے (ایک بالشت) قریب پایا گیا جس کے ارادہ سے وہ چلا تھا۔ چنانچہ رحمت کے فرشتوں نے اس کی روح قبض کی (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۲۳۲۷)

حدیث (۳) —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یقیناً اللہ تعالیٰ مؤمن بندے کی توبہ سے اُس مسافر سے بھی زیادہ خوش ہوتے ہیں جو (اثنائے سفر) کسی غیر آباد اور سنسان زمین میں اتر گیا ہو، جو سامانِ حیات سے خالی اور اسباب ہلاکت سے بھری ہوئی ہو۔ اور اس کے ساتھ اس کی سواری کی اونٹنی ہو اور اسی پر اس کے کھانے پینے کا سامان ہو۔ پس وہ سر رکھ کر لیٹ گیا اور اسے نیند آگئی۔ جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اونٹنی غائب ہے۔ وہ اس کی تلاش میں سرگرداں پھرا، یہاں تک کہ گرمی اور پیاس کی شدت سے اس کی جان پر بن آئی۔ اس نے سوچا کہ اسی جگہ جا کر پڑ جاؤں اور وہیں جان جاں آفریں کے سپرد کردوں۔ چنانچہ وہ لوٹ کر اپنے بازو پر سر رکھ کر مرنے کے لئے لیٹ گیا۔ (اور نیند آگئی) پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ اونٹنی مع ساز و سامان کے اس کے پاس کھڑی ہے۔ پس جتنا یہ مسافر اپنی کھوئی ہوئی اونٹنی کے ملنے سے خوش ہوتا ہے، مؤمن بندے کے توبہ سے اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ خوش ہوتے ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۲۳۵۸)

حدیث (۴) —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے کسی بندے نے کوئی گناہ کیا۔ پھر اس نے اللہ سے عرض کیا: میرے پروردگار! مجھ سے گناہ ہوگیا، مجھے معاف فرما! تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ''کیا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی پروردگار ہے، جو گناہوں پر پکڑتا بھی ہے اور معاف بھی کرتا ہے؟! میں نے اپنے بندے کا گناہ بخش دیا اور اس کو معاف کردیا'' —— پھر جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا بندہ گناہ سے رکا رہا، پھر وہ کوئی اور گناہ کر بیٹھا۔ پھر اس نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: میرے پروردگار! مجھ سے گناہ ہوگیا، آپ میرا گناہ معاف فرمادیں۔ تو اللہ تعالیٰ پھر فرماتے ہیں: ''کیا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی پروردگار ہے جو قصور معاف بھی کرتا ہے اور اس پر پکڑ بھی کرتا ہے؟! میں نے اپنے بندے کا گناہ معاف کردیا'' —— پھر جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ بندہ گناہ سے رکا رہا، مگر پھر کوئی گناہ کر بیٹھا، تو پھر اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: میرے پروردگار! مجھ سے اور گناہ ہوگیا، آپ اس کو بھی معاف فرمادیں۔ تو اللہ تعالیٰ پھر ارشاد فرماتے ہیں: ''کیا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی پروردگار ہے جو گناہ پر پکڑتا بھی ہے اور معاف بھی کرتا ہے؟! میں نے اپنے بندے کو بخش دیا، اب جو اس کا جی چاہے کرے'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۲۳۳۳)

حدیث (۵) —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بیشک اللہ کے لئے سو رحمتیں ہیں۔ ان میں سے ایک رحمت جنّ وانس اور بہائم و حشرات کے درمیان نازل کی ہے۔ اسی کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر مہربانی کرتے ہیں۔ اور اسی کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں۔ اور اسی کی وجہ سے وحشی جانور اپنے بچہ پر شفقت کرتا ہے۔ اور اللہ نے ننانوے

رحمتیں محفوظ رکھی ہیں، جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں پر مہربانی کریں گے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۳۶۵)

حدیث (۶) —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی بندہ اسلام لے آتا ہے، پھر اس کا اسلام عمدہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی ہر اس برائی کو مٹادیتے ہیں جو اس نے آگے بھیجی ہے۔ پھر اس کے بعد بدلہ ہوتا ہے یعنی اب جو عمل کرتا ہے اس پر بدلہ ملتا ہے: ایک نیکی دس گنا سے سات سو گنا تک لکھی جاتی ہے، بلکہ سات سو سے بھی زیادہ۔ اور برائی اس کے مانند لکھی جاتی ہے یعنی جتنی کرتا ہے اتنی ہی لکھی جاتی ہے الا یہ کہ اس سے بھی اللہ تعالیٰ درگذر فرمادیں'' (رواہ البخاری، مشکوٰۃ حدیث ۲۳۷۳)

حدیث (۷) —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آخرت کے سامنے دنیا کا حال بس ایسا ہے جیسے کوئی سمندر میں انگلی ڈبوئے، پھر دیکھے وہ اپنے ساتھ کتنا پانی لائی ہے! (ترمذی ۲:۵۶)

حدیث (۸) —— رسول اللہ ﷺ ایک مردہ، چھوٹے کان والے بکری کے بچے پر گذرے۔ آپؐ نے اس کا کان پکڑا اور ساتھیوں سے فرمایا: ''اس کو ایک درہم میں کون لینا پسند کرتا ہے؟'' صحابہ نے جواب دیا: اسے تو کوئی مفت لینا بھی پسند نہیں کرے گا۔ آپؐ نے فرمایا: ''دنیا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ بے قدر ہے!'' (مسلم شریف ۱۸: ۹۳ کتاب الزہد)

ان روایات میں غور وفکر کیا جائے تو بھی فروتنی وانکساری اور عاجزی ونیازمندی پیدا ہوگی۔ دل اللہ تعالیٰ کی طرف جھکے گا۔ نفس ٹوٹے گا۔ اور دنیا سے دل اکھڑے گا۔ اور آخرت کی تیاری کرنے کی فکر پیدا ہوگی۔

ولـما لم يكن سهلاً على العامَّة أن يتفرَّغوا للفكر الممعن، وإحضارِها بين أَعْيُنِهم: وجب أن يُجعل أشباحٌ: يُعَبّى فيها أنواعُ الفكر، وهيا كلُ: يُنفخ فيها روحُها، ليقصُدها العامَّةُ،ويتلى عليهم، ويستفيدوا حسبما قُدِّرَ لهم.

وقد أوتى النبيُّ صلى الله عليه وسلم القرآن جامعًا لهذه الأنواع، ومثلَه معه؛ وأُرى أنه جُمع له صلى الله عليه وسلم فى هذين جميعُ ماكان فى الأمم السابقة، والله أعلم.

فاقتضت الحكمة:

[۱] أن يرغَّب فى تلاوة القرآن، ويُبيَّنَ فضلُها، وفضلُ سورو آياتٍ منه:

[الف] فشبَّه النبيُّ صلى الله عليه وسلم الفائدةَ المعنويةَ الحاصلةَ من الآية، بفائدة محسوسة لاأنفع منها عند العرب، وهى: ناقةٌ كَوْمَاءُ أو خَلِفَةٌ سَمِيْنَةٌ، تصويرًا للمعنى، وتمثيلا له.

[ب] وشَبَّهَ صاحبها بالملائكة.

[ج] وأخبر بأجرها بكل حرف.

[د] وبَيَّن درجاتِ الناس بما ضرب من مَثَلِ الأُتْرُجَّةِ، والتمرة، والحنظلة، والرَّيْحانة.

[هـ] وبين أن سور القرآن تتمثَّلُ يومَ القيامة أجسادًا: تُرى وتُلمس، فتحاجُّ عن أصحابها.

وذلك: انكشاف لتعارض أسبابِ عذابِه ونجاتِه، ورجحانِ تلاوةِ القرآن على الأسباب الأخرى.

[و] وبين أن السور فيما بينهما تتفاضل.

أقول: وإنما تتفاضل لمعانٍ:

منها: إفادتُها التفكرَ في صفات الله، وكونُها أجمعَ شيئ فيه، كآية الكرسى، وآخر الحشر، و﴿قل: هو الله أحد﴾ فإنها بمنزلة الاسم الأعظم من بين الأسماء.

ومنها: أن يكون نزولُها على ألسنة العباد، ليعلموا: كيف يتقربوا إلى ربهم؟ كالفاتحة: ونسبتُها من السور كنسبة الفرائض من العبادات.

ومنها: أنها أجمعُ السور، كالزَّهراوين.

[ز] وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم في يٰسٓ: "إنه قلب القرآن" لأن القلب يؤمئ إلى التوسط، وهذه من المثاني: دون المئين فما فوقها، وفوق المفصَّل، وفيها: آيات التوكل، والتفويض، والتوحيد، على لسان محدَّثِ أنطاكية: ﴿ومالى لا أعبد الذى فطرنى﴾ الآياتِ، وفيها: الفنونُ المذكورة تامَّة كاملة.

[ح] وفى تبارك الذى: "شَفَعَتْ لرجل حتى غُفرله" وهذه قصة رجل رآه النبيُّ صلى الله عليه وسلم فى بعض مكاشفاته.

[۲] وأن يرغِّب:

[الف] فى تعاهده واستذكاره، ويُضرب له مَثَلُ تفصِّى الإبل.

[ب] وفى الترتيل به.

[ج] وتلاوتِه عند ائتلاف القلوب، وجمع الخاطر، ووفور النشاط، ليكون أقربَ إلى التدبر.

[د] وحسنِ الصوت به.

[هـ] والبكاء أو التباكى عنده وتقريبا للمراد، وهو التفكر.

[و] ويُحَرَّمَ نسيانُه.

[ز]ويُنهى عن ختمه فى أقلَّ من ثلاث، لأنه لايفقه معناه حينئذ.

[ح] وجاءت الرخصةُ فى قراءته على لغات العرب، تسهيلا عليهم، لأن فيهم الأميَّ، والشيخَ الكبير، والصبيَّ.

ومما أوتى النبيُّ صلى الله عليه وسلم فى غير القرآن عنه عزَّوجلَّ:

[۱] يـا عبادى! إنى حرَّمتُ الظلم على نفسى، وجعلته بينكم محرَّما، فلا تُظالموا. يا عبادى! كلكم ضال إلا من هديته" الحديثَ.

[۲] كان فى بنى إسرائيل رجل قتل تسعا وتسعين إنسانا" الحديث.

[۳] لَلّٰهُ أشدُّ فرحًا بتوبة عبده" الحديث.

[٤] إن عبدًا أذنب ذنبا" الحديث.

[٥] إن لله مائةَ رحمةٍ، أنزل منها واحدة" الحديث.

[٦] إذا أسلم العبد، فحسُن إسلامُه" الحديث.

[۷] وأحاديثُ تشبيه الدنيا بماءٍ يَلْحَقُ بالأصبع من اليم.

[۸] وبجَدْیٍ أَسَكَّ ميتٍ.

ترجمہ: اور جب عوام کے لئے آسان نہیں تھا کہ فارغ ہو جائیں گہرے غور کے لئے، اور مذکورہ امور کو اپنی نگاہوں کے سامنے لانے کے لئے تو ضروری ہوا کہ مقرر کئے جائیں، ایسے پیکر ہائے محسوس جن میں غور وفکر کی مذکورہ انواع مرتب کی جائیں، اور (مقرر کئے جائیں) ایسے مجسمے جن میں انواع مذکورہ کی روح پھونکی جائے، تاکہ عوام اُن (پیکروں اور مجسموں) کا قصد کریں، اور وہ ان کو پڑھ کر سنائی جائیں یعنی وہ پیکر اور ہیکل کلام ہوں جو لوگوں کو پڑھ کر سنائے جاہیں۔اور وہ استفادہ کریں جس قدر ان کے نصیب میں ہے۔

اور بالتحقیق نبی ﷺ قرآن دیئے گئے جو اُن انواع کے لئے جامع ہے، اور آپ اس (قرآن) کے مانند اس کے ساتھ دیئے گئے (یہ قرآن اور مخصوص احادیث ہی پیکر اور ہیکل ہیں) اور میں گمان کرتا ہوں کہ آپ کے لئے ان دو میں جمع کی گئیں (غور وفکر کے سلسلہ کی) وہ تمام باتیں جو گذشتہ امتوں میں تھیں، باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

پس حکمت (خداوندی) نے چاہا: (۱) کہ ترغیب دی جائے تلاوتِ قرآن کی، اور تلاوت کی فضیلت بیان کی جائے اور قرآن کی کچھ آیتوں اور سورتوں کی بھی فضیلت بیان کی جائے: (الف) پس نبی ﷺ نے آیت سے حاصل ہونے والے معنوی فائدہ کو تشبیہ دی ایسے محسوس فائدے کے ساتھ جس سے مفید تر عربوں کے نزدیک کوئی چیز نہیں تھی۔اور وہ محسوس فائدہ اونچی کوہان والی اونٹنی یا موٹی حاملہ اونٹنی ہے (تشبیہ دی) معنی کی منظرکشی کرتے ہوئے اور معنی کی تمثیل کے طور پر (ب) اور تشبیہ دی تلاوت کرنے والے کو فرشتوں کے ساتھ (ج) اور ہر حرف کے بدل تلاوت کے ثواب کی اطلاع دی (د) اور لوگوں کے مراتب بیان کئے ترنج لیموں اور کھجور اور اندرائن اور خوشبودار پھول کی مثال کے ذریعہ جو آپ نے بیان کی (ھ) اور یہ بات بیان کی کہ قرآن کی سورتیں قیامت کے دن ایسے اجسام میں متمثل ہونگی جو دیکھے اور چھوئے

جاسکیں گے، پس وہ ان کے پڑھنے والوں کی جانب سے جھگڑا کریں گی، اور وہ جھگڑا: پڑھنے والے کی نجات اور عذاب کے اسباب کے تعارض کا انکشاف ہے، اور دیگر اسباب ہلاکت پر قرآن کی تلاوت کا رجحان ہے (و) اور یہ بات بیان کی کہ سورتوں میں باہمی تفاضل ہے۔ میں کہتا ہوں: سورتوں میں چند معانی ہی کی وجہ سے تفاضل ہوتا ہے: ازانجملہ: سورت کا اللہ کی صفات میں غور کرنے کا فائدہ دینا ہے، اور سورت کا تفکر وتدبر میں جامع ترین آیت ہونا ہے۔ جیسے آیت الکرسی اور سورۃ الحشر کی آخری آیتیں اور قل ھو اللہ احد۔ پس یہ آیات اللہ کے ناموں میں اسم اعظم جیسی ہیں۔ اور ازانجملہ: یہ بات ہے کہ سورت کا نزول بندوں کی زبان پر ہوا ہو، تاکہ بندے جانیں کہ وہ اپنے پروردگار کی نزدیکی کیسے حاصل کریں؟ جیسے فاتحہ۔ اور اس کی نسبت دوسری سورتوں سے جیسے فرائض کی نسبت عبادات سے۔ اور ازانجملہ: یہ ہے کہ وہ سورت سورتوں میں جامع ترین ہو۔ جیسے دو روشن سورتیں۔

(ز) اور رسول اللہ ﷺ نے یٰسٓ کے متعلق فرمایا: ''بیشک وہ قرآن کا دل ہے'' اس لئے کہ دل اشارہ کرتا ہے درمیان کی طرف۔ اور یہ مثانی میں سے ہے: جو مئین پس اس سے بڑی سورتوں سے نیچے ہے اور مفصل سے اوپر ہے۔ اور اس میں: توکل، تفویض اور توحید کی آیتیں ہیں، انطاکیہ کے مُلہم کی زبان سے: ''اور میرے پاس کونسا عذر ہے کہ اس کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا؟'' کئی آیات پڑھئے۔ اور اس میں: فنون مذکورہ: تام وکامل ہیں (ح) اور (آپؐ نے فرمایا) تبارک الذی کے متعلق کہ: ''اس نے سفارش کی ایک شخص کی یہاں تک کہ اس کو معاف کردیا گیا'' اور یہ ایک آدمی کا قصہ ہے جس کو نبی ﷺ نے اپنے کسی مکاشفہ میں دیکھا ہے۔

(۲) اور (حکمت نے چاہا) کہ (الف) ترغیب دی جائے قرآن کی دیکھ بھال کرنے کی اور اس کو یاد رکھنے کی اور قرآن کے لئے اونٹ کے بھاگ جانے کی مثال بیان کی جائے (ب) اور (ترغیب دی جائے) اس کی تلاوت کی ٹھہر ٹھہر کر (ج) اور اس کی تلاوت کی دلوں کے اکٹھا ہونے اور دل کے جمع ہونے اور نشاط کے زیادہ ہونے کے وقت تاکہ تلاوت تدبر سے قریب تر ہو (د) اور (ترغیب دی جائے) قرآن کو اچھی آواز میں پڑھنے کی (ھ) اور رونے کی یا رونے کی صورت بنانے کی تلاوت کے وقت، مراد کو نزدیک کرنے کے طور پر اور مراد غور وفکر کرنا ہے (و) اور حرام قرار دیا جائے اس کا بھولنا (ز) اور روکا جائے قرآن ختم کرنے سے تین دن سے کم میں اس لئے کہ قاری نہیں سمجھے گا اس وقت اس کے معنی (ح) اور اجازت وارد ہوئی ہے عربوں کے لہجوں میں قرآن پڑھنے کی، ان پر آسانی کرتے ہوئے، اس لئے کہ ان میں ناخواندہ اور بہت بوڑھے اور بچے ہیں —— اور ان مضامین میں سے جو نبی ﷺ قرآن کے سوا دیئے گئے ہیں اللہ عزوجل کی جانب سے: (اس کے بعد چھ حدیثیں ہیں) (۷) اور دنیا کو تشبیہ دینے کی حدیثیں اس پانی کے ساتھ جو انگلی پر لگ گیا ہے سمندر سے (۸) اور مردہ چھوٹے کان والے بکری کے بچے کے ساتھ (دنیا کو تشبیہ دینے کی حدیثیں)

لغات: عَبّٰی تَعْبِیَۃَ الجیشَ: لشکر کو ترتیب دینا...... کوماء مؤنث أکوم کا: بلند بڑے کوہان والا

اونٹ......خَلِفَتِ الناقۃُ: حاملہ ہونا، صفت: خَلِفَۃ......محدَّث: جس کو اللہ کی طرف سے الہام ہوتا ہو یعنی روشن ضمیر، جس کا گمان صحیح نکلتا ہے اور اس کی رائے اکثر درست ہوتی ہے۔

☆ ☆ ☆

اخلاص کی اہمیت اور ریا کی شناعت

نیت: عبادت کی روح ہے، اور عبادت کی ظاہری شکل اس کا جسم۔ اور جسم کی روح کے بغیر زندگی نہیں، مگر روح بدن سے جدا ہونے کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ البتہ زندگی کے آثار بدن کے بغیر کامل و مکمل ظاہر نہیں ہوتے۔ سورۃ الحج آیت ۳۷ میں ارشاد پاک ہے: ''اللہ کے پاس نہ اُن (ہدیوں) کا گوشت پہنچتا ہے، نہ اُن کا خون، بلکہ ان کے پاس تمہارا تقوی پہنچتا ہے'' یعنی اچھی نیت پہنچتی ہے جو قربانی کی روح ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ: ''اعمال کا مدار نیتوں پر ہے'' یعنی جیسی نیت ویسی مراد۔

اور متعدد روایات میں یہ مضمون آیا ہے کہ اگر کوئی شخص عمل کی سچی نیت رکھتا ہے، مگر کسی مانع کی وجہ سے وہ عمل پر قادر نہ ہوسکا تو اس کے لئے اس عمل کا ثواب لکھا جاتا ہے۔ جیسے سفر یا بیماری کی وجہ سے کوئی اپنا وظیفہ پورا نہ کرسکے تو بغیر عمل کے بھی ثواب لکھا جاتا ہے۔ اسی طرح تنگ حال وجوہ خیر میں خرچ کرنے کی سچی نیت رکھتا ہو تو اس کے لئے بھی بغیر خرچ کئے ثواب لکھا جاتا ہے (تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ ۳: ۶۴۲)

اور نیت سے مراد: وہ بات ہے جو عمل پر آمادہ کرتی ہے یعنی رسولوں کی معرفت اچھے برے اعمال پر جن نتائج کی خبر دی گئی ہے ان کی تصدیق کرنا یعنی اطاعت کرنے والوں کے لئے ثواب اور نافرمانوں کے لئے عقاب کی جو اطلاع دی گئی ہے، اس کی وجہ سے کوئی عمل کرنا یا کسی بات سے باز رہنا —— یا اوامر و نواہی کے امتثال کی محبت دل میں موجزن ہو، اور اس تقاضے سے کوئی عمل کرنا یا کسی کام سے اعراض کرنا: یہی اخلاص ہے۔ اور خالص نیت سے کیا ہوا کام ہی مقبول بارگاہ ہے۔ اگر نیت میں کھوٹ ہے تو وہ کام مقبول نہیں، اس لئے ضروری ہوا کہ عمل کو دکھانے اور سنانے کے جذبہ سے پاک کیا جائے۔ اور ریا وُسمعہ سے روکا جائے۔ اور زیادہ سے زیادہ صراحت کے ساتھ ان کی قباحتیں اور شناعتیں بیان کی جائیں۔ اس سلسلہ کی دو روایتیں درج ذیل ہیں:

پہلی روایت: حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جن لوگوں کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا: وہ تین قسم کے لوگ ہوں گے: ایک: وہ جو معرکۂ جہاد میں اس لئے شہید ہوا کہ لوگ اسے ''سورما'' کہیں۔ دوسرا: وہ جس نے دین پڑھا پڑھایا تاکہ لوگ اسے ''عالم'' کہیں۔ اور تیسرا: وہ جس نے اچھے کاموں میں اس لئے خرچ کیا کہ لوگ اسے ''داتا'' کہیں۔ ان تینوں کے متعلق حکم ہوگا، اور وہ منہ کے بل جہنم کی طرف گھسیٹے جائیں گے (مشکوۃ حدیث ۲۰۵) کیونکہ ان کے

اعمال میں اخلاص نہیں تھا۔

دوسری روایت: حدیث قُدسی میں ہے: اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں: ''میں ساجھاداروں میں شراکت سے سب سے زیادہ بے نیاز ہوں یعنی مجھے بھاگی داری کی کچھ حاجت نہیں۔ جس نے کوئی ایسا عمل کیا، جس میں میرے ساتھ میرے علاوہ کو شریک کیا تو: میں اس عمل کو اس کے شرک کے ساتھ چھوڑتا ہوں!'' اور ایک روایت میں ہے: ''میں اس سے بیزار ہوں، وہ عمل اسی کے لئے ہے جس کے لئے کیا ہے'' پس جائے اس سے اجر طلب کرے (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث ۵۳۱۷ باب الریاء والسُّمعۃ)

جلدی خوش خبری: حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: ایک شخص عمل خیر کرتا ہے، اور لوگ اس عمل کی وجہ سے اس کی تعریف کرتے ہیں، بتائیں: اس کا کیا حکم ہے؟ یہ ریاء ہے یا نہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''وہ مؤمن کی جلدی خوش خبری ہے!''

تشریح: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بندے نے عمل تو صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے کیا۔ کوئی اور جذبہ کارفرما نہیں تھا۔ مگر جب عمل بارگاہِ خداوندی میں قبول ہوا تو وہ مقبولیت زمین میں اتری اور لوگ اس کی تعریف اور اس سے محبت کرنے لگے تو یہ مؤمن کے لئے ایڈوانس خوش خبری ہے۔ یہ دکھانے اور سنانے کے لئے عمل کرنا نہیں ہے۔

دوہرا ثواب: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! رات ایسا ہوا کہ میں گھر میں نماز پڑھ رہا تھا۔ اچانک ایک صاحب آگئے، اور انھوں نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا۔ مجھے یہ بات اچھی لگی کہ انھوں نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا، تو کیا یہ بات دکھانے اور سنانے میں شمار ہوگی؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''ابو ہریرہ! تم پر اللہ کی رحمت ہو! تمہارے لئے دو اجر ہیں: پوشیدہ کا اجر اور آشکارا کا اجر'' (مشکوٰۃ حدیث ۵۳۲۲)

تشریح: یہ بات اس صورت میں ہے کہ خوش ہونا مغلوب ہو، تنہا عمل کا باعث نہ بن سکتا ہو یعنی خواہ کوئی دیکھتا یا نہ دیکھتا، وہ عمل ضرور کرتا، مگر اتفاقاً کسی نے دیکھ لیا تو اچھا لگا، یہ دکھانا سنانا نہیں ہے۔ ریاء یہ ہے کہ کوئی دیکھے تو عمل کرے ورنہ نہ کرے۔

اور پوشیدہ کا اجر: اس اخلاص کا اجر ہے جو چپکے سے عمل کرنے میں پایا جاتا ہے۔ اور آشکارا کا اجر: دین کی سربلندی اور راہِ ہدایت کی اشاعت کا اجر ہے یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے تہجد تنہائی میں شروع کیا تھا، پس ایک اجر تو چپکے سے عمل کرنے کا ملا۔ پھر اچانک کسی نے دیکھ لیا، جس سے اس کو تہجد کی ترغیب ہوئی، پس دوسرا اجر: عمل کو آشکارا کرنے کا ملا۔

واعلم أن النية روح، والعبادةَ جسدٌ، ولا حياةَ للجسد بدون الروح، والروحُ لها حياةٌ بعد مفارقة البدن، ولكن لا يظهر آثار الحياة كاملةً بدونه، ولذلك قال الله تعالىٰ: ﴿لَنْ يَنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا، وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾ وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إنما الأعمال بالنيات".

وشَبَّهَ النبیُّ صلی الله علیه وسلم فی کثیر من المواضع: من صَدَقت نیتُه، ولم یتمکن من العمل لمانع: بمن عمل ذلك العملَ، کالمسافر والمریض لایستطیعان وردًا واظبا علیه، فیُکتب لهما؛ وکصادق العزم فی الإنفاق، وهو مُمْلِقٌ، یُکتب کأنه أنفق.

وأعنی بالنیة: المعنیَ الباعث علی العمل من التصدیق بما أخبر به اللّٰهُ علی ألسنة الرسل، من ثواب المطیع، أو عقاب العاصی، أو حبِّ امتثالِ حکمِ الله فیما أمر ونهی.

ولذلك وجب أن یَنْهی الشارعُ عن الریاء والسمعة، ویُبیِّنَ مساویهما أصرحَ مایکون. فمن ذلك:

[۱] قوله صلی الله علیه وسلم: "إن أول الناس یُقضی علیهم یومَ القیامة ثلاثة: رجلٌ قُتل فی الجهاد لیقال له: هو رجل جریءٌ ورجلٌ تعلَّم العلم وعلَّمه لیقال: هو عالم، ورجلٌ أنفق فی وجوه الخیر لیقال: هو جَوَادٌ، فیؤمر بهم، فیسحبون علی وجوههم إلی النار"

[۲] وقوله صلی الله علیه وسلم، عن الله تعالی: "أنا أغنی الشرکاء عن الشرك، من عمل عملاً أشرك فیه غیری ترکتُه وشِرْکَه"

أما حدیث أبی ذر رضی الله عنه: قیل: یارسول الله! أرأیتَ الرجلَ یعمل العمل من الخیر، ویحمدُه الناس علیه؟ قال: "تلك عاجلُ بُشری المؤمن" فمعناه: أن یعمل العمل، لایقصد به إلا وجه الله، فینزل القبول إلی الأرض، فیحبه الناس.

وحدیثُ أبی هریرة رضی الله عنه: قلت: یارسول الله! بینا أنا فی بیتی فی مصلایَ، إذ دخل عليَّ رجل، فأعجبنی الحال التی رآنی علیها، قال: "رحمك الله یا أباهریرة! لك أجران: أجر السر وأجر العلانیة" فمعناه: أن یکون الإعجاب مغلوبًا، لایبعث بمجرده علی العمل. وأجر السر: أجر الإخلاص الذی یتحقق فی السر، وأجر العلانیة: أجر إعلاء الدین، وإشاعة السنة الراشدة.

ترجمہ: اور جان لیں کہ نیت روح ہے، اور عبادت جسم، اور روح کے بغیر جسم کے لئے زندگی نہیں۔ اور روح کے لئے بدن سے جدا ہونے کے بعد بھی زندگی ہے۔ مگر بدن کے بغیر زندگی کے آثار کامل طور پر ظاہر نہیں ہوتے۔ اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا......... اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا......... اور نبی ﷺ نے بہت سے مواقع میں اس شخص کو جس کی نیت سچی ہے، مگر کسی مانع کی وجہ سے عمل پر قادر نہ ہوسکا: اس شخص کے ساتھ تشبیہ دی ہے جس نے وہ عمل کیا ہے۔ جیسے مسافر اور مریض: جو نہ طاقت رکھیں کسی ایسے وظیفہ کی جس کے وہ پابند تھے، تو وہ عمل ان دونوں کے حق میں لکھا جاتا ہے۔ اور جیسے خرچ کرنے کی سچی نیت رکھنے والا اس حال میں کہ وہ تنگدست ہے: لکھا جاتا ہے گویا اس نے خرچ کیا۔

اور نیت سے میری مراد: وہ بات ہے جو عمل پر آمادہ کرتی ہے یعنی: مطیع کے ثواب اور عاصی کے عقاب کی تصدیق جس کی اللہ تعالیٰ نے رسولوں کی معرفت اطلاع دی ہے۔ یا حکم الٰہی کے امتثال کی محبت ان باتوں میں جن کا اللہ نے حکم دیا ہے یا روکا ہے۔

اور اسی وجہ سے ضروری ہوا کہ شارع روکے ریاؤسُمعہ سے اور بیان کرے دونوں کی برائیاں زیادہ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ، پس اس میں سے ہے: (اس کے بعد دو روایتیں ہیں) ـــــــ رہی حضرت ابوذرؓ کی حدیث:......تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی عمل کرے: نہ ارادہ کرے اس سے مگر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا، پس اترے قبولیت زمین میں، پس لوگ اس سے محبت کرنے لگیں ـــــــ اور ابو ہریرہؓ کی حدیث..........پس اس کے معنی: یہ ہیں کہ خوش ہونا مغلوب ہو، وہ تنہا عمل پر برانگیختہ نہ کرے۔ اور پوشیدگی کا اجر: اس اخلاص کا اجر ہے جو پوشیدگی میں پایا جاتا ہے اور آشکارہ کا اجر: دین کی بلندی اور راہ ہدایت کی اشاعت کا اجر ہے۔

☆ ☆ ☆

اخلاقِ حسنہ کی تشکیل

حدیث ـــــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’تم میں بہترین وہ آدمی ہے جس کے اخلاق تم میں سب سے بہتر ہیں‘‘ (مسند احمد ۲: ۱۹۳)

تشریح: سماحت اور عدالت میں گونہ تعارض ہے۔ باب اول میں اس پر تنبیہ گذر چکی ہے۔ کیونکہ سماحت (فیاضی) کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف نفس کا میلان ضروری ہے۔ اور عدالت (انصاف) کے لئے لوگوں کے ساتھ مہر و مودّت ضروری ہے۔ اور یہ دونوں باتیں بیک وقت مشکل سے حاصل ہوتی ہیں یعنی ایک ساتھ دونوں کے تقاضے پورے نہیں کئے جاسکتے۔ مگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات: دونوں مصلحتوں (سماحت و عدالت) کی رعایت پر مبنی ہیں۔ ان کے پیش نظر دارین کی استواری ہے۔ اور وہ تعارض کی صورت میں حتی الامکان مصالح کے درمیان جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ ضروری ہوا کہ احکام شرعیہ میں سماحت کی ایسی شکلیں تجویز کی جائیں جو عدالت کے ساتھ مختلط ہوں، جن سے عدالت کو تقویت ملے اور جن سے عدالت کی یاد تازہ ہو، چنانچہ اسی انداز پر اخلاقِ حسنہ کی تشکیل کی گئی ہے۔

اخلاقِ حسنہ: سماحت و عدالت کے سلسلہ کے چند امور کے مجموعہ کا نام ہے۔ کیونکہ اخلاقِ حسنہ: جود و کرم، ستم گر سے درگذر، تواضع و خاکساری اور حسد، کینہ اور غصہ نہ کرنے کو شامل ہیں۔ اور یہ سب باتیں سماحت کے قبیل سے ہیں۔ نیز اخلاقِ حسنہ: لوگوں سے مودت و محبت، صلہ رحمی، اچھی طرح لوگوں سے میل ملاپ اور محتاجوں کی غمخواری کو بھی شامل ہیں اور یہ سب باتیں عدالت کے قبیل سے ہیں۔ اور قسم اول کا اعتماد قسم ثانی پر ہے یعنی مودت ہوگی تو کرم کا دریا بہے گا۔ اور قسم

ثانی کی تکمیل قسم اول سے ہوتی ہے یعنی کرم ہوگا تو مودت پیدا ہوگی۔ غرض اخلاقِ حسنہ کی تشکیل میں سماحت وعدالت دونوں کی رعایت: اس رحمتِ الٰہی سے ہے جس کی احکام شرعیہ میں رعایت کی گئی ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "خياركم أحاسنكم أخلاقًا"

أقول: لما كان بين السماحة والعدالة نوعٌ من التعارض، كما نبَّهْنا عليه، وكان بناءُ علوم الأنبياء عليهم السلام على رعاية المصلحتين، وإقامةِ نظام الدارين، وأن يُجمع بين المصالح ما أمكن: وجب أن لايُعين فى النواميس للسماحة إلا أشباح تشتبك مع العدالة، وتؤيدها، وتُنَبِّهُ عليها؛ فنزل الأمرُ إلى حسن الخلق:

وهو عبارة عن مجموع أمور من باب السماحة والعدالة: فإنه يتناول الجود، والعفو عمن ظلم، والتواضعَ، وتركَ الحسد، والحقدِ، والغضب، وكل ذلك من السماحة؛ ويتناول التودُّد إلى الناس، وصلةَ الرحم، وحسن الصحبة مع الناس، ومواساةَ المحاويج، وهى من باب العدالة. والفصل الأول يعتمد على الثانى، والثانى لايتم إلا بالأول، وذلك من الرحمة المرعية فى النواميس الإلٰهية.

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تم میں بہترین وہ ہے جس کے اخلاق تم میں بہترین ہیں" میں کہتا ہوں: جب سماحت اور عدالت کے درمیان گونہ تعارض تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے اس پر تنبیہ کرچکے ہیں۔ اور انبیاء کی تعلیمات کا مدار دونوں مصلحتوں کی رعایت پر اور دارین کے نظام کی استواری پر ہے اور اس بات پر ہے کہ دونوں مصلحتوں کے درمیان حتی الامکان جمع کیا جائے۔ پس ضروری ہوا کہ احکام شرعیہ میں سماحت کے لئے متعین نہ کئے جائیں مگر ایسے پیکر جو عدالت کے ساتھ مختلط ہوں، اور جن سے عدالت کو تقویت حاصل ہو اور جو عدالت سے چوکنا کریں۔ چنانچہ معاملہ اخلاق کی عمدگی کی طرف اترا یعنی دونوں مصلحتوں کا لحاظ کر کے اخلاقِ حسنہ کی تشکیل عمل میں آئی —— اور حسن خلق: نام ہے سماحت وعدالت کے سلسلہ کے چند امور کے مجموعہ کا۔ پس بیشک حسنِ خلق شامل ہے سخاوت، ظلم کرنے والے سے درگذر کرنے، خاکساری، حسد نہ کرنے، کینہ نہ رکھنے اور غصہ نہ کرنے کو، اور یہ سب باتیں سماحت سے ہیں۔ اور حسن خلق شامل ہے لوگوں سے محبت، صلہ رحمی، لوگوں کے ساتھ اچھے میل ملاپ اور محتاجوں کی غمگساری کو، اور یہ باتیں عدالت کے قبیل سے ہیں۔ اور پہلی قسم: دوسری قسم پر تکیہ کرتی ہے اور دوسری قسم تکمیل پذیر نہیں ہوتی پہلی قسم کے بغیر۔ اور وہ بات یعنی دونوں باتوں کی رعایت اس رحمت سے ہے جس کی احکام شرعیہ میں رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔

☆ ☆ ☆

زبان کی آفات

زبان کی آفات: دیگر اعضاء کی آفات سے سنگین ہیں۔ اور اس کی دو وجہیں ہیں:

پہلی وجہ: اعضائے انسانی میں زبان خیر وشر کی طرف زیادہ سبقت کرنے والی ہے۔ حدیثِ معاذؓ میں ہے: ''آدمیوں کو دوزخ میں ان کے منہ کے بل (یا ناک کے بل) ان کی زبانوں کی بیبا کانہ باتیں ہی ڈلوائیں گی'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۹) دوسری روایت میں ہے کہ جب آدمی صبح کرتا ہے تو اس کے سارے اعضاء بڑی لجاجت کے ساتھ زبان سے کہتے ہیں کہ خدارا! ہم پر رحم کرنا، اور ہمارے معاملہ میں خدا سے ڈرنا۔ کیونکہ ہم تیرے ساتھ وابستہ ہیں۔ اگر تو ٹھیک چلی تو ہم بھی ٹھیک چلیں گے اور اگر تو کج ہوئی تو ہم بھی کج روی اختیار کریں گے (مشکوٰۃ حدیث ۴۸۳۸)

دوسری وجہ: زبان کی آفات: اخبات، سماحت اور عدالت: سبھی میں خلل انداز ہوتی ہیں۔ ہَذر (بہت بولنا) اللہ کی یاد بھلا دیتا ہے اور صفتِ اخبات فوت ہوجاتی ہے۔ اور غیبت اور یاوہ گوئی وغیرہ باہمی تعلقات کو بگاڑ دیتے ہیں۔ اور آدمی جو بھی بات زبان سے نکالتا ہے: دل اس کا رنگ پکڑ لیتا ہے۔ آدمی غصہ میں بات کرتا ہے تو غُصیلا ہوجاتا ہے، وقس علی ہذا اور جب دل برا ہوجاتا ہے تو برائی کو وجود میں آنے میں دیر نہیں لگتی۔

زبان کی چھ آفات: مذکورہ وجوہ سے شریعت نے زبان کی آفات سے بہ نسبت دیگر اعضاء کی آفات کے زیادہ اعتناء کیا ہے۔ زبان کی آفات مختلف طرح کی ہیں۔ ذیل میں ان کی چھ انواع ذکر کی جاتی ہیں:

نوع اول: ہر میدان میں گھوڑا دوڑانا، دنیا جہاں کی باتیں کرنا: اس سے خزانۂ خیال میں ان چیزوں کی صورتیں جمع ہوجاتی ہیں۔ اور ایسا شخص جب اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے مثلاً نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو وہ ذکر میں کوئی حلاوت محسوس نہیں کرتا۔ اور اذکار میں غور وفکر کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اسی وجہ سے لایعنی (بے فائدہ باتوں) سے روکا گیا ہے۔ حدیث شریف میں ہے: مِن حُسْنِ إسلام المرءِ تركُه مالايَعْنِيْهِ: آدمی کے دین کی خوبی یہ ہے کہ وہ بے فائدہ باتیں نہ کرے (مشکوٰۃ حدیث ۴۸۳۹) یعنی اسلام کی رونق اسی میں ہے کہ بے ضرورت اور بے فائدہ باتیں نہ کی جائیں۔

نوع ثانی: وہ باتیں ہیں جو لوگوں میں فتنہ وفساد کی آگ بھڑکاتی ہیں۔ جیسے غیبت کرنا، جھگڑا کرنا اور حق کا انکار کرنا: ان سے دلوں میں فتنہ وفساد کا بیج پڑتا ہے۔

نوع ثالث: جس کلام کا مقتضا ایسا ہو کہ اس سے نفس پر شیطنت یا شہوت کا بڑا پردہ پڑ جائے، جیسے گالی گلوچ اور عورتوں کی خوبیاں بیان کرنا۔ اول سے نفس پر شیطنت سوار ہوتی ہے اور ثانی سے نفس چٹکیاں لینے لگتا ہے۔

نوع رابع: وہ بات جو عظمتِ خداوندی بھول جانے سے اور اللہ کے خزانوں سے غافل ہوجانے کی وجہ سے زبان سے نکلتی ہے۔ جیسے بادشاہ کو ''شہنشاہ'' کہنا یعنی اس کی تعریف میں آسمان وزمین کے قلابے ملانا۔

نوع خامس: وہ باتیں جوملّی مصالح اور دینی مفاد کے خلاف ہیں۔جن باتوں سے ایسی چیزوں کی ترغیب ہوتی ہے جن سے احتراز کرنے کا ملت نے حکم دیا ہے۔جیسے شراب کی تعریف،اورانگور کو''کَرم''(کریم وطیب) کہنا۔کیونکہ یہ بھی بالواسطہ شراب ہی کی تعریف ہے(اورممانعت کی حدیث بخاری میں ہے حدیث ۶۱۸۲ کتاب الادب) یا کتاب اللہ کی مراد مشتبہ کرنا،جیسے مغرب کوعشاء اورعشاء کوعتمہ کہنا(تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ ۳:۳۲۰)

نوع سادس: وہ شنیع(بُرا) کلام جوافعالِ شنیعہ جیسا ہو،جوشیاطین کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔جیسے فحش(شرم کی بات)اور جماع اور پوشیدہ اعضاء کا صاف صریح الفاظ میں تذکرہ اورجیسے بدشگونی کی بات،مثلاً یہ کہنا کہ:''اس گھر میں کامیابی ہے نہ مالداری!''یعنی یہ گھر منحوس ہے!

ولـمـا كان اللسانُ أسبقَ الجوارح إلى الخير والشر، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:''وهل يَكُبُّ الناسَ على مناخرهم إلا حصائدُ ألسنتهم!''

وأيضا: فإن آفاتِه تُخِلُّ الإخباتَ، والعدالةَ، والسماحةَ جميعًا، لأن إكثار الكلام يُنْسِي ذكرَ الله، والـغيبةَ والبـذاءَ ونـحـوَهما تُفسد ذات البين، والقلبُ ينصبغ بصبغ مايتكلم به، فإذا ذكر كـلـمةَ الـغـضـب لابـد أن يـنـصبغ القلب بالغضب، وعلى هذا القياس، والانصباغُ يُفضى إلى التشبُّح: يجب أن يبحث الشرعُ عن آفات اللسان أكثر من آفات غيره.

وآفات اللسان على أنواع:

منها : أن يـخـوضَ فـي كل وادٍ، فتجتمع في الحسّ المشترك صُوَرُ تلك الأشياء، فإذا توجَّه إلى الله لم يجد حلاوة الذكر، ولم يستطع تدبر الأذكار، ولهذا المعنى نُهى عمالا يُعنى.

ومنها:أن يُثير فتنةً بين الناس، كالغيبة، والجدال، والمِراء.

ومنها : أن يـكـون مـقـتـضًـى تُـغَشِّي النفسَ بغاشية عظيمة من السبُعية والشهوية، كالشتم، وذكر محاسن النساء.

ومنها: أن يكون سببَ حدوثِه نسيانُ جلال الله، والغفلةُ عما عند الله، كقوله للملِك: مَلِك الملوك!

ومنها : أن يـكـون مـنـاقضًا لمصالح الملة، بأن يكون مرغِّبا لماأمرتِ الملة بهَجْرِه، كمدح الخمر، وتمسية العنب كرما، أو يُعْجِمُ كتاب الله، كتسمية المغرب عشاءً، والعشاء عتمةً.

ومـنـها: أن يـكـون كـلامـاً شـنـيـعـا مَثَـلُـه كـمَثَـلِ الأفعال الشنيعة المنسوبة إلى الشياطين، كالفحش وذكر الجماع والأعضاءِ المستورة بصريح ماوُضع لها، وكذكرما يُتَطَيَّرُ به، كقوله: ليس في الدار نجاح ولايسار!

ترجمہ: اور جب زبان: اعضاء میں سے خیر وشر کی طرف زیادہ سبقت کرنے والی تھی، اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:.......... اور نیز: پس بیشک زبان کی آفتیں: اخبات، عدالت اور سماحت سبھی میں خلل ڈالتی ہیں، اس لئے کہ بہت باتیں کرنا اللہ کی یاد کو بھلا دیتا ہے، اور غیبت، بیہودہ کلام اور ان کے مانند باہمی تعلقات کو بگاڑ دیتے ہیں۔ اور دل اس بات کا رنگ پکڑ لیتا ہے جس کو آدمی بولتا ہے۔ پس جب وہ غصہ کی بات کرتا ہے تو ضروری ہے کہ دل غصہ کا رنگ پکڑے۔ اور اسی انداز پر، اور رنگ پکڑنا مُفضی ہوتا ہے متمثّل ہونے کی طرف: پس واجب ہے کہ شریعت بحث کرے زبان کی آفتوں سے اس کے علاوہ اعضاء کی آفتوں سے زیادہ۔

اور زبان کی آفتیں چند انواع پر ہیں: از انجملہ: یہ ہے کہ آدمی ہر میدان میں گھسے، پس حس مشترک میں ان چیزوں کی صورتیں جمع ہو جائیں، پس جب وہ اللہ کی طرف متوجہ ہو تو وہ ذکر کی چاشنی نہ پائے۔ اور اذکار میں غور کرنے کی طاقت نہ رکھے، اور اسی وجہ سے روکا گیا غیر مفید باتوں سے —— اور از انجملہ: یہ ہے کہ کلام لوگوں کے درمیان فتنہ بھڑکائے۔ جیسے غیبت، جھگڑا اور حق کا انکار —— اور از انجملہ: یہ ہے کہ (کلام کا) کوئی ایسا مقتضا ہو جو نفس کو درندگی یا شہوت کے بڑے پردے سے ڈھانک دے۔ جیسے گالی دینا اور عورتوں کی خوبیوں کا تذکرہ کرنا —— اور از انجملہ: یہ ہے کہ اس کلام کے پیدا ہونے کا سبب: اللہ کے جلال وعظمت کو بھولنا اور اس چیز سے غافل ہونا ہو جو اللہ کے پاس ہے، جیسے اس کا بادشاہ سے کہنا: ''شہنشاہ!'' —— اور از انجملہ: یہ ہے کہ وہ کلام ملت کے مصالح کے مناقض ہو، بایں طور کہ وہ ترغیب دینے والا ہو اس بات کی جس کو چھوڑنے کا ملت نے حکم دیا ہے۔ جیسے شراب کی تعریف کرنا اور انگور کو ''کرم'' (طیّب) کہنا یا اللہ کی کتاب کو مشتبہ کرنا، جیسے مغرب کو عشاء اور عشاء کو عَتَمہ کہنا —— اور از انجملہ: یہ ہے کہ کوئی برا کلام ہو، جن کا حال ان برے افعال جیسا ہو جو شیاطین کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔ جیسے فحش گوئی اور جماع اور اعضائے مستورہ کا ایسے صریح الفاظ سے تذکرہ کرنا جو ان کے لئے موضوع ہیں اور جیسے اس چیز کا ذکر جس سے لوگ بدشگونی لیتے ہیں، جیسے کسی کا کہنا: ''اس گھر میں نہ کوئی کامیابی ہے اور نہ مالداری!''

☆ ☆ ☆

صفتِ سماحت کا بیان

سماحت: یہ ہے کہ آدمی کی نظر اللہ کی طرف اور اللہ کے پاس جو نعمتیں ہیں ان کی طرف اٹھی رہے۔ اس کا نفس دنیا پر اور دنیا کی حقیر متاع پر نہ ریجھے۔ سماحت کے چند ممکنہ مصادیق اور احتمالی جگہیں ہیں، جن کا کثرت سے وقوع ہوتا رہتا ہے۔ ان میں سے بعض کا شریعت نے اعتبار کیا ہے، بعض کا نہیں۔ پس ضروری ہے کہ ان کے درمیان خط امتیاز کھینچا جائے۔ مثلاً حدیث میں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ زُہد کیا ہے اور کیا نہیں؟ یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ

تقشُّف (سخت زندگی بسر کرنے) سے امتیاز ہو جائے۔

شاہ صاحب قدس سرہ نے سماحت کی سات انواع بیان کی ہیں: زُہد، قناعت، جُود، قصر الامل، تواضع، حلم وأناۃ و رِفق اور صبر۔ سب کی تفصیل درج ذیل ہے۔

سماحت کی انواع

۱- زہد کا بیان

کبھی نفس میں لذیذ کھانے، نفیس لباس اور عورتوں کی چاؤ پیدا ہوتی ہے، جس سے نفس پر خراب رنگ چڑھ جاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ یہ رنگ نفس کی تھاہ میں پہنچ جاتا ہے۔ اسی رنگ کو اپنی ذات سے جھاڑے کا نام ''زُہد'' ہے۔ اور ان چیزوں کا چھوڑنا فی نفسہ مطلوب نہیں، بلکہ صفتِ زہد کو واقعی حقیقت بنانے کے لئے مطلوب ہے۔

وضاحت: زُہد کے لغوی معنی: کسی چیز سے بے رغبت ہو جانے کے ہیں۔ اور دین کی خاص اصطلاح میں: آخرت کے لئے دنیا کے لذائذ و مرغوبات کی طرف سے بے رغبت ہو جانے اور عیش و تنعم کی زندگی ترک کر دینے کو ''زہد'' کہتے ہیں (معارف الحدیث ۲:۹۳)

زُہد کیا ہے اور کیا نہیں؟ —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دنیا کی بے رغبتی: حلال کو حرام کرنے اور مال کو ضائع کرنے کا نام نہیں۔ بلکہ دنیا کی بے رغبتی یہ ہے کہ (۱) جو کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے اس سے زیادہ بھروسہ اس پر ہو جو اللہ کے پاس ہے (۲) اور جب تم کو کوئی تکلیف پیش آئے تو اس کے اخروی ثواب کی آرزو تمہارے دل میں زیادہ ہو: اس کی بہ نسبت کہ وہ تکلیف دہ بات تم کو پیش نہ آتی'' (مشکوۃ حدیث ۵۳۰۱)

تشریح: کچھ لوگ ناواقفی سے زہد کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی دنیا کی نعمتوں، راحتوں اور لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر لے۔ اور اگر کہیں سے کچھ آجائے تو اس کو جلدی سے کہیں پھینک دے۔ اس حدیث میں اسی غلط خیال کی اصلاح کی گئی ہے۔ فرمایا: زہد درحقیقت دو چیزوں کا نام ہے: ایک: یہ کہ جو اس دنیا میں اپنے پاس ہے اس کو فانی اور ناپائیدار یقین کرے اور غیبی خزانوں اور اللہ کے یہاں جو اجر و ثواب ہے اس پر زیادہ اعتماد کرے۔ دوسری: یہ کہ جب اللہ کے حکم سے کوئی تکلیف پہنچے تو اس کے ثواب کی چاہت اس کے دل میں اس تکلیف کے نہ پہنچنے کی آرزو سے زیادہ ہو یعنی اس کا دل اس وقت نہ کہے کہ کاش یہ تکلیف مجھے نہ پہنچتی، بلکہ اس کے دل کا احساس یہ ہو کہ اس تکلیف کا جو اجر و ثواب مجھے آخرت میں ملے گا وہ بدرجہا بہتر ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ آدمی کا یہ حال اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ اس کو عیشِ دنیا کے مقابلہ میں عیشِ آخرت کی زیادہ فکر ہو، اور یہی زہد کی اصل و اساس ہے (معارف الحدیث ۲:۱۰۱ ملخصاً)

مختصر متاع —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آدمؑ کے بیٹے کے لئے ان تین باتوں کے علاوہ میں کوئی حق نہیں:

(۱) ایسا گھر جس میں وہ رہ بس لے (۲) اور اتنا کپڑا جس سے وہ اپنی ستر پوشی کرلے (۳) اور روکھی روٹی اور پانی'' (مشکوٰۃ حدیث ۵۱۸۶)

تشریح: حدیث کا مقصد یہ ہے کہ بقدر کفاف دنیوی ساز وسامان کی طرف التفات تو ناگزیر ہے کہ اس کے بغیر دنیا کی زندگی مشکل ہے، اور اس سے زائد کی آرزو وبس ہوس ہے!

کم خوری —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آدمی نے پیٹ سے بدتر کوئی برتن نہیں بھرا'' کیونکہ پیٹ بھر کر کھانے سے ایسی برائیاں اٹھتی ہیں کہ بیان نہیں کی جاسکتیں —— ''ابن آدم کیلئے اُتنے لقمے کافی ہیں جو اس کی پیٹھ کو سیدھا کریں'' یعنی ادنی خوراک پر کفایت کرے، ورنہ: ''پیٹ کے تین حصے کرے: ایک تہائی کھانے کے لئے، دوسری تہائی پانی وغیرہ کے لئے اور تیسری تہائی سانس لینے کے لئے خالی رکھے'' تاکہ دَم نہ گھٹے اور ہلاک نہ ہوجائے (مشکوٰۃ حدیث ۵۱۹۲)

کفایت شعاری اور غمگساری —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دو کا کھانا تین کے لئے کافی ہے اور تین کا چار کے لئے'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۱۷۷ کتاب الأطعمۃ)

تشریح: حدیث کا مقصد یہ ہے کہ وہ کھانا جس سے دو آدمی خوب شکم سیر ہوجاتے ہیں، اگر اس کو تین آدمی کھائیں تو ان کا بھی دال دَلیا ہوجائے گا۔ اور حدیث کا سبق: مواسات (تعاون وغمخواری) کی پسندیدگی اور شکم سیری کے آز کی ناپسندیدگی ہے۔

ثم لابد من بيان ماكثُر وقوعُه من مظانّ السماحة، وتمييزُ ما اعتبره الشرع مما لم يعتبره:

فمنها: الزهد: فإن النفس ربما تميل إلى شَرَهِ الطعامِ واللباس والنساء، حتى تكتَسِبَ من ذلك لونًا فاسدًا، يدخل فى جوهرها، فإذا نفضه الإنسانُ عن نفسه فذلك الزهدُ فى الدنيا.

وليس ترك هذه الأشياء مطلوبا بعينه، بل إنما يطلب تحقيقا لهذه الخصلة، ولذلك قال النبى صلى الله عليه وسلم: " الزَّهادة فى الدنيا ليست بتحريم الحلال، ولا إضاعةِ المال، ولكن الزهادة فى الدنيا أن لاتكون بما فى يَدَيْك أوثقَ ممافى يَدَيِ الله، وأن تكون فى ثواب المصيبة إذا أنتَ أُصبتَ بها أرغبَ فيها لوأنها أُبْقِيَتْ لك" وقال: " ليس لابن آدم حق فى سوى هذه الخصال: بيتٍ يَسْكُنُه، وثوبٍ يُوارى عورتَه، وجِلْفِ الخبز والماءِ" وقال: " بحسبِ ابن آدمَ لُقَيْماتٌ يُقِمْنَ صُلبَه" وقال: " طعام الاثنين كافى الثلاثة، وطعام الثلاثة كافى الأربعة" يعنى أن الطعام الذى يُشبع الاثنين كلَّ الإشباع: إذا أكله الثلاثةُ كفاهم على التوسط؛ يريد الترغيب فى المواساة، وكراهية شَرَهِ الشبع.

ترجمہ: پھر سماحت کی اُن احتمالی جگہوں کو بیان کرنا ضروری ہے جن کا وقوع بکثرت ہوتا ہے اور ان چیزوں کو جدا کرنا

ضروری ہے جن کا شارع نے اعتبار کیا ہے، ان چیزوں سے جن کا شارع نے اعتبار نہیں کیا —— پس ازانجملہ : زُہد ہے۔ پس نفس کبھی مائل ہوتا ہے کھانے اور لباس اور عورتوں کی حرص کی طرف، یہاں تک کہ نفس ان سے فاسد رنگ کماتا ہے، وہ رنگ نفس کے جوہر میں داخل ہوتا ہے۔ پس جب انسان اس رنگ کو اپنی ذات سے جھاڑتا ہے تو وہی ''دنیا کی بے رغبتی'' ہے —— اور ان چیزوں کا چھوڑنا فی نفسہ مطلوب نہیں، بلکہ اس صفتِ زہد کی تحقیق ہی کے لئے مطلوب ہے، اور اسی وجہ سے نبی ﷺ نے فرمایا: ''دنیا کی بے رغبتی حلال کو حرام کرنے میں نہیں ہے اور نہ مال کو ضائع کرنے کے ذریعہ ہے۔ بلکہ دنیا کی بے رغبتی یہ ہے کہ (۱) نہ ہو تو زیادہ بھروسہ کرنے والا اس چیز پر جو تیرے ہاتھ میں ہے یعنی اسباب دنیا پر: اس سے جو اللہ کے دونوں ہاتھوں میں ہے یعنی اخروی نعمتیں (۲) اور یہ کہ ہو تو مصیبت کے ثواب میں، جب تجھے وہ پہنچائی جائے، زیادہ رغبت کرنے والا اس میں (یعنی اس سے کہ) اگر یہ بات ہوتی کہ وہ تیرے لئے باقی رکھی جاتی یعنی تجھے وہ مصیبت نہ پہنچائی جاتی (اس کے بعد تین حدیثیں ہیں جن کا ترجمہ گذر چکا) مراد لے رہے ہیں نبی ﷺ وہ کھانا جو دو آدمیوں کو پوری طرح سیر کرسکتا ہے، جب اس کو تین آدمی کھائیں تو وہ ان کے لئے کافی ہوجائے گا، کفایت شعاری کے طور پر، چاہ رہے ہیں آپؐ مواسات کی ترغیب دینا اور شکم سیری کی ناپسندیدگی کو۔

☆ ☆ ☆

۲- قناعت کا بیان

سماحت: کی ایک احتمالی جگہ وصفِ قناعت ہے۔ اور قناعت یہ ہے کہ کبھی مال کی آز نفس پر چھا جاتی ہے اور وہ نفس کی جڑ تک پہنچ جاتی ہے۔ پس جب انسان اس کو دل سے جھاڑ دے اور مال کا چھوڑنا اس کے لئے آسان ہوجائے تو اس کا نام قناعت و استغناء ہے۔ قناعت اس مال کو تج دینے کا نام نہیں جو اللہ تعالیٰ نے اشرافِ نفس کے بغیر عنایت فرمایا ہے، بلکہ قناعت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ عنایت فرمایا ہے اس پر راضی اور مطمئن رہے اور زیادہ کی حرص نہ کرے۔

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مالداری مال کی فراوانی سے نہیں، بلکہ مالداری دل کی مالداری ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۵۱۷۰)

تشریح: آدمی کے پاس اگر دولت کے ڈھیر ہوں، مگر اس میں زیادہ کی طمع ہو، تو اسے کبھی قلبی سکون نصیب نہ ہوگا، وہ دل کا فقیر ہی رہے گا۔ برخلاف اس کے: اگر آدمی کے پاس دنیا کم ہو یا زیادہ مگر وہ اس پر مطمئن ہو، تو وہ دل کا غنی ہے، اس کی زندگی بڑی آسودگی کی زندگی ہوگی۔

حدیث —— حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے کچھ مال طلب کیا۔ آپؐ نے عطا فرمایا۔ انھوں نے پھر مانگا، آپؐ نے پھر عطا فرمایا، اور ارشاد فرمایا: ''اے حکیم! یہ مال ہرا بھرا شیریں ہے یعنی سب کو بھلا لگتا

ہے۔ پس جو اس کو سیر چشمی سے لیتا ہے اس کیلئے اس میں برکت کی جاتی ہے، اور جو اس کو اشراف نفس سے لیتا ہے اس کیلئے اس میں برکت نہیں کی جاتی۔ اور اس کا حال اس پیٹو جیسا ہے جس کا کھانے سے پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ اور دستِ بالا دستِ زیریں سے بہتر ہے یعنی ہاتھ پھیلانا ایک گھٹیا بات ہے، امکانی حد تک اس سے احتراز کرنا چاہئے (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۴۲)

تشریح: اِشراف کے معنی ہیں: اوپر سے جھانکنا۔ اور اشرافِ نفس کے معنی ہیں: طمع، لالچ، رال ٹپکانا اور کسی جگہ سے مفت ملنے کا امیدوار رہنا۔ کاروبار میں نفع کی امید: اشراف نہیں ہے —— اور جو مال بے آرزو ملتا ہے اور سیر چشمی سے آدمی اس کو لیتا ہے اس میں برکت اس طرح ہوتی ہے کہ وہ اس مال کی امید پر پہلے سے کوئی قرضہ نہیں کر لیتا۔ اس لئے جب وہ آتا ہے تو بچا رہتا ہے۔ اور حریص پہلے ہی خرچہ کر لیتا ہے، اس لئے جب وہ آتا ہے تو ہاتھوں ہاتھ نکل جاتا ہے۔ اور وہ خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تیرے پاس اِس مال میں سے کچھ آئے درانحالیکہ تو نہ جھانکنے والا ہو اور نہ مانگنے والا ہو تو اس کو لے لے، اور اس کو اپنے لئے جمع رکھ، ورنہ اسکے پیچھے اپنے نفس کو نہ ڈال'' (بخاری حدیث ۱۴۷۳)

تشریح: مال مایۂ زندگانی ہے۔ سورۃ النساء آیت ۵ میں ہے: ﴿جَعَلَ اللهُ لَكُمْ قِيَامًا﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے مال کو لوگوں کے لئے سہارا بنایا ہے۔ پس اس کو جمع رکھنا مطلوب ہے، سب مال خرچ کر دینا اور کنگلا ہو کر رہ جانا اسلامی تعلیمات کا مقتضیٰ نہیں ہے۔

ومنها: القناعة: وذلك أن الحرص على المال ربما يغلب على النفس، حتى يدخل في جوهرها، فإذا نفضه من قلبه، وسهل عليه تركه، فذلك القناعة.

وليست القناعة ترك ما رزقه الله تعالى من غير إشراف النفس. قال النبي صلى الله عليه وسلم: "ليس الغنى عن كثرة العرض، ولكن الغنى غنى النفس" وقال: "ياحكيم! إن هذا المال خُضْرٌ حُلْوٌ، فمن أخذه بسخاوة نفس بورك له فيه، ومن أخذه بإشراف نفس لم يبارك له فيه، وكان كالذي يأكل ولايشبع، واليد العليا خير من اليد السفلى" وقال عليه السلام: "إذا جاء ك من هذا المال شيئ، وأنت غيرُ مشرف ولا سائل، فخذه، فتموَّلْه، ومالا فلا تُتْبِعْهُ نفسَك"

ترجمہ: اور ازانجملہ: قناعت ہے۔ اور قناعت یہ ہے کہ بسا اوقات مال کی حرص نفس پر چھا جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جوہر نفس میں پہنچ جاتی ہے، پس جب آدمی اس کو اپنے دل سے جھاڑ دیتا ہے، اور اس پر مال کا چھوڑنا آسان ہو جاتا ہے تو وہ قناعت ہے —— اور قناعت اس چیز کو چھوڑنا نہیں ہے جو اللہ نے روزی کے طور اس کو عنایت فرمائی ہے نفس کے جھانکے بغیر (پھر احادیث ہیں۔ جن کا ترجمہ گذر چکا)

۳- جود وسخا کا بیان

سماحت: کا ایک مظنّہ جود وسخا بھی ہے۔ اور جود کی حقیقت یہ ہے کہ کبھی مال کی اور مال کو جمع رکھنے کی محبت دل پر قبضہ جمالیتی ہے۔ وہ دل کو ہر چہار جانب سے گھیر لیتی ہے۔ مگر جب آدمی خیر کے کاموں میں خرچ کرنے کی ہمت کرتا ہے، اور خرچ کرنے میں تنگی محسوس نہیں کرتا ہے تو اس کیفیت کا نام جود وسخا ہے۔ جود وسخا مال اڑانے کا نام نہیں۔ مال فی نفسہ بری چیز نہیں، وہ تو بڑی نعمت ہے۔ بری چیز اس کی ہوس اور اس کا غلط استعمال ہے۔

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''انتہائی حرص سے بچو! انتہائی حرص ہی سے پہلی قومیں تباہ ہوئی ہیں۔ اسی نے ان کو خوں ریزی پر اور ناجائز کو جائز بنانے پر ابھارا'' (مسند احمد ۳: ۳۲۳)

تشریح: حرص وطمع بُری خصلت ہی نہیں، بلکہ اس کی وجہ سے معاشرہ میں بہت سی خطرناک برائیاں پیدا ہوتی ہیں جو بالآخر قوموں کو لے ڈوبتی ہیں۔ اس کے برخلاف جود وکرم: یگانگت، رحم دلی، تعاون باہمی، غمخواری اور ہمدردی جیسی بے شمار خوبیوں کو وجود میں لاتا ہے، جو قوموں کو بام عروج پر پہنچاتا ہے۔

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بس دو ہی شخصوں پر حسد کرنا چاہئے: ایک: وہ جس کو اللہ نے مال دیا ہو، اور راہ حق میں خرچ کرنے کی توفیق بھی دی ہو، دوسرا: وہ جس کو اللہ نے علم دیا ہو، اور وہ اس کے ذریعہ فیصلے کرتا ہو اور اس کو سکھاتا بھی ہو'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۲ کتاب العلم)

تشریح: اس حدیث میں حسد سے مراد رشک ہے۔ یعنی یہ آرزو کرنا کہ جو چیز دوسرے کو حاصل ہے، مجھے بھی مل جائے۔ لوگ دنیا کمانے اور اس کو جمع رکھنے میں رشک کرتے ہیں، حالانکہ قابلِ رشک دنیا کو دین کے لئے خرچ کرنا ہے۔ یہی جود وسخا ہے۔

حدیث ـــــ ایک خطاب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ان باتوں میں سے جن سے میں تم پر اپنے بعد ڈرتا ہوں یہ ہے کہ تم پر دنیا کی رونق اور اس کی زیبائش کے دروازے کھولے جائیں گے'' یعنی دولت کی ریل پیل ہوگی اور وہ باعثِ فتنہ ہوگی۔ ایک شخص نے سوال کیا: کیا خیر باعثِ شر ہوسکتی ہے؟ یعنی مال تو اللہ کی نعمت ہے، کیا وہ بھی سببِ فتنہ بن سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''خیر تو باعثِ شر نہیں ہوتی'' (البتہ اس کا غلط استعمال خرابی پیدا کرتا ہے، جیسے) ''موسم بہار سبزہ اُگاتا ہے، اس میں بعض ایسی اچھی گھاس ہوتی ہے کہ جانور بے تحاشا چرتا چلا جاتا ہے، جس سے اس کو بدہضمی ہوجاتی ہے، اور وہ مرجاتا ہے یا قریب المرگ ہوجاتا ہے'' تو یہ گھاس کی خرابی نہیں، بلکہ بے اعتدالی سے چرنے کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح فتوحات کے ذریعہ جو مال ہاتھ آئے گا، وہ برا نہیں، خرابی عیش وعشرت میں بے مُحابا اڑانے سے پیدا ہوگی۔ (مشکوٰۃ حدیث ۵۱۶۲) اور جو جو خیر میں خرچ کیا جائے: مساکین، یتامی اور مسافروں کو دیا جائے تو اس مال کے کیا کہنے (بخاری حدیث ۱۴۶۵)

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کے پاس زائد سواری ہو اس کو چاہئے کہ وہ اس کو سواری دے جس کے پاس سواری نہیں ہے۔ اور جس کے پاس زائد توشہ ہو اس کو چاہئے کہ وہ اس کو دے جس کے پاس توشہ نہیں ہے'' راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مال کی اتنی اقسام ذکر کیں کہ ہمیں خیال ہوا کہ جو بھی چیز ضرورت سے زائد ہے اس میں ہمارا کوئی حق نہیں (مشکوٰۃ حدیث ۳۸۹۸)

تشریح: رسول اللہ ﷺ نے حاجت سے زائد مال کو خرچ کرنے کی اتنی زیادہ ترغیب اس لئے دی ہے کہ اس زمانہ میں لوگ جہاد میں مشغول تھے، اور ان کے سامنے حاجات وضروریات تھیں، جو اسی طرح ارباب فضل کے تعاون سے پوری ہوسکتی تھیں۔ علاوہ ازیں اس میں اور بھی فوائد ہیں: (۱) یہ سماحت یعنی جود وسخا ہے (۲) اس میں نظام ملت کی استواری ہے (۳) اس میں مفلوکوں کی چارہ سازی ہے۔

ومنها: الجود: وذلك: لأن حبَّ المال، وحبَّ إمساكِه، ربما يملك القلب، ويحيط به من جوانبه، فإذا قدر على انفاقه، ولم يجد له بالاً، فهو الجود؛ وليس الجودُ إضاعةَ المال وليس المال مُبَغَّضًا لعينه، فإنه نعمة كبيرة.

قال صلى الله عليه وسلم: "اتقوا الشحَّ، فإن الشحَّ أهلك من قبلكم: حملهم على أن سفكوا دماء هم، واستحلوا محارمهم" وقال عليه الصلاة والسلام: "لاحسد إلا في اثنين" الحديث، وقيل: أوَ يأتي الخير بالشر؟ فقال: "إنه لايأتي الخير بالشر، وإن مما ينبت الربيع مايقتل حَبَطًا، أو يُلِمُّ!" وقال صلى الله عليه وسلم: "من كان معه فضلُ ظهرٍ فَلْيَعُدْ به على من لاظهر له، ومن كان له فضل زادٍ فليَعُدْ به على من لا زادَله" فذكر من أصناف المال، حتى رأينا أنه لاحق لأحد منا في فضل.

وإنما رغَّب في ذلك أشد الترغيب: لأنهم كانوا في الجهاد، وكانت بالمسلمين حاجةٌ واجتمع فيه السماحةُ، وإقامةُ نظام الملة، وإبقاءُ مُهَجِ المسلمين.

ترجمہ: اور از انجملہ: سخاوت ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ مال کی محبت اور اس کو روکنے کی الفت، کبھی دل پر قبضہ کرلیتی ہے۔ اور دل کو اس کی تمام جانبوں سے گھیر لیتی ہے، پس جب آدمی اس کے خرچ کرنے پر قادر ہوتا ہے، اور وہ انفاق میں کوئی تنگی محسوس نہیں کرتا تو وہ جود وسخا ہے ـــــ اور سخاوت مال کا ضائع کرنا نہیں۔ اور مال فی نفسہٖ کوئی بری چیز نہیں، کیونکہ وہ بڑی نعمت ہے (اس کے بعد چار حدیثیں ہیں) اور ترغیب دی آپؐ نے اس بارے میں بہت زیادہ ترغیب: اس لئے کہ لوگ جہاد میں مشغول تھے، اور مسلمانوں کو حاجت درپیش تھی۔ اور اکٹھا ہوئی اس خرچ کرنے میں سماحت (جود وسخا) اور ملت کے نظام کی استواری اور مسلمانوں کی ارواح کو باقی رکھنا۔

۴- امیدیں کوتاہ کرنے کا بیان

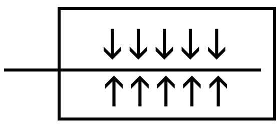
سماحت ہی کے باب سے ہے: امیدیں کوتاہ کرنا۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان پر زندگی کی محبت اس حد تک غالب آجاتی ہے کہ وہ موت کا ذکر تک پسند نہیں کرتا۔ اور وہ ایسی حیاتِ دراز کا خواب دیکھتا ہے جس تک عام طور پر آدمی نہیں پہنچتا۔ ایسا شخص اگر اسی حال میں مرجاتا ہے تو زندگی کا یہ اشتیاق اس کے لئے وبالِ جان بن جاتا ہے۔

اور زندگی فی نفسہٖ قابلِ نفرت نہیں۔ زندگی تو نعمتِ عظمی ہے۔ حدیث میں ہے: ''تم میں سے کوئی شخص ہرگز موت کی آرزو نہ کرے، اور نہ وقت آنے سے پہلے اس کی دعا کرے، کیونکہ جب وہ مرگیا تو اس کا عمل منقطع ہوگیا۔ اور مؤمن کی زندگی اس کی خیر ہی میں اضافہ کرتی ہے!'' (رواہ مسلم، جامع الاصول ۴:۱۰۸)

حدیث ــــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دنیا میں ایسا رہ جیسے پردیسی یا راستہ چلتا مسافر ہو'' (مشکوۃ حدیث ۱۶۰۴ و ۵۲۷۴)

تشریح: مقصدِ حدیث یہ ہے کہ دنیا کی زندگی کو ہمیشہ عارضی زندگی سمجھو۔ حیاتِ جاودانی آخرت کی زندگی ہے، پس اس کی تیاری میں رہو۔

حدیث ــــــ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مربّع شکل بنائی۔ اور اس کے بیچ میں ایک لمبی لکیر کھینچی جو چوکھٹے سے باہر نکلنے والی تھی۔ اور چند چھوٹے خطوط بنائے جو اس درمیانی خط کی طرف متوجہ ہونے والے تھے۔ یہ چھوٹے خطوط اس خط کی جانب سے کھینچے جو درمیان میں تھا یعنی اس کے قریب کھینچے۔ اس طرح:



پھر لمبی لکیر کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: ''یہ انسان ہے'' اور چوکھٹے کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: ''یہ اس کی اجل (موت کا مقررہ وقت) ہے جو ہر چہار طرف سے اس کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور یہ خط جو باہر نکلا ہوا ہے وہ انسان کی امیدیں ہیں۔ اور یہ چھوٹے خطوط عوارض (آفات و بلیات) ہیں۔ اگر ایک سے بچ جاتا ہے تو دوسرا ڈس لیتا ہے اور دوسرے سے بچ جاتا ہے تو تیسرا ڈس لیتا ہے'' یعنی وہ ہر لمحہ موت کے منہ میں ہے۔ بلایا اس کی تاک میں ہیں۔ ایک سے بچ جاتا ہے تو دوسری دبوچ لیتی ہے، دوسری سے بھی بچ نکلتا ہے تو تیسری آگھیرتی ہے۔ بالآخر کوئی ایک جان لیوا ثابت ہوتی ہے، اور تمام آرزوئیں خاک میں مل جاتی ہیں (مشکوۃ حدیث ۵۲۶۸)

تشریح: آرزوئیں کوتاہ کرنے کا طریقہ نبی ﷺ نے یہ تجویز کیا ہے کہ زندگی کا مزہ کرکرا کرنے والی موت کو بکثرت یاد کیا جائے، گاہ گاہ قبرستان جایا جائے، اور ہم عصروں کی موت سے عبرت حاصل کی جائے۔

ومنها: قصر الأمل: وذلك: لأن الإنسان يَغلب عليه حبُّ الحياة، حتى يكره ذكرَ الموت، وحتى يرجو من طول الحياة شيئا لايبلغه، فإن مات من هذه الحالة عُذِّبَ بنزوعه إلى ما اشتاق إليه، ولايَجِدُه، وليس العمر فى نفسه مُبَغَّضًا، بل هو نعمة عظيمة.

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "كن فى الدنيا كأنك غريب، أو عابر سبيل" وخَطَّ خطًا مربَّعا، وخط خطًا فى الوسط خارجًا منه، وخط خُطَطًا صغاراً إلى هذه الذى فى الوسط، من جانبه الذى فى الوسط، فقال: "هذا الإنسان، وهذا أجلُه محيطٌ به، وهذا الذى هو خارجٌ: أملُه، وهذه الخطط الصغار: الأعراض، فإن أخطأه هذا، نهسه هذا، وإن أخطأه هذا نهسَه هذا"

وقد عالج النبى صلى الله عليه وسلم ذلك بذكر هاذم اللذات، وزيارة القبور، والاعتبار بموت الأقران. وقال صلى الله عليه وسلم: "لايتمنين أحدكم الموتَ، ولا يَدْعُ به قبلَ أن يأتيه، إنه إذا مات انقطع عمله".

ترجمہ: اورازانجملہ: امید کومختصر کرنا ہے۔اوروہ بات: اس لئے ہے کہ انسان پر غالب آجاتی ہے زندگی کی محبت، یہاں تک کہ وہ موت کا تذکرہ بھی ناپسند کرتا ہے اور یہاں تک کہ وہ امید باندھتا ہے زندگی کی درازی کی اتنی کہ وہ اس کو نہیں پہنچ سکتا۔پس اگر وہ اس حالت میں مرتا ہے تو سزادیا جاتا ہے اس کے مشتاق ہونے کی وجہ سے اس چیز کی طرف جس کا وہ مشتاق ہوا اور اس کو نہیں پایا ——— اور زندگی فی نفسہٖ قابلِ نفرت نہیں، بلکہ وہ نعمت عظمیٰ ہے (اس کے بعد دو حدیثیں جن میں امیدیں کوتاہ کرنے کا بیان ہے) اور تحقیق علاج کیا ہے نبی ﷺ نے اس کا (یعنی لمبی آرزوؤں کا) لذتوں کو توڑنے والی موت کو یاد کرنے اور زیارتِ قبور اور ہم عصروں کی موت سے عبرت پذیر ہونے کے ذریعہ ——— اور فرمایا: (اس حدیث کا تعلق اوپر سے ہے جہاں تقریر میں ذکر کی گئی ہے)

☆ ☆ ☆

۵- تواضع کا بیان

سماحت ہی کے باب سے تواضع (خاکساری) ہے۔اور وہ یہ ہے کہ آدمی گھمنڈ اور خود پسندی کے تقاضوں کے پیچھے اتنا نہ چلے کہ لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔کیونکہ یہ چیز نفس کو خراب کردیتی ہے اور لوگوں پر ستم ڈھانے اور ان کی تحقیر کرنے پر ابھارتی ہے۔درج ذیل روایات میں تواضع کا بیان ہے:

حدیث ——— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں ذرّہ بھر غرور ہے!" کسی نے دریافت کیا: آدمی کو اچھا لباس اور اچھا چپل پسند ہوتا ہے تو کیا یہ بھی غرور ہے؟ آپؐ نے فرمایا: "بیشک اللہ

پاک جمیل ہیں: وہ جمال کو پسند کرتے ہیں۔ تکبر: حق کو قبول نہ کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۵۱۰۸)

تشریح: اس حدیث میں دو ملتی جلتی چیزوں میں امتیاز کیا گیا ہے۔ ایک: جمال پسندی، جو مطلوب ہے۔ دوسری: خود پسندی، جو ممنوع ہے۔ اور خود پسندی یہ ہے کہ آدمی اپنی ہی چلائے، دوسرے کی بات خواہ وہ حق ہی کیوں نہ ہو، نہ سنے۔ اور میں میں ہی میں رہے، دوسرے کو قطعاً گھاس نہ ڈالے، یہی وہ گھمنڈ ہے جو دخولِ جنت میں مانع ہے

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تم کو بتاؤں کہ دوزخی کون ہے؟ ہر اکھڑ، بدخو اور مغرور شخص!'' (مشکوٰۃ حدیث ۵۱۰۶)

تشریح: ضد سے چیز پہچانی جاتی ہے۔ جب اکھڑ پن، بدخوئی اور غرور جہنم میں لے جانے والی صفات ہیں تو تواضع، فروتنی، خاکساری اور نرمی جنت میں لے جانے والی صفات ہیں۔

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کا واقعہ بیان کیا کہ وہ ایک خوشنما جوڑا زیب تن کئے ہوئے چلا جارہا تھا اور دل میں اترا رہا تھا، اس نے سر میں کنگھی کر رکھی تھی اور متکبرانہ چال چل رہا تھا کہ یکایک اللہ نے اسے زمین میں دھنسا دیا۔ پس وہ قیامت تک دھنستا ہی جارہا ہے (بخاری حدیث ۵۷۸۹)

۶ ـــ بردباری، وقار اور نرمی کا بیان

سماحت ہی کے باب سے بردباری، وقار اور نرمی ہے۔ تینوں کا ماحصل یہ ہے کہ آدمی غصہ کے تقاضے کی پیروی نہ کرے۔ جب کسی بات پر غصہ آئے تو جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئے، معاملہ کو سوچے اور عواقب پر نظر ڈالے پھر کوئی اقدام کرے۔ اور غصہ ہر حال میں برا نہیں۔ بے موقعہ غصہ ہی برا ہے۔ جو غصہ نفسانیت کی وجہ سے ہو یا جس غصہ میں آدمی حدودِ شرعیہ کا پابند نہ رہے وہی مذموم ہے۔ اور جو غصہ اللہ کے لئے اور حق کی بنیاد پر ہو، اور اس میں بھی حدود سے تجاوز نہ ہو تو وہ کمالِ ایمان کی نشانی اور سنتِ نبوی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ''پہلوان وہ نہیں جو مقابل کو پچھاڑ دے۔ شہ زور وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے اوپر قابو رکھے'' (مشکوٰۃ حدیث ۵۱۰۵)

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو آدمی نرمی کی صفت سے محروم کیا گیا، وہ ساری ہی خیر سے محروم کیا گیا'' (مشکوٰۃ حدیث ۵۰۶۹) یعنی لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آنا بڑی خوبی کی بات ہے، اتنی بڑی خوبی کہ جو اس سے محروم رہا وہ ہر بھلائی سے تہی دست رہ گیا!

حدیث ـــــ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: مجھے کوئی وصیت فرمایئے۔ آپؐ نے فرمایا: ''غصہ مت کیا کرو'' انھوں نے اپنی وہی درخواست بار بار دُہرائی، آپؐ نے ہر دفعہ یہی فرمایا کہ: ''غصہ مت کیا کرو!'' (مشکوٰۃ حدیث ۵۱۰۴)

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تمہیں ایسے شخص کی خبر نہ دوں جو دوزخ پر حرام ہے، اور جس پر

دوزخ کی آگ حرام ہے؟ ہر نرم مزاج، نرم طبیعت، لوگوں سے نزدیک اور نرم خو پر جہنم حرام ہے'' (مشکوۃ حدیث ۵۰۸۴)

تشریح: هَیِّن، لَیِّنْ اور سَهْل تینوں لفظ قریب المعنی ہیں اور نرم مزاجی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی نرم مزاج، خوش خو اور ملنسار ہو اور لوگ اس کو چاہتے ہوں وہ جنتی ہے، دوزخ کی آگ اس پر حرام ہے۔

۷- صبر کا بیان

سماحت کے مظنات میں سے صبر وشکیبائی بھی ہے۔ اور صبر یہ ہے کہ نفس: راحت وآسودگی، مقابلہ کے وقت گھبراہٹ، خواہش نفس، کبر وگھمنڈ، افشائے راز اور قطع مودّت جیسے تقاضوں کی تابعداری نہ کرے۔ اور انہی دواعی کے اختلاف سے صبر کے مختلف نام ہیں۔ سورۃ الزمر آیت ۱۰ میں ہے: ''صبر شعار لوگوں کو ان کا صلہ بے شمار ہی ملے گا'' اور حدیث شریف میں ہے: لن تُعْطَوا عطاءً خیرًا وأَوْسَعَ من الصبر: تم صبر سے بہتر اور وسیع تر کوئی عطیہ ہرگز نہیں دیئے گئے (بخاری حدیث ۶۴۷۰)

تشریح: صبر کے لغوی معنی ہیں: رُکنا اور روکنا۔ اور اصطلاحی معنی ہیں: نفس کو حدود شرعیہ کا پابند بنانا۔ پس طاعت پر نفس کو روکنا اور محارم سے باز رکھنا دونوں صبر ہیں۔ اور صابر وشاکر بندہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف کو لگائے رہتا ہے، اس لئے صبر بھی باب سماحت سے ہے۔

ومنها: التواضع: وهو: أن لا تتبع النفسُ داعيةَ الكبر والإعجاب، حتى يَزْدَرِيَ بالناس، فإن ذلك يُفسد نفسَه، ويُثير على ظلم الناس والازدراء. قال صلى الله عليه وسلم: "لايدخلُ الجنةَ من كان في قلبه مثقالُ ذرَّةٍ من كِبْرٍ" فقال الرجل: إن الرجل يحبُّ أن يكون ثوبُه حسنا، ونعلُه حسنةً؟ فقال: "إن الله جميل يحب الجمال، الكبرُ: بطرُ الحق وغَمْطُ الناس" وقال عليه السلام: "ألا أخبركم بأهل النار؟ كلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مستكبر" وقال عليه السلام: "بينما رجل يمشي في حلَّة تُعجبه نفسُه، مَرَجِّلٌ براسه، يختال في مِشيه، إذ خسف الله به، فهو يَتَجَلْجَلُ في الأرض إلى يوم القيامة"

ومنها: الحلم، والأناة، والرفق: وحاصلها: أن لايتبع داعيةَ الغضب، حتى يُرَوِّيَ، ويرى فيه مصلحةً، وليس الغضبُ مذمومًا في جميع الأحوال. قال صلى الله عليه وسلم: "من يُحْرَمِ الرفقَ يُحرمِ الخيرَ كلَّه" وقال رجل للنبي صلى الله عليه وسلم: أوصني، قال: "لاتغضب" فردد مرارًا، فقال: "لاتغضب" وقال صلى الله عليه وسلم: "ألا أخبركم بمن يحرم على النار؟

كل قريبٍ، هَيِّنٍ، لَيِّنٍ، سَهْلٍ" وقال عليه السلام:" ليس الشديد بالصُّرَعَةِ، إنما الشديد الذى يملك نفسَه عند الغضب"
ومنها : الصبر : وهو عدمُ انقياد النفس لداعية الدَّعَةِ، والْهَلَع، والشهوة، والبَطَر، وإظهار السر، وصَرْم المودة، وغير ذلك، فيسمّٰى بأسام حسب تلك الداعية. قال الله تعالى: ﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ وقال صلى الله عليه وسلم:" ما أوتى أحد عطاءً أفضلَ وأوسعَ من الصبر"

ترجمہ: اورازانجملہ : تواضع ہے۔اور تواضع یہ ہے کہ نہ پیچھے چلے نفس تکبر اور خود پسندی کے تقاضے کے۔ یہاں تک کہ نہ حقیر سمجھے وہ لوگوں کو۔ پس بیشک یہ چیز اس کے نفس کو بگاڑ دیتی ہے اور ابھارتی ہے لوگوں پر ظلم کرنے پر اور تحقیر کرنے پر (اس کے بعد احادیث ہیں) ـــــــ اورازانجملہ : بردباری، باوقاری اور نرمی ہیں۔اور تینوں کا ماحصل یہ ہے کہ نہ پیروی کرے آدمی غصہ کے تقاضے کی، یہاں تک کہ غور وفکر کرے اور غصہ کرنے میں مصلحت دیکھے، اور نہیں ہے غصہ برا ہر حال میں ـــــــ اورازانجملہ :صبر ہے۔اور صبر نفس کا تابعداری نہ کرنا ہے آسودگی، گھبراہٹ، شہوت، گھمنڈ، افشائے راز اور قطع تعلقات اور ان کے علاوہ کے تقاضے کی۔ پس نام رکھا جاتا ہے صبر اس داعیہ کے موافق ناموں کے ذریعہ (تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ ۱:۷۴ ۵)

☆ ☆ ☆

صفتِ عدالت کا بیان

نبی ﷺ نے عدالت کے مظنّات (احتمالی جگہوں) کا حکم دیا ہے، اور اس کے اہم ابواب کی اطلاع دی ہے۔اور آپؐ نے اللہ کی مخلوق کے ساتھ مہربانی کرنے کی خوبیاں بیان کی ہیں اور اس کی ترغیب دی ہے۔اور آپؐ نے عدالت کی اقسام کا تذکرہ فرمایا ہے۔ جو یہ ہیں: ۱-ایک گھر میں بسنے والے افراد میں الفت وائتلاف ۲- محلّہ والوں کے ساتھ معاشرت (مِل جُل کر زندگی بسر کرنا) ۳-بستی والوں کے ساتھ معاشرت ۴- بزرگانِ دین کی تعظیم ۵- لوگوں سے حسب مراتب برتاؤ کرنا ـــــ ذیل میں کچھ احادیث ذکر کی جاتی ہیں جو باب عدالت کی انواع کے لئے نمونہ کا کام دیں گی۔

حدیث (۱) ـــــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ظلم وستم سے بچو، کیونکہ ظلم قیامت کے دن گھپ اندھیرا ہوگا" (مسند احمد ۲:۹۲)

حدیث (۲) ـــــــ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر منیٰ کے میدان میں خطاب میں فرمایا: "تمہارے

خون، تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں: اللہ تعالیٰ نے تم پر ایسی قطعی حرام کی ہیں جیسی تمہارے اس دن کی حرمت، تمہارے اس مہینے میں اور تمہارے اس شہر میں'' پھر فرمایا: ''بھلے مانسو! خیال رکھنا۔ میرے بعد کافر نہ ہوجانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو!'' (بخاری حدیث ۴۴۰۳)

حدیث (۳) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں'' (مشکوۃ حدیث ۶)

حدیث (۴) ـــــ ابنُ اللُّتبِیَّۃ کے واقعہ میں رسول اللہ ﷺ نے خطابِ عام میں فرمایا: ''بخدا! اگر تم میں سے کوئی شخص اموالِ زکوٰۃ میں سے کچھ بھی ناحق لے گا تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملاقات کرے گا کہ وہ اس چیز کو اٹھائے ہوئے ہوگا۔ پس بخدا! میں تم میں سے ایک شخص کو پہچانونگا جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا اس حال میں کہ وہ اونٹ اٹھائے ہوئے ہوگا، جو بلبلا رہا ہوگا، یا گائے اٹھائے ہوئے ہوگا جو بول رہی ہوگی، یا بکری اٹھائے ہوئے ہوگا جو ممیارہی ہوگی'' (مسلم ۱۲: ۲۲۰ کتاب الامارۃ)

حدیث (۵) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے بالشت بھر زمین ہتھیائی، اس کو ساتوں زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا'' (بخاری حدیث ۲۴۵۳) اور اس کی وجہ کتاب الزکاۃ میں گذر چکی ہے (دیکھیں رحمۃ اللہ ۴:)

حدیث (۶) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان: مسلمان کے لئے عمارت کی طرح ہے، جس کا بعض بعض کو مضبوط رکھتا ہے'' پھر آپؐ نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کیا یعنی مسلمانوں کو اس طرح باہم وابستہ اور پیوستہ رہنا چاہئے (مشکوۃ حدیث ۴۹۵۵)

حدیث (۷) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمانوں کی حالت ایک دوسرے سے محبت کرنے میں، ایک دوسرے پر رحم کرنے میں اور ایک دوسرے پر مہربانی کرنے میں جسم کی مثال ہے۔ جب اس کا کوئی حصہ دردمند ہوتا ہے تو تمام (اعضائے) جسم ایک دوسرے کو دردمند عضو کے لئے شب بیداری اور تپ میں شریک ہونے کے لئے بلاتے ہیں'' (مسلم ۱۶: ۱۴۰)

حدیث (۸) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں کرتے'' (مسلم ۱۵: ۷۷ فضائل)

حدیث (۹) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اس کو مہلکہ میں ڈالتا ہے (یعنی دشمن کے ہاتھ میں نہیں پھنساتا) جو شخص اپنے بھائی کی حاجت روائی میں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی حاجت روائی میں ہوتے ہیں۔ اور جو کسی مسلمان سے کوئی غم (بے چینی) دور کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے اس غم کے بدل قیامت کے دن کے غموں میں سے کوئی غم دور کریں گے۔ اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی

پردہ پوشی فرمائیں گے‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۵۸)

حدیث (۱۰) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’سفارش کرو ثواب دیئے جاؤ گے، اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے ذریعہ جو چاہیں گے فیصلہ کریں گے‘‘ یعنی کوئی اپنی حاجت لے کر میرے پاس آئے تو اس کی سفارش کرو، بہ تقدیر الٰہی جو ہونا ہوگا: ہوگا، تم اپنا ثواب نہ کھوؤ (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۵۶)

حدیث (۱۱) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’دو شخصوں کے درمیان انصاف کرنا خیرات ہے، کسی کا سواری میں تعاون کرنا: اس کو اس پر بٹھالینا یا اس پر اس کا سامان اٹھالینا بھی صدقہ ہے اور ہر اچھی بات صدقہ ہے‘‘ (مسلم ۷: ۹۵ مشکوٰۃ حدیث ۱۸۹۶)

حدیث (۱۲) ـــــ ایک واقعہ میں کمزور صحابہ (سلمان وصہیب وبلال رضی اللہ عنہم) سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک بات کہی تھی، جس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’ابوبکر! شاید تم نے ان کو ناراض کردیا۔ بخدا! اگر تم نے ان کو ناراض کردیا تو یقیناً تم نے اپنے پروردگار کو ناراض کردیا‘‘ (مسلم ۱۶: ۶۶)

حدیث (۱۳) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’میں اور یتیم کی پرورش کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے‘‘ اور آپؐ نے شہادت کی اور بیچ کی انگلی سے اشارہ فرمایا، اور ان کے درمیان تھوڑی سی کشادگی رکھی‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۵۲)

حدیث (۱۴) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’بیوہ اور مسکین کی خبر گیری کرنے والا راہِ خدا میں سعی کرنے والے (خرچ کرنے والے) کی طرح ہے‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۵۱)

حدیث (۱۵) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’ان بیٹیوں سے جو آزمایا گیا (یعنی اس کے یہاں دختر تولد ہوئی) پس اس نے اس کے ساتھ حسن سلوک کیا (زندہ درگور نہیں کیا بلکہ اچھی طرح پالا پوسا) تو وہ اس کے لئے دوزخ سے پردہ ہوگی‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۴۹)

حدیث (۱۶) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’عورتوں کے ساتھ بہتر برتاؤ کی میری وصیت قبول کرو۔ کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں، اور پسلیوں میں سب سے کج اوپر کی پسلی ہے یعنی عورتیں نہایت کج پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔ پس اگر تم پسلی کو سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو اس کو توڑ بیٹھوگے (اور اس کا توڑنا طلاق ہے) اور اگر اس کو اسی حال پر رہنے دوگے تو ہمیشہ کج ہی رہے گی (اور تمہارا کام نکلتا رہے گا) پس عورتوں کے ساتھ بہتر برتاؤ کی وصیت قبول کرو (مشکوٰۃ حدیث ۳۲۳۸)

تشریح: اس حدیث میں نسوانی فطرت کی کجی کی تمثیل ہے۔ عورت کی تخلیق کا بیان نہیں ہے اور عوج (بالکسر) غیر محسوس کجی کو کہتے ہیں۔ جیسے رائے یا کلام کی کجی۔ اور تخلیق حوّاء رضی اللہ عنہا کی روایات منجملہ اسرائیلات ہیں۔ اور سورۃ النساء کی پہلی آیت میں جو ﴿وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ آیا ہے، اس کی تفسیر میں روح المعانی (۴: ۱۸۱) میں حاشیہ میں حضرت محمد باقر

رحمہ اللہ کا جو جلیل القدر تابعی ہیں، قول نقل کیا ہے: إنما خُلقتْ من فضلِ طِينَتِه یعنی آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد جو گوندھی ہوئی مٹی بچ گئی تھی، اس سے دادی حواء پیدا کی گئی ہیں۔ واللہ اعلم (یہ تشریح شارح کی ہے، شاہ صاحب کی نہیں ہے)

حدیث (۱۷) ـــــ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا: شوہر پر بیوی کا کیا حق ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''جب آپ کھائیں تو اسے بھی کھلائیں اور جب آپ پہنیں تو اسے بھی پہنائیں یعنی حسب ضرورت خورد ونوش اور لباس و پوشاک کا انتظام کریں۔ اور چہرہ پر نہ ماریں، اور قَبَّحَكِ الله (خیر سے محرومی کی بددعا) نہ کہیں۔ اور آپ اسے نہ چھوڑیں مگر گھر میں یعنی اگر کبھی ناراضگی ہو تو بھی اسی گھر میں لیٹیں (مشکوٰۃ حدیث ۳۲۵۹)

حدیث (۱۸) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب آدمی اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے، پھر وہ نہ آئے اور شوہر رات بھر ناراض رہے تو اس پر فرشتے صبح تک لعنت کرتے ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۲۴۶)

حدیث (۱۹) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عورت کے لئے جائز نہیں کہ (نفل یا واجب غیر معین) روزہ رکھے، جبکہ اس کا شوہر گھر پر موجود ہو، مگر اس کی اجازت سے۔ اور شوہر کے گھر میں کسی کو آنے کی اجازت نہ دے مگر اس کی اجازت سے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۳۱)

حدیث (۲۰) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ وہ کسی کو سجدہ کرے تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے'' یعنی شوہر کا عظیم حق ہے (مشکوٰۃ حدیث ۳۲۵۵)

حدیث (۲۱) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس عورت کا انتقال اس حال میں ہوا کہ اس کا شوہر اس سے خوش ہے تو وہ جنت میں جائے گی'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۲۵۶)

حدیث (۲۲) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایک دینار جو آپ راہِ خدا (جہاد) میں خرچ کریں، دوسرا دینار جو آپ غلام آزاد کرنے میں خرچ کریں، تیسرا دینار جو آپ کسی غریب کو خیرات دیں اور چوتھا دینار جو آپ اپنی بیوی پر خرچ کریں: ان میں سے زیادہ ثواب اس دینار کا ہے جو آپ نے اپنی بیوی پر خرچ کیا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۳۱)

حدیث (۲۳) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر مسلمان اپنی بیوی پر بہ امید ثواب کچھ خرچ کرے تو وہ خرچ کرنا اس کے لئے خیرات ہوگا'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۳۰)

حدیث (۲۴) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جبرئیل برابر مجھے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کرتے رہے، تا آنکہ مجھے خیال ہوا کہ اب وہ اس کو وارث بنائیں گے'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۶۴)

حدیث (۲۵) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ جب تم شوربا پکایا کرو تو پانی بڑھا دیا کرو اور اپنے پڑوسی کا خیال رکھو!'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۳۷)

حدیث (۲۶) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کا اللہ پر اور آخرت کے دن پر یقین ہو وہ اپنے پڑوسی کو نہ

ستائے‘‘ (بخاری حدیث ۶۰۱۸)

حدیث (۲۷) ــــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’بخدا! وہ مؤمن نہیں جس کا پڑوسی اس کی مصیبت (شر وفساد) سے مامون نہیں!‘‘ (بخاری حدیث ۶۰۱۶)

حدیث (۲۸) ــــــ ایک موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے ناتے سے فرمایا: ’’کیا تو راضی نہیں کہ میں اسے جوڑوں جو تجھے جوڑے، اور میں اُسے کاٹوں جو تجھے کاٹے ؟!‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۱۹) یعنی اللہ کی خوشی ناخوشی: صلہ رحمی اور قطع رحمی کے ساتھ وابستہ ہے۔

حدیث (۲۹) ــــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جو رزق میں کشادگی اور دیر تک نشاناتِ قدم میں بقا چاہتا ہے اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۱۸) یعنی صلہ رحمی سے رزق میں برکت ہوتی ہے، اور موت کے بعد بہت دنوں تک ذکر خیر باقی رہتا ہے۔

حدیث (۳۰) ــــــ رسول اللہ ﷺ نے کبیرہ گناہوں میں والدین کی نافرمانی کو بھی شامل کیا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۵۰) اور جس ترتیب سے آپؐ نے کبائر کا ذکر فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک کے بعد والدین کی نافرمانی اور ایذا رسانی کا درجہ ہے، قتل نفس کا درجہ بھی اس کے بعد ہے۔

حدیث (۳۱) ــــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’کبیرہ گناہوں میں شمار ہے: ماں باپ کو گالی دینا!‘‘ عرض کیا گیا: کیا ماں باپ کو بھی کوئی گالی دیتا ہے؟! آپؐ نے فرمایا: ’’ہاں! وہ دوسرے کے باپ کو گالی دیتا ہے، تو دوسرا اس کے باپ کو گالی دیتا ہے۔ اور وہ دوسرے کی ماں کو گالی دیتا ہے، تو دوسرا اس کی ماں کو گالی دیتا ہے۔ پس گویا اس نے خود اپنے والدین کو گالی دی (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۱۶ مسند احمد ۲: ۱۶۴)

حدیث (۳۲) ــــــ ایک صحابی حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا میرے ماں باپ کے مجھ پر کچھ ایسے حقوق ہیں جو ان کے مرنے کے بعد بھی مجھے ادا کرنے چاہئیں؟ آپؐ نے فرمایا: ’’ہاں! ان کے لئے رحمت کی دعا کرنا، ان کے لئے بخشش مانگنا، ان کا اگر کوئی عہد و پیمان کسی سے ہو تو اس کو پورا کرنا، ان کے تعلق سے جو رشتے ہیں ان کا لحاظ رکھنا اور ان کا حق ادا کرنا اور ان کے دوستوں کا احترام کرنا‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۳۶)

حدیث (۳۳) ــــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ کی تعظیم میں شمار ہے: (۱) بوڑھے مسلمان کی تعظیم کرنا (۲) اور اس عالم کی تعظیم کرنا جو دین میں غلو کرنے والا نہیں ہے یعنی دین کی غلط ترجمانی نہیں کرتا، اور نہ وہ دین سے دور (بے عمل) ہے (۳) اور انصاف پرور بادشاہ کی تعظیم کرنا‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۷۲)

حدیث (۳۴) ــــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑے کی بزرگی نہ پہچانے!‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۷۰)

حدیث (۳۵) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں کو ان کے مرتبوں میں اتارو'' یعنی اہل عزت اور شرفاء کی توقیر کرو (مشکوۃ حدیث ۴۹۸۹)

حدیث (۳۶) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے کسی کی بیمار پرسی کی، یا اپنے دینی بھائی کی ملاقات کی، تو ایک پکارنے والا اس سے پکار کر کہتا ہے: تو خوش ہو، اور تیرا چلنا دل پسند ہو اور تو نے جنت میں ٹھکانا بنالیا'' (ترمذی حدیث ۲۰۷۶)

یہ اور اِن جیسی اور حدیثوں میں صفتِ عدالت اور حسنِ معاشرت کی آگہی دی گئی ہے (ان روایات میں کوئی ترتیب ملحوظ نہیں)

وقد أمر النبى صلى الله عليه وسلم بمظانّ العدالة، ونَبَّهَ على معظَّم أبوابها، وبين محاسن الرحمة بخلق الله، ورغَّب فيها، وذكر أقسامَها: من تألُّفِ أهلِ المنزلة، ومعاشرةِ أهل الحيّ، وأهلِ المدينة، وتوقيرِ عظماء الملة، وتنزيلِ كلِّ واحد منزلَه؛ ونذكر من ذلك أحاديثَ، تكون أنموذَجًا لهذا الباب:

[١] قال صلى الله عليه وسلم: '' اتقوا الظلم، فإن الظلم ظلمات يوم القيامة''

[٢] وقال عليه السلام: '' إن الله حرم عليكم دماءكم وأموالكم، كحرمة يومكم هذا فى بلدكم هذا''

[٣] ''المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده''

[٤] ''والله! لا يأخذ أحد منكم منها شيئًا بغير حقه، إلا لقى الله يحمله يوم القيامة، فَلَأَعْرِفَنَّ أحدًا منكم لقى الله يحمِل بعيرًا، له رُغَاءٌ، أو بقرةً لها خُوار، أو شاةً تَيْعَرُ''

[٥] وقال: '' من ظلم قِيْدَ شبر من الأرض، طُوِّقَه من سبع أرضين'' وقد ذُكر سِرُّه فى الزكاة.

[٦] و'' المؤمن للمؤمن كالبنيان، يشدُّ بعضُه بعضًا''

[٧] '' مَثَلُ المؤمنين فى توادِّهم وتراحُمِهم وتعاطُفِهم مَثَلُ الجسد: إذا اشتكى منه عضوٌ، تداعى له سائِرُ الجسد بالسَّهَرِ والحُمّى''

[٨] '' من لايرحمِ الناسَ لايرحَمْهُ الله''

[٩] '' المسلم أخو المسلم، لايظلمه، ولايُسْلِمُه، من كان فى حاجة أخيه كان الله فى حاجته، ومن فَرَّج عن مسلم كُربةً، فَرَّج الله عنه بها كربة من كُرَبِ يوم القيامة، ومن ستر مسلما ستره الله يوم القيامة''

[١٠] '' اشْفَعُوْا تُؤْجَرُوْا، ويقضى الله على لسان نبيه ما أحبَّ''

[١١] وقال: ''تَعْدِلُ بين الاثنين صدقةٌ، وتُعينُ الرجلَ فى دابته، فَتَحْمِلُه عليها أو ترفَعُ له عليها

متاعَه: صدقة، والكلمة الطيبة صدقة"

[١٢] وقال فى ضعفاء المهاجرين:" لئن كنتَ أغْضَبْتَهم فقد أَغْضَبْتَ ربك"

[١٣] وقال:" أنا وكافلُ اليتيم فى الجنة هكذا" وأشار بالسبابة والوسطى.

[١٤] " الساعى على الأَرْمَلَةِ والمسكين كالساعى فى سبيل الله"

[١٥] "من ابتُلى من هذه البنات بشيئ، فأحسن إليهن، كنَّ له سترًا من النار"

[١٦] " استَوْصُوا بالنساء! فإن المرأة خُلقت من ضِلع، وإن أعوج مافى الضلع أعلاه: فإن ذهبتَ تقيمه كسرته"

[١٧] وقال فى حق الزوجة:" أن تُطعمَها إذا طعمتَ،وتكسُوَها إذا اكتسيتَ، ولا تضربِ الوجهَ، ولاتُقَبِّحْ، ولاتَهْجُرْ إلافى البيت"

[١٨] " إذا دعا الرجل امرأته إلى فراشه، فلم تأته، فبات غضبان عليها، لعَنتْها الملائكةُ حتى تُصبح"

[١٩] "لايحل لامرأة أن تصوم، وزوجُها شاهد، إلا بإذنه، ولاتأذنُ فى بيته إلا بإذنه"

[٢٠] "ولو كنتُ آمرًا أحدًا أن يسجد لأحد، لأمرتُ المرأةَ أن تسجد لزوجها"

[٢١] "أيما امرأة ماتت وزوجها عنها راض دخلت الجنة"

[٢٢] "دينار أنفقتَه فى سبيل الله، ودينار أنفقته فى رقبة، ودينار تصدَّقت به على مسكين، ودينار أنفقته على أهلك: أعظمُها أجرًا الذى أنفقتَه على أهلك"

[٢٣] " إذا أنفق الرجل على أهله نفقة يحتسبها فهو له صدقة"

[٢٤] " مازال جبريل يوصينى بالجار، حتى ظننت أنه سيورِّثه"

[٢٥] " يا أباذر! إذا طبخت مرقا فأكثر ماءَ ها، وتعاهَدْ جيرانَك"

[٢٦] " من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلايؤذِ جارَه"

[٢٧] "واللّهِ! لايؤمن الذى لايأمن جارُه بوائقه"

[٢٨] قال الله تعالى للرحم:" ألا تَرْضَيْنَ أن أَصِلَ من وصلكِ، وأَقْطَعَ من قطعكِ؟"

[٢٩] " من أحبَّ أن يُبْسَطَ له فى رزقه، ويُنْسَأ له فى أثره: فَلْيَصِلْ رحمه"

[٣٠] " من الكبائر عقوق الوالدين"

[٣١] " من الكبائر شتم الرجل والديه: يسب أبا الرجل فيسب أباه، ويسب أمه فيسب أمه"

[٣٢] سئل: هى بقى من بر أبويَّ شيئ أَبَرُّهما به بعد موتهما؟ فقال:" نعم! الصلاةُ عليهما،

والاستغفار لهما، وإنفاذُ عهدهما من بعدهما، وصلة الرحم التى لاتوصل إلا بهما، وإكرام صديقهما"

[۳۳] "وإن من إجلال الله إكرامُ ذى الشيبة المسلم،وحاملِ القرآن، غيرِ الْغَالِىْ فيه، والجافى عنه، وإكرامُ ذى السلطان المقسط"

[۳٤] " ليس منا من لم يرحم صغيرنا،ولم يعرف شرفَ كبيرنا"

[۳۵] " أنزلوا الناسَ منازلهم"

[۳٦] " من عاد مريضًا؛ أو زار أخاً له فى الله، ناداه منادٍ بأن طبتَ، وطاب ممشاك، وبَوَّئْتَ من الجنة منزلاً"

فهذه الأحاديث وأمثالها كلُّها تنبيه على خُلُق العدالة وحسن المشاركة.

نوٹ: احادیث کا ترجمہ اوپر گذر چکا اور باقی عبارت کا ترجمہ بھی واضح ہے۔

باب ــــــ ۴

احوال ومقامات کا بیان

احسان کے حصول کے بعد اس کے جو ثمرات وفوائد حاصل ہوتے ہیں وہی ''احوال ومقامات'' کہلاتے ہیں۔

وضاحت: سالک جب ذکر وفکر کے ذریعہ سیر الی اللہ شروع کرتا ہے تو اسے کچھ عارضی کیفیات پیش آتی ہیں، جیسے طرب وحزن اور بسط وقبض وغیرہ۔ یہی عوارض احوال کہلاتے ہیں۔ اور ذکر وفکر کے نتیجہ میں جو فوائد وثمرات حاصل ہوتے ہیں وہ مقامات کہلاتے ہیں:

حال: وہ عارضی کیفیت ہے جو سالک کے دل پر چھاتی ہے یا نفس میں پیدا ہوتی ہے۔ حال: غیر اختیاری اور آنی جانی ہوتا ہے۔ اس کو حال اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ پھر جاتا ہے، برقرار نہیں رہتا۔

مقام: وہ جمی ہوئی کیفیت (ملکہ) ہے جو ذکر وفکر سے پیدا ہوتی ہے۔ جیسے یقین اور اس کے شعبے: اخلاص وتوکل وغیرہ۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ احوال ومقامات سے متعلق روایات کی شرح دو مقدمات پر موقوف ہے: پہلا مقدمہ: عقل وقلب اور نفس کے اثبات میں اور ان کی ماہیات کے بیان میں ہے۔ اور دوسرا مقدمہ: لطائفِ ثلاثہ (عقل، قلب اور نفس) سے احوال ومقامات کے پیدا ہونے کی کیفیت کے بیان میں ہے۔

پہلا مقدمہ

لطائفِ ثلاثہ کا دلائلِ نقلیہ سے اثبات

اور

ان کی ماہیات کا بیان

لطائف: لطیفہ کی جمع ہے۔**لطیفہ**: لطیف کا مؤنث ہے۔**لطیف**: کے معنی ہیں: باریک۔ انسان کے جسم میں فہم کے اعتبار سے تین باریک (خفی) چیزیں ہیں، جو عقل، قلب اور نفس کہلاتی ہیں۔ یہ لطائفِ ثلاثہ: نقل، عقل اور تجربہ سے ثابت ہیں، اور عقلمندوں کا ان پر اتفاق ہے:

عقل کا نقل سے اثبات: آیات: (۱) سورۃ الرعد آیت ۴، سورۃ النحل آیت ۱۲، اور سورۃ الروم آیت ۲۴ میں ہے: ''بیشک ان امور میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں'' (۲) اور سورۃ الملک آیت ۱۰ میں اللہ تعالیٰ نے دوزخیوں کا قول نقل کیا ہے: ''اور کافر (فرشتوں سے) کہیں گے: اگر ہم سنتے یا عقل سے کام لیتے تو ہم اہلِ دوزخ میں سے نہ ہوتے''

احادیث: (۱) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے عقل کو پیدا کیا۔ پس اس سے فرمایا: سامنے آ۔ وہ سامنے آئی۔ فرمایا: پیٹھ پھیر، اس نے پیٹھ پھیری۔ فرمایا: میں تیرے ہی ذریعہ داروگیر کرونگا'' (کنز العمال حدیث ۷۰۵۷ و ۷۰۵۸ یہ روایت مختصر لکھی ہے) (۲) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آدمی کا دین اس کی عقل ہے، اور جس میں عقل نہیں اس میں دین نہیں'' (کنز العمال حدیث ۷۰۳۳) (۳) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جسے لُبّ (خالص عقل) کی روزی ملی وہ کامیاب ہوگیا'' (کنز العمال حدیث ۷۰۴۱)

یہ احادیث اگرچہ ضعیف ہیں، محدثین نے ان کی اسانید میں کلام کیا ہے۔ مگر عقل کے سلسلہ میں متعدد احادیث مختلف اسانید سے مروی ہے۔ جو باہم مل کر قوی ہوجاتی ہے (دیگر روایات کے لئے دیکھیں کنز العمال احادیث ۷۰۳۳ تا ۷۰۵۳ جلد ثالث، صفحہ ۳۷۹)

قلب کا نقل سے اثبات: آیات: (۱) سورۃ الانفال آیت ۲۴ میں ہے: ''اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ آڑ بن جاتے ہیں آدمی اور اس کے قلب کے درمیان'' (۲) اور سورۂ قٓ آیت ۳۷ میں ہے: ''اس میں اس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جس کے لئے قلب ہے یا وہ کان لگا کر دھیان سے بات سنتا ہے''

احادیث: (۱) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سنو! جسم میں ایک بوٹی ہے۔ جب وہ سنور جاتی ہے تو سارا جسم سنور

جاتا ہے۔اور جب وہ بگڑ جاتی ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے، سنو! وہ بوٹی قلب ہے'' (مشکوۃ حدیث ۲۷۶۲) (۲) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قلب کا حال: چٹیل زمین میں پڑے ہوئے پَر کی طرح ہے، جس کو ہوائیں پیٹھ سے پیٹ کی طرف پلٹتی ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۱۰۳)

نفس کا نقل سے اثبات: آیت: سورۃ حٰم السجدۃ آیت ۳۱ میں ہے: ﴿وَلَكُمْ فِيْهَا مَاتَشْتَهِيْ أَنْفُسُكُمْ﴾ اور تمہارے لئے اس (جنت) میں وہ ہے جس کو تمہارے نفوس چاہیں گے''

حدیث ـــــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نفس تمنا کرتا ہے اور خواہش کرتا ہے، اور شرمگاہ تصدیق یا تکذیب کرتی ہے'' (مشکوۃ حدیث ۸۶)

لطائف ثلاثہ کی ماہیات: مواقع استعمال کا جائزہ لینے سے لطائفِ ثلاثہ کی ماہیات درج ذیل معلوم ہوتی ہیں:

عقل: وہ چیز ہے جس کے ذریعہ انسان ان چیزوں کا ادراک کرتا ہے جن کا حواس ظاہرہ سے ادراک نہیں کیا جا سکتا۔

قلب: وہ چیز ہے جس کے ذریعہ انسان محبت کرتا ہے، بغض رکھتا ہے، پسند یا ناپسند کرتا ہے اور عزم وارادہ کرتا ہے۔

نفس: وہ چیز ہے جس کے ذریعہ انسان لذیذ کھانوں کی، مزیدار مشروبات کی اور دل پسند بیویوں کی خواہش کرتا ہے۔

﴿المقامات والأحوال﴾

اعلم أن للإحسان ثمراتٍ، تحصل بعد حصوله، وهي "المقامات والأحوال". وشرح الأحاديث المتعلقة بهذا الباب يتوقّف على تمهيد مقدِّمين: الأولى: في إثبات العقل والقلب والنفس، وبيانِ حقائقها. والثانية: في بيان كيفية تولُّد المقامات والأحوال منها.

﴿المقدِّمة الأولى﴾

اعلم أن في الإنسان ثلاثُ لطائفَ، تُسمى بالعقل، والقلب، والنفس؛ دلَّ على ذلك النقل، والعقل، والتجرِبة، واتفاق العقلاء.

أما النقل: فقد ورد في القرآن العظيم: ﴿إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾ وورد حكايةً عن أهل النار: ﴿لَوْكُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَاكُنَّا فِيْ أَصْحَابِ السَّعِيْرِ﴾

وورد في الحديث: "أولُ ما خلق الله تعالى العقلَ، فقال له: أقبل! فأقبلَ، وقال له: أدبر! فأدبر، فقال: بك أُؤَاخِذُ" وقال صلى الله عليه وسلم: "دينُ المرء عقلُه، ومن لا عقل له لادين له" وقال: "أفلح من رُزق لُبًّا" وهذه الأحاديث وإن كان لأهل الحديث في ثبوتها مقالٌ، فإن لها أسانيدَ يقوِّي بعضُها بعضًا.

وورد في القرآن العظيم: ﴿وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ﴾ وورد: ﴿إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ، أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ﴾

وفي الحديث: "ألا إن في الجسد مضغةً: إذا صلُحت صلُح الجسد، وإذا فسدت فسد الجسد، ألا وهي القلب" وورد: "مثل القلب كريشة في فلاةٍ، تقلِّبُها الرياح ظهرًا لبطن" وورد في الحديث: "النفس تتمنّٰى وتشتهي، والفرج يصدق ذلك ويكذبه"

ويُعلم من تَتَبُّع مواضع الاستعمال:

أن العقل: هو الشيئُ الذي يُدْرِكُ به الإنسانُ مالا يُدْرِك بالحواس.

وأن القلب: هو الشيئ الذي به يحب الإنسانُ، ويُبغض، ويَختار، ويَعْزِم.

وأن النفس: هو الشيئُ الذي به يَشتهي الإنسانُ ما يستَلِذُّه من المطاعم، والمشارب، والمناكح.

ترجمہ: مقامات واحوال: جان لیں کہ احسان کے لئے کچھ ثمرات ہیں جو احسان کے حصول کے بعد حاصل ہوتے ہیں، اور وہی مقامات واحوال ہیں۔ اور ان احادیث کی وضاحت جو اس باب سے تعلق رکھتی ہیں دو مقدموں کو تیار کرنے پر موقوف ہے: پہلا: عقل، قلب اور نفس کے اثبات میں، اور ان کی ماہیات کے بیان میں۔ اور دوسرا: ان سے مقامات واحوال کے پیدا ہونے کی کیفیت کے بیان میں ——— پہلا مقدمہ: جان لیں کہ انسان میں تین لطیفے (باریک باتیں) ہیں، جو عقل، قلب اور نفس کہلاتے ہیں۔ اس پر نقل، عقل، تجربہ اور عقلاء کا اتفاق دلالت کرتا ہے ——— رہی نقل: تو قرآن کریم میں آیا ہے الی آخرہ۔

☆ ☆ ☆

لطائفِ ثلاثہ کا دلیلِ عقلی سے اثبات

علم طب میں دلائل سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ بدنِ انسانی میں اعضائے رئیسہ تین ہیں: دل، دماغ اور جگر۔ اور ہر ایک کے لئے خدمتگار اعضاء ہیں: دل کی خدمت شرائین، دماغ کی خدمت اعصاب اور جگر کی خدمت اَوْرِدہ کرتے ہیں (نفیسی ۱:۶۹) انہی اعضاء کے ذریعہ وہ قُویٰ اور افعال پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہیں جو انسان کی صورتِ نوعیہ کا مقتضی ہیں۔ پس:

① ——— قوی ادراکیہ کا محل دماغ ہے اور دماغ میں عقل ہے۔ اور قوی ادراکیہ یہ ہیں:

(۱) تخیّل یعنی وہ قوت جس کے ذریعہ مادّی چیزوں کا ادراک وتصور کیا جاتا ہے، جیسے اشجار واحجار کا ادراک۔

(۲) توہّم یعنی دماغ کی وہ قوت جس کے ذریعہ غیر مادّی چیزوں کا ادراک وتصور کیا جاتا ہے، جیسے محبت وبغض کا ادراک (اور بعض کے نزدیک تخیل وتوہّم ایک ہی چیز ہیں یعنی خیال وگمان کرنا)

(۳) خیالی اور وہمی امور میں تصرف کرنا۔ یہ کام قوتِ متصرفہ کرتی ہے۔ وہ خزانہ خیال اور حافظہ میں جو صورتیں مجتمع ہوتی ہیں، ان میں سے بعض کو بعض سے جوڑتی، اور بعض کو بعض سے توڑتی ہے۔ جیسے زید کھڑا ہے یا نہیں ہے۔ یہ حکم زید اور قیام کے تصور کے بعد قوتِ متصرفہ لگاتی ہے۔

(۴) مجردات یعنی غیر مادی چیزوں کو کسی نہ کسی نہج سے بیان کرنا۔ یہ کام عقل کرتی ہے۔ اور کسی نہ کسی نہج کا مطلب: تمثیل، استعارہ یا کنایہ وغیرہ کے ذریعہ بیان کرنا ہے۔ جیسے معرفتِ حق کو بادہ وساغر کے پیرایہ میں بیان کرنا۔

(۲) —— اور غصہ، دلیری و بے باکی، جود وسخا، انتہائی بخل، خوشی و ناخوشی اور اس قسم کی دیگر باتوں کا محل دل ہے۔ اسی لئے یہ تمام افعال دل کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: خوش دلی اور بد دلی وغیرہ۔

(۳) —— اور جن چیزوں کے ساتھ یا ان کی ہم جنس چیزوں کے ساتھ جسم کا قوام وقیام وابستہ ہے، جیسے کھانا پینا، ان کی طلب کا محل جگر ہے، اور جگر میں نفس ہے۔

دلیل: اور مذکورہ اوصاف وافعال کے مذکورہ اعضاء کے ساتھ اختصاص کی دلیل یہ ہے کہ کبھی کسی آفت کی وجہ سے اعضاء رئیسہ میں سے کوئی عضو ماؤف ہوجاتا ہے، تو اس سے متعلق اوصاف وافعال میں خلل پڑجاتا ہے۔ دماغ ماؤف ہوجاتا ہے تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت میں فتور پیدا ہوتا ہے۔ دل آفت رسیدہ ہوتا ہے تو دلیری اور بے باکی میں کمی آجاتی ہے، اور جگر ضعیف ہوجاتا ہے تو اشتہاء ختم ہوجاتی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اوصاف وافعال ان اعضاء کے ساتھ خاص ہیں۔

تعاونِ باہمی اور خدّام کی احتیاج: اس کے بعد جاننا چاہئے کہ اعضاء رئیسہ میں سے ہر ایک کا کام باقی دو کی معاونت کے بغیر تکمیل پذیر نہیں ہوسکتا، مثلاً:

(۱) غصہ اس وقت بھڑکتا ہے اور جذبۂ مودت اس وقت موجزن ہوتا ہے، جب آدمی گالی کی برائی اور تعریف کی خوبی کا ادراک کرتا ہے۔ اور ادراک عقل کا کام ہے اور غصہ اور محبت کرنا دل کا فعل ہے، جو عقل کے تعاون سے انجام پاتا ہے۔

(۲) آدمی جو بات سوچتا ہے اس کا یقین اس وقت حاصل ہوتا ہے جب دل قوی ہو۔ قوتِ فیصلہ کمزور ہو تو آدمی مذبذب رہتا ہے۔ سوچنا عقل کا کام ہے، اور یقین کرنا دل کا فعل ہے، جو عقل کے تعاون سے تام ہوتا ہے۔

(۳) لذیذ کھانوں کی پہچان اور حسین عورتوں کی معرفت اور ان میں منافع کا تصور ہی طبیعت کو ان کی طرف مائل کرتا ہے۔ یہ معرفت عقل کا فعل ہے، اور میلان: نفس کا عمل ہے، جو عقل کی معاونت سے تکمیل پذیر ہوتا ہے۔

(۴) جب دل اپنے احکام بدن کی گہرائیوں میں نافذ کرتا ہے اور جسم کا انگ انگ بے تاب ہوتا ہے، تبھی آدمی مستلذّات کی تحصیل کی سعی کرتا ہے۔ بدن کے اجزاء کو بے تاب بنانا دل کا فعل ہے، اور مرغوبات کی تحصیل میں دوڑ دھوپ کرنا نفس کا کام ہے، جو دل کی معاونت ہی سے تکمیل پذیر ہوتا ہے۔

اسی طرح ہر عضو خدمت گاروں کا بھی محتاج ہے، مثلاً:

(۱) جب حواس: عقل کی خدمت بجالاتے ہیں، تبھی ہم محسوسات کا ادراک کرتے ہیں۔ مرئی کا تصور ہم اسی وقت کرتے ہیں جب آنکھ اس کو دیکھتی ہے۔ ادراک: عقل کا فعل ہے، مگراس کے لئے حواسِ ظاہرہ کے تعاون کی حاجت ہے۔ کیونکہ نظر وفکر امور معلومہ میں ہوتی ہیں، اور چیزیں معلوم: مشاہدہ ہی سے ہوتی ہیں۔ اور مشاہدہ: حواس کے تعاون کا محتاج ہے۔ جیسے حدوثِ عالم کا فیصلہ: عقل اسی وقت کرسکتی ہے، جب وہ عالم کی تغیر پذیری کو بخوبی جانتی ہو۔ اور یہ بات بدا ہۃً اسی وقت معلوم ہوسکتی ہے جب وہ اپنی آنکھوں سے دنیا کی بے ثباتی کا مشاہدہ کرے۔

(۲) اگر شرائین واعصاب درست نہ ہوں، جن پر قلب ودماغ کی درستی موقوف ہے، تو ان دونوں کے افعال درست نہیں ہوسکتے۔ پس معلوم ہوا کہ اعضاء رئیسہ بھی اپنے خدام سے تعاون حاصل کرتے ہیں۔

مثال سے وضاحت: اعضاء رئیسہ: دل ودماغ اور جگر: ایک دوسرے کے تعاون کے محتاج ہیں، اور خدام کی خدمتگاری کے بھی محتاج ہیں، تاہم ان میں سے ہر ایک اپنی مملکت کا بادشاہ ہے، اور اس کے دائرے میں اسی کی چلتی ہے۔ جیسے کسی بادشاہ کے پیش نظر کسی عظیم مقصد کی تکمیل ہو: وہ کوئی سنگین قلعہ فتح کرنا چاہتا ہو، تو وہ دوسرے بادشاہوں سے مدد طلب کرتا ہے۔ اور وہ لشکر وسپاہ، بکتروں اور توپوں سے تعاون کرتے ہیں، مگر جنگی مہمات کا منصرم وہی بادشاہ ہوتا ہے جس نے مدد مانگی ہے۔ حکم اور رائے اسی کی چلتی ہے۔ کمک میں آئی ہوئی فوج اور ان کے بھیجنے والے بادشاہ محض خادم اور معاون ہوتے ہیں۔ جو اس بادشاہ کے مشورہ پر چلتے ہیں۔ چنانچہ واقعات اسی طرح رونما ہوتے ہیں: جیسی اس بادشاہ کی صفاتِ غالبہ ہوتی ہیں۔ اگر وہ بہادر، بے باک، سخی اور انصاف پرور ہوتا ہے تو واقعات اور طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ بزدل، بخیل اور ظالم ہوتا ہے تو حالات اور طرح رونما ہوتے ہیں۔

پس جس طرح بادشاہوں، ان کی رایوں اور ان کی صفات کے اختلاف سے صورتِ حال مختلف ہوتی ہے، گو لشکر اور سامانِ حرب دونوں صورتوں میں ملتا جلتا ہے، اسی طرح جسم کے اعضاء رئیسہ بھی اگرچہ ایک دوسرے سے تعاون حاصل کرتے ہیں اور خدام سے بھی کام لیتے ہیں، مگران میں سے ہر ایک کا حکم اپنی مملکتِ بدن میں مختلف ہوتا ہے یعنی ہر عضو کا کام الگ ہے۔

حاصلِ کلام: وہ افعال جو اعضاء ثلاثہ سے صادر ہوتے ہیں، وہ متقارب (ملتے جلتے) ہوتے ہیں۔ مثلاً: عقل کے تمام کام یکساں ہوتے ہیں۔ اگر عقل ضعیف ہوتی ہے تو اس کے سارے کام تفریط (کوتاہی) کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اور اگر عقل قوی اور نہایت عالی ہوتی ہے، تو اس کے سارے کام افراط (زیادتی) کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اور اگر عقل اوسط درجہ کی ہوتی ہے، تو اس کے کام بھی افراط وتفریط کے بیچ میں ہوتے ہیں۔ اور اسی سے دل اور جگر کے احوال بھی جان لیں۔

پس جب جب ہم ان اعضاء کو ان کے افعالِ متقاربہ کے ساتھ خیال میں لائیں، اور ان کا ان مزاجوں کے ساتھ لحاظ کریں جو ان کے افعالِ متقاربہ کو دائما چاہتے ہیں تو یہی اعضاء: لطائف ثلاثہ ہیں، جن سے احسان میں بحث کی جاتی ہے۔ ان اعضاء سے مِن حیث ھی ھی (ان کے ساتھ کسی چیز کا لحاظ کئے بغیر) بحث نہیں کی جاتی۔ ایسی بحث تو علم

طب میں کی جاتی ہے۔

پس لطائف ثلاثہ کی صفات درج ذیل ہیں:

قلب کی صفات وافعال: غضب وغصہ، دلیری وبے باکی، مودت ومحبت، بزدلی وکم ہمتی، خوشی وناخوشی، قدیم محبت کا نباہ، بغض ومحبت میں تبدیلی، جاہ طلبی، جود وسخا، حرص وبخل اور بیم ورجاء۔

عقل کی صفات وافعال: یقین، شک، توہّم، ہر واقعہ کے لئے سبب کی جستجو اور جلب منفعت اور دفع مضرت کے لئے تدبیریں سوچنا۔

نفس کی صفات: لذیذ ماکولات ومشروبات کی حرص، عورتوں سے عشق اور اس کے مانند چیزیں۔

وأما العقل: فقد ثبت في موضِعه: أن في بدن الإنسان ثلاثةُ أعضاءَ رئيسيةٍ، بها تتم القوى والأفاعيلُ التي تقتضيها صورةُ نوع الإنسان.

فالقوى الإدراكية: من التخيُّل، والتوهم، والتصرفِ في المتخيلات والمتوهمات، والحكايةِ للمجردات بوجه من الوجوه: محلُّها الدماغ.

والغضبُ، والجرأةُ، والجود، والشح، والرضا، والسُّخْط، ومايشبهها، محلُّها القلبُ؛

وطلبُ مالايقوم البدن إلا به، أو بجنسه، محلها الكَبِد.

وقد يدلُّ فتورُ بعضِ القوى، إذا حدثت آفة في بعض هذه الأعضاء: على اختصاصها بها.

ثم إن فعلَ كلِّ واحد من هذه الثلاثة لايتم إلا بمعونة من الآخَرَيْنِ؛ فلولا إدراك مافي الشتم، أو الكلام الحسن: من القبح والحُسْنِ، وتوهمِ النفع والضرِّ: ماهاج غضبٌ ولاحب؛ ولولا متانةُ القلب لم يصر المتصوَّرُ مصدَّقا به؛ ولولا معرفةُ المطاعم والمناكح، وتوهمُ المنافع فيها لم يَمِلْ إليها الطبعُ؛ ولولا تنفيذُ القلبِ حكمَه في أعماق البدن لم يَسْعَ الإنسانُ في تحصيل مستَلَذَّاته؛ ولولا خدمةُ الحواس للعقل ما أدركنا شيئًا، فإن الكسبياتِ فرعُ البديهيات، والبديهياتِ فرعُ المحسوسات؛ ولولا صحةُ كل عضو من الأعضاء التي يتوقف عليها صحة القلب والدماغ لما كان لهما صحةٌ، ولا تَمَّ لهمافعل.

ولكن كل واحد منها بمنزلة مَلِكٍ اهتمَّ بأمر عظيم: من فتح قلعةٍ صعبةٍ أو نحوه؛ فاستمدَّ من إخوانه بجيوش، ودروع، ومدافعَ، وهو المدبِّرُ في فتح القلعة، وإليه الحكم، ومنه الرأيُ؛ وإنماهم خدم يمشون على رأيه، فجاءت صورُ الحوادثِ على حسب الصفات الغالبة في الملك: من جُرْأَتِه وجُبْنِه، وسخائه وبخله، وعدالته وظلمه؛ فكما يختلف الحال باختلاف

الملوك وآرائهم وصفاتهم، وإن كانت الجيوشُ والآلاتُ متشابهةً، فكذلك يختلف حكم كل رئيس من الرؤساء الثلاثة فى مملكة البدن.

وبالجملة: الأفاعيلُ المنبجسة من كل واحد من هذه الثلاثة، تكون متقاربةً فيما بينها: إما مائلةً إلى الإفراط، أو التفريط، أو قَارَّةً فيما بين هذا وذلك.

فاذا اعتبرنا هذه الهياكلَ الثلاثةَ مع أفاعيلها المتقاربة وأمزجتها التى تقتضى تلك الأفاعيل المتقاربة دائما، فهى اللطائفُ الثلاث التى يُبحث عنها، لا تلك القوى بذواتها من غير اعتبار شيئ معها.

فالقلب من صفاته وأفعاله: الغضبُ، والجرأة، والحب، والجبن، والرضا، والسخط، والوفاء بالمحبة القديمة، والتلوّن فى الحب والبغض، وحب الجاه، والجود، والبخل، والرجاء، والخوف.

والعقل من صفاته وأفعاله: اليقين، والشك، والتوهم، وطلب الأسباب لكل حادث، والتفكر فى حِيَلِ جلب المنافع ودفع المضار.

والنفس من صفاتها: الشَّرَهُ فى المطاعم والمشارب اللذيذة، وعشق النساء، ونحوُ ذلك.

ترجمہ: اور رہی دلیلِ عقل: پس اپنی جگہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انسان کے بدن میں تین اعضاء رئیسہ ایسے ہیں جن کے ذریعہ اُن قُویٰ (ادراکیہ) اور افعال کی تکمیل ہوتی ہے، جن کو نوعِ انسانی کی صورت چاہتی ہے —— پس قویٰ ادراکیہ یعنی تخیل اور توہّم اور خیالی اور وہمی امور میں تصرف کرنا، اور مجردات کو کسی نہ کسی نہج پر بیان کرنا: ان کا محل دماغ ہے —— اور غصہ اور دلیری اور سخاوت اور حرص اور خوشی اور ناخوشی اور وہ باتیں جو ان سے ملتی جلتی ہیں: ان کا محل قلب ہے —— اور اس بات کی طلب و جستجو جس کے ساتھ یا جس کی جنس کے ساتھ بدن کا قوام و قیام وابستہ ہے: اس کا محل جگر ہے —— اور بعض قویٰ کا فتور (خرابی) جب ان اعضاء میں سے کسی میں کوئی آفت پیدا ہوتی ہے: دلالت کرتا ہے ان صفات کے مختص ہونے پر ان اعضاء کے ساتھ۔

پھر بیشک ان میں سے ہر ایک کا فعل تام نہیں ہوتا مگر دوسرے دو کی معاونت سے، پس (۱) اگر نہ ہو اس برائی کا ادراک جو گالی میں ہے یا اس خوبی کا ادراک جو اچھی بات میں ہے، اور (نہ ہو) نفع و ضرر کا خیال تو نہیں بھڑکے گا کچھ غصہ اور نہ کچھ محبت (۲) اور اگر نہ ہو قلب کی مضبوطی تو نہیں ہوگی تصور کی ہوئی بات مانی ہوئی (۳) اور اگر نہ ہو کھانوں اور عورتوں کی پہچان، اور ان منافع کا خیال جو ان کھانوں اور عورتوں میں ہیں تو ان کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوگی (۴) اور اگر نہ ہو دل کا نافذ کرنا اپنا حکم بدن کی گہرائیوں میں تو نہیں دوڑ دھوپ کرے گا انسان اپنی مرغوبات کی تحصیل میں —— (۱) اور اگر نہ ہو حواس کی خدمت گذاری عقل کے لئے تو نہیں ادراک کر سکتے ہم کسی چیز کا۔ کیونکہ اکتسابیات بدیہیات کی شاخ ہیں یعنی نظر و فکر

امور معلومہ ہی میں ہوتی ہیں۔ اور بدیہیات محسوسات کی شاخ ہیں یعنی حواس کے ذریعہ جانی ہوئی چیزیں بدیہی ہوتی ہیں ——— (۲) اور اگر نہ ہوان اعضاء میں سے ہر عضو کی درستی، جن پر قلب ودماغ کی درستی موقوف ہے، تو نہیں ہوگی قلب ودماغ کے لئے درستگی، اور نہیں تام ہوگا ان دونوں کا کام۔

مگر ان اعضاء میں سے ہر ایک بمنزلہ اس بادشاہ کے ہے جو کسی بڑے معاملہ کا اہتمام کرتا ہے یعنی کسی سنگین قلعہ کو فتح کرنا یا اس جیسا کوئی اہم کام۔ پس وہ مدد طلب کرتا ہے اپنے برادروں سے یعنی دوسرے بادشاہوں سے لشکروں اور بکتروں اور توپوں کی، درانحالیکہ وہی انتظام کرنے والا ہے قلعہ کی فتح کا، اور اسی کی طرف حکم ہے اور اسی کی رائے چلتی ہے۔ اور وہ لوگ (جو بطور کمک آئے ہیں) خدام ہی ہیں، اور وہ اسی کی رائے پر چلتے ہیں۔ پس آتی ہیں واقعات کی صورتیں ان صفات کے موافق، جو اس بادشاہ میں غالب ہوتی ہیں یعنی اس کی دلیری اور اس کی بزدلی، اور اس کی سخاوت اور اس کی بخیلی، اور اس کا انصاف اور اس کا ظلم۔ پس جس طرح حالت مختلف ہوتی ہے بادشاہوں، اور ان کی رایوں اور ان کی صفات کے اختلاف سے، اگرچہ لشکر اور آلاتِ جنگ ملتے جلتے ہوتے ہیں، پس اسی طرح رؤساء ثلاثہ میں سے ہر رئیس کا حکم مختلف ہوتا ہے مملکتِ بدن میں۔

اور حاصل کلام: وہ افعال جو ان تین اعضاء میں سے ہر ایک سے پھوٹنے والے ہیں آپس میں متقارب ہوتے ہیں: یا تو افراط کی طرف مائل ہوتے ہیں، یا تفریط کی طرف یا اِس کے اور اُس کے درمیان میں ٹھہرنے والے ——— پس جب ہم ان تین جسموں (اعضاء ثلاثہ) کا ان کے ان افعال کے ساتھ جو کہ متقارب ہیں خیال کریں، اور ان کے ان مزاجوں کے ساتھ جو ان متقارب افعال کو دائماً چاہتے ہیں لحاظ کریں تو وہ لطائفِ ثلاثہ ہیں جن سے بحث کی جاتی ہے (سلوک واحسان میں) ان قُوی سے بحث نہیں کی جاتی فی نفسہا یعنی ان کے ساتھ کسی چیز کا لحاظ کئے بغیر ——— پس قلب کی صفات وافعال میں سے ہیں: غصہ، بے باکی، محبت، بزدلی، خوشی، ناخوشی، محبتِ قدیمہ کا نباہ، محبت وبغض میں رنگ بدلنا، جاہ طلبی، سخاوت، بخل، امید اور خوف ——— اور عقل کی صفات وافعال میں سے ہیں: یقین، شک، توہّم، ہر واقعہ کے لئے اسباب کی جستجو اور جلبِ منافع اور دفع مضرات کے لئے تدبیریں سوچنا ——— اور نفس کی صفات میں سے ہیں: لذیذ ماکولات ومشروبات کی حرص اور عورتوں سے عشق، اور ان کے مانند چیزیں۔

☆ ☆ ☆

تجربات سے لطائف کا اثبات

عقل ونقل سے لطائفِ ثلاثہ کے اثبات کے بعد اب لوگوں کے احوال کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس سے بھی عقل، قلب اور نفس کا پتہ چلتا ہے۔ کیونکہ جو بھی شخص افرادِ انسانی کا جائزہ لے گا: وہ یہ بات بالیقین جان لے گا کہ لوگ اپنی سرشت

میں ان لطائف میں مختلف ہیں۔ کسی کا قلب: نفس پر حاکم ہے تو کسی کا نفس: قلب پر حاوی:

پہلا شخص: جس کا قلب: نفس پر حاکم ہے: جب اس کو غصہ آتا ہے یا اس کے دل میں کسی بڑے منصب کی خواہش ہیجان پیدا کرتی ہے تو وہ اس کے سامنے بڑی سے بڑی لذت کو ہیچ سمجھتا ہے۔ وہ اس سے محرومی پر صبر کرتا ہے۔ اور اس کو چھوڑنے پر نفس سے ٹکر لیتا ہے۔

اور دوسرا شخص: جس کا نفس: قلب پر حاوی ہوتا ہے: جب اس کے سامنے خواہشِ نفس آتی ہے تو وہ زبردستی اس میں گھستا ہے، چاہے ہزار داغ کیوں نہ لگ جائیں۔ اور اگر اس کو کسی بلند منصب کی لالچ دی جاتی ہے یا ذلت ورسوائی سے ڈرایا جاتا ہے تو بھی وہ دل کی چاہت چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتا۔

پھر پہلا شخص اگر غیور (بہت غیرت مند آدمی) ہوتا ہے، اور اس کے سامنے کوئی ایسی عورت آتی ہے جو اس کو پسند ہوتی ہے، اور اس سے نکاح ممکن بھی ہوتا ہے۔ اور اس کا نفس اس سے نکاح کرنے کی دعوت بھی دیتا ہے، پھر بھی اس کے دل میں غیرت کے قبیل کی کوئی بات آتی ہے، اور وہ نکاح کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ یہی شخص کبھی بھوکا ننگا رہنا پسند کرتا ہے، مگر فطری خودداری کی وجہ سے کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتا۔

اور دوسرا شخص اگر لالچی ہوتا ہے۔ اور اس کے سامنے کوئی دل پسند عورت یا کوئی لذیذ کھانا آتا ہے، اور وہ حفظانِ صحت کے اصول سے یا عملی تجربہ سے جانتا ہے کہ وہ کھانا اس کے لئے سخت مضر ہے، اور اس عورت سے نکاح کرنے میں لوگوں سے اندیشہ ہے: تو وہ اولاً ڈرتا ہے، سہم جاتا ہے، اور باز رہتا ہے۔ پھر خواہش اس کو اندھا کر دیتی ہے۔ اور وہ دیدہ ودانستہ ورطۂ ہلاکت میں پڑتا ہے۔

اور کبھی یہی انسان مختلف جہتوں (دل کی جہت اور نفس کی جہت) کی طرف میلان پاتا ہے یعنی دل کچھ چاہتا ہے اور نفس کچھ۔ پھر ایک تقاضا دوسرے تقاضے پر غالب آتا ہے، اور وہ اس کے مقتضی پر چل پڑتا ہے۔ پھر چلتا ہی رہتا ہے۔ اور اس لائن کے اعمال اس سے سرزد ہوتے رہتے ہیں، تا آنکہ وہ ضرب المثل بن جاتا ہے۔ اگر وہ نفس کے تقاضوں پر چلا ہے تو اتباعِ ہوی اور قلت تحفظ (احتیاط) میں، اور دل کے فیصلہ پر چلا ہے تو ضبطِ نفس اور قوتِ تحفظ میں اس کی مثال دی جاتی ہے کہ فلاں جیسا بدچلن یا فلاں جیسا نیک سیرت!

اور تیسرا شخص: وہ ہے جس کی عقل: قلب ونفس پر غالب ہوتی ہے: یہ کھرا مؤمن ہے۔ اس کی محبت ونفرت اور اس کی خواہش شریعت کے حکم کے تابع ہوتی ہے۔ وہ جس چیز کا جواز، بلکہ استحباب جانتا ہے: اسی کو اختیار کرتا ہے۔ اور وہ جادۂ مستقیم سے قدم اِدھر اُدھر نہیں ہٹاتا۔

اور چوتھا شخص: وہ ہے جس پر ریت ورواج، حبِّ جاہ اور اپنی ذات سے عار ہٹانے کا جذبہ غالب آتا ہے تو وہ غصہ ضبط کرتا ہے۔ اور لوگوں کی کڑوی کسیلی باتیں سن لیتا ہے، حالانکہ اس کو غصہ بہت آتا ہے۔ اور وہ بزدل بھی نہیں ہوتا۔ تاہم

وہ خواہش کو چھوڑتا ہے تاکہ اس کے بارے میں ایسی ویسی بات نہ کہی جائے: جسے وہ پسند نہیں کرتا۔ اور اس کی بدنامی نہ ہو۔ اور اس کا منصب عالی محفوظ رہے۔

پس پہلا شخص درندوں کے ساتھ تشبیہ دیا جاتا ہے یعنی وہ خونخوار جانوروں کی طرح ہٹیلا سمجھا جاتا ہے۔ اور دوسرا شخص چوپایوں کے ساتھ تشبیہ دیا جاتا ہے، کیونکہ وہ جانوروں کی طرح ہر طرف منہ مارتا ہے۔ اور تیسرا شخص فرشتہ صفت انسان ہے۔ اور چوتھا با مروّت اور بلند حوصلہ کہلاتا ہے۔

پھر جائزہ لینے والے کو معمولی لوگوں میں ایسے افراد بھی ملیں گے جن میں کوئی دو قوتیں ایک ساتھ تیسری قوت پر غالب ہونگی۔ مثلاً: قلب اور نفس دونوں کا عقل پر غلبہ ہوگا۔ اور قلب اور نفس کے تقاضے اگرچہ الگ الگ ہیں مگر وہ باہم مصالحت کر لیتے ہیں، اس لئے کبھی قلب کی چلتی ہے تو کبھی نفس کی، اور عقل بے چاری دنگ رہ جاتی ہے۔

غرض: جب فہیم آدمی لوگوں کے احوال کو منضبط کرنا چاہے گا اور ان کی تفہیم کا قصد کرے گا تو وہ لطائفِ ثلاثہ کو ثابت کرنے کی طرف مجبور ہوگا۔ ان کو مانے بغیر اس کے لئے چارۂ کار ہی نہیں ہوگا۔

وأما التجرِبَة: فكل من استقرأ أفرادَ الإنسان علم لامحالة: أنهم مختلفون بحسب جبلتهم في هذه الأمور: منهم: من يكون قلبه هو الحاكم على النفس، و منهم: من تكون نفسُه هي القاهرةُ على القلب:

أما الأول: فإذا أصابه غضب، أو هاج في قلبه طلبُ منصبٍ عظيمٍ، يستهينُ في جنبه اللذّاتِ العظيمةَ، ويصبر على تركها، ويجاهد نفسَه مجاهدةً عظيمةً في تركها.

وأما الآخر: فإنه إذا عرضت له شهوةٌ اقتحم فيها، وإن كان هناك ألفُ عارٍ، ولايلتفت إلى ما يُرَغَّبُ فيه من المناصب العالية، أو يُرَهَّبُ منه من الذلّ والهوان.

وربما يبدو للرجل الغيور مَنْكَحٌ شهيٌّ، وتدعوا إليه نفسُه أشدَّ دعوة، فلايركن إليها لخاطرٍ هَجَسَ من قلبه من قبيل الغيرة؛ وربما يصبر على الجوع والعُرْي، ولايسأل أحدًا شيئًا، لِمَا جُبِلَ فيه من الأَنَفَةِ.

وربما يبدو للرجل الحريص منكح شَهِيّ، أومطعم هنيّ، ويعلم فيهما ضررًا عظيمًا: إما من جهة الطب، أو من جهة الحكمة العملية، أو من جهة سطوة بني آدم؛ فيخافُ ويرتَعِشُ ويرعَوِي، ثم يُعميه الهوى، فيقتحم في الورطة على علم.

وربمايُدرك الإنسان من نفسه نزوعًا إلى جهتين متخالفتين، ثم يغلب داعية على داعية، ويتكرر منه أفعال متشابهة على هذا النسق، حتى يُضرب به المثلُ: إما في اتباع الهوى وقلةِ

الحِفاظِ، وإما فی ضبط الهوی وقوة المُسْكَةِ.

ورجل ثالث: يغلب علقُه على القلب والنفس، كالرجل المؤمن حقَّ الإيمان، انقلب حبُّه وبغضه وشهوته إلى ما يأمر به الشرعُ، وإلى ما عَرَفَ من الشرع جوازَه، بل استحبابَه، فلا يبتغي أبدًا عن حكم الشرع حِوَلاً.

ورجل رابع: يغلب عليه الرسم، وطلبُ الجاه، ونفيُ العار عن نفسه، فهو يكظم الغيظ، ويصبر على مِرارة الشتم، مع قوة غضبه، وشدة جرأته؛ ويتركُ شهواتِه مع قوة طبيعته، لئلا يقال فيه: مالايحبه، ولئلا يُنسب إلى الشيئ القبيح، أو ليجدَ ما يطلبه من رفعة الجاه وغيره.

فالرجل الأول: يُشَبَّهُ بالسباع، والثانی: بالبهائم، والثالث: بالملائكة، والرابع يقال له: صاحبُ المروءة، وصاحب معالِی الهِمَم.

ثم يجدُ من عُرض الناس أفرادًا يغلب فيها قوَّتان معاً على الثالثة، ويكون أمرهما فيمابينهما متشابِها، ينال هذا من ذلك تارة، وذلك من هذا أخرى؛ فإذا أراد المستبصرُ ضَبْطَ أحوالِهم، والتعبيرَ عماهم فيه، اضطرَّ إلى إثبات اللطائف الثلاث.

ترجمہ: اور رہا تجربہ: پس ہر وہ شخص جو افرادِ انسانی کا جائزہ لے گا، وہ یقیناً جان لے گا کہ انسان جبلّی طور پر ان امور (لطائفِ ثلاثہ) میں مختلف ہیں۔ ان میں سے کوئی: وہ ہے جس کا دل نفس پر حاکم ہے۔ اور ان میں سے کوئی: وہ ہے جس کا نفس قلب پر غالب ہے ـــــ رہا پہلا شخص تو جب اس کو غصہ چڑھتا ہے یا اس کے دل میں کسی بڑے منصب کی خواہش ہیجان پیدا کرتی ہے تو وہ اس کے پہلو میں بڑی بڑی لذتوں کو ہیچ سمجھتا ہے، اور ان کے چھوڑنے پر صبر کرتا ہے۔ اور ان کے چھوڑنے میں اپنے نفس کے ساتھ بڑا مجاہدہ کرتا ہے ـــــ اور رہا دوسرا شخص: پس جب اس کے سامنے کوئی خواہش آتی ہے تو وہ اس میں زبردستی گھستا ہے، اگرچہ وہاں ہزار عار ہوں۔ اور ملتفت نہیں ہوتا ان بلند مناصب کی طرف جن کی وہ ترغیب دیا جاتا ہے یا اس ذلّت ورسوائی کی طرف جس سے وہ ڈرایا جاتا ہے ـــــ اور کبھی غیور آدمی کے لئے ظاہر ہوتا ہے نکاح کا پسندیدہ محل، اور اس کا نفس اس محل کی طرف بہت زیادہ بلاتا ہے، پس وہ اس کی طرف مائل نہیں ہوتا کسی ایسے امر کی وجہ سے جس کا اس کے دل میں خیال آتا ہے از قبیلِ غیرت ـــــ اور کبھی وہ بھوک اور عریانی پر صبر کرتا ہے، اور کسی سے بھی کوئی چیز نہیں مانگتا، اس خودداری کی وجہ سے جو اس کی سرِشت میں رکھی گئی ہے ـــــ اور کبھی حریص آدمی کے لئے نکاح کا پسندیدہ محل یا مرغوب کھانا ظاہر ہوتا ہے، اور وہ دونوں میں بڑا نقصان جانتا ہے از روئے طب یا از روئے حکمتِ عملیہ یعنی اپنے ذاتی تجربہ سے یا از روئے حملہ بنی آدم یعنی عورت کے خاندان یا پولس وغیرہ کا ڈر ہوتا ہے: تو وہ ڈرتا ہے اور لرزتا ہے اور باز رہتا ہے، پھر اس کو خواہش اندھا کر دیتی ہے، پس وہ ہلاکت میں زبردستی گھستا ہے، جاننے کے باوجود ـــــ اور کبھی

انسان اپنے نفس میں اشتیاق پاتا ہے دو متخالف جہتوں کی طرف، پھر ایک داعیہ دوسرے داعیہ پر غالب آتا ہے، اور بار بار پائے جاتے ہیں اس داعیہ سے: ملتے جلتے اعمال اسی انداز پر، یہاں تک کہ اس شخص کی مثال بیان کی جاتی ہے: یا تو خواہش کی پیروی میں اور نگہبانی کی کمی میں اور یا خواہش کے ضبط کرنے میں اور باز رہنے کی قوت میں۔

اور تیسرا شخص: اس کی عقل: قلب ونفس پر غالب ہوتی ہے، جیسے کھرا ایماندار آدمی۔ پلٹ جاتی ہے اس کی محبت اور اس کی نفرت اور اس کی خواہش اس چیز کی طرف جس کا شریعت حکم دیتی ہے، اور اس چیز کی طرف جس کا جواز وہ شریعت میں پہچانتا ہے، بلکہ اس کا استحباب جانتا ہے۔ پس نہیں چاہتا وہ کبھی بھی شریعت کے حکم سے پھرنا —— اور چوتھا شخص: غالب آتا ہے اس پر رواج اور جاہ طلبی اور اپنی ذات سے عار کو ہٹانا۔ پس وہ غصہ پی لیتا ہے اور گالی کی تلخی پر صبر کرتا ہے، اس کے غصہ کے قوی ہونے کے باوجود، اور اس کی دلیری کے سخت ہونے کے باوجود، اور چھوڑتا ہے وہ اپنی خواہشات کو اس کی طبیعت کی قوت کے باوجود، تاکہ نہ کہی جائے اس کے حق میں وہ بات جس کو وہ پسند نہیں کرتا، اور تاکہ نہ منسوب کیا جائے بری بات کی طرف یا تاکہ پائے وہ اس چیز کو جس کو وہ طلب کرتا ہے یعنی مرتبہ کی بلندی اور اس کے علاوہ —— پس پہلا شخص درندوں کے ساتھ تشبیہ دیا جاتا ہے، اور دوسرا چوپایوں کے ساتھ، اور تیسرا فرشتوں کے ساتھ اور چوتھا کہا جاتا ہے اس کو بامروت اور بلند حوصلہ —— پھر پاتا ہے جائزہ لینے والا معمولی آدمیوں میں سے ایسے افراد کو جن میں غالب ہوتی ہیں دو قوتیں ایک ساتھ تیسری قوت پر، اور ہوتا ہے ان دونوں قوتوں کا معاملہ باہم ملتا جلتا، کبھی حاصل کرتی ہے یہ اس سے اور کبھی وہ اس سے —— پس جب فہیم آدمی چاہے گا ان کے احوال کو منضبط کرنا اور اس چیز کو تعبیر کرنا جس میں لوگ ہیں یعنی لوگوں کے احوال کو سمجھانا چاہے گا تو وہ مجبور ہوگا لطائفِ ثلاثہ کے اثبات کی طرف۔

لغات: **هاج يهيج هيجًا وهيجانًا**: بھڑکنا، برانگیختہ کرنا...... **اِستَهَان به**: ہیچ سمجھنا، حقیر جاننا...... **الأنَفَة**: خودداری، اسم ہے از **أنف** (س) **أنفًا من العار**: خوددار ہونا...... **اِرْعَوى اِرْعَوَاء من الجهل**: رکنا، باز رہنا...... **الحِوَل**: زوال، انتقال۔ کہا جاتا ہے **لاحِوَلَ عنه** سورۃ الکہف آیت ۱۰۸ میں ہے: ﴿لَايَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلاً﴾ جنتی: جنت سے کہیں اور جگہ جانا نہیں چاہیں گے۔

تصحیح: **ثم يجد** اصل میں **لم يجد** تھا اور **على الثلاثة** اصل میں **على الثلاثة** تھا۔ یہ دونوں تصحیف ہیں، تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے اور مولانا سندھی رحمہ اللہ نے بھی کی ہیں۔

فائدہ: حکمتِ عملیہ سے یہاں مراد اپنا ذاتی تجربہ ہے **قوله: أو من جهة الحكمة العملية أى من جهة التجربة، وإنما سميت التجربة بالحكمة العملية لأنها تحصل بتكرار العمل مرة بعد مرة** (سندی رحمہ اللہ)

☆ ☆ ☆

عقلاء کے اتفاق سے لطائف کا اثبات

مختلف ادیان و مذاہب کے تمام وہ لوگ جو تزکیہ یعنی نفس کو سنوارنے کا اہتمام کرتے ہیں: لطائفِ ثلاثہ کے اثبات پر یا ان احوال و مقامات کے بیان پر جو ان لطائف سے تعلق رکھتے ہیں: متفق ہیں۔ یہ اتفاق بھی لطائف کے ثبوت کی ایک دلیل ہے۔

البتہ فلسفی فن تہذیب الاخلاق میں ان لطائف کے نام: نفسِ مَلَکی، نفسِ سَبُعی اور نفسِ بہیمی رکھتے ہیں۔ مگر اس تسمیہ میں گونہ تسامح ہے۔ کیونکہ ہر عقل: نفس ملکی نہیں ہے، بلکہ سنوری ہوئی عقل نفس ملکی ہے، اسی طرح ہر قلب نفس سبعی نہیں ہے، بلکہ بگڑا ہوا قلب نفس سبعی ہے۔ مگر چونکہ سنوری ہوئی عقل: عقل کا بہترین فرد تھی اور بگڑا ہوا ہونا قلب کا مشہور وصف تھا، اس لئے جزء کے ذریعہ اور مشہور وصف سے نام رکھ دیا ہے۔

اور صوفیا بھی ان لطائف ثلاثہ کو سنوارنے کا بہت زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔ البتہ وہ ان لطائف کے علاوہ دو اور لطیفے بھی ثابت کرتے ہیں، اور وہ ان دونوں کا ان تین لطائف سے بھی زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔ وہ دو لطیفے: روح اور سر ہیں۔

روح و سر کی حقیقت و اوصاف: اور روح و سر کی حقیقت یہ ہے کہ قلب کے دو رخ ہیں: ایک رخ: بدن اور اعضاء کی طرف مائل ہے، اس کو صوفیا قلب کہتے ہیں۔ اور دوسرا رخ: اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہے، جو مادّہ سے مجرد ہستی اور وجود محض ہے۔ قلب کے اس رخ کو صوفیاء ''روح'' کہتے ہیں۔ اسی طرح عقل کے بھی دو رخ ہیں: ایک رخ: بدن اور حواس ظاہرہ کی طرف مائل ہے، اس کو صوفیا عقل کہتے ہیں۔ اور دوسرا رخ: اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہے، عقل کے اس رخ کو صوفیا ''سِرّ'' کہتے ہیں۔ (سر: عربی میں راء کی تشدید کے ساتھ بمعنی راز اور بھید ہے اور اردو و فارسی میں راء کی تشدید کے بغیر مستعمل ہے) پس:

قلب کی صفت (خوبی): (۱) اللہ کی طرف اور طاعات کی طرف بے قرار کرنے والا شوق (۲) اور بے خودی کی حالت ہے۔

اور روح کی صفت: (۱) انسیّت (اللہ سے مہر و محبت) (۲) اور انجذاب (اللہ کی طرف کھنچ جانا) ہے۔

اور عقل کی صفت: ایسی باتوں کا یقین کرنا ہے جن کا ماخذ: انسانی علوم کے ماخذ سے قریب ہے۔ یعنی تمثیل و قیاس وغیرہ کے ذریعہ ان کو سمجھا جاسکتا ہے۔ جیسے (۱) مغیبات پر ایمان لانا۔ مثلاً جنت و جہنم، جن و ملائکہ، حشر و معاد وغیرہ کی تصدیق کرنا (۲) اور توحید افعالی یعنی ایک ہی ذات کو بندگی کا مستحق سمجھنا اور اس کی بندگی کرنا۔

اور سر کی صفت: ایسی باتوں کا مشاہدہ کرنا ہے جو علوم انسانی سے برتر و بالا ہیں، جو اس مجرد محض کی باتیں ہیں جو نہ زمانی ہے نہ مکانی، اور نہ اس کی کوئی تمثیل بیان کی جاسکتی ہے اور نہ اس کی طرف کوئی اشارہ کیا جاسکتا ہے۔ یعنی تجلیات کا مشاہدہ کرنا سر کی خاص دولت ہے۔

فائدہ: (۱) چونکہ شریعت عام انسانی علوم کے معیار پر نازل ہوئی ہے، مخصوص افراد کے احوال کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا،

اس لئے ان لطائف سے شریعت نے بہت زیادہ تفصیلی بحث نہیں کی، بلکہ ان مباحث کو پسِ پردہ کر دیا ہے یعنی اجمالاً ان کی طرف اشارے کئے ہیں۔

فائدہ: (۲) دنیا کے دیگر ادیان وملل والوں کے پاس بھی اس سلسلہ کے علوم ہیں۔ان کی کتابوں کا جائزہ لیا جائے اور کچھ فہم وفراست سے بھی کام لیا جائے تو ان کا پتہ چل سکتا ہے (یہ دونوں فائدے کتاب میں ہیں)

وإما اتفاق العقلاء : فاعلم أن جميعَ من اعتنى بتهذيب النفس الناطقة من أهل الملل والنِّحَلِ: اتفقوا على إثبات هذه الثلاث، أو على بيانِ مقاماتٍ وأحوالٍ تتعلق بالثلاث.

فالفيلسوف فى حكمته العمليةِ يُسميها: نفساً ملكية، ونفسا سبعية، ونفسًا بهيمية؛ وفى هذه التسمية نوع من التسامح، فَسَمَّى العقلَ بالنفس الملكية تسميةً بأفضل أفراده، وسمى القلبَ بالنفس السبعية، تسميةً بأشهر أوصافه.

وطوائف الصوفية ذكروا هذه اللطائفَ، واعتنوا بتهذيب كل واحدة، إلا أنهم أثبتوا لطيفتين أخريَيْن أيضًا، واهتموا بهما اهتماما عظيما، وهما الروح والسِّرُّ.

وتحقيقهما: أن القلب له وجهان: وجه يميل إلى البدن والجوارح، ووجه يميل إلى التجرد والصرافة؛ وكذلك العقل له وجهان: وجه يميل إلى البدن والحواس، ووجه يميل إلى التجرد والصرافة؛ فسموا ما يلى جانب السفل قلبا وعقلاً، وما يلى جانب الفوق روحًا وسرًا.

فصفة القلب: الشوقُ المُزْعِج، والوجد؛ وصفة الروح : الأنسُ والانجذاب؛ وصفة العقل: اليقين بما يقرب مأخذه من مأخذ العلوم العادية، كالإيمان بالغيب، والتوحيد الأفعالى؛ وصفة السر: شهودُ ما يَجِلُّ عن العلوم العادية، وإنما هو حكايةٌ مّا عن المجرد الصِّرْفِ، الذى ليس فى زمان ولامكان، ولايُوْصَف بوصفٍ، ولايُشار إليه بإشارة.

والشرع لما كان نازلاً على ميزان الصورة الإنسانية، دون الخصوصيات الفردية: لم يبحث عن هذا التفصيل كثيرَ بحث، وترك مباحثَها فى مِخْدَعِ الإجمال. وسائر الملل والنِّحَلِ أيضًا عندهم علمٌ من ذلك يُعرف بالاستقراء، مع نوع من التفطُّن.

ترجمہ: اور رہا عقل مندوں کا اتفاق: پس جان لیں کہ ملل وادیان والوں میں سے تمام وہ لوگ جو نفس ناطقہ کو سنوارنے کا اہتمام کرتے ہیں، متفق ہیں ان تین لطائف کے اثبات پر، یا اُن مقامات واحوال کے بیان پر جو لطائفِ ثلاثہ سے تعلق رکھتے ہیں —— پس فلسفی اپنی حکمتِ عملیہ میں ان لطائف کے نام رکھتا ہے: نفس ملکی اور نفس سبعی اور نفس بہیمی، اور

اس نام رکھنے میں گونہ تسامح ہے۔پس نام رکھا ہے فلسفی نے عقل کا نفس ملکی: نفس ملکی کے بہترین افراد کے ذریعہ نام رکھنے کے طور پر۔اور نام رکھا ہے قلب کا نفس سبعی: قلب کے اوصاف میں سے مشہورترین وصف کے ذریعہ نام رکھنے کے طور پر۔

اور صوفیا کی جماعت: انھوں نے یہ لطائف ذکر کئے ہیں۔اور انھوں نے ہر ایک کو سنوارنے کا اہتمام کیا ہے۔مگر وہ ان لطائفِ ثلاثہ کے علاوہ دو لطیفے اور بھی ثابت کرتے ہیں۔اور ان دونوں کا بہت زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔اور وہ دو لطیفے روح اور سر ہیں۔

اور ان دونوں کی حقیقت: یہ ہے کہ قلب کے دو رخ ہیں: ایک: بدن اور اعضاء کی طرف مائل اور دوسرا رخ: غیر مادّی ذات اور وجودِ محض کی طرف مائل۔اور اسی طرح عقل کے لئے بھی دو رخ ہیں: ایک: بدن اور حواس کی طرف مائل۔اور دوسرا رخ: غیر مادّی ذات اور وجودِ محض کی طرف مائل۔پس نام رکھا صوفیا نے جانب اسفل کا قلب و عقل اور اس جانب کا جو اوپر کی جانب ہے: روح اور سر۔

پس قلب کی حالت: (۱) بے قرار کرنے والا شوق (۲) اور بے خودی کی حالت ہے —— اور روح کی حالت: (۱) انسیّت (۲) اور انجذاب (کھنچ جانا) ہے —— اور عقل کی حالت: اس بات کا یقین کرنا ہے جس کا مأخذ: علوم عادیہ کے ماخذ سے قریب ہے۔جیسے مغیبات پر ایمان لانا اور توحیدِ افعالی —— اور سر کی حالت: اس بات کا مشاہدہ کرنا ہے جو علوم عادیہ سے برتر و بالا ہے، اور وہ بس اس مجرد محض کی کچھ نقل و حکایت ہی ہے جو نہ زمانی ہے، نہ مکانی، اور جو کسی وصف کے ساتھ متصف نہیں کی جاتی، اور نہ اس کی طرف کوئی اشارہ کیا جاتا ہے —— اور شریعت جبکہ اترنے والی تھی صورتِ انسانیہ کی ترازو پر، نہ کہ خصوصیاتِ فردیہ کے لحاظ پر تو نہیں بحث کی شریعت نے لطائف کی تفصیل سے بہت زیادہ بحث کرنا۔اور چھوڑ دیا ان کے مباحث کو اجمال کی کوٹھڑی میں —— اور دیگر ملل و مذاہب کے پاس بھی اس سلسلہ کا علم ہے، وہ جانا جا سکتا ہے جائزہ لینے سے، گونہ زیرکی کے ساتھ۔

لغات: النِّحَل: جمع ہے النِحْلة اور النُحْلة کی جس کے معنی دین اور ملت کے ہیں...... حکمتِ عملیہ سے مراد: اس کی ایک قسم فن تہذیب الاخلاق ہے (تفصیل کے لئے دیکھیں معین الفلسفہ ص ۱۳۱)...... مِخْدَع: گھر کے اندر کی کوٹھڑی۔

دوسرا مقدمہ

احوال و مقامات کا بیان

آئیڈیل انسان: یہ بات جان لینی چاہئے کہ انتہائی مضبوط عقل و جسم والا آدمی وہ ہے جس میں دو باتیں پائی جائیں: **ایک**: اس کا مادّہ نوعی احکام کو اپنے اندر ظہور کا کامل و مکمل موقع دے یعنی اس کا جسم کامل ہو۔خلقت کے اعتبار سے

اس میں کوئی نُقص اور عیب نہ ہو۔ایسا ہی انسان افرادِ انسانی کا سردار ہوتا ہے۔

دوسری: انسانوں کے ارتقاء کے لئے ایک آئین ودستور ہے، جس کے بارے میں سبھی لوگ جانتے ہیں کہ جو اس کی حدّ اعلی کو چھولیتا ہے وہی کامل انسان ہے۔ اور جو اس سے جس قدر فروتر رہ جاتا ہے، وہ اُسی قدر ناقص ہے۔

اور یہ دونوں باتیں کسی میں اس وقت جمع ہوتی ہیں جب دو باتیں پائی جائیں:

ایک: جب عقل: قلب پر غالب ہو، درانحالیکہ قلب نہایت قوی اور قُوی نہایت مضبوط ہوں یعنی ضُعفِ قلب وقُوی کی وجہ سے عقل غالب نہ ہو، بلکہ وہ اقوی اور اکمل ہونے کی بنا پر غالب ہو۔

دوسری: جب قلب: نفس پر حاوی ہو، درانحالیکہ نفس نہایت قوی اور اس کے تقاضے وافر ہوں۔ یعنی نفس پیر نہ ہو، جوان ہو اور اس کے ارمان بے شمار ہوں مگر دل اتنا قوی ہو کہ نفس پر کنٹرول کرلے۔

جس شخص میں یہ باتیں مجتمع ہوتی ہیں وہی تام اخلاق والا اور مضبوط فطرت والا ہے۔ اور اس سے وَرے بہت سی متفاوت درجات والی اصناف ہیں، جو شخص انسانوں کے احوال میں صحیح غور وفکر کرے گا، وہ ان اقسام کو جان لے گا۔

بہائم کا حال: اور بے زبان جانوروں میں بھی لطائفِ ثلاثہ: عقل وقلب ونفس پائے جاتے ہیں۔ مگر ان کی عقل اتنی ضعیف ہوتی ہے کہ قلب ونفس کے مقابلہ میں مغلوب ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ان کو احکام شرعیہ کا مکلّف نہیں بنایا گیا۔ اور نہ وہ ملأ اعلی تک پہنچ سکتے ہیں۔ سورہ بنی اسرائیل آیت ۷۰ میں ارشاد پاک ہے: ''اور بخدا! واقعہ یہ ہے کہ ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی، اور ان کو خشکی اور تری میں سواریاں عطا فرمائیں، اور نفیس چیزوں میں سے ان کو رزق دیا، اور اپنی بہت سی مخلوقات پر ان کو نمایاں فضیلت دی'' انسان کو یہ برتری اس کی وافر عقل اور کامل فہم کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ وہ اپنی خداداد عقل ہی کے ذریعہ حیوانات پر سواری کرتا ہے، اور ان میں سے نفیس کو کھاتا ہے۔ اگر بہائم میں بھی انسانوں کے بقدر عقل ہوتی تو وہ انسانوں کی دسترس سے باہر ہوجاتے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ حیوانات کی عقل ناقص ہے۔

مضبوط آدمی کی قسمیں: اور انتہائی مضبوط آدمی چار طرح کے ہوتے ہیں: سچا مؤمن، ولی صفت انسان، بے دین گمراہ شخص اور دین سے جاہل آدمی:

سچا مؤمن: وہ ہے جس کی عقل اُن عقائدِ حقّہ کی تابعدار ہو جو انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے ماخوذ ہیں، اور وہ ان حضرات نے عالم بالا سے حاصل کئے ہیں۔

ولی صفت انسان: وہ ہے جو ایمان میں پختگی کے ساتھ بلا واسطہ ملأ اعلی سے فیضیاب ہو، اس کو کمالاتِ نبوت سے حصہ ملا ہو۔ حدیث میں ہے: ''اچھا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۶۰۸ کتاب الرؤیا) یہی ملأ اعلی سے فیض یاب ہونا ہے۔

بے دین گمراہ: وہ شخص ہے جس کی عقل اُن عقائد باطلہ کی تابعدار ہو، جو باطل پرستوں سے ماخوذ ہیں۔

دین سے جاہل: وہ شخص ہے جس کی عقل قوم کے رواجات کی اور اپنے ذاتی تجربات کی تابعدار ہو۔

کتاب اللہ اور بیانِ مقامات کی ضرورت: جب صورتِ حال ایسی ہے جو اوپر بیان کی گئی تو اللہ کی حکمت میں دو چیزیں ضروری ہوئیں:

ایک: یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے شخص پر اپنی کتاب نازل فرمائیں جو لوگوں میں سب سے اچھی نشو ونما پانے والا ہو، جو عقل وجسم کا مضبوط ترین آدمی ہو، اور جو ملأ اعلیٰ سے بہت زیادہ مناسبت رکھنے والا ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ لوگوں کی توجہات اس شخصیت کی طرف پھیر دیں اور وہ اس کی پیروی کریں، اور ایک امت وجود میں آئے، جو چار دانگ عالم میں اس کتاب کا شہرہ پھیلائے تا کہ جسے برباد ہونا ہو وہ نشان آئے پیچھے برباد ہو، اور جسے زندہ ہونا ہو، وہ نشان آئے پیچھے زندہ ہو (سورۃ الانفال آیت ۴۲) یعنی نہ ماننے والوں کے لئے کوئی عذر باقی نہ رہے اور اللہ کی راہ اپنانے والوں کے لئے نشاناتِ راہ قائم ہو جائیں۔

حاصلِ کلام: جب آدمی اللہ کی کتاب پر، اور اللہ کے نبی ﷺ کی وضاحتوں پر ایسا مضبوط ایمان لے آئے کہ اس کے تمام قلبی اور نفسانی قوی اس ایمان کے تقاضوں پر چلنے لگیں، پھر وہ اللہ کی بندگی میں کماحقہ مشغول ہو جائیں: زبان ذکر میں زمزمہ سنج ہو، دل تفکر وتدبر میں منہمک ہو، اور اعضاء مسلسل عمل سے تھک رہے ہوں، اور آدمی مدتِ دراز تک اس پر مداومت کرے تو لطائف ثلاثہ اس عبادت سے اثر پذیر ہوں گے، اور مردہ روح میں جان پڑے گی۔ جیسے ایک تناور درخت پانی کی کمی سے مرجھایا ہوا ہو: جب اس کو خوب پانی دیا جاتا ہے تو اس کے جزء جزء میں سیرابی داخل ہوتی ہے، اور اس پر برگ وبار نمودار ہوتے ہیں۔ اسی طرح عبادت بھی عقل وقلب ونفس کو متأثر کرتی ہے اور ان کے نکمّے احوال کو برتر صفات سے بدل دیتی ہے، اور ان کی کایا ہی پلٹ جاتی ہے۔

احوال ومقامات: عبادت کی اثر پذیری سے لطائفِ ثلاثہ کو جو برتر صفات بدست آئی ہیں وہ:

(۱) اگر ملکاتِ راسخہ بن گئی ہیں، اور ان صفات سے اعمال ایک منہاج پر یا متقارب (ایک دوسرے سے نزدیک) منہاجوں پر مسلسل پائے جاتے ہیں تو ''وہ مقامات'' ہیں۔

(۲) اور اگر وہ صفات بجلی کی چمک کی طرح عارضی ہیں: جو کبھی ظاہر ہوتی ہے اور کبھی مٹ جاتی ہے، اور ابھی ان صفات کو استقرار حاصل نہیں ہوا، یا وہ صفات ایسی چیزیں ہیں جن کی شان میں سے استقرار نہیں ہے، جیسے خواب، غیبی آوازیں، غلبۂ حال اور کشف وغیرہ تو ''وہ صفات احوال واوقات'' ہیں۔

مقاماتِ عقل: (۱) عقل کا فطری مقتضی یہ ہے کہ وہ ان باتوں کی تصدیق کرے جو اس کی سمائی میں آجائیں۔ پس جب اس کو سنوار لیا جائے تو اس کا تقاضا یہ ہو جاتا ہے کہ وہ شریعت کی تعلیمات پر ایسا یقین کرلے کہ گویا آدمی ان باتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ جیسا کہ ایک متکلم فیہ روایت میں ہے کہ حضرت حارث بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ سے

نبی ﷺ نے حال دریافت کیا۔ انھوں نے جواب دیا: میں نے پکا مؤمن ہونے کی حالت میں صبح کی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''سوچو! کیا کہہ رہے ہو۔ کیونکہ ہر بات کی حقیقت ہوتی ہے، پس تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟'' انھوں نے جواب دیا: میں نے اپنے نفس کو دنیا سے بے رغبت کرلیا ہے۔ چنانچہ میں رات میں بیدار رہتا ہوں، دن میں پیاسا رہتا ہوں اور گویا میں اپنے رب کا عرش دیکھتا ہوں، درانحالیکہ وہ (قیامت کے دن) ظاہر ہونے والا ہے یعنی میدانِ قیامت کا منظر نگاہوں کے سامنے ہے۔ اور گویا میں جنتیوں کو دیکھ رہا ہوں: وہ جنت میں ایک دوسرے کی زیارت کررہے ہیں۔ اور گویا میں جہنم کو دیکھ رہا ہوں: جہنمی جہنم میں چیخ وپکار کررہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''اے حارث! تم نے پہچان لیا پس لازم رہو'' (مجمع الزوائد ۱: ۵۷ اصابہ ۱: ۲۸۹ ورواہ عبدالرزاق وابن ابی شیبۃ أیضاً)

(۲) اور عقل کا فطری مقتضی یہ بھی ہے کہ وہ نعمت ونقمت کے قبیل سے پیدا ہونے والے واقعات کے اسباب کو جانے یعنی وہ جو بھی رنج وراحت پیش آتی ہے اس کی وجوہ کو سوچتی ہے۔ پس جب اس کو سنوار لیا جائے تو اس کا تقاضا: توکل، شکر، رضا اور توحید ہوجاتا ہے یعنی اب وہ پیش آنے والے احوال میں اللہ ہی پر بھروسہ کرتی ہے۔ آدمی اچھے احوال پر شکر بجالاتا ہے۔ فیصلۂ خداوندی پر راضی رہتا ہے اور ایک ہی معبود سے لولگائے رکھتا ہے۔

قلب کا مقام: قلب کا اپنی اصل فطرت میں تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے مُنعم ومُربی سے محبت کرے، مخالف وبدخواہ سے نفرت کرے، ان چیزوں سے ڈرے جو اس کو تکلیف پہنچاتی ہیں اور ان باتوں کی امید رکھے جو اس کے لئے نفع بخش ہیں۔ پس جب اس کو ایمان ویقین سے سنوار لیا جائے تو اس کا تقاضا: محبتِ الٰہی، خوفِ عذاب اور ثواب کی امید ہوجاتا ہے۔

نفس کا مقام: نفس اپنے نشاط میں شہوات اور آسودگی میں منہمک رہتا ہے، پس جب اس کو سنوار لیا جائے تو اس کا مقتضی: توبہ، زُہد اور مجاہدہ ہوجاتا ہے۔

فائدہ: عقل وقلب ونفس کے مذکورہ بالا مقامات بطور مثال بیان کئے گئے ہیں۔ لطائفِ ثلاثہ کے مقامات ان میں منحصر نہیں۔ پس غیر مذکور کو مذکور پر قیاس کرنا چاہئے۔ اور احوال کو جیسے سُکر، غلبۂ حال، کھانے پینے سے عرصۂ دراز تک بے رغبتی، خواب اور غیبی آوازوں کو مقامات پر قیاس کرنا چاہئے یعنی مقامات ہی جب تک عارضی ہوتے ہیں احوال واوقات کہلاتے ہیں (یہ فائدہ کتاب میں ہے)

نوٹ: احوال ومقامات کی مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

المقدِّمة الثانية

اعلم: أن الرجل العتيك الذى مكَّنَتْ مادتُّه لظهور أحكام النوع فيها كاملاً وافرًا —— وهو رئيس أفراد الإنسان بالطبع —— والدُّستورَ الذى يعرف جميعُ الأفراد قربًا من الحد الأعلى

وبعدًا منه بالنظر إليه: هو الذى غلب عقلُه على قلبه، مع قوة قلبه وسُبوغ قواه، وَقَهَرَ قلبه على نفسه مع شدة نفسه ووفور مقتضياتها؛ فهذا هو الذى تمت أخلاقه، وقويت فطرته؛ ودونَه أصنافٌ كثيرة متفاوتة، يُظهرها التأملُ الصحيح.

وأما الحيوان الأعجم: ففيه القوى الثلاث أيضا، إلا أن عقلَه مغلوبُ قلبِه ونفسِه فى الغاية، فلم يستحقَّ التكليفَ، ولا لَحِقَ بالملأ الأعلى، وهو قوله تبارك وتعالى:﴿ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ، وَحَمَلْنَاهُمْ فِيْ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ، وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطِّيِّبَاتِ، وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلاً﴾

وهذا الرجلُ العتيك:

[١] إن كان عقلُه منقادًا للعقائد الحقَّةِ المأخوذةِ من الصادقين الآخذين عن الملأ الأعلى ـــ صلوات الله عليهم ـــ فهو المؤمن حقا.

[٢] وإن كان له مع ذلك سبيل إلى الملأ الأعلى، يأخذ عنهم بغير واسطة، ففيه شعبةٌ من النبوة، وميراثٌ منها، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" الرؤيا الصالحة جزء من ستة وأربعين جزءًا من النبوة"

[٣] وإن كان عقله منقاداً لعقائدَ زائغةٍ مأخوذةٍ من المضلين المبطلين، فهو الملحد الضال.

[٤] وإن كان عقله منقادًا لرسوم قومه، ولِمَا أدركه بالتجربة والحكمة العملية، فهو الجاهل لدين الله.

ولما كان الأمر على ذلك: وجب فى حكمة الله تعالى:

[١] أن يُنزل كتابا على أزكى خلق الله، وأَعْتَكِهم، وأَشبَهِهم بالملأ الأعلى، ثم يجمع عليه الآراءَ، حتى يصير أحكامُه من المشهورات الذائعة﴿ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ، وَيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ﴾

[٢] وأن يبين لهم هذا النبيُّ ـــ صلوات الله وسلامه عليه ـــ طرقَ الإحسان، والمقاماتِ التى هى ثمراتُه أتم بيان.

وبالجملة: إذا آمن الرجلُ بكتاب الله تعالى، وبما جاء به نبيه ـــ صلوات الله وسلامه عليه ـــ من بيانه، أيمانًا يستتبع جميعَ قواه القلبية والنفسية، ثم اشتغل بالعبودية حق الاشتغال، ذكرًا باللسان، وتفكراً بالجنان، وإِذْآبًا بالجوارح ، وداوم على ذلك مدةً مديدةً: شَرِبَ كلُّ واحد من هذه اللطائف الثلاث حظَّه من العبودية، وكان الأمر شبيها بالدَّوْحَةِ اليابسة، تُسْقَى الماءَ الغزير، فيدخلُ الرَّيُّ كلَّ غصن من أغصانها، وكلَّ ورق من أوراقها، ثم ينبت منها

الأزهارُ والثمارُ، فكذلك تدخل العبوديةُ فى هذه اللطائف الثلاث، وتُغيِّرُ صفاتِها الطبيعيةَ الخسيسةَ إلى الصفات الملكية الفاضلة.

فتلك الصفات:

[۱] إن كانت ملكاتٍ راسخةً، تستمرأ فاعيلُها على نهج واحد، أو أَنْهَاجٍ متقاربةٍ فهى المقامات.

[۲] وإن كانت بوارقَ، تبدو تارةً وتنمحى أخرى، ولَمَّا تستَقِرُّ بعدُ، أو هى أمور ليس من شأنها الاستقرارُ، كالرؤيا، والهواتف، والغلبة، تسمى أحوالاً وأوقاتا.

ولما كان مقتضى العقل فى غَلواء الطبيعة البشرية: التصديقُ بأمور تَرِدُ عليه مناسباتُها: صار من مقتضاه بعدَ تهذيبه: اليقينُ بماجاء به الشرعُ، كأنه يُشاهِدُ كلَّ ذلك عيانًا، كما أخبر زيد بن حارثة، حين قال له صلى الله عليه وسلم: " لكل حق حقيقةٌ، فما حقيقة إيمانك؟" فقال: كأنى أنظر إلى عرش الرحمن بارزًا.

ولما كان من مقتضاه أيضًا: معرفةُ الأسباب لِمَا يَحْدُثُ من نعمة ونقمةٍ: صار من مقتضاه بعدَ تهذيبه: التوكل، والشكر، والرضا، والتوحيد.

ولما كان من مقتضى القلب فى أصل الطبيعة: محبةُ المنعمِ المربّى، وبُغض المنافِرِ الشانِئِ والخوفُ عما يؤذيه، والرجاءُ لما ينفعه: كان مقتضاه بعدَ التهذيب: محبة الله تعالى، والخوفُ من عذابه، ورجاءُ ثوابه.

ولما كان من مقتضى النفس فى غَلواء طبيعتها: الانهماكُ فى الشهوات والدَّعَةِ: كان صفتُها عند تهذيبها: التوبةَ، والزهدَ والاجتهادَ.

وهذا الكلامُ إنما أردنا به ضربَ المثال. والمقاماتُ ليست محصورةً فيما ذكرنا، فَقِسْ غيرَ المذكور على المذكور، والأحوالَ كالسُّكر، والغلبة، والعُزُوْفِ عن الطعام والشراب مدةً مديدةً، وكالرؤيا والهاتف: على المقامات.

ترجمہ: دوسرا مقدمہ: جان لیں کہ وہ انتہائی مضبوط آدمی جس کے مادّے نے اپنے اندر نوع کے احکام کو ظاہر ہونے کا کامل ومکمل موقع دیا ہو —— اور وہ فطری طور پر انسان کے افراد کا سردار ہے —— اور وہ دستور جس کے متعلق انسان کے تمام افراد جانتے ہیں کہ حدِ اعلیٰ سے نزدیکی اور اس سے دوری: اس دستور کی طرف دیکھنے کے اعتبار سے ہے یعنی آئیڈیل آدمی وہ ہے جو اس دستور کی حدِ اعلیٰ کو چھولے، اور جو اس تک نہ پہنچ سکیں وہ ثانوی درجہ کے لوگ ہیں: ایسا شخص

وہی ہے جس کی عقل اس کے دل پر غالب ہو، اس کے قلب کی قوت اور اس کے قُوی کے کمال کے باوجود۔ اور اس کے قلب نے نفس کو مغلوب کرلیا ہو، اس کے نفس کے سخت اور اس کے تقاضوں کے زیادہ ہونے کے باوجود۔ پس یہی وہ شخص ہے جس کے اخلاق تام اور جس کی فطرت مضبوط ہے۔ اور اس سے وَرے بہت سی متفاوت اقسام ہیں، جن کو صحیح غور وفکر ظاہر کرتا ہے ——— اور رہا بے زبان جانور: تو اس میں بھی تین قُوی ہیں، مگر یہ بات ہے کہ اس کی عقل غایت درجہ اس کے قلب اور اس کے نفس کے سامنے مغلوب ہے۔ چنانچہ وہ مکلّف بنائے جانے کا حقدار نہیں ہوا، اور نہ وہ ملأ اعلی کے ساتھ ملا، اور وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:...... اور یہ انتہائی مضبوط آدمی: (۱) اگر اس کی عقل اُن عقائد حقہ کی تابعدار ہے جو ان سچوں سے لئے گئے ہیں جو ملأ اعلی سے لینے والے ہیں ——— ان پر اللہ کی بے پایاں رحمتیں نازل ہوں ——— تو وہ کھرا مؤمن ہے (۲) اور اگر اس کے لئے اس کے ساتھ ملأ اعلی کی طرف کوئی راہ ہے، وہ ان سے بلاواسطہ لیتا ہے تو اس میں نبوت کی ایک شاخ ہے اور نبوت کا ورثہ ہے، اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:...... (۳) اور اگر اس کی عقل اُن کج عقائد کی تابعدار ہے جو گمراہ باطل پرستوں سے لئے گئے ہیں تو وہ شخص بددین گمراہ ہے (۴) اور اگر اس کی عقل تابعدار ہے اپنی قوم کے رواجات کی اور اس بات کی جس کو اس نے تجربہ اور حکمتِ عملیہ کے ذریعہ پایا ہے، تو وہ اللہ کے دین سے ناواقف ہے (حکمتِ علمیہ سے بھی اپنا ذاتی تجربہ مراد ہے اور عطف تفسیری ہے)

اور جب معاملہ ایسا تھا تو اللہ کی حکمت میں ضروری ہوا: (۱) کہ وہ کوئی کتاب نازل فرمائیں اللہ کی مخلوق میں بہترین نشو ونما پائے ہوئے شخص پر، اور ان میں سے انتہائی مضبوط آدمی پر، اور ان میں سے سب سے زیادہ ملأ اعلی سے مشابہت رکھنے والے شخص پر۔ پھر اکٹھا کریں اس پر آراء کو، یہاں تک کہ ہو جائیں اس کے احکام مشہور ومعروف چیزوں میں سے "تاکہ ہلاک ہو جسے ہلاک ہونا ہے دلیل سے اور زندہ ہو جسے زندہ ہونا ہے دلیل سے" ——— (۲) اور یہ کہ بیان کرے یہ نبی ——— اس پر اللہ کی بے پایاں رحمتیں اور سلامتی نازل ہو ——— لوگوں کے لئے احسان کی راہیں اور ان مقامات کو جو کہ وہ احسان کی ثمرات ہیں کامل طور پر بیان کرنا۔

اور حاصلِ کلام: جب ایمان لائے آدمی اللہ تعالیٰ کی کتاب پر، اور ان باتوں پر جن کو اللہ کا نبی لایا ہے، قرآن کی تبیین وتشریح میں سے، ایسا ایمان لانا جو پیچھے چلنے کو کہے اس کے تمام قلبی اور نفسانی قُوی کو، پھر وہ بندگی میں مشغول ہو جائے جیسا کہ مشغول ہونے کا حق ہے: زبان سے ذکر کے طور پر، اور دل سے تدبر کے طور پر اور اعضاء سے لگاتار کوشش کرنے کے طور پر، اور وہ اس پر مداومت کرے مدتِ دراز تک: تو ان لطائفِ ثلاثہ میں سے ہر ایک بندگی میں سے اپنا حصہ پی لے گا۔ اور ہو جائے گا معاملہ اس بڑے سوکھے (مرجھائے ہوئے) درخت کے مشابہ جس کو بکثرت پانی دیا جاتا ہے تو سیرابی داخل ہوتی ہے اس کی ٹہنیوں میں سے ہر ٹہنی میں اور اس کے پتوں میں سے ہر پتہ میں۔ پھر اُگتے ہیں اس درخت سے پھول اور پھل۔ پس اسی طرح بندگی داخل ہوتی ہے ان لطائفِ ثلاثہ میں، اور بدل دیتی ہے ان کی فطری کمینی صفات کو

ملکوتی برتر صفات میں۔

پس وہ صفات: (۱) اگر ملکاتِ راسخہ ہوتی ہیں، اور مسلسل پائے جاتے ہیں ان صفات کے اعمال ایک ہی نہج پر یا مناہج متقاربہ پر تو وہ مقامات ہیں ——— (۲) اور اگر وہ صفات بجلی کی چمک ہوتی ہیں، جو کبھی ظاہر ہوتی ہے اور کبھی مٹ جاتی ہے، اور ہنوز ان کو قرار حاصل نہیں ہوا یا وہ ایسی چیزیں ہیں جن کے حال میں سے قرار نہیں ہے، جیسے خواب اور غیبی آوازیں، اور غلبۂ حال تو وہ احوال ومقامات کہلاتے ہیں۔

اور جبکہ تھا عقل کا تقاضا بشری فطرت کی جولانی میں ایسے امور کی تصدیق کرنا جن کی مناسبتیں اس (عقل) پر وارد ہوں یعنی جو عقل کی سمائی میں آجائیں تو ہوگیا عقل کے تقاضے میں سے اس کو سنوارنے کے بعد: ان باتوں کا یقین کرنا جن کو شریعت لائی ہے، اس طرح گویا وہ ان سب باتوں کو آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ جیسا کہ خبر دی زید بن حارثہ نے (یہ تسامح ہے۔ یہ واقعہ حارث بن مالک رضی اللہ عنہ کا ہے جو زمانۂ نبوت ہی میں شہید ہوگئے تھے) جب ان سے نبی ﷺ نے دریافت کیا: ''ہر برحق بات کی ایک واقعیت ہوتی ہے، پس تمہارے ایمان کی واقعیت کیا ہے؟'' پس انھوں نے جواب دیا: میں گویا اللہ تعالیٰ کے عرش کو دیکھ رہا ہوں درانحالیکہ وہ (میدانِ حشر میں) ظاہر ہونے والا ہے ——— اور نیز جب تھا عقل کے مقتضی میں سے اُن باتوں کے اسباب کو پہچاننا جو نعمت ونقمت کے قبیل سے نئی پیدا ہوتی ہیں تو اس کو سنوارنے کے بعد اس کے مقتضی سے ہوگیا: توکل، شکر، رضا اور توحید۔

اور جب تھی اصل فطرت میں قلب کے مقتضی میں سے: منعم ومربی کی محبت اور مخالف وبدخواہ کی نفرت، اور ان چیزوں سے ڈرنا جو اس کو تکلیف پہنچاتی ہیں اور ان باتوں کی امید رکھنا جو اس کے لئے نفع بخش ہیں: تو قلب کو سنوارنے کے بعد اس کا مقتضی تھا: اللہ کی محبت اور اس کے عذاب کا خوف اور اس کے ثواب کی امید ——— اور جبکہ تھا نفس کے مقتضی میں سے اس کی فطرت کی جولانی میں شہوات اور آسودگی میں منہمک ہونا تو اس کو سنوارنے کے بعد اس کے مقتضی میں سے ہوئی: توبہ، زُہد اور مجاہدہ (عبادات میں انتہائی جدوجہد)

اور یہ کلام: ہم نے اس کے ذریعہ مثال بیان کرنا چاہا ہے۔ اور مقامات ان میں منحصر نہیں ہیں جو ہم نے ذکر کئے ہیں۔ پس غیر مذکور کو مذکور پر قیاس کیجئے یعنی سمجھ لیجئے۔ اور احوال جیسے سُکر اور غلبۂ حال اور کھانے پینے سے عرصۂ دراز تک بے رغبتی اور جیسے ثواب اور غیبی آواز: ان کو مقامات پر قیاس کیجئے۔

لغات: العتيك: سخت، مضبوط العتيك من الأيام: سخت گرم دن۔ یہاں عتیک سے مراد الذی مکنت إلخ ہے...... الدستور کا عطف الرجل پر ہے...... بُعْدًا منه اور بالنظر إليه کی ضمیریں الدستور کی طرف لوٹتی ہیں...... الحكمة العملية یہاں بھی التجربة کے معنی میں ہے...... اِسْتَتْبَعَه: پیچھے چلنے کو کہنا...... أَدَّ أَبَه إِدْآبًا: تھکانا۔

☆ ☆ ☆

عقل کے مقامات

ایمان ویقین کا بیان

عقل کا اہم ترین مقام یقین ہے۔ اور یقین کی شاخیں: توحید، اخلاص، توکل، شکر، انسیّت، ہیبت، تفرید، صدیقیت اور محدَّثیت وغیرہ ہیں، جن کے شمار میں طوالت ہے۔

روایت — حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''صبر آدھا ایمان ہے، اور یقین سارا ایمان'' یہ روایت مرفوعاً بھی مروی ہے، مگر بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ محفوظ موقوف ہی ہے (درمنثور ۱:۶۶)

حدیث — ایک جامع دعا میں نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سے منقول ہے کہ: ''الٰہی! ہمیں وہ یقین عطا فرما جس سے ہم پر دنیا کی مصیبتیں آسان ہوجائیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۴۹۲)

تشریح: یقین کے معنی ہیں: مؤمن ان مغیبات کی تصدیق کرے جن کی شریعت نے خبر دی ہے، مثلاً: تقدیر ومعاد کے مسائل۔ اور یہ یقین اس کی عقل پر اس درجہ غالب آجائے کہ وہ اس سے لبریز ہوجائے، اور اس کے ترشحات اس کے قلب ونفس پر اتنے پڑیں کہ ایمانیات اس کے لئے مشہود ومحسوس ہوجائیں جیسا کہ حضرت حارث بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ کا حال ابھی گذر چکا ہے کہ ان کو میدانِ حشر اور آخرت کے مناظر آنکھوں سے نظر آنے لگے تھے۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یقین کو سارا ایمان اس لئے قرار دیا ہے کہ یقین عقل کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اور جب عقل سنور جاتی ہے تو قلب ونفس بھی سنور جاتے ہیں۔

اور عقل کے سنورنے سے قلب ونفس اس لئے سنور جاتے ہیں کہ جب یقین قلب پر غالب آجاتا ہے تو اس کی بہت سی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ مثلاً:

۱ — اب اس کا تقدیر پر ایمان پختہ ہوجاتا ہے۔ اب وہ ان باتوں سے نہیں ڈرتا جس سے لوگ عام طور پر ڈرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جو تکلیف اس کو پہنچی ہے، وہ نہ پہنچے ایسا ممکن نہیں۔ اور جو نہیں پہنچی وہ پہنچ جائے ایسا بھی ممکن نہیں۔ پھر وہ کسی بات سے کیوں ڈرے؟!

۲ — اور آخرت کے وعدوں پر اعتماد فزوں ہوجاتا ہے اور دنیا کی مصیبتیں اس کے لئے آسان ہوجاتی ہیں۔ کیونکہ اسے ان وعدوں پر اطمینان ہوتا ہے جو آخرت میں مصائب پر کئے گئے ہیں۔

۳ — اور اب وہ اسباب پر تکیہ نہیں کرتا، بلکہ وہ بہت سے اسباب کو ہیچ سمجھتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ ہی اپنے اختیار وارادہ سے عالم میں متصرف ہے، اور اسباب محض امور عادیہ ہیں یعنی عادتِ الٰہی یہ

جاری ہے کہ وہ ان اسباب پر مسببات کو مرتب فرماتے ہیں۔اس سے زیادہ اسباب کا مسببات میں دخل نہیں۔اس علم ویقین کی وجہ سے اُن چیزوں میں اس کی مساعی سست پڑ جاتی ہیں جن میں لوگ شب وروز لگے رہتے ہیں: محنتیں کرتے ہیں اور مشقتیں برداشت کرتے ہیں، کیونکہ وہ اسباب پر تکیہ کئے ہوئے ہیں اور مؤمن کی نظر میں زروسنگ یکساں ہوجاتے ہیں اس لئے وہ دنیا کے پیچھے جان نہیں دیتا۔

حاصل کلام: یہ ہے کہ جب یقین کامل ہوجاتا ہے اور وہ مضبوط ومستمر ہوتا ہے، اور اتنا پختہ ہوجاتا ہے کہ فقر وغنی اور عزت وذلت اس پر اثر انداز نہیں ہوتے، تو اس کی بہت سی شاخیں پھوٹتی ہیں۔جن کا بیان آگے آرہا ہے۔

وإذ فرغنا مما يتوقف عليه شرحُ أحاديث الباب حان أن نشرع فى المقصود، فنقول:

أصل المقامات والأحوال المتعلقة بالعقل: هو اليقين، وينشعب من اليقين: التوحيد، والإخلاص، والتوكل، والشكر، والأُنس، والهيبة، والتفريد، والصديقية، والمحدَّثية، وغيرُ ذلك مما يطول عَدُّه:

قال عبد الله بن مسعود: "اليقين الإيمان كله" ويُروى رفعُه. وقال صلى الله عليه وسلم: "وَاقْسِمْ لنا من اليقين ماتُهَوِّنُ به علينا مصائبَ الدنيا"

أقول: معنى اليقين: أن يؤمن المؤمن بما جاء به الشرعُ من مسئلة القدر ومسئلة المعاد، ويغلب الإيمان على عقله حتى يمتلئ عقلُه، ويترشح من عقله رشحات على قلبه، ونفسِه، حتى يصير المتيقن به كالمعايَنِ المحسوس.

وإنما كان اليقين هو الإيمان كلُّه: لأنه العمدةُ فى تهذيب العقل، وتهذيبُ العقل هو السبب فى تهذيب القلب والنفس.

وذلك: لأن اليقين إذا غلب على القلب انشعب منه شعب كثيرة، فلايخاف مما يخاف منه الناسُ فى العادة، علما منه بأن ما أصابه لم يكن ليخطئه، وما أخطأه لم يكن ليصيبه، ويَهُوْنُ عليه مصايبُ الدنيا اطمئنانا بما وُعد فى الآخرة، وتَزْدَرِى نفسُه بالأسباب المتكثرة: علما منه: بأن القدرة الوجوبية هى المؤثرة فى العالم بالاختيار والإرادة؛ وبأن الأسباب عاديةٌ، فَيَفْتر سعيُه فيما يسعى الناس فيه، ويَكِدُّون ويكدحون، فيستوى عنده ذهب الدنيا وحجرها.

وبالجملة: فإذا تم اليقين، وقوى واستمر، حتى ما يُغيِّره فقرٌ، ولا غِنٰى، ولاعِزٌّ، ولا ذُلٌّ: انشعب منه شعب كثيرة.

ترجمہ: اور جب ہم فارغ ہوگئے اُس بات سے جس پر باب (احوال ومقامات) کی احادیث کی شرح موقوف ہے تو وقت آگیا کہ ہم مقصود کو شروع کریں، پس ہم کہتے ہیں: عقل سے متعلق احوال ومقامات کی جڑ بنیاد یقین ہی ہے۔ اور یقین سے شاخیں نکلتی ہیں: توحید، اخلاص، توکل، شکر، اُنس، ہیبت، تفرید، صدیقیت، محدثیت اور ان کے علاوہ جن کے شمار میں طول ہے —— فرمایا ابن مسعودؓ نے کہ یقین سارا ایمان ہے، اور یہ روایت مرفوعاً بھی مروی ہے۔ اور فرمایا نبی ﷺ نے کہ ''ہمیں وہ یقین عطا فرما جس سے ہم پر دنیا کی مصیبتیں آسان ہوجائیں'' —— میں کہتا ہوں: یقین کے معنی یہ ہیں کہ ایمان لانے والا اُن باتوں کا یقین کرے جن کو شریعت لائی ہے یعنی تقدیر کا مسئلہ اور معاد کا مسئلہ۔ اور غالب آجائے یقین اس کی عقل پر تا آنکہ اس کی عقل لبریز ہوجائے۔ اور اس کی عقل سے قطرات مترشح ہوں اس کے قلب ونفس پر تا آنکہ ہوجائے وہ بات جس کا یقین کیا گیا ہے یعنی ایمانیات مانند آنکھوں سے دیکھی ہوئی محسوس چیز کی طرح۔

اور یقین ہی سارا ایمان اس لئے ہے کہ وہ عقل کو سنوارنے میں بنیادی چیز ہے۔ اور عقل کو سنوارنا ہی سبب ہے قلب ونفس کو سنوارنے کا —— اور وہ بات یعنی عقل کی اصلاح: قلب ونفس کی اصلاح کا باعث اس لئے ہے کہ جب یقین قلب پر غالب آجاتا ہے تو اس سے بہت سی شاخیں پھوٹتی ہیں، پس (۱) وہ ان باتوں سے نہیں ڈرتا جس سے لوگ عادۃً ڈرا کرتے ہیں، اپنی طرف سے یہ بات جاننے کی وجہ سے کہ جو بات اس کو پہنچی ہے وہ اس کو چوک ہی نہیں سکتی۔ اور جو چیز اس کو چوک گئی ہے وہ اس کو پہنچ ہی نہیں سکتی (۲) اور آسان ہوجاتی ہیں اس پر دنیا کی مصیبتیں، اس بات پر اطمینان کرنے کی وجہ سے جس کا آخرت میں وعدہ کیا گیا ہے (۳) اور اس کا نفس حقیر سمجھتا ہے بہت سے اسباب کو، اپنی طرف سے یہ بات جاننے کی وجہ سے کہ واجب تعالیٰ کی قدرت ہی عالم میں اختیار وارادے سے مؤثر ہے اور یہ بات جاننے کی وجہ سے کہ اسباب عادیہ ہیں۔ پس سست پڑجاتی ہے اس کی کوشش ان چیزوں میں جن میں لوگ سعی کرتے ہیں اور محنتیں اٹھاتے ہیں اور مشقتیں برداشت کرتے ہیں۔ پس اس کے نزدیک دنیا کا سونا اور اس کا سنگریزہ یکساں ہوجاتا ہے —— اور حاصل کلام: پس جب یقین کامل ہوجاتا ہے اور مضبوط ومستمر ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ نہیں تبدیلی کرتی اس میں محتاجی اور نہ مالداری اور نہ عزت اور نہ ذلت تو پھوٹتی ہیں اس سے بہت سی شاخیں (جن کا بیان آگے آرہا ہے)

☆ ☆ ☆

یقین کی شاخوں کا بیان

ابھی بیان کیا گیا کہ ایمان ویقین کی بہت سی شاخیں ہیں۔ شاہ صاحب قدس سرہ نے اس کی نو شاخیں بیان کی ہیں، جو یہ ہیں: شکر، توکل، ہیبت، حسن ظن (اُنس) تفرید، اخلاص، توحید، صدیقیت اور محدَّثیت۔ سب کی تعریفات اپنے مواقع پر آرہی ہیں۔

شکر و سپاس کا بیان

شکر و سپاس کے معنی ہیں: بہتر سلوک پر تعریف کرنا۔ اور ایمان ویقین سے شکر گزاری کا جذبہ اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ جب بندہ دیکھتا ہے کہ وہ تمام ظاہری اور باطنی (روحانی) نعمتیں جو اس کو حاصل ہیں، وہ سب باری تعالیٰ کی طرف سے پہنچی ہیں، تو اس کے دل میں نعمتوں کے شمار کے بقدر محبتِ باری تعالیٰ پیدا ہوتی ہے، اور قلب میں حمد وثنا کا داعیہ ابھرتا ہے۔ یہی شکر گزاری ہے۔ پھر جب بندہ خود کو شکر کی بجا آوری سے عاجز پاتا ہے تو وہ پاش پاش اور نابود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور اعترافِ عجز کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ یہ شکر گزاری کا اعلیٰ درجہ ہے۔

شکر گزار بندوں کی فضیلت اور اس کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن جنت میں سب سے پہلے بے حد حمد کرنے والوں کو بلایا جائے گا۔ یہ وہ بندے ہیں جو ہر حال میں: خوش حالی میں بھی اور تنگ حالی میں بھی اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتے ہیں'' (مستدرک حاکم ۱:۵۰۲ مشکوٰۃ حدیث ۲۳۰۸)

تشریح: ہر حال میں حمد کرنے والوں کو جنت میں سب سے پہلے دو وجہ سے بلایا جائے گا:

پہلی وجہ: ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرنا اس بات کی علامت ہے کہ حامد کی عقل اور اس کا قلب باری تعالیٰ کے منقاد و تابعدار ہو گئے ہیں یعنی یہ تابعداری کا صلہ ہے۔

دوسری وجہ: نعمتوں کو نعمتیں سمجھنے سے اور ان کے فیضان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جاننے کی وجہ سے حمد کرنے والوں میں ایک قوت پیدا ہوتی ہے، جو عالم بالا کی چیزوں پر اثر انداز ہوتی ہے، اور اس قوت سے عالم آخرت کے قُویٰ اور اجسام متأثر ہوتے ہیں۔ پس جس طرح مقبول دعا بابِ کرم کو کھٹکھٹاتی ہے: تفصیل سے نعمتوں کو جاننا اور ان کے فیضان کو مُنعم تعالیٰ کی طرف سے ماننا بھی جود وکرم کے باب کو وا کرتا ہے۔

اور شکر گزاری کے لئے موجودہ نعمتوں کی تفصیلات جاننا کافی نہیں۔ شکر گزاری اس وقت تک تام نہیں ہو سکتی جب تک آدمی اپنی گذشتہ زندگی کو یاد نہ کرے۔ اور ماضی میں اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حیرت زا معاملات کو یاد نہ کرے۔ سورۃ الضحیٰ آیات ۶-۸ میں اللہ پاک نے رسول اللہ ﷺ کو آپؐ کی زندگی کے گذشتہ واقعات یاد دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: ''کیا اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو یتیم نہیں پایا، پس آپؐ کو ٹھکانا دیا؟ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین سے بے خبر پایا، پس آپؐ کو رستہ بتلایا اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو نادار پایا، پس آپؐ کو بے نیاز کر دیا''

اور روایت میں آیا ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس حج سے واپس لوٹے جس کے بعد آپ نے حج نہیں کیا،

اور ضَجْنان میدان سے گذرے تو اپنا زمانۂ ماضی یاد کر کے فرمایا: ''تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔ اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ جس کو جو چاہتے ہیں دیتے ہیں۔ بخدا! میں اس میدان میں اپنے ابّا خطاب کے اونٹ چرایا کرتا تھا۔ وہ تند خو سخت مزاج تھے۔ میں کام کرتا تو مجھے تھکا دیتے اور کوتاہی کرتا تو مارتے۔ اور اب میرا صبح و شام یہ حال ہے کہ میرے اور خدا کے درمیان کوئی نہیں جس سے میں ڈروں!'' (استیعاب برحاشیہ اصابہ ۲:۴۷۲ تذکرہ حضرت عمرؓ)

منها: الشكر، وهو: أن يرى جميعَ ما عنده من النعم الظاهرة والباطنة فائضةً من بارئه جلّ مجدُه، فيرتفع بعدد كل نعمة محبةٌ منه إلى بارئه، ويرى عَجْزَه عن القيام بشكره، فيضمحل ويتلاشى فى ذلك.

قال صلى الله عليه وسلم: '' أول من يُدعى إلى الجنة الحمَّادون الذين يحمَدون الله تعالى فى السراء والضراء''

أقول: وذلك: لأنه آيةُ انقياد عقله وقلبِه لليقين ببارئه، ولأن معرفةَ النعم ورؤيةَ فيضانِها من بارئها، أورثت فيهم قوةً فعالةً فى عالم المثال، تنفعل منها القوى المثاليةُ والهياكل الأخروية، فلايَنْزِلُ معرفةُ تفاصيلِ النعم، ورؤيةُ فيضانها من المُنعم جلّ مجدُه، من الدعاء المستجاب فى قرع باب الجود.

ولايتم الشكرُ حتى يتنبهَ بعجيب صنع الله به فيمامضى من عمره، كما رُوى عن عمر رضى الله عنه، أنه قال فى انصرافه من حجته التى لم يَحُجَّ بعدها: '' الحمد لله، ولا إله إلا الله، يُعطى من يشاء ما يشاء، لقد كنت بهذا الوادى — يعنى ضَجْنَانَ — أَرعى إبلاً للخطاب، وكان فَظًّا غليظًا، يُتْعِبُنِىْ إذا عملتُ، ويضربنى إذا قَصَّرْتُ، وقد أصبحتُ وأمسيتُ وليس بينى وبين الله أحدٌ أخشاه!''

ترجمہ: از انجملہ: شکر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ دیکھے وہ ان تمام چیزوں کو جو اس کے پاس ہیں ظاہری اور باطنی نعمتوں میں سے: فائز ہونے والی اپنے خالق جلّ مجدہ کی طرف سے۔ پس بلند ہو ہر نعمت کے شمار کے بقدر اس کی محبت اپنے پیدا کرنے والے کی طرف، اور دیکھے وہ اپنی درماندگی اللہ کے شکر کی بجا آوری سے پس معدوم ہو جائے وہ اور نابود ہو جائے شکر گزاری میں۔

فرمایا آنحضرت ﷺ نے: ......میں کہتا ہوں: اور وہ بات یعنی ہر حال میں حمد کرنے والوں کو جنت میں سب سے پہلے بلایا جانا: (۱) اس لئے ہے کہ وہ یعنی ہر حال میں حمد کرنا اس کی عقل اور اس کے قلب کے تابعدار ہونے کی نشانی ہے اپنے خالق کے لئے (۲) اور اس لئے کہ نعمتوں کا پہچاننا، اور ان کے فیضان کو باری تعالیٰ کی طرف سے دیکھنا: پیدا کرتا ہے تعریف

کرنے والوں میں ایسی قوت کو جو عالم مثال میں اثر ڈالنے والی ہے۔ متأثر ہوتے ہیں اس قوت سے قُوائے مثالیہ اور اخری اجسام، پس کم درجہ نہیں نعمتوں کی تفصیلات کو پہچاننا، اور ان کے فیضان کو منعم جل مجدہٗ کی جانب سے دیکھنا: دعائے مستجاب سے، جو داِلٰہی کے دروازے کو کھٹکھٹانے میں —— اور تام نہیں ہوتا شکر تا آنکہ چوکنا ہو آدمی اس کے ساتھ یعنی موجودہ نعمتوں کو تفصیل سے جاننے کے ساتھ: اللہ تعالیٰ کی عجیب کاریگری سے اس کی گذشتہ زندگی میں، جیسا کہ روایت کیا گیا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہ آپ نے فرمایا جب آپ اس حج سے واپس لوٹے جس کے بعد آپ نے حج نہیں کیا الی آخرہ۔

☆ ☆ ☆

توکل اور اعتماد علی اللہ کا بیان

توکل: بھی ایمان و یقین کی ایک شاخ ہے۔ توکل کے معنی ہیں: کسی کو کام سونپنا اور اس پر بھروسہ کرنا کہ وہ کام کردے گا۔ اور اللہ تعالیٰ پر توکل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کارسازی پر یقین اس درجہ پختہ ہو جائے کہ اس کی نگاہ میں جلبِ منفعت اور دفع مضرت کے قبیل کے اسباب بے حیثیت ہو کر رہ جائیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے رزق کے جو اسباب مقرر کئے ہیں ان پر بھروسہ کئے بغیر ان کو اختیار کئے رہے یعنی اسباب پر تکیہ: توکل کے منافی ہے، ترکِ اسباب مطلوب نہیں۔

توکل کا تقاضا اُن اسباب کو ترک کرنا ہے جن سے شریعت نے روکا ہے

اور

توکل بے حساب دخولِ جنت کا باعث ہے

حدیث —— ایک واقعہ میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میری امت کے سترّ ہزار آدمی بے حساب جنت میں داخل ہوں گے'' صحابہ میں ان کی تعیین کے سلسلہ میں گفتگو ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا: ''وہ: وہ لوگ ہیں جو منتر نہیں کرواتے، بدشگونی نہیں لیتے، گرم لوہے کا داغ نہیں لگواتے اور اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں'' (بخاری حدیث ۵۷۰۵ مشکوٰۃ حدیث ۵۲۹۵)

تشریح: نبی ﷺ نے ان ستر ہزار آدمیوں کی جو صفات بیان کی ہیں، ان سے یہ بات آشکارہ ہوتی ہے کہ توکل کا تقاضا ان اسباب کو چھوڑنا ہے جن سے شریعت نے روکا ہے۔ توکل کا تقاضا اُن اسباب کو چھوڑنا نہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے مقرر کیا ہے۔

وضاحت: زمانۂ جاہلیت میں لوگ جب وہ خود یا ان کے بچے کسی بیماری اور دکھ درد میں مبتلا ہوتے تھے تو منتر جاننے

والوں سے جھاڑ پھونک کرواتے تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ یہ جنتر منتر دکھ درد اور بیماری کو ضرور دور کردے گا۔ اور وہ منتر سب جاہلی تھے۔ اسی طرح جب وہ کوئی ایسا کام کرنے کا ارادہ کرتے، جس میں نفع ونقصان کے دونوں پہلو ہوتے تو وہ پرندہ اڑاتے، اگر برا شگون نکلتا تو وہ کام نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح وہ زخموں اور پھوڑوں کا علاج گرم لوہے کا داغ لگوا کر کرتے تھے، اور اس کو مؤثر بالذات مانتے تھے۔ یہ سب اسباب ناجائز ہیں۔ شریعت نے ان کے ترک کرنے کا حکم دیا ہے۔ پس حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ بے حساب جنت میں جانے والے بندے وہ ہیں جو اپنے کاموں میں اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اس کی مشیّت اور اس کے حکم ہی کو مؤثر اور کارفرما سمجھتے ہیں، اور اُن اسباب کو اختیار نہیں کرتے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں۔ البتہ جو جائز اسباب اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے مقرر فرمائے ہیں، ان کو اختیار کرنا ضروری ہے، ان کا ترک توکل کا تقاضا نہیں ہے۔

اور بے حساب دخولِ جنت کا سبب ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرنا ہے۔ صرف حدیث میں مذکور امور سے بچنا ہی سبب نہیں ہے۔ البتہ ان امورِ ثلاثہ سے کنارہ کش رہنا آدمی میں صفتِ توکل پیدا کرتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ جو منتر وغیرہ سے بچتا ہے اس کا اعتقاد یہ ہوجاتا ہے کہ عالمِ وجود میں کارفرمائی اسباب کی بالکل نہیں ہے۔ مؤثر ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور انہی کا حکم چلتا ہے۔ اور یہ اعتقاد اس طرح قائم ہوتا ہے کہ جو لوگ ناجائز اسباب سے بچتے ہیں اور اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں، ان کے اذہان سے مطلق اعمال کی علیّت اور اسباب کی سببیت کا تصور نکل جاتا ہے۔ جن اعمال واسباب کو لوگ اپنی ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑتے ہیں، یہ لوگ ان کو محض ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اسی توکل واعتماد علی اللہ کی برکت سے وہ لوگ بے حساب جنت میں جائیں گے۔

ہیبت یعنی خوف وخشیت کا بیان

ہیبت یعنی خوف وخشیتِ الٰہی اور فکرِ آخرت بھی ایمان ویقین کی ایک شاخ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے قہر وجلال کو یاد کرے، اور اس کا اس درجہ یقین کرے کہ جلالِ خداوندی کے سامنے اپنی ہستی کو فنا کردے۔ درج ذیل روایات بابِ خشیت سے متعلق ہیں:

حدیث ——— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’تم میں سے کسی کا عمل اُس کو جنت میں نہیں لے جائے گا، اور نہ دوزخ سے بچائے گا، اور میرا بھی یہی حال ہے، مگر اللہ کی رحمت اور اس کے کرم ہی سے جنت میں جاسکوں گا‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۲۳۷۲) آپؐ کے دل کے خوف وخشیت کی کیفیت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ حدیث کافی ہے۔

حدیث ——— ایک گنہگار بندے نے اللہ کے خوف سے اپنے بیٹوں کو یہ وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد اس کو جلا دیا جائے۔ اور آدھی راکھ خشکی میں بکھیر دی جائے اور آدھی دریا میں بہادی جائے۔ اس کے بیٹوں نے اس کی وصیت پر عمل

کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے خشکی اور تری سے اس کے اجزاء جمع کئے گئے اور اس سے پوچھا گیا: تو نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے عرض کیا: من خشيتك يا رب! وأنت أعلم: آپ کے ڈر سے میں نے ایسا کیا ہے، اے میرے پروردگار! اور آپ خوب جانتے ہیں! حدیث میں ہے کہ اس کی اتنی بڑی جاہلانہ غلطی ہی اللہ تعالیٰ نے معاف نہیں کی، بلکہ اس کی بخشش فرمادی (مسلم ۱۷: ۷۰ کتاب التوبہ)

روایت ــــــ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک پرندے کو کسی درخت پر بیٹھا ہوا دیکھا تو فرمایا: ''اے پرندے! تو کتنا خوش نصیب ہے! بخدا! میری بھی خواہش تھی کہ تیری طرح ہوتا۔ تو درخت پر بیٹھتا ہے، اس کے پھل کھاتا ہے اور اڑ جاتا ہے، تجھ پر نہ کوئی حساب ہے نہ عذاب! واللہ! مجھے پسند ہے کہ میں راستہ کے کنارہ پر کوئی درخت ہوتا۔ اور مجھ پر کوئی اونٹ گذرتا، جو مجھے منہ میں لے کر چباتا، پھر نگل جاتا اور مینگنیاں کر کے نکال دیتا، اور میں انسان نہ ہوتا (مصنّف ابن ابی شیبہ ۱۳: ۲۵۸ كتاب الزهد، كلام أبي بكر الصديق رضى الله عنه)

حسنِ ظن (امید و رجاء) کا بیان

حسن ظن: ہیبت کی مقابل صفت ہے۔ صوفیا کی اصطلاح میں اس کو اُنس و محبت کہتے ہیں۔ اور احادیث میں رجاء کی تعبیر بھی آئی ہے۔ اور اللہ کے ساتھ حسن ظن ان کی نعمتوں اور مہربانیوں کو پیش نظر لانے سے پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ ہیبت وخشیت اللہ کی سزاؤں اور غلبوں کو پیش نظر لانے سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ جہاں ﴿عَزِيْزٌ ذُوْ انْتِقَامٍ﴾ غلبہ والے بدلہ لینے والے ہیں، وہاں وہ ﴿غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ بخشنے والے مہربانی فرمانے والے بھی ہیں۔ پس اگر پہلی صفات کا تصور غالب آئے گا تو ہیبت طاری ہوگی، اور دوسری صفات کا تصور غالب آئے گا تو امید بندھے گی، اور اچھا گمان قائم ہوگا۔

سوال: ایمان: خوف و رجاء کی مرکب حالت کا نام ہے۔ سورۃ الحجر آیات ۴۹ و ۵۰ میں ارشاد پاک ہے: ''آپ میرے بندوں کو اطلاع کر دیجئے کہ میں ہی بڑا مغفرت و رحمت والا ہوں اور یہ کہ میری سزا بڑی دردناک ہے'' پھر صرف ہیبت اور صرف حسن ظن ایمان ویقین کے مقامات کیسے ہو سکتے ہیں؟

جواب: یہ بات اگرچہ درست ہے کہ اعتقاد کے اعتبار سے ایمان: خوف و رجاء کی مرکب حالت کا نام ہے، مگر احوال ومقامات کے لحاظ سے کبھی مؤمن پر ہیبت طاری ہوتی ہے، اور کبھی حسن ظن غالب آتا ہے۔ جیسے گہرے کنویں کی مَن پر کھڑا ہوا آدمی گھبراتا ہے اور لرزتا ہے، حالانکہ عقلاً خوف کی کوئی بات نہیں۔ اور خوش گوار نعمتوں کا تصور آدمی کو خوش کرتا ہے۔ حالانکہ عقلاً کوئی خوشی کا موقع نہیں۔ مگر قوتِ واہمہ دونوں حالتوں سے خوف وخوشی جذب کرتی ہے۔ اسی طرح مؤمن پر جب خوف وخشیت کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ نروس ہو جاتا ہے۔ اور جب حسن ظن غالب آتا ہے تو امید بندھتی ہے اور وہ مطمئن ہوتا ہے۔

فائدہ: جب صورتِ حال وہ ہے جو جواب میں مذکور ہوئی تو ہیبت وحسن ظن کو عقل کے احوال میں شامل کرنا چاہئے،

مقاماتِ عقل میں ان کو شمار نہیں کرنا چاہئے۔ مقامات تو ملکاتِ راسخہ ہوتے ہیں، اور یہ دونوں علحدہ علحدہ برقرار رہنے والی صفات نہیں ہیں، بلکہ طاری ہونے والے احوال ہیں (فائدہ تمام ہوا)

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ سے اچھا گمان رکھنا عبادت کی عمدگی سے ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۵۰۴۸) یعنی حسن ظن خود بہترین عبادت ہے، جیسے دعا عبادت ہے، بلکہ عبادت کا مغز ہے۔

حدیث —— حدیث قدسی میں ہے کہ: ''میں میرے ساتھ میرے بندے کے گمان کے پاس ہوں'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۲۶۴) پس جو اچھا گمان رکھتا ہے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اچھا ہی معاملہ فرماتے ہیں۔ کیونکہ حسن ظن نفس میں باری تعالیٰ کی طرف سے فیضانِ لطف وکرم کی استعداد پیدا کرتا ہے، جیسے کوئی بہت ہی پر امید ہوکر کسی سخی کے سامنے دستِ سوال پھیلائے تو وہ اس کی امید کو خاک میں نہیں ملاتا۔

ومنها : التوكل: وهو: أن يغلب عليه اليقينُ، حتى يفتُر سعيُه فى جلب المنافع ودفع المضار من قِبَلِ الأسباب، ولكن يمشى على ما سنَّه الله تعالى فى عباده من الأكساب، من غير اعتماد عليها.

قال صلى الله عليه وسلم:" يدخل الجنة من أمتى سبعون ألفا بغير حساب: هم الذين لايستَرْقون، ولا يتطَيَّرون، ولا يكتَوُون، وعلى ربهم يتوكلون"

أقول: إنما وصَفَهم النبيُّ صلى الله عليه وسلم بهذا، إعلامًا بأن أثر التوكل تركُ الأسباب التى نهى الشرع عنها، لا تركُ الأسباب التى سنَّها الله تعالى لعباده.

وإنما دخلوا الجنة من غير حساب: لأنه لما استقر فى نفوسهم معنى التوكل، أورث ذلك معنىً يَنْفُضُ عنها سببية الأعمالِ العاضَّةِ عليها، من حيث أنهم أيقنوا بأن لامؤثر فى الوجود إلا القدرة الوجوبية.

ومنها: الهيبة: وهى: أن يستيقن بعظيم جلال الله حتى يتلاشى فى جنبه، كما قال الصديق إذا رأى طيرًا واقعًا على شجرةٍ، فقال:" طوبى لك يا طير! والله! لوددتُ أنى كنتُ مثلك: تقع على الشجر، وتأكل من الثمر، ثم تطير، وليس عليك حساب ولا عذاب. والله! لوددتُ أنى كنتُ شجرة إلى جانب الطريق، مَرَّ عليَّ جملٌ فأخذنى، فأدخلنى فاه، فَلاَكَنِى، ثم ازْدَرَدَنِىْ، ثم أخرجنى بَعْرًا، ولم أكن بشرًا"

ومنها: حسن الظن: وهو المعبر عنه فى لسان الصوفية بالأنس، وينشأُ من ملاحظةِ نِعَمِ الحق وألطافه، كما أن الهيبة تنشأ من ملاحظةِ نِقَمِ الحق وسطواته.

والمؤمن وإن كان بنظره الاعتقادىّ يجمع الخوفَ والرجاءَ، لكن بحاله ومقامه ربما يغلب عليه الهيبةُ، وربما يغلب عليه حسنُ الظن، كمثل رجل قائم على شفا البئر العميقة، ترتعد فرائصُه، وإن كان عقله لايوجب خوفًا، وكما أن حديثَ النفس بالنعم الهنيئة يفرِّح الإنسان، وإن كان عقلُه لايوجب فرحًا، ولكن تشَرَّب الوهمُ فى هاتين الحالتين خوفًا وفرحًا.

قال صلى الله عليه وسلم: "حسن الظن بالله من حسن العبادة" وقال عن ربه تبارك وتعالىٰ: "أنا عند ظن عبدى بى"

أقول: وذلك: لأن حسن الظن يهيئُ نفسَه لفيضان اللطف من بارئه.

ترجمہ: ازانجملہ: توکل ہے۔ اوروہ یہ ہے کہ غالب آجائے مؤمن پر یقین، یہاں تک کہ سست پڑ جائے اس کی سعی جلب منافع اور دفع مضرات میں منجانبِ اسباب یعنی وہ اسبابِ زندگی کے پیچھے بہت زیادہ جان نہ کھپائے۔ مگر وہ چلے ان کمائیوں پر جن کواللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے مقرر کیا ہے، ان پر اعتماد کئے بغیر ——— آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:...... میں کہتا ہوں: نبی ﷺ نے ان کو (جو بے حساب جنت میں جائیں گے) اِن باتوں کے ساتھ متصف کیا یعنی ان کے یہ اوصاف بیان کئے، صرف یہ بات بتلانے کے لئے کہ توکل کا اثر اُن اسباب کو چھوڑنا ہے، جن سے شریعت نے روکا ہے۔ اُن اسباب کو چھوڑنا توکل کا تقاضا نہیں ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے مقرر کیا ہے ——— اور وہ لوگ جنت میں بغیر حساب کے اسی لئے داخل ہوئے کہ جب ان کے نفوس میں توکل کے معنی ٹھہر گئے (اور انھوں نے منتر وغیرہ سے کنارہ کشی اختیار کرلی) تو وہ معنی اپنے پیچھے لائے ایک ایسے معنی کو جو ان کے نفوس سے جھاڑ دیتے ہیں اُن اعمال کی علیّت کو جن کو نفوس مضبوط پکڑنے والے ہیں، بایں حیثیت کہ انھوں نے یقین کرلیا کہ وجود میں مؤثر صرف واجب تعالیٰ کی قدرت ہی ہے۔

اور ازانجملہ: ہیبت ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آدمی یقین کرے اللہ کے بڑے جلال کا، یہاں تک کہ کالعدم ہوجائے وہ اس جلال کے سامنے، جیسا کہ فرمایا، صدیق رضی اللہ عنہ نے الی آخرہ۔

اور ازانجملہ: حسنِ ظن ہے۔ اور اس کو صوفیا کی اصطلاح میں اُنس کہتے ہیں۔ اور حسن ظن پیدا ہوتا ہے اللہ کی نعمتوں اور ان کی مہربانیوں کو پیشِ نظر لانے سے جیسا کہ خشیت پیدا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کی سزاؤں اور ان کے غلبوں کو پیش نظر لانے سے ——— (سوالِ مقدر کا جواب) اور مؤمن اگرچہ اپنے اعتقاد کے نقطۂ نظر سے خوف اور امید کے درمیان جمع کرتا ہے، مگر اپنے حال ومقام کے لحاظ سے کبھی اس پر ہیبت غالب آجاتی ہے، اور کبھی اس پر حسن ظن غالب آجاتا ہے، جیسے اس آدمی کی حالت جو گہرے کنویں کے کنارے پر کھڑا ہو تو اس کے شانے کا گوشت لرزتا ہے، اگرچہ اس کی عقل کسی خوف کو ثابت نہیں کرتی۔ اور جس طرح یہ بات ہے کہ خوش گوار نعمتوں کا تصور انسان کو خوش کرتا ہے، اگرچہ اس کی عقل

کسی خوشی کو ثابت نہیں کرتی، مگر وہم جذب کرتا ہے ان دونوں حالتوں میں خوف اور خوشی کو ——— (دوحدیثیں) میں کہتا ہوں: اور وہ بات یعنی بندے کے گمان کے مطابق معاملہ اس لئے ہوتا ہے کہ حسن ظن تیار کرتا ہے آدمی کے نفس کو لطف کے فیضان کے لئے اس کے خالق کی طرف سے۔

☆ ☆ ☆

تفرید (سُبک باری) کا بیان

تفرید: بھی یقین ہی کی ایک شاخ ہے۔ فَرَّدَ تَفْرِیْدًا کے لغوی معنی ہیں: لوگوں سے جدا ہونا، اکیلا ہونا۔ اور اصطلاحی معنی ہیں: سُبک باری، بوجھ سے آزاد ہونا۔ دوسرے معنی ہیں: ذاکر وشاغل رہنا۔ کیونکہ ایسا شخص گناہوں سے سبک بار ہوتا ہے۔ درج ذیل احادیث میں یہی معنی مراد ہیں:

حدیث ——— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں سے جدا ہونے والے آگے بڑھ گئے!'' صحابہ نے دریافت کیا: لوگوں سے جدا ہونے والے کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: **المُسْتَهْتَرون في ذكر الله، يضع الذكرُ عنهم أثقالَهم فيأتون يومَ القيامة خِفَافًا**: لوگوں سے جدا ہونے والے وہ لوگ ہیں جو اللہ کے ذکر پر فریفتہ ہیں۔ ذکر ان سے ان کے گناہوں کا بوجھ اتار دیتا ہے، پس وہ قیامت کے دن سبک بار آئیں گے (ترمذی حدیث ۳۶۲۶ أبواب الدعوات)

حدیث ——— رسول اللہ ﷺ ایک سفر میں ایک پہاڑی پر سے گذرے تو فرمایا: ''چلتے رہو! یہ جُمدان پہاڑی ہے، لوگوں سے جدا ہونے والے آگے بڑھ گئے!'' صحابہ نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! لوگوں سے جدا ہونے والے کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والے مرد وزن'' (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث ۲۲۶۲)

شاہ صاحب فرماتے ہیں: تفرید: یہ ہے کہ آدمی کے قُویٰ ادراکیہ (دل ودماغ) پر ذکر اللہ کا اس قدر غلبہ ہوجائے کہ وہ گویا اللہ تعالیٰ کا معاینہ کررہا ہے۔ جب یہ مقام حاصل ہوتا ہے تو خواہشات پاش پاش ہوجاتی ہیں۔ اور نفس کے بہت سے شعلے بجھ جاتے ہیں۔ یعنی تقاضے تھم جاتے ہیں۔ مذکورہ بالا احادیث کا یہی مطلب ہے۔ جب ذکر کے انوار عقل تک رسائی حاصل کرتے ہیں، اور معرفتِ خداوندی ذاکرین کے دلوں میں متمثل ہوتی ہے تو بہیمیت کے تقاضے تھم جاتے ہیں، اس کے شعلے بجھ جاتے ہیں اور ان لوگوں کے بوجھ اتر جاتے ہیں۔ اس لئے وہ قیامت کے دن سبک بار آئیں گے۔

اخلاص یعنی عمل کو کھوٹ سے خالی کرنے کا بیان

اخلاص: بھی یقین ہی کی شاخ ہے۔ اور اخلاص: قربِ خداوندی حاصل کرنے کے لئے یا اخروی ثواب کی امید سے، نام ونمود کے بغیر، اللہ کی خوشنودی کے لئے عمل کرنا ہے۔ اخلاص مامور بہ ہے۔ سورۃ البینۃ آیت ۵ میں ہے: ''اور

ان لوگوں کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت اسی کے لئے خالص کریں'' اور حدیث میں ہے کہ: ''اعمال (کے ثواب) کا مدار نیتوں پر ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱)

شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب بندے کی عقل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ صرف اللہ کی بندگی کرنے سے قرب خداوندی حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ سورۃ الاعراف آیت ۵۶ میں ہے: ''بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت نیک کام کرنے والوں سے نزدیک ہے'' یا بندہ خالص اللہ کی عبادت پر اُس اخروی ثواب کا یقین کرتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی معرفت وعدہ کیا ہے، تو اب اعمال ایک ایسے عظیم قلبی داعیہ سے پیدا ہوتے ہیں، جن میں نہ تو ریاء وسمعہ کا دخل ہوتا ہے اور نہ وہ عادت کے طور پر صادر ہوتے ہیں۔ اور یہی صورتِ حال عبادت کے علاوہ دیگر اعمال کی بھی ہوجاتی ہے، حتی کہ عام طور پر جو مباح کام کئے جاتے ہیں وہ بھی اخلاص سے ہونے لگتے ہیں۔

ومنها: التفريد: وهو: أن يَسْتَوْلِيَ الذكر على قواه الإدراكية، حتى يصير كأنه يرى الله تعالى عيانًا، فتضمحل أحاديثُ نفسه، وينطفئ كثير من لَهَبِهَا.

قال صلى الله عليه وسلم: ''سِيْرُوا، سبق المفرِّدون: هم الذين وضع عنهم الذكر أثقالهم''

أقول: إذا خلص نورُ الذكر إلى عقولهم، وتَشَبَّحَ التطلُّعُ إلى الجبروت في نفوسهم، انزجرت البهيمية، وانطفأ لهبها، وذهبت أثقالها.

ومنها: الإخلاص: وهو: أن يتمثل في عقله نفعُ العبادة لله تعالى، من جهة قرب نفسِه من الحق، كما قال تبارك وتعالىٰ: ﴿إِنَّ رَحْمَةَ اللهِ قَرِيْبٌ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ أو من جهة تصديق ماوعد الله تعالى على ألسنة رسله من ثواب الآخرة، فينشأ منه الأعمال بداعية عظيمة، لايشوبها رياء ولاسمعة، ولاموافقةُ عادة، ويَنْسَحِبُ هذا الحال على جميع أعماله، حتى الأعمالِ المباحة العادية، قال الله تعالى: ﴿وَمَا أُمِرُوْا إِلَّا لِيَعْبُدُوْا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ وقال صلى الله عليه وسلم: '' إنما الأعمال بالنيات''

ترجمہ: اور از انجملہ: تفرید ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ذکر الٰہی غالب آجائے اس کے قُویٰ ادراکیہ پر تا آنکہ وہ ہوجائے گویا وہ اللہ تعالیٰ کو کھلے طور پر دیکھ رہا ہے۔ پس پاش پاش ہوجاتی ہیں اس کے نفس کی باتیں یعنی خواہشات۔ اور ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں اس کے نفس کے بہت سے شعلے —— (اس کے بعد حدیث ذکر فرمائی ہے جو دو حدیثوں سے ماخوذ ہے) میں کہتا ہوں: جب ذکر کا نور ان کی عقلوں تک پہنچتا ہے۔ اور جبروت کی طرف جھانکنا یعنی معرفت خداوندی ان کے نفوس میں متمثل ہوتی ہے تو بہیمیت تھم جاتی ہے، اور اس کے شعلے بجھ جاتے ہیں، اور ان کے بوجھ اتر

جاتے ہیں یعنی گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔

اور از انجملہ : اخلاص ہے۔اور وہ یہ ہے کہ بندے کی عقل میں متمثّل ہو: اللہ تعالیٰ کے لئے بندگی کا نفع، اللہ تعالیٰ سے اس کے نفس کی نزدیکی کی جہت سے، جیسا کہ فرمایا...... یا اس اخروی ثواب کی تصدیق کی جہت سے، جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کی معرفت وعدہ فرمایا ہے۔ پس رونما ہوتے ہیں اس سے اعمال ایک ایسے بڑے تقاضے سے جس کے ساتھ ملا ہوا نہیں ہوتا دکھلانا اور نہ سنانا اور نہ عادت کی ہم آہنگی۔ اور گھستی ہے یہ حالت اس کے تمام اعمال تک یہاں تک کہ حسب معمول کئے جانے والے مباح اعمال تک۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے الی آخرہ۔

☆ ☆ ☆

توحید یعنی صرف خدا سے لو لگانے کا بیان

توحید: بھی ایمان ویقین کی شاخ ہے۔ اور توحید کے تین مراتب ہیں:

پہلا مرتبہ: توحید عبادت کا ہے یعنی صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا، شیطانی طاقتوں کی عبادت نہ کرنا۔ اور ان کی عبادت کو ایسا ناپسند کرنا جیسا آگ میں ڈالے جانے کو آدمی ناپسند کرتا ہے۔

دوسرا مرتبہ: یہ ہے کہ طاقت وقوت کا سرچشمہ صرف اللہ تعالیٰ کو سمجھے۔ اور یہ عقیدہ رکھے کہ عالم میں اللہ تعالیٰ کی قدرت ہی بلا واسطہ مؤثر ہے۔ اور اسباب صرف عادت کے طور پر کام کرتے ہیں یعنی سنتِ الٰہی یہ جاری ہے کہ وہ مسببات کو اسباب پر مرتب کرتے ہیں، جب کسی چیز کو آگ مسّ کرتی ہے تب وہ جلتی ہے، مگر اسباب کا مسببات کے وجود میں کچھ دخل نہیں ہوتا، جلاتے اللہ تعالیٰ ہیں۔ اور مسببات کو جو اسباب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو وہ صرف مجازی نسبت ہے۔ اور یہ اعتقاد رکھے کہ مخلوقات کے ارادوں پر تقدیر الٰہی غالب ہے یعنی ہوتا وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ازل میں طے کردیا ہے۔ مخلوق کے ارادوں سے کچھ نہیں ہوتا۔

تیسرا مرتبہ: یہ ہے کہ آدمی عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات کی مشابہت سے مبرّا ہیں۔ اور ان کے اوصاف بھی مخلوقات کے اوصاف سے کوئی مماثلت نہیں رکھتے۔ اور نصوص میں اس سلسلہ میں جو اطلاعات دی گئی ہیں ان کو آنکھوں دیکھی چیز کی طرح سمجھے۔ اور دل کی تھاہ سے اطمینان رکھے کہ اللہ کی مانند کوئی چیز نہیں۔ اور اس سلسلہ میں شریعت کی خبروں کا استقبال کرے: اپنے رب کی طرف سے ایسی واضح دلیل کے ذریعہ، جو خود اس کے اندر سے ابھرنے والی ہو اور خود اس پر قائم ہونے والی ہو یعنی وہ واضح دلیل وجدانی ہو جو اس کو ان حقائق کا قائل کردے۔

ومنها: التوحيد: وله ثلاثُ مراتب:

إحداها: توحيد العبادة: فلا يعبد الطواغيت، ويَكره عبادتَها كما يَكره أن يُقذف في النار.

والثانية : أن لايرى الحول والقوة إلابالله، ويرى أن لامؤثر في العالم إلا القدرة الوجوبية بلاواسطة، ويرى الأسباب عاديةً، إنما تُنسب المسبباتُ إليها مجازًا، ويرى القدر غالبًا على إرادات الخلق.

والثالثة : أن يعتقد تنزيهَ الحق عن مشاكلة المُحْدَثين، ويرى أوصافَه لا تُماثل أوصافَ الخلق، ويصير الخبر في ذلك كالعيان، ويطمئن قلبه بأن ليس كمثله شيئ من جذر نفسه، ويتلقَّى أخبارَ الشرع بذلك على بينة من ربه، ناشئةٍ من ذاته على ذاته.

ترجمہ: اور از انجملہ: توحید ہے۔ اور توحید کے تین مراتب ہیں: ان میں سے ایک: عبادت کی یکتائی ہے: پس وہ شیاطین کی پرستش نہ کرے۔ اور ان کی عبادت کو ناپسند کرے جیسا وہ ناپسند کرتا ہے کہ پھینکا جائے آگ میں ——— اور دوسرا مرتبہ: یہ ہے کہ نہ دیکھے طاقت وقوت: مگر اللہ تعالیٰ کے لئے۔ اور دیکھے وہ کہ کوئی مؤثر نہیں عالم میں مگر واجب تعالیٰ کی قدرت، بلاکسی واسطہ کے۔ اور دیکھے اسباب کو عادت کے طور پر کام کرنے والے، جن کی طرف مسببات صرف مجازاً منسوب کئے جاتے ہیں۔ اور دیکھے تقدیر کو مخلوق کے ارادوں پر غالب ——— اور تیسرا مرتبہ: یہ ہے کہ اعتقاد رکھے اللہ تعالیٰ کے پاک ہونے کا نو پید چیزوں کی مشابہت سے۔ اور دیکھے ان کے اوصاف کو کہ وہ مماثلت نہیں رکھتے مخلوق کے اوصاف سے۔ اور اس سلسلہ کی اطلاع: مانند آنکھوں سے دیکھی ہوئی چیز کے ہوجائے۔ اور مطمئن ہوجائے اس کا دل اس بات پر کہ اللہ کے مانند کوئی چیز نہیں، اس کے نفس کی جڑ سے۔ اور استقبال کرے وہ شریعت کی اطلاعات کا اس سلسلہ میں: واضح دلیل سے اس کے رب کی جانب سے، جو پیدا ہونے والی ہو اس کی ذات سے (اور قائم ہونے والی ہو) اس کی ذات پر۔

☆ ☆ ☆

صدیقیت ومحدّثیت کا بیان

صدیق اور محدّث ہونا: بھی ایمان ویقین کی شاخیں ہیں۔ یہ مراتبِ کمال: کمالِ ایمانی ہی کی بدولت حاصل ہوتے ہیں۔ صدیق: صِدق سے مبالغہ کا صیغہ ہے اس کے معنی ہیں: نہایت سچا۔ اور محدّث: حَدَّثہ سے اسم مفعول ہے۔ جس کے معنی ہیں: خبر دیا ہوا، جس کے ساتھ باتیں کی گئی ہوں یعنی مُلہَم اور روشن ضمیر۔

اور اصطلاح میں دونوں کی حقیقت شاہ صاحب رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ امت میں کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی اصل فطرت کے لحاظ سے انبیاء کے مشابہ ہوتے ہیں۔ جیسے ذہین شاگرد: باکمال استاذ کے مشابہ ہوتا ہے۔ پھر اگر یہ مشابہت قوائے عقلیہ (علمیہ) کے اعتبار سے ہے تو وہ صدیق اور محدّث ہیں۔ اور اگر قوائے عملیہ کے اعتبار سے ہے تو وہ

شہید اور حواری ہیں۔ سورۃ الحدید آیت ۱۹ میں دونوں قسم کی مشابہتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ارشاد پاک ہے: ''اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں، ایسے ہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیقین اور شہداء ہیں'' صدیقین کمالِ علمی کے حامل ہوتے ہیں، اور شہداء کمالِ عملی کے۔ اور کمالات کل یہی دو ہیں، جن کی وجہ سے تعریف کی جاتی ہے۔ سورۃ النساء آیت ۷۰ میں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی تعریف کی گئی ہے۔ نبوت کمالاتِ علمی میں سے ہے، کمالات عملی میں سے نہیں ہے۔ اسی طرح صدیقیت بھی کمالاتِ علمی میں سے ہے۔ اور دونوں میں فرق فاعلیت اور قابلیت کا ہے، جو آفتاب اور آئینہ میں وقتِ تقابل ہوتا ہے۔ انبیاء منبع العلوم اور فاعل (مؤثر) ہیں۔ اور صدیقین: مجمع العلوم اور قابل ہیں۔ اسی طرح محدثیت بھی کمالاتِ علمی میں سے ہے، مگر اس کا مرتبہ صدیقیت کے بعد ہے۔ کیونکہ صدیق پر آفتابِ نبوت کا پَرتو پڑتا ہے، اور محدّث: عالم ملکوت کے بعض علمی خزانوں سے جو اللہ تعالیٰ نے وہاں مہیا کئے ہیں: استفادہ کرتا ہے۔

اور شہید: وہ شخص ہے جو اعلائے کلمۃ اللہ اور ترقی دین کے لئے جان دیتا ہے۔ شہید اول درجہ کا آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر ہوتا ہے۔ پس شہادت: کمالاتِ عملی میں سے ہے، یہی حال حواریّت کا ہے۔ اور جو شخص ان کی اصلاحی تحریک سے متاثر ہوتا ہے وہ صالح ہے، پس صلاحیت بھی کمالاتِ عملی میں سے ہے۔ اور دونوں میں وہی فاعل اور قابل کا فرق ہے۔ پس شہداء منبع العمل اور فاعل ہیں، اور صالحین مجمع العمل اور قابل۔ آیت کریمہ میں دونوں قسم کے کمالات کے حاملین کے اعلیٰ افراد کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور انبیاء کا تذکرہ اس لئے نہیں کیا گیا کہ سلسلۂ نبوت ختم ہو چکا ہے۔

صدیق کی خصوصیات

صدیق کا تذکرہ قرآن کریم میں آیا ہے۔ سورۃ الزمر آیت ۳۳ میں ہے: ''اور جو سچی بات لیکر آیا، اور جس نے اس کی تصدیق کی: یہی لوگ پرہیزگار ہیں'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ برحق بات لانے والے رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اور اس کی تصدیق کرنے والے ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں (درمنثور ۵:۳۲۸) شاہ صاحب رحمہ اللہ ذیل میں صدیق کی تین خصوصیات بیان فرماتے ہیں۔

پہلی خصوصیت: صدیق: صلاحیت کے اعتبار سے نبی کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ دونوں میں آگ اور گندھک کی نسبت ہوتی ہے۔ آگ فاعل اور گندھک قابل ہے۔ چنانچہ صدیق جب بھی نبی سے کوئی خبر سنتا ہے تو وہ دل کے پار ہو جاتی ہے۔ وہ دل کی شہادت سے اس کا استقبال کرتا ہے۔ اور صدیق کے لئے وہ خبر اس درجہ قابلِ پذیرائی ہوتی ہے کہ گویا وہ ایسا علم ہے جو بغیر متابعت کے خود صدیق کی ذات سے ابھرا ہے یعنی وہ خبر اس کے اپنے دل کی آواز ہوتی ہے۔ اور اس حقیقت کی طرف اُس روایت میں اشارہ آیا ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ جب نبی ﷺ پر وحی نازل ہوتی تھی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جبرئیل علیہ السلام کی آواز کی بھنبھناہٹ سنا کرتے تھے (یہ روایت: صدیقِ اکبر کی

تخصیص کے ساتھ مجھے نہیں ملی۔البتہ مسند احمد (۱:۳۴) میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب نبی ﷺ پر وحی اترتی تھی تو آپؐ کے چہرۂ انور کے پاس شہد کی مکھیوں کی بھن بھن جیسی آواز سنائی دیتی تھی)

دوسری خصوصیت: صدیق کا دل ممکن حد تک محبتِ نبوی سے لبریز ہوتا ہے، جو جان و مال سے نبی کی غمگساری، اور ہر حال میں نبی کی ہمنوائی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔چنانچہ نبی ﷺ نے بیان فرمایا ہے کہ جس طرح ابوبکر نے میری خدمت گذاری کی ہے، اور مجھ پر اپنا مال خرچ کیا ہے: کسی نے نہیں کیا۔اور آپؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ اگر میں کسی کو خلیل (وہ دوست جس کی محبت دل کی گہرائیوں میں پہنچ گئی ہو) بناتا تو ابوبکر کو بناتا (مشکوٰۃ حدیث ۶۰۱۰) یعنی حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے تو آپؐ کو خلیل بنالیا ہے، اور احسان کا بدلہ احسان ہوتا ہے۔مگر چونکہ آپؐ نے محبوب بایں صفت اللہ تعالیٰ کو بنالیا ہے، اس لئے اب کسی اور کیلئے گنجائش باقی نہیں رہی۔مگر یہ بات واضح ہوگئی کہ صدیق: خُلّت کے مستحق ہیں۔یہی آپ کی فضیلت ہے۔

اور قلبِ نبوت سے صدیق کے غایتِ تعلق کی وجہ: قلبِ صدیق پر وحی کے انوار کا پے بہ پے وارد ہونا ہے۔پس جب جب اثر اندازی اور اثر پزیری اور فعل وانفعال کی تکرار ہوتی ہے تو فنائیت وفدائیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

تیسری خصوصیت: صدیق: نبی کا ہر وقت کا ساتھی ہوتا ہے۔صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ایسے وقت بھی آپؐ کے ساتھ رہے ہیں جب کوئی اور ساتھ نہیں تھا۔وہ غار میں اور ہجرت میں آپؐ کے ساتھ رہے ہیں۔اور حوضِ کوثر پر بھی آپؐ کے ساتھ ہوں گے (مشکوٰۃ حدیث ۶۰۱۹) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ صحبتِ نبوی سے اور کلام نبوت کے استماع سے صدیق کا جو سب سے بڑا مقصد ہے یعنی علوم نبوت کی جلوہ گاہ بننا: وہ صحبت ورفاقت ہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔آئینہ آفتاب کے سامنے رہے گا جبھی اس میں انوار کا انعکاس ہوگا۔

صدیق کی علامتیں

صدیق کی دو علامتیں ہیں:

پہلی علامت: صدیق خوابوں کی تعبیر کا سب سے زیادہ ماہر ہوتا ہے۔چنانچہ نبی ﷺ نے اپنے بعض خوابوں کی تعبیر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے دریافت کی ہیں۔شاہ صاحب قدس سرہ نے ازالۃ الخفا میں: مآثرِ جمیلہ صدیق اکبرؓ (۲:۲۰) کے عنوان کے تحت ایسے چند خوابوں کا تذکرہ کیا ہے۔اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تعبیرِ رؤیا کے لئے امور غیبیہ کا انکشاف ضروری ہے۔اور یہ خوبی صدیق کو حاصل ہوتی ہے۔اس کی سرشت ہی اللہ تعالیٰ ایسی بناتے ہیں کہ معمولی سبب کی وجہ سے اس پر امورِ غیبیہ منکشف ہوتے ہیں۔اس لئے اس کے خواب بھی سچے ہوتے ہیں، اور تعبیر بھی مطابق واقعہ ہوتی ہیں۔

دوسری علامت: صدیق سب سے پہلے نبی پر ایمان لاتا ہے۔اور اس کو ایمان لانے کے لئے کسی معجزہ کی حاجت نہیں ہوتی۔چنانچہ آزاد بالغ مردوں میں سب سے پہلے صدیق اکبر ہی ایمان لائے ہیں۔

محدَّث کی خصوصیات

محدَّث: کا تذکرہ متفق علیہ روایت میں آیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بخدا! واقعہ یہ ہے کہ تم سے پہلی امتوں میں محدَّث (مُلہَم) ہوتے تھے۔ پس اگر میری امت میں کوئی محدَّث ہے تو وہ عمر ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۶۰۲۶) شاہ صاحب نے ذیل میں محدَّث کی دو خصوصیتیں بیان فرمائی ہیں:

پہلی خصوصیت: محدَّث کا نفس عالم ملکوت (فرشتوں کی دنیا) کے بعض علمی خزانوں کی طرف سبقت کرتا ہے۔ اور وہاں اللہ تعالیٰ نے جو علومِ شرعیہ مہیا کئے ہیں، ان میں سے بعض علوم نزولِ وحی سے پہلے ہی اخذ کرلیتا ہے، جو یا تو آئینِ وشریعت سے متعلق ہوتے ہیں یا نظامِ انسانی کی اصلاح سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے بعض نیک بندے عالم ملکوت میں جو باتیں طے پا چکی ہیں ان کو خواب میں دیکھ لیتے ہیں۔

دوسری خصوصیت: بہت سے واقعات میں محدَّث کی رائے کے موافق قرآن کریم نازل ہوتا ہے۔ اور خواب میں نبی ﷺ سیرابی کے بعد اس کو بچا ہوا دودھ عنایت فرماتے ہیں۔ (مشکوٰۃ حدیث ۶۰۳۰ و ۶۰۴۱)

خلافت کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟

نبی ﷺ کے بعد صدیق ہی لوگوں میں سب سے زیادہ خلافت کا حقدار ہے۔ صدیق کا قلب: نبی ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی عنایتوں، نُصرتوں اور تائیدات کا کاشانہ ہوتا ہے۔ اور صورتِ حال یہ ہوجاتی ہے کہ گویا نبی کی روح: صدیق کی زبان سے بولتی ہے۔ یہ بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمائی ہے، جب انھوں نے لوگوں کو صدیقؓ سے بیعت کی دعوت دی تو فرمایا: ''اگر حضرت محمد ﷺ کی وفات ہوگئی ہے تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان ایک ایسا نور باقی رکھا ہے جس سے تم وہی ہدایت حاصل کرسکتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو عنایت فرمائی ہے۔ اور بیشک ابوبکر: رسول اللہ ﷺ کے ہر وقت کے ساتھی تھے، اور غارِ ثور میں بھی وہی آپؐ کے ساتھ تھے، پس وہ تمہارے امور کے مسلمانوں میں سب سے زیادہ حقدار ہیں، پس اٹھو اور ان سے بیعت کرو (بخاری حدیث ۷۲۱۹ کتاب الاحکام، باب نمبر ۵۱)

پھر صدیق کے بعد محدَّث لوگوں میں سب سے زیادہ خلافت کا حقدار ہے۔ یہ بات رسول اللہ ﷺ نے ایک موقعہ پر ارشاد فرمائی ہے کہ: ''مجھے معلوم نہیں کہ کب تک میں آپ لوگوں کے درمیان رہونگا، پس تم ان دو شخصوں کی پیروی کرنا جو میرے بعد (خلیفہ) ہوں گے: وہ ابوبکر و عمر ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۶۰۵۰)

ومنها: الصديقية والمحدَّثية: وحقيقتهما: أن من الأمة من يكون في أصل فطرته شبيها بالأنبياء، بمنزلة التلميذ الفَطِن للشيخ المحقق؛ فَتَشَبُّهُه: إن كان بحسب القوى العقلية فهو الصديق

أو المحدَّث؛ وإن كان تشبهه بحسب القوى العملية فهو الشهيد والحَوَارِىّ؛ وإلى هاتين القبيلتين وقعت الإشارة فى قوله تعالىٰ:﴿وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ أُوْلٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَاءُ﴾

والفرقُ بين الصديق والمحدَّث : أن الصديق نفسُه قريبةُ المأخذ من نفس النبى، كالكبريت بالنسبة إلى النار، فكلما سمع من النبى صلى الله عليه وسلم خبرًا وقع فى نفسه بموقع عظيم، ويتلقاه بشهادة نفسه، حتى صار كأنه عِلْمٌ هاج فى نفسه من غير تقليد، وإلى هذا المعنى الإشارةُ فيما ورد من أن أبا بكر الصديق كان يسمع دَوِىَّ صوتِ جبريل، حين كان يَنْزِلُ بالوحى على النبى صلى الله عليه وسلم.

والصديق تنبعث من نفسه لامحالة محبةُ الرسول صلى الله عليه وسلم أشدَّ ما يمكن من الحب، فيندفع إلى المواساة معه بنفسه وماله، والموافقةِ له فى كل حالٍ، حتى يُخبر النبىُّ صلى الله عليه وسلم من حاله أنه:" أَمَنُّ الناس عليه فى ماله وصحبته" وحتى يشهدَ له النبىُّ صلى الله عليه وسلم بأنه لو كان أمكن أن يتخذ خليلا من الناس لكان هو ذلك الخليلُ.

وذلك: لتعاقب ورود أنوارِ الوحى من نفس النبى صلى الله عليه وسلم إلى نفس الصديق، فكلما تكرر التأثير والتأثر، والفعل والإنفعال حصل الفناء والفداء.

ولما كان كمالُه: الذى هو غايةُ مقصوده بصحبة النبى صلى الله عليه وسلم، وباستماع كلامه: لا جرم كان أكثرُهم له صحبةً.

ومن علامة الصديق: أن يكون أَعْبَرَ الناس للرؤيا؛ وذلك: لما جبل عليه من تلقى الأمور الغيبية بأدنى سبب؛ ولذلك كان النبى صلى الله عليه وسلم يطلب التعبير من الصديق فى واقعات كثيرة.

ومن علامة الصديق: أن يكون أولَ الناس إيمانا، وأن يؤمن بغير معجِزَة.

والمحدَّث: تُبادر نفسُه إلى بعض معادنِ العلم فى الملكوت، فتأخذ منه علوما، مما هيأه الحق هناك، ليكون شريعةً للنبى صلى الله عليه وسلم، وليكون إصلاحًا لنظام بنى آدم، وإن لم يَنْزِلِ الوحىُ بعدُ على النبى صلى الله عليه وسلم، كمثل رجل يرى فى منامه كثيرًا من الحوادث التى أُجمع فى الملكوت على إيجادها.

ومن خاصية المحدَّث : أن يَنْزِلَ القرآنُ على وفق رأيه فى كثير من الحوادث، وأن يرى النبىُّ صلى الله عليه وسلم فى منامه أنه أعطاه اللبنَ بعد رَيِّهِ.

والصديق أولى الناس بالخلافة: لأن نفسَ الصديق تصير وَكْرًا لعناية الله بالنبى، ونصرته له،

وتأييده إياه، حتى يصير كأن روح النبى صلى الله عليه وسلم ينطق بلسان الصديق، وهو قول عمر حين دعا الناس إلى بيعة الصديق:" فإن يَكُ محمدٌ صلى الله عليه وسلم قد مات، فإن الله قد جعل بين أظهُرِكم نورًا تهتدون به، بما هَدَى اللّٰهُ محمدًا صلى الله عليه وسلم وإن أبا بكر صاحبُ رسول الله صلى الله عليه وسلم، وثانِى اثْنَيْن، فإنه أولَى المسلمين بأموركم، فقوموا فبايِعوه"

ثم المحدَّث بعد ذلك أولى الناس بالخلافة: وذلك قوله صلى الله عليه وسلم:" اقتدُوا باللذَيْن من بعدى: أبى بكر وعمر" وقوله تعالى:﴿وَالَّذِىْ جَاءَ بِالصِّدْقِ،وَصَدَّقَ بِهٖ اُولٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ وقال صلى الله عليه وسلم:" لقد كان فيمن قبلكم محدَّثون، فإن يك فى أمتى أحد فعمر.

ترجمہ: اورازانجملہ: صدیقیت ومحدَّثیت ہے۔ اوران دونوں کی حقیقت یہ ہے کہ امت میں وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی اصل فطرت میں انبیاء کے مشابہ ہوتے ہیں۔ جیسے ذہین شاگرد: محقق استاذ کے مشابہ ہوتا ہے۔ پس اس کی مشابہت: اگر قُوائے عقلیہ کے اعتبار سے ہے تو وہ صدیق اور محدَّث ہیں۔ اور اگر اس کی مشابہت قوائے عملیہ کے اعتبار سے ہے تو وہ شہید اور حواری ہیں۔ اور ان دوقسموں کی طرف اشارہ آیا ہے ارشاد باری تعالیٰ میں.......... اور صدیق اور محدَّث کے درمیان فرق: (یہ فرق پوری بحث کے بعد واضح ہوگا۔ صدیق کی پہلی خصوصیت یہ ہے) کہ صدیق کا نفس قریب الماخذ ہوتا ہے، نبی کے نفس سے، جیسے گندھک بنسبت آگ کے۔ پس جب بھی وہ نبی سے کوئی خبر سنتا ہے تو واقع ہوتی ہے وہ صدیق کے دل میں بڑی اہم جگہ میں یعنی وہ دل میں پورا اثر کرتی ہے۔ اور صدیق اس خبر کا اپنی دل کی شہادت سے استقبال کرتا ہے یعنی اسکا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ سچی خبر ہے۔ یہاں تک کہ ہوجاتی ہے وہ بات گویا وہ ایک ایسا علم ہے جو صدیق کی ذات سے ابھرا ہے، کسی کی تقلید کے بغیر۔ اور اس معنی کی طرف اشارہ ہے اس روایت میں جو آئی ہے کہ ابوبکر صدیق سنا کرتے تھے جبرئیل کی آواز کی بھنبھناہٹ جب وہ نبی ﷺ پر وحی لے کر اترا کرتے تھے ـــــ (دوسری خصوصیت) اور صدیق کے نفس سے یقیناً اٹھتی ہے رسول اللہ ﷺ کی محبت، زیادہ سے زیادہ محبت جو ممکن ہوتی ہے۔ پس بہتی ہے وہ محبت نبی کی غم خواری کی طرف اپنی جان اور اپنے مال سے، اور نبی کی ہمنوائی کی طرف ہر حال میں۔ یہاں تک کہ نبی ﷺ اس کے حال کی اطلاع دیتے ہیں کہ وہ: ''لوگوں میں سب سے زیادہ احسان کرنے والا ہے آپؐ پر اپنے مال اور اپنی رفاقت کے ذریعہ'' اور یہاں تک کہ گواہی دیتے ہیں نبی ﷺ اس کے لئے اس بات کی کہ اگر آپؐ کے لئے ممکن ہوتا کہ آپؐ لوگوں میں سے کسی کو دوست بنائیں، تو البتہ وہ دوست صدیق ہی ہوتے ـــــ اور یہ بات: وحی کے انوار کے پے بہ پے وارد ہونے کی وجہ سے ہے۔ نبی ﷺ کے نفس سے صدیق کے نفس پر۔ پس جب جب اثر اندازی اور اثر پذیری اور فعل وانفعال کی تکرار ہوتی ہے تو فنائیت اور فدائیت وجود میں آتی ہے ـــــ (تیسری خصوصیت) اور جبکہ تھا صدیق کا کمال: وہی جو کہ وہ اس کا غایت مقصود ہے نبی ﷺ کی صحبت اور ان کے کلام کے سننے سے یعنی خود کو علوم نبوت

کا اسٹیج بنانا: تولامحالہ صدیق بڑھا ہوا ہوتا ہے صحابہ میں سب سے زیادہ نبی کی صحبت کے اعتبار سے ——— اور صدیق کی علامت سے یہ بات ہے کہ وہ خوابوں کی تعبیر کا سب سے زیادہ ماہر ہوتا ہے۔ اور وہ بات یعنی مہارت اس بات کی وجہ سے ہے جس پر صدیق پیدا کیا گیا ہے یعنی امور غیبیہ کا استقبال کرنا معمولی سبب کی وجہ سے۔ اور اس وجہ سے نبی ﷺ تعبیر دریافت کیا کرتے تھے صدیق سے بہت سے واقعات میں ——— اور صدیقِ کی علامت میں سے یہ بات ہے کہ وہ لوگوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والا ہو، اور یہ کہ وہ معجزہ کے بغیر ایمان لائے۔

اور محدَّث: (کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ) سبقت کرتا ہے اس کا نفس عالم ملکوت کے بعض خزانوں کی طرف۔ پس وہ ملکوت سے علوم لیتا ہے، ان علوم میں سے جو اللہ تعالیٰ نے وہاں تیار کئے ہیں۔ تاکہ ہو وہ علم: آئین نبی ﷺ کے لئے، اور تاکہ ہو وہ بنی آدم کے نظام کی اصلاح، اگرچہ اب تک نبی ﷺ پر وحی نازل نہ ہوئی ہو۔ جیسے اس شخص کی حالت جو اپنے خواب میں بہت سے وہ واقعات دیکھتا ہے جن کی ایجاد پر ملکوت میں اتفاق کیا گیا ہے ——— اور محدَّث کی خصوصیت میں سے یہ ہے کہ بہت سے واقعات میں اس کی رائے کے موافق قرآن اترے۔ اور یہ کہ نبی ﷺ اپنے خواب میں دیکھیں کہ آپؐ نے اس کو دودھ عطا فرمایا ہے سیرابی کے بعد۔

اور صدیق لوگوں میں سب سے زیادہ خلافت کا حقدار ہوتا ہے۔ اس لئے صدیق کا نفس آشیانہ ہوتا ہے نبی پر اللہ کی عنایت کا، اور اللہ کی طرف سے نبی کی نصرت کا اور اللہ کی تائید کا نبی کے لئے۔ یہاں تک کہ صدیق ہو جاتا ہے گویا نبی ﷺ کی روح اس کی زبان سے بولتی ہے۔ اور وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے، جب آپ نے لوگوں کو صدیق سے بیعت کرنے کی دعوت دی: الی آخرہ۔

☆ ☆ ☆

عقل کے احوال کا بیان

مقاماتِ عقل کے بیان سے فارغ ہو کر اب احوال عقل کا بیان شروع کرتے ہیں۔ عقل کے چھ احوال یہ ہیں: تجلی، فراستِ صادقہ، رؤیا صالحہ۔ حلاوتِ مناجات، محاسبہ، اور حیاء۔ سب کی تعریفات اپنی جگہ آرہی ہیں۔

پہلا حال: تجلی

تَجلّٰی تَجلِّیا کے معنی ہیں: خوب واضح ہونا۔ حدیث میں ہے: تـجـلّٰی لی کلُّ شیئ: میرے لئے ہر چیز خوب واضح ہوگئی (ترمذی در تفسیر سورہ نمبر ۳۸) اور تجلی کے اصطلاحی معنی ہیں: مَـایَـنکشف للقلوب من أنوار الغیوب: مغیبات کے وہ انوار جو قلوب پر منکشف ہوتے ہیں (دستور العلماء ۱: ۳۱۵)

تجلی کی عام طور پر دو قسمیں کی جاتی ہیں: تجلی ذات اور تجلی صفات۔ مگر حضرت سَہل بن عبداللہ تُستَری رحمہ اللہ (۲۰۰-۲۸۳ھ) نے، جو اکابر صوفیا میں سے گذرے ہیں: تجلی کی تین قسمیں کی ہیں: تجلی ذات، تجلی صفات، اور تجلی حکم ذات۔ اور حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے تجلی صفات کی دو صورتیں کی ہیں، پس تجلی کی کل چار قسمیں ہوئیں: تجلی ذات، تجلی صفات کی پہلی صورت، تجلی صفات کی دوسری صورت۔ اور تجلی حکمِ ذات۔

فائدہ: تجلی کا لفظ تصوف کی کتابوں میں بہت مبہم استعمال کیا گیا ہے۔ جس سے یہ تصور قائم ہو گیا ہے کہ تجلی سے اولیاء کبار ہی استفادہ کر سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ تصور صحیح نہیں۔ تجلی سے ہر کھرا مؤمن استفادہ کر سکتا ہے۔

تجلی کی اقسام

پہلی قسم —— تجلی ذات —— اس کا دوسرا نام مکاشفہ ہے یہ وہ تجلی ہے جس کا مبدا اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے یعنی کسی صفت کا لحاظ کئے بغیر۔ اور اس تجلی کا مطلب یہ ہے کہ ایمان ویقین اس درجہ قوی ہو جائے کہ مؤمن گویا اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ اور وہ ماسوی اللہ سے بالکل بے خبر ہو جائے۔ جیسا کہ حدیث جبرئیل میں ہے: ''احسان: یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کریں گویا اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہیں''

فائدہ: سر کی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کی رویت دنیا میں ممکن نہیں۔ دنیا میں بس یہی حکمی رویت یعنی انوار وتجلیات کا مشاہدہ ممکن ہے۔ عینی رویت آخرت میں ہوگی (یہ فائدہ کتاب میں ہے)

مثال: تجلی ذات یعنی عبادت میں محویّت کی مثال: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ ہے۔ آپ طواف کر رہے تھے، کسی نے سلام کیا۔ آپ نے جواب نہیں دیا۔ سلام کرنے والے نے آپ کے احباب سے اس کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا: ہم اس جگہ یعنی طواف میں اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے تھے یعنی ہمیں اس کے سلام کا پتہ ہی نہیں چلا۔

تشریح: یہ حالت ایک طرح کی غَیبت (محویّت) اور ایک قسم کی فنائیت ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ لطائفِ ثلاثہ میں سے ہر لطیفہ کے لئے غیبت اور فنائیت ہے:

عقل کی غَیبت وفنائیت: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں مشغولیت کی وجہ سے: چیزوں کی معرفت باقی نہ رہے۔ مثلاً: امام عامر شَعبی رحمہ اللہ سے کسی نے کہا: ہم نے آپ کی زرقاء (نیلی آنکھوں والی) باندی بازار میں دیکھی۔ آپ نے فرمایا: کیا وہ زرقاء ہے؟ گویا آپ نے کبھی اس کی آنکھیں نہیں دیکھیں، حالانکہ وہ آپ کی حریم تھیں۔

اور قلب کی غیبت وفنائیت: یہ ہے کہ دل سے غیر اللہ کی محبت اور خوف نکل جائے (اور دل اللہ کی محبت سے بھر جائے)

اور نفس کی غیبت وفنائیت: یہ ہے کہ اسکے تقاضے تھم جائیں۔ اور آدمی خواہشاتِ نفس سے لطف اندوز ہونا چھوڑ دے۔

فائدہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ: جس طرح حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے بیان کیا ہے: مجھے کسی

کتاب میں نہیں ملا۔ البتہ طبقات ابن سعد (۴: ۱۶۷ تذکرہ ابن عمرؓ) میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے کہ آپ طواف کررہے تھے۔ اسی حال میں حضرت عروۃ بن الزبیر رحمہ اللہ نے آپ سے آپ کی صاحبزادی: سودہ کا رشتہ مانگا۔ آپ نے کچھ جواب نہ دیا۔ عروہ نے خیال کیا کہ درخواست نامنظور ہوئی۔ مگر انھوں نے ٹھان لی کہ یہ رشتہ پھر مانگوں گا۔ چنانچہ مدینہ لوٹنے کے بعد حاضر خدمت ہوئے۔ ملاقات پر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''تم مجھ سے طواف میں ملے تھے، اور میری بیٹی کا تذکرہ کیا تھا۔ مگر ہم اس وقت اللہ کو دیکھ رہے تھے، اس بنا پر میں نے کچھ جواب نہ دیا تھا۔ (فذکرتَ لی ابنتی، ونحن نَتَراءی اللّٰهَ بین أعیننا، فذلك الذی منعنی أن أجیبك فیها بشیٔ إلخ) پس یہ واقعہ محویت کی مثال نہیں کیونکہ حضرت کو سلام کا پتہ چلا تھا۔ البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک جنگ میں آپ کو تیر لگ گیا تھا۔ نماز میں وہ تیر نکال دیا گیا اور آپ کو احساس تک نہ ہوا (فضائل ذکر ص ۳۸۱ باب سوم کا آخر)

فائدہ: تجلی ذات میں نور کی جگہ (تجلی کی جلوہ گاہ) عبادت میں محویت ہے یعنی دل لگا کر اور ٹوٹ کر عبادت کرنے میں جو لطف اور روحانی حظّ حاصل ہوتا ہے وہی تجلی کا ثمرہ ہے۔ غزوۂ ذات الرقاع میں ایک انصاری صحابی نوافل پڑھ رہے تھے کہ دشمن نے تیر چلائے۔ وہ تیر کھاتے رہے مگر ان کو نماز ختم کرنا گوارہ نہ ہوا (بذل ۲: ۱۲۸ مصری) یہی محویت: تجلی ذات کی جلوہ گاہ ہے (شاہ صاحب رحمہ اللہ نے تجلی ذات کا موضع نور بیان نہیں کیا تھا۔ اس لئے اس کا اضافہ کیا گیا)

اور تجلی صفات: وہ تجلی ہے جس کا مبدا: اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت ہوتی ہے۔ مثلاً: اللہ تعالیٰ کے سمیع وبصیر ہونے کا مراقبہ یا ان کی رحیمی وکریمی یا غفاریت کا تصور —— پھر تجلی صفات کی دو صورتیں ہیں:

تجلی کی دوسری قسم —— اور تجلی صفات کی پہلی صورت —— یہ ہے کہ بندہ مخلوقات میں: اللہ تعالیٰ کی کرشمہ سازی کا مشاہدہ کرے۔ اللہ کی صفات کو ذہن میں لائے۔ پس اس پر اللہ کی قدرت کا یقین غالب آجائے۔ اور اسباب نگاہوں سے اوجھل ہوجائیں۔ اور کسی چیز کا خوف باقی نہ رہے۔ اور وہ اسبابِ ظاہری کو ترک کردے۔ اور اس پر یہ تصور غالب آجائے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہر حال کو جانتے ہیں۔ پس وہ منقاد ومرعوب ومدہوش ہوکر رہ جائے۔ جیسا کہ حدیث جبرئیل میں ہے کہ: ''اگر آپ اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھتے تو وہ آپ کو دیکھ رہے ہیں'' —— یہ اللہ کی صفات **علیم وبصیر** کے مراقبہ کی مثال ہے۔

اور صفتِ قدرت کے غلبہ کی مثال: حضرت صدیق اور دیگر جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ قول ہے کہ: ''طبیب ہی نے مجھے بیمار کیا ہے!''

وضاحت: حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا: آپ کو کیا بیماری ہے؟ فرمایا: گناہوں کی! دریافت کیا گیا: آپ کی کیا خواہش ہے؟ فرمایا: رب کی بخشش کی! لوگوں نے کہا: آپ کے لئے ہم کسی طبیب کو بلائیں؟ جواب دیا: طبیب ہی نے مجھے بیمار کیا ہے! (احیاء العلوم ۴: ۲۴۶) اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا قول مصنف ابن ابی شیبہ (۱۳: ۲۶۲) میں مذکور ہے۔ ان واقعات میں: قدرتِ خداوندی کے تصور کے غلبہ سے اسباب ظاہری نگاہوں سے اوجھل ہوگئے، اور

بیماری کا کوئی اندیشہ باقی نہ رہا۔ اور علاج جو شفایابی کا ظاہری سبب ہے اس کو ترک کر دیا۔

نور کی جگہیں: تجلی صفات کی اس صورت میں نور کی جگہیں وہی صفاتِ علم وقدرت وغیرہ ہیں۔ یعنی نفس: متعدد انوار سے روشن ہوتا ہے۔ ایک نور اور ایک مراقبہ سے دوسرے نور اور دوسرے مراقبہ کی طرف پلٹتا ہے یعنی مختلف صفات کے الوان سے مستفید ہوتا ہے۔ تجلی ذات میں یہ بات نہیں ہوتی، کیونکہ ذات میں نہ تعدّد ہے، نہ اس میں تبدیلی ہوتی ہے۔

تجلی کی تیسری قسم —— اور تجلی صفات کی دوسری صورت —— یہ ہے کہ آدمی یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ بذاتِ خود اپنے حکم کُنْ (ہوجا) سے ہر کام کرتے ہیں۔ وہ اسبابِ خارجیہ کے توسط کے محتاج نہیں۔

امثلہ: (۱) حضرت اُسید بن حُضیر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ نماز میں سورۂ کہف پڑھ رہے تھے۔ گھوڑا قریب میں بندھا ہوا تھا۔ اس نے اچانک پُھدکنا شروع کیا۔ آپ نے جو نظر اٹھائی تو دیکھا کہ ایک سائبان ہے، جس میں بہت سے چراغ روشن ہیں۔ آپ نے صبح یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''پڑھتے رہتے! وہ تو سکینت تھی جو قرآن کی وجہ سے نازل ہوئی تھی (مشکوٰۃ حدیث ۲۱۱۶)

(۲) حضرت اُسید بن حُضیر اور عباد بن بشر رضی اللہ عنہما: ایک سخت تاریک رات میں: نبی ﷺ کے پاس سے گھر لوٹے۔ دونوں کے ہاتھ میں لاٹھیاں تھیں۔ ایک لاٹھی روشن ہوگئی۔ دونوں اس کی روشنی میں چلتے رہے۔ جب دونوں علحدہ ہوئے تو دوسری لاٹھی بھی روشن ہوگئی۔ دونوں حضرات اپنی اپنی لاٹھیوں کی روشنی میں گھر پہنچے (مشکوٰۃ حدیث ۵۹۴۴)

(۳) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ جب نجاشی رحمہ اللہ کا انتقال ہوا تو صحابہ میں یہ چرچا تھا کہ ان کی قبر پر مسلسل ایک نور نظر آتا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۵۹۴۷)

نور کی جگہیں: تجلی صفات کی اس صورت میں نور کی جگہیں: وہ مثالی نوری پیکر ہیں: جو عارف کو اس وقت نظر آتے ہیں۔ جب اس کے حواس دنیا سے غائب ہوجاتے ہیں یعنی جب اس پر استغراقی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

چوتھی قسم —— تجلی حکم ذات یعنی احوالِ آخرت کا انکشاف —— اس تجلی کا مطلب یہ ہے کہ مؤمن اپنی بصیرت کی آنکھ سے دنیا وآخرت میں مجازات کا مشاہدہ کرے۔ اور مجازات کو اپنے وجدان سے جانے۔ جیسے بھوکا: بھوک کی تکلیف، اور پیاسا: پیاس کی تکلیف اپنے وجدان سے محسوس کرتا ہے۔

امثلہ (۱) حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ جب ہمیں رسول اللہ ﷺ جنت ودوزخ یاد دلاتے ہیں تو وہ ہمیں آنکھوں سے نظر آنے لگتی ہے۔ پھر جب ہم ازواج واولاد اور جائیداد میں مشغول ہوتے ہیں تو یہ حال باقی نہیں رہتا۔

مفصل روایت: حضرت حنظلہ بن الرَّبیع اُسیّدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مجھ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ملاقات کی۔ پوچھا: اے حنظلہ کیا حال ہے؟ میں نے کہا: حنظلہ تو منافق ہوگیا! ابوبکرؓ نے کہا: سبحان اللہ! کیا کہہ رہے ہو۔ میں نے کہا: ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس ہوتے ہیں، آپؐ ہمیں جنت اور جہنم یاد دلاتے ہیں تو گویا ہم

آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ پھر جب ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس سے نکلتے ہیں، اور ازواج واولاد اور جائیداد میں مشغول ہوتے ہیں تو ہم بہت سی باتیں بھول جاتے ہیں۔ ابوبکرؓ نے فرمایا: بخدا! ہمارا بھی یہی حال ہے۔ پھر میں اور ابوبکر دونوں چلے اور رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! حنظلہ تو منافق ہوگیا! آپؐ نے پوچھا: کیا بات ہوئی؟ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم آپؐ کے پاس ہوتے ہیں۔ آپؐ ہمیں جنت ودوزخ یاد دلاتے ہیں تو گویا ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ پھر جب ہم آپؐ کے پاس سے نکلتے ہیں۔ اور ازواج واولاد اور جائیداد میں مشغول ہوتے ہیں، تو بہت سی باتیں بھول جاتے ہیں! آپؐ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! اگر تم اس حال پر مسلسل رہو جس پر تم میرے پاس ہوتے ہو، اور ذکر میں (مسلسل رہو) تو تم سے ملائکہ مصافحہ کریں: تمہارے بستروں میں اور تمہاری راہوں میں! مگر اے حنظلہ! گھڑی اور گھڑی! یعنی یہ تجلی کبھی کبھی کوندتی ہے۔ یہ آخری جملہ تین بار فرمایا (مسلم شریف ۱۷: ۶۶ مصری)

فائدہ: نبی ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے کہ احوال دائمی نہیں ہوتے۔ بس برق کی طرح کوندتے ہیں (یہ فائدہ کتاب میں ہے)

(۲) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے نبی ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں یہ خواب دیکھا تھا کہ آپؓ کے ہاتھ میں ایک ریشم کا ٹکڑا ہے۔ اور آپؓ جنت میں جہاں بھی جانا چاہتے ہیں: ریشم کا وہ ٹکڑا آپؓ کو اڑا کر لے جاتا ہے۔ اور یہ بھی دیکھا تھا کہ دو شخص آپؓ کو جہنم میں لے جانا چاہتے ہیں۔ مگر ایک فرشتہ آیا، اور اس نے کہا: چھوڑ دو! (بخاری حدیث ۱۱۵۶)

نوٹ: تقریر میں ترتیب بدل گئی ہے۔ کتاب سے ملاتے وقت خیال رکھیں۔

﴿ومن الأحوال المتعلقة بالعقل﴾

التجلي: قال سهل: التجلي على ثلاثة أحوال: تجلي ذاتٍ، وهي المكاشفة، وتجلي صفاتِ الذات، وهي مواضع النور، وتجلي حكمِ الذات، وهي الآخرة ومافيها.

فمعنى المكاشفة: غلبةُ اليقين، حتى يصير كأنه يراه ويبصُره، ويبقى ذاهلاً عما عداه، كما قال صلى الله عليه وسلم: "الإحسان: أن تعبد الله كأنك تراه" أَما مشاهدةُ العيان: فهو في الآخرة، لا في الدنيا.

وقوله: تجلي صفاتِ الذات: يحتمل وجهين:

أحدهما: أن يراقِبَ أفعالَه في الخَلْق، ويستحضر صفاتِه، فيغلب يقينُ قدرة الله عليه، فيغيب عن الأسباب، ويسقط عنه الخوفُ، والتسببُ، ويغلب عليه علمه تعالىٰ به، فيبقى خاضعًا

مرعوبًا مدهوشًا، كما قال صلى الله عليه وسلم:" فإن لم تكن تراه فإنه يراك"

وهى مواضع النور : بمعنى أن النفس تتنوَّر بأنوار متعددة، تتقلب من نور إلى نور، ومن مراقبة إلى مراقبة، بخلاف تجلى الذات، إذ لا تعدد هناك ولا تحوُّل.

وثانيهما: أن يرى صفةَ الذات بمعنى فعلها وخَلْقها بأمر كُنْ، من غير توسط الأسباب الخارجية.

ومواضع النور: هى الأشباح المثالية النورية التى تتراء ى للعارف عند غيبة حواسه عن الدنيا.

ومعنى تجلى الآخرة: أن يعاينَ المجازاةَ بِبَصَرِ بصيرته فى الدنيا والآخرة، ويجد ذلك من نفسه كما يجد الجائع ألمَ جوعه، والظمآنُ ألمَ عطشه.

فمثال الأول: قول عبد الله بن عمر حين سلَّم عليه إنسان، وهو فى الطواف، فلم يَرُدَّ عليه السلامَ، فشكا إلى بعض أصحابه، فقال ابن عمر:" كنا نَتَرَايَا اللّٰهَ فى ذلك المكان!"

وهذه الحالة نوع من الغيبة، ونوع من الفناء وذلك: لأن كل لطيفةٍ من اللطائف الثلاث لها غيبة وفناء.

فغيبة العقل وفناؤه: سقوطُ معرفة الأشياء، شغلاً بربه.

وغيبة القلب وفناؤه: سقوطُ محبة الغير، والخوفِ منه.

وغيبة النفس وفناؤها: سقوط شهوات النفس، وانحجامها عن الالتذاد بالشهوات.

ومثال الثانى:ما قال الصديق، وغيره من أجلاء الصحابة:" الطبيبُ أَمْرَضَنِيْ!"

ومثال الثالث :رؤية الأنصارى ظُلَّةً فيها أمثال المصابيح.وما رُوى من أنه خرج رجلان من أصحاب النبى صلى الله عليه وسلم من عند النبى صلى الله عليه وسلم فى ليلة مظلمة، ومعهما مثل المصباحين بين أيديهما، فلما افترقا صار مع كل واحد منهما واحدًا، حتى أتى أهلَه وما ورد فى الحديث: أن النجاشى كان يُرى عند قبره نورٌ.

ومثال الرابع:قول حنظلة الأُسيِّدى لرسول الله صلى الله عليه وسلم: تُذَكِّرُنَا بالنار والجنة.

عن حنظلة بن الرُّبَيِّعِ الأُسيِّدى: قال لقينى أبوبكر، فقال: كيف أنت يا حنظلةُ؟ قلتُ: نَافَقَ حنظلةُ! قال: سبحان الله! ما تقول؟ قلت: نكون عند رسول الله صلى الله عليه وسلم يُذَكِّرُنَا بالجنة والنار، كأنَّا رأىَ عينٍ، فإذا خرجنا من عند رسول الله صلى الله عليه وسلم عَافَسْنَا الأزواجَ وَالأولادَ والضيعاتِ نسينا كثيرًا. قال أبو بكر: فو الله! إنا لَنَلْقٰى مثلَ هذا، فانطلقتُ أنا وأبوبكر، حتى دخلنا على رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقلت: نافق حنظلةُ يارسولَ الله!

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "وما ذاك؟" قلت: يارسول الله! نكون عندك تذكرنا بالنار والجنة كأنا رأيَ عينٍ، فإذا خرجنا من عندك عافسنا الأزواجَ والأولادَ والضيعاتِ نسينا كثيرًا، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "والذى نفسى بيده! لو تدومون على ماتكونون عندى، وفى الذكر، لصافَحَتْكم الملائكةُ على فرشكم وفى طرقكم، ولكن يا حنظلة! ساعةٌ وساعةٌ" ثلاث مرات. فأشار صلى الله عليه وسلم إلى أن الأحوال لاتدوم.

ومثالُه أيضًا: مارأى عبد الله بن عمر فى رؤياه من الجنة والنار.

ترجمہ: اوران احوال میں سے جو عقل سے تعلق رکھنے والے ہیں: تجلی ہے۔ سہل نے فرمایا: ''تجلی تین طرح کی ہے: (۱) ذات کی تجلی، اور وہی مکاشفہ ہے (۲) اور صفاتِ ذات کی تجلی، اور وہی (صفات) نور کی جگہیں ہیں (۳) اور حکمِ ذات یعنی فیصلہ خداوندی کی تجلی، اور وہی آخرت اور وہ باتیں ہیں جو آخرت میں ہیں یعنی جنت وجہنم —— پس مکاشفہ یعنی تجلی ذات کی حقیقت: یقین کا غلبہ ہے یعنی ایمان کی پختگی ہے، یہاں تک کہ ہوجائے آدمی گویا وہ اللہ کو دیکھتا ہے، اور اس کی طرف نگاہ کرتا ہے۔ اور غافل ہوکر رہ جائے وہ ماسوی اللہ سے، جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا: '''احسان: یہ ہے کہ آپ اللہ کی بندگی کریں گویا آپ اللہ کو دیکھتے ہیں'' رہا آنکھوں سے دیکھنا: تو وہ آخرت میں ہوگا، دنیا میں نہیں۔

اور سہلؒ کا قول: صفاتِ ذات کی تجلی: پس اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں: —— ایک یہ کہ مخلوق میں اللہ کے افعال کا مشاہدہ کرے، اور ان کی صفات کو مستحضر کرے۔ پس اس پر اللہ کی قدرت کا یقین غالب آجائے، پس وہ اسباب سے غائب ہوجائے۔ اور اس سے خوف اور سبب کو اختیار کرنا ساقط ہوجائے یعنی وہ اسباب ظاہری ترک کردے۔ اور اس پر اللہ کا اس کو جاننا غالب آجائے، پس وہ سہا ہوا مرعوب و مدہوش ہوکر رہ جائے۔ جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے: ''پس اگر آپ اللہ کو نہیں دیکھتے تو وہ آپ کو دیکھ رہے ہیں'' —— اور وہ (صفات) ہی نور کی جگہیں ہیں: بایں معنی کہ نفس روشن ہوتا ہے متعدد انوار سے۔ الٹتا پلٹتا ہے نفس ایک نور سے دوسرے نور کی طرف، اور ایک مراقبہ سے دوسرے مراقبہ کی طرف۔ ذات کی تجلی کے برخلاف، کیونکہ وہاں نہ تعدّد ہے اور نہ تبدّل ہے —— اور دوسری صورت یہ ہے کہ دیکھے ذات کی صفت کو حکم کُن کے ذریعہ، ذات کے پیدا کرنے اور ذات کے کام کرنے کے معنی کے اعتبار سے۔ یعنی یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ کی خلاقیت کن فیکونی حکم کے ذریعہ بذاتِ خود کام کرتی ہے، اسبابِ خارجیہ کے توسط کے بغیر —— اور نور کی جگہیں: وہ مثالی نوری پیکر ہیں جو عارف کو نظر آتے ہیں، دنیا سے اس کے حواس کے غائب ہونے کے وقت ——

اور آخرت کی تجلی کے معنی: یعنی حکمِ ذات کی تجلی کا مطلب: یہ ہے کہ وہ دنیا و آخرت میں مجازات کا معائنہ کرے اپنی بصیرت کی آنکھ سے، اور وہ اس کو اپنے دل میں پائے جیسا پاتا ہے بھوکا اپنی بھوک کی تکلیف اور پیاسا اپنی پیاس کی تکلیف —— پس اول کی مثال: یعنی تجلی ذات کی مثال: عبداللہ بن عمر کا قول ہے: .... اور یہ حالت ایک طرح کی

محویّت ہے اور ایک قسم کی فنائیت ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ لطائفِ ثلاثہ میں سے ہر لطیفہ کے لئے محویت اور فنائیت ہے۔ پس عقل کی محویت اور اس کی فنائیت: چیزوں کی معرفت کا ساقط ہونا ہے، اپنے رب کے ساتھ مشغولیت کی وجہ سے —— اور قلب کی محویت اور اس کی فنائیت: غیر اللہ کی محبت اور اس کے خوف کا ساقط ہونا ہے —— اور نفس کی محویت اور اس کی فنائیت: نفس کی خواہشات کا ساقط ہونا ہے، اور اس کا باز رہنا ہے خواہشات سے لطف اندوز ہونے سے —— اور ثانی کی مثال یعنی صفاتِ ذات کی تجلی کی پہلی صورت کی مثال: وہ بات ہے جو صدیق اور ان کے علاوہ جلیل القدر صحابہ نے فرمائی ہے کہ: ''طبیب ہی نے مجھے بیمار کیا ہے!'' —— اور ثالث کی مثال یعنی صفاتِ ذات کی تجلی کی دوسری صورت کی مثال: انصاری کا ایسے سائبان کو دیکھنا ہے جس میں بے شمار مشعلیں تھیں —— اور (دوسری مثال) وہ ہے جو روایت کی گئی کہ نبی ﷺ کے اصحاب میں سے دو شخص: ایک تاریک رات میں نبی ﷺ کے پاس سے نکلے، درانحالیکہ دونوں کے ساتھ مشعلوں کے مانند تھیں اُن دونوں کے سامنے۔ پس جب وہ دونوں جدا ہوئے تو ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ہوگئی ان میں سے ایک (صحیح یہ ہے کہ پہلے ایک ہی لاٹھی روشن تھی جس کی روشنی میں دونوں چل رہے تھے۔ پھر جب وہ علحدہ ہوئے تو دوسری لاٹھی بھی روشن ہوگئی) یہاں تک کہ وہ اپنے گھر پہنچا —— اور (تیسری مثال) وہ بات ہے جو حدیث میں آئی ہے کہ نجاشی کی قبر کے پاس نور دیکھا جاتا تھا —— اور رابع کی مثال یعنی حکم ذات کی تجلی کی مثال: حنظلہ اُسیدی کا قول ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے کہ: ''آپ ہمیں دوزخ اور جنت یاد دلاتے ہیں'' (اس کے بعد مفصل روایت ہے جس کا ترجمہ اوپر آگیا ہے) پس اشارہ کیا نبی ﷺ نے اس بات کی طرف کہ احوال دائمی نہیں ہوتے —— اور اس کی (دوسری) مثال وہ بھی ہے جو عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے خواب میں دیکھی تھی یعنی جنت اور جہنم کو۔

☆　☆　☆

دوسرا حال: فراستِ صادقہ

فراستِ صادقہ اور واقعی خیال بھی عقل کا ایک حال ہے (ایسا شخص اَلمعیّ کہلاتا ہے، جو کسی کے بارے میں کوئی گمان قائم کرتا ہے تو وہ صدفی صد صحیح نکلتا ہے) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب بھی کسی چیز کے متعلق یہ کہتے کہ: ''اس کے متعلق میرا گمان ایسا ہے'' تو میں اس چیز کو ویسا ہی پاتا جیسا ان کا گمان ہوتا تھا

(بخاری حدیث ۳۸۶۶ مناقب الانصار، باب ۳۵)

تیسرا حال: اچھے خواب

اچھے خواب دیکھنا بھی عقل کا ایک حال ہے۔ نبی ﷺ سالکین کے خوابوں کی تعبیر کا اہتمام فرمایا کرتے تھے۔

روایت میں آیا ہے کہ آپ فجر کی نماز کے بعد مسجد میں تشریف رکھتے، اور صحابہ سے دریافت کرتے کہ: ''تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہو تو بیان کرے تاکہ میں اس کی تعبیر دوں'' (مسلم شریف ۱۵: ۳۰ کتاب الرؤیا) اگر کوئی خواب بیان کرتا تو جو کچھ اللہ تعالیٰ دل میں ڈالتے، تعبیر بیان فرماتے۔

اور اچھے خوابوں سے مراد: اِس قسم کے خواب ہیں: (۱) نبی ﷺ کو خواب میں دیکھنا (۲) جنت یا جہنم کو خواب میں دیکھنا (۳) نیک بندوں کو اور انبیاء علیہم السلام کو خواب میں دیکھنا (۴) مقاماتِ متبرکہ جیسے بیت اللہ کو خواب میں دیکھنا (۵) آئندہ پیش آنے والے واقعات کو خواب میں دیکھنا۔ پھر وہ واقعہ ویسا ہی رونما ہو جیسا اس نے دیکھا ہے۔ مثلاً دیکھا کہ ایک حاملہ کے لڑکا پیدا ہوا۔ پھر واقعی لڑکا پیدا ہوا (۶) گذشتہ واقعات کو واقعی طور پر خواب میں دیکھنا۔ مثلاً دیکھا کہ کسی کا انتقال ہو گیا۔ پھر انتقال کی خبر آئی (۷) کوئی ایسا خواب دیکھنا جو کوتاہی پر آگاہ کرے۔ مثلاً خواب دیکھا کہ کتّا اس کو کاٹ رہا ہے۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ غصیلا ہے، اپنا غصہ کم کرے (۸) انوار اور ستھرے کھانوں کو خواب میں دیکھنا۔ مثلاً دودھ، شہد اور گھی کا پینا (۹) ملائکہ کو خواب میں دیکھنا۔

چوتھا حال: مناجات میں حلاوت اور قطع وساوس

اللہ سے مناجات (سرگوشی، دعاء عبادت) میں حلاوت (چاشنی) پانا اور وساوس کا نہ آنا بھی عقل کا ایک حال ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص اچھی طرح وضو کرنے کے بعد دو نفلیں اس طرح پڑھے کہ ان میں اپنے دل سے باتیں نہ کرے تو اس کے سابقہ گناہ بخش دیئے جاتے ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۲۸۷ کتاب الطہارۃ)

پانچواں حال: محاسبہ (اپنی پڑتال کرنا)

نفس کا اور اعمال کا محاسبہ کرنا بھی عقلمند کا کام ہے۔ جس کی عقل نور ایمانی سے منور ہوتی ہے۔ اور آخرت اس کی نگاہ میں دنیا سے زیادہ اہم ہوتی ہے وہ ضرور اپنا محاسبہ کرتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ''دانا: وہ ہے جو اپنے نفس کو حقیر سمجھتا ہے اور موت کے بعد کے لئے تیاری کرتا ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۵۲۸۹) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی تقریر میں ارشاد فرمایا ہے: ''اپنا محاسبہ کرو اس سے پہلے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے، اور اپنا وزن کرو اس سے پہلے کہ تمہارا وزن کیا جائے۔ اور اللہ کے سامنے بڑی پیشی کے لئے (اعمال سے) آراستہ ہو جاؤ: ''جس دن تم حساب کے لئے پیش کئے جاؤ گے (اور) تمہاری کوئی ادنی بات اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہ ہوگی'' (سورۃ الحاقہ آیت ۱۸) (درمنثور ۶: ۲۶۱ ترمذی حدیث ۲۴۵۷)

چھٹا حال: حیا (شرم)

معروف حیا: یہ ہے کہ آدمی ان باتوں سے جن کو لوگ برا جانتے ہیں، جھجکے اور باز رہے۔ یہ حیا: نفس کے مقامات میں

سے ہے۔ ہر باحیا میں یہ وصف ہوتا ہے۔ اور ایک اللہ سے حیا کرنا ہے۔ یہ عقل کے احوال میں سے ہے۔ یہ حیا: اللہ کی عظمت وجلالت کے تصور سے، اپنی عاجزی اور درماندگی کے خیال سے، حق اللہ کی بجا آوری میں کوتاہی کے احساس سے اور اپنی بشری کمزوریوں کو پیش نظر لانے سے پیدا ہوتی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں اندھیرے گھر میں نہاتا ہوں، پھر بھی اللہ سے شرما کر سکڑ جاتا ہوں'' اور صدیق اکبر فرماتے ہیں: ''میں بیت الخلاء جاتا ہوں تو اللہ سے شرما کر سر ڈھانک لیتا ہوں'' (کنز العمال حدیث ۵۸۱۸ اخلاق: حیاء)

ومنها: الفِراسة الصادقة، والخاطر المطابق للواقع: قال ابن عمر: ماسمعتُ عمر يقول لشيئ قط: "إنى لأظنه كذا" إلا كان كمايظن.

ومنها: الرؤيا الصالحة: وكان صلى الله عليه وسلم يَعْتَنِىْ بتعبير رؤيا السالكين، حتى رُوى أنه كان يجلس بعد صلاة الصبح، ويقول: "من رأى منكم رؤيا؟" فإن قَصَّها أحد عَبَّرَ ماشاء الله.

وأعنى بالرؤيا الصالحة: رؤيةَ النبى صلى الله عليه وسلم فى المنام، أو رؤيةَ الجنة والنار، أو رؤيةَ الصالحين والأنبياء عليهم السلام، أو رؤيةَ المشاهد المتبركة كبيت الله، أو رؤيةَ الوقائع الآتية، فيقع كما يرى، أو الماضية على ماهى عليه، أو رؤيةَ ما ينبهه على تقصيره، بأن يرى غَضَبَه فى صورة كلب يَعَضُّه، أو رؤيةَ الأنوار والطيباتِ من الرزق، كشرب اللبن، والعسل، والسمن، أو رؤيةَ الملائكة، والله أعلم.

ومنها: وجدانُ حلاوة المناجاة، وانقطاعُ حديث النفس: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من صلى ركعتين، لايُحَدِّثُ فيهما نفسَه، غُفرله ماتقدم من ذنبه"

ومنها: المحاسبة: وهى تتولد من بين العقل المتنوِّر بنور الإيمان، والجمعِ الذى هو أولُ مقامات القلب، قال صلى الله عليه وسلم: "الكَيِّسُ من دان نفسه وعمل لما بعدَ الموت" وقال عمر رضى الله عنه فى خطبته: "حاسِبوا أنفسكم قبل أن تُحاسَبوا، وزِنُوْها قبل أن تُوزَنوا، وتَزَيَّنُوا للعَرْضِ الأكبر على الله تعالى﴿يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَاتَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ﴾

ومنها: الحياء: وهو غير الحياء الذى هو من مقامات النفس، ويتولد من رؤيةعزة الله تعالى وجلالِه، مع ملاحظة عَجزه عن القيام بحقه، وتلبُّسِه بالأدناس البشرية، قال عثمان رضى الله عنه: "إنى لأغسل فى البيت المُظْلم، فَأَنْطوى حياءً من الله تعالى.

ترجمہ: اور ازانجملہ: محاسبہ ہے: وہ حال پیدا ہوتا ہے نور ایمان سے منور عقل اور اس جمع کے درمیان سے جو قلب کا

پہلا مقام ہے (جس کا بیان ابھی آرہا ہے)............اور ازانجملہ: حیا ہے اور وہ اس حیا کے علاوہ ہے جو کہ وہ نفس کے مقامات میں سے ہے (جس کا بیان آگے آرہا ہے) اور پیدا ہوتی ہے وہ حیا اللہ کی عظمت وجلالت کے دیکھنے سے، پیش نظر لانے کے ساتھ اپنی بے بسی کو اللہ کے حق کی بجا آوری سے اور اپنے متلبس ہونے کو بشری ناپاکیوں سے الی آخرہ۔(وتلبُّسِہ کا عطف عزۃِ پر ہے)

☆ ☆ ☆

مقاماتِ قلب کا بیان

پہلا مقام: جمعِ خاطر

قلب کا پہلا مقام: جمعیتِ خاطر ہے۔اور وہ یہ ہے کہ آدمی آخرت ہی کو مقصود بنالے۔اسی کا اہتمام کرے۔اور دنیا کا معاملہ اس کی نظر میں ہیچ ہوکر رہ جائے۔نہ اس کا قصد کرے نہ اس کی طرف التفات۔بس گذر بسر کی حد تک ہی اس کی طرف دھیان دے۔صوفیا کی اصطلاح میں جمع خاطر کو ارادۂ آخرت کہتے ہیں۔

جمعیت کے فوائد

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اپنے افکار کو بس ایک فکر بنالیا یعنی فکر آخرت: تو اللہ تعالیٰ اس کی دنیا کی فکروں کے لئے کافی ہوجاتے ہیں۔اور جس کو دنیا کے افکار پراگندہ کردیں: تو اللہ تعالیٰ کو اس کی کچھ پرواہ نہیں کہ وہ کس میدان میں تباہ ہوا'' (مشکوۃ حدیث ۲۶۳ کتاب العلم، فصل ثالث)

تشریح: جمعیّتِ خاطر کے دو فائدے ہیں:

پہلا فائدہ —— اللہ تعالیٰ اس کے لئے کافی ہوجاتے ہیں —— جو بندہ ہمہ تن اللہ کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے اور فکر آخرت میں لگ جاتا ہے: اللہ تعالیٰ اس کے کاموں کے لئے کافی ہوجاتے ہیں۔کیونکہ اللہ کی طرف کامل توجہ بابِ کرم کو وَا کرنے میں ویسی ہی تاثیر رکھتی ہے جیسی دعا۔بلکہ کامل توجہ ہی دعا کا مغز اور اس کا خلاصہ ہے۔غافل قلب کی دعا تو شرفِ قبولیت سے محروم ہی رہتی ہے۔پس جب بندہ پوری توجہ سے اللہ کی خوشنودی والے کاموں میں لگ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے سب کام سنوار دیتے ہیں۔

دوسرا فائدہ —— دل میں اللہ ورسول کی محبت پیدا ہوتی ہے —— جب فکر آخرت پائی جاتی ہے۔اور اللہ کی طرف بندے کی کامل توجہ ہوجاتی ہے، اور وہ ظاہراً وباطناً بندگی والے کاموں میں لگ جاتا ہے۔تو اس کے دل میں اللہ

تعالیٰ کی اور رسول اللہ ﷺ کی محبت پیدا ہوتی ہے۔

اور محبت سے: اللہ تعالیٰ کے مالک الملک ہونے پر اور رسول اللہ ﷺ کے سچے رسول ہونے پر صرف ایمان لانا مراد نہیں، بلکہ وہ ایک چاہت ہے، جیسی پیاسے میں پانی کی، اور بھوکے میں کھانے کی چاہت۔

اور یہ محبت: اس وقت پیدا ہوتی ہے جب عقل اللہ کے ذکر سے اور اللہ کی عظمت کے تصور سے لبریز ہو جاتی ہے۔ اور عقل سے قلب پر نور ایمان کی بارش ہوتی ہے۔ اور دل اپنی فطری استعداد سے اس نور کا استقبال کرتا ہے۔

﴿وأما المقامات المتعلقة بالقلب﴾

فأولها: الـجَـمْـعُ: وهو أن يكون أمر الآخرة هو المقصود الذى يَهْتَمُّ به، ويكون أمر الدنيا هَيِّـنًـا عـنـده، لايـقـصُدُه ولايلتفت إليه إلا بالعرض، من جهةِ أن يكون بُلْغَةً له إلى ماهو بسبيله.

والجمع: هو الذى يُسميه الصوفيةُ بالإرادة.

قـال صـلـى الله عـلـيـه وسـلـم: "مـن جعل همَّه همًا واحدًا: هَمَّ الآخرة، كفاه الله هَمَّه، ومن تَشَعَّبَتْ به الهمومُ: لم يبالِ الله فى أىِّ أوديةٍ هلك"

أقول: هـمة الإنسان لها خاصية مثلَ خاصيةِ الدعاء فى قرع باب الجود، بل هى مخ الدعاء وخلاصته، فإذا تَجَرَّدَتْ همتُه لمرضياتِ الحق كفاه الله تعالى.

فـإذا حـصـل جمعُ الهمة، وواظب على العبودية ظاهرًا وباطنا: أَنْتَجَ ذلك فى قلبه محبةَ الله ومحبةَ رسوله.

ولانـريـد بالمحبة: الإيمانَ بأن الله تعالى مالك الملك، وأن الرسول صادق، مبعوث من قِبَلِهِ إلى الخلق: فقط، بل هى حالة شبيهة بحالة الظمآن بالنسبة إلى الماء، والجائع بالنسبة إلى الطعام.

وتَـنْـشَـأ المحبةُ من امتلاء العقل بذكر الله تعالى، والتفكرِ فى جلاله، وترشُّحِ نور الإيمان من العقل إلى القلب، وتلقى القلبِ ذلك النورَ بقوة مجبولة فيه.

ترجمہ: اور رہے وہ مقامات جو قلب سے تعلق رکھتے ہیں: پس ان میں پہلا مقام (قلب اور توجہ کو) اکٹھا کرنا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آخرت کا معاملہ ہی وہ مقصود ہو جس کا آدمی اہتمام کرے، اور دنیا کا معاملہ اس کے نزدیک ہیچ ہو جائے، نہ وہ اس کا قصد کرے، اور نہ اس کی طرف التفات کرے، مگر تبعاً: بایں طور کہ وہ گذر بسر ہو اس کے لئے اس آخرت تک پہنچنے کے لئے جس کے وہ در پے ہے۔ اور جمع ہی کو صوفیا ارادہ کہتے ہیں۔

حدیث شریف (ترجمہ گذر چکا) میں کہتا ہوں: انسان کی کامل توجہ کے لئے ایک خاصیت ہے دعا کی خاصیت کی

طرح بابِ کرم کو کھٹکھٹانے میں، بلکہ کامل توجہ ہی دعا کا مغز اور اس کا نچوڑ ہے۔ پس جب اس کی کامل توجہ خالص ہوجاتی ہے اللہ کی خوشنودیوں (والے کاموں) کے لئے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے کافی ہوجاتے ہیں —— پس جب کامل توجہ کا اجتماع پایا جاتا ہے، اور وہ بندگی پر ظاہراً و باطناً مواظبت کرتا ہے تو وہ جمع نتیجہ نکالتا ہے اللہ کی محبت کا اور اس کے رسول کی محبت کا اس کے دل میں۔

اور نہیں مراد لیتے ہم محبت سے اس بات پر ایمان لانا کہ اللہ تعالیٰ ملک کے مالک ہیں، اور یہ کہ رسول سچے ہیں، وہ اللہ کی طرف سے مخلوق کی طرف بھیجے گئے ہیں: بس اتنی بات۔ بلکہ محبت ایک حالت ہے، ویسی جیسی پیاسے کی حالت پانی کی بہ نسبت۔ اور بھوکے کی حالت کھانے کی بہ نسبت۔

اور (یہ) محبت پیدا ہوتی ہے دل کے لبریز ہونے سے اللہ کے ذکر سے، اور اللہ کی عظمت میں غور وفکر سے، اور عقل سے قلب پر نورِ ایمان کے مترشح ہونے سے، اور دل کے استقبال کرنے سے اس نور کا: ایسی قوت کے ذریعہ جو اس قلب میں پیدا کی گئی ہے۔

لغت: البُلْغَة: ما یُتَبَلَّغُ به من العیش (لسان العرب) یعنی گذارہ بھر مقدار۔

☆ ☆ ☆

محبتِ خاص ہی قلب کا مقام ہے

اوپر جو جمع خاطر کا فائدہ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے دل میں اللہ ورسول کی محبت پیدا ہوتی ہے، اس سے عام محبت مراد نہیں، وہ تو مطلق ایمان کا مقتضی ہے، بلکہ خاص محبت مراد ہے، وہی کمالِ ایمان کی علامت اور قلب کا مقام ہے۔

اور محبت خاص: یہ ہے کہ اللہ ورسول پر ایمان کی حلاوت: اولاً عقل پر غلبہ پائے، پھر وہ لذّت: قلب ونفس پر چھا جائے، اور دونوں کی چاہتوں کا قائم مقام بن جائے۔ دل کا میلان: عام طور پر اولاد، ازواج اور اموال کی طرف ہوتا ہے، اور نفس کی چاہت: لذائذ: عمدہ کھانے اور ٹھنڈا پانی ہوتا ہے، جب ایمان ویقین کی لذت: اِن میلانات وخواہشات کی جگہ لے لیتی ہے تو وہ اعلیٰ درجہ کی محبت ہوتی ہے، اور وہی مخصوص محبت: قلب کا مقام ہے۔

درج ذیل روایات میں، اور اس جیسی دوسری روایات میں، اسی خاص محبت کا تذکرہ ہے:

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ایمان کی حلاوت اسی کو نصیب ہوتی ہے، جس میں تین باتیں پائی جاتی ہیں: ایک یہ کہ اللہ ورسول کی محبت اس کو تمام ماسوی سے زیادہ ہو۔ دوسری یہ کہ جس سے بھی محبت ہو، اللہ ہی کے لئے ہو۔ تیسری یہ کہ ایمان کے بعد کفر کی طرف پلٹنے کو ایسا ناپسند کرے، جیسا آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند کرتا ہے“ (مشکوٰۃ حدیث ۸)

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”داؤد علیہ السلام کی دعاؤں میں سے ہے: ”اے اللہ! میں آپ سے آپ

کی محبت کی التجا کرتا ہوں، اوران بندوں کی محبت کی: جو آپ سے محبت کرتے ہیں، اوران اعمال کی محبت کی: جو آپ کی محبت تک پہنچاتے ہیں۔ اے اللہ! ایسا کردیں کہ میری جان اور میرے اہل وعیال کی محبت سے، اورٹھنڈے پانی کی چاہت سے بھی زیادہ مجھے آپ کی محبت اور چاہت ہو'' (ترمذی ۲: ۱۸۷)

حدیث ـــــ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپؐ مجھے میری جان کے علاوہ ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، قسم اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! جب تک میں آپ کو آپ کی جان سے بھی زیادہ پیارا نہ ہوجاؤں (محبتِ خاص جو قلب کا مقام ہے میسر نہیں آسکتا!) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اب اے اللہ کے رسول! آپؐ مجھے میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں! آپؐ نے فرمایا: ''اب اے عمر!'' یعنی اب حبّ خاص کا مقام حاصل ہوگیا۔ (بخاری حدیث ۶۶۳۲)

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک اس کو اس کے ماں باپ، اولاد، اورسب لوگوں سے زیادہ مجھ سے محبت نہ ہو'' (مشکوٰۃ حدیث ۷)

خلاصہ: یہ ہے کہ ایمان کامل اس وقت ہوتا ہے، جب اللہ ورسول سے تعلق محض رسمی یا عقلی نہ ہو، بلکہ اس کے ساتھ گرویدگی بھی ہو۔ وہ اللہ ورسول کی محبت میں ایسا سرشار ہو کہ ہر چیز سے زیادہ اُس کو اللہ ورسول کی محبت ہو۔ اوراس محبت کا اس کے دل پر ایسا قبضہ ہو کہ ازواج واولاد اوراموال کی محبت مغلوب ہوگئی ہو، اور وہ محبت نفس پر ایسی حاوی ہو کہ وہ بمنزلۂ لذاتِ نفس ہوگئی ہو۔ یعنی خاص محبت ہی قلب کا مقام ہے۔

نوٹ: تقریر میں ترتیب بدل گئی ہے، کتاب سے ملاتے وقت اِس کا خیال رکھیں۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " ثلاث من كنّ فيه وجد حَلاوة الإيمان: من كان الله ورسولُه أحبَّ إليه مماسواهما" الحديثَ.

وقال صلى الله عليه وسلم في دعائه: " اللهم اجعل حُبَّك أحبَّ إلَيَّ من نفسي وسمعي وبصري وأهلي ومالي ومن الماء البارد"

وقال لعمر: " لاتكون مؤمنًا حتى أكون أحبَّ إليك من نفسك" فقال عمر: والذي أَنزل عليك الكتابَ! لَأَنْتَ أحبُّ إليّ من نفسي التي بين جَنْبَيَّ؛ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " الْآن يا عمر! تَمَّ إيمانك".

وعن أنس قال: سمعتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: " لايؤمن أحدكم حتى أكون أحبَّ إليه من ولده، ووالده، والناس أجمعين"

أقول: أشار النبي صلى الله عليه وسلم إلى أن حقيقةَ الحب غلبةُ لذةِ اليقين على العقل، ثم

علی القلب والنفسِ، حتی یقومَ مقامَ مشتھی القلب فی مجری العادۃ: من حب الولد والأھل والمال، وحتی یقوم مقام مشتھی النفس: من الماء البارد بالنسبۃ إلی العطشان، فإذا کان کذلک فھو الحب الخاص الذی یُعَدُّ من مقامات القلب.

ترجمہ: چار روایتیں جن کا ترجمہ گذر چکا ہے۔ دوسری روایت میں جو دعا ہے وہ حضرت داؤد علیہ السلام کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ دعا بہت ہی پسند تھی، اسی لئے آپؐ نے یہ دعا صحابہ کو تلقین فرمائی ہے۔ پس اس طرح وہ آپؐ کی بھی دعا ہے۔ اور حضرت شاہ صاحب نے اس دعا کے الفاظ حفظ سے لکھے ہیں، اس میں وسمعی وبصری نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: نبی ﷺ نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ محبت کی حقیقت: یقین کی لذت کا عقل پر غلبہ ہے، پھر قلب ونفس پر، یہاں تک کہ قائم مقام ہوجائے وہ محبت: جری عادت میں دل کی خواہش کے یعنی اولاد اور بیوی اور مال کی چاہت کے اور یہاں تک کہ قائم مقام ہوجائے وہ نفس کی خواہش کے، یعنی ٹھنڈے پانی کی چاہت کے پیاسے کی نسبت سے۔ پس جب وہ محبت ایسی ہوجائے تو وہی خاص محبت ہے، جو قلب کے مقامات میں سے شمار کی جاتی ہے۔

☆ ☆ ☆

محبتِ خاص کی علامت

حدیث —— نبی ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملنا پسند کرتا ہے: اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنا پسند کرتے ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۶۰۱ یہ حدیث تفصیل سے رحمۃ اللہ ۳: ۶۵۵ میں گذر چکی ہے)

تشریح: اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے وہ ہیں: جن میں اللہ تعالیٰ کی محبتِ خاص پائی جاتی ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ سے سچی محبت رکھتا ہے: وہ اللہ تعالیٰ سے ملنا پسند کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی ملاقات: موت کے پُل سے گذر کر ہی ہوسکتی ہے۔ اس لئے اس حدیث میں محبتِ خاص کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ جو موت کی تمنا رکھتا ہے: اسی کو اللہ تعالیٰ سے سچی محبت ہے۔ ورنہ محبت کا دعویدار تو ہر کوئی ہے۔

فائدہ: یہود ونصاریٰ اس بات کے دعویدار تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں (سورۃ المائدۃ آیت ۱۸) چنانچہ سورۃ البقرہ آیات ۹۴-۹۶ میں اور سورۃ الجمعہ آیات ۶ و ۷ میں یہود سے کہا گیا کہ اگر تمہارا یہ دعوی سچا ہے تو موت کی تمنا کرو، کیونکہ موت کے بعد ہی اللہ کا وصل نصیب ہوتا ہے۔ اور جس کو یقین ہوتا ہے کہ وہ محبوب خدا ہے تو اس کو وصلِ حبیب کی تمنا کرنے میں کیا ڈر ہوسکتا ہے۔ مگر اللہ پاک نے خبر دی کہ وہ موت کی تمنا ہرگز نہیں کرسکتے۔ وہ تو موت کا نام سن کر ہی بھاگتے ہیں، کیونکہ وہ اپنے کرتوتوں کو اور ان کے انجام بد کو جانتے ہیں۔ پس وہ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں، جو سچی محبت کرنے والے تھے وہ تو یہ رجز پڑھتے ہیں: غَدًا نَلْقِی الأَحِبَّۃ: محمداً وَّ حِزْبَہٗ: کل ہم محبوبوں سے ملیں گے: محمد ﷺ سے اور ان کی

جماعت سے! اور وہ کہتے تھے: يَاحَبَّذَا الجنةُ وَاقْتِرَابُهَا: طَيِّبَةٌ وَبَارِدٌ شَرَابُهَا: واہ جنت اور اس کی نزدیکی: وہ ستھری ہے اور اس کا مشروب ٹھنڈا ہے۔ یہ حضرات اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور جنت کے اشتیاق میں موت کی تمنا کیا کرتے تھے، یہی محبتِ خاص کی علامت ہے۔

آثارِ محبت: حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جس نے خالص محبتِ الٰہی کا کچھ مزہ چکھ لیا: تو یہ چیز اس کو دنیا طلبی سے غافل کردے گی، اور اس کو تمام انسانوں سے متوحش کردے گی'' (احیاء العلوم ۴: ۲۸۵ كتاب المحبة إلخ القول فی علاماتِ محبة العبد لله تعالى)

تشریح: حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد: محبتِ خاص کے آثار کی آخری درجہ کی وضاحت ہے۔

وضاحت: جو مؤمن محبتِ خاص کی دولت سے کچھ بھی بہرہ ور ہوتا ہے، اس میں دو باتیں نمایاں ہوتی ہیں:

پہلی بات: اس کا دنیا طلبی کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔ اب اس کے دل میں دنیا کی طلب اور خواہش باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ جب دل اللہ کی محبت سے بھر جاتا ہے تو دنیا کی محبت اس کے دل سے نکل جاتی ہے۔ اب وہ دنیوی ضرورت کی حد تک ہی مال و منال سے تعلق رکھتا ہے۔

دوسری بات: اس کو لوگوں سے وحشت ہو جاتی ہے۔ وہ ہر وقت اللہ کی یاد میں مگن رہتا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر نے خوب کہا ہے:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے ÷ یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے!

فائدہ: یہ محبتِ خاص کے آخری درجہ کے آثار ہیں۔ یعنی اس سے آگے کوئی درجہ نہیں (یہی فائدہ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے)

حبِّ خاص کا صلہ —— جب بندے کی اللہ تعالیٰ سے محبت کامل ہو جاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ اس بندے سے محبت کرنے لگتے ہیں، کیونکہ احسان کا بدلہ احسان ہی ہوتا ہے۔

حبِ الٰہی کی حقیقت: اور بندہ سے اللہ کی محبت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے سے منفعل (اثر قبول کرنے والے) ہوتے ہیں۔ کیونکہ انفعال و تاثر سے اللہ تعالیٰ کی ذات بہت ہی بلند و بالا ہے۔ بلکہ حبِّ الٰہی کی حقیقت یہ ہے کہ اب اللہ تعالیٰ بندے کے ساتھ اس کی استعداد کے موافق معاملہ فرماتے ہیں یعنی جس طرح محبّ: اپنے محبوب کی ہر طرح دلداری کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس بندہ کی رعایت کرتے ہیں، اور اس پر عنایات فرماتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کا بندوں کے ساتھ جو مختلف معاملہ ہوتا ہے: وہ درحقیقت بندوں کی استعداد کے اختلاف کا نتیجہ ہوتا ہے، جیسے سورج کی تابانی یکساں ہوتی ہے، مگر آئینہ اس سے زیادہ منور ہوتا ہے، اور کالا توا کم۔ اسی طرح صیقل شدہ اجسام زیادہ گرم ہوتے ہیں، اور دوسرے کم۔ اور جیسے بارش کا فیضان عام ہوتا ہے، مگر زمین کی روئیدگی مختلف ہوتی ہے،

جو زمین کی قابلیت واستعداد کے اختلاف کا نتیجہ ہوتی ہے:

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست ÷ در باغ لالہ روید و درشورہ بوم خس

اسی طرح جو بندہ صفاتِ خسیسہ (کمینے احوال) کے ساتھ متصف ہوتا ہے، جو اس کو بہائم کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے: آفتاب صمدیت (اللہ تعالیٰ) کا معاملہ اس کے ساتھ اس کی استعداد کے موافق ہوتا ہے یعنی وہ مردود وملعون ہوتا ہے۔ اور جو بندہ صفاتِ فاضلہ کے ساتھ متصف ہوتا ہے، جو اس کو ملأ اعلی کی لڑی میں پروتا ہے: آفتابِ صمدیت اس پر ضیا پاشی کرتا ہے، اور نور برساتا ہے، یہاں تک کہ وہ بارگاہ عالی کا ایک قیمتی ہیرا بن جاتا ہے، اور اس پر ملأ اعلی کے احکام جاری ہونے لگتے ہیں۔ پس اس وقت یہ بات صادق آتی ہے کہ: ''اللہ نے اس کو اپنا محبوب بنالیا'' یعنی اللہ تعالیٰ کا اس کے ساتھ ایسا معاملہ ہونے لگا، جیسا محبّ اپنے محبوب کے ساتھ کرتا ہے۔ اور اس وقت وہ بندہ ولی اللہ (اللہ کا دوست) کہلاتا ہے۔

قال صلى الله عليه وسلم: ''من أحب لقاء الله أحب الله لقاء ه''

أقول: جعل النبى صلى الله عليه وسلم ميلَ المؤمن إلى جناب الحق، وتعطُّشَه إلى مقام التجرد من جلباب البدن، وطلبَه التخلصَ من مضايق الطبيعة إلى فَضاء القدس ـــــ وحيث يتصل إلى مالايُوصف بالوصف ـــــ علامةً لصدق محبته لربه.

قال الصديق رضى الله عنه: '' من ذاق من خالصِ محبةِ الله تعالى: شغله ذلك عن طلب الدنيا، وأوحشه عن جميع البشر''

أقول: قوله هذا غايةٌ فى الكشف عن آثار المحبة.

فإذا تمت محبةُ المؤمن لربه، أداه ذلك إلى محبة الله له.

وليس حقيقةُ محبة الله لعبده انفعالُه من العبد، تعالى عن ذلك علوًّا كبيرًا؛ ولكن حقيقتُها: المعاملة معه بما استعدَّ له، فكما أن الشمس تُسَخِّنُ الجسمَ الصقيلَ أكثَرَ من تسخينها لغيره، وفعلُ الشمس واحد فى الحقيقة، ولكنه يتعدُّد بتعدُّد استعداد القوابل، كذلك لله تعالى عنايةٌ بنفوس عباده، من جهة صفاتهم وأفعالهم.

فمن اتَّصف منهم بالصفات الخسيسة التى يَدخل بها فى عداد البهائم، فعل ضوءُ شمسِ الأحديةِ فيه مايناسب استعدادَه؛ ومن اتَّصف بالصفات الفاضلة التى يدخل بسببها فى عداد الملأ الأعلى، فعل ضوء شمس الأحدية فيه نورًا وضياءً، حتى يصير جوهرًا من جواهر حظيرة القدس، وانسحب عليه أحكام الملأ الأعلى؛ فعند ذلك يقال: '' أحبه الله'' لأن الله تعالى فعل معه فعل المحب بحبيبه، ويسمى العبد حينئذٍ وليًا۔

ترجمہ: حدیث کے بعد: نبی ﷺ نے بارگاہِ حق کی طرف مؤمن کے میلان کو، اور بدن کی چادر سے علحدہ ہونے کے مقام (موت) کی طرف شدتِ اشتیاق کو، اور طبیعت (عالم مادی) کی تنگ نائیوں یعنی سختیوں سے عالم قُدس کی کشادہ جگہ کی طرف نکل بھاگنے کی انتہائی خواہش کو ——— جہاں وہ اس ذات سے مل جائے گا، جس کا کوئی وصف بیان نہیں کیا جاسکتا یعنی وصالِ خداوندی نصیب ہوگا ——— علامت گردانا ہے اپنے پروردگار سے اس کی سچی محبت کے لئے۔

صدیق رضی اللہ عنہ کے قول کے بعد: میں کہتا ہوں: آپؐ کا یہ ارشاد آثار محبت کی انتہائی وضاحت ہے۔

پس جب مؤمن کی اس کے پروردگار سے محبت کامل ہوجاتی ہے تو وہ محبت اس کو پہنچاتی ہے اس سے اللہ کے محبت کرنے تک یعنی اب اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں ——— اور اپنے بندے سے اللہ کی محبت کی حقیقت: اللہ تعالیٰ کی بندے سے اثر پذیری نہیں ہے۔ تأثر سے اللہ کی ذات بہت ہی بالاتر ہے۔ بلکہ اس کی حقیقت: بندے کے ساتھ برتاؤ کرنا ہے اس استعداد کے مطابق جو بندے میں پائی جاتی ہے۔ جس طرح یہ بات ہے کہ سورج گرم کرتا ہے صیقل شدہ جسم کو: دوسرے اجسام کو گرم کرنے سے زیادہ، درانحالیکہ سورج کا فعل حقیقت میں یکساں ہے، مگر وہ اثر قبول کرنے والے اجسام کی استعداد کے تعدد سے متعدد ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لئے عنایت ہے ان کے بندوں کے نفوس کے ساتھ: ان کی صفات اور ان کے افعال کے لحاظ سے ——— پس ان میں سے جو شخص صفاتِ خسیسہ کے ساتھ متصف ہوتا ہے، جن کی وجہ سے وہ چوپایوں کی گنتی میں داخل ہوجاتا ہے: تو آفتابِ احدیت کی روشنی اس میں وہ بات کرتی ہے جو اس کی استعداد کے مناسب ہوتی ہے۔ اور جو ایسی صفاتِ فاضلہ کے ساتھ متصف ہوتا ہے، جن کی وجہ سے وہ ملأ اعلیٰ کے شمار میں داخل ہوجاتا ہے: تو آفتابِ احدیت کی روشنی اس میں نور وضیاء کا فیضان کرتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بارگاہِ مقدس کے ہیروں میں سے ایک ہیرہ بن جاتا ہے۔ اور گھستے ہیں یعنی جاری ہوتے ہیں اس پر ملأ اعلیٰ کے احکام۔ پس اس وقت کہا جاتا ہے: ''اللہ نے اس کو محبوب بنالیا'' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو ایک محبّ اپنے محبوب کے ساتھ کرتا ہے۔ اور اس وقت وہ بندہ ''ولی'' کہلاتا ہے۔

تصحیح: صدیق رضی اللہ عنہ کے قول میں مِن کا اضافہ احیاء العلوم سے کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

وہ احوال: جو بندے سے اللہ کی محبت: آدمی میں پیدا کرتی ہے

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو اس میں کچھ احوال پیدا ہوتے ہیں، جن کو نبی ﷺ نے خوب وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، وہ احوال درج ذیل ہیں:

پہلا حال ——— وہ بندہ مقبولِ خلائق بن جاتا ہے ——— پہلے اس کی قبولیت ملأ اعلیٰ میں اترتی ہے، پھر زمین میں۔

مسلم شریف کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو جبرئیل کو آواز دیتے ہیں (اور فرماتے ہیں:) میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں، پس آپ بھی اس سے محبت کریں۔ چنانچہ جبرئیل اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر وہ آسمانوں میں صدا لگاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یقیناً فلاں بندے سے محبت کرتے ہیں، پس تم بھی اس سے محبت کرو، چنانچہ آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر زمین میں اس کی مقبولیت اتاری جاتی ہے'' یعنی جن ّوانس اس سے محبت کرنے لگتے ہیں (مشکوۃ حدیث ۵۰۰۵ رحمۃ اللہ ا:۲۰۷ میں یہ حدیث پوری آچکی ہے)

تشریح: جب عنایتِ الٰہی اِس بندے کی محبت کی طرف متوجہ ہوتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں۔تو وہ محبت ملأ اعلی کی طرف منعکس ہوتی ہے یعنی ملأ اعلی پر اس محبت کا پرتو پڑتا ہے، جیسے سورج کی روشنی صاف وشفاف آئینوں میں منعکس ہوتی ہے۔ پھر ملأ سافل کو وہ محبت الہام کی جاتی ہے۔ پھر زمینی مخلوقات میں سے جن میں استعداد ہوتی ہے، ان کو وہ محبت الہام کی جاتی ہے، جیسے نرم زمین پانی کے کھڈے سے نمی جذب کرتی ہے۔ اسی طرح وہ بندہ مقبولِ خلائق بن جاتا ہے۔

دوسرا حال —— اس مقبول بندے کے دشمن رسوا ہوتے ہیں —— حدیث قدسی میں ہے کہ: ''جو شخص میرے دوست سے دشمنی رکھتا ہے: میں اس کو جنگ کا الٹی میٹم دیتا ہوں!'' (بخاری حدیث ۶۵۰۲)

تشریح: جب کسی بندے سے اللہ تعالیٰ کی محبت: ملأ اعلی کے نفوس کے آئینوں میں منعکس ہوتی ہے، پھر زمین والوں میں سے اس بندے کا کوئی مخالف اس محبت کی مخالفت کرتا ہے یعنی اس سے بجائے محبت کے عداوت رکھتا ہے تو ملأ اعلی کو اس مخالفت کا احساس ہوتا ہے، جیسے ہمارا پاؤں چنگاری پر پڑتا ہے تو ہمیں گرمی کا احساس ہوتا ہے۔ پھر ان کے نفوس سے نفرت وعداوت کے قبیل کی شعاعیں نکلتی ہیں جو اس حبیبِ خدا کے دشمن کو گھیر لیتی ہیں۔ اس وقت وہ رسوا کیا جاتا ہے، اور اس پر عرصۂ حیات تنگ کیا جاتا ہے۔ اور ملأ سافل اور اہل ارض کو الہام کیا جاتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ بری طرح پیش آئیں۔ یہی اللہ تعالیٰ کی اس کے ساتھ جنگ ہے۔

تیسرا حال —— وہ مستجاب الدعوات ہوجاتا ہے —— اس کی دعائیں قبول کی جاتی ہیں یعنی وہ جو چیز مانگتا ہے: دی جاتی ہے۔ اور جس چیز سے پناہ چاہتا ہے: پناہ دی جاتی ہے۔ حدیث قدسی میں ہے: ''اگر وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں ضرور اس کو دیتا ہوں۔ اور اگر وہ کسی چیز سے پناہ چاہتا ہے تو میں ضرور اس کو پناہ دیتا ہوں'' (بخاری حدیث ۶۵۰۲)

تشریح: اور وہ بندہ مستجاب الدعوات اس طرح ہوجاتا ہے کہ اس کی دعائیں اُس بارگاہ مقدس میں پہنچتی ہیں جہاں واقعات کے فیصلے کئے جاتے ہیں۔ جب اس کی کوئی درخواست یا پناہ طلبی بارگاہِ مقدس کی طرف چڑھتی ہے تو وہ فیصلہ کے نزول کا سبب بن جاتی ہے۔ آثار صحابہ میں قبولیت دعا کے سلسلہ کی بہت سی روایات ہیں۔ دو واقعے درج ذیل ہیں:

پہلا واقعہ —— ابوسعدہ اسامۃ بن قتادہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ پر تین افتراء کئے تھے کہ وہ

بزدل ہیں، جہاد کے لئے دوسروں کو بھیجتے ہیں، خود شریک نہیں ہوتے، وہ تقسیم اموال میں انصاف نہیں کرتے۔ جنبہ داری کرتے ہیں یا خود زائد رکھ لیتے ہیں۔ اور عدالتی مقدمات میں انصاف سے فیصلہ نہیں کرتے۔ حضرت سعدؓ نے فرمایا: ''میں ضرور تین دعائیں کرونگا: الٰہی! اگر تیرا یہ بندہ جھوٹا ہے، اور ریاکاری اور شہرت کے لئے کھڑا ہوا ہے تو اس کی عمر کو دراز فرما، اس کی محتاجی کو طویل فرما اور اس کو فتنوں کا نشانہ بنا'' چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بڑھاپے کی وجہ سے اس کی پلکیں آنکھوں پر آگری تھیں، لوگوں سے مانگتا پھرتا تھا اور راستے میں لڑکیوں کو چھیڑتا تھا۔ اور جب اس سے حال پوچھا جاتا تو کہتا کہ مجھے سعد کی بددعا کھا گئی (متفق علیہ بخاری حدیث ۷۵۵)

دوسرا واقعہ ـــــ اَروىٰ بنت اُویس نے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے خلاف کچھ زمین غصب کرنے کا جھوٹا دعوی مروان بن الحکم کی عدالت میں کیا تو آپؓ نے اس کو یہ بددعا دی: ''الٰہی! اگر یہ جھوٹی ہے تو اس کو اندھا کردے اور اس کو اس کی زمین میں مار'' چنانچہ وہ آخر عمر میں اندھی ہوگئی اور اپنی زمین میں چل رہی تھی کہ ایک کھڈے میں گر پڑی اور مرگئی (مسلم ۱۱: ۴۹ کتاب المساقاۃ، باب تحریم الظلم)

چوتھا حال ـــــ اس کو فنا وبقا نصیب ہوتا ہے ـــــ یعنی وہ بندہ اپنی ذات سے نیست، اور اللہ کے ساتھ ہست ہوجاتا ہے۔ صوفیا: اس حال کو ''عبد کے وجود پر اللہ کے وجود کا غلبہ'' کہتے ہیں۔ اور اسی کو فنا فی اللہ اور بقا باللہ بھی کہتے ہیں۔ اس حال کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اللہ کی مرضیات میں محو اور پاش پاش ہوجائے۔ اس کی ذات کا کوئی تقاضا باقی نہ رہے۔ اس کا ہر بُنِ مُو اللہ کی مرضیات کے تابع ہوجائے۔

اور اس حال کا ابتدائی درجہ وہ ہے جو ایک حدیث میں آیا ہے کہ: ''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک اس کی خواہش میری لائی ہوئی ہدایت کے تابع نہ ہوجائے'' (مشکوۃ حدیث ۱۶۷ باب الاعتصام إلخ) یعنی ایمانی برکات جبھی نصیب ہوسکتی ہیں: جب آدمی کے نفس کے میلانات اور اس کے جی کی چاہتیں کلی طور پر دینِ الٰہی کے تابع ہوجائیں۔ یہی بندہ کا اپنی ذات سے فنا ہونا اور اللہ کے ساتھ باقی رہنا ہے۔ اور یہی اپنی ہستی پر اللہ کی ہستی کو غالب کرنا ہے۔

اور اس حال کا انتہائی درجہ وہ ہے جو ایک حدیث قدسی میں آیا ہے کہ: ''میرا بندہ نوافلِ اعمال کے ذریعہ برابر میری نزدیکی حاصل کرتا رہتا ہے، تا آنکہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ پھر جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے۔ اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ پکڑتا ہے۔ اور اس کا پیر بن جاتا ہوں، جس سے وہ چلتا ہے (بخاری حدیث ۶۵۰۲)

تشریح: بندے کی قوتِ عملیہ جو اس کے بدن کے جزء جزء میں پھیلی ہوئی ہے، جب وہ دینِ الٰہی اور مرضیاتِ خداوندی کے تابع ہوجاتی ہے۔ اور تمام اعضاء: ہاتھ پیر، ناک کان اور آنکھیں اطاعت شعار ہوجاتی ہیں، تو انوارِ الٰہی بندے کو ڈھانک لیتے ہیں۔ اور اس نور کا ایک حصہ اس کے تمام قویٰ میں داخل ہوجاتا ہے۔ پس قُویٰ میں ایسی برکات پیدا

ہوتی ہیں اوران سے ایسے اعمال صادر ہوتے ہیں، جو جانے پہچانے ہوئے نہیں ہوتے۔ یعنی اس سے محیر العقول اعمال صادر ہوتے ہیں۔ اس وقت بندے کے وہ افعال اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، جیسا کہ مذکورہ حدیث قدسی میں وارد ہوا ہے۔

رہی یہ بات کہ بندے کے اعمال جواللہ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں تواس نسبت کی بنیاد کیا ہے؟ پس جاننا چاہئے کہ نسبت کی متعدد بنیادیں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً: کوئی کام کسی کے حکم سے کیا جائے: تو وہ فعل آمر کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جیسے یہ شہر فلاں امیر نے بسایا، حالانکہ بسانے والے لوگ ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی کام کسی کے حکم سے اوراس کی مرضی کے مطابق کیا جائے یا بشر کوئی ایسا کام کرے جو عادۃً اس کی استطاعت سے باہر ہے، تو بھی اس کی نسبت اللہ کی طرف کی جاتی ہے۔ جیسے غزوۂ بدر میں جب جنگ کا آغاز ہوا تو نبی ﷺ نے ایک مٹھی کنکریاں لشکرِ کفار کی طرف پھینکیں۔ اور تین مرتبہ شَاھَتِ الوجوہ (چہرے بدشکل ہوجائیں) فرمایا: خدا کی قدرت سے کنکریوں کے ریزے ہر کافر کی آنکھ میں پہنچے۔ وہ سب آنکھیں ملنے لگے۔ اِدھر سے مسلمانوں نے دھاوا بول دیا۔ آخر بہت سے کفار کھیت رہے۔ اس سلسلہ میں ارشاد پاک ہے: ''سوتم نے ان کو قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قتل کیا۔ اورآپؐ نے خاک نہیں پھینکی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی'' (سورۃ الانفال آیت ۱۷) اور مذکورہ حدیث قدسی میں چونکہ بندے کے اعضاء اللہ کے احکام کے مطابق عمل پیرا ہوچکے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے بندے کے افعال کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

فائدہ: اس انتہائی درجہ میں بندہ جو اپنی ذات سے ''نیست'' اوراللہ کی ذات کے ساتھ ''ہست'' ہوجاتا ہے۔ اور بندے کے وجود پر اللہ کے وجود کا غلبہ ہوجاتا ہے تو وہ کَأنَّ (گویا) کا درجہ ہے۔ درحقیقت وجودوں میں اتحاد نہیں ہوتا، اور نہ ہوسکتا ہے، کیونکہ اللہ کا وجود: خالق کا وجود ہے جو قدیم ہے۔ اور بندے کا وجود: مخلوق کا وجود ہے جو حادث ہے۔ اور حادث وقدیم میں اتحاد نہیں ہوسکتا۔ مگر بعض صوفیا پر یہ حال اس درجہ غالب آگیا کہ وہ وحدۃ الوجود کے قائل ہوگئے۔ جو ایک خلافِ واقعہ امر ہے۔

پانچواں حال ـــــ فروگذاشت پر تنبّہ ہونا اوراس کی اصلاح کرنا ـــــ اللہ تعالیٰ اپنے مقبول بندے کو چوکنا کرتے ہیں، جبکہ اس سے کوئی معمولی فروگذاشت ہوجاتی ہے۔ اور جب وہ بندہ اپنی کوتاہی کی اصلاح کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمالیتے ہیں۔ حدیث شریف میں یہ واقعہ مروی ہے کہ ایک دن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے گھر مہمان تھے۔ آپ نے گھر والوں کو ہدایت دی تھی کہ مہمانوں سے نمٹ لیا جائے، میرا انتظار نہ کیا جائے۔ اہل خانہ نے مہمانوں سے کھانا کھانے کے لئے کہا۔ انھوں نے کہا کہ ہم حضرت ہی کے ساتھ کھائیں گے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کسی وجہ سے آنے میں دیر ہوگئی۔ آپؓ نبی ﷺ کے ساتھ کھانا کھا کر دیر سے گھر لوٹے، اہلیہ صاحبہ نے کہا: آپ اپنے مہمانوں کو چھوڑ کر کہاں رہ گئے تھے؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا آپ لوگوں نے ان کو کھانا نہیں

کھلایا؟ اہلیہ نے بتایا: وہ آپ کے بغیر کھانا کھانے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ناراض ہوئے اور قسم کھالی کہ میں کھانا نہیں کھاؤنگا۔ مہمان بھی ناراض ہوئے اور انھوں نے بھی قسم کھالی کہ ہم بھی آپ کے بغیر کھانا نہیں کھائیں گے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تنبہ ہوا اور فرمایا: یہ شیطان کا اثر ہے۔ اور فرمایا: کھانا لاؤ۔ آپؓ نے اپنی قسم توڑ دی اور مہمانوں کے ساتھ کھانا تناول فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کھانے میں برکت فرمائی۔ جب سب لوگ کھا کر فارغ ہوگئے تو دیکھا کہ کھانا پہلے سے تین گنا بچ گیا ہے (بخاری حدیث ۶۱۴۱)

ثم محبةُ الله لهذا العبد تُحدِث فيه أحوالاً، بينها النبی صلی الله علیه وسلم أتم بیان:

فمنها: نزول القبولِ له فی الملأ الأعلی، ثم فی الأرض، قال صلی الله علیه وسلم:" إذا أحب الله تعالی عبدًا، نادی جبریلَ: إنی أحب فلانا فأَحِبَّه، فیحبه جبریل، ثم ینادی جبریل فی السماوات: إن الله تعالی أحب فلانًا فأَحِبُّوه، فیحبُّه أهل السماوات، ثم یوضع له القبول فی الأرض"

أقول: إذا توجهت العنایة الإلٰهیة إلی محبة هذا العبد، انعکست محبتُه إلی الملأ الأعلی، بمنزلة انعکاس ضوء الشمس فی المرایا الصقیلة، ثم أُلهِم الملأُ السافل محبتَه، ثم من استعدَّ لذلك من أهل الأرض، کما تَتَشَرَّبُ الأرضُ الرخوةُ النَّدیٰ من برکَةِ الماء.

ومنها: خذلان أعدائه، قال صلی الله علیه وسلم عن ربه تبارك وتعالی:" من عادی لی ولیًا فقد آذنته بالحرب"

أقول: إذا انعکست محبتُه فی مرایا نفوس الملأ الأعلی، ثم خالفها مخالفٌ من أهل الارض، أحسَّت الملأُ الأعلی بتلك المخالفة کما یُحِسُّ أحدُنا حرارةَ الجمرة، إذا وقعت قدمه علیها، فخرجت من نفوسهم أشعةٌ تُحیط بهذا المخالف، من قبیل النفرة والشنآن، فعندذلك یُخْذل ویضیَّق علیه، ویُلْهَم الملأ السافل وأهلُ الأرض أن یُسیئوا إلیه، وذلك حربُه تعالی إیاه.

ومنها: إجابةُ سؤاله، وإعاذتُه مما استعاذ منه. قال صلی الله علیه وسلم عن ربه تبارك وتعالی:" وإن سألنی لَأُعْطِیَنَّه وإن استعاذنی لَأُعیذَنَّه"

أقول: وذلك لدخوله فی حظیرة القدس، حیث یُقضی بالحوادث، فدعاؤه واستعاذتُه یرتقی هناك، ویکون سببًا لنزول القضاء، وفی آثار الصحابة شیئٌ کثیر من باب استجابة الدعاء.

من جملة ذلك:

[۱] ماوقع لسعدٍ حین دعا علی أبی سعدة:" اللّٰهم! إن کان عبدك هذا کاذبًا، قام ریاءً وسُمعة، فأَطِلْ عمُرَه، وَأَطِلْ فقره، وعَرِّضْه للفتن!" فکان کما قال:

[۲] وما وقع لسعيدٍ حين دعا على أَورىٰ بنتِ أويس: " اللّٰهم! إن كانت كاذبةً، فأَعِمْ بَصَرَهَا، واقتلها في أرضها" فكان كما قال:

ومنها: فناؤه عن نفسه، وبقاؤه بالحق، وهو المعبر عنه عند الصوفية بغلبة كون الحق على كون العبد. قال صلى الله عليه وسلم عن ربه تبارك وتعالى: " ومايزال عبدى يتقرَّب إلىَّ بالنوافل حتى أحببتُه، فإذا أحببته كنت سمعَه الذى يسمع به، وبصره الذى يبصر به، ويدَه التى يبطش بها"

أقول: إذا غشى نور الله نفسَ هذا العبد، من جهة قوّته العملية، المنبثة فى بدنه، دخلت شعبة من هذا النور فى جميع قواه، فحدثت هنالك بركاتٌ، لم تكن تُعْهَدُ فى مجرى العادة، فعندذلك يُنسب الفعل إلى الحق، بمعنىً من معانى النسبة، كما قال تعالى: ﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ، وَمَارَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾

ومنها: تنبيه الله تعالى إياه بالمؤاخذة على ترك بعض الآداب، وبقبول الرجوع منه إلى الأدب، كما وقع للصديق حين غاضبَ أضيافَه، ثم علم أن ذلك من الشيطان، فراجع الأَمْرَ المعروفَ، فبورك فى طعامه.

ترجمہ: پھر اس بندے سے اللہ کی محبت اس میں چند احوال پیدا کرتی ہے، جن کو نبی ﷺ نے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے ——— پس ان احوال میں سے: اس بندے کے لئے قبولیت کا اترنا ہے ملأ اعلیٰ میں، پھر زمین میں۔ نبی ﷺ نے فرمایا:......... میں کہتا ہوں: جب عنایتِ الٰہی اس بندے کی محبت کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو اللہ کی محبت ملأ اعلیٰ کی طرف پلٹتی ہے، جیسے سورج کی روشنی صاف وشفاف آئینوں میں منعکس ہوتی ہے۔ پھر ملأ سافل کو اس کی محبت الہام کی جاتی ہے، پھر زمین والوں میں سے ان مخلوقات کو جن میں اس کی استعداد ہوتی ہے، جس طرح نرم زمین پانی کے گھڑے سے نمی جذب کرتی ہے ——— اور از انجملہ: اس بندے کے دشمنوں کا رسوا ہونا ہے...... میں کہتا ہوں: جب اللہ کی محبت ملأ اعلیٰ کے نفوس کے آئینوں میں منعکس ہوتی ہے۔ پھر اس محبت کی مخالفت کرتا ہے: زمین والوں میں سے کوئی مخالفت کرنے والا، تو ملأ اعلیٰ کو اس مخالفت کا احساس ہوتا ہے، جس طرح ہم چنگاری کی گرمی محسوس کرتے ہیں، جب پیر چنگاری پر پڑتا ہے۔ پس ان کے نفوس سے لہریں نکلتی ہیں جو اس مخالف کو گھیر لیتی ہیں، وہ لہریں نفرت وعداوت کے قبیل سے ہوتی ہیں۔ پس اس وقت وہ رسوا کیا جاتا ہے، اور اس پر زندگی تنگ کی جاتی ہے، اور ملأ سافل اور اہلِ ارض الہام کئے جاتے ہیں کہ وہ اس کے ساتھ بری طرح پیش آئیں۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کی اس سے جنگ ہے ——— اور از انجملہ: اس کی دعا کا قبول ہونا ہے۔ اور جس چیز سے وہ پناہ چاہتا ہے، اس سے اس کو پناہ دی جاتی ہے ...... میں کہتا ہوں: اور وہ بات یعنی اس کا مستجاب الدعوات ہونا: اس دعا کے بارگاہِ مقدس میں پہنچنے کی وجہ سے ہے،

جہاں واقعات کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ پس اس کی دعا اور اس کی پناہ طلبی وہاں چڑھتی ہے، اور وہ فیصلہ کے نزول کا سبب بن جاتی ہے۔ اور آثارِ صحابہ میں قبولیتِ دعا کے سلسلہ کی بہت سی روایات ہیں: ——— اور منجملہ ٔ ازاں: (۱) وہ قبولیت ہے جو حضرت سعدؓ کے لئے واقع ہوئی، جب انھوں نے ابو سعدۃ کے لئے بددعا کی ...... (۲) اور وہ قبولیت ہے جو حضرت سعیدؓ کے لئے واقع ہوئی جب انھوں نے اروی بنت اویس کے لئے بددعا کی ——— اور از انجملہ: بندے کا اپنی ذات سے فنا ہونا ہے، اور اس کا اللہ کے ساتھ باقی رہنا ہے۔ اور اسی کو صوفیا کے نزدیک تعبیر کیا جاتا ہے: ''بندے کے وجود پر اللہ کے وجود کے غلبہ'' سے ...... میں کہتا ہوں: جب نورِ الٰہی اس بندے کے نفس کو ڈھانک لیتا ہے، اس کی قوتِ عملیہ کی جہت سے، جو اس کے بدن پر پھیلنے والی ہے، تو اس نور کا ایک شعبہ اس کے تمام قُویٰ میں داخل ہو جاتا ہے۔ پس وہاں یعنی قویٰ میں ایسی برکات پیدا ہوتی ہیں جو عادۃً جانی پہچانی ہوئی نہیں ہوتیں۔ پس اس وقت بندے کا فعل اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، نسبت کے معانی میں سے کسی معنی کے اعتبار سے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ...... اور از انجملہ: اللہ تعالیٰ کا اس بندے کو چوکنا کرنا ہے بعض آداب چھوڑنے پر مؤاخذہ کر کے، اور اس بندے کا رجوع قبول کرنے پر ادب کی طرف، جیسا کہ پیش آیا صدیق کو جب انھوں نے اپنے مہمانوں کو ناراض کر دیا، پھر جانا آپ نے کہ یہ بات شیطان کی طرف سے ہے، پس آپ نے اچھے کام کی طرف رجوع کر لیا، تو ان کے کھانے میں برکت فرمائی گئی (تاکہ وہ علامت بن جائے کہ اللہ نے ان کا رجوع قبول فرما لیا ہے)

☆ ☆ ☆

قلب کے دو اور مقام

شہیدیت وحواریت

قلب کے دو مقامات اور بھی ہیں۔ اور وہ شہیدیت وحواریت ہیں۔ یہ دونوں مقامات ان لوگوں کے ساتھ مختص ہیں جو انبیاء کے مشابہ ہوتے ہیں یعنی صلاحیت واستعداد کے اعتبار سے وہ انبیاء کے لگ بھگ ہوتے ہیں۔ اور یہ دونوں مقامات: صدیقیت ومحدّثیت کے بمنزلہ ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ صدیقیت ومحدّثیت کا تعلق انسان کی قوتِ عقلیہ سے ہے، اور شہیدیت وحواریت کا تعلق اس قوتِ عملیہ سے ہے جو قلب سے ابھرتی ہے یعنی اولین: کمالِ علمی ہیں اور آخرین: کمالِ عملی۔ اور یہ دونوں مقامات لوگوں پر اس طرح ضوفگن ہوتے ہیں، جس طرح کسی کھلے ہوئے روشن دان کے بالمقابل آئینہ رکھا ہوا ہو، جب اس پر بدرِ کامل ضوفگن ہوتا ہے تو آئینہ روشن ہو جاتا ہے پھر در و دیوار، چھت اور زمین پر اس کا عکس پڑتا ہے تو وہ بھی روشن ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح عالم بالا سے قلب نبوت پر ان مقامات کا فیضان ہوتا ہے، پھر اُس سے جن امتیوں میں استعداد ہوتی ہے: فیض پہنچتا ہے۔

شہید اور حواری میں فرق: شہید کے لغوی معنی ہیں: گواہ، نگران اور احوال بتانے والا۔ قرآن کریم میں عام طور پر یہی لغوی معنی مراد ہیں۔ اور اصطلاح میں شہید: وہ شخص ہے جو راہِ خدا میں قتل کیا گیا ہو۔ سورۃ آل عمران آیت ۱۴۰ میں یہی معنی ہیں۔ ارشاد پاک ہے: ﴿وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ﴾ یعنی غزوۂ اُحد میں جو صورت پیش آئی اس میں بہت سی حکمتیں ہیں۔ ایک حکمت یہ ہے کہ تم میں سے بعضوں کو شہید بنانا تھا۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے بھی اسی اصطلاحی معنی کے اعتبار سے شہیدیت کو قلب کا مقام قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے عالم بالا کے کسی مقام میں یہ بات طے فرمائی ہے کہ نافرمانوں سے انتقام ضرور لیا جائے گا۔ وہاں سے یہ ارادۂ الٰہی وقت کے رسول پر اترتا ہے، تاکہ وہ اس کی تکمیل میں اللہ کا دست وبازو بن جائے یعنی وہ رسول دشمنانِ خدا سے برسرِ پیکار ہو جائے، پھر اس سے اس کے امتی: کفار پر غصہ کرنے اور سختی برتنے کا جذبہ اور دین کی نصرت کا داعیہ قبول کرتے ہیں۔ اور کفن بردوش نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے اور دین کی ترقی کے لئے تن دھڑ کی بازی لگاتے ہیں۔ اور جام شہادت نوش فرماتے ہیں۔

پس جس طرح محدَّث: عالم ملکوت کے بعض خزانوں سے، جو اللہ تعالیٰ نے وہاں مہیا کئے ہیں، استفادہ کرتا ہے، اسی طرح شہید بھی عالم بالا کے کسی مقام میں طے شدہ ارادۂ خداوندی سے استفادہ کرتا ہے، اور مقامِ شہادت پر فائز ہونے کے لئے بے تاب ہو جاتا ہے۔

اور حواری: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صحابہ کا خطاب تھا۔ اور شرع میں اس سے مراد وہ شخص ہے جو رسول اللہ ﷺ سے محبت رکھتا ہے، اور عرصہ تک آپؐ کی صحبت میں رہا ہے، یا وہ آپ سے قریبی قرابت رکھتا ہے، چنانچہ اس کے قلب پر نبی کے قلب سے اللہ کے دین کی نصرت کا پرتو پڑتا ہے، اور وہ اللہ کے دین کا اور اللہ کے رسول کا خاص الخاص ناصر و مددگار بن جاتا ہے۔ سورۃ الصفّ آیت ۱۴ میں ارشاد پاک ہے: ''اے ایمان والو! تم اللہ (کے دین) کے مددگار بن جاؤ، جیسا کہ عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) نے حواریین سے کہا: میرا اللہ کی راہ میں مددگار کون ہے؟ حواریوں نے جواب دیا: ہم اللہ کے مددگار ہیں!'' چنانچہ انھوں نے دین پھیلانے کے لئے محنت شروع کی: ''پس بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ ایمان لائے، اور کچھ لوگ منکر رہے'' پھر ان میں آویزش شروع ہوئی: ''تو ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں تائید کی پس وہ غالب ہو گئے'' مسلمانوں نے بھی اس حکم خداوندی کی بتوفیق الٰہی تعمیل کی تو اسلام چار دانگِ عالم پھیل گیا۔

اور آنحضرت ﷺ نے اپنے پھوپھی زاد بھائی حضرت زبیر بن العوام کو حواری ہونے کی خوش خبری سنائی ہے۔ غزوۂ احزاب میں جس رات نہایت ٹھنڈی ہوا چلی تھی، اور ہر شخص اپنی جگہ ٹھٹرا ہوا تھا۔ آپ نے صدا دی کہ کوئی ہے جو دشمن کے کیمپ کی خبر لائے؟ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے بلاوے کا جواب دیا۔ گئے اور خبر لائے۔ کچھ وقت کے بعد پھر آپؐ نے پکارا۔ پھر انھوں نے ہی جواب دیا اور جا کر دشمن کی نقل و حرکت کی خبر لائے۔ اس موقعہ پر آپؐ نے ارشاد

فرمایا کہ: ''ہر نبی کے لئے حواری (خاص مددگار) ہوتے ہیں، اور میرے حواری زبیر بن العوام ہیں'' (بخاری حدیث ۲۸۴۷)

شہید وحواری کی انواع ——— شہید وحواری کی مختلف انواع ہیں، مثلاً: امین ورفیق اور نجیب ورقیب۔ اور نبی ﷺ نے ان انواع کے ذریعہ صحابہ کے فضائل بیان فرمائے ہیں:

امین ہونے کی فضیلت: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر امت میں ایک امین (معتمد شخص) ہے، اور اس امت کے امین ابوعبیدۃ بن الجرّاح ہیں'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۶۱۰۶)

رفیق ہونے کی فضیلت: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر نبی کے لئے رفیق (ساتھی) ہے اور میرے رفیق (جنت میں) عثمان ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۶۰۷۱ واسنادہ منقطع)

نجیب ورقیب ہونے کی فضیلت: نجیب کے معنی ہیں: قول وفعل میں لائقِ ستائش۔ اور رقیب کے معنی ہیں: نگہبان، محافظ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر نبی کے لئے سات نجباء رقباء ہوئے ہیں، اور میں چودہ عطا کیا گیا ہوں! لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: وہ کون ہیں؟ آپؓ نے فرمایا: (۱) میں (۲و۳) میرے دو بیٹے (حسن وحسین) (۴) جعفر (طیّار) (۵) حمزہ (سید الشہداء) (۶) ابوبکر (صدیق اکبر) (۷) عمر (فاروق) (۸) مُصعب بن عُمیر (۹) بلال (رسول اللہ کے مؤذن) (۱۰) سلمان (فارسی) (۱۱) عمار بن یاسر (۱۲) عبد اللہ بن مسعود (۱۳) ابوذر (غفاری) (۱۴) مقداد (رضی اللہ عنہم)

شہید ہونے کی فضیلت: سورۃ آل عمران کی آیت ۱۴۰ ہے، جو پہلے گذر چکی ہے۔ اسی طرح سورۃ النساء کی آیت ۶۹ میں ہے کہ: ''جو شخص اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ کا کہنا مان لے گا، وہ ان حضرات کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صلحاء'' اس میں شہید کو بھی منعم علیہم میں شامل کیا ہے۔ یہی اس کی فضیلت ہے۔ اور شہداء کی فضیلت میں بے شمار احادیث وارد ہوئی ہیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے سورۃ الحج کی آیت ۷۸ ذکر فرمائی ہے، مگر اس میں شہید بمعنی گواہ ہے، اس لئے وہ یہاں بے محل ہے۔ البتہ درج ذیل حدیث برمحل ہے:

حدیث ——— حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ اور ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم جبلِ اُحد پر چڑھے تو وہ ان کی وجہ سے کانپنے لگا۔ آپؐ نے اس پر پیر مارا اور فرمایا: ''ٹھہر جا اے اُحد! پس تجھ پر نبی، صدیق اور دو شہید ہی ہیں!'' (مشکوٰۃ حدیث ۶۰۷۷ بخاری حدیث ۳۶۷۵)

ومن مقامات القلب: مقامان، يختصان بالنفوس المتشبهة بالأنبياء، عليهم الصلوات والتسليمات، ينعكسان عليها كما ينعكس ضوءُ القمر على مرآة موضوعةٍ بإزار كُوَّةٍ مفتوحة، ثم ينعكس ضوؤها على الجدران والسقف والأرض.

وهما بمنزلة الصدّيقية والمحدَّثية، إلا أن ذينك تستقرَّانِ فى القوة العقلية من نفوسهم،

وهذانِ فى القوة العملية المنجسة من القلب؛ وهما مقاما الشهيد والحوارى.

والفرقُ بينهما: أن الشهيد تقبل نفسُه غضبًا وشدةً على الكفار ونصرةً للدين: من موطن من مواطن الملكوت، هَيَّأَ الحق فيه إرادةَ الانتقام من العصاة، يَنزلُ من هنالك على الرسول، ليكون الرسول جارحةً من جوارح الحق فى ذلك. فتقبل نفوسُهم من هناك، كما ذكرنا فى المحدَّثية.

والحوارى: من خلصت محبتُه للرسول، وطالت صحبتُه معه، أو اتَّصلت قرابتُه به: فأوجب ذلك انعكاسَ نصرة دين الله من قلب النبى على قلبه. قال الله تعالى: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا! كُوْنُوْا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّيْنَ: مَنْ أَنْصَارِىْ إِلَى اللّٰهِ؟ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ: نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ، فَآمَنَتْ طَائِفَةٌ﴾الآيةَ؛ وقد بشّر النبى صلى الله عليه وسلم الزبيرَ بأنه حوارىّ.

وللشهيد والحوارىّ أنواعٌ وشعبٌ: منهم الأمين، ومنهم الرفيق، ومنهم النجباء والنقباء؛ وقد نوَّهَ النبى صلى الله عليه وسلم فى فضائل الصحابة بشيئ كثير من هذه المعانى.

عن على رضى الله عنه: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إن لكل نبى سبعةَ نجباءَ رُقباءَ، وأُعطيتُ أنا أربعة عشر" قلنا: من هم؟ قال: "أنا، وابناىَ، وجعفر، وحمزة، وأبوبكر، وعمر، ومصعب بن عمير، وبلال، وسلمان، وعمار، وعبد الله بن مسعود، وأبو ذر، والمقداد" وقال الله: ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ، وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ﴾وقال صلى الله عليه وسلم: "أُثْبُتْ أُحُدُ، فإنما عليك نبى، وصديق وشهيدان"

ترجمہ: اور مقاماتِ قلب میں سے دو مقام ایسے ہیں جو ان لوگوں کے ساتھ مختص ہیں جو انبیاء کرام ــــ علیہم الصلوٰات والتسلیمات ــــ کے مشابہ ہیں۔ وہ دونوں مقام لوگوں پر منعکس ہوتے ہیں، جس طرح چاند کی روشنی ضوفگن ہوتی ہے ایسے آئینہ پر جو کسی کھلے ہوئے روشن دان کے بالمقابل رکھا ہوا ہو۔ پھر اس آئینہ کا عکس پڑتا ہے دیواروں، چھتوں اور زمین پر ــــ اور وہ دونوں مقام بمنزلۂ صدیقیت ومحدّثیت کے ہیں۔ البتہ یہ فرق ہے کہ وہ دونوں مقام قرار پکڑتے ہیں لوگوں کے نفوس کی قوتِ عقلیہ میں، اور یہ دونوں اس قوتِ عملیہ میں (قرار پکڑتے ہیں) جو قلب سے برانگیختہ ہونے والی ہے۔ اور وہ مقام: شہید اور حواری کے مقامات ہیں ــــ اور ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ شہید کا نفس غصہ اور کفار پر سختی اور دین کی نصرت (کا جذبہ) قبول کرتا ہے ملکوت کی جگہوں میں سے کسی جگہ سے، جس میں اللہ تعالیٰ نے تیار کیا ہے نافرمانوں سے انتقام کا ارادہ۔ وہ ارادہ وہاں سے رسول پر اترتا ہے تاکہ وہ اس سلسلہ میں اللہ کے اعضاء میں سے ایک عضو بن جائے۔ پس قبول کرتے ہیں اُن (شہداء) کے نفوس وہاں سے یعنی ملکوت سے، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا محدثیت کے بیان میں ــــ اور حواری وہ ہے جو رسول سے خالص محبت رکھتا ہے۔ اور وہ عرصہ تک آپؐ کی صحبت میں رہا ہے یا آپؐ

سے قریبی قرابت داری رکھتا ہے۔ پس ثابت کیا اس (صحبت وقرابت) نے نبی کے قلب سے اس کے قلب پر اللہ کے دین کی نصرت کے عکس کو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا...... اور تحقیق خوش خبری سنائی ہے نبی ﷺ نے زبیرؓ کو کہ وہ حواری ہیں ـــــ اور شہید اور حواری کے لئے انواع اور شعبے ہیں۔ ان میں سے امین، اور ان میں سے رفیق، اور ان میں سے نجباء ورقبا ہیں۔ اور تحقیق نبی ﷺ نے صحابہ کے فضائل میں ان معانی میں سے بہت سی چیزوں کے ذریعہ شان بلند کی ہے۔

تصحیح: آخری حدیث کا متن مطبوعہ اور مخطوطوں میں اس طرح تھا: **نبی أو صدیق أو شهید**۔ تصحیح بخاری اور مشکوٰۃ سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

قلب کے احوال

پہلا حال: سُکر (مدہوشی)

سکر: یہ ہے کہ نور ایمان اولاً عقل میں، پھر قلب میں اس درجہ متمثل ہو کہ دنیا کی مصلحتیں ہاتھ سے نکل جائیں یعنی ان سے توجہ ہٹ جائے اور عموماً لوگ جو چیزیں ناپسند کرتے ہیں: ان کو پسند کرنے لگے۔ جیسے موت، بیماری اور محتاجی وغیرہ کو پسند کرنے لگے۔ اور وہ اس مدہوش جیسا ہو جائے جو نہ عقل کی سنتا ہے اور نہ عرف وعادت کی پرواہ کرتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ’’میں پروردگار سے ملنے کے شوق میں موت کو پسند کرتا ہوں۔ اور بیماری کو اس لئے پسند کرتا ہوں کہ وہ میرے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔ اور محتاجی کو اس لئے پسند کرتا ہوں کہ اللہ کے سامنے فروتنی کا ذریعہ بنے‘‘ (طبقات ابن سعد ۷: ۳۹۲ سیر أعلام النبلاء ۲: ۳۴۹)

اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ طبعی طور پر مال کو ناپسند کرتے تھے۔ اور مالداری اور دولت مندی سے ان کو ایسی نفرت تھی جیسی گندی چیزوں سے ہوتی ہے۔ حالانکہ موت، بیماری اور محتاجی کو پسند کرنا اور مال ومنال کو ناپسند کرنا عام انسانی احوال سے ہم آہنگ نہیں۔ مگر ان دونوں حضرات پر آخرت اور اس کی نعمتوں کا یقین اس درجہ غالب آگیا تھا کہ وہ انسانی عادات کی روش سے ہٹ گئے تھے۔

ملحوظہ: خیال رہے یہ احوال کا بیان ہے، مقامات کا نہیں۔ حال: عارضی کیفیت ہوتی ہے اور مقام: ملکہ راسخہ۔ حکیم الامت حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ دمشق کے قاضی تھے۔ پس ان کی زندگی درکفے جام شریعت، درکفے سندانِ عشق کا مصداق تھی۔ دیگر اکابر صحابہ سے بھی بحالتِ سکر اس قسم کے ارشادات مروی ہیں اور وہ امت کے لئے اسوہ ہیں۔ مگر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا یہ محض حال نہیں تھا، بلکہ مال ومنال اور دراہم ودنانیر سے نفرت ان کا مزاج ومسلک بن گئی

تھی۔ جو تعلیماتِ شریعت سے ہم آہنگ نہیں اس لئے ان کا نظریہ امت کے لئے اسوہ نہیں۔

ومن أحوال القلب : السُّكْر : وهو أن يتشبَّح نورُ الإيمان في العقل، ثم في القلب، حتى تفوتَه مصالحُ الدنيا، وحتى يحبَّ مالايحبه الإنسان في مجرى طبيعته، فيكون شبيهًا بالسَّكرانِ المتغير عن سُنَنِ عقله وعادته؛ كما قال أبو الدرداء:" أُحِبُّ الموتَ اشتياقا إلى ربي، وأحبُّ المرض مكفرًا لخطيئتي، وأحب الفقر تواضعًا لربي" وكما يؤثر عن أبي ذر: من كراهيته للمال بطبعه، وشنآنه الغنى والثروةَ مثلَ كراهية الأمور المستقذرة، وليس في مجرى العادة البشرية حبُّ هذا القبيل وكراهيةُ ذلك القبيل، ولكنهما غلب عليهما اليقينُ، حتى خرجا من مجرى العادة.

ترجمہ: اور قلب کے احوال میں سے سکر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نور ایمان متمثل ہو عقل میں، پھر دل میں، یہاں تک کہ مصالح دنیا اس کے ہاتھ سے نکل جائیں، اور یہاں تک کہ وہ ان چیزوں کو پسند کرے جن کو انسان اپنی فطرت کی راہ میں پسند نہیں کرتا، اور وہ اس مدہوش کے مشابہ ہوجائے جو اپنی عقل اور اپنی عادت کی راہوں سے بدل جانے والا ہے، جیسا کہ ابوالدرداء نے کہا: ...... اور جیسا کہ نقل کیا گیا ابوذر سے یعنی ان کا اپنی فطرت سے مال کو ناپسند کرنا۔ اور مالداری اور دولت مندی سے ان کا عداوت رکھنا گندی چیزوں کو ناپسند کرنے کی طرح، درانحالیکہ بشری عادت کی راہ میں سے نہیں ہے اِس طرح کی چیزوں کو پسند کرنا، اور اُس طرح کی چیزوں کو ناپسند کرنا۔ مگر اُن دونوں پر یقین غالب آیا، یہاں تک کہ وہ دونوں عادت کی راہ سے نکل گئے۔

☆ ☆ ☆

دوسرا حال: غلبہ (جوش، ولولہ)

قلب کا دوسرا حال: غلبہ یعنی جوش و ولولہ ہے۔ پھر غلبہ دو طرح کا ہے:

غلبہ کی پہلی صورت: ایسے داعیہ کا جوش مارنا جو مؤمن کے قلب سے ابھرنے والا ہے۔ جب نور ایمان دل کے ساتھ مخلوط ہوتا ہے تو اس نور سے اور دل کی فطری حالت سے پیدا شدہ ایک جوش اٹھتا ہے، اور ایسا داعیہ اور خیال بن جاتا ہے جس سے باز رہنا ممکن نہیں ہوتا۔ خواہ یہ جوش موافق شرع ہو یا نہ ہو۔

سوال: جب وہ جوش نور ایمان سے ابھرتا ہے تو وہ خلافِ شرع کیسے ہوسکتا ہے؟

جواب: چونکہ اس جوش میں قلب کی فطری حالت کا بھی دخل ہوتا ہے، اس لئے وہ کبھی خلافِ شرع ہوتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ شریعت بہت سے ایسے مقاصد کا احاطہ کئے ہوئے ہے کہ مؤمن کا قلب ان سب کا احاطہ نہیں

کرسکتا۔ مثلاً: کسی موقعہ پر مؤمن کا قلب جذبۂ ترحم کی تابعداری کرنا چاہتا ہے یعنی نرمی برتنا چاہتا ہے، جبکہ اس خاص موقعہ میں شریعت نے ترحم کی ممانعت کی ہے۔ جیسے زنا کی سزا کے معاملہ میں ترحم کی ممانعت ہے۔ ارشاد پاک ہے: ''اور تم لوگوں کو اُن (زانی اور زانیہ) پر اللہ کے دین کے معاملہ میں ذرا رحم نہیں آنا چاہئے'' (سورۃ النور آیت ۲) اسی طرح کبھی مؤمن کا قلب بغض وعداوت کے جذبہ کی تابعداری کرنا چاہتا ہے، جبکہ اس خاص موقعہ میں شریعت کا منشا نرمی برتنے کا ہوتا ہے، جیسے ذمی کا معاملہ (ذمی رعایا کے ساتھ شریعت نرمی کا معاملہ پسند کرتی ہے۔ شدت سے کام لینے کا حکم حربی کفار کے ساتھ ہے۔ پس اگر پہلی صورت میں نرمی کی جائے اور دوسری صورت میں گرمی دکھائی جائے تو یہ جوش خلاف شرع ہوگا)

امثلہ: اس غلبہ کی مثال حضرت ابولبابہ بن المنذر کا واقعہ ہے۔ جب بنوقریظہ نے ہتھیار ڈالنے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ ابولبابہ کو ہمارے پاس بھیج دیں۔ ہم ان سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ ابولبابہ ان کے حلیف تھے۔ اور ان کے باغات اور آل اولاد بھی اسی علاقے میں تھے۔ حضرت ابولبابہ وہاں پہنچے تو مرد ان کی طرف دوڑ پڑے۔ اور عورتیں اور بچے دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ پر رقت طاری ہوگئی۔ یہود نے کہا: ابولبابہ! کیا آپ مناسب سمجھتے ہیں کہ ہم محمد (ﷺ) کے فیصلے پر راضی ہوجائیں اور ہتھیار ڈالدیں؟ ابولُبابہ نے جواب دیا: ہاں! لیکن ساتھ ہی اپنے گلے پر تلوار کی طرح ہاتھ پھیر کر اشارہ کیا کہ ذبح کئے جاؤگے۔ مگر انہیں فوراً احساس ہوا کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت ہوئی۔ چنانچہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آنے کے بجائے سیدھے مسجد نبوی میں پہنچے، اور خود کو مسجد کے ایک ستون سے باندھ لیا۔ اور عہد کیا کہ جب تک میری توبہ قبول نہ ہوگی اسی طرح بندھا رہونگا، یا جان دے دونگا!

حضرت ابولبابہ چھ روز تک مسلسل ستون سے بندھے رہے۔ ان کی بیوی ہر نماز کے وقت آکر کھول دیتی۔ اور وہ نماز سے فارغ ہوکر پھر اسی طرح بندھ جاتے۔ بالآخر ان کی توبہ قبول ہوئی۔ اور سورۃ الانفال کی آیات ۲۷ و ۲۸ نازل ہوئیں۔ صحابہ نے ان کو کھولنا چاہا مگر انھوں نے منع کردیا کہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ انہیں کوئی نہ کھولے۔ چنانچہ جب نبی ﷺ نماز فجر کے لئے نکلے تو ان کو اپنے دستِ مبارک سے کھول دیا۔

اس واقعہ میں حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے گلے پر ہاتھ پھیر کر جس فیصلۂ نبوی کی طرف اشارہ کیا تھا: وہ غلبۂ محبت اور جوشِ رحمت کا نتیجہ تھا، جو موافقِ شرع نہیں تھا۔ مگر چونکہ دل نورِ ایمان سے بھرا ہوا تھا اس لئے فوراً تنبہ ہوا، اور انھوں نے اپنے لئے سخت سزا تجویز کی۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو فرمایا: ''اگر وہ میرے پاس آتے تو میں ان کے لئے دعائے مغفرت کرتا۔ مگر جب انھوں نے خود ہی سزا تجویز کردی تو اب میں ان کو نہیں کھول سکتا۔ اب اللہ کے فیصلہ کا انتظار کیا جائے!''

دوسری مثال: صلح حدیبیہ کا معاہدہ لکھا جا رہا تھا کہ حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ بیڑیاں گھسیٹتے آپہنچے۔ اُن کا حال زار

دیکھ کر صحابہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جب ان کو اُن کا باپ سہیل لے کر چلا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اچھل کر ابو جندل کے پاس پہنچے۔ وہ ان کے پہلو میں چلتے جارہے تھے، اور کہتے جارہے تھے: ابو جندل! صبر و کرو۔ یہ لوگ مشرک ہیں۔ ان کا خون کتوں کا خون ہے۔ اور ساتھ ہی اپنی تلوار کا دستہ ان کے قریب کرتے جارہے تھے کہ وہ اپنے باپ کو نمٹا دیں۔ مگر اس بندۂ خدا نے بخل سے کام لیا، اور اپنے باپ پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ وہاں سے لوٹے تو رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے، اور عرض کیا: کیا آپؐ اللہ کے سچے رسول نہیں ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''کیوں نہیں!'' انھوں نے کہا: کیا ہم حق پر اور وہ باطل پر نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''کیوں نہیں!'' انھوں نے کہا: کیا ہمارے مقتولین جنت میں اور ان کے مقتولین جہنم میں نہیں ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''کیوں نہیں!'' انھوں نے کہا: پھر ہم کیوں اپنے دین میں دنائت قبول کریں؟ اور ایسی حالت میں پلٹیں کہ اللہ نے ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ نہ کیا ہو؟ آپؐ نے فرمایا: ''عمر! میں اللہ کا رسول ہوں اور اس کی نافرمانی نہیں کرسکتا، وہ میری مدد کرے گا اور مجھے ہرگز ضائع نہیں کرے گا'' انھوں نے کہا: کیا آپؐ نے ہم سے یہ بیان نہیں کیا تھا کہ ہم بیت اللہ کے پاس پہنچیں گے اور اس کا طواف کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا: ''کیوں نہیں، مگر کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم اسی سال طواف کریں گے؟'' انھوں نے کہا: نہیں! تو آپؐ نے فرمایا: ''تم بہر حال بیت اللہ پر پہنچو گے اور اس کا طواف کروگے''

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصہ میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے۔ اور ان سے بھی وہی باتیں کیں جو رسول اللہ ﷺ سے کیں تھیں۔ اور انھوں نے بھی وہی جواب دیا جو رسول اللہ ﷺ نے دیا تھا۔ البتہ آخر میں یہ کہا کہ عمر! آپؐ کی رکاب تھامے رہ۔ یعنی ان کے تابع رہ، بخدا! وہ برحق رسول ہیں!

بعد میں جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی تقصیر کا احساس ہوا تو سخت نادم ہوئے۔ خود ان کا بیان ہے کہ میں نے اس روز جو مناقشہ کیا تھا اس کی تلافی کے لئے بہت سے اعمال کئے۔ برابر صدقہ وخیرات کرتا رہا۔ روزے اور نماز پڑھتا رہا۔ اور غلام آزاد کرتا رہا۔ تا آنکہ مجھے امید ہوگئی کہ معاملہ بخیر ہوگا! (بخاری حدیث ۲۷۳۱ و ۲۷۳۲ مع زیادات من الفتح ۵: ۳۴۶)

تیسری مثال: متعدد روایات میں مروی ہے کہ بعض صحابہ اور صحابیات رضی اللہ عنہم نے غلبۂ محبت میں نبی ﷺ کے فضلات (خون اور پیشاب) پی لئے تھے، جن کو آپؐ نے مختلف نتائج سے آگاہ فرمایا۔ مثلاً:

۱ــــ حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ نے آپؐ کے پچھنوں کا خون پی لیا تھا، تو آپؐ نے فرمایا: ويل لك من الناس، وويل للناس منك یعنی لوگوں کی طرف سے تم کو ہلاکت پہنچے گی، اور تمہاری طرف سے لوگوں کو سخت ضرر پہنچے گا۔

۲ــــ حضرت سفینہ مولیٰ رسول اللہ ﷺ رضی اللہ عنہ نے بھی آپؐ کے پچھنوں کا خون پی لیا تھا۔ جب آپؐ کے علم میں یہ بات آئی تو آپؐ نے تبسم فرمایا۔

۳ــــ جنگ احد میں نبی ﷺ کے ماتھے میں خود کے ٹکڑے گڑ گئے تھے۔ صحابہ نے ان کو دانتوں سے پکڑ کر نکالا تھا۔ اس موقعہ پر حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے والد ماجد حضرت مالک بن سنان رضی اللہ عنہ نے بھی منہ میں جو خون آیا

اسکو نگل لیا تھا۔آپ نے ان کو بشارت دی تھی کہ:’’میرا خون انکے خون سے مل گیا،اس لئے ان کو آگ نہیں چھوئے گی!‘‘

۴ــــ حضرت ابورافع مولیٰ رسول اللہ ﷺ رضی اللہ عنہ کی اہلیہ صاحبہ نے نبی ﷺ کے سر مبارک کی دھووَن پی لی تھی،آپؐ نے ان کو یہ خوش خبری دی تھی کہ:’’اللہ نے تمہارے بدن کو آگ پر حرام کردیا!‘‘

۵ــــ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خادمہ بُرّہ رضی اللہ عنہا نے آپؐ کا پیالے میں رکھا ہوا پیشاب پی لیا تھا تو آپؐ نے فرمایا:لَقَد احْتَظَرْتِ من النار بِحِظَارٍ:بخدا!تم نے دوزخ سے ایک آڑ بنالی!

۶ــــ حضرت ام اَیمن رضی اللہ عنہا نے بھی لاعلمی میں آپؐ کا پیالے میں رکھا ہوا پیشاب پی لیا تھا تو آپؐ نے فرمایا کہ:’’تمہارے پیٹ میں کبھی درد نہیں ہوگا!‘‘

یہ تمام روایات مجمع الزوائد(۸:۲۷۰)میں ہیں۔اور علامہ عینی رحمہ اللہ نے عمدۃ القاری(۳:۳۵باب الماء الذی یُغسل بہ شَعر الإنسان)میں حَجَّام یعنی پچھنے لگانے والے حضرت ابوطیبہ رضی اللہ عنہ کے خون پینے کا بھی تذکرہ کیا ہے۔مگر وہ روایت مجھے نہیں ملی۔ یہ سب غلبۂ محبت کے واقعات ہیں، چنانچہ نبی ﷺ نے ان کو معذور قرار دیا۔ شریعت میں خون یا پیشاب پینا ممنوع ہے،خواہ وہ کسی کا ہو۔

فائدہ: نبی ﷺ کے فضلات کا کیا حکم ہے؟ پاک ہیں یا ناپاک؟ علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ نے ردُّ الْمحتار(۱:۲۳۳)میں اس پر تنبیہ کی ہے کہ آپؐ کے تمام فضلات پاک تھے۔اور یہ آپؐ کی خصوصیت تھی۔اور فرمایا ہے کہ طہارت کے بہت سے دلائل ہیں۔اور علامہ عینی رحمہ اللہ نے بھی عمدۃ القاری(۳:۳۵)میں یہی بات جذباتی انداز میں لکھی ہے۔مگر دو باتیں قابل غور ہیں۔

ایک: یہ کہ منی کی طہارت ونجاست کے مسئلہ میں قائلین نجاست کی طرف سے یہ بات نہیں کہی گئی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فرکِ منی کی روایت سے دوسرے انسانوں کی منی کی طہارت پر استدلال صحیح نہیں، کیونکہ آپؐ کے فضلات پاک تھے یعنی قائلین طہارت کے استدلال پر یہ نقض وارد نہیں کیا گیا۔

دوسری بات: طہارتِ فضلات کے دلائل وہی روایات ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں۔اور وہ سب غلبہ محبت کے احوال ہیں۔ان سے احکام ومسائل میں استدلال درست نہیں۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے محتاط الفاظ استعمال کئے ہیں۔یہ فرمایا ہے کہ’’خون کا پینا شریعت میں ممنوع ہے‘‘آپؐ کا خون پاک تھا یا ناپاک؟اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔کیونکہ بعض پاک چیزیں بھی کھانا ممنوع ہیں،مثلاً مٹی کھانا حرام ہے،اگرچہ وہ پاک ہے۔

غلبہ کی دوسری صورت ــــ جو اہم اور اتم ہے ــــ یہ ہے کہ کوئی ربانی داعیہ اور جذبہ قلب پر نازل ہو،اور وہ دل کو اپنی گرفت میں ایسا لے لے کہ اس کے مقتضی سے باز رہنا ممکن نہ ہو۔اور چونکہ یہ غلبہ عالَم بالا سے نازل ہوتا ہے۔قلب کی

فطری حالت کا اس میں دخل نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ شرع کے موافق ہی ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ اہم اور اتم ہے۔

اور اس غلبہ کی حقیقت: یہ ہے کہ عالم بالا کے کسی پاکیزہ مقام سے آدمی کی قوتِ عملیہ پر ـــ قوت علمیہ پر نہیں ـــ علم الٰہی کا فیضان ہوتا ہے۔ بناءً علیہ مؤمن میں جوش اور ولولہ اٹھتا ہے، اور وہ کوئی کام کر گذرتا ہے۔

اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسانوں میں سے جن کے نفوس: انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے نفوس کے مانند ہوتے ہیں، جب ان میں فیضانِ الٰہی کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، تو:

(الف) اگر ان کی قوت علمیہ: قوتِ عملیہ پر غالب ہوتی ہے تو ان پر علمی فیضان ہوتا ہے۔ اور وہ فراست اور الہام کہلاتا ہے۔

(ب) اور اگر ان کی قوت عملیہ: قوتِ علمیہ پر غالب ہوتی ہے تو ان پر عمل کا فیضان ہوتا ہے۔ پھر اگر ان کو کسی کام کے کرنے پر ابھارا گیا ہے تو وہ ''عزم و اقبال'' کہلاتا ہے۔ اور اگر کسی کام کے کرنے سے روکا گیا ہے تو وہ ''نفرت اور باز رہنا'' کہلاتا ہے۔

پہلی مثال: معرکۂ بدر میں رسول اللہ ﷺ صفیں درست کر کے چھپر میں تشریف لے گئے اور اس طرح دعا شروع کی: ''الٰہی! میں آپ کو آپ کا عہد اور آپ کا وعدہ یاد دلاتا ہوں۔ الٰہی! اگر آپ چاہیں تو آج کے بعد آپ کی عبادت نہ کی جائے'' آپؐ نے اس طرح خوب تضرّع سے دعا کی، یہاں تک کہ کندھوں سے چادر مبارک گر گئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کا ہاتھ پکڑا اور عرض پرداز ہوئے: ''اے اللہ کے رسول! بس فرمائیے۔ آپؐ نے اپنے رب سے خوب الحاح سے دعا فرمالی'' چنانچہ رسول اللہ ﷺ یہ کہتے ہوئے چھپر سے باہر تشریف لائے کہ: ''عنقریب یہ جتھہ شکست کھائے گا اور پیٹھ پھیر کر بھاگے گا!'' (سورۃ القمر آیت ۴۵) (بخاری حدیث ۲۹۱۵)

اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ داعیۂ الٰہی ڈالا گیا کہ مزید الحاح کی ضرورت نہیں، اب آپؐ کو روک دیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے بے تاب ہو کر آپؐ کو اٹھا دیا۔ اور آپؐ نے بھی اپنی فراست سے یہ بات جان لی کہ یہ برحق داعیہ ہے۔ اس لئے آپؐ نے دعا موقوف کر دی۔ اور اللہ سے مدد طلب کرتے ہوئے اور آیت کریمہ تلاوت کرتے ہوئے باہر تشریف لے آئے۔

دوسری مثال: جب رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کا انتقال ہوا تو آپؐ اس کا جنازہ پڑھانے کے لئے تشریف لائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آڑے آئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپؐ اِس کی نماز جنازہ پڑھائیں گے جبکہ اُس نے فلاں فلاں وقت میں اسلام کے خلاف ایسی ایسی نالائق حرکتیں کی ہیں! کیا حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: ﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ، إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ﴾ خواہ آپؐ اُن (منافقین) کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں۔ اگر آپؐ ان کے لئے ستّر بار بھی استغفار کریں گے: اللہ تعالیٰ ان کو نہیں بخشے گا (التوبہ آیت ۸۰) آپؐ نے فرمایا:

''عمر! ہٹ جاؤ، مجھے اس آیت میں صراحۃً استغفار کرنے سے منع نہیں کیا گیا۔ مجھے اختیار دیا گیا ہے اور میں نے استغفار کرنے کو اختیار کیا ہے'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے راستہ چھوڑ دیا۔ اور آپؐ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَلَاتُصَلِّ عَلٰی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا، وَلَاتَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ﴾ یعنی ان (منافقین) میں سے کوئی مرجائے تو اس پر کبھی نماز نہ پڑھیے۔ اور نہ (دفن کے لئے) اس کی قبر پر کھڑے ہوئیے'' (التوبہ آیت ۸۴) اس آیت کے نزول کے بعد منافقین کا جنازہ پڑھنا قطعاً ممنوع ہوگیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''مجھے خود اپنے اوپر حیرت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایسی جرأت کیسے کی؟ حالانکہ اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں!'' (بخاری حدیث ۴۶۷۱)

دراصل: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نظر بغض فی اللہ کے جوش میں اس بات پر مقصور تھی کہ وہ ہمیشہ کفر ونفاق کا علم بردار رہا ہے۔ ایسے کا جنازہ پڑھنے سے ایسوں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ اور رسول اللہ ﷺ کی نظر دیگر مصالح پر تھی یعنی اَحیاء کی دلداری اور ایسوں کو دین سے قریب لانا۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دونوں واقعات میں غور کریں۔ دونوں غلبوں کا فرق واضح ہوجائے گا۔ معاہدۂ حدیبیہ کے سلسلہ میں مناقشہ بھی بغض فی اللہ کے جوش میں تھا اور یہ بھی۔ مگر پہلے واقعہ میں آپ فرماتے ہیں: ''میں برابر روزے رکھتا رہا، خیرات کرتا رہا، غلام آزاد کرتا رہا الی آخرہ'' اور اس دوسرے واقعہ میں فرماتے ہیں: ''مجھے خود اپنے اوپر حیرت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایسی جرأت کیسے کی!'' ان دونوں تأثرات میں آپ کو آسمان وزمین کا فرق نظر آئے گا۔

ومن أحوال القلب: الغلبة: والغلبة غلبتان:

[۱] غلبةُ داعيةٍ منبجسة من قلب المؤمن، حين خالطه نورُ الإيمان، فَطَفَحَ طُفَاحَةٌ متولدةٌ من ذلك النور ومن جبلة القلبِ، فصارت داعيةً وخاطرًا، لايستطيع الإمساكَ عن موجبها، وافقت مقصودَ الشرع أولا.

وذلك: لأن الشرع يحيط بمقاصدَ كثيرةٍ، لايحيط بها قلبُ هذا المؤمن، فربما ينقاد قلبه للرحمة ــ مثلاً ــ وقد نهى الشرع عنها فى بعض المواضع، قال تعالى: ﴿وَلَاتَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ﴾ وربما ينقاد قلبه للبغض، وقد قصد الشرع اللطفَ، مثلَ أهل الذمة.

ومثال هذه الغلبة:

[الف] ماجاء فى الحديث عن أبى لبابة بن المنذر، حين استشاره بنو قريظة، لما استنزلهم النبى صلى الله عليه وسلم على حكم سعد بن معاذ، فأشار بيده إلى حلقه: أنه الذبحُ، ثم ندم على ذلك، وعلم أنه قد خان الله ورسولَه، فانطلق على وجهه، حتى ارتبط نفسَه فى المسجد على عَمَدٍ من عُمُدِه، وقال: '' لاأبرح مكانى هذا، حتى يتوب الله تعالى علىَّ مما صنعتُ''

[ب] وعن عمر: أنه غلبت عليه حميةُ الإسلام، حين اعترضَ على رسول الله صلى الله عليه وسلم، لما أن أراد أن يصالح المشركين عام الحديبية، فوثب حتى أتى أبابكر رضى الله تعالى عنه، قال: أليس برسول الله صلى الله عليه وسلم؟! قال: بلى! قال: ألسنا بالمسلمين؟ قال: بلى! قال: أليسوا بالمشركين؟ قال: بلى!قال: فعلى ما نعطى الدَّنِيَّةَ فى ديننا؟ فقال أبوبكر: يا عمر! أَلْزِمْ غَرْزَه، فإنى أشهد أنه رسول الله ثم غلب عليه مايجد، حتى أتى رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال له مثلَ ماقال لأبى بكر، وأجابه النبى صلى الله عليه وسلم كما أجابه أبوبكر رضى الله عنه ، حتى قال:" أنا عبد الله ورسوله، لن أخالف أمره، ولن يُضَيِّعَنى" قال: وكان عمر يقول: فمازلتُ أصومُ وأتصدق، وأعتق وأصلى من الذى صنعتُ يؤمئذٍ، مخافةَ كلامى الذى تكلمتُ به، حتى رجوتُ أن يكون خيرًا.

[ج] وعن أبى طيبة الجرّاح، حين حجم النبيَّ صلى الله عليه وسلم، فشرب دمَه، وذلك محظور فى الشريعة، ولكنه فعله فى حال الغلبة، فعذره النبيُّ صلى الله عليه وسلم، وقال له: "قد احتظرتَ بخطائر من النار!"

[۲] وغلبةٌ أخرى أجلُّ من هذه وأتم، وهى غلبة داعيةٍ إلٰهية، تنزل على قلبه، فلايستطيع الإمساك عن موجبها؛ وحقيقةُ هذه الغلبة: فيضان علم إلٰهى من بعض المعادن القدسية على قوته العملية، دون القوة العقلية.

تفصيل ذلك : أن النفس المتشبهة بنفوس الأنبياء عليهم الصلاة والسلام، إذا استعدّت لفيضان علم إلٰهى:

[الف] إن سبقت القوةُ العقلية منها على القوة العملية، كان ذلك العلمُ المُفَاضُ فراسةً وإلهامًا.

[ب] وإن سبقت القوةُ العملية منها على القوة العقلية، كان ذلك العلمُ المُفَاضُ عزمًا وإقبالاً، أو نفرةً وانحجامًا.

مثاله: مارُوى فى قصة بدر من أن النبى صلى الله عليه وسلم أَلَحَّ فى الدعاء، حتى قال:" إنى أَنْشُدُكَ عهدَك ووعدَك، اللّٰهم! إن شئتَ لم تُعْبَدْ بعد اليوم" فأخذ أبوبكر بيده، فقال: حسبك! فخرج رسول الله صلى الله عليه وسلم، وهو يقول:﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرْ﴾

معناه : أن الصديق أُلقى فى قلبه داعيةٌ إلٰهية، تُزَهِّدُه فى الإلحاح، وتُرَغِّبُه فى الكف عنه، فعرف النبى صلى الله عليه وسلم بفراسته: أنها داعيةُ حق، فخرج مستظهرًا بنصرة الله، تاليا

هذه الآية.

ومثاله أيضا: ما روى في قصة موتِ عبد الله بن أبيّ، حين أراد النبي صلى الله عليه وسلم أن يصلي على جنازته، قال عمر: فتحولتُ حتى قمتُ في صدره، وقلت: يارسول الله! أتصلي على هذا، وقد قال يوم كذا: كذا وكذا؟ أُعِدُّ أيامَه، حتى قال: تَأَخَّرْ عني يا عمر! إني خُيِّرْتُ فاخترتُ، وصلى عليه، ثم نزلت هذه الآية: ﴿وَلاَتُصَلِّ عَلٰى أَحَدٍ مِّنْهُمْ مَاتَ أَبَدًا﴾ قال عمر: فعجبتُ لي وجرأتي على رسول الله صلى الله عليه وسلم، ورسولُ الله صلى الله عليه وسلم أعلم.

وقد بين عمرُ الفرقَ بين الغلبتين أفصحَ بيان: فقال في الغلبة الأولى: "فمازلت أصوم وأتصدق وأعتق إلخ. وقال في الثانية: "فعجبتُ لي وجرأتي" فانظر الفرقَ بين هاتين الكلمتين.

ترجمہ: اور قلب کے احوال میں سے غلبہ ہے اور غلبہ: دو غلبے ہیں: (۱) ایسے داعیہ کا غلبہ جو مؤمن کے قلب سے ابھرنے والا ہو یعنی عالم بالا سے نازل ہونے والا نہ ہو، جب اس کے ساتھ نور ایمان مخلوط ہوتا ہے۔ پس یہ پڑتا ہے وہ جھاگ جو اس نور اور قلب کی فطرت سے پیدا ہونے والا ہے۔ پس وہ جھاگ (جوش) ایسا داعیہ اور خیال بن جاتا ہے جس کے مقتضی سے رکنے کی وہ طاقت نہیں رکھتا۔ خواہ وہ داعیہ مقصود شرع کے موافق ہو یا نہ ہو۔

اور وہ بات یعنی داعیہ کا مقصود شرع کے موافق نہ ہونا اس لئے ہے کہ شریعت ایسے بہت سے مقاصد کا احاطہ کئے ہوئے ہوتی ہے، جن کا احاطہ اِس مؤمن کا قلب نہیں کرسکتا۔ پس کبھی — مثال کے طور پر — مؤمن کا دل مہربانی کی تابعداری کرتا ہے، جبکہ شریعت نے بعض مواقع میں مہربانی کرنے کی ممانعت کی ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے:............اور کبھی مؤمن کا قلب بغض کی تابعداری کرتا ہے، جبکہ شریعت نرمی کا ارادہ کرتی ہے، جیسے ذمی لوگ۔

(۲) اور ایک دوسرا غلبہ: جو اس سے بڑا اور اتم ہے۔ اور وہ ایسے داعیۂ الٰہی کا غلبہ ہے جو قلب پر اترتا ہے، پس اس کے مقتضی سے رکنے کی آدمی طاقت نہیں رکھتا۔ اور اس غلبہ کی حقیقت: اس کی قوتِ عملیہ پر —— نہ کہ قوت عقلیہ پر —— بعض پاکیزہ مقامات سے علم الٰہی کا فیضان ہے —— اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ نفس جو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے نفوس کے مانند ہے یعنی اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہے، جب اس میں فیضانِ الٰہی کی استعداد پیدا ہوتی ہے تو (الف) اگر اس نفس کی قوتِ عقلیہ: قوتِ عملیہ سے آگے بڑھی ہوئی ہوتی ہے تو وہ ڈالا ہوا علم: فراست اور الہام ہوتا ہے (ب) اور اگر اسکی قوت عملیہ: قوتِ عقلیہ سے آگے بڑھی ہوئی ہوتی ہے تو وہ ڈالا ہوا علم: پختہ ارادہ اور متوجہ ہونا ہے یا نفرت اور باز رہنا ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ صدیقؓ کے دل میں داعیۂ الٰہی ڈالا گیا، جس نے ان کو بے رغبت کیا الحاح کرنے میں۔ اور جس نے ان کو ترغیب دی الحاح سے رکنے کی پس نبی ﷺ نے اپنی فراست سے جانا کہ وہ برحق داعیہ ہے۔ پس آپؐ نکلے اللہ کی نصرت کے ذریعہ مدد طلب کرتے ہوئے، اور یہ آیت تلاوت فرماتے ہوئے:

اور تحقیق عمرؓ نے دونوں غلبوں کے درمیان فرق بیان کیا ہے، نہایت واضح طور پر بیان کرنا۔ پس فرمایا پہلے غلبہ میں: ''پس میں برابر......'' اور دوسرے غلبہ میں فرمایا: ''پس مجھے خود پر اور اپنی بے باکی پر حیرت ہوئی'' پس ان دونوں کے درمیان فرق دیکھ۔

لغات: **الطُفَاحة**: ہانڈی کا جھاگ، اور کناروں سے باہر نکلنے والی شیئ۔ **طَفَحَ (ف) طَفْحا و طُفُوحا**: برتن کا بھر کر کناروں سے پانی بہہ جانا، چھلکنا۔ شاہ صاحب نے جوش اور ولولہ کو اس لفظ سے تعبیر کیا ہے...... **اِسْتَنْزَلَہ**: کسی سے نیچے اترنے کو کہنا...... **الدَنِیَّۃ و الدَنِیْئَۃ**: کمینگی، عیب، گھٹیا درجہ کی بات...... **الغرز**: رکاب (وہ لوہا جس میں پیر ڈال کر سوار ہوتے ہیں)...... **اِحْتَظَر بکذا**: حفاظت اور پناہ میں آنا و **الحَظَائِر جمع حظیرۃ**: باڑھ، وہ مکان جس میں مویشی حفاظت کے لئے بند کئے جائیں۔ مگر یہ معنی مناسب نہیں۔ اور حضرت ابوطیبہؒ کی روایت تو مجھے ملی نہیں۔ اور خادمہ سُرّہ کی جو روایت تقریر میں لکھی گئی ہے اس میں **حِظَار** ہے، جس کے معنی ہی: رکاوٹ، آڑ، لکڑی کی دیوار جو کمرے میں پارٹیشن کے لئے کھڑی کی جاتی ہے۔ یہ معنی مناسب ہیں۔ پس **قد احْتَظَرْتَ بِحِظَارٍ من النار** کے معنی ہیں: تم نے دوزخ سے ایک آڑ کے ذریعہ پناہ لے لی...... **المفاض** (اسم مفعول) **أفاض بکذا**: پھینکنا، دھکیلنا۔ **العلم المفاض**: اللہ کی طرف سے ڈالا ہوا علم۔

ملحوظہ: صلح حدیبیہ کے موقع پر مناقشہ والی روایات میں پہلے حضرت عمرؓ کا آنحضرت ﷺ کے پاس جانا، پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس جانا مذکور ہے۔ شاہ صاحب نے اس کے برعکس لکھا ہے۔ سرسری تلاش میں مجھے اس کا حوالہ نہیں ملا۔

☆ ☆ ☆

تیسرا حال: عبادت کو ترجیح دینا

قلب کو ایک عارضی حالت یہ پیش آتی ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کو اس کے علاوہ پر ترجیح دیتا ہے۔ اور عبادت کی راہ کے روڑوں کو ہٹا دیتا ہے اور اُن چیزوں سے نفرت کرتا ہے جو عبادت سے غافل کرنے والی ہیں۔ جیسے حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ نے کیا تھا: وہ اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک جنگلی کبوتر اڑا۔ وہ اِدھر اُدھر اڑنے لگا۔ اُسے ٹہنیوں اور پتّوں کی کثرت کی وجہ سے کوئی راہ نہیں مل رہی تھی۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ کو یہ منظر بھلا لگا۔ وہ کچھ دیر اس کو دیکھتے رہے۔ پھر جب وہ نماز کی طرف متوجہ ہوئے تو انھیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ کتنی رکعتیں پڑھیں ہیں؟ انھوں نے سوچا کہ اِس مال نے اُن کو فتنہ میں ڈالا۔ چنانچہ وہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صورتِ حال بیان کی، اور عرض کیا کہ یہ باغ اللہ کے لئے خیرات ہے۔ آپؐ جہاں مناسب سمجھیں خرچ کریں (موطا مالک ۱: ۹۸ کتاب الصلاۃ، قُبیل کتاب السھو)

چوتھا حال: خوفِ خدا کا غلبہ

قلب کو ایک عارضی حالت یہ بھی پیش آتی ہے کہ اس پر خوفِ خدا کا اس درجہ غلبہ ہو جاتا ہے کہ وہ رو پڑتا ہے، اور خوف سے اس کے شانے کا گوشت پھڑکنے لگتا ہے۔ درج ذیل روایات میں اس کا تذکرہ ہے:

حدیث —— حضرت عبداللہ بن الشِّخّیر رضی اللہ عنہ خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نماز پڑھ رہے تھے اور آپؐ کے اندر ایسی سنسناہٹ تھی جیسی ہانڈی کی سنسناہٹ ہوتی ہے یعنی آپؐ پر گریہ طاری تھا (نسائی ۳: ۱۳ مصری کتاب السهو، باب البكاء في الصلاة)

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سات قسم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے سایہ میں رکھیں گے، جس دن اللہ کے سایے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ یعنی قیامت کے دن میدانِ حشر میں۔ آپؐ نے ان میں اس شخص کا بھی تذکرہ فرمایا: جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا: پس اس کی آنکھیں بہہ پڑیں (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۷۰۱ باب المساجد)

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ شخص دوزخ میں نہیں جائے گا جو اللہ کے ڈر سے (کسی دن) رویا ہے، یہاں تک کہ دودھ تھن میں لوٹے'' یہ تعلیق بالمحال ہے (مشکوۃ حدیث ۳۸۲۸ کتاب الجہاد)

حدیث —— حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بہت زیادہ رونے والے تھے۔ جب وہ قرآن پڑھتے تھے تو اپنی آنکھوں پر قابو نہیں رکھ سکتے تھے (بخاری حدیث ۴۷۶ كتاب الصلاة، باب المسجد يكون إلخ)

حدیث —— حضرت جبیر بن مُطعم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے مغرب کی نماز میں رسول اللہ ﷺ کو سورۃ الطّور پڑھتے ہوئے سنا۔ جب آپ اس آیت پر پہنچے: ''کیا وہ بدون کسی چیز کے پیدا ہوگئے ہیں یا وہ خود خالق ہیں؟ یا انھوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ بلکہ وہ لوگ یقین نہیں کرتے! یا ان کے پاس آپؐ کے رب کے خزانے ہیں یا وہ حاکم ہیں؟'' (سورۃ الطّور آیات ۳۵-۳۷) پس قریب تھا کہ میرا دل پرواز کر جائے یعنی میں ہارٹ فیل ہونے کے قریب ہوگیا! (بخاری حدیث ۴۸۵۴ تفسیر سورۃ الطّور)

ومنها: إيثار طاعة الله تعالى على ماسواها، وطردُ موانعها، والنفرةُ عما يُشغله عنها، كما فعل أبو طلحة الأنصاريُّ: كان يصلى فى حائط له، فطار دُبْسِيٌّ، وطفق يتردد، ولا يجد مخرجًا من كثرة الأغصان والأوراق، فأعجبه ذلك، فصار لايدرى كم صلى؟ فتصدق بحائطه.

ومنها: غلبة الخوف حتى يظهر البكاءُ وارتعادُ الفرائص، وكان له صلى الله عليه وسلم إذا صلى بالليل أَزِيْزٌ كَأَزِيْزِ المِرْجَل. وقال صلى الله عليه وسلم فى سبعة يظلهم الله تعالى فى ظله

يوم لاظل إلا ظله:" ورجل ذكر الله تعالى خالياً ففاضت عيناه" وقال:" لايلج النارَ رجلٌ بكى من خشية الله، حتى يعودَ اللبن في الضرع" وكان أبوبكر رجلاً بكاَّءً، لايملك عينيه حين يقرأ القرآن. وقال جبير بن مُطعم: سمعتُ النبي صلى الله عليه وسلم يقرأ:﴿أَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْئٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ؟﴾ فكأنما طار قلبي.

ترجمہ: واضح ہے۔ الدُّبْسِیّ: کبوتروں کی ایک قسم جن کا رنگ خاکی ہوتا ہے...... الفرائص جمع الفريصة: مونڈھے اور سینے کے درمیان کا گوشت جو خوف کے وقت حرکت کرنے لگتا ہے۔ اَرْتَعَدَتْ فرائصُه: وہ گھبرا گیا، لرز اٹھا، ڈر سے اس کے شانے کا گوشت پھڑکنے لگا...... الأزيز: آواز، گونج۔ أَزَّ (ض) أَزًّا وَأَزِيْزًا: حرکت کرنا۔ گونج دار آواز پیدا ہونا، زن زن کرنا، سنسنانا...... المِرجَل: مٹی کی ہانڈی۔

☆ ☆ ☆

مقاماتِ نفس

پہلا مقام: توبہ

نفس کو بدکرداری اور پرہیز گاری: دونوں باتوں کا القا کیا گیا ہے۔ اور نفس کی یہ حالت ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ یعنی اس کا بدی کا جذبہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ البتہ جس پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہوجائے: اس پر نورِ ایمان قابض ہوتا ہے، وہ نفس کو زیر کرتا ہے۔ اور اس کے گھٹیا احوال کو عمدہ احوال سے بدل دیتا ہے۔ نفس کو اس جہت سے جو کمالات حاصل ہوتے ہیں وہ اس کے "مقامات" کہلاتے ہیں۔ شاہ صاحب قدس سرہ نے نفس کے ایسے چار مقامات (کمالات) بیان کئے ہیں جو یہ ہیں: توبہ، حیاء، وَرع (پرہیز گاری) اور ترکِ لایعنی۔

نفس کا پہلا مقام: توبہ ہے۔ اور نفس کو مقامِ توبہ تک پہنچنے کے لئے تین مراحل سے گذرنا پڑتا ہے:

پہلا مرحلہ: اس عقل سے جو عقائدِ حقّہ سے منور ہوچکی ہے: ایمان کا نور قلب پر نازل ہو۔ اور قلب کی فطری حالت سے اس کا ازدواج ہو۔ پھر دونوں کے درمیان ایک "جھڑکنے والا" پیدا ہو یعنی ضمیر بیدار ہو، جو نفس کو مغلوب کرے۔ اور اس کو شریعت کی خلاف ورزی پر پھٹکارے۔

پھر اس ازدواج کے نتیجہ میں "ندامت" پیدا ہو، اور وہ بھی نفس کو مغلوب کرے۔ اور اس کو پامال کرے اور اس کا گریبان پکڑے۔ پھر اسی نور و قلب کے ازدواج سے آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ جنم لے۔ اور وہ بھی نفس کو مغلوب کرے۔ اور اس کو شریعت کے اوامر و نواہی کی تعمیل پر مطمئن کرے، تو توبہ کا ایک مرحلہ پورا ہوا۔

اس مرحلہ کا تذکرہ سورۃ النازعات: آیات ۴۰ و۴۱ میں ہے۔ فرمایا: ’’اور رہا وہ شخص جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کو خواہشات سے روکا، تو جنت ہی اس کا ٹھکانا ہے!‘‘

تفسیر: اس آیت میں دو باتیں غور طلب ہیں:

پہلی بات: اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی سے ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ عقل نورِ ایمان سے روشن ہوجائے، پھر وہ نور عقل سے قلب کی طرف اترے۔ کیونکہ اللہ کا خوف اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب بندہ اللہ تعالیٰ کو اور ان کی سطوت اور دبدبہ کو پہچانتا ہے۔ اور یہ پہچاننا ہی نورِ ایمان سے عقل کا منور ہونا ہے —— اور جب خوف اپنی نہایت کو پہنچتا ہے تو آدمی گھبراتا ہے، بے چین ہوتا ہے اور ہکا بکا رہ جاتا ہے۔ یہی عقل سے قلب پر نورِ ایمان کا اترنا ہے۔

دوسری بات: اور نفس کو خواہش سے روکنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جب پتھر جیسے سخت دل پر عقل سے نورِ ایمان اترتا ہے تو وہ پگھلتا ہے۔ پھر وہ نور نفس کی طرف اترتا ہے، اس کو مغلوب کرتا ہے۔ سخت ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے اور اپنا تابعدار بناتا ہے۔ چنانچہ نفس نورِ قلب کی ماتحتی قبول کرلیتا ہے۔

دوسرا مرحلہ: پھر دوبارہ عقل سے نورِ ایمان اترتا ہے۔ اور قلب کی فطری حالت کے ساتھ اس کا ازدواج ہوتا ہے۔ اور دونوں کے درمیان سے ’’اللہ کی طرف پناہ لینا‘‘ جنم لیتا ہے یعنی بندہ اللہ کی پناہ لینا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو گناہ کا زنگ زائل ہوجاتا ہے۔

اس مرحلہ کا تذکرہ ایک حدیث میں آیا ہے: ’’جب مؤمن گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ دھبّہ لگ جاتا ہے۔ پھر اگر وہ توبہ کرتا ہے اور بخشش طلب کرتا ہے تو دل صاف ہوجاتا ہے۔ اور اگر گناہ بڑھتا ہے تو وہ دھبّہ بھی بڑھتا ہے تا آنکہ اس کے دل پر حاوی ہوجاتا ہے۔ یہی وہ زنگ ہے جس کا ذکر سورۃ التطفیف آیت ۱۴ میں آیا ہے۔ فرمایا: ’’ہرگز نہیں! بلکہ ان کے دلوں پر اُن اعمال کا زنگ بیٹھ گیا ہے جو وہ کیا کرتے تھے‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۲۳۴۲)

تشریح: سیاہ دھبّے سے مراد یہ ہے کہ جب بندہ گناہ کرتا ہے تو بہیمیت کی کوئی تاریکی ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اور ملکیت کا کوئی نور چھپ جاتا ہے۔ اور توبہ سے دل صاف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر نور کا فیضان ہوتا ہے۔ جس سے بہیمیت کی تاریکی چھٹ جاتی ہے۔ اور دل مجلّٰی ہوجاتا ہے۔ اور زنگ سے مراد بہیمیت کا تسلط اور ملکیت کا تستُّر ہے۔

تیسرا مرحلہ: پھر نفس پر بار بار نورِ ایمان نازل ہوتا ہے۔ اور وہ نفس کے وساوس کو دفع کرتا ہے۔ چنانچہ جب بھی نفس میں گناہ کا خیال انگڑائی لیتا ہے تو فوراً ایک نور نازل ہوتا ہے، اور وہ اس باطل خیال کا سر کچل دیتا ہے۔ اور اس کو فنا کی گھاٹ اتار دیتا ہے۔

اس مرحلہ کا تذکرہ اس حدیث میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان فرمائی: ایک سیدھا راستہ جس کی دونوں جانب دیواریں ہیں، جن میں کھلے ہوئے دروازے ہیں۔ اور ان پر پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ اور راستہ

کے سرے پر ایک داعی ہے۔ وہ پکارتا ہے: سیدھا چلا آ، اِدھر اُدھر نہ مُڑ۔ اور اس سے بالا ایک اور داعی ہے۔ جب راہ رَو اُن پردوں میں سے کسی پردے کو کھولنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ پکارتا ہے: تیرا ناس ہو! اس کو مت کھول۔ اگر تو اس کو کھولے گا تو اندر گھس جائے گا'' پھر رسول اللہ ﷺ نے اس مثال کی وضاحت فرمائی کہ سیدھا راستہ اسلام ہے اور کھلے ہوئے دروازے: اللہ کے حرام کئے ہوئے کام ہیں۔ اور لٹکائے ہوئے پردے: اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔ اور راستہ کے سرے پر پکارنے والا: قرآن ہے۔ اور اس سے بالا پکارنے والا منجانب اللہ ناصح ہے جو ہر مؤمن کے دل میں ہے'' (مشکوۃ حدیث ۱۹۱)

تشریح: پہلا داعی قرآن وشریعت ہیں۔ جو ایک ہی انداز پر لوگوں کو سیدھے راستہ کی طرف بلاتے ہیں۔ اور دوسرا داعی: جو راستہ چلنے والے کے سر پر ہے: جو ہر وقت اس کی نگرانی کرتا ہے، اور جب بھی وہ کسی گناہ کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس کو دھمکاتا ہے، یہ دوسرا داعی: وہ خیال ہے جو دل سے ابھرتا ہے۔ جو قلب کی فطری حالت اور اس نور کے ازدواج سے پیدا ہوتا ہے، جو اس عقل سے قلب پر فائض ہوتا ہے جو تعلیماتِ قرآن کے نور سے منور ہو چکی ہے۔ اور وہ خیال اُن چنگاریوں کی طرح ہے جو چقماق رگڑنے سے بار بار جھڑتی ہے۔ اسی طرح یہ خیال بھی بار بار آتا ہے اور مؤمن بندہ کو گناہ سے روکتا ہے۔

خصوصی معاملہ: بعض بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خصوصی معاملہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ان کے لئے کوئی غیبی لطیفہ پیدا کرتی ہے۔ اور وہ بندے اور معصیت کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ ایسے بندوں کو توبہ کے مراحل سے نہیں گذرنا پڑتا۔ وہ دفعۃً مقام توبہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ سورہ یوسف آیت ۲۴ میں برہان ربّ سے اسی کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا: ''اور بخدا! صورتِ حال یہ تھی کہ وہ عورت ان کا پختہ ارادہ کر چکی تھی۔ اور وہ بھی اس کا پختہ ارادہ کر لیتے اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھتے'' —— یہاں تک مقام توبہ کا بیان ہے۔

فائدہ (۱) وہ برہانِ رب جو وقت پر حضرت یوسف علیہ السلام کے ذہن میں مستحضر ہوئی وہ یہ تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں یہ احساس پیدا ہوا کہ میرے لئے اس عورت کی دعوتِ عیش قبول کرنا کسی طرح زیبا نہیں۔ اول تو یہ اللہ کا بڑا گناہ ہے، پھر مجھے اپنے محسنِ مجازی کا حق شناس ہونا چاہئے۔ اس نے مجھے اچھی منزلت دی، پھر میں اس کے ناموس پر کیوں حملہ کروں، توبہ! توبہ! ایسے ظالموں کو کبھی فلاح نصیب نہیں ہوتی: ﴿قَالَ: مَعَاذَ اللّٰهِ! إِنَّهُ رَبِّيْ أَحْسَنَ مَثْوَايَ، إِنَّهُ لَايُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ دل میں یہ احساس پیدا ہونا ہی لطیفۂ غیبی ہے جس کی وجہ سے آپ اس عورت کا قصد کرنے سے بچ گئے۔

فائدہ: (۲) توبہ کی توفیق اسی کو ملتی ہے جس کا اعتقاد صحیح ہوتا ہے۔ صحتِ اعتقاد کا صحتِ عمل میں بڑا دخل ہے۔ مثلاً: جو لوگ اللہ تعالیٰ کو غفور رحیم ہی جانتے ہیں۔ وہ ہمیشہ بے عملی بلکہ بدعملی کی دلدل میں پھنسے رہتے ہیں۔ اور جو یہ درست اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دردناک سزا دینے والے بھی ہیں ان کو دیر سویر اصلاحِ عمل کی توفیق مل جاتی ہے۔ سورۃ الحجر آیات ۴۹ و ۵۰ میں، اور سورۃ المائدہ آیت ۹۸ میں اللہ تعالیٰ کی ان دونوں صفات کی ایک ساتھ آگہی دی گئی ہے۔ پس صحیح اعتقاد رکھنے والوں ہی کو منزل توبہ ملتی ہے۔

﴿وأما المقامات الحاصلة للنفس﴾

من جهة تسلُّطِ نور الإيمان عليها، وقَهره إياها، وتغيير صفاتِها الخسيسة إلى الصفات الفاضلة:

فأولها: أن يَـنـزل نـورُ الإيمان من العقل المتنوِّرِ بالعقائد الحقَّةِ إلى القلب، فَيَزْدَوِجَ بجبلة الـقـلـب، فيتـولَّدَ بينهما زَاجِرٌ يَقهر النفسَ، ويَزجُرُها عن المخالفات،ثم يتولَّد بينهما نَدَمٌ يَقهر الـنـفسَ، ويأتى عليها، ويأخذ بتَلَابِيْبِها، ثم يتولد بينهما العزمُ على ترك المعاصى فى المستقْبَلِ من الزمان، فَيَقْهر النفسَ، ويجعلُها مطمئنة بأوامر الشرع، ونواهيه.

قال الله تعالىٰ:﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ، وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوىٰ، فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَأْوٰى﴾

أقول:أماقوله:﴿مَنْ خَافَ﴾ فبيانٌ لاستنارَةِ العقل بنور الإيمان، ونزولِ النور منه إلى القلب.

وذلك: لأن الـخوف له مبتدأٌ ومنتهى؛ فمبتدؤُه: معرفةُ المَخُوْفِ منه وسطوتِه، وهذا محلُّه العقل. ومنتهاه: فزعٌ، وقَلَقٌ، وَدَهَشٌ؛ وهذا محلُّه القلب.

وأمـا قـولـه:﴿وَنَهَـى النَّفْسَ﴾ فبيانٌ لنزول النورِ المخالطِ لِوَكَاعَةِ القلب إلى النفس، وقهره إياه، وزجره لها، ثم انقهارِها وانزِجَارِها تحت حكمه.

ثـم يَـنـزل من العقل نورُ الإيمان مرةً أخرى، ويزدوج بجبلة القلب، فيتولَّد بينهما اللجأُ إلى الله، ويُفضى ذلك إلى الاستغفار والإنابة؛ والاستغفارُ يُفضى إلى الصِّقَالَةِ.

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:" إن المؤمن إذا أذنب: كانت نكتةٌ سوداءُ فى قلبه، فإن تـاب واستـغـفـر صُـقِلَ قلبُه، فإن زاد زادت، حتى تَعْلُوَ قلبَه، فذلكم الرَّانُ الذى ذكرالله تعالى: ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَاكَانُوا يَكْسِبُوْنَ﴾

أقول: أمـا النكتة السوداءُ: فظهور ظلمةٍ من ظلماتِ البهيمية، واستتارُ نور من الأنوار الملكية، وأما الصِّقَالَةُ: فضوءٌ يُفَاضُ على النفس من نور الإيمان. وأما الرَّان: فغلبة البهيمية، وكمونُ الملكية رأسًا.

ثـم يتـكـرر نـزولُ نورِ الإيمان، ودفعُه الهاجِسَ النفسانِيَّ، فكلما هجس خاطر المعصية من النفس نزل بإزائه نورٌ، فدمغ الباطل ومحاه.

قـال صـلى الله عليه وسلم:" ضرب الله مثلاً صراطًا مستقيما، وعن جنبتى الصراط سُوْرَانِ، فيهـمـا أبواب مفتحة، وعلى الأبواب ستورٌ مُرْخَاةٌ، وعند رأس الصراط داعٍ، يقول: استقيموا عـلـى الـصـراط، ولا تَـعَـوَّجُـوْا، وفـوقَ ذلك داعٍ، يـدعـو كلما هَمَّ عبدٌ أن يفتح شيئًا من تلك الأبـواب، قـال: ويـحك! لاتَـفْـتَـحْـه، فـإنك إن تَـفْـتَـحْه تَلِجْهُ" ثم فَسَّرَه: فأخبر أن الصراط هو

الإسلام، وأن الأبواب المفتَّحَةَ محارمُ الله، وأَنَّ الستور المرخاةَ حدود الله، وأن الداعيَ على رأس الصراط هو القرآن، وأن الداعي من فوقه: هو واعظُ الله في قلب كل مؤمن.

أقول: بين النبيُّ صلى الله عليه وسلم أن هناك داعيين: داعيًا على رأس الصراط، وهو القرآن والشريعةُ، لايزال يدعو العبدَ إلى الصراط المستقيم بنسقٍ واحدٍ؛ وداعيًا فوق رأس السالك، يراقبه كل حين، كلما همَّ بمعصية صاح عليه؛ وهو الخاطِرُ المنبجسُ من القلب، المتولِّدُ من بين جبلة القلب، والنور الفائض عليه من العقل المتنوِّر بنور القرآن، وإنما هو بمنزلة شررٍ ينقَدِحُ من الحجر دفعةً بعد دفعة.

وربما يكون من الله تعالى لطفٌ ببعض عباده، بإحداثِ لطيفة غيبية، تحول بينه وبين المعصية، وهو البرهان المشارُ إليه في قوله تبارك وتعالىٰ: ﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ، وَهَمَّ بِهَا لَوْلاَ أَنْ رَأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ﴾ وهذا كلُّه مقام التوبة.

ترجمہ: اور رہے وہ مقامات جو نفس کو حاصل ہونے والے ہیں: اس پر نورِ ایمان کے قابض ہونے، اور نور کے نفس پر غالب آنے، اور اس کی نکمّی صفات کو عمدہ صفات میں تبدیل کرنے کی جہت سے: —— پس ان مقامات میں سے پہلا مقام: یہ ہے کہ ایمان کا نور اُس عقل سے جو عقائد حقّہ سے منور ہو چکی ہے: دل کی طرف اترے۔ پس وہ قلب کی جبلت کے ساتھ ازدواجی تعلق قائم کرے۔ پس دونوں کے درمیان ایک ایسا ''جھڑکنے والا'' پیدا ہو جو نفس کو مغلوب کرے اور اس کو (شریعت کی) مخالفتوں پر ڈانٹے۔ پھر دونوں کے درمیان ایسی ''پشیمانی'' پیدا ہو جو نفس کو مغلوب کرے، اور وہ نفس کو پامال کرے، اور وہ نفس کا گریبان پکڑے۔ پھر دونوں کے درمیان ''زمانۂ آئندہ میں گناہ ترک کرنے کا پختہ ارادہ'' پیدا ہو، پس وہ عزم: نفس کو مغلوب کرے۔ اور نفس کو شریعت کے اوامر و نواہی پر مطمئن کرے —— (آیت کریمہ) میں کہتا ہوں: اور رہا اللہ کا ارشاد: ''جو ڈرا'' تو وہ بیان ہے نورِ ایمان سے عقل کے روشن ہونے کا، اور عقل سے قلب کی طرف نور کے اترنے کا —— اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ خوف کے لئے ایک آغاز اور ایک انتہا ہے۔ پس اس کا آغاز: اس ہستی کو جس سے ڈرا جاتا ہے اور اس کے غلبہ کو پہچاننا ہے۔ اور اس کا محل عقل ہے۔ اور اس کا منتہی: گھبراہٹ، بے چینی اور ہکا بکا رہ جانا ہے۔ اور اس کا محل قلب ہے —— اور رہا اللہ کا ارشاد: ''اور نفس کو روکا'' یہ بیان ہے: اس نور کے اترنے کا جو قلب کی سختی سے ملنے والا ہے: نفس کی طرف، اور اس نور کے نفس کو مغلوب کرنے کا، اور نور کے نفس کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا، پھر نفس کی تابعداری کرنے کا، اور نفس کے رکنے کا نور کے حکم کے ماتحت۔

پھر عقل سے ایمان کا نور دوسری مرتبہ اترتا ہے۔ اور وہ قلب کی فطری حالت کے ساتھ ازدواجی تعلق قائم کرتا ہے، پس دونوں کے درمیان پیدا ہوتا ہے ''اللہ کی طرف پناہ لینا'' اور وہ پناہ لینا استغفار اور رجوع الی اللہ تک پہنچاتا ہے۔ اور

مغفرت طلبی: زنگ دور کرنے تک پہنچاتی ہے۔

(حدیث شریف کے بعد) میں کہتا ہوں: رہا سیاہ دھبّہ: تو وہ بہیمیت کی تاریکیوں میں سے ایک تاریکی کا ظہور ہے۔ اور ملکیت کے انوار میں سے ایک نور کا چھپنا ہے —— اور رہا مانجھنا: تو وہ روشنی ہے جو نور ایمان سے نفس پر بہائی جاتی ہے —— اور رہا زنگ: تو وہ بہیمیت کا غلبہ ہے، اور ملکیت کا بالکل چھپ جانا ہے۔

پھر نور کا نزول اور اس کا نفسانی وساوس کو دفع کرنا بار بار ہوتا ہے۔ پس جب جب معصیت کا خیال نفس میں کھٹکتا ہے تو اس کے مقابلہ میں ایک نور اترتا ہے۔ پس وہ خیال باطل کا بھیجا نکال دیتا ہے۔ اور اس کو مٹا دیتا ہے —— میں کہتا ہوں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ وہاں دو پکارنے والے ہیں: ایک داعی راستہ کے سرے پر ہے۔ اور وہ قرآن وشریعت ہے۔ وہ ایک انداز سے بندے کو برابر سیدھے راستہ کی طرف بلاتا ہے۔ اور دوسرا پکارنے والا راہ رَو کے سر پر ہے، وہ اس کی ہر وقت نگرانی کرتا ہے۔ جب جب وہ کسی گناہ کا ارادہ کرتا ہے تو وہ چلاّتا ہے، اور وہ (دوسرا داعی) وہ خیال ہے جو دل سے ابھرنے والا ہے۔ جو قلب کی جبلّت اور اس نور کے درمیان سے پیدا ہونے والا ہے، جو قلب پر اس عقل سے فائض ہونے والا ہے جو قرآن کے نور سے منور ہو چکی ہے۔ اور وہ خیال بمنزلہ اُن چنگاریوں کے ہے جو پتھر سے جھڑتی ہیں یکے بعد دیگرے۔

اور کبھی اللہ کی طرف سے اپنے بعض بندوں پر مہربانی ہوتی ہے: کسی غیبی لطیفہ کے پیدا کرنے کے ذریعہ، جو بندے اور معصیت کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ اور وہی ''برہان'' ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں .... اور یہ سبھی مقام توبہ کا بیان ہے۔

لغات: **التَلْبِيْب**: گریبان، جمع **تَلَابِيْب**...... **مَخُوْفٌ منه**: **خاف من كذا** کا اسم مفعول ہے یعنی وہ ذات جس سے ڈرا جاتا ہے، مراد اللہ تعالیٰ ہیں، کیونکہ ان کے عذاب کا اندیشہ ہے...... **وَكُعَ** (ک) **وَكَاعَةً الشيئُ**: ٹھوس اور سخت ہونا۔ قلب فطری طور پر پتھر جیسا سخت ہے، جب اس سے نور ایمان ملتا ہے تبھی وہ نرم پڑتا ہے...... **اِزْدَوَجَ**: شادی کا تعلق قائم کرنا۔

☆ ☆ ☆

دوسرا مقام: حیا (شرم)

مقام توبہ میں جب پختگی آتی ہے تو وہی مقام حیا کہلاتی ہے۔ فرماتے ہیں: جب مقام توبہ مکمل ہو جاتا ہے۔ اور وہ نفس میں ایسی جمی ہوئی کیفیت بن جاتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی جلالت وعظمت کا تصور کیا جائے تو آدمی مضمحل (پاش پاش) ہو کر رہ جائے، اور وہ ملکہ ایسا پائیدار ہو جائے کہ اس میں کوئی چیز تبدیلی نہ کر سکے تو وہی مقام حیا ہے۔

حیا کے لغوی معنی ہیں: نفس کا ایسی چیزوں سے باز رہنا جن کو لوگ عموماً برا جانتے ہیں۔ اور شریعت کی اصطلاح میں حیا: نفس میں جمی ہوئی اس کیفیت کا نام ہے جس کی وجہ سے نفس بارگاہ خداوندی میں ایسا پگھل جاتا ہے جس طرح نمک پانی میں پگھل

جاتا ہے۔اورآدمی ان خیالات کی تابعداری کرنے سے رک جاتا ہے جوشریعت کی خلاف ورزیوں کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

فائدہ: ایک حیا: عقل کے احوال میں سے ہے، جس کا تذکرہ پہلے آچکا ہے۔وہ حیا بابِ معرفت سے ہے۔میرے استاذ شیخ محمود عبدالوہاب محمود قدس سرہ جومصر کے شہر اسکندریہ کے تھے،اور جامعہ ازہر کی طرف سے دارالعلوم دیوبند میں مبعوث فرمائے گئے تھے اور میں ان کا خادم تھا۔ان کا حال یہ تھا کہ گرمیوں میں ان کے جسم میں گرمی دانے نکل آتے تھے۔کپڑا پہننا ان کے لئے نہایت تکلیف دِہ ہوتا تھا۔کمرے میں رات دن صرف پاجامہ پہنے رہتے تھے،مگر جب فرض نماز کے لئے مسجد میں جاتے تو بنیان، پھر توب (لمبا عربی کرتا) پھر عبا پہنتے اوراوپر سے شال اوڑھتے ،اور دلہا بن کر مسجد میں جاتے ،اورنہایت سکون سے نماز پڑھتے۔اور جب واپس آتے تو سارے کپڑے نہایت ناگواری کے ساتھ اتار پھینکتے۔ایک دن میں نے عرض کیا: حضرت! آپ یہ سب کپڑے کیوں پہنتے ہیں،توب کافی ہے،فرمایا:سعید! إنی اَسْتَحْيِیْ من اللّٰہ! سعید! مجھے اللہ سے شرم آتی ہے۔یہی حیا بابِ معرفت سے ہے۔جو عقل کا ایک حال ہے۔

اور یہاں جس حیا کا ذکر ہے وہ بابِ اخلاق سے ہے،اوروہ نفس کا ایک ملکہ ہے،جس کوانسان کی سیرت سازی میں بڑادخل ہے۔اسی وصف وخُلق کی وجہ سے آدمی بہت سے بُرے کاموں اور بُری باتوں سے رک جاتا ہے۔اوراچھےاور شریفانہ کام کرنے لگتا ہے۔چنانچہ احادیث میں اس وصف پر بہت زور دیا گیا ہے۔اس سلسلہ کی دوحدیثیں ذیل میں پڑھیں: (فائدہ تمام ہوا)

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''حیا ایمان سے ہے، اور ایمان جنت میں ہے۔اور فحش گوئی گنوار پن سے ہے،اورگنوار پن دوزخ میں ہے'' (مشکوۃ حدیث ۵۰۷۷)

تشریح: شرم وحیا شجرِ ایمان کی ایک اہم شاخ ہے،صحیحین کی ایک دوسری حدیث میں **الحیاء شُعبة من الإیمان** فرمایا گیا ہے۔اوربیہقی کی روایت میں ہے کہ:''حیااورایمان دونوں ہمیشہ ساتھ اوراکٹھے رہتے ہیں۔جب ان میں سے کوئی ایک اٹھالیا جاتا ہے تو دوسرا بھی اٹھالیا جاتا ہے''یعنی دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے،ایک وصف اٹھالیا جائے گا تو دوسرا بھی اٹھالیا جائے گا۔رہی یہ بات کہ حیا کیا ہے؟ تواس کی تفصیل ذیل کی روایت میں ہے:

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''اللہ تعالیٰ سے ایسی حیا کرو،جیسا اُن سے حیا کرنے کا حق ہے!''صحابہ نے عرض کیا: الحمدللہ! ہم اللہ سے حیا کرتے ہیں! آپؐ نے فرمایا: وہ (جوتم حیا کرتے ہو) حیانہیں ہے۔بلکہ اللہ تعالیٰ سے ایسی حیا کرنا جیسا اُن سے حیا کرنے کا حق ہے: یہ ہے کہ آپ سر کی اور جن قُوی کوسر نے جمع کیا ہے نگہداشت کریں (اس میں کان، آنکھ اورافکار کی حفاظت کا حکم آگیا) اور پیٹ کی اوراُن اعضا کی جن کو پیٹ نے سمیٹا ہے نگہداشت کریں (اس میں شہوتِ بطن اورشہوتِ فرج سے بچنے کا حکم آگیا) اورموت اور بوسیدہ ہونے کو یاد کریں۔اور جوشخص آخرت کواپنا مقصد بناتا ہے تو وہ دنیا کی آرائش سے دست بردار ہوجاتا ہے،اورآخرت کودنیا پرترجیح دیتا ہے۔پس جس نے یہ سب کام کئے اس نے یقیناً اللہ سے حیا کی جیسا ان سے حیا کرنے کا حق ہے!'' (ترمذی ۶۹:۲ صفة القیامة)

تشریح: عرفِ عام میں اس شخص کو جو طبعی کمزوری کی وجہ سے بعض کام نہیں کرتا: حیادار کہا جاتا ہے، اسی طرح اس بامروّت آدمی کو بھی باحیا کہا جاتا ہے جو ایسی باتوں کا ارتکاب نہیں کرتا، جن سے چہ میگوئیاں پھیلتی ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں اس حیا سے نہیں ہیں جو نفس کے مقامات میں سے ہے۔ اس لئے نبی ﷺ نے مذکورہ حدیث میں تین باتوں کی وضاحت فرمائی:

پہلی بات —— حیا سے کیا مراد ہے؟ —— نبی ﷺ نے چند ایسے کام متعین کئے جو حیا ہی سے رونما ہوتے ہیں، اور بتایا کہ ان کاموں سے رکنے کا نام حیا ہے۔ فرمایا: ''حیا یہ ہے کہ آدمی سر کی اور اُن قُوی کی جن کو سر نے جمع کیا ہے، اور پیٹ کی اور اُن اعضاء کی جن کو پیٹ نے سمیٹا ہے نگہداشت رکھے'' اور ان سے صادر ہونے والے گناہوں سے بچے۔ اس ارشاد میں اُن افعال کا بیان ہے جو زیرِ گفتگو ملکۂ حیا سے رونما ہونے والے ہیں اور جو ممنوعات کے قبیل سے ہیں۔

دوسری بات —— باعثِ حیا کیا چیز ہے؟ —— آپؐ نے اس سبب کی نشاندہی بھی فرمائی جو باعث حیا بنتا ہے۔ فرمایا: ''چاہئے کہ وہ موت کو اور بوسیدگی کو یاد کرے'' اس میں اس سبب کا بیان ہے جس سے حیا نفس میں گھر کرتی ہے۔

تیسری بات —— حیا کا پڑوسی کون ہے؟ —— فرمایا: زہد اور حیا میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کیونکہ حیا کبھی بھی زہد سے علحدہ نہیں ہوتی۔ حدیث کے آخری حصہ میں یہی بات بیان کی گئی ہے کہ ''جو شخص آخرت کو اپنا مقصد بنا لیتا ہے وہ دنیا کی آرائش کو چھوڑ دیتا ہے، اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتا ہے'' یہی زُہد ہے۔

وإذا تمَّ مقامُ التوبة، وصار ملكةً راسخةً في النفس، تُثْمِرُ اضمحلالاً عند إحضار جلال الله، لايغيرها مغير: سُميت حياءً.

والحياء في اللغة: انحجامُ النفس عما يَعِيْبُه الناسُ في العادة، فنقله الشرعُ إلى ملكة راسخة في النفس، تنماع بها بين يديِ الله كما ينماع الملح في الماء، ولاينقاد بسببها للخواطر المائلة إلى المخالفات.

قال صلى الله عليه وسلم: " الحياء من الإيمان" ثم فسر الحياء، فقال: " من استحيا من الله حقَّ الحياء، فَلْيَحْفَظِ الرأسَ وماوعٰى، وليحفظ البطنَ وماحوىٰ، وليذكر الموتَ والبِلٰى، ومن أراد الآخرةَ ترك زينةَ الدنيا، من فعل ذلك فقد استحيا من الله حقَّ الحياء"

أقول: قد يقال في العرف للإنسان المنحجم عن بعض الأفعال لضعفٍ في جبلته: أنه حَيِيٌّ؛ وقد يقال للرجل صاحبِ المروءةِ، لايرتكب ما يَفْشو لأجله القَالَةُ: إنه حَيِيٌّ؛ وليسا من الحياء المعدود من المقامات في شيئ؛ فعرَّف النبي صلى الله عليه وسلم المعنىَ المرادَ بتعيينِ أفعالٍ تنبعث منه، والسببَ الذي يَجْلِبُه، ومُجَاوِرَه الذي يلزمه في العادة.

فقوله: " فليحفظ الرأس" إلخ بيان للأفعال المنبجسة من ملكة الحياءِ المرادِ، مما هو من

جنس ترك المخالفات، وقوله:" وليذكر الموت" بيان لسبب استقراره في النفس؛ وقوله: "من أراد الآخرة" بيان لمجاوره الذى هو الزهد؛ فإن الحياء لايخلو عن الزهد.

ترجمہ: اور جب مقام توبہ مکمل ہوتا ہے، اور وہ نفس میں جما ہوا ایسا ملکہ ہو جاتا ہے، جو پھل دیتا ہے اضمحلال (پاش پاش ہونے) کا، اللہ کے جلال کو پیش نظر لانے کی صورت (اور) نہیں بدلتا اس ملکہ کو کوئی بدلنے والا، تو وہ ملکہ: حیا کہلاتا ہے۔

اور حیا لغت میں: نفس کا باز رہنا ہے ان چیزوں سے جن کو لوگ عادۃً معیوب سمجھتے ہیں۔ پھر شریعت نے لفظ حیا کو منتقل کیا: نفس میں جمے ہوئے ملکہ کی طرف، جس کی وجہ سے نفس پگھلتا ہے اللہ تعالیٰ کے سامنے، جس طرح نمک پانی میں پگھل جاتا ہے۔ اور جس کی وجہ سے آدمی تابعداری نہیں کرتا اُن خیالات کی جو شریعت کے خلاف ورزیوں کی طرف مائل ہونے والے ہیں۔

میں کہتا ہوں: کبھی عرف میں کہا جاتا ہے اُس انسان کو جو اپنی فطری کمزوری کی وجہ سے بعض کاموں سے باز رہنے والا ہے کہ وہ شرمیلا ہے۔ اور کبھی کہا جاتا ہے بامروّت آدمی کو جو ایسی بات کا ارتکاب نہیں کرتا جس کی وجہ سے چہ میگوئیاں ہوں کہ وہ شرمیلا ہے۔ درانحالیکہ وہ دونوں اس حیا سے جو مقامات میں شمار ہے کچھ بھی نہیں ہے۔ پس نبی ﷺ نے روشناس کرایا: (۱) مرادی معنی کو چند افعال متعین کر کے جو حیا سے برانگیختہ ہوتے ہیں (۲) اور اس سبب کو جو حیا کو کھینچتا ہے (۳) اور اس کے پڑوسی کو جو عادۃً حیا کے لئے لازم ہے۔

پس آپؐ کا ارشاد: ''پس چاہئے کہ نگہداشت کرے سر کی الی آخرہ'' بیان ہے اُن افعال کا جو مراد لی ہوئی حیا کے ملکہ سے ابھرنے والے ہیں، ان افعال میں سے جو کہ وہ خلاف ورزیوں کو چھوڑنے کے قبیل سے ہیں یعنی از قبیلِ منہیات ہیں۔ اور آپؐ کا ارشاد: ''اور چاہئے کہ یاد کرے موت کو'' بیان ہے حیا کے نفس میں استقرار کا۔ اور آپؐ کا ارشاد: ''جو آخرت کا ارادہ کرتا ہے'' بیان ہے حیا کے اس پڑوسی کا جو کہ وہ زہد ہے۔ پس بیشک حیا: زہد سے خالی نہیں ہوتی۔

لغات: اِنْمَاعَ السَّمَنُ: گھی کا پگھلنا۔ مَاعَ الجسمُ (ض) میعًا: پگھل جانا...... حَيِىٌّ علی وزنِ خَشِنٌ (حاشیہ مخطوطہ کراچی)...... القالة: فضول باتیں جن سے لوگوں کے درمیان جھگڑا پیدا ہو...... جملہ تثمر اور جملہ لايغير: دونوں ملكةً کی صفتیں ہیں (حاشیہ مخطوطہ کراچی)

تیسرا مقام: ورع (پرہیزگاری)

جب صفتِ حیا آدمی میں جم جاتی ہے، تو پھر نور ایمان نازل ہوتا ہے۔ اور اس کے ساتھ قلب کی پیدائشی حالت مخلوط ہو جاتی ہے۔ پھر وہ نور نفس کی طرف ڈھلکتا ہے۔ اور اس کو مشتبہ چیزوں سے روکتا ہے۔ یہ (مشکوک امور سے بھی بچنا) مقام ''ورع'' ہے۔ ذیل کی روایات میں اسی کا تذکرہ ہے:

حدیث ——— (۱) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حلال واضح ہے۔ اور حرام (بھی) واضح ہے۔ اور دونوں کے

درمیان ایسے مشتبہ امور ہیں جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے (أمن الحلال هي أم من الحرام؟ یعنی آیا وہ حلال ہیں یا حرام؟ ترمذی ۱:۱۴۵) پس جو شخص مشتبہ چیزوں سے بچتا ہے: وہ اپنے دین اور اپنی آبرو کو پاک کر لیتا ہے۔ اور جو شخص مشتبہ امور میں جا پڑتا ہے: وہ حرام میں بھی جا پڑتا ہے'' پھر آپؐ نے مثال کے ذریعہ یہ حقیقت سمجھائی کہ سرکاری چراگاہ کی طرح: ناجائز کاموں کے لئے بھی آڑ اور باڑ ہے۔ پس جو چرواہا باڑ سے دور اپنے جانور چرائے گا: اس کے جانور چراگاہ میں نہیں گھسیں گے۔'' اور جو شخص اپنے جانور باڑ کے قریب چرائے گا تو کچھ بعید نہیں کہ اس کے جانور چراگاہ میں منہ ماریں۔ سنو! ہر بادشاہ کے لئے ایک مخصوص چراگاہ ہوتی ہے۔ سنو! اللہ کا ممنوع ایریا ان کے حرام کئے ہوئے امور ہیں۔ سنو! جسم میں ایک بوٹی ہے۔ جب وہ سنور جاتی ہے تو سارا جسم سنور جاتا ہے۔ اور جب وہ بگڑ جاتی ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ سنو! وہ بوٹی دل ہے'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۲۷۶۲)

حدیث —— (۲) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ چیز چھوڑ دے جو تجھے شک میں ڈالے، اور وہ چیز اختیار کر جو بے کھٹک ہو۔ پس بیشک سچ طمانینت ہے، اور جھوٹ کھٹک ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۷۷۳)

حدیث —— (۳) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بندہ اس مقام تک نہیں پہنچتا کہ وہ پرہیزگاروں میں شمار ہو جب تک وہ اُن چیزوں کو نہ چھوڑ دے جن میں گنجائش ہے، ان چیزوں سے بچنے کے لئے جن میں گنجائش نہیں ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۷۷۵)

تشریح: ان سب روایات کا حاصل یہ ہے کہ کبھی کسی مسئلہ میں دو متعارض وجہیں ہوتی ہیں: حلّت کی وجہ بھی اور حرمت کی وجہ بھی: یا تو نصوصِ شرعیہ میں تعارض کی وجہ سے یا دو قیاسوں میں تخالف کی وجہ سے یا شریعت میں طے شدہ اباحت و حرمت کے ضوابط کی صورتِ واقعہ پر تطبیق میں اختلاف ہوتا ہے، پس ایسی صورت میں آدمی کی دینداری اور بندے اور اللہ کے درمیان کا تعلق اسی وقت صاف رہتا ہے کہ مشتبہ چیزوں کو چھوڑ دیا جائے، اور وہ بات اختیار کی جائے جس میں کوئی اشتباہ نہیں ہے۔ یہی پرہیزگاری ہے۔

فائدہ: حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے احادیث کی جو اوپر شرح کی ہے وہ خواصِ امت (مجتہدین) کے تعلق سے ہے۔ عوام کے تعلق سے اُن روایات کا مقصد: لوگوں کا یہ مزاج اور ذہن بنانا ہے کہ وہ حلّت و جواز کی خوب تحقیق کر کے ہی عملی قدم اٹھائیں۔ یہی پرہیزگاری کا تقاضا ہے۔ اسی سے دین اور آبرو محفوظ رہتے ہیں۔ مثلاً معاملات کی نئی نئی صورتیں وجود میں آتی رہتی ہیں، جن کے احکام بہت سے لوگوں کو معلوم نہیں۔ کچھ لوگوں کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ جب تک عدم جواز کا فتوی نہ آئے، ان کاموں کے کرنے میں کیا حرج ہے؟ جب حرمت کا فتوی آئے گا تو چھوڑ دیں گے۔ یہ ذہنیت دین کو ضرر پہنچانے والی ہے۔ اور اس سے آبرو بھی پامال ہو سکتی ہے۔ یا مثلاً ایک چیز کے بارے میں جواز کا فتوی بھی ہے اور عدم جواز کا بھی۔ ایسی چیزوں کے بارے میں احتیاط اس میں ہے کہ ان سے احتراز کیا جائے۔ اسی کو سرکاری چراگاہ کی مثال سے سمجھایا ہے اور دل کو سنوارنے کا حکم دیا ہے۔ باقی دو حدیثوں میں بھی اسی حقیقت کا بیان ہے

کہ کھٹک والی بات سے کنارہ کش رہنا چاہئے۔اور بے دغدغہ بات اختیار کرنی چاہئے۔

فإذا تمكّن الحياء من الإنسان، نزل نورُ الإيمان أيضًا، وخالطه جبلةُ القلب، ثم انحدر إلى النفس، فصدَّها عن الشبهات وهذا هو الورع.

قال صلى الله عليه وسلم: " الحلال بَيِّنٌ، والحرام بين، وبينهما أمور مشتبهات، لايعلمها كثير من الناس، فمن اتقى الشبهاتِ استبرأ لعِرْضِه ودينه، ومن وقع فى المشتبهات وقع فى الحرام" قال: " دَع ما يُريبك إلى مالايُريبك، فإن الصدق طُمأْنينة، وإن الكذب رِيْبَة" وقال: "لايبلغ العبدُ أن يكون من المتقين، حتى يدع مالابأس به، حذرًا لمابه بأس"

أقول: قد يتعارض فى المسألة وجهان: وجهُ إباحةٍ، ووجهُ تحريم: إما فى أصل مأخذ المسألة من الشريعة، كحديثين متعارضين، وقياسين متخالفين؛ وإما فى تطبيق صورة الحادثة بما تقرر فى الشريعة، من حكمَيِ الإباحة والتحريم، فلايصفو ما بين العبد وبين الله إلا بتركه، والأخذِ بمالااشتباه فيه.

ترجمہ: پھر جب حیا انسان پر قابو پالیتی ہے تو پھر نورِ ایمان نازل ہوتا ہے،اور اس کے ساتھ قلب کی فطری حالت مخلوط ہوتی ہے، پھر وہ نور نفس کی طرف ڈھلکتا ہے تو وہ نفس کو مشتبہ امور سے روکتا ہے،اور یہی وہ ورع ہے ——— (تین حدیثوں کے بعد) میں کہتا ہوں: کبھی مسئلہ میں دو وجہیں متعارض ہوتی ہیں: اباحت کی وجہ اور حرمت کی وجہ: یا تو شریعت سے مسئلہ لینے کی جگہ کی اصل میں: جیسے دو متعارض حدیثیں اور دو متخالف قیاس اور یا واقعہ کی صورت کی تطبیق میں ان اصول پر جو شریعت میں طے شدہ ہیں: اباحت وتحریم کے دو حکموں سے۔پس نہیں بے غبار ہوتا وہ تعلق جو بندے اور اللہ کے درمیان ہے۔مگر اس (مشتبہ امر) کو چھوڑنے سے اور اس چیز کو لینے سے جس میں کوئی اشتباہ نہیں۔

☆ ☆ ☆

چوتھا مقام: لایعنی چیزوں سے کنارہ کشی

ورع کے تحقق کے بعد نورِ ایمان پھر نازل ہوتا ہے۔اور اس کے ساتھ دل کی فطری حالت مل جاتی ہے تو زائد از حاجت چیزوں میں مشغولیت کی قباحت منکشف ہوتی ہے۔کیونکہ بے فائدہ چیزیں اور دنیا کے ضرورت سے زیادہ جھمیلے اس آخرت کی تیاری میں خلل انداز ہوتے ہیں جو مؤمن کا مطمح نظر ہے۔پھر وہ نور نفس کی طرف ڈھلکتا ہے۔اور نفس کو لایعنی چیزوں کی طلب سے روک دیتا ہے۔درج ذیل حدیث میں اس کا بیان ہے۔

حدیث ——— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: " آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ فضول چیزوں سے کنارہ کشی اختیار

کرلے" (مشکوۃ حدیث ۴۸۳۹)

تشریح: ماسوی اللہ کے ساتھ ہر مشغولیت نفس کے آئینہ میں ایک سیاہ دھبّہ ہے۔البتہ جن چیزوں کے بغیر چارہ ہی نہیں، اگر ان کو آخرت کی خاطر اختیار کیا جائے تو گنجائش ہے۔اور جو چیزیں ان کے سوا ہیں: ان سے قلبِ مؤمن میں جواللہ کا ناصح ہے یعنی ایمان کا نور: باز رہنے کا حکم دیتا ہے۔

فإذا تحقق الورع نزل نور الإيمان أيضًا، وخالطه جبلةُ القلب، فانكشف قبحُ الاشتغال بما يزيد على الحاجة، لأنه يصدُّه عما هو بسبيله، فانحدر إلى النفس، فكفَّها عن طلبه. قال صلى الله عليه وسلم: "من حُسن إسلام المرء تركُه مالايَعْنِيْهِ" أقول: كلُّ شغلٍ بما سوى الله نكتةٌ سوداءُ في مرآة النفس، إلا أن مالابدّ له منه في حياته، إذا كان بنية البلاغ: معفو عنه؛ وأما سوى ذلك فواعظُ الله في قلب المؤمن يأمر بالكف عنه.

ترجمہ: واضح ہے۔البلاغ: مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ۔

☆　☆　☆

فوائد

پہلا فائدہ: زُہد کیا ہے اور کیا نہیں؟

حدیث ——— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "دنیا سے بے رغبتی: حلال کو حرام اور مال کو برباد کرنے کا نام نہیں، بلکہ دنیا سے بے رغبتی یہ ہے کہ (۱) جو کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے، اس سے زیادہ تمہارا بھروسہ اس (ثواب) پر ہو جو اللہ کے پاس ہے (۲) اور جب تم کو کوئی تکلیف پہنچے تو اس کے اخروی ثواب کی آرزو تمہارے دل میں اس سے زیادہ ہو کہ وہ تکلیف تمہیں نہ پہنچتی" (مشکوۃ حدیث ۵۳۰۱ یہ حدیث پہلے ساحت کی انواع کے بیان میں بھی گذر چکی ہے)

تشریح: کبھی دنیا سے بے رغبت آدمی پر غلبہ ہو جاتا ہے[1]، اور وہ ایسے عقائد (تصورات) اور ایسے افعال پر ابھارتا ہے جو شرعاً پسندیدہ نہیں ہیں۔ چنانچہ نبی ﷺ نے مذکورہ حدیث میں زہد کی اُن جگہوں کی نشاندہی فرمائی جو شرعاً پسندیدہ ہیں، اور ان جگہوں کو بھی مشخص کیا ہے جو شرعاً پسندیدہ نہیں ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب زاہد پر حاجت سے زائد چیزوں میں مشغولیت کی قباحت منکشف ہوتی ہے تو وہ فضولیات کو ایسا ناپسند کرتا ہے جیسا طبعی طور پر ضرر رساں چیزوں کو ناپسند کرتا ہے۔ پھر یہ کراہیت:

[1] غلبہ: قلب کا ایک حال ہے، جس کا بیان پہلے آچکا ہے ۱۲

(الف) کبھی اس کو اس خیال میں تعمق تک پہنچادیتی ہے۔ پس اس کا اعتقاد یہ ہوجاتا ہے کہ اس کی ان زائد از حاجت چیزوں پر بھی پکڑ ہوگی، حالانکہ یہ غلط خیال ہے، کیونکہ شریعت کا نزول فطرتِ بشری کے دستور پر ہوا ہے یعنی شریعت نے احکام میں انسان کے فطری احوال کا لحاظ رکھا ہے۔ اور انسان فطری طور پر متاع دنیا کو پسند کرتا ہے۔ اور بیش از بیش کا طالب ہوتا ہے، پھر اس پر پکڑ کیسے ہوسکتی ہے؟ —— اور زہد (دنیا سے نفرت) تو بشری فطرت سے ایک طرح کا انسلاخ (الگ ہونا) ہے۔ اور ایسا حکم مخصوص افراد کے لئے تو ہوسکتا ہے جو مقام زہد کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کوئی عمومی شرعی حکم نہیں ہوسکتا۔

(ب) اور کبھی وہ کراہیت: مال ضائع کرنے تک، اور اس کو سمندروں اور پہاڑوں میں پھینک دینے تک پہنچاتی ہے۔ اور یہ بھی ایک ایسا غلبہ (جوش) ہے جس کی شریعت نے پذیرائی نہیں کی، اور نہ اس کو زہد کے احکام کے ظہور کے لئے اسٹیج بنایا ہے یعنی وہ زہد کا پیکر محسوس نہیں ہیں۔ بلکہ شریعت نے زہد کے احکام کے ظہور کے لئے دو چیزوں کو اسٹیج بنایا ہے:

ایک: حاجت سے زائد وہ چیزیں جو ابتک حاصل نہیں ہوئیں: شریعت کا حکم یہ ہے کہ ان کے لئے پاپڑ نہ بیلے۔ بلکہ اس چیز پر بھروسہ کرے جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ اس کو دنیا میں بقدر کفاف روزی عنایت فرمائیں گے اور آخرت میں تنگی پر ثواب عنایت فرمائیں گے۔

دوسری: وہ چیز جو ہاتھ سے نکل گئی اس پر کفِ افسوس نہ ملے، نہ نفس کو اس کے پیچھے ڈالے، بلکہ اس ثواب کا یقین رکھے جس کا اللہ تعالیٰ نے صابرین اور تنگ دستوں سے وعدہ فرمایا ہے۔

نوٹ: شاہ صاحب نے یہ مضمون اس لئے ذکر کیا ہے کہ ابھی نفس کے مقام حیا میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ حیا اور زہد میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پس اس فائدے کے ذریعہ تنبیہ کی ہے کہ رہبانیت والا زہد: شرعی زہد نہیں۔ شرعی زہد قناعت کے قبیل کی چیز ہے۔ نیز زہد: مقام ترک لایعنی کا ثمرہ ہے، اس لئے بھی یہ تنبیہ ضروری ہوئی تاکہ ترکِ لایعنی کے ڈانڈے رہبانیت سے مل نہ جائیں۔

قال صلى الله عليه وسلم: "الزَهَادَةُ في الدنيا ليست بتحريم الحلال، ولا إضاعةِ المال، ولكنَّ الزهادةَ في الدنيا: أن لاتكون بما في يدك أوثقَ منك بما في يَدَيِ الله، وأن تكون في ثواب المصيبة، إذا أنت أُصِبْتَ بها: أرغبَ منك فيها لو أنها أُبقيت لك"

أقول: قد يحصل للزاهد في الدنيا غلبةٌ تحمله على عقائدَ وأفعالٍ ماهي محمودةٌ في الشرع، فبين النبي صلى الله عليه وسلم من محالّ الزهد ماهو محمودٌ في الشرع، مماليس بمحمود؛

فالرجلُ إذا انكشف عليه قبحُ الاشتغال بالزائد على الحاجة، فكرهه كمايكره الأشياءَ الضارَّةَ بالطبع:

[الف] ربما يؤدّيه ذلك إلى التعمق فيه، فيعتقد مؤاخذةَ الله عليه في صُراحِ الشريعة؛ وهذه

عـقيـدة باطلة، لأن الشرع نازل على دستور الطبائع البشرية، والزهدُ نوعُ انسلاخ عن الطبيعة البشرية، وإنما ذلك أمرُ الله فى خاصة نفسه، تكميلا لمقامه وليس بتكليف شرعى.

[ب] وربـمـا يؤدّيه إلى إضاعة المال، والرميِ به فى البحار والجبال؛ وهذه غلبةٌ لم يُصَحِّحْها الشرعُ، ولم يعتبرها مَنَصَّةً لظهور أحكام الزهد.

بل الذى اعتبره الشرع منصَّةً شيئان:

أحدهما : الـزائـد الـذى لـم يـحصل بعدُ، فلايتكلف فى طلبه، اعتمادًا على ماوعده الله من البلاغ فى الدنيا، والثواب فى الآخرة.

وثانيهما : الشيئ الـذى فـات مـن يـده، فلايتبعه نفسَه، ولايتأسف عليه، إيماناً بماوعد الله للصابرين والفقراء.

ترجمہ: (حدیث کے بعد) میں کہتا ہوں: کبھی دنیا میں بے رغبت شخص کے لئے ایسا غلبہ حاصل ہوتا ہے، جو اس کو ایسے عقائد واعمال پر ابھارتا ہے جو شریعت میں پسندیدہ نہیں ہیں۔ پس نبی ﷺ نے زہد کی جگہوں میں سے وہ جگہیں بیان فرمائیں جو شریعت میں پسندیدہ ہیں۔ ان سے (جدا کر کے) جو پسندیدہ نہیں ہیں —— پس جب آدمی پر کھلتی ہے حاجت سے زائد میں مشغول ہونے کی برائی تو وہ اس کو ناپسند کرتا ہے، جس طرح وہ فطری طور پر ضرر رساں چیزوں کو ناپسند کرتا ہے: —— (الف) وہ ناپسندیدگی کبھی اس کو پہنچاتی ہے اس (ترکِ لایعنی) میں تعمق تک۔ پس وہ اعتقاد رکھتا ہے اس پر اللہ کی پکڑ کا خالص شریعت میں، درانحالیکہ یہ باطل عقیدہ ہے، اس لئے کہ شریعت بشری طبائع کے قانون پر اترنے والی ہے۔ اور زہد بشری طبیعت سے ایک طرح کا نکل جانا ہے۔ اور یہ اللہ کا حکم خاص طور پر اسی کے لئے ہے مقام زہد کی تکمیل کرنا چاہتا ہے —— (ب) اور کبھی وہ ناپسندیدگی مال ضائع کرنے کی طرف، اور اس کو سمندروں اور پہاڑوں میں پھینکنے کی طرف پہنچاتی ہے۔ اور یہ ایک ایسا غلبہ ہے جس کو شریعت نے درست قرار نہیں دیا۔ اور اس کو زہد کے احکام کے ظہور کے لئے چبوترہ نہیں بنایا —— بلکہ جس کو شریعت نے چبوترہ بنایا ہے: وہ دو چیزیں ہیں: —— ان میں سے ایک: وہ زائد چیز ہے جو ابتک حاصل نہیں ہوئی، پس اس کی طلب میں مشقت نہ اٹھائے، اس چیز پر بھروسہ کرتے ہوئے جس کا اللہ تعالیٰ نے اس سے وعدہ کیا ہے: بقدر کفاف روزی میں سے دنیا میں، اور ثواب سے آخرت میں —— اور ان میں سے دوسری: وہ چیز ہے جو اس کے ہاتھ سے نکل گئی، پس اپنے نفس کو اس کے پیچھے نہ ڈالے۔ اور اس پر افسوس نہ کرے، اس ثواب پر یقین رکھتے ہوئے جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے۔ صابرین اور تنگ دستوں سے۔

☆　☆　☆

دوسرا فائدہ: مُجاہدہ کی ضرورت

یہ بات جان لینی چاہئے کہ خواہشات کی پیروی کا جذبہ نفس کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ وہ ہمیشہ اس میں باقی رہتا ہے، مگر یہ کہ اس پر نور ایمان غالب آجائے۔ حضرت یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں: ’’اور میں اپنے نفس کی براءت نہیں کرتا۔ نفس تو یقیناً برائی پر بہت اُکسانے والا ہے۔ مگر جب میرے پروردگار مہربانی فرمائیں‘‘ (یوسف آیت ۵۳) یعنی محض خدا کی رحمت واعانت ہی نفس کو برائی سے روک سکتی ہے۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو ضروری ہے کہ مؤمن رحمتِ خداوندی میں حصہ داری کے لئے، اور اپنے نفس کو نورانی بنانے کے لئے برابر مجاہدہ کرتا رہے۔ جب بھی نفس میں کسی گناہ کا ہوکا اٹھے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرے، اللہ کی جلالت وعظمت کو یاد کرے، اور اس ثواب کو یاد کرے جو اللہ تعالیٰ نے اطاعت کرنے والوں کے لئے تیار کیا ہے، اور اس عذاب کو یاد کرے جو اللہ تعالیٰ نے نافرمانوں کے لئے تیار کیا ہے۔ جب ایسا کرے گا تو عقل وقلب سے ایک ربانی خیال چمکے گا جو باطل خیال کا سر کچل دے گا۔ اور جو برا خیال آیا تھا وہ ایسا کافور ہوجائے گا جیسے وہ کوئی چیز ہی نہیں تھا —— البتہ عارف باللہ (خداشناس ولی) اور نئے توبہ کرنے والے میں بڑا فرق ہے یعنی دونوں کے مراتب میں آسمان وزمین کا تفاوت ہے۔

تیسرا فائدہ: خیالات میں مزاحمت

نبی ﷺ نے یہ بات بھی بیان فرمائی ہے کہ اچھے اور بُرے خیالات میں مزاحمت رہتی ہے: پھر اگر نفس: اُس عقل سے جو نور ایمان سے منور ہوچکی ہے: آداب وسلیقہ سیکھ چکا ہے تو اچھا خیال بُرے خیال پر غالب آجاتا ہے، اور نفس احکام شرع کی تابعداری کرتا ہے۔ اور اگر نفس: نافرمان اور سرکش ہے تو وہ برحق خیال سے بغاوت کرتا ہے، اور اس کی ایک نہیں سنتا۔ نبی ﷺ نے یہ بات بخل وسخاوت کی مثال کے ذریعہ سمجھائی ہے۔ آپؐ نے لوہے کی دو زِرہوں کی مثال دی، جن میں سے ایک کشادہ ہے، اور دوسری تنگ، فرمایا:

’’بخیل اور خیرات کرنے والے کا حال اُن دو شخصوں جیسا ہے، جنھوں نے لوہے کی دو زِرہیں پہن رکھی ہوں، اور دونوں کے ہاتھ ان کی پستانوں اور ہنسلیوں سے جکڑے ہوئے ہوں۔ پس سخی جب بھی خیرات کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کی زِرہ کشادہ ہوجاتی ہے۔ اور بخیل جب بھی خیرات کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کی زِرہ سُکڑ جاتی ہے، اور اس کی ہر کڑی اپنی جگہ پکڑ لیتی ہے‘‘ (بخاری حدیث ۵۷۹۷)

تشریح: جس کا نفس فطری اور اکتسابی طور پر مطمئن ہوتا ہے: خیالِ حق اس کا مالک ہوجاتا ہے۔ اور وہ ظاہر ہوتے ہی نفس کو مغلوب کردیتا ہے۔ اور جس کا نفس نافرمان اور سرکش ہوتا ہے: اس پر خیالِ حق اثر انداز نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ خیال ہی چل دیتا ہے۔

چوتھا فائدہ: نورِ ایمان سے عقل کا منور ہونا اور نفس پر اس کا فیضان

قرآنِ عظیم میں نورِ ایمان سے عقل کے روشن ہونے کا، اور نفس پر نورِ عقل کے فیضان کا بیان آیا ہے۔ ذیل میں اس سلسلہ کی تین آیتیں ذکر کی جاتی ہیں:

پہلی آیت: سورۃ الاعراف آیت ۲۰۱ میں ارشاد پاک ہے: ''جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں: جب ان کو شیطان کی طرف سے کوئی خیال آتا ہے تو وہ یقیناً (اللہ تعالیٰ کو) یاد کرتے ہیں، پس یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں''

تفسیر: شیطان انسان کے باطن میں، خواہش نفس کے روزن سے جھانکتا ہے۔ اور انسان میں معصیت کا تقاضا پیدا کرتا ہے۔ پھر انسان اگر اپنے رب کے جلال کو یاد کرتا ہے، اور وہ اللہ کے سامنے سہم جاتا ہے، تو اس سے عقل میں ایک روشنی پیدا ہوتی ہے، وہی ''آنکھیں کھل جانا'' ہے۔ پھر وہ نور قلب ونفس کی طرف ڈھلکتا ہے، اور وہ گناہ کے تقاضے کو ہٹا دیتا ہے، اور شیطان کو دھتکار دیتا ہے۔

دوسری آیت: سورۃ البقرہ آیات ۱۵۵-۱۵۷ میں ارشاد پاک ہے: ''اور اُن صابرین کو خوش خبری سنایئے جن پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو کہتے ہیں: ''ہم اللہ کے لئے ہیں۔ اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ان پر ان کے پروردگار کی جانب سے خصوصی رحمتیں اور مہربانی ہے۔ اور وہی لوگ راہ یاب ہیں''

تفسیر: صابرین کے اس قول میں کہ: ''ہم اللہ کے لئے ہیں'' خیالِ حق کے نزول کی طرف اشارہ ہے یعنی ان کے دل میں یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے۔ اور اللہ پاک کا ارشاد کہ ''ان پر ان کے پروردگار کی جانب سے خصوصی رحمتیں اور مہربانی ہے'' اس میں ایسی برکتوں کی طرف اشارہ ہے جو صبر کا پھل ہے۔ اور وہ نفس کی نورانیت اور فرشتوں کی دنیا کے ساتھ مشابہت ہے۔

تیسری آیت: سورۃ التغابن آیت ۱۱ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''کوئی مصیبت اللہ کے حکم کے بغیر نہیں آتی۔ اور جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے: اللہ تعالیٰ اس کے دل کو راہ دکھاتے ہیں''

تفسیر: اللہ پاک کے ارشاد: ''اللہ کے حکم کے بغیر'' میں قضاوقدر کی معرفت کی طرف اشارہ ہے یعنی انسان کو یہ بات جان لینی چاہئے کہ ہر بات مقدر ہے۔ جو اچھا یا بُرا معاملہ پیش آتا ہے: وہ اسی نوشتۂ تقدیر کے مطابق پیش آتا ہے ——— اور اللہ پاک کا ارشاد: ''اور جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے'' الی آخرہ میں عقل سے قلب ونفس کی طرف خیال اترنے کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہی دل کو راہ دکھانا ہے۔

واعلم أن النفسَ مجبولةٌ على اتباع الشهوات، لاتزالُ على ذلك. إلا أن يَبْهَرَها نورُ الإيمان، وهو قولُ يوسفَ عليه السلام: ﴿وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِيْ، إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ، إِلَّا مَارَحِمَ رَبِّيْ﴾

فلايزال المؤمن طولَ عمره فى مجاهدة نفسه باستنزالِ نور الله، فكلما هاجت داعيةٌ نفسانيةٌ لَجَأَ إلى الله، وتذكر جلالَ الله وعَظْمَتَه، وما أعدَّ للمطيعين من الثواب، وللعصاة من العذاب، فانقدح من قلبه وعقله خاطرُ حقٍّ يدمغ خاطِرَ الباطل، فيصير كأن لم يكن شيئًا مذكوراً، إلا أن الفرقَ بين العارف والمستأنف غيرُ قليل.

وقد بين النبى صلى الله عليه وسلم المدافعةَ بين الخاطرين، وغلبةَ خاطر الحق على خاطر الباطل، وانقيادَ النفس للحق، إذا كانت مطمئنةً متأدِّبةً بآداب العقل المتنور بنور الإيمان؛ وبغيها عليه وإبائها منه إذا كانت عَصِيَّةً أَبِيَّةً: بما ضرب فى مسألة البخل والجود، من مَثَلِ جُنَّتَيْنِ من حديد: إحداهما سابغة، والأخرى ضَيِّقة: قال صلى الله عليه وسلم: مَثَلُ البخيل والمتصدِّق كمثل رجلين، عليهما جُنَّتَانِ من حديد، وقد اضطُرَّتْ أيديهما إلى ثُدِيِّهما وتراقيهما، فجعل المتصدق: كلما تصدق بصدقة انبسطت عنه، وجعل البخيل: كلماهَمَّ بصدقة قَلَصَتْ، وأخذتْ كلُّ حلقة بمكانها"

أقول: الرجل الذى اطمأنت نفسُه جبلةً أو كسباً، فخاطرُ الحق يملك نفسَه، ويَقْهرها أولَ ما يبدو؛ والرجل الذى عصت نفسُه وأبت، فخاطر الحق لايُؤثر فيها، بل يَنْبُوْ،

وقد بين الله تعالى فى القرآن العظيم تنوُّرَ العقلِ بنور الإيمان، وفيضانَ نوره على النفس، حيث قال: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوْا، فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُوْنَ﴾

أقول: الشيطان يُشرف على باطن الإنسان من قِبَلِ كُوَّةِ شهوةِ النفس، فيُدخل عليه داعية المعصية، فإن تذكر جلالَ ربه، وخشع له، تولَّد منه نور فى العقل، وهو الإبصار؛ ثم ينحدر إلى القلب والنفسِ، فيدفع الداعيةَ، ويطردُ الشيطانَ.

قال الله تبارك وتعالى: ﴿وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ الَّذِيْنَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيْبَةٌ قَالُوْا: إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ؛ أُوْلٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ، وَأُوْلٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾

أقول: قوله تعالى: ﴿إِنَّا لِلّٰهِ﴾ إشارة إلى نزول خاطر الحق، وقوله: ﴿صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ﴾ إشارة إلى بركات يُثمرها الصبر: من نورانية النفس، وتَشَبُّهها بالملكوت.

وقال تعالى: ﴿مَاأَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ، وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهُ﴾ الآية.

أقول: قوله: ﴿بِإِذْنِ اللّٰهِ﴾ إشارة إلى معرفة القدر، وقوله: ﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ﴾ إشارة إلى نزول الخاطر من العقل إلى القلب والنفسِ.

ترجمہ: اور جان لیں کہ نفس اتباع ہوی پر پیدا کیا گیا ہے۔ وہ برابر اسی (حالت) پر رہتا ہے۔ مگر یہ کہ اس پر نور ایمان

غالب آجائے۔ اور وہ یوسف علیہ السلام کا قول ہے...... پس مؤمن زندگی بھر اپنے نفس سے ٹکر لیتا رہتا ہے اللہ کے نور کو اتارنے میں۔ پس جب بھی کوئی نفسانی تقاضا جوش مارتا ہے تو وہ اللہ کی طرف پناہ لیتا ہے۔ اور وہ اللہ کی جلالت وعظمت کو یاد کرتا ہے۔ اور اس ثواب کو یاد کرتا ہے جو اللہ نے اطاعت کرنے والوں کے لئے تیار کیا ہے، اور اس عذاب کو یاد کرتا ہے جو اللہ نے نافرمانوں کیلئے تیار کیا ہے۔ پس اس کے دل اور اس کی عقل سے ربانی خیال چمکتا ہے، جو باطل کا سر کچل دیتا ہے۔ پس وہ برائی کا خیال ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا وہ کوئی قابل ذکر چیز ہی نہیں تھا۔ مگر عارف اور از سرنو توبہ کرنے والے میں معمولی فرق نہیں ہے۔

اور نبی ﷺ نے بیان کی ہے: دو خیالوں کے درمیان کشمکش، اور خیال حق کا باطل پر غلبہ، اور نفس کا حق (شریعت) کی تابعداری کرنا: جبکہ نفس مطمئنہ سنورا ہوا ہو اس عقل کے آداب سے جو نور ایمان سے منور ہونے والی ہے۔ اور نفس کا خیالِ حق کے سامنے سرکشی کرنا، اور نفس کا انکار کرنا خیالِ حق کی بات ماننے سے، جبکہ نفس نافرمان سرکش ہو: اس مثال کے ذریعہ جو آپؐ نے بیان کی ہے بخل اور سخاوت کے مسئلہ میں یعنی لوہے کی دو زرہوں کی مثال: ان میں سے ایک کشادہ اور دوسری تنگ ہے۔ فرمایا:.......... میں کہتا ہوں: وہ شخص جس کا نفس فطری یا اکتسابی طور پر مطمئن ہو: تو خیالِ حق اس کے نفس کا مالک ہوتا ہے۔ اور وہ نفس کو مغلوب کرتا ہے ظاہر ہوتے ہی۔ اور وہ آدمی جس کا نفس نافرمانی کرتا ہے، اور انکار کرتا ہے تو خیالِ حق اس پر اثر انداز نہیں ہوتا، بلکہ وہ خیال دور ہو جاتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے قرآن عظیم میں بیان کیا ہے: عقل کا نور ایمان سے روشن ہونا، اور نور ایمان کا فیضان نفس پر بایں طور کہ فرمایا: (اس کے بعد ترجمہ واضح ہے)

نفس کے احوال

غیبت ومَحق

پہلا حال ——— غیبت (محویّت) ——— اور وہ یہ ہے کہ نفس اپنی خواہشات سے بے خبر ہو جائے، جیسا کہ مشہور تابعی حضرت عامر بن عبداللہ بن الزبیر اسدی کا حال تھا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے کچھ پرواہ نہیں کہ میں نے کسی عورت کو دیکھا یا کسی دیوار کو ——— اور امام عامر شعبی رحمہ اللہ سے کسی نے کہا کہ ہم نے آپ کی نیلی آنکھوں والی باندی بازار میں دیکھی۔ آپؐ نے فرمایا: کیا اس کی آنکھیں نیلی ہیں! گویا آپ نے اس کی آنکھیں کبھی نہیں دیکھیں۔

دوسرا حال ——— مَحْق (مٹانا، کم کرنا) ——— اور اس کے دو درجے ہیں: ادنیٰ اور اعلیٰ:

ادنیٰ درجہ ——— یہ ہے کہ نفس عقل کی طرف مائل ہو، اور عقل نور الٰہی سے لبریز ہو، جس کی وجہ سے کھانے پینے سے اتنی مدت تک بے خبر رہے، جس میں عادۃً بے خبر نہیں رہا جاتا۔

اور اعلیٰ واتم درجہ ——— یہ ہے کہ نور الٰہی نفس پر اترے، اور وہ کھانے پینے کا قائم مقام بن جائے۔ حدیث شریف

میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ صوم وصال (کئی روز کا مسلسل روزہ) رکھتے تھے۔ بعض صحابہ نے بھی آپؐ کی پیروی کی۔ آپؐ نے ان کو منع کیا۔ انھوں نے عرض کیا کہ إنك تُواصل: آپؐ تو صوم وصال رکھتے ہیں! آپ نے فرمایا: إنی لست مثلَکم، إنی أَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ ربی وَیَسْقِیْنِیْ: میں آپ لوگوں کی طرح نہیں، میں اس حال میں رات گذارتا ہوں کہ میرا رب مجھے کھلاتا پلاتا ہے (بخاری حدیث ۷۲۹۹)

ومن أحوال النفس: الغَیْبَة: وهی: أن تغیب عن شهواتها، کما قال عامر بن عبد الله: ما أُبالی امرأةً رأیتُ أم حائطًا وقیل للأوزاعی: رأینا جاریتك الزرقاء فی السوق، فقال: أَفَزَرْقَاءُ هی؟ ومن أحوالها: المَحْق: وهو أن تغیب من الأکل والشرب مدةً، لاتغیب فیها عادةً، لِمَیْلِ نفسه إلی جانب العقل، وامتلاء العقل بنور الله تعالی. وأجلُّ من هذا وأتم: أن ینزل نورُ الله إلی النفس، فیقوم مقام الأکل والشرب، وهو قوله صلی الله علیه وسلم: "إنی لستُ کهیئتکم! إنی أبیت عند ربی، یُطْعِمُنِیْ ویَسْقِیْنِی"

ترجمہ: واضح ہے۔ اور حدیث شریف میں أبیت عند ربی کسی روایت میں یاد نہیں پڑتا۔ صحیح الفاظ وہ ہیں جو شرح میں لکھے گئے ہیں۔ واللہ اعلم۔

☆　☆　☆

قلب کی طرف مقامات کی نسبت کی وجہ

قلب: عقل ونفس کے درمیان کی چیز ہے۔ یعنی اس کا دونوں سے لگا ہے۔ اس لئے کبھی چشم پوشی برتی جاتی ہے۔ اور سبھی مقامات کو یا ان میں سے اکثر کو قلب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے (عقل ونفس کی طرف ان کے مقامات کی نسبت نصوص میں شاذ ونادر ہی کی جاتی ہے) آیات واحادیثِ کثیرہ اسی (چشم پوشی والے) انداز پر وارد ہوئی ہیں۔ لہٰذا آپ اس نکتہ سے غافل نہ رہیں۔

اخلاقِ حسنہ وسیئہ

اخلاق وعادات اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ لطائف (عقل وقلب ونفس) اگر شائستہ ہوں تو ان سے اچھے اخلاق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اور اگر غیر مہذب ہوں تو برے اخلاق وجود میں آتے ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے مقاصد میں تزکیہ بھی شامل تھا، بلکہ آپؐ نے فرمایا ہے کہ: "بُعثتُ لأُتَمِّم حُسْنَ الأخلاق: میری بعثت کے اہم مقاصد میں سے اصلاح اخلاق بھی ہے، چنانچہ آپؐ نے امت کے اخلاق کو سنوارنے کا خاص اہتمام فرمایا۔ اچھے اخلاق کی خوبیاں بیان کر کے

ان کی ترغیب دی۔ اور برے اخلاق کی قباحتیں بیان کرکے ان سے بچنے کی تاکید کی۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے ابتک لطائفِ ثلاثہ کے جو مقامات بیان کیئے ہیں وہ ان کی عمدہ صلاحتیوں کے ثمرات ہیں۔ آپ نے ان کی اضداد بیان نہیں کیں۔ کیونکہ اول تو وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں۔ ثانیاً: **تُعرف الأشياء بأضدادها** کی رو سے وہ خود ہی مفہوم ہوجاتی ہیں۔

اور چونکہ شاہ صاحب قدس سرہ نے تمام اخلاقِ حسنہ اور سیئہ کو اخلاقِ اربعہ اور ان کی اضداد کی طرف لوٹایا ہے۔ یعنی طہارت وحدث، اخبات واستکبار، سماحت وشُحّ وغیرہ اور عدالت وجور وغیرہ کو تمام اخلاق کا مرجع قرار دیا ہے۔ اس لئے دیگر اخلاقِ حسنہ وسیئہ کا تفصیلی تذکرہ نہیں کیا[۱]۔ البتہ لطائف کے انوار سے جب اخلاق سیئہ کو دفع کیا جاتا ہے تو اخلاقِ حسنہ وجود میں آتے ہیں، ان میں سے چند کا تذکرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

جب نور ایمان: شہوت پرست نفس اور درندہ خُو دل کے مختلف النوع تقاضوں کو دفع کرتا ہے تو ہر مدافعت کا ایک نام رکھا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے نام اور اوصاف اہتمام سے بیان فرمایئے ہیں۔ جو یہ ہیں:

۱۔ **مصیبت پر صبر** —— اس کی ضد بے صبری ہے۔ جب آدمی پر کوئی مصیبت ٹوٹ پڑتی ہے، اور وہ گھبرا جاتا ہے تو خوب روتا اور واویلا مچاتا ہے۔ جب نور ایمان بے صبری کے ان تقاضوں کو دفع کرتا ہے، اور آدمی باہمت بن جاتا ہے تو اس خوبی کو ''مصائب پر صبر'' کہا جاتا ہے، جس کا مستقرّ دل ہے یعنی یہ ملکاتِ قلب میں سے ہے۔

۲۔ **اجتہاد (عبادات میں محنتِ شاقّہ) اور عبادت پر صبر** —— اس کی ضد آسودگی اور بےفکری ہے۔ نفس آسائش پسند اور بےفکرا واقع ہوا ہے۔ جب نور ایمان آلکسی اور لاپروائی کو دفع کرتا ہے، اور آدمی عبادات میں جُت جاتا ہے تو اس خوبی کا نام اجتہاد اور عبادت پر صبر ہے۔ اور اس کا مستقر نفس ہے۔

۳۔ **تقوی (پرہیزگاری)** —— کبھی آدمی کی نظر میں احکام شرعیہ بےقدر ہوجاتے ہیں وہ ان کو چھوڑ بیٹھتا ہے، یا وہ منہیات کی طرف مائل ہوجاتا ہے اور برائیاں کرنے لگتا ہے۔ جب نور ایمان ان خلاف ورزیوں کو دفع کرتا ہے اور وہ حدود شرعیہ کا پابند ہوجاتا ہے تو اس کا نام تقوی ہے۔ اور اس کا مستقر بھی نفس ہے۔

فائدہ: کبھی تقوی کا اطلاق لطائفِ ثلاثہ کے سبھی مقامات پر کیا جاتا ہے۔ بلکہ ان اعمال پر بھی کیا جاتا ہے جو ان

---

[۱] چند اخلاقِ حسنہ مع متقابلات یہ ہیں: (۱) اخلاص وللٰہیت – نام ونمود (۲) شکر – ناشکری (کفران) (۳) صبر – جزع وفزع (۴) قناعت – حرص (۵) امانت داری – خیانت (۶) صدق – کذب (۷) سخاوت – بخل (۸) محبت – عداوت (۹) ایثار – خودغرضی (۱۰) استغناء – طمع (۱۱) تواضع وخاکساری غرور وتکبر (۱۲) ایفائے عہد – بدعہدی (۱۳) خوش کلامی – بدزبانی (فحش گوئی) (۱۴) نرم مزاجی – درشت خوئی (۱۵) رحم دلی – بےرحمی (۱۶) عفو (درگذر کرنا) انتقام لینا (۱۷) احسان (حسنِ سلوک) – بدسلوکی (۱۸) انس (یگانگت) – بےگانگی (۱۹) توکل (اللہ پر بھروسہ) – اسباب پر تکیہ (۲۰) کم بولنا – بک بک کرنا —— علاوہ ازیں اخلاق حسنہ: متانت ووقار۔ حلم وبربادی اور میانہ روی ہیں۔ اور اخلاقِ سیئہ: نفرت، بغض وکینہ، حسد، بدگمانی، شماتت، چغلخوری، غیبت، بہتان، جلدبازی، بےوقاری اور دورخاپن ہیں۔ تفصیلات کے لئے معارف الحدیث جلد دوم کتاب الاخلاق کا مطالعہ مفید ہوگا۔

کے ملکات سے برانگیختہ ہوتے ہیں۔ مثلاً: سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات میں متقیوں کے تعارف میں عقائد واعمال ذکر کئے ہیں، ترکِ معاصی کا تذکرہ صراحۃً نہیں کیا۔ فرمایا: (یہ کتاب) راہ بتلانے والی ہے متقیوں کو جو: (۱) غیب پر یقین رکھتے ہیں (۲) نماز کا اہتمام کرتے ہیں (۳) اللہ نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں یعنی زکوۃ ادا کرتے ہیں (۴) اور اس کتاب پر یقین رکھتے ہیں جو آپؐ پر اتاری گئی ہے (۵) اور ان کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپؐ سے پہلے اتاری گئی ہیں (۶) اور آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں (یہ فائدہ کتاب میں ہے)

۴ — قناعت (جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس پر مطمئن اور خوش رہنا) —— اس کی ضد حرص وآز ہے۔ حریص آدمی ہر طرف منہ مارتا ہے۔ وہ جائز ناجائز کا امتیاز کئے بغیر مال جمع کرتا ہے۔ جب نور ایمان لالچ کے تقاضوں کو دفع کرتا ہے تو اس کا نام قناعت ہے۔ اور اس کا محل عقل ہے۔

۵ — متانت (آہستہ روی) —— اس کی ضد عجلت (جلد بازی) ہے، جو شیطانی حرکت ہے۔ جب نور ایمان اس کے تقاضوں کو دفع کرتا ہے۔ اور آدمی ہر کام باطمینان کرنے لگتا ہے تو وہ متانت کہلاتا ہے۔ اور اس کا مستقر مزاج ہے یعنی عقل وقلب ونفس کا مجموعہ ہے۔

۶ — حلم (بردباری) —— اس کی ضد غضب ہے۔ جب غصہ بھڑکتا ہے تو آدمی آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ جب نور ایمان اس کے تقاضوں کو دفع کرتا ہے تو وہ بردباری کہلاتا ہے۔ اور اس کا مستقر دل ہے۔

۷ — عِفّت (پاکدامنی) —— اس کی ضد فجور (بدکاری) ہے۔ جو شرمگاہ کے گناہوں میں ملوث کرتی ہے۔ جب نور ایمان شہوت فرج کے تقاضوں کو دفع کرتا ہے تو اس کا نام عفت ہے۔ اور اس کا محل نفس ہے۔

۸ — صَمْت (خاموشی) اور کلام سے عاجزی —— اس کی ضد بڑھ بڑھ کر باتیں کرنا اور فحش بکنا ہے، جو جھگڑوں اور فتنوں کا باعث ہے۔ جب نور ایمان زبان کی آفتوں کو دفع کرتا ہے۔ اور آدمی زبان پر قابو پالیتا ہے تو اس کا نام صَمْت (خاموشی) ہے۔ اور ایسے شخص کے بارے میں لوگ خیال کرتے ہیں کہ بے چارہ بولنا نہیں جانتا۔ حالانکہ یہ خوبی ہے، کیونکہ یہ اختیاری امر ہے۔ یہی عِیّ (کلام سے عاجزی) ہے۔ اور اس کا مستقر عقل ہے۔

۹ — خُمول (گمنامی) —— اس کی ضد شہرت طلبی ہے۔ آدمی کی فطرت میں دوسروں پر غالب آنے اور جیتنے کا جذبہ ہے، جو حسد، عداوت اور بغض وکینہ تک مفضی ہو جاتا ہے۔ جب نور ایمان ان تقاضوں کو دفع کرتا ہے تو اس کا نام خمول ہے، جس کا مستقر دل ہے۔

۱۰ — استقامت (پامردی) —— اس کی ضد تلوّن مزاجی ہے۔ ایسا شخص دوستی ودشمنی وغیرہ میں گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے۔ وہ کسی ایک حال پر نہیں جمتا۔ جب نور ایمان غیر مستقل مزاجی کے تقاضوں کو دفع کرتا ہے تو اس کا نام پامردی ہے اور اس کا محل بھی دل ہے۔

فائدہ: علاوہ ازیں اور بھی بری صفات ہیں، اور نور ایمان کے ذریعہ ان کی مدافعت کے نام ہے۔ ان کی کچھ تفصیل رحمۃ اللہ الواسعہ ۱:۵۴۷ میں اور باقی باتیں اسی جلد میں ابواب الاحسان کے باب اول میں اور سماحت کے بیان میں آچکی ہیں۔ (یہ فائدہ کتاب میں ہے)

واعلم: أن القلبَ متوسطٌ بين العقل والنفس، فقد يُتَسَامح ويُنْسَب جميعُ المقامات أو أكثرُها إليه، وقد ورد على هذا الاستعمال آياتٌ وأحاديثُ كثيرةٌ، فلا تغفل عن هذه النكتة.

واعلم: أن مدافعةَ نورِ الإيمان لكل نوع من دواعى النفس البهيميةِ والقلبِ السَّبُعِيِّ يُسمى باسم؛ وقد نَوَّهَ النبى صلى الله عليه وسلم باسم كلِّ ذلك ووصفِه.

فإذا حصل للعقل ملكة فى انقداحِ خواطر الحق منه، وللنفس ملكة فى قبول تلك الخواطر، كان ذلك مقاماً:

فملكةُ مدافعةِ داعيةِ الجَزَع، تسمى صبرًا على المصيبة، وهذا مستقرُّه القلبُ.

وملكة مدافعة الدَّعَة والفراغ، تسمى اجتهادًا وصبرًا على الطاعة.

وملكةُ مدافعةِ داعيةِ مخالفةِ الحدودِ الشرعية، تهاوناً لها، أو ميلاً إلى أضدادها، تسمى تقوى.

وقد يطلق التقوى على جميع مقامات اللطائف الثلاث، بل على أعمال تنبعث منها أيضًا، وعلى هذا الاستعمال الأخير قوله تعالى: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ، الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾

وملكة مدافعة داعية الحرص تسمى قناعة.

وملكة مدافعة داعية العجلة تسمى تأَنِّيًا.

وملكة مدافعة داعية الغضب تسمى حِلما؛ وهذه مستقرها القلب.

وملكة مدافعة داعية شهوةِ الفرج تسمى عِفَّةً.

وملكة مدافعة داعية التَّشَدُّقِ والبِذَاءِ تسمى صَمْتًا وعِيًّا.

وملكة مدافعة داعية الغلبة والظهور تسمى خُمُوْلاً.

وملكة مدافعة داعية التلوُّن فى الحب والبغض وغيرهما تسمى استقامةً.

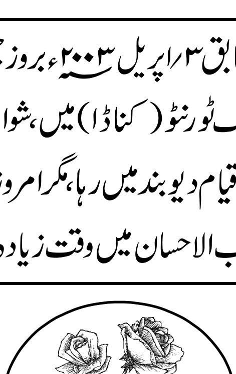
ووراءَ ذلك دواعٍ كثيرةٌ، ولمدافعتها أَسَامٍ، ومبحثُ ذلك فى الأخلاق من هذا الكتاب، إن شاء الله تعالى.

ترجمہ: اور جان لیں کہ قلب: عقل ونفس کے بین بین ہے۔ چنانچہ تسامح برتا جاتا ہے اور تمام مقامات کو یا ان میں سے بیشتر کو قلب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اور اس استعمال پر بہت سی آیتیں اور حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔ پس آپ اس

باریک بات سے بے خبر نہ رہیں۔

اور جان لیں کہ نورِ ایمان کا دفع کرنا: نفس بہیمی اور درندہ خو قلب کے تقاضوں سے ہر نوع (کے تقاضوں) کو: ایک نام رکھا جاتا ہے۔ اور نبی ﷺ نے اہتمام فرمایا ہے ہر ایک کے نام اور اس کے وصف کا ——— پس جب عقل میں یہ لیاقت پیدا ہوجاتی ہے کہ اس سے برحق خیالات کی چنگاریاں جھڑیں، اور نفس میں ان خیالات کو قبول کرنے کی لیاقت پیدا ہوجاتی ہے تو وہ ''مقام'' ہوتا ہے ——— (۱) اور گھبراہٹ کے تقاضے کو دور کرنے کی مہارت ''مصیبت پر صبر'' کہلاتی ہے اور اس کا مستقر قلب ہے ——— (۲) اور آسودگی اور فراغت (بے فکری) کے تقاضے کو دور کرنے کی مہارت اجتہاد اور عبادت پر صبر کہلاتی ہے ——— (۳) اور حدود شرعیہ کو ہیچ جانتے ہوئے یا ان کی اضداد کی طرف جھکتے ہوئے احکام شرعیہ کی مخالفت کے جذبات کو ہٹانے کی مہارت تقویٰ کہلاتی ہے ——— (فائدہ) اور کبھی تقویٰ کا اطلاق تینوں لطائف کے سبھی مقامات پر کیا جاتا ہے، بلکہ ان اعمال پر بھی کیا جاتا ہے جو ان ملکات سے ابھرتے ہیں۔ اور اس آخری استعمال پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ''راہ بتلانے والی خدا سے ڈرنے والوں کو، جو چھپی ہوئی چیزوں پر یقین رکھتے ہیں'' ——— (۴) اور لالچ کے تقاضے کو دور کرنے کی مہارت قناعت کہلاتی ہے ——— (۵) اور جلد بازی کے داعیہ کو ہٹانے کی مہارت آہستہ روی کہلاتی ہے ——— (۶) اور غصہ کے تقاضے کو دور کرنے کی مہارت بردباری کہلاتی ہے اور اس مہارت کا مستقر دل ہے ——— (۷) اور شرمگاہ کی خواہش کے داعیہ کو دور کرنے کی مہارت پاکدامنی کہلاتی ہے ——— (۸) اور بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے اور فحش گوئی کے داعیہ کو ہٹانے کی مہارت خاموشی اور کلام سے عاجزی کہلاتی ہے ——— (۹) اور غالب آنے اور جیتنے کے تقاضے کو دفع کرنے کی مہارت گمنامی کہلاتی ہے ——— (۱۰) اور حبّ وبغض وغیرہ میں رنگ بدلنے کے داعیہ کی مدافعت کا ملکہ: استقامت کہلاتا ہے ——— (فائدہ) اور ان کے علاوہ بہت سے دواعی اور ان کی مدافعت کے نام ہیں۔ اور ان کی بحث اس کتاب کے اخلاقیات میں ان شاء اللہ آئے گی (خیال رہے: آگے اخلاق کی بحث نہیں ہے۔ یہ گذشتہ کا حوالہ ہے)

(بفضلہ تعالیٰ آج ۳۰ محرم الحرام ۱۴۲۴ھ مطابق ۳ اپریل ۲۰۰۳ء بروز جمعرات یہاں تک شرح مکمل ہوئی فالحمد للہ! درمیان میں چار ماہ کام بند رہا۔ رمضان المبارک ٹورنٹو (کناڈا) میں، شوال: وینکور (کناڈا) نیویارک، شگاگو (امریکہ) اور لندن (یوکے) میں گذرا۔ ذی قعدہ میں قیام دیوبند میں رہا، مگر امروز فردا میں وقت گذر گیا اور ذی الحجہ میں حج کی سعادت نصیب ہوئی اس لئے کتاب الاحسان میں وقت زیادہ لگا۔ فالحمد للہ علی کل حالٍ)



دوسری قسم

تفصیل وار احادیث مرفوعہ کے اسرار و حکم کا بیان

بیوع و معاملات

باب　(۱)　تلاش معاش کے سلسلہ کی اصولی باتیں

باب　(۲)　ممنوع معاملات کا بیان

باب　(۳)　احکام معاملات

باب　(۴)　تبرعات ومعاونات

باب　(۵)　وراثت کا بیان

باب ـــــــ ۱

تلاشِ معاش کے سلسلہ کی اصولی باتیں

پہلی بات: مبادلہ اور باہمی رضامندی کی ضرورت

جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا۔ اور اس کا سامانِ زندگانی زمین میں رکھا۔ اور ان کے لئے زمین کی چیزوں سے فائدہ اٹھانا جائز کیا[1] تو ان میں نزاع اور لڑائی جھگڑا پیدا ہوا (کیونکہ ہر شخص ہر چیز پر اپنا استحقاق ثابت کرنے لگا اور قبضہ کی کوشش میں لگ گیا) تو اس صورت میں اللہ کا حکم یہ آیا کہ کوئی انسان اس چیز میں اپنے ساتھی سے مزاحمت نہ کرے جس کے ساتھ وہ بایں وجہ مخصوص کیا گیا ہے کہ اس پر اس کا یا اس کے آباؤ اجداد کا پہلے سے قبضہ ہو چکا ہے۔ یا اختصاص کی ایسی ہی کوئی اور وجہ ہے جو لوگوں کے نزدیک معتبر ہے۔ البتہ دو طرح سے دوسرے کی چیز لینا درست ہے۔ ایک: مبادلہ کے ذریعہ یعنی اپنی کوئی چیز دے کر اس کے بدلے میں دوسرے کی چیز لے جیسے بیع اور اجارہ میں ہوتا ہے۔ دوم: ایسی رضامندی سے جو مبنی بر علم ہو یعنی محض خیالی رضامندی نہ ہو بلکہ واقعی ہو، اور دھوکہ اور فریب دہی سے وہ چیز نہ لی گئی ہو۔ جیسے ہبہ میں ملی ہوئی چیز۔

دلیل: سورۃ النساء آیت ۲۹ میں ارشاد پاک ہے: ﴿یٰٓـاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَاتَأْکُلُوْا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّآ أَنْ تَکُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْکُمْ﴾ اے ایمان والو! باہم ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر مت کھاؤ، البتہ اگر باہمی رضامندی سے کوئی سودا ہو تو مضائقہ نہیں۔

دوسری بات: معیشت میں مشغولیت کی حاجت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسا مدنی الطبع بنایا ہے کہ وہ سامانِ زندگی درست کرنے میں تعاونِ باہمی کا محتاج ہے یعنی انسانی فطرت ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ اپنی زندگی گذارنے میں تعاونِ باہمی اور لین دین کا محتاج ہے۔ ہر فرد اور ہر طبقہ کی

---

[1] ارشاد پاک ہے: ﴿وَلَقَدْ مَکَّنّٰکُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَکُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ﴾ اور ہم نے تم کو زمین میں بسایا۔ اور ہم نے تمہارے لئے اس میں سامانِ زندگانی پیدا کیا (سورۃ الاعراف آیت ۱۰) اور ارشاد فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ اللہ ہی نے تمہارے فائدہ کے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے (سورۃ البقرۃ آیت ۲۹)

ضرورت دوسرے سے وابستہ ہے۔ جب تک لوگ مختلف پیشے اختیار نہ کریں سب کی ضرورتیں پوری نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے تعاون باہمی کے وجوب کا فیصلۂ خداوندی نازل ہوا۔ اور حکم دیا گیا کہ ہر شخص کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کرے۔ اور وہ پیشہ ایسا ہو جو تمدن کے لئے مفید ہو، سود جُوا جیسا تباہ کن پیشہ نہ ہو ——— البتہ اس حکم سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسے کام میں مشغول ہوں کہ وہ کوئی کاروبار نہیں کرسکتے۔ جیسے مجاہدین اور طلبہ وغیرہ۔

دلیل: (۱) سورۃ المائدہ آیت ۲ میں ارشاد پاک ہے: ﴿تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى، وَلَاتَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ نیکی اور تقوی (کے کاموں) میں ایک دوسرے کی اعانت کرو۔ اور گناہ اور زیادتی (کے کاموں) میں ایک دوسرے کی اعانت مت کرو۔

(۲) حدیث شریف میں ہے: طَلَبُ کَسْبِ الحلال فریضةٌ بعدَ الفریضة: حلال ذریعۂ معاش تلاش کرنا فرض کے بعد فرض ہے (مشکوۃ حدیث ۲۷۸۱ باب الکسب، کتاب البیوع) یعنی بنیادی فرائض کی ادائیگی کے بعد حلال روزی کا ذریعہ اختیار کرنا ایک اسلامی فریضہ ہے۔

(۳) سورۃ البقرۃ آیت ۲۷۳ میں ارشاد پاک ہے: ﴿لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ أُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، لَايَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ﴾ صدقات ان حاجت مندوں کے لئے ہیں جو راہِ خدا میں روک لئے گئے ہیں، وہ (مشغولیت کی وجہ سے) زمین میں چلنے پھرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔

تیسری بات: کمائی کے ذرائع

کمائی کے بنیادی ذرائع دو ہیں[۱]: (۱) خشکی اور تری میں سے مباح اموال جمع کرنا (۲) مباح اموال سے مدد لے کر اپنے ذاتی مال کو بڑھانا۔ جیسے: (۱) اپنے مواشی کو جنگل میں گھاس چرا کر ان سے نسل حاصل کرنا (۲) اور زمین کو سدھار کر اور سینچائی کر کے کھیتی پیدا کرنا ——— البتہ کمائی کرنے کی اس صورت میں شرط یہ ہے کہ بعض بعض پر ایسی تنگی نہ کریں جو تمدن کے فساد کا باعث ہو۔ مثلاً سرکاری جنگل میں اپنے جانوروں کے لئے چراگاہ مخصوص کرنا۔ کیونکہ اس سے دوسروں کی حق تلفی ہوگی۔ اور حق تلفی سے نزاعات پیدا ہونگے۔

پھر مال بڑھانے کی دو صورتیں ہیں: جائز اور ناجائز:

جائز صورت: یہ ہے کہ لوگوں کے اموال میں اپنا مال شامل کر کے اس طرح بڑھایا جائے کہ ضروریات زندگی میں معاونت بھی ہو یعنی صرف اپنا ہی نفع نہ ہو بلکہ دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے۔ کیونکہ باہمی تعاون کے بغیر مملکت کی حالت کی درستگی ناممکن یا دشوار ہے۔ مثلاً:

[۱] اصلی اور فرعی ذرائع معاش کی تفصیل: قسم اول، مبحث سوم، باب خامس میں ہے۔ دیکھیں رحمۃ اللہ ۱: ۴۵۸

۱ــــ تاجر غلہ کی درآمد برآمد کرے۔ اشیائے خورد ونوش ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کرے۔ اور وقتِ ضرورت تک رسد کی حفاظت کرے تو اس سے تاجر کو بھی نفع ہوگا اور لوگوں کو بھی ضروریاتِ زندگی میسر آئیں گی۔

۲ــــ کوئی شخص ذات محنت کر کے آڑھت کا کام کرے اور پیسہ کمائے تو خرید وفروخت کرنے والوں کے لئے بھی سہولت ہوگی۔

۳ــــ کاریگریوں کے ذریعہ مثلاً آہنگری، زرگری اور نور بافی وغیرہ کے ذریعہ کمائی کرے۔ اور لوگوں کی چیزوں کو سنوار کر ایسا بنادے کہ وہ ان کو پسند آجائیں۔ یہ بھی لوگوں کی معاونت ہے۔

اور ناجائز صورتیں دو ہیں:

ایک: لوگوں کے اموال میں اپنا مال شامل کر کے اس طرح بڑھانا کہ اس میں دوسروں کی ذرا بھی معاونت نہ ہو۔ جیسے جُوا کے ذریعہ مال کمانا۔ جُوا یہ ہے کہ مال کے مالک بننے کو ایسی شرط پر موقوف رکھا جائے جس کے وجود وعدم کی دونوں جانبیں مساوی ہوں۔ پس نفع ونقصان کی دونوں جانبیں بھی مساوی ہونگی۔ اور جُوا میں ایک کا نفع دوسرے کے نقصان پر موقوف ہوتا ہے۔ جیتنے والے کا نفع ہی نفع ہوتا ہے۔ اور ہارنے والے کا نقصان ہی نقصان۔ معاونت کی اس میں کوئی صورت نہیں۔

دوسری: لوگوں کے اموال میں اپنا مال اس طرح شامل کر کے بڑھانا، جس میں دوسرے کا نفع نہ ہونے کے برابر ہو۔ جیسے سود لینا۔ کیونکہ کنگال ایسی چیز سر لینے پر مجبور ہوتا ہے جس کے ایفا پر وہ قادر نہیں ہوتا۔ اور سود دینے پر اس کی رضامندی حقیقی رضامندی نہیں ہوتی۔

کمائی کی یہ دونوں صورتیں پسندیدہ معاملات اور نیک ذرائع نہیں ہیں۔ بلکہ حکمتِ مدنی (شہری انتظام) کی رو سے باطل معاملات اور حرام آمدنی ہے۔

﴿من أبواب ابتغاء الرزق﴾

اعلم: أن الله تعالى لما خلق الخَلْقَ، وجعل معايِشَهم في الأرض، وأباح لهم الانتفاع بما فيها: وَقَعَتْ بينهم المشاحَّة والمشاجَرةُ؛ فكان حكمُ الله عند ذلك تحريمَ أن يزاحِمَ الإنسان صاحبَه فيما اخْتُصَّ به، لِسَبْقِ يده إليه، أو يدِ مورِثِه، أو لوجه من الوجوه المعتبرة عندهم، إلا بمبادلة، أو تراضٍ معتمَدٍ على علم، من غيرِ تدليسٍ وركوبِ غَرَرٍ.

وأيضًا: لما كان الناس مدَنيين بالطبع، لاتستقيم معايِشُهم إلا بتعاون بينهم: نزل القضاءُ بإيجاب التعاون، وأن لايخلُوَ أحدٌ منهم مماله دخل في التمدُّن، إلا عند حاجةٍ لايجد منها بُدًّا.

وأيضًا: فأصل التسبُّب:

[۱] حيازةُ الأموال المباحة.

[۲] أو استِنْمَاءُ ما اخْتُصَّ به، بما يَسْتَمِدُّ من الأموال المباحة، كالتناسل بالرعى والزِّراعةِ بإصلاح الأرض وسقى الماء؛ ويشترط فى ذلك: أن لا يضيِّق بعضُهم على بعض، بحيث يُفضى إلى فساد التمدُّن.

ثم الاستنماءُ فى أموال الناس: بمعونةٍ فى المعاش؛ يتعذَّر أو يتعسَّر استقامةُ حالِ المدينة بدونها، كالذى يجلب التجارةَ من بلد إلى بلد، ويَعْتَنِىْ بحفظ الجَلَبِ إلى أجل معلوم، أو يُسَمْسِرُ بسعى وعمل، أو يُصلح مالَ الناس، بإيجاد صفةٍ مرضية فيه، وأمثالِ ذلك.

فإن كان الاستِنْمَاءُ فيها بما ليس له دخل فى التعاون، كالمَيْسِر، أو بما هو تراضٍ يُشْبِهُ الاقتضابَ، كالربا — فإن المفلس يضطرٌّ إلى التزامِ مالايقدر على إيفائه، وليس رِضَاه رِضًا فى الحقيقة — فليس من العقود المرضية، ولا الأسبابِ الصالحة، وإنما هو باطلٌ وسُحْتٌ بأصل الحكمة المدنية.

ترجمہ: رزق طلبی کے سلسلہ کی اصولی باتیں: جان لیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق پیدا کی، اوران کا سامانِ زندگانی زمین میں رکھا، اوران کے لئے ان چیزوں سے فائدہ اٹھانا جائز کیا جوزمین میں ہیں، توان میں باہمی نزاع اورلڑائی جھگڑا پیدا ہوا۔ پس ایسی صورت میں اللہ کا حکم ہوا کہ انسان اپنے ساتھی سے اس چیز میں مزاحمت نہ کرے جس کے ساتھ وہ مختص کیا گیا ہے۔ اس کے یااس کے مورث کے قبضہ کے اس چیز کی طرف سبقت کرنے کی وجہ سے، یا لوگوں کے نزدیک معتبر وجوہ میں سے کسی وجہ سے، مگر مبادلہ یا ایسی باہمی رضامندی کے ذریعہ جوعلم پر تکیہ کرنے والی ہو، دھوکہ دیئے بغیراور فریب پرسواری کئے بغیر —— اور نیز: جب لوگ ایسے مدنی الطبع تھے جن کا سامان زندگی درست نہیں ہوسکتا مگر باہمی تعاون کے ذریعہ تو تعاون کوواجب کرنے کا فیصلہ اترا، اور یہ (فیصلہ اترا) کہ لوگوں میں سے کوئی خالی نہ ہواس (پیشہ) سے جس کا تمدن میں دخل ہے۔ مگرایسی حاجت کی صورت میں جس سے وہ چارہ نہ پائے —— اور نیز: پس کمائی کی بنیاد: (۱) مباح اموال پر قبضہ کرنا ہے (۲) یااس مال کو بڑھانا ہے جس کے ساتھ وہ خاص کیا گیا ہے، مباح اموال سے استمداد کے ذریعہ، جیسے: (۱) چرائی کے ذریعہ نسل بڑھانا (۲) اورکھیتی کرنا زمین کوسدھارنے اورآب پاشی کے ذریعہ —— اوراس (طرح مال بڑھانے) میں شرط ہے کہ بعض بعض پرایسی تنگی نہ کریں کہ وہ تمدن کے فسادتک پہنچادے۔

پھرلوگوں کے اموال میں اپنامال شامل کرکے اس کو بڑھانا ضروریاتِ زندگی میں معاونت کے ذریعہ ہوتا ہے۔ معاونت کے بغیرمملکت کی حالت کی درستگی متعذّر یا دشوار ہے۔ جیسے: (۱) وہ شخص جوایک شہر سے دوسرے شہرتجارتی سامان لے جاتا

ہے، اور وقتِ معلوم تک یعنی ضرورت پیش آنے تک رسد کی حفاظت کا اہتمام کرتا ہے (۲) یا سعی وعمل کے ذریعہ دلالی کرتا ہے (۳) یا لوگوں کا مال سنوارتا ہے اس میں پسندیدہ حالت پیدا کرنے کے ذریعہ، اور اس کے مانند کمائی کی اور صورتیں —— پھر اگر لوگوں کے اموال میں ملا کر اپنا مال بڑھانا ایسے طریقہ سے ہو جس کا تعاون میں کوئی دخل نہیں، جیسے جُوا یا ایسے طریقہ سے ہو جو کہ وہ شکستگی کے مشابہ ہے، جیسے سود —— کیونکہ کنگال اس چیز کو یعنی سود کو سر لینے کی طرف مجبور ہے جس کے ایفاء پر وہ قادر نہیں (پس وہ سود چند در چند ہو جائے گا) اور اس کی رضامندی حقیقی رضامندی نہیں ہے —— تو وہ پسندیدہ معاملات میں سے نہیں۔ اور نہ نیک ذرائع آمدنی میں سے ہے۔ اور وہ باطل اور حرام ہے حکمتِ مدنی کی رو سے۔

لغات: مَعَایِش جمع معیشة: سامانِ زندگانی...... شَاحَّ مشاحَّةً: کسی سے لڑائی جھگڑا کرنا...... شَاجَره مشاجَرَةً: کسی کے ساتھ جھگڑا کرنا...... تحریمَ مضاف ہے أن یزاحم کی طرف...... غَرَر: فریب...... التسبُّب کے معنی مخطوطہ کراچی کے حاشیہ میں التکسّب لکھے ہیں...... اِسْتِنْمَاء: بڑھوتری طلب کرنا...... بما یستمد متعلق ہے استنماء سے اور مَا مصدریہ ہے...... اعتنٰی به: توجہ دینا، اہتمام کرنا...... الجلب: رسد، کھانے پینے کا سامان...... سَمْسَر فلان: دلّالی کرنا۔ بائع اور مشتری کے درمیان سہولت پیدا کرنے کے لئے کمیشن پر ثالثی کرنا...... اِقْتَضَب: کاٹنا، توڑنا۔ مخطوطہ کراچی کے حاشیہ میں اس کا ترجمہ شکستن لکھا ہے۔

☆ ☆ ☆

آبادکاری سے ملکیت کی وجہ

(اوپر جو تین اصولی باتیں بیان کی ہیں، ان پر مبنی چھ روایات کی شرح کرتے ہیں۔ پھر باقی اصولی باتیں بیان کریں گے)

حدیث —— دو شخصوں کا مقدمہ نبی ﷺ کی خدمت میں آیا۔ ایک نے دوسرے کی زمین میں درخت لگائے تھے اور وہ تناور بھی ہو چکے تھے۔ آپؐ نے زمین کا زمین والے کے لئے فیصلہ کیا، اور درخت والے کو حکم دیا کہ وہ اپنے درخت کاٹ لے، فرمایا: ”جس نے افتادہ زمین کی آبادکاری کی تو وہ اس کی ملک ہے، اور ظالم کی رگ (درخت) کے لئے کوئی حق نہیں“ (مشکوۃ حدیث ۲۹۴۴ ابوداؤد حدیث ۳۰۷۴)

تشریح: نبی ﷺ نے یہ فیصلہ اس اصل پر کیا ہے جس کی طرف ابھی اشارہ آیا کہ: ”کسی چیز میں درحقیقت کسی کا کوئی حق نہیں۔ سب چیزیں اللہ ہی کی ملک ہیں، جو ہر چیز کے پیدا کرنے والے ہیں۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے زمین سے اور زمین کی چیزوں سے فائدہ اٹھانا جائز کیا، اور ان کو بھی ایک درجہ میں مالک بنایا ہے[1]، تو لوگوں میں

[1] سورۂ یٰس آیت ۷۱ ہے ﴿أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِمَّا عَمِلَتْ أَيْدِينَا أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ﴾ کیا اور ان لوگوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے ان کے (نفع کے) لئے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں سے مواشی پیدا کئے، پس وہ ان کے مالک ہیں؟! ۱۲

نزاعات ہوئے۔پس حکم شریعت یہ نازل ہوا کہ کسی کو نقصان پہنچائے بغیر اگر کوئی شخص کسی چیز پر پہلے قبضہ کرلے تو اس کو اس چیز سے ہٹایا نہ جائے''

اسی اصل پر وہ افتادہ زمین جو نہ آبادی میں ہے، نہ اس کی فِنا (ملحقہ حصہ) میں: جب اس کو کوئی شخص آباد کرے تو کسی کو نقصان پہنچائے بغیر اس پر اس کا قبضہ ہوگیا۔پس اس زمین کا حکم یہ ہے کہ اس سے آباد کار کو ہٹایا نہ جائے۔کیونکہ زمین ساری حقیقت میں مسجد کی طرح یا اس سرائے کی طرح ہے جو مسافروں پر وقف ہے، اور ان کا اس میں حصہ ہے۔ پس الأسبق فالأسبق کا لحاظ کیا جائے گا یعنی پہلے کا حق پہلے اور بعد والے کا حق بعد میں!

سوال: زمین اور زمین کی چیزوں کے اللہ تعالیٰ مالک ہیں اور لوگ بھی مالک ہیں۔یہ دونوں باتیں کیسے جمع ہوسکتی ہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ کی ملکیت تو حقیقی ہے۔اور انسان کی ملکیت کے معنی ہیں: فائدہ اٹھانے کا دوسروں سے زیادہ حقدار۔یہ مجازی ملکیت ہے اور حقیقی اور مجازی ملکیتیں ایک ساتھ جمع ہوسکتی ہیں۔

---

[۱] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ''من أَحْيىٰ أرضًا مَيْتَةً فهيَ له''

أقول: الأصل فيه: ما أَوْمَأْنَا: أن الكلَّ مالُ الله، ليس فيه حق لأحد في الحقيقة، لكنَّ الله تعالى لما أباح لهم الانتفاعَ بالأرض ومافيها، وقعتِ الْمُشَاحَّةُ، فكان الحكمُ حينئذ أن لايُهَيَّجَ أحدٌ مما سبق إليه من غيرِ مضارَّةٍ.

فالأرض الميتةُ التي ليست في البلاد ولافي فنائها، إذا عَمَّرَهَا رجلٌ فقد سبقت يدُه إليها من غير مُضَارَّةٍ، فمن حكمه أن لايُهَيَّجَ عنها؛ والأرضُ كلُّها في الحقيقة بمنزلة مسجد، أو رَباطٍ جُعل وقفًا على أبناء السبيل، وهم شركاءُ فيه، فَيُقَدَّمُ الأسبقُ فالأسبق؛ ومعنى الملك في حق الآدمي: كونُه أحقَّ بالانتفاع من غيره.

ترجمہ: (حدیث شریف کے بعد) میں کہتا ہوں: اس (فیصلہ) میں اصل: وہ بات ہے (جس کی طرف) ہم نے اشارہ کیا کہ سب اللہ کا مال ہے۔حقیقت میں اس میں کسی کا کوئی حق نہیں۔لیکن جب اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے زمین سے فائدہ اٹھانا مباح کیا اور ان چیزوں سے جو زمین میں ہیں تو جھگڑا واقع ہوا۔پس اس وقت اللہ کا حکم ہوا کہ کوئی شخص برانگیختہ نہ کیا جائے اس چیز سے جس کی طرف اس نے سبقت کی ہے (کسی کو) نقصان پہنچائے بغیر۔پس وہ افتادہ زمین جو آبادیوں میں نہیں ہے، اور نہ ان کی فنا میں ہے، جب اس کو کوئی آباد کرے تو یقیناً اس کے ہاتھ نے اس کی طرف سبقت کی (کسی کو) نقصان پہنچائے بغیر۔پس اس کا حکم یہ ہے کہ وہ اس سے برانگیختہ نہ کیا جائے۔اور پوری زمین درحقیقت بمنزلۂ مسجد یا اس سرائے کے ہے جو مسافروں پر وقف کی ہوئی ہے۔اور وہ مسافر اس میں حصہ دار ہیں۔پس سب سے

پہلے کو مقدم کیا جائے گا، پھر اس کے بعد والے کا نمبر آئے گا —— اور آدمی کے حق میں ملکیت کے معنی: اس کا زیادہ حقدار ہونا ہے فائدہ اٹھانے میں اس کے علاوہ سے۔

☆ ☆ ☆

جس زمین کا کوئی مالک نہ ہو وہ افتادہ زمین کے حکم میں ہے

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جس زمین کا کوئی مالک نہ بچا ہو: وہ اللہ کے لئے اور اس کے رسول کے لئے ہے، پھر وہ میری طرف سے تمہارے لئے ہے‘‘ (مشکوۃ حدیث ۳۰۰۳)

تشریح: وہ زمین جس کے مالکان ختم ہو گئے ہوں، کوئی ایسا شخص نہ بچا ہو جو اس کا دعوی کرتا ہو، اور اپنی جدی جائداد بتلا کر منازعت کرتا ہو، ایسی زمین سے لوگوں کی ملکیت ختم ہو جاتی ہے، اور وہ خالص اللہ تعالیٰ کی ملکیت رہ جاتی ہے۔ پس اس کا حکم اس افتادہ زمین کا ہے جس کی کبھی بھی آبادکاری نہ کی گئی ہو۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے تعلق سے ملکیت کے معنی ہیں: فائدہ اٹھانے کا دوسروں سے زیادہ حقدار۔ اور اس معنی کے اعتبار سے اس زمین کا کوئی مالک نہیں، پس وہ افتادہ زمین جیسی ہوگی۔

حِمیٰ کی ممانعت کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’حمیٰ نہیں ہے مگر اللہ اور اس کے رسول کے لئے‘‘ (مشکوۃ حدیث ۲۹۹۱)

تشریح: حمیٰ بنانا یعنی سرکاری جنگل میں چراگاہ مخصوص کرنا، جس میں دوسروں کو جانور چرانے کا حق نہ ہو: اس لئے ممنوع ہے کہ اس سے عام لوگوں پر تنگی ہوگی۔ ان کی حق تلفی ہوگی۔ اور ان کو ضرر پہنچے گا۔ کیونکہ جب زیادہ مویشی والے اپنے لئے جگہیں مخصوص کرلیں گے تو عام لوگ جن کے پاس تھوڑے مویشی ہیں: کہاں چرائیں گے؟ —— البتہ رسول اللہ ﷺ حمیٰ بنا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ایک کسوٹی عنایت فرمائی تھی۔ آپؐ اتنا ہی حصہ مخصوص کریں گے کہ کسی کو ضرر نہ پہنچے۔ نیز آپؐ معصوم بھی تھے۔ ظلم و زیادتی کا صدور آپؐ سے ناممکن ہے۔

اور اس کی وجہ پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ جس کام کی ممانعت کسی برائی کے غالب احتمال کی وجہ سے ہوتی ہے، اس سے نبی ﷺ مستثنیٰ ہوتے ہیں، کیونکہ آپؐ کے حق میں گناہ کا وہ احتمال نہیں ہوتا مثلاً حالت حیض میں بیوی سے علحدہ رہنے کا حکم ہے، اور اس سے قُربت ممنوع ہے (سورۃ البقرۃ آیت ۲۲۲) کیونکہ قربت میں صحبتِ حرام کا سخت اندیشہ ہے۔ مگر نبی ﷺ ایسی حالت میں حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کو ساتھ لٹاتے تھے۔ کیونکہ آپؐ کے حق میں کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ اور جو احکام تہذیب نفس کے لئے ہوتے تھے مثلاً عبادات: ان میں نبی اور غیر نبی یکساں ہوتے تھے (تفصیل رحمۃ اللہ ۲: ۲۸۵

میں ہے) اور حمی بنانے کی ممانعت از قبیل اول ہے، اس لئے آپ مستثنیٰ ہیں۔

فائدہ: آپ ﷺ کا استثناء سربراہِ مملکت ہونے کی وجہ سے بھی ہوسکتا ہے۔ حکومت کو سرکاری جانوروں کے لئے حمی بنانے کا حق ہے۔ نبی ﷺ نے مقام نقیع کو مسلمانوں کے گھوڑوں کے لئے حمی بنایا تھا (فتح الباری ۵:۴۵) اور بخاری شریف (حدیث ۳۰۵۹) میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مقام شَرف (شین کے ساتھ) اور ربذہ کو حمی بنایا تھا۔ اور اپنے ایک مولیٰ کو اس کا نگران مقرر کیا تھا ـــــ اور حکومت کو حمی بنانے کی اجازت اس لئے ہے کہ وہ عوام کی مصلحت پیش نظر رکھ کر جگہ مخصوص کرے گی۔ پس کسی کی حق تلفی اور کسی پر ظلم وزیادتی نہ ہوگی۔

[۲] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "عاديُّ الأرض لله ورسوله، ثم هي لكم مني"

اعلم: أن عاديَّ الأرض هي التي باد عنها أهلُها، ولم يبقَ من يدَّعيها، ويُخاصم فيها، ويحتجُّ بسبق يدِ مورثِه عليها؛ فإذا كانت الأرضُ على هذه الصفة انقطع عنها ملك الآدميين، وخَلَصَتْ لملك الله؛ وحكمُهَا حكمُ مالم يُحييٰ قطُّ، لما ذكرنا من معنى الملك.

[۳] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "لاحِمىٰ إلا لله ورسوله"

أقول: لما كان الحِمىٰ تضييقًا على الناس، وظلماً عليهم وإضرارًا: نُهي عنه؛ وإنما استُثني الرسولُ: لأنه أعطاه الله الميزانَ، وعصمه من أن يَفْرُطَ منه مالايجوز؛ وقد ذكرنا: أن الأمور التي مبناها على المظانّ الغالبة، يُستَثنى منها النبيُّ صلى الله عليه وسلم؛ وأن الأمور التي مبناها على تهذيب النفس، وما يُشْبِهُ ذلك، فالأمرُ لازم فيها للنبي وغيره سواءً.

ترجمہ: (۲) جان لیں کہ بہت قدیم زمانہ کی باقی ماندہ زمین: وہ ہے جس سے اس کے مالکان ختم ہوگئے ہوں، اور کوئی شخص نہ بچا ہو جو اس کا دعوی کرتا ہو، اور اس میں جھگڑا کرتا ہو۔ اور اس پر اس کے مورث کے قبضہ کی سبقت کے ذریعہ استدلال کرتا ہو۔ پس جب زمین اس حالت میں ہو تو اس سے لوگوں کی ملکیت منقطع ہوجاتی ہے۔ اور وہ اللہ کی ملکیت کے لئے خالص ہوجاتی ہے۔ اور اس کا حکم اس زمین کا حکم ہے جس کی کبھی بھی آبادکاری نہ کی گئی ہو، اس بات کی وجہ سے جو ہم نے ذکر کی ملکیت کے معنی سے۔

(۳) جب حمی بنانا لوگوں پر تنگی کرنا اور ان پر ظلم کرنا اور نقصان پہنچانا تھا تو اس کی ممانعت کی گئی۔ اور رسول کا استثناء اس لئے کیا گیا کہ اللہ نے رسول کو میزان (کسوٹی) عنایت فرمائی تھی، اور اس کو اس بات سے محفوظ کیا تھا کہ اس سے وہ بات سرزد ہو جو جائز نہیں ہے۔ اور ہم نے یہ بات ذکر کی ہے کہ جن امور کا مدار غالب احتمالی مواقع پر ہوتا ہے ان سے نبی ﷺ مستثنیٰ کئے جاتے ہیں۔ اور جن امور کا تعلق نفس کو سنوارنے سے ہوتا ہے یا اس سے مشابہ چیزوں سے ہوتا ہے:

پس ان میں نبی اور ان کے علاوہ کے لئے معاملہ یکساں طور پر لازم ہوتا ہے۔

فائدہ: عادیّ: قوم عاد کی طرف منسوب۔ قوم عاد بہت قدیم زمانہ میں ہلاک کی گئی ہے۔ اب ان کی املاک کا کوئی دعویدار نہیں۔ عرب ایسی بے مالکی کی چیزوں کو عادیّ کہتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

مباح چیزوں سے استفادہ میں دو باتوں کا لحاظ ضروری ہے

خطّۂ عرب میں بارش کم ہوتی ہے۔ مگر جب ہوتی ہے تو چھاجوں برستی ہے۔ اور علاقہ پہاڑی ہے، اس لئے پہاڑوں سے پانی اتر کر نالے زور سے بہتے ہیں۔ پہلے لوگ پانی باندھ کر جمع کر لیتے تھے۔ پھر بوقتِ ضرورت اس سے سینچائی کرتے تھے۔ جب باندھ میں پانی کم رہ جاتا تھا تو نزاع ہوتا تھا۔ زیریں کھیت والا بالائی کھیت والے سے تقاضا کرتا کہ پانی میری طرف آنے دے۔ بالائی کھیت والا کہتا: جب میری ضرورت پوری ہوگی آنے دونگا۔ اس سلسلہ کے دو فیصلے یہ ہیں:

پہلا فیصلہ —— بنوقُریظہ کے علاقہ میں مَھْزُور نامی وادی کے نالے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ کیا کہ وہ روکا جائے۔ یہاں تک کہ کھیت میں پانی ٹخنوں تک بھر جائے۔ پھر اوپر والا نیچے والے کی طرف پانی چھوڑے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۰۵ یہ روایت ضعیف ہے)

دوسرا فیصلہ —— حضرت زبیر بن عوّام اور ایک انصاری صحابی میں حرّہ کے نالے کے پانی میں نزاع ہوا۔ نبی ﷺ نے فیصلہ کیا: ''زبیر! سینچائی کرو، پھر پانی کو روکو یہاں تک کہ مینڈ تک آجائے یعنی کھیت بھر جائے، پھر اپنے پڑوسی کی طرف چھوڑو'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۲۹۹۳)

تشریح: جب کسی مباح چیز کے ساتھ ترتیب وار حقوق متعلق ہوں، جیسے سرکاری نل سے پانی لینے کے لئے لائن لگے تو دو باتوں کا لحاظ ضروری ہے:

۱ —— ترتیب کا لحاظ رکھا جائے یعنی لوگ نمبر وار استفادہ کریں۔ جس کا نمبر پہلے ہے وہ پہلے فائدہ اٹھائے، اور بعد والا بعد میں۔ کیونکہ جس کا نمبر آیا ہے اگر اس کو پہلے نہیں لینے دیا جائے گا تو من مانی اور ضرر رسانی ہوگی، جس سے جھگڑا کھڑا ہوگا۔

۲ —— ہر ایک کو اتنا لینے دیا جائے کہ اس کو معتد بہ فائدہ حاصل ہوجائے۔ کیونکہ لوگ اگر اپنے اپنے نمبر پر اتنا فائدہ حاصل نہیں کریں گے تو کسی کو بھی حق نہیں مل سکے گا۔ لوگوں میں دھینگا مُشتی ہوگی، اور سبھی ناکام رہیں گے۔

فائدہ: ٹخنوں تک پانی آنے میں اور مینڈ تک آنے میں کچھ تعارض نہیں۔ دونوں قریب ہی قریب ہیں۔ کیونکہ اول ثانی کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ اور اس سے کم زمین کا پانی کو چوسنا ہے، سینچائی نہیں ہے۔ پس یہی کم از کم معتد بہ فائدہ ہے (یہ فائدہ کتاب میں ہے)

[٤] وقضى صلى الله عليه وسلم في سَيْلِ المَهْزُور: " أن يُمْسَك حتى يبلُغَ الكعبين، ثم يرسل الأعلى إلى الأسفل"

وفي قصة مخاصمة الزبير رضي الله عنه: " اِسْقِ يازبير! ثم احْبِسِ الماءَ حتى يرجع إلى الجَدْر، ثم أرسل الماء إلى جارك"

أقول: الأصل فيه: أنه لما توجَّهَ للناس في شيئ مباح حقوقٌ مترتبةٌ: وجب أن يراعى الترتيب، في قدر ما يحصل لكل واحد فائدةٌ هي أدنى ما يُعتد بها؛ فإنه لو لم يقدَّم الأقربُ كان فيه التحكُّمُ والمضارَّةُ؛ ولو لم يستوفِ الأولُ ثم الأولُ الفائدةَ، لم يحصُلِ الحقُّ؛ فعلى هذا الأصل قضى أن يُمسك حتى يبلُغ الكعبين، وهو قريب من قوله: " إلى الجَدْر" لأنه أولُّ حدِّ بلوغ الجدر؛ وإنما يكون قبلَه امتصاصُ الأرض، من غير أن يُصادم الجدار.

ترجمہ: میں کہتا ہوں: اس فیصلہ میں ضابطہ یہ ہے کہ جب لوگوں کے لئے کسی مباح چیز میں ترتیب وار حقوق متعلق ہوں تو ضروری ہے کہ (۱) ترتیب کی رعایت کی جائے (۲) اتنی مقدار میں کہ ہر ایک کو اتنا فائدہ حاصل ہو جائے جو اس کا کم از کم ایسا درجہ ہو جس کا لحاظ کیا جاتا ہو (پہلی بات کی دلیل:) پس بیشک شان یہ ہے کہ اگر نہیں مقدم کیا جائے گا قریب ترین تو ہوگا اس (استفادہ) میں تحکّم اور ضرر رسانی (دوسری بات کی دلیل:) اور اگر پہلا پھر اس کے بعد والا فائدہ وصول نہیں کرے گا تو حق حاصل نہیں ہوگا۔ پس اس ضابطہ پر فیصلہ کیا کہ وہ پانی کو روکے تا آنکہ وہ ٹخنوں تک پہنچے۔ اور وہ قریب ہے آپؐ کے ارشاد: "دیوار تک" سے۔ اس لئے کہ وہ (ٹخنوں تک پہنچنا) دیوار تک پہنچنے کی ابتدائی حد ہے۔ اور اس سے پہلے زمین کا پانی چوسنا ہی ہے، دیوار سے ٹکرائے بغیر۔

لغات: الجَدْر والجدار بمعنی...... تحکّم: زبردستی...... اِمْتَصَّ اِمْتِصَاصًا: آہستہ آہستہ چوسنا۔

☆ ☆ ☆

کم محنت اور زیادہ نفع والی چیز کسی کو الاٹ نہ کی جائے

حدیث ـــــ حضرت ابیض بن حمال رضی اللہ عنہ نے درخواست کی کہ یمن کے مآرِب کے علاقہ میں نمک بنانے کا حق ان کو دیدیا جائے۔ آپؐ نے دیدیا۔ جب وہ اٹھ کر چلے گئے تو کسی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپؐ نے ان کو ایسا پانی الاٹ کر دیا جس کا سوت کبھی خشک نہیں ہوتا یعنی سمندر کے پانی سے نمک تیار ہوتا ہے، جو ہمیشہ باقی رہنے والا پانی ہے۔ اور نمک بنانے میں کچھ زیادہ محنت اور خرچ بھی نہیں ہے، پس ایسا حق ایک شخص کو دیدینا مناسب نہیں۔ راوی کہتا ہے: پس آپؐ نے ان سے وہ حق واپس لے لیا (مشکوٰۃ حدیث ۳۰۰۰)

تشریح: جو کھان زمین کے اوپر ہو اور بہت زیادہ محنت طلب نہ ہو: اگر وہ کسی ایک شخص کو الاٹ کر دی جائے گی تو یقیناً اس سے لوگوں کو ضرر پہنچے گا، اور ان پر تنگی ہوگی۔ اس لئے ضررِ عام کو ہٹانے کے لئے آپ نے وہ الاٹ منٹ ختم کر دیا۔

فائدہ: کم محنت زیادہ نفع والی چیزیں یا تو حکومت کی تحویل میں رہنی چاہئیں تاکہ سب لوگوں کو فائدہ پہنچے یا پھر ان کو رفاہِ عام کے لئے باقی رکھا جائے تاکہ جو چاہے فائدہ اٹھائے۔

لُقطہ (پڑی پائی چیز) سے اباحتِ انتفاع کی وجہ

حدیث ——— نبی صلی اللہ ﷺ سے لقطہ (پڑی چیز) کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''اس کا سربند اور تسمہ خوب پہچان لو، پھر سال بھر اس کی تشہیر کرو، اگر مالک مل جائے تو مراد حاصل! ورنہ جو چاہو کرو'' پوچھا گیا: گم شدہ بکری؟ یعنی جو بکری ریوڑ سے پیچھے رہ گئی ہو اس کا کیا حکم ہے؟ فرمایا: ''وہ تیرے لئے یا تیرے بھائی کے لئے یا بھیڑیے کے لئے ہے!'' یعنی اس کو پکڑ کر لے آ۔ تیرے کام آئے گی یا کسی غریب کے۔ وہیں چھوڑ دے گا تو رات میں بھیڑیا اس کو پھاڑ کھائے گا۔ پوچھا گیا: گم شدہ اونٹ کا کیا حکم ہے؟ فرمایا: ''تجھے اس سے کیا لینا ہے! اس کے ساتھ اس کا مشکیزہ اور جوتا ہے۔ وہ پانی پر پہنچتا ہے اور درخت کھاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا مالک اس کو پالیتا ہے!'' یعنی اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہیں ہے (مشکوۃ حدیث ۳۰۳۳)

حدیث ——— حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ہمیں رسول اللہ ﷺ نے لاٹھی، کوڑے، رسّی اور اس کے مانند چیزوں میں اجازت دی کہ آدمی اسے اٹھالے، اور اس سے فائدہ اٹھائے (مشکوۃ حدیث ۳۰۴۰)

تشریح: کوئی چیز ایسی جگہ پڑی ملے کہ اگر اس کو اٹھا نہیں لیا جائے گا تو ضائع ہو جائے گی: تو اس کا اٹھالینا واجب ہے۔ پھر اگر وہ قیمتی اور اہمیت رکھنے والی چیز ہے تو اس کے مالک کو تلاش کرنا واجب ہے۔ اور معمولی چیز ہے مثلاً ایک کھجور تو اس کے مالک کو تلاش کرنا ضروری نہیں۔ پھر جب تلاش کرنے کے بعد مایوسی ہو جائے، اور غالب گمان یہ ہو جائے کہ اب اس کا مالک نہیں آئے گا تو احناف کے نزدیک: اگر خود غریب ہے تو اپنے استعمال میں لاسکتا ہے۔ اور مال دار (صاحبِ نصاب) ہے تو خیرات کر دے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک: مالدار بھی اپنے استعمال میں لاسکتا ہے۔ اور اباحت کی وجہ شاہ صاحب بیان کرتے ہیں:

لقطہ کی اباحت اُس ضابطہ سے ہے کہ جب کسی چیز کا کوئی مالک نہیں رہتا تو وہ اللہ کی ملکیت کی طرف لوٹ جاتی ہے یعنی مباح الاصل ہو جاتی ہے۔ پس جب لقطہ معمولی چیز ہو، اور اس کا مالک اس سے بے نیاز ہو جائے اور وہ اس کی طرف نہ لوٹے تو اس کا کوئی بھی مالک بن سکتا ہے۔ البتہ قیمتی چیز ہو تو اس کی تشہیر ضروری ہے۔ لقطہ کی حیثیت اور عرف کا لحاظ کر کے اس کی تشہیر کی جائے۔ پھر جب ظن غالب ہو جائے کہ اس کا مالک نہیں لوٹے گا تو اس کا استعمال درست ہے۔

فائدہ: بکری جیسی چیز جس کے ضائع ہونے کا احتمال ہے اس کو اٹھالینا چاہئے۔ اور اونٹ جیسی چیز جس کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہیں ہے: اٹھانا مکروہ ہے (یہ فائدہ کتاب میں ہے)

فائدہ: اگر لقطہ معمولی چیز ہو تو مالک کو تلاش کئے بغیر اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ اس کی دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت ہے۔ نیز بخاری و مسلم کی یہ روایت بھی اس کی دلیل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم راستہ میں پڑی ہوئی ایک کھجور کے پاس سے گذرے۔ فرمایا: ''اگر صدقہ کی کھجور ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں اس کو کھالیتا'' (جامع الاصول ۱۱: ۳۰۰) اور شاہ صاحب نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ جس چیز کا مالک نہیں رہتا یعنی مالک کا دل اس سے ہٹ جاتا ہے وہ اللہ کی ملک کی طرف لوٹ جاتی ہے یعنی مباح الاصل چیزوں کی طرح ہو جاتی ہے۔ پس ہر کوئی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

لیکن اگر لقطہ اہم چیز ہو تو کیا حکم ہے؟ مالک نہ ملنے کی صورت میں وہ اللہ کے مال کی طرف لوٹے گی یا نہیں؟ اور مباح الاصل چیزوں کی طرح ہوگی یا نہیں؟ شاہ صاحب قدس سرہ نے اس جگہ خاموشی اختیار کی ہے۔ کیونکہ پہلی حدیث میں اس سلسلہ میں کوئی بات نہیں ہے۔ حالانکہ یہی بات وضاحت طلب تھی۔ اسی میں مجتہدین کرام میں اختلاف ہے۔ احناف کے نزدیک: اس صورت میں مالک کی ملک زائل نہیں ہوتی۔ اور چونکہ مالک معلوم نہیں اس لئے اس کا خیرات کرنا ضروری ہے۔ بخاری شریف میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ اثر ہے کہ آپ نے ایک باندی خریدی۔ بائع قیمت وصول کئے بغیر غائب ہو گیا۔ آپ نے سال بھر اس کو ڈھونڈھا۔ نہ ملا تو آپ نے باندی کی قیمت تھوڑی تھوڑی کر کے صدقہ کی۔ اور فرمایا: اللّٰهم عن فلان، فإن أبى فَلِي وعليّ: الٰہی! یہ فلاں (یعنی بائع) کی طرف سے صدقہ ہے۔ پس اگر وہ اس کو منظور نہ کرے تو اس کا ثواب میرے لئے ہے اور اس آدمی کا پیسہ میرے ذمّے ہے۔ اور فرمایا: هكذا فافعلوا باللقطة إذا لم تجدوا صاحبها: لقطہ کے ساتھ بھی ایسا ہی کرو، جبکہ اس کے مالک کو نہ پاؤ (جامع الاصول حدیث ۸۳۴۶) اس روایت سے یہ بات صاف ہو گئی کہ ایسا لقطہ مالک کی ملک سے نہیں نکلتا۔ اور مباح الاصل چیزوں کی طرح نہیں ہوتا۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ مالک کا دل برابر اس چیز کے ساتھ اٹکا رہتا ہے، خواہ کتنا ہی زمانہ گذر جائے۔ اور خواہ وہ مایوس ہو کر تلاش کرنا چھوڑ دے۔ اور اللہ کا مال بن جانے کا اسی پر مدار ہے۔ ابو داؤد میں روایت ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کوئی جانور پایا جسے اس کے مالک نے گھاس چارہ سے عاجز ہو کر چھوڑ دیا ہے، اس نے اس کو پالا تو وہ اس کا ہے'' (جامع الاصول حدیث ۸۳۴۳) کیونکہ اس سے اس کے مالک کا دل ہٹ گیا۔ پس وہ اللہ کا مال ہو گیا۔ واللہ اعلم۔

[۵] وأقطع صلى الله عليه وسلم لأبيضَ بنِ حَمَّال المَأْرِبِيِّ الملحَ الذى بِمَأْرِبَ، فقيل: إنما أَقْطَعْتَ له الماءَ العِدَّ! قال: فرجعه منه.

أقول: لاشك أن المعدِنَ الظاهِرَ الذى لايحتاج إلى كثيرِ عملٍ، إقطاعُه لواحد من المسلمين إضرارٌ بهم، وتضييقٌ عليهم.

[۶] وسُئل صلى الله عليه وسلم عن اللُّقَطَةِ، فقال: "اعْرِفْ عِفَاصَهَا ووِكَاءَ ها، ثم عَرِّفْها سَنَةً، فإن جاء صاحبها، وإلا فشأنَك بها" قال: فضالَّة الغنم؟ قال: "هي لك، أولأخيك، أو للذئب" قال: فضالة الإبل؟ قال: "مالك ولها! معها سِقاؤُها وحِذاؤُها، تَرِدُ الماءَ وتأكل الشجر حتى يلقاها ربها"

وقال جابر رضي الله عنه: رَخَّص لنا رسولُ الله صلى الله عليه وسلم في العصا والسَّوط والحبل وأشباهِه: يلتقِطُه الرجلُ، ينتفعُ به.

أقول: اعلم أن حكم اللُّقَطَة مستنبطٌ من تلك الكلية التي ذكرنا؛ فما اسْتَغْنى عنه صاحبُه، ولايرجع إليه بعد مافارقه، وهو التَّافِهُ، يجوز تملُّكُه إذا ظُنَّ أن المالك غاب، ولم يرجع، وامتنع عودُه إليه؛ لأنه رجع إلى مال الله، وصارمباحاً.

وأما ماكان له بالٌ يطلب، ويرجع له الغائب، فيجب تعريفُه، على ما جرت العادةُ بتعريف مثله، حتى يُظَنَّ أن مالكه لم يرجع.

ويستحب التقاطُ مثلِ الغنم، لأنه يَضيع إن لم يُلتقط، ويكره التقاطُ مثلِ الإبل.

ترجمہ: میں کہتا ہوں: جان لیں کہ لقطہ کا حکم اُس قاعدہ سے نکالا گیا ہے جو ہم نے ذکر کیا یعنی عادیّ الارض کی روایت کی شرح میں۔ پس جس لقطہ سے اس کا مالک بے نیاز ہوگیا۔ اور وہ اس سے جدا ہونے کے بعد اس کی طرف نہیں لوٹے گا۔ اور وہ معمولی چیز ہو تو اس کا مالک بننا جائز ہے جب گمان کیا جائے کہ مالک چلا گیا، اور وہ نہیں لوٹے گا، اور اس کی طرف اس کا لوٹنا ممتنع ہے، کیونکہ وہ چیز اللہ کے مال کی طرف لوٹ گئی اور مباح ہوگئی۔

اور رہی وہ چیز جس کے لئے ایسی اہمیت ہو کہ وہ تلاش کی جاتی ہے، اور اس کے لئے چلا جانے والا واپس لوٹتا ہے، پس اس کی تشہیر کرنی ضروری ہے، جس طرح اس قسم کی چیزوں کی تشہیر کرنے کی عادت جاری ہو، یہاں تک کہ گمان کیا جائے کہ اس کا مالک واپس نہیں آئے گا —— اور بکری جیسی چیز کو اٹھا لینا مستحب ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ نہیں اٹھائی جائے گی تو ضائع ہوجائے گی۔ اور اونٹ جیسی چیز کو اٹھا لینا مکروہ ہے (رَجَعَه (مجرد) اور رَجَّعَه (مزید) دونوں کے معنی ہیں: واپس لینا)

☆ ☆ ☆

چوتھی بات: مبادلہ میں ضروری چیزیں اور ان کی شرطیں

ہر مبادلہ میں چار چیزیں ضروری ہیں:

پہلی چیز —— عاقِدَین —— یعنی دو لین دَین کرنے والے: بائع اور مشتری۔ اور متعاقدین کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ

خود مختار عقلمند ہوں۔ مبادلہ کا نفع ونقصان سمجھتے ہوں، اور بصیرت وغور وفکر سے معاملہ کریں ـــــ پس مُکرَہ، مجنون اور ناسمجھ بچہ کی اور مذاق کے طور پر کی ہوئی بیع درست نہیں۔ البتہ آزاد بمعنی غلام نہ ہونا اور بالغ ہونا شرط نہیں۔

دوسری چیز ـــ عوضین ـــ یعنی وہ دو چیزیں جن کا باہم تبادلہ کیا جائے: مبیع اور ثمن۔ اور عوضین کیلئے چار شرطیں ہیں:

۱ ـــ مال ہونا ـــ یعنی دونوں عوض ایسی چیزیں ہوں جن سے فائدہ اٹھایا جاتا ہو، جو مرغوب فیہ ہوں اور جن کے دینے میں کنجوسی کی جاتی ہو ـــــ پس جو چیزیں مال نہیں ہیں جیسے مٹی، مردار اور خون کی بیع درست نہیں۔

فائدہ: فقہاء نے مال کی تعریف مَا یمیلُ إلیہ النفس کی ہے یعنی جس چیز کی طرف نفس مائل ہو۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے مال کے جو معنی بیان کئے ہیں وہ زیادہ واضح ہیں۔

۲ ـــ مملوک ہونا ـــ یعنی دونوں عوض عاقدین کے مملوک ہوں۔ دونوں یا کوئی ایک عوض مباح الاصل نہ ہو۔ جیسے جنگل کی گھاس احراز سے پہلے غیر مملوک ہے، پس اس کی بیع درست نہیں۔

۳ ـــ متقوّم ہونا ـــ یعنی دونوں عوض یا کوئی ایک ایسی چیز نہ ہو جس میں کوئی قابل لحاظ فائدہ نہ ہو۔ جیسے مسلمانوں کے حق میں خمر اور خنزیر۔ کیونکہ ایسا عوض ان چیزوں میں سے نہیں ہوگا جن کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے مشروع کیا ہے۔ اور ان کا مبادلہ لاحاصل ہوگا۔

۴ ـــ نفع کا یقینی ہونا ـــ یعنی مبادلہ میں ملنے والا نفع کوئی ضمنی چیز نہ ہو، جس کا بہ ظاہر تذکرہ نہ کیا جاتا ہو، جیسے جُوا میں ملنے والا نفع غیر یقینی ہے۔

فائدہ: جُوا کی حرمت کی یہ بھی ایک وجہ ہے۔ جُوا کھیلنے والے کو دھڑکا لگا رہتا ہے کہ شاید اس کو وہ چیز نہ ملے جس کی اس نے امید باندھی ہے۔ پس ہارنے کی صورت میں یا تو محرومی کے ساتھ خاموش رہے گا، یا ایسے حق (جُوا کے نفع) کے لئے جھگڑا کرے گا جو لوگوں کے نزدیک اس کے لئے ثابت نہیں (یہ فائدہ کتاب میں ہے)

تیسری چیز ـــــ مبادلہ پر متعاقدین کی رضامندی کا پیکر محسوس ـــــ اور اس کے لئے شرط یہ ہے کہ کوئی ایسی واضح چیز ہو جس کے ذریعہ برملا گرفت کی جاسکے۔ اور متعاقدین میں سے ایک دوسرے پر بے حجت ظلم نہ کرسکے۔ ایسی چیزیں دو ہیں: اول: قول یعنی ایجاب وقبول۔ کیونکہ زبان سے بولی ہوئی بات سے زیادہ واضح کوئی چیز نہیں۔ دوم: تعاطی یعنی خریدنے کے طور پر مبیع لینا، اور ثمن اس طرح دینا کہ بیع میں ذرا شک باقی نہ رہے۔

فائدہ: تعاطی کی دو صورتیں ہیں: اول: دکان سے مقررہ ریٹ کی کوئی چیز لے اور اس کی قیمت دے۔ اور منہ سے کچھ نہ بولے۔ دوم: مقبوض علی سَوم الشراء یعنی قیمت معلوم کرکے دکان سے کوئی چیز گھر دکھانے کے لئے لے گیا۔ پسند آئی تو پیسے دیدیئے ورنہ چیز لوٹا دی۔

چوتھی چیز ـــــ متعاقدین میں منازعت ختم کرنے والی اور دونوں پر عقد لازم کرنے والی فیصلہ کن چیز ـــــ یہ

چیز تبدّل مجلس یعنی متعاقدین کا ایک دوسرے سے جدا ہونا ہے۔ جس کا تذکرہ درج ذیل حدیث میں ہے:

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''معاملۂ بیع کے دونوں فریقوں کو (معاملہ فسخ کرنے کا) اختیار ہے، اس کے ساتھی کی مرضی کے خلاف، جب تک وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں۔ مگر خیارِ شرط والی بیع (اس میں تفرقِ ابدان کے بعد بھی مدتِ مقررہ تک بیع ختم کرنے کا اختیار باقی رہتا ہے) (مشکوۃ حدیث ۲۸۰۱)

تشریح: امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک: خیار مجلس ثابت ہے یعنی فریقین کو اس وقت تک معاملہ فسخ کرنے کا اختیار ہے جب تک وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں۔ اور امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک: خیار مجلس نہیں ہے۔ ان کے نزدیک جب معاملہ طے ہو جائے، اور سودا پکّا ہو جائے، اور ایجاب وقبول متحقق ہو جائیں یا تعاطی کی صورت پائی جائے تو بیع لازم ہو گئی۔ اب ایک فریق کو سودا ختم کرنے کا اختیار نہیں۔ ہاں باہمی رضامندی سے معاملہ فسخ کیا جا سکتا ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مبادلہ میں کوئی ایسی فیصلہ کن چیز ضروری ہے جو متعاقدین کے حقوق کو ایک دوسرے سے جدا کر دے۔ یعنی یہ بات واضح ہو جائے کہ مبیع اب مشتری کی اور ثمن بائع کا حق ہو گیا۔ اور وہ چیز دونوں کا بیع ختم کرنے کا اختیار ختم کر دے۔ کیونکہ بیع میں ایسی فیصلہ کن چیز نہیں ہو گی تو ایک دوسرے کو ضرر پہنچائے گا۔ اور ہر ایک اپنی چیز میں تصرف کرنے سے رکا رہے گا، اس اندیشہ سے کہیں دوسرا بیع ختم نہ کر دے۔

اور فیصلہ کن چیز ایجاب وقبول نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ وہ ایسے الفاظ ہوتے ہیں جو عقد پر رضامندی اور بیع کے پختہ ارادے پر بھی دلالت کرتے ہیں اور معاملہ کو آخری شکل دینے پر بھی۔ کیونکہ مول تول اور بھاؤ تاؤ کے لئے بھی ضروری ہے کہ کسی مقدار پر یعنی ثمن پر فریقین پختہ ارادہ ظاہر کریں۔ نیز عوامی محاورات میں اس قسم کے الفاظ قلبی رغبت کے پیکر ہوتے ہیں۔ پس یہ امتیاز کرنا کہ کونسے لفظ بیع کو آخری شکل دینے کے لئے بولے گئے ہیں اور کونسے بھاؤ تاؤ کے لئے: بہت مشکل ہے۔ پس ایجاب وقبول کے لئے بولے گئے الفاظ کو امر قاطع نہیں بنا سکتے۔

اسی طرح تعاطی کو بھی فیصلہ کن چیز نہیں بنا سکتے۔ کیونکہ آدمی کبھی وہ چیز لیتا ہے جس کا وہ خواہش مند ہوتا ہے تا کہ وہ اس چیز کو دیکھے بھالے اور غور کرے اگر پسند آئے تو لے ورنہ چھوڑ دے۔ اور دوسرا لینا خریدنے کے طور پر ہوتا ہے۔ اور لینے اور لینے میں امتیاز کرنا آسان نہیں۔ پس یہ چیز بھی امر قاطع نہیں بن سکتی۔

اور ایسی چیز بھی فیصلہ کن نہیں ہو سکتی جو واضح نہ ہو، اور نہ کوئی لمبی مدت مثلاً ایک دن یا زیادہ امر قاطع مقرر کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ بہت سے سامان اس لئے خریدے جاتے ہیں کہ ان سے ہمہ روز فائدہ اٹھایا جائے۔ پس اگر کوئی لمبی مدت امر قاطع مقرر کی جائے گی تو حرج واقع ہو گا۔

پس تین وجوہ سے مجلس سے جدا ہونے کو فیصلہ کن امر مقرر کرنا ضروری ہے: اول: عرف وعادت یہ جاری ہے کہ متعاقدین

سودا کرنے کے لئے اکٹھا ہوتے ہیں، اور فارغ ہو کر جدا ہو جاتے ہیں۔ دوم: عرب وعجم کے مختلف گروہوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ اکثر لوگ متعاقدین کے جدا ہونے کے بعد معاملہ ختم کرنے کو ظلم وجَور قرار دیتے ہیں، اُس سے پہلے نہیں۔ البتہ اگر کوئی اپنی فطرت بدل لے تو وہ پہلے معاملہ ختم کرنے کو بھی ناانصافی قرار دے گا۔ سوم: احکام شرعیہ اس طرح نازل کئے گئے ہیں کہ عوام ان کو سنتے ہی دل سے قبول کرلیں۔ چنانچہ حدیث میں اسی کو امر قاطع مقرر کیا گیا ہے۔

سوال: جب فیصلہ کن امر تبدّلِ مجلس کو مقرر کیا گیا ہے تو سودا مکمل ہونے کے بعد اگر ایک شخص مجلس سے اٹھ جائے تو وہ جائز ہونا چاہئے۔ حالانکہ حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ فرمایا: ''فریقین میں سے کسی کے لئے بھی جائز نہیں کہ وہ اپنے ساتھی سے اس اندیشہ سے جدا ہو جائے کہ وہ اس سے سودا ختم کرنے کے لئے کہے گا'' (مشکوۃ حدیث ۲۸۰۴)

جواب: اس حدیث میں مجلس عقد سے اٹھ جانے کی ممانعت نہیں ہے، بلکہ چپکے سے کھسک جانے کی ممانعت ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ بعض لوگ معاملہ مکمل ہونے کے بعد جب دیکھتے ہیں کہ ان کو نفع ہوا تو وہ چپکے سے کھسک جاتے ہیں، تا کہ دوسرا بیع ختم نہ کردے۔ پس یہ تو معاملہ برعکس ہو گیا۔ کیونکہ شریعت نے خیارِ مجلس تروّی (غور وفکر کرنے) کے لئے رکھا ہے یعنی اگر کسی کو سودے سے پشیمانی ہو تو وہ بیع ختم کر سکے۔ پس جب ایک شخص چپکے سے کھسک جائے گا تو خیار کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ بلکہ متعاقدین کا فرض منصبی یہ ہے کہ دونوں صبر وتوقّف سے کام لیں اور جو جدا ہو وہ دوسرے کی نگاہوں کے سامنے جدا ہو تا کہ اگر وہ بیع ختم کرنا چاہے تو کر سکے۔

فائدہ: (۱) —— بیع میں دو چیزیں ہیں: تمامیتِ بیع اور لزوم بیع۔ اس میں اختلاف ہے کہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ رہتی ہیں یا جدا ہوتی ہیں۔ احناف مالکیہ اور ظاہر یہ کے نزدیک ایک ساتھ رہتی ہیں۔ پھر ظاہر یہ کے نزدیک: تفرقِ ابدان پر دونوں کا تحقّق ہوتا ہے یعنی جب متعاقدین ایک دوسرے سے جدا ہوں گے اس وقت بیع تام بھی ہوگی اور لازم بھی۔ اور حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک: ایجاب وقبول پر دونوں کا تحقق ہوتا ہے۔ اور شوافع اور حنابلہ کے نزدیک: ایجاب وقبول پر بیع تام ہوتی ہے، مگر لازم نہیں ہوتی۔ لزوم تفرق ابدان پر ہوتا ہے۔ اور ثمرۂ اختلاف دو صورتوں میں ظاہر ہوگا: اول: اگر کوئی چیز خریدی گئی۔ پھر سودا مکمل ہونے کے بعد مجلس عقد ہی میں ایک شخص فوت ہو گیا تو ظاہر یہ کے نزدیک: سودا نہیں ہوا۔ مبیع: بائع کی اور ثمن مشتری کا ہے۔ اور ائمہ اربعہ کے نزدیک: سودا ہو گیا۔ کیونکہ ایجاب وقبول ہو چکے ہیں۔ پس ثمن: بائع کا یا اس کے ورثاء کا۔ اور مبیع: مشتری کی یا اس کے ورثاء کی ہوگی۔ دوم: سودا مکمل ہونے کے بعد تفرقِ ابدان سے پہلے ایک فریق: دوسرے کی رضامندی کے بغیر سودا ختم کرنا چاہے تو شوافع اور حنابلہ کے نزدیک: اس کو یہ حق ہے۔ اور حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک: دوسرے کی رضامندی کے بغیر وہ سودا ختم نہیں کر سکتا۔

اور خیار مجلس میں اختلاف کی بنیاد: نص فہمی میں اختلاف ہے یعنی مذکورہ روایات میں تفرق ابدان سے پہلے جس اختیار کا ذکر ہے: وہ اختیار تام ہے یا ناقص؟ بہ الفاظ دیگر: یہ حکم بابِ قضا سے ہے یا بابِ دیانت سے؟ دو اماموں کے نزدیک: یہ

اختیار تام ہے یعنی ہر فریق بیع ختم کرنے میں ڈکٹیٹر ہے۔ دوسرا خواہ راضی ہو یا نہ ہو: پہلا بیع ختم کرسکتا ہے اور یہ شرعی حکم ہے۔ قاضی بھی اسی کے موافق حکم کرے گا۔ اور دو اماموں کے نزدیک: یہ اختیار ناقص ہے یعنی ہر فریق اپنے ساتھی کو راضی کر کے معاملہ ختم کرسکتا ہے، تنہا نہیں کرسکتا[1] اور یہ حکم اخلاق و مروّت کے باب سے ہے یعنی ایک فریق بیع ختم کرنا چاہے تو انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ دوسرا راضی ہو جائے۔

پہلے فریق کے نزدیک: تفرقِ ابدان کے علاوہ ایک مرتبہ اِختر اختر کہنے پر بھی خیار ختم ہو جاتا ہے یعنی سودا مکمل ہونے کے بعد ایک شخص دوسرے سے کہے: آپ سودے میں غور کرلیں۔ اگر پسند نہ ہو تو معاملہ ختم کردیں۔ دوسرا غور کر کے یا تو سودا ختم کردے یا یہ کہے کہ مجھے سودا منظور ہے۔ پھر یہ شخص جس کو سودا پسند ہے۔ یہی بات دوسرے سے کہے۔ اور وہ بھی غور کر کے یا سودا ختم کردے یا منظور کرے تو بیع لازم ہوگئی۔ اور خیار مجلس ختم ہوگیا، اگرچہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئے ہوں۔ بخاری شریف میں روایت ہے: البَیِّعَان بالخیار مالم یتفرقا، أو یقولَ أحدھما لصاحبه: اختر: متعاقدین کو اختیار ہے جب تک دونوں جدا نہ ہوں یا ایک اپنے ساتھی سے کہے: پسند کر! (بخاری حدیث ۲۱۰۹)

اس فریق کا استدلال ظاہر نصوص سے ہے۔ روایات سے بہ ظاہر یہی بات مفہوم ہوتی ہے کہ یہ خیار تام ہے اور حق لازم ہے۔ اور شاہ صاحب قدس سرہ نے اس کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ یہ مدت تروّی (غور و فکر کرنے) کے لئے، اور فریقین میں منازعت ختم کرنے کے لئے اور دونوں پر عقد لازم کرنے کے لئے ہے۔

اور بڑے دو اماموں نے درج ذیل قرائن کی بنا پر یہ سمجھا ہے کہ یہ حکم بابِ اخلاق سے ہے اور یہ خیار ناقص ہے:

۱ — بخاری شریف میں حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کی روایت میں ایک راوی ہمام کی روایت میں: یختار ثلاث مرار ہے یعنی تین بار اختر اختر کہنے تک خیار فسخ باقی رہتا ہے۔ فتح الباری (۴: ۳۳۴) میں حافظ رحمہ اللہ نے اس کو استحبابی حکم قرار دیا ہے۔ پس تین مرتبہ کی طرح ایک مرتبہ کا حکم بھی استحبابی ہے، ایک مرتبہ کے وجوبی حکم ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

۲ — ترمذی وغیرہ میں سندِ حسن سے حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت میں یہ ارشاد مروی ہے: ولا یحلُّ له أن یُفارقَ صاحبَه خشیةَ أن یَسْتَقِیْلَه: فریقین میں سے کسی کے لئے بھی جائز نہیں کہ وہ اپنے ساتھی سے اس اندیشہ سے جدا ہو جائے کہ وہ اس سے بیع ختم کرنے کی درخواست کرے گا (مشکوۃ حدیث ۲۸۰۴) اِسْتَقَالَه البیعَ کے معنی ہیں: بیع فسخ کرنے کی درخواست کرنا۔ باب استفعال طلب کے لئے ہے۔ اور درخواست اس صورت میں کی جاتی ہے جب معاملہ میں دوسرے فریق کا بھی کچھ دخل ہو۔ اور دوسرے کا دخل: پہلے کے اختیار ناقص کی دلیل ہے۔

[1] ایسا ہی اختلاف دو اور حدیثوں میں بھی ہوا ہے: (۱) حدیث مُصَرَّات۔ جیسا کہ آئندہ باب میں تفصیل آرہی ہے (۲) اگر کوئی شخص کسی کو عمداً قتل کرے تو مقتول کے ورثاء کو دو باتوں کا اختیار ہے: چاہیں تو قصاص لیں اور چاہیں تو دیت لیں (مشکوۃ حدیث ۳۴۵۷ کتاب القصاص) احناف کے نزدیک دیت لینے کا اختیار ناقص ہے یعنی قاتل کی رضامندی سے دیت لے سکتا ہے ۱۲

۳ ـــــ خیارِ مجلس کی روایت کے بنیادی راوی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ اور ان کا عمل بخاری شریف (حدیث ۲۱۱۶) میں یہ مروی ہے کہ انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ایک زمین کا سودا کیا۔ سودا مکمل ہوتے ہی ابن عمرؓ الٹے پاؤں لوٹے، اور گھر سے باہر نکل گئے تاکہ حضرت عثمانؓ سودا ختم نہ کردیں۔ ابن عمرؓ نے ایسا اس لئے کیا تھا کہ ان کو سودے میں فائدہ نظر آیا تھا۔ حالانکہ حدیث میں ایسا کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ اور یہ بات جائز نہیں کہ راوی خود اپنی روایت کردہ حدیث کے خلاف کرے۔ اس لئے اس خیار کو بابِ اخلاق سے قرار دینا زیادہ مناسب ہے۔

پھر اخلاقی معاملہ تفرقِ ابدان تک یا ایک بار اختر اختر کہنے پر ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے بعد بھی اس کے درجات ہیں۔ جیسے تین مرتبہ اختر اختر کہنے تک خیار کا باقی رہنا۔ درج ذیل دو روایتیں بھی اسی سلسلہ کی ہیں:

پہلی روایت ـــــ ترمذی نے یہ روایت کی ہے کہ دورانِ سفر ایک کشتی میں دو شخصوں نے شام کے وقت ایک گھوڑے کا سودا کیا۔ صبح گھوڑے کا مالک پشیمان ہوا۔ اس نے سودا ختم کرنا چاہا۔ دوسرا تیار نہ ہوا۔ حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ بھی کشتی میں تھے۔ آپ نے فرمایا: ''میرے خیال میں تم دونوں جدا نہیں ہوئے۔ پس ایک فریق معاملہ ختم کرسکتا ہے'' ـــــ حالانکہ شام سے صبح تک دونوں کا ساتھ ساتھ رہنا عقل باور نہیں کرتی۔ لامحالہ یہ مراد ہوگی کہ ابھی فریقین نے اپنے اپنے عوض سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اور وقت بھی زیادہ نہیں گذرا۔ پس اگر ایک فریق معاملہ ختم کرنا چاہتا ہے تو دوسرے کو تیار ہوجانا چاہئے۔

دوسری روایت ـــــ رسول اللہ ﷺ نے ایک اعرابی کو اونٹ بیچا۔ وہ اونٹ لے کر چلا گیا۔ ایک عرصہ کے بعد واپس آیا۔ اور کہنے لگا: یارسول اللہ! آپؐ نے مجھے پہچانا؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں تم وہی ہو جس نے مجھ سے اونٹ خریدا تھا؟!'' اس نے کہا: ہاں میں وہی ہوں اور اب مجھے سودا منظور نہیں۔ آپؐ نے اونٹ واپس لے لیا اور اس کی رقم لوٹادی۔ صدق اللہ تعالیٰ: ﴿وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ اور بیشک آپؐ اخلاق کے اعلیٰ پیمانہ پر ہیں (سورۃ القلم آیت ۴)

اور بڑے دو اماموں کے نزدیک: مذکورہ حدیث لانکاح إلا بولی کے قبیل کی ہے۔ اس حدیث سے بہ ظاہر یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ نکاح میں عورت کی مرضی کا کوئی دخل نہیں۔ حالانکہ دوسری روایت سے عورت کا بھی حق ثابت ہے۔ بلکہ اس کا حق ولی سے بھی زیادہ ہے۔ اسی طرح یہاں اس شخص سے خطاب ہے جن کا ساتھی تفرقِ ابدان سے پہلے سودا ختم کرنا چاہتا ہے۔ اس خطاب سے بھی بہ ظاہر یہی مفہوم ہوتا ہے کہ اگر دوسرا سودا ختم کرنا چاہے تو پہلے کا کچھ حق نہیں۔ حالانکہ اس کا حق ہے جیسا کہ یستقیلہ سے ثابت ہے۔ پس یہ انداز خطاب اس فریق کا تعاون ہے جو سودا ختم کرنا چاہتا ہے۔

رہا امر قاطع کا معاملہ: تو جس طرح تفرق ابدان امر قاطع ہوسکتا ہے اسی طرح ایجاب وقبول سے فراغ اور تعاطی بھی امر قاطع ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ اسی پر چاروں ائمہ کے نزدیک بیع تام ہوتی ہے۔ اور الفاظ اور الفاظ کے درمیان فرق کرنا اسی طرح لینے اور لینے کے درمیان فرق کرنا بھی آسان ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے۔

ملحوظہ: یہ جو عام خیال ہے کہ احناف خیار مجلس کی حدیث کو نہیں لیتے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس اخلاقی (استحبابی) حکم

کو فقہ کی کتابوں میں نہیں لیا گیا۔ اگر فقہاء اس حکم کو ـــــ جس درجہ کا بھی وہ ہے ـــــ فقہ کی کتابوں میں شامل کرتے تو یہ بدگمانی پیدا نہ ہوتی ـــــ اور تفرق سے تفرق اقوال مراد لینا خلاف ظاہر ہے۔

واعلم: أنه يجب في كل مبادلةٍ من أشياءَ: عاقدَين، وعوضَيْن، والشيئُ الذي يكون مظِنَّةً ظاهرةً لرِضا العاقدين بالمبادلة، وشيئٍ يكون قاطعًا لمنازَعتهما، موجِبًا للعقد عليهما.

ويُشترط في العاقدين: كونُهما حرين عاقلين، يعرفانِ النفعَ والضرر، ويباشرانِ العقدَ على بصيرة وتَثَبُّتٍ.

وفي العوضَين: كونهما مالاً يُنتفع به، ويرغَّب فيه، ويُشَحُّ به؛ غيرَ مباح، ولا مالا فائدةَ معتداً بها فيه، وإلا لم يكن مما شرع الله لخلقه، وكان عبثًا، أو مرعيا فيه فائدةٌ ضِمنيةٌ، لايذكرها في الظاهر.

وهذا أحدى المفاسد: لأن صاحبها على شَرَفِ أن لايجدَ مايريده، فيسكتَ على خَيْبَةٍ، أو يخاصم بغير حق توجَّهَ له عند الناس.

وفيما يُعرف به رِضا العاقدَين: أن يكونَ أمرًا واضحًا، يؤاخذ به على عيون الناس، ولايستطيع أن يَحيفَ إلا بحجةٍ عليه. وأوضحُ الأشياء في مثل ذلك: العبارة باللسان، ثم التعاطي بوجهٍ لايبقى فيه ريب.

قال صلى الله عليه وسلم: "المتبايِعان: كلُّ واحد منهما بالخيار على صاحبه، مالم يتفرَّقا، إلا بيعَ الخيار"

أقول: اعلم أنه لابد من قاطع يُميز حقَّ كلِّ واحد من صاحبه، ويرفعُ خيارَها في رد البيع؛ ولولا ذلك لأضر أحدُهما بصاحبه، ولتوقَّفَ كلٌّ عن التصرف فيما بيده، خوفاً أن يستقيلَها الآخر.

وههنا شيئ آخر: وهو اللفظ المعبِّرُ عن رِضا العاقدين بالعقد، وعزمِهما عليه، ولاجائز أن يُجعل القاطعُ ذلك: لأن مثلَ هذه الألفاظِ يستعمل عند التراوُض والمساوَمَة؛ إذ لا يمكن أن يتراوَضا إلا باظهار الجزم بهذا القدر؛ وأيضا: فلسان العامَّةِ في مثل هذا: تمثال الرغبةِ من قلوبهم، والفرقُ بين لفظٍ دون لفظ حرجٌ عظيم.

وكذلك التعاطي: فإنه لابد لكل واحد أن يأخذ ما يطلبه على أنه يشتريه، لينظر فيه، ويتأمله، والفرق بين أخذ وأخذ غير يسير.

ولاجائز أن يكون القاطعُ شيئًا غيرَ ظاهر، ولاأجلاً بعيداً، يومًا فما فوقَه: إذ كثير من السِّلَع إنما يطلب لِيُنْتفعَ به في يومه.

فوجب أن يُجعل ذلك: التفرُّقُ من مجلس العقد: لأن العادة جارية بأن العاقدين يجتمعان

للعقد، ويتفرقان بعد تمامه. ولو تفحَّصْتَ طبقاتِ الناس من العرب والعجم رأيتَ أكثَرَهم يرون ردَّ البيع بعد التفرق جورًا وظلمًا، لاقبلَه، اللّٰهم! إلا من غَيَّرَ فطرتَه. وكذلك الشرائع الإلٰهية لاتنزل إلا بماتقبله نفوسُ العامة قبولاً أوَّلِيًا.

ولما كان من الناس من يتسَلَّل بعد العقد، يرى أنه قد رَبِحَ، ويكره أن يستقيلَه صاحبُه، وفي ذلك قلب الموضوع، سجَّل النبي صلى الله عليه وسلم النهيَ عن ذلك، فقال:" ولايحل له أن يفارق صاحبَه، خشيةَ أن يستقيلَه" فوظيفتُهما أن يكونا على رِسلهما، ويتفرق كل واحد على عين صاحبه.

ترجمہ: اور جان لیں کہ ہر مبادلہ میں چند چیزیں ضروری ہیں: (۱) دولین دین کرنے والے (۲) دوعوض (۳) اور وہ چیز جو مبادلہ پر عاقدین کی رضامندی کی واضح احتمالی جگہ ہو (۴) اور وہ چیز جو دونوں کی منازعت ختم کرنے والی، دونوں پر عقد لازم کرنے والی ہو ـــــ اور شرط کیا گیا ہے عاقدین میں: دونوں کا آزاد (خودمختار) عقلمند ہونا، دونوں نفع ونقصان کو جانتے ہوں، اور دونوں بصیرت اور غور وفکر سے معاملہ کریں ـــــ اور عوضین میں: (۱) دونوں کا ایسا مال ہونا جس سے نفع اٹھایا جاتا ہو، اور ان کی ترغیب دی جاتی ہو، اور اس میں بخیلی کی جاتی ہو (۲) جو مباح نہ ہو (۳) اور نہ ایسی چیز ہو جس میں کوئی قابل لحاظ فائدہ نہ ہو، ورنہ وہ چیز ان چیزوں میں سے نہیں ہوگی جو اللہ نے اپنی مخلوق کے لئے جائز کی ہے، اور ہوگا عقد لاحاصل (۴) یا ملحوظ ہو اس میں کوئی ایسا ضمنی فائدہ جس کا بہ ظاہر تذکرہ نہ کیا جاتا ہو ـــــ اور یہ ایک خرابی ہے۔ اس لئے کہ عقد کرنے والے کو یہ خوف لگا رہتا ہے کہ وہ: وہ چیز نہ پائے جس کی اس نے امید باندھ رکھی ہے۔ پس وہ خاموش رہے محرومی کے ساتھ یا ایسے حق کے بغیر جھگڑے جو اس کے لئے لوگوں کے پاس متوجہ ہوا ہے ـــــ اور اس چیز میں جس کے ذریعہ دو معاملہ کرنے والوں کی خوشنودی پہچانی جاتی ہے یہ بات (شرط کی گئی ہے) ہے کہ وہ کوئی واضح امر ہو، جس کے ذریعہ وہ پکڑا جائے لوگوں کے روبرو، اور نہ طاقت رکھے وہ کہ ظلم کرے مگر اس کے خلاف دلیل کے ذریعہ۔ اور واضح ترین چیز اس طرح (کے معاملات) میں: زبان کی تعبیر یعنی قول ہے۔ پھر لینا اور دینا ہے اس طرح کہ معاملہ میں کوئی شک باقی نہ رہے۔

(حدیث کے بعد) میں کہتا ہوں: جان لیں کہ کوئی ایسا فیصلہ کن امر ضروری ہے جو ہر ایک کے حق کو اس کے ساتھی کے حق سے جدا کرے۔ اور دونوں کا بیع کو لوٹانے کا اختیار ختم کرے۔ اور اگر یہ چیز نہیں ہوگی تو ان میں سے ایک دوسرے کو ضرر پہنچائے گا۔ اور یقیناً ہر ایک ٹھہرا رہے گا اس چیز میں تصرف کرنے سے جو اس کے قبضہ میں ہے، اس اندیشہ سے کہ دوسرا بیع ختم کرنے کی درخواست کرے گا۔

اور یہاں ایک اور چیز ہے: اور وہ: وہ لفظ ہے جو ظاہر کرنے والا ہے معاملہ پر عاقدین کی رضامندی کو، اور اس پر دونوں کے پختہ ارادہ کو۔ اور نہیں جائز ہے کہ اس چیز کو فیصلہ کن امر بنایا جائے، اس لئے کہ اس قسم کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں مول تول اور بھاؤ تاؤ کرتے وقت۔ کیونکہ ممکن نہیں ہے کہ دونوں مول تول کریں مگر پختہ ارادہ ظاہر کرنے کے

ذریعہ اس مقدار پر۔ اور نیز: پس عوامی گفتگو اس قسم کے معاملات میں ان کی قلبی رغبت کا پیکر محسوس ہوتی ہے۔ اور لفظ اور لفظ کے درمیان فرق کرنے میں بڑا احرج ہے —— اور اسی طرح لینا اور دینا: پس بیشک ضروری ہے ہر ایک کے لئے کہ وہ اس چیز کو لے جس کا وہ خواہش مند ہے، بایں طور کہ وہ اس کو خریدے گا، تا کہ وہ اس میں دیکھے اور اس میں غور کرے۔ اور لینے اور لینے کے درمیان فرق کرنا آسان نہیں ہے —— اور نہیں جائز ہے کہ فیصلہ کن امر کوئی ایسی چیز ہو جو واضح نہ ہو، اور نہ لمبی مدت، ایک دن یا اس سے زیادہ۔ کیونکہ بہت سے سامان اس لئے طلب کئے جاتے ہیں کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے اس کے دن میں۔ پس ضروری ہے کہ وہ فیصلہ کن چیز مقرر کی جائے: مجلس عقد سے جدا ہونا۔ اس لئے کہ عادت جاری ہے کہ عاقدین عقد کے لئے اکٹھا ہوتے ہیں، اور تمامیتِ عقد کے بعد جدا ہوتے ہیں۔ اور اگر آپ عرب وعجم کے لوگوں کے طبقات کا جائزہ لیں تو ان میں سے اکثر کو دیکھیں گے کہ وہ جدا ہونے کے بعد بیع کے ختم کرنے کو ظلم وبجور سمجھتے ہیں، اس سے پہلے نہیں، اے اللہ! مگر جس نے اپنی فطرت بدل دی ہو۔ اور اسی طرح قوانین خداوندی نہیں نازل ہوتے مگر اس چیز کے ساتھ جس کو عوام کے دل پہلی ہی بار میں قبول کرلیں۔

اور جب لوگ معاملہ کرنے کے بعد کھسک جاتے تھے، دیکھتا تھا وہ کہ یقیناً اس نے نفع پایا، اور وہ ناپسند کرتا تھا کہ اس سے اس کا ساتھی بیع ختم کرنے کے لئے کہے، اور اس میں معاملہ برعکس ہوگیا تو نبی ﷺ نے اس کی قطعی طور پر ممانعت کردی۔ پس فرمایا:...... پس دونوں کا فرض منصبی یہ ہے کہ دونوں صبر وتوقف کریں۔ اور ہر ایک جدا ہو دوسرے کی نگاہوں کے سامنے۔

لغات: خاب (ض) خَيْبَةً: محروم رہنا، ناکام رہنا...... شَحَّ به: کسی چیز کے دینے میں کنجوسی کرنا...... تَثَبَّتَ تَثَبُّتًا: غور وفکر سے جاننا...... تَرَاوَضا: بھاؤ تاؤ کرنا...... تساوما: بھاؤ تاؤ کرنا مثلاً ایک کی جانب سے ایک قیمت کہی جائے اور دوسرے کی جانب سے اس سے کم کہی جائے۔

☆　☆　☆

پانچویں بات

تمدّن کی خوبی ذرائع معاش کی عمدگی اور تقسیم میں ہے

اور

تمدّن کی خرابی سامانِ تعیّش سے غیر معمولی دلچسپی میں ہے

اگر کسی مملکت میں مثال کے طور پر دس ہزار انسان بستے ہوں تو ضروری ہے کہ نظام حکومت ان کے ذرائع معاش سے بحث کرے۔ لوگوں کو اچھے اور ضروری ذرائع معاش اختیار کرنے کی ترغیب دے۔ اور برے ذرائع معاش سے

روکے۔ نیز کمائی کے طریقوں کی اس طرح تقسیم کرے کہ ضروریاتِ زندگی کا ٹوٹا نہ پڑے۔ کیونکہ اگر مملکت کے اکثر باشندے کاریگریوں اور سرکاری ملازمتوں کو ذریعۂ معاش بنالیں گے اور بہت تھوڑے لوگ مویشی پروری اور کھیتی باڑی کریں گے تو لوگوں کی دنیوی حالت خراب ہوجائے گی۔ لوگ ضروریاتِ زندگی کے لئے ترس جائیں گے۔ اور اگر لوگ شراب سازی اور صنم گری کو ذریعۂ معاش بنائیں گے تو یہ چیز لوگوں کے لئے ترغیب ہوگی کہ وہ شراب نوشی اور صنم پرستی کریں۔ پس لوگوں کی دینی حالت خراب ہوجائے گی۔ اور اگر کمائی کے ذرائع اور کمانے والوں کو حکمت کے تقاضے کے مطابق تقسیم کیا جائے گا، اور برے ذرائع معاش پر پابندی عائد کی جائے گی تو لوگوں کی حالت درست ہوگی۔

اسی طرح یہ امر بھی تمدن کی خرابی کا باعث ہے کہ امراء: زیورات، پوشاک، تعمیرات، خورد ونوش، عورتوں کے گداز پن اور ان کے مانند چیزوں میں دلچسپی لینے لگیں۔ ایسی دلچسپی جوان معاشی تدبیرات نافعہ سے بڑھی ہوئی ہو جن کے بغیر چارہ نہیں اور جن پر عرب وعجم کے لوگ متفق ہیں۔ جب یہ صورتِ حال پیدا ہوجائے گی تو لوگ مادی چیزوں میں تصرف کرنے کو ذرائع معاش بنالیں گے تاکہ عیش پرستوں کی خواہشات پوری ہوں۔ پس کچھ لوگ لونڈیوں کو گانے ناچنے اور لذیذ ودل پسند تھرکنے کی تعلیم دیں گے اور دوسرے: سونے کی حیرت انگیز ڈھلائی اور عمدہ ہیرا تراشی کریں گے اور کچھ لوگ: بلند عمارتوں اور ان کی نقاشی اور مصوری کریں گے۔ اور جب لوگوں کا جم غفیران چیزوں کو ذرائع معاش بنالے گا تو کاشتکاری اور تجارتیں رائگاں ہوجائیں گی۔

اور جب امراء ان چیزوں میں دولت خرچ کریں گے تو شہر کی دیگر مصلحتیں رائگاں ہوجائیں گی۔ اور یہ چیز ضروری ذرائع معاش کا اہتمام کرنے والوں پر مثلاً کاشتکاروں، بیوپاریوں اور کاریگروں پر تنگی اور ان پر ٹیکسوں کی بھرمار تک پہنچادے گی۔ تاکہ ان ٹیکسوں سے امراء عیش کریں۔ اور اس طرح مملکت تباہ ہوجائے گی۔ بڑوں سے یہ خرابی متوسط طبقہ میں منتقل ہوگی۔ پھر سب کو عام ہوجائے گی۔ اور یہ خرابی ایسی تیزی سے پھیلے گی جیسے ہڑک (جنونِ سگ) سگ گزیدہ میں پھیل جاتی ہے۔ اور یہ دنیوی خرابی کا بیان ہے۔ رہی سعادتِ اخروی کے اعتبار سے خرابی تو وہ محتاج بیان نہیں۔

اور یہ مرض روم وایران کے شہروں پر چھا گیا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ اس کا علاج مادۂ فساد کے ازالہ کے ذریعہ کیا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے غور کیا کہ یہ خرابیاں کہاں سے پیدا ہوتی ہیں۔ آپؐ نے دیکھا کہ ان کا سرچشمہ: گانے والی لونڈیاں، ریشم، بیش قیمت کپڑے اور سونے کی سونے کے بدل کمی بیشی کے ساتھ خرید وفروخت ہے تاکہ ان سے زیورات ڈھالے جائیں یا سونے کی اعلیٰ درجہ کی چیزیں تیار کی جائیں، اور ایسی ہی اور چیزیں۔ چنانچہ آپؐ نے ان سب چیزوں کی ممانعت کردی۔

واعلم: أنه إذا اجتمع عشرةُ آلافِ إنسانٍ – مثلاً – في بلدةٍ، فالسياسةُ المدنية تبحث عن مكاسبهم: فإنهم إن كان أكثَرُهم مكتسبين بالصِّناعات وسياسةِ البلدة، والقليلُ منهم

مكتسبين بالرعى والزِّراعة، فسد حالُهم فى الدنيا؛ وإن تكسَّبُوْا بِعُصَارة الخمر وصِناعة الأصنام، كان ترغيباً للناس فى استعمالها على الوجه الذى شاع بينهم، فكان سببًا لهلاكهم فى الدين؛ فإن وُزِّعت المكاسبُ وأصحابُها على الوجه المعروف الذى تُعطية الحكمةُ، وقُبض على أيدى المكتسبين بالأكساب القبيحة، صلُح حالُهم.

وكذلك: من مفاسد المدن أن يرغب عظماؤهم فى دقائق الحلى واللباس والبناء والمطاعم وغَيَدِ النساء ونحوِ ذلك، زيادةً على ما تعطيه الارتفاقاتُ الضرورية التى لابد للناس منها، واجتمع عليها عربُ الناس وعجمهم، فيكتسب الناسُ بالتصرف فى الأمور الطبيعية، ليتأتى منها شهواتُهم، فينتصبُ قومٌ إلى تعليم الجوارى للغناء والرقص والحركات المتناسبة اللذيذة؛ وأخرون: إلى الألوان المطرِبة فى الثياب، وتصوير صورِ الحيوانات والأشجارِ العجيبة والتخاطيط الغريبة فيها؛ وآخرون: إلى الصِّيَاغات البديعة فى الذهب والجواهر الرفيعة؛ وآخرون: إلى الأبنية الشامخة، وتخطيطِها وتصويرها؛ فإذا أقبل جمٌّ غفير منهم إلى هذه الأكساب أهملوا مثلَها من الزراعات والتجارات.

وإذا أنفق عظماءُ المدينة فيها الأموال: أهملوا مثلَها من مصالح المدينة، وجَرَّ ذلك إلى التضييق على القائمين بالأكساب الضرورية، كالزُّرَّاع والتُّجَّار والصُّنَّاع، وتضاعُفِ الضَّرائب عليهم؛ وذلك ضررٌ بهذه المدينة، يتعدّى من عضو منها إلى عضو، حتى يعمَّ الكل، ويتجارىٰ فيها كما يتجارَى الكَلَبُ فى بدن المَكْلُوْبِ؛ وهذا شرحُ تضررِهم فى الدنيا؛ وأما تضررُهم بحسب الخروج إلى الكمال الأخروى، فغنىٌّ عن البيان.

وكان هذا المرضُ قد استولى على مدن العجم، فنفث الله فى قلب نبيه صلى الله عليه وسلم أن يُدَاوِىَ هذا المرضَ بقطع مادَّتِه، فنظر رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى مظان غالِبيَّةٍ لهذه الأشياء، كالقَيْنَاتِ، والحرير، والقَسِّيِّ، وبيعِ الذهب بالذهب متفاضلاً لأجل الصِّيَاغاتِ، أو طبقاتِ أصنافه، ونحوِ ذلك. فنهى عنها.

ترجمہ: اور جان لیں کہ جب دس ہزار انسان ـــــ مثال کے طور پر ـــــ کسی شہر میں اکٹھا ہوں تو سیاستِ مدنیہ (نظام حکومت) ان کے ذرائع آمدنی سے بحث کرے گی۔ پس بیشک ان کے بیشتر اگر کاریگریوں اور شہر کے انتظام کے ذریعہ کمائی کرنے والے ہوں گے، اور ان میں سے تھوڑے مویشی پروری اور کھیتی باڑی کے ذریعہ کمائی کرنے والے ہوں گے تو

ان کی دنیوی حالت خراب ہوجائے گی۔اور اگر وہ کمائی کریں گے شراب نچوڑنے اور مورتیاں بنانے کے ذریعہ تو یہ چیز لوگوں کے لئے ترغیب ہوگی ان کے استعمال کرنے کی اس طور پر جوان کے درمیان رائج ہے۔پس یہ چیز دین میں ان کی ہلاکت کا باعث ہوگی۔پس اگر تقسیم کئے جائیں ذرائع معاش اور ان کو اختیار کرنے والے اس معروف طریقہ پر جو حکمتِ مدنیہ دیتی ہے، اور روک لگائی جائے قبیح ذرائع سے کمائی کرنے والوں پر تو ان کی حالت درست ہوگی۔

اور اسی طرح تمدن کی خرابیوں میں سے یہ بات ہے کہ بڑے لوگ: زیورات، پوشاک، تعمیرات، خورد ونوش، عورتوں کی نعومت اور ان کے مانند چیزوں کی باریکیوں میں رغبت کریں، اس سے زائد رغبت جو ضروری ارتفاقات کا تقاضا ہے، جن کے بغیر لوگوں کے لئے چارہ نہیں، اور جن پر عرب وعجم متفق ہیں، پس لوگ کمائی کرنے لگیں مادی چیزوں میں تصرف کرنے کے ذریعہ تاکہ ان سے بڑے لوگوں کی خواہشات پوری ہوں۔پس اٹھیں کچھ لوگ: باندیوں کو گانے ناچنے اور لذت آگیں دل پسند حرکتوں کی تعلیم دینے کے لئے، اور دوسرے: کپڑوں میں خوش کن رنگوں، اور حیوانات اور پسندیدہ درختوں کی تصویر کشی اور کپڑوں میں انوکھی ڈیزائنوں کے لئے، اور دوسرے: سونے اور قیمتی ہیروں میں حیرت انگیز ڈھلائیوں کے لئے، اور دوسرے: بلند عمارتوں اور ان میں مصوری اور نقاشی کے لئے۔تو جب ان کا جم غفیر ان ذرائع معاش کی طرف متوجہ ہوجائے گا تو وہ ان کے مانند کاشتکاریوں اور تجارتوں میں سے رائگاں کردیں گے۔

اور جب شہر کے بڑے لوگ ان چیزوں میں دولت خرچ کریں گے تو وہ شہر کے مصالح میں سے ان کے مانند کو رائگاں کردیں گے۔اور یہ چیز پہنچائے گی تنگی کرنے کی طرف ضروری ذرائع معاش کا اہتمام کرنے والوں پر، جیسے کاشتکار، تاجر اور کاریگر، اور ان پر ٹیکسوں کی بھرمار کرنے تک۔اور یہ اس شہر کا ضرر ہے وہ اس کے ایک عضو سے دوسرے عضو کی طرف متعدی ہوگا، یہاں تک کہ سب کو عام ہوجائے گا۔اور سرایت کرے گا وہ ضرر مملکت میں جس طرح کتّے کی دیوانگی سرایت کرتی ہے کتا کاٹے ہوئے کے جسم میں۔اور یہ دنیا میں ان کے نقصان پہنچنے کی وضاحت ہے۔اور رہا اخروی کمال کی طرف نکلنے کے اعتبار سے نقصان پہنچنا تو وہ بیان سے بے نیاز ہے —— اور یہ بیماری عجم کے شہروں پر چھا گئی تھی۔پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے دل میں ڈالا کہ وہ اس مرض کا علاج کریں اس کے مادہ کو ختم کرنے کے ذریعہ۔پس رسول اللہ ﷺ نے نظر ڈالی ان چیزوں کی غالب احتمالی جگہوں میں، جیسے گانے والی لونڈیاں اور ریشم اور قسّی کپڑے اور سونے کو سونے کے بدل کم وبیش بیچنا ڈھلائیوں کے لئے یا سونے کی اقسام کے اعلیٰ درجات کے لئے اور اس کے مانند چیزیں، پس آپؐ نے ان سے روک دیا۔

لغات: **غَیَد**: مصدر باب سمع۔مخطوطہ کراچی کے حاشیہ میں اس کا ترجمہ نعومت لکھا ہے...... **زیادۃ**: مفعول مطلق ہے یرغب کا تقدیر عبارت رغبۃ زائدۃ ہے (سندیؒ)...... **قَسّی** کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ ۲:۲۴۲

باب ــــــ ۲

ممنوع معاملات کا بیان

مَیسر اور ربوا کی کلی حرمت کی وجہ

وہ معاملہ جس میں کسی مال کا ملنا ایسی شرط پر موقوف ہو جس میں جوکھم ہو یعنی شرط کے پائے جانے کا بھی امکان ہو، اور نہ پائے جانے کا بھی: ایسا معاملہ میسر، قمار، مخاطرہ اور جُوا کہلاتا ہے۔ اور سٹّہ اور لاٹری وغیرہ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر: وہ معاملہ جو نفع وضرر کے درمیان دائر ہو یعنی یہ بھی احتمال ہو کہ بہت سا مال مل جائے اور یہ بھی کچھ نہ ملے جُوا ہے ـــــ اور ربوا کے لغوی معنی ہیں: زیادتی، اضافہ۔ اور اصطلاحی معنی ہیں: وہ رقم جو قرض لینے والا مقررہ شرط کے مطابق اصل قرض سے زائد ادا کرتا ہے ـــــ مَیسر اور ربوا میں اگرچہ کچھ فوائد بھی ہیں۔ مگر شریعت نے دونوں کو بالکلیہ حرام کیا ہے۔ کیونکہ ان کے مضرات بہت زیادہ ہیں: شاہ صاحب فرماتے ہیں:

جُوا: ایک باطل اور حرام معاملہ ہے۔ اس کے ذریعہ لوگوں کے اموال جھپٹ لئے جاتے ہیں۔ اور جوے کا مدار جہالت، لالچ، جھوٹی آرزو، اور فریب خوردگی کی پیروی پر ہے۔ یہی باتیں آدمی کو بازی لگانے پر ابھارتی ہیں۔ اور جوے کا تمدن اور باہمی تعاون میں کچھ حصہ نہیں ـــــ تمدن کی ترقی بنیادی ذرائع معاش کو ترقی دینے میں ہے۔ اسی سے لوگوں کو اسبابِ زندگی اور روزگار فراہم ہوتا ہے۔ نیز لوگوں کی بہبودی کمزوروں کو سہارا دینے میں، اور حاجت مندوں کی دستگیری میں ہے۔ اور جُوا کمزوروں کے خون کا آخری قطرہ بھی چوس لیتا ہے ـــــ اور جُوا ہارنے والا اگر خاموش رہتا ہے تو غصہ اور محرومی کے ساتھ خاموش رہتا ہے یعنی وہ خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ اور اگر دوسرے فریق سے جھگڑا کرتا ہے تو اس کی کوئی نہیں سنتا۔ کیونکہ وہ ایسے نقصان کے لئے جھگڑا کرتا ہے جو اس نے خود سر لیا ہے، اور جس میں وہ اپنے ارادہ سے داخل ہوا ہے۔ اور جو بازی پالیتا ہے وہ جوے کو خوشگوار معاملہ خیال کرتا ہے۔ اور آئندہ بڑی بازی لگاتا ہے۔ اور حرص وآز اس کو اس برائی سے باز نہیں آنے دیتے۔ مگر ایک دن اس پر بھی تباہی آکر رہے گی۔

اور قمار بازی کی جب عادت پڑ جاتی ہے تو آدمی اپنی ساری دولت لٹا دیتا ہے، لمبے چوڑے جھگڑوں میں پھنس کر رہ جاتا ہے اور تمدن کو ترقی دینے والے ضروری کام رائگاں ہو جاتے ہیں۔ اور جواری لوگوں کی معاونت سے اعراض کرتے ہیں جس پر تمدن کی بہبودی کا مدار ہے۔ عیاں راچہ بیان! مشاہدہ ان سب باتوں کی تصدیق کرے گا۔ کیا آپ نے کوئی قمار باز ایسا دیکھا ہے جس میں یہ باتیں نہ پائی جاتی ہوں!

اسی طرح سود بھی حرام اور باطل معاملہ ہے۔ سود: وہ رقم ہے جو قرض لینے والا مقررہ شرط کے مطابق اصل قرض کے

علاوہ ادا کرتا ہے۔ کیونکہ عام طور پر اس قسم کا قرض لینے والے مجبور مفلس لوگ ہوتے ہیں۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مقررہ وقت پر وہ لوگ قرض کی ادائیگی نہیں کر پاتے۔ پس وہ دُونے پے دُونا ہوجاتا ہے۔ جس سے پیچھا چھڑانا ناممکن ہوجاتا ہے۔ اور سودی کاروبار میں لمبے چوڑے مناقشات اور طویل مخاصمتوں کا بھی احتمال ہے۔

اور جب اس طرح زر سے زر پیدا کرنے کی ریت چل پڑتی ہے تو لوگ بنیادی ذرائع معاش: کھیتاں اور کاریگریاں چھوڑ دیتے ہیں۔ مثل مشہور ہے: جب روٹی ملے یوں تو کھیتی کرے کیوں! اور سود میں تین برائیاں تو سنگین ہیں: ایک: سود کے حساب میں بال کی کھال نکالی جاتی ہے۔ دوسری: سود کا پیسہ پیسہ وصول کیا جاتا ہے۔ ذرا رعایت نہیں کی جاتی۔ تیسری: سودی کاروبار میں سب سے زیادہ جھگڑے ہوتے ہیں۔

اور جُوا اور سود ایک طرح کا نشہ ہیں۔ جب ان کی لت پڑ جاتی ہے تو بچنا دشوار ہوجاتا ہے۔ اور کمائی کرنے کے یہ دونوں طریقے اُن ذرائع معاش کے سراسر خلاف ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لئے جائز کیا ہے۔ اور اس قسم کی چیزوں میں جن میں کچھ فائدے اور بڑے اندیشے ہوں: اختیار شریعت کا ہے کہ چاہے تو اس کے جواز کے لئے کوئی حد مقرر کرے: اس سے کم کی اجازت دے اور زائد کی سخت ممانعت کردے یا فوائد کو نظر انداز کر کے کلی ممانعت کردے۔

اور جُوا اور سود دونوں کا عربوں میں عام رواج تھا۔ اور ان کی وجہ سے ایسے بڑے مناقشات اور لڑائیاں کھڑی ہوئی تھیں جن کی کوئی نہایت ہی نہیں تھی۔ اور جب ان کا چسکا پڑ جاتا ہے تو آدمی تھوڑے پر صبر نہیں کرسکتا۔ زیادہ کی ہوس دامن گیر ہوجاتی ہے۔ اس لئے مناسب اور بہتر بات یہ تھی کہ دونوں میں جو قُبح وفساد ہے اس کو پیشِ نظر رکھا جائے اور ان کے برائے نام فوائد سے صرفِ نظر کرلی جائے۔ اور دونوں سے کلی طور پر روک دیا جائے۔

﴿البیوع المنھی عنھا﴾

اعلم: أن الـميسِـر سُحْتٌ باطلٌ، لأنه اختطافٌ لأموال الناس منهم، معتمَدٌ على اتباع جهلٍ وحرصٍ وأمنيةٍ باطلةٍ وركوبِ غَرَرٍ، تبعثه هذه على الشرط، وليس له دخلٌ فى التمدن والتعاون، فإن سكت المغبونُ سكت على غيظٍ وخيبةٍ، وإن خاصم خاصم فيما التزمه بنفسه، واقتحم فيه بقصده، والغابنُ يستلذُّه ويدعوه قليلُه إلى كثيرة، ولايَدَعُه حرصُه أن يُقْلِعَ عنه، وعما قليل تكون التِرَةُ عليه!

وفى الاعتياد بذلك إفساد للأموال ومناقشاتٌ طويلة، وإهمالٌ للارتفاقات المطلوبة، وإعراض عن التعاون المبنى عليه التمدن؛ والمعاينةُ يُغنيك عن الخبر، هل رأيتَ من أهل القمار إلا ماذكرناه؟

وكذلك الربا ـــــ وهو القرض على أن يؤدِّىَ إليه أكثرَ أو أفضلَ مما أخذ ـــــ سحتٌ باطل، فإن عامَّةَ المقترضين بهذا النوع هم المفاليس المضطرون، وكثيرًا ما لايجدون الوفاء عند الأجل فيصير أضعافا مضاعفة، لايمكن التخلص منه أبدا، وهو مظنةٌ لمناقشات عظيمة وخصوماتٍ مستطيرة.

وإذا جرى الرسم باستنماء المال بهذا الوجه أفضى إلى ترك الزِّراعات والصِّناعات التى هو أصول المكاسب، ولاشيئ فى العقود أشدَّ تدقيقاً واعتناءً بالقليل وخصومةً من الربا.

وهذانِ الكسبان بمنزلة السُكْر، مناقضان لأصل ما شرع الله لعباده من المكاسب، وفيهما قُبْحٌ ومناقشةٌ، والأمر فى مثل ذلك إلى الشارع: إما أن يَضرب له حدًا يُرَخِّصُ فيما دونه، ويُغَلِّظُ النهىَ عما فوقَه، أو يُصَدَّ عنه رأسا.

وكان الميسر والربا شائعين فى العرب، وكان قدحدث بسببهما مناقشات عظيمة لا انتهاءَ لها ومحاربات، وكان قليلُهما يدعو إلى كثيرهما، فلم يكن أصوبَ ولا أحقَّ من أن يُراعىٰ حكمُ القبحِ والفساد موفَّرًا، فَيُنهى عنهما بالكلية.

ترجمہ: وہ معاملات جن سے روکا گیا ہے: جان لیں کہ جُوا حرام باطل ہے۔اس لئے کہ وہ لوگوں کے اموال ان سے چھین لینا ہے۔(اوراس لئے کہ وہ) بھروسہ کئے ہوئے ہے جہالت اورلالچ اور باطل ارمان اورفریب پرسوار کرنے کی پیروی پر۔ابھارتی ہیں اس کو یہ صفات بازی لگانے پر۔اور جوے کا کچھ دخل نہیں مدنیت اورمعاونت میں۔پس اگر ہارنے والا خاموش رہتا ہےتو غصہ اورمحرومی کے ساتھ خاموش رہتا ہے۔اوراگر جھگڑا کرتا ہےتو اس نقصان میں جھگڑا کرتا ہے جس کواس نے بذاتِ خودسر لیا ہےاور جس میں وہ اپنے ارادے سے داخل ہوا ہے۔اور بازی جیتنے والا جوے کومزیدار سمجھتا ہے۔اوراس کاتھوڑااس کواس کے زیادہ کی طرف بلاتا ہے۔اورنہیں چھوڑتی اس کواس کی لالچ کہ وہ اس سے باز آئے۔اور بہت جلد پچھتاوااس پر پڑے گا ـــــ اوراس چیز (جوے) کی عادت بنالینے میں دولت کی بربادی اورطویل جھگڑے اورمطلوبہ ارتفاقات کورائگاں کرنا ہے۔اوراُس تعاون سے اعراض ہے جس پر تمدن کا مدار ہے۔اور مشاہدہ تجھ کواطلاع سے بے نیاز کردے گا۔کیا آپ نے قمار بازوں میں سے کسی کو دیکھا ہے،مگرویسا جوہم نے ذکر کیا؟!

اوراسی طرح سود ـــــ اورسودقرض دیناہےاس شرط پرکہ مقروض اس کواس سے زیادہ یابہتر ادا کرے جواس نے لیا ہے ـــــ حرام باطل ہے۔پس بیشک اس قسم کاقرض لینے والے مجبور مفلس لوگ ہوتے ہیں۔اور بارہاوہ ادائیگی نہیں کرپاتے مقررہ وقت پر۔پس سود چند در چند ہوجاتا ہے۔جس سے رستگاری کبھی بھی ممکن نہیں ہوتی۔اورسود بڑے مناقشات اور طویل مخاصمتوں کی احتمالی جگہ ہے ـــــ اور جب اس طرح مال بڑھانے کی ریت چل پڑتی ہےتو کھیتیوں اورکاریگریوں

کے چھوڑنے تک پہنچادیتی ہے جو کہ بنیادی پیشے ہیں۔اور معاملات میں کوئی چیز نہیں ہے باریکیاں نکالنے میں زیادہ سخت، اور تھوڑے کا اہتمام کرنے میں زیادہ اور جھگڑے کے اعتبار سے زیادہ سود سے —— اور یہ دونوں کمائیاں بمنزلہ نشہ ہیں۔ دونوں ان ذرائع معاش کی بنیاد کے سراسر خلاف ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لئے جائز کیا ہے۔اور دونوں میں قباحت اور مناقشہ ہے۔اور اس قسم کی چیز میں شارع کو اختیار ہے: یا تو وہ اس کے لئے کوئی حد مقرر کرے، اور جو اس حد سے کم ہو اس کی اجازت دے، اور جو اس سے زیادہ ہو اس کی سخت ممانعت کرے یا سرے سے اس سے روک دے۔

اور جوُا اور سود دونوں عرب میں رائج تھے۔اور ان کی وجہ سے ایسے بڑے مناقشات اور لڑائیاں پیدا ہوتی تھیں جن کی کوئی انتہا نہیں تھی۔اور ان دونوں کا تھوڑا ان کے زیادہ کی طرف بلاتا ہے۔پس نہیں تھا زیادہ درست اور نہ زیادہ حقدار اس سے کہ ملحوظ رکھا جائے قبح وفساد کا حکم کامل طور پر، اور ان دونوں سے کلی طور پر روک دیا جائے۔

☆ ☆ ☆

ربا کی قسمیں اور ان کی حرمت کی وجہ

ربا کی دو قسمیں ہیں: حقیقی (اصلی) ربا اور حقیقی پر محمول یعنی اس کے ساتھ ملحق کیا ہوا ربا:

حقیقی ربا: قرضوں میں ہوتا ہے۔زمانہ جاہلیت میں اسی ربا کا رواج تھا۔اور قرآن میں براہِ راست اس کی ممانعت کی گئی ہے۔

حرمت کی وجہ: حقیقی ربا کی حرمت کی وجوہ ابھی بیان کی جاچکی ہیں کہ یہ ربا موضوع معاملات کے خلاف ہے۔ معاملات میں فریقین کا فائدہ ملحوظ ہوتا ہے۔اور سودی قرض میں ایک ہی کا فائدہ ہوتا ہے۔زمانۂ جاہلیت میں اسی ربا کا چلن تھا۔لوگ اس میں بُری طرح پھنسے ہوئے تھے۔اور اس کی وجہ سے پھیلنے والی لڑائیاں شروع ہوگئی تھیں۔اور یہ ربا ایک طرح کا نشہ تھا، جس کا تھوڑا زیادہ کی طرف بلاتا تھا۔اس لئے ضروری ہوا کہ اس کا بالکلیہ سدّباب کردیا جائے۔چنانچہ اس کے بارے میں قرآن کریم میں سخت وعیدیں نازل ہوئیں اور اس کا قلع قمع کردیا گیا۔

دوسری قسم: زیادتی والا ربا ہے۔اور اس کی حرمت کی بنیاد یہ مشہور حدیث ہے:

حدیث —— حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سونے کی بیع سونے کے بدلے، اور چاندی کی چاندی کے بدلے، اور گیہوں کی گیہوں کے بدلے، اور جَو کی جَو کے بدلے، اور کھجور کی کھجور کے بدلے، اور نمک کی نمک کے بدلے: یکساں، برابر اور دست بدست ہونی چاہئے۔اور جب یہ اجناس مختلف ہوں تو جس طرح چاہو بیچو۔بشرطیکہ لین دین دست بدست ہو'' (رواہ مسلم، مشکوۃ حدیث ۲۸۰۸)

اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ جس نے زیادہ دیا یا زیادہ طلب کیا تو اس نے

سودی معاملہ کیا۔ اس میں لینے والا اور دینے والا برابر ہیں (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث ۲۸۰۹)

تشریح: مذکورہ اشیائے ستّہ میں سے اگر کسی جنس کا اسی جنس سے تبادلہ کیا جائے، مثلاً گیہوں کے بدلے گیہوں لئے جائیں تو دونوں عوض برابر اور دست بدست ہونے چاہئیں۔ کمی بیشی اور ادھار سود ہے۔ اور زیادتی ربا الفضل (زیادتی والا سود) ہے۔ اور ادھار ربا النسیئہ ہے۔ اور دونوں میں اضافت بیانیہ ہے یعنی یہ زیادتی اور ادھار ہی سود ہے ــــ البتہ اگر اجناس مختلف ہوں مثلاً: گیہوں کے بدلے جَو لئے جائیں تو کمی بیشی درست ہے۔ اب ربا الفضل کا تحقق نہ ہوگا۔ البتہ اب بھی لین دین دست بدست ضروری ہے، ورنہ ربا النسیئہ کا تحقق ہوگا۔

سوال: جب حقیقی ربا قرضوں والا ربا ہے۔ اور اشیائے ستّہ میں زیادتی حقیقی ربا کے ساتھ ملحق ہونے کی وجہ سے مجازاً ربا ہے تو اس کو ربا نہیں کہنا چاہئے۔ اس کی قباحت کے لئے یہ الحاق کافی ہے۔ جیسے حدیث میں علم دین حاصل کرنے کے لئے نکلنے کو فی سبیل اللہ کہا گیا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۲۲۰ کتاب العلم) مگر علم دین کی تحصیل کے لئے سفر کو 'جہاد' نہیں کہا جاتا۔ نہ جہاد والے فضائل اس کے لئے ثابت کئے جاتے ہیں۔ اس کی فضیلت کے لئے یہ الحاق ہی کافی ہے۔ اسی طرح اموالِ ربویہ میں ادھار معاملہ کو ربا النسیئہ کہا جاتا ہے۔ حالانکہ اس ربا کا درجہ زیادتی والے ربا کے بعد ہے۔ پس اس کو بھی ربا نہیں کہنا چاہئے۔ حالانکہ احادیث اور کتب فقہ میں دونوں کو ربا کہا گیا ہے۔ پس اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب: فضل (زیادتی) کو تغلیظ کے طور پر اور حقیقی سود کے مشابہ قرار دیتے ہوئے ربا کہا گیا ہے یعنی اس سے سختی سے روکنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے۔ جیسے لوگ نجومی کو کاہن کہتے ہیں۔ حالانکہ کاہن وہ ہے جو جنّوں سے باتیں معلوم کر کے آئندہ کی خبریں دیتا ہے۔ اور نجومی: علم نجوم کے ماہر (جوتشی) کو کہتے ہیں۔ مگر چونکہ نجومی بھی آئندہ کی باتیں بتلاتا ہے اس لئے اس کو کاہن کہتے ہیں۔

فائدہ: یہاں سے حدیث: لا ربا إلا فی النسیئۃ کے معنی بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ یہ بخاری کی حدیث (نمبر ۲۱۷۸) ہے۔ اس کا ترجمہ ہے: ربا صرف ادھار میں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اموالِ ربویہ میں فضل (زیادتی) سود نہیں۔ صرف ادھار سود ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ دھوکا لگا تھا۔ وہ دست بدست بیع کی صورت میں اتحاد جنس کی حالت میں بھی کمی بیشی کو جائز کہتے تھے۔ بعد میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے ان کی یہ غلط فہمی دور کی۔ بلکہ ربا النسیئہ کی قباحت ذہن نشین کرنے کے لئے حصر کیا گیا ہے کہ ادھار کو معمولی نہ سمجھا جائے یہی تو ربا ہے۔ اسی طرح ربا الفضل کی شناعت واضح کرنے کے لئے، حقیقی سود نہ ہونے کے باوجود اس پر سود کا اطلاق کیا گیا ہے۔

نوٹ: فضل کو مجازاً ربا کہنے کی یہ وجہ شروع میں تھی۔ بعد میں شریعت میں فضل پر (بلکہ ادھار پر بھی) اس کثرت سے ربا کا اطلاق ہونے لگا کہ یہ معنی بھی حقیقتِ شرعیہ بن گئے۔ یعنی اب شریعت میں یہ اطلاق مجازی نہیں، بلکہ حقیقی ہے (یہ فائدہ اور نوٹ کتاب میں ہیں)

دوسری قسم کے ربا کی حرمت کی وجہ: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو رفاہیتِ بالغہ یعنی بہت زیادہ بلند معیارِ زندگی پسند نہیں۔ کیونکہ جو شخص بہت اونچے معیار کی زندگی گذارے گا وہ طلبِ دنیا میں زیادہ منہمک ہوگا۔ اور اسی کے بقدر آخرت سے غافل ہوگا — اور اعلیٰ معیارِ زندگی کا تقاضا یہ ہے کہ ہر چیز بڑھیا سے بڑھیا اور اعلیٰ معیار کی استعمال کی جائے۔ گیہوں اعلیٰ قسم ہی کا کھایا جائے، کھجوریں اعلیٰ قسم ہی کی کھائی جائیں۔ سونا اور چاندی اعلیٰ معیار ہی کی استعمال کی جائے۔ جس کی عملی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ اگر اپنے پاس اعلیٰ درجہ کی چیز نہ ہو، بلکہ معمولی درجہ کی ہو، تو وہ زیادہ مقدار میں دیکر اس کے بدلے میں اعلیٰ درجہ کی چیز تھوڑی مقدار میں لے لی جائے۔ اور اس طرح زندگی کا اعلیٰ معیار برقرار رکھا جائے۔ اس لئے رفاہیتِ بالغہ کی یہ صورت امتِ مرحومہ کے لئے نبیٔ رحمت ﷺ کے ذریعہ یعنی وحیِ غیر متلو کے ذریعہ ممنوع قرار دی گئی۔ اور جنس واحد میں جیّد وردی کا تفاوت لغو کردیا۔ تاکہ ہر شخص جو کچھ اس کو میسر ہو اس پر قناعت کرے۔ اور رئیسانہ ٹھاٹ سے بچے۔ یہ خلاصہ ہے۔ اب تفصیل پڑھیں:

ربا الفضل کی تحریم کی وجہ: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رفاہیتِ بالغہ یعنی بہت زیادہ بلند معیارِ زندگی پسند نہیں فرماتے۔ جیسے ریشم کا لباس پہننا۔ کھانے پینے میں سونے چاندی کے برتن استعمال کرنا۔ اور سونے کا بڑا زیور جیسے کنگن، پازیب اور گلوبند پہننا۔ کیونکہ یہ سامانِ زندگانی: دنیا طلبی میں شب وروز انہماک، اسبابِ زندگی میں باریکیاں نکالنے اور ان میں گہرائی میں اترنے کا محتاج بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ اور دنیا میں اتنی مشغولی تباہ کن اور جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں پہنچانے والی ہے۔ اور لوگوں کے سوچ وچار کو دنیا کے ظلمانی تصورات کی طرف پھیرنے والی ہے۔

اور آسودگی کی حقیقت: ہر چیز اعلیٰ معیار کی چاہنا، اور ردی سے اعراض کرنا ہے۔ یعنی آسودہ حال کو اچھی چیز بھاتی ہے اور معمولی چیز پسند نہیں آتی۔

اور انتہائی درجہ کی آسودگی: ایک ہی جنس میں جید اور ردی کا اعتبار کرنا ہے یعنی مثال کے طور پر اعلیٰ درجہ ہی کا گیہوں کھایا جائے، معمولی درجہ کے گیہوں کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔

اور اس کی تفصیل: یہ ہے کہ اشیائے خوردنی میں سے کسی نہ کسی خوراک کے ذریعہ زندگی بسر کرنے کا سامان کرنا، اور نقد (سونے چاندی) میں سے کسی نہ کسی نقد کو اپنانا ضروری ہے۔ ان کے بغیر زندگی کا پہیّا نہیں گھوم سکتا۔ مگر تمام اشیائے خوردنی اور تمام نقود کی طرف حاجت یکساں ہے۔ کوئی خاص خوراک اور نقد ضروری نہیں —— البتہ دو مختلف چیزوں میں مبادلہ ناگزیر ہے۔ یہ چیز ارتفاقات کی بنیادوں میں سے ہے (تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ ۱: ۴۵۵) مگر ایک چیز کا تبادلہ دوسری ویسی ہی چیز سے — جو اس کا کام کرتی ہو — ضروری نہیں ہے۔ مگر بایں ہمہ لوگوں کے مزاجوں اور عادتوں کے اختلاف نے واجب کیا کہ اسبابِ زندگی کے حصول میں لوگوں کے درجات مختلف ہوں۔ جیسے سورۃ الزخرف آیت ۳۲ میں ارشاد فرمایا ہے: ”ہم نے ان کے درمیان ان کا سامانِ زندگانی دنیوی زندگی میں بانٹا ہے۔ اور ہم نے بلند کیا ہے ان کو ایک

دوسرے پر درجات میں تا کہ ان کا ایک دوسرے سے کام لیتا رہے" یعنی کوئی غنی ہے کوئی فقیر۔ اور غنی چاول اور گیہوں کھاتا ہے اور سونے کا زیور پہنتا ہے۔ اور فقیر جَو اور مکئی کھاتا ہے اور چاندی کا زیور پہنتا ہے، اس لئے اگر غنی کے پاس جَو اور چاندی ہے تو اس کو ضرورت ہے کہ اس کو گیہوں اور سونے سے بدلے، تا کہ اس کا معیار زندگی برقرار رہے۔ اور فقیر کے پاس گیہوں اور سونا ہے تو اس کو بھی ضرورت ہے کہ جَو اور چاندی سے بدلے، تا کہ زیادہ دنوں تک اس کا کام چلے۔ پس غیر جنس سے تبادلۂ اشیاء کی ضرورت ہے۔

مگر مثال کے طور پر چاول اور گیہوں کی انواع میں امتیاز کرنا اور ان میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دینا یعنی اعلی قسم ہی کا گیہوں کھانا، اسی طرح سونے میں باریک باتوں کا اور اس کی معدنی حالت کے درجات (CARATS) کا اعتبار کرنا: تو یہ مُسرفین اور اعاجم کی عادت ہے۔ اور اُن چیزوں میں دور تک جانا دنیا کی گہرائی میں اترنا ہے۔ پس مصلحتِ خداوندی نے فیصلہ کیا کہ اس کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ چنانچہ ہم جنس میں زیادتی اور ادھار کو حرام کر دیا۔ اور جید وردی کا تفاوت لغو کر دیا۔

فائدہ: اگر کسی واقعی ضرورت سے ہم جنس سے تبادلہ کی ضرورت پیش آئے۔ مثلاً ایک کسان کے پاس معمولی گیہوں ہے، اور اس کو بونے کے لئے عمدہ گیہوں درکار ہے، اور وہ جید اور ردی کا تفاوت بھی ملحوظ رکھنا چاہتا ہے تو اس کی راہ یہ ہے کہ دو بیعیں کی جائیں۔ وہ اپنے معمولی گیہوں نقد کسی کو بیچ دے پھر اس رقم سے عمدہ گیہوں خرید لے، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

فائدہ: حدیث **جیدها وردیئها سواء** ثابت نہیں۔ مگر اس کا مضمون صحیح احادیث سے ثابت ہے (نصب الرایہ ۴: ۳۷)

فائدہ: شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک سونے کا بڑا زیور عورتوں کے لئے جائز نہیں۔ اس کی تفصیل آگے **اللباس والزينة والأواني ونحوها** کے عنوان کے تحت آئے گی۔ جمہور کے نزدیک بڑا زیور بھی جائز ہے۔ کما مر فی رحمۃ اللہ (۲: ۲۴۲)

واعلم: أن الربا على وجهين: حقيقي ومحمولٌ عليه:

أما الحقيقي: فهو في الديون، وقد ذكرنا: أن فيه قلبًا لموضوع المعاملات، وأن الناس كانوا منهمكين فيه في الجاهلية أشد انهماك، وكان حدث لأجله محاربات مستَطِيرةٌ، وكان قليلُه يدعو إلى كثيره، فوجب أن يُسَدَّ بابُه بالكلية، ولذلك نزل في القرآن في شأنه ما نزل.

والثاني: ربا الفضل: والأصل فيه الحديثُ المستفيض: " الذهب بالذهب، والفضة بالفضة، والبُرُّ بالبر، والشعير بالشعير، والتمر بالتمر، والملح بالملح: مِثْلاً بِمِثْلٍ، سواءً بسواء، يدًا بيدٍ، فإذا اختلفت هذه الأصناف فبيعوا كيف شئتم، إذا كان يدًا بيدٍ".

وهو مسمىً بالربوا تغليظا وتشبيهًا له بالربا الحقيقي على حدِّ قولِه عليه السلام: " المنجِّم كاهن" وبه يُفهم معنى قوله صلى الله عليه وسلم: " لاربًا إلا في النَّسِيْئَةِ"

ثم كثُر فى الشرع استعمالُ الربا فى هذا المعنى حتى صار حيقيقةً شرعيةً فيه أيضًا، والله أعلم.

وسِرُّ التحريم: أن الله تعالى يكره الرفاهية البالغة، كالحرير، والارتفاقاتِ الْمُحْوِجَةِ إلى الإمعان فى طلب الدنيا، كآنية الذهب والفضة، وحُلِيٍّ غيرِ مُقَطَّعٍ من الذهب، كالسِوَار والخلخال والطوق؛ والتدقيقِ فى المعيشة، والتعمُّقِ فيها، لأن ذلك مُرْدٍ لهم فى أسفل السافلين، صارفٌ لأفكارهم إلى ألوانٍ مظلمة.

وحقيقة الرِّفاهية: طلب الجيد من كل ارتفاق، والإعراضُ عن رديئه. والرفاهية البالغة: اعتبار الجَودةِ والرداءة فى الجنس الواحد.

وتفصيل ذلك: أنه لابد من التعيُّش بقوتٍ مَّا من الأقوات، والتمسُّكِ بنقدٍ مَّا من النقود، والحاجةُ إلى الأقوات جميعِها واحدةٌ، والحاجةُ إلى النقود جميعِها واحدةٌ، ومبادلةُ إحدى القبيلتين بالأخرى من أصول الارتفاقات التى لابد للناس منها، ولاضرورةَ فى مبادلة شيئ بشيئ يكفى كفايتَه، ومع ذلك فأوجب اختلافُ أمزجتهم وعاداتهم أن تتفاوت مراتبهم فى التعيُّش، وهو قوله تعالى: ﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيْشَتَهُمْ فِى الْحَيَاةِ الدُّنْيَا، وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا﴾ فيكون منهم من يأكل الأَرُزَّ والحنطة، ومنهم من يأكل الشعير والذُّرَةَ، ويكون منهم من يتحلى بالذهب، ومنهم من يتحلى بالفضة.

وأما تَمَيُّزُ الناس فيما بينهم بأقسام الأَرُزِّ والحنطة مثلاً، واعتبارُ فضل بعضِها على بعض، وكذلك اعتبار الصِّناعات الدقيقة فى الذهب، وطبقاتِ عِيَارِه، فمن عادة المسرفين والأعاجم، والإمعانُ فى ذلك تعمُّقٌ فى الدنيا، فالمصلحةُ حاكمةٌ بسدِّ هذا الباب.

ترجمہ: اور جان لیں کہ سود کی دو قسمیں ہیں: حقیقی اور اس پر لادا ہوا —— رہا حقیقی: تو وہ قرضوں میں ہے۔ اور ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ (۱) اس میں معاملات کے موضوع کو الٹ دینا ہے (۲) اور یہ کہ لوگ زمانۂ جاہلیت میں اس میں بری طرح منہمک تھے (۳) اور اس کی وجہ سے پھیلنے والی لڑائیاں پیدا ہوئی تھیں (۴) اور اس کا تھوڑا اس کے زیادہ کی طرف بلاتا تھا۔ پس ضروری ہوا کہ اس کا دروازہ بالکلیہ بند کر دیا جائے۔ اور اس وجہ سے قرآن میں اس کے بارے میں نازل ہوا جو نازل ہوا۔

اور دوسری قسم: عوض سے خالی زیادتی والا سود ہے۔ اور بنیاد اس میں مشہور حدیث ہے............ (سوال کا جواب) اور وہ زیادتی ربا نام رکھی گئی ہے تغلیظ کے طور پر اور اس کو ربوا حقیقی کے ساتھ مشابہ ٹھہراتے ہوئے۔ آپ ﷺ کے ارشاد کے انداز پر کہ ''نجومی کاہن ہے'' (یہ حدیث نہیں ہے۔ مجمع البحار مادہ کھن میں ہے: والعرب تُسمی العالم النحرير

كاهنا، ومنهم من يسمى المنجم والطبيب كاهنًا) ـــــ (فائدہ) اوراس سے سمجھے جاتے ہیں آپ ﷺ کے ارشاد کے معنی کہ ’’سود نہیں ہے مگر ادھار میں‘‘ ـــــ (نوٹ) پھر شریعت میں اس معنی (زیادتی) میں ربا کا استعمال بکثرت ہونے لگا۔ یہاں تک کہ لفظ ربا اس معنی میں بھی حقیقتِ شرعیہ بن گیا۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

اور ربا الفضل کو حرام کرنے میں راز: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انتہائی درجہ کی عیش کوشی کو ناپسند کرتے ہیں۔ جیسے ریشم اور وہ سامانِ معیشت جو محتاج بنانے والا ہے دنیا طلبی میں گہرائی میں اترنے کی طرف، جیسے سونے اور چاندی کے برتن اور ٹکڑے ٹکڑے نہ کیا ہوا سونے کا زیور، جیسے کنگن اور پازیب اور گلوبند، اور سامانِ زندگی میں باریکیاں نکالنے کی طرف اور اس میں گہرائی میں اترنے کی طرف۔ اس لئے کہ یہ چیزیں گرانے والی ہیں لوگوں کو اسفل السافلین میں۔ اور ان کے افکار کو تاریک رنگوں کی طرف پھیرنے والی ہیں۔

اور آسودگی کی حقیقت: ہر سامانِ زندگی میں سے عمدہ کی تلاش اور اس کے نکمّے سے روگردانی ہے۔ اور انتہائی درجہ کی آسودگی: ایک جنس میں عمدہ اور نکمّے کا لحاظ کرنا ہے ـــــ اور اس کی تفصیل: یہ ہے کہ اشیائے خوردنی میں سے کسی بھی خوراک کے ذریعہ زندگی گذارنے کا سامان کرنا اور نقود میں سے کسی بھی نقد سے چمٹنا ضروری ہے۔ اور حاجت تمام اشیائے خوردنی کی طرف ایک ہے۔ اور حاجت سبھی نقود کی طرف ایک ہے۔ اور دوقبیل کی ایک چیز کا تبادلہ دوسری کے ساتھ اُن ارتفاقات کے اصول میں سے ہے جن سے لوگوں کے لئے چارہ نہیں۔ اور کچھ ضرورت نہیں ایک چیز کے تبادلہ میں دوسری ایسی چیز سے جو اسی کا کام کرتی ہے۔ اور معہذا واجب کیا لوگوں کے مزاجوں اور ان کی عادتوں کے اختلاف نے کہ متفاوت ہوں ان کے درجات اسباب زندگی کی تحصیل میں۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:......پس لوگوں میں سے بعض چاول اور گیہوں کھاتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض جو اور مکئی کھاتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض سونے کا زیور پہنتے ہیں اور ان میں سے بعض چاندی کا زیور پہنتے ہیں ـــــ اور رہا لوگوں کا جدا ہونا آپس میں چاول اور گیہوں ـــــ بطور مثال ـــــ کی اقسام کے ذریعہ، اور ان میں سے بعض کی بعض پر ترجیح کا اعتبار کرنا، اور اسی طرح سونے میں باریکیوں کا اور ان کی معدنی حالت کے درجات کا اعتبار کرنا: تو وہ فضول خرچی کرنے والوں اور عجمیوں کی عادتوں میں سے ہے۔ اور ان میں دور تک جانا دنیا میں گہرا اترنا ہے۔ پس مصلحت فیصلہ کرنے والی ہے اس دروازے کو بند کرنے کا۔

لغات: الـمُحْوِجة (اسم فاعل مؤنث) أَحْوَجَ فلاناً: محتاج بنا دینا......مُرْدٍ (اسم فاعل آخر سے ی محذوف ہے) أَرْدَى فلانا: گرانا......تَعَيَّشَ تَعَيُّشًا: اسبابِ زندگی کے حصول کی کوشش کرنا......سُخْرِيا: خدمت گار، تابعدار سَخَرَ فلاناً سُخْرِيا: بیگار لینا، کسی سے جبراً کام لینا......عِيَارُ النقود: سکّہ کی خالص معدنی مقدار...... التدقيق اور التعمق کا عطف الإمعان پر ہے۔

☆ ☆ ☆

اشیاءِ ستّہ میں ربا کی علت اور اس کی وجہ

علت: حکم شرعی میں ملحوظ وہ وصف ہے جو اپنے جلو میں کثرت کو لئے ہوئے ہو، اور حکم اس وصف پر دائر ہو یعنی جہاں وصف پایا جائے حکم بھی پایا جائے۔ اور جہاں وصف منتفی ہو حکم بھی مرتفع ہو جائے — تمام محققین کے نزدیک نصوص معلَّل بعلّت ہیں یعنی قرآن وحدیث میں جو بھی حکم مذکور ہوتا ہے اس کی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے، خواہ نص میں وہ علت مذکور ہو یا نہ ہو (تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ ۲: ۱۴۳)

چنانچہ اشیاءِ ستّہ میں ربا کی جو حدیث ابھی گذری ہے وہ بھی تمام مجتہدین کے نزدیک معلّل بعلّت ہے۔ اور ربا کا حکم اُن چیزوں میں بھی جاری ہوتا ہے جن میں وہ علت پائی جاتی ہے۔ پھر اس میں اتفاق ہے کہ سونے اور چاندی کی علت الگ ہے، اور باقی چار چیزوں کی الگ۔ مگر علت نکالنے میں اختلاف ہوا ہے۔

احناف اور حنابلہ کے نزدیک سونے اور چاندی میں علت: وزن یعنی موزونی چیز ہونا ہے۔ جو بھی چیز تولی جاتی ہے وہ سونے چاندی کے حکم میں ہے۔ جیسے زعفران، لوہا، تانبا، پیتل وغیرہ۔ بلکہ اب تو بیشتر اشیاء موزونی ہیں —— اور شافعیہ و مالکیہ کے نزدیک علت: ثمنیت ہے یعنی ایسی چیز ہونا جس کو اللہ تعالیٰ نے معاملات میں ثمن (وسیلہ) بننے کے لئے پیدا کیا ہے۔ ایسی چیزیں دو ہی ہیں: سونا اور چاندی۔ پس یہ علت ان دو کے ساتھ خاص ہوگی۔

اور باقی چار چیزوں میں علت:

احناف اور حنابلہ: کے نزدیک کَیل یعنی مکیلی ہونا ہے۔ جو بھی چیز پیمانے سے ناپی جاتی ہے وہ اصنافِ اربعہ کے حکم میں ہے۔ خواہ وہ مطعوم ہو یا غیر مطعوم، جیسے چاول، چنا، مکئی، بنولے اور برسین کے بیج وغیرہ۔ اور معدودات (جو گن کر فروخت کی جاتی ہیں) اور مزروعات (جو گز وغیرہ سے ناپ کر فروخت کی جاتی ہیں) ربوی اشیاء نہیں ہیں۔

اور شافعیہ کے نزدیک علت: طُعم (کھانے کی چیز) ہونا ہے۔ اور طعم میں ان کے نزدیک تین چیزیں شامل ہیں: اول: مطعومات یعنی وہ چیزیں جو غذا بننے کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ گیہوں اور جَو اس کی مثالیں ہیں۔ اور چاول، چنا اور مکئی وغیرہ اس کے ساتھ ملحق ہیں۔ دوم: فواکہ (پھل) کھجور اس کی مثال ہے اور کشمش، انجیر وغیرہ اس کے ساتھ ملحق ہیں۔ سوم: مُصلحات یعنی وہ چیزیں جو طعام یا جسم کی اصلاح کرتی ہیں۔ نمک اس کی مثال ہے۔ اور تمام ادویہ اور مسالے اس کے ساتھ ملحق ہیں۔

اور مالکیہ کے نزدیک:

(۱) صرف ربا النسیئہ کے لئے طعام میں علت: مطعوم ہونا ہے، بشرطیکہ وہ چیز دوا کے طور پر نہ کھائی جاتی ہو، خواہ وہ مطعوم اقتیات وادّخار کے قابل ہو یا نہ ہو، جیسے ککڑی، خربوزہ، نارنجی، لیموں اور گاجر وغیرہ کو دست بدست بیچنا ضروری

ہے —— اور فواکہ کی جملہ انواع جیسے سیب اور کیلے وغیرہ کو بھی دست بدست فروخت کرنا ضروری ہے۔ ادھار بیچنا سود ہے۔ البتہ ان میں ربا الفضل متحقق نہیں ہوگا، پس کمی بیشی جائز ہے۔

(۲) اور ربا الفضل اور ربا النسیئہ دونوں کے تحقق کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں: ایک: طعام کا مُقتات ہونا یعنی عموماً انسان اُن کو کھاتے ہوں، اور صرف اُن پر گذر بسر کیا جاسکتا ہو۔ دوسری چیز: طعام کا ادّخار کے قابل ہونا یعنی عرصہ تک رکھنے سے وہ چیز خراب نہ ہو —— جہاں یہ دونوں چیزیں (اقتیات وادخار) پائی جائیں گی وہاں دونوں ربا متحقق ہوں گے۔ پس نہ کم وبیش فروخت کرنا درست ہے نہ ادھار۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے مالکیہ والی علت اختیار کی ہے، اور اس کی حکمت بیان کی ہے۔ اور شافعیہ نے جو نمک کو مصلحات کی مثال قرار دیا ہے اور ادویہ اور مسالوں کو اس کے ساتھ ملحق کیا ہے اس پر رد کیا ہے۔ اور شوافع نے جو کھجور کو فواکہ کی مثال قرار دیا ہے اور انجیر وغیرہ کو اس کے ساتھ ملحق کیا ہے: اس پر بھی آخر میں رد کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

پھر مجتہدین نے یہ بات سمجھی کہ حرام سود ان چھ چیزوں کے علاوہ میں بھی جاری ہوتا ہے جن کی حدیث میں صراحت کی گئی ہے (یہ جمہور کی تعبیر ہے) اور یہ بات سمجھی کہ سود کا حکم ان چیزوں کی طرف بھی متعدی ہوتا ہے جو اشیاءِ ستّہ میں سے کسی کے ساتھ ملحق ہیں (یہ شوافع کی تعبیر ہے) پھر ان میں علت کے سلسلہ میں اختلاف ہوا۔ اور شریعت کے قوانین سے ہم آہنگ بات یہ ہے کہ سونے چاندی میں علت: ثمنیت ہو۔ اور یہ علت ان دونوں کے ساتھ خاص ہو۔ اور باقی چار چیزوں میں علت: وہ طعام ہو جو اقتیات وادخار کے قابل ہے —— اور نمک پر ادویہ اور مسالوں کو قیاس نہ کیا جائے، کیونکہ کھانے میں نمک کی جیسی حاجت ہے ویسی حاجت کسی اور چیز کی نہیں، بلکہ اس کا دسواں حصہ بھی نہیں۔ پس نمک روزی کا جزء ہے، بلکہ وہ بذاتِ خود طعام ہے۔ اور ادویہ اور مسالوں کی یہ حالت نہیں۔

اور سونے چاندی میں ثمنیت کو علت بنانے کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے احکام میں ثمنیت کا لحاظ کیا گیا ہے۔ جیسے بیع صرف میں مجلس عقد میں دونوں عوضوں کو ہاتھ میں لے کر قبضہ کرنا ضروری ہے۔ تعیین کافی نہیں۔ اور دیگر ربوی چیزوں میں محض تعیین قبضہ کے لئے کافی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ عوضین کا نقد ہونا ہے۔

اور باقی چار چیزوں میں علت: ایسا طعام ہونا ہے جو روزی بننے اور ذخیرہ کرنے کے قابل ہو کیونکہ ایک حدیث میں اِن چاروں کو لفظ طعام سے تعبیر کیا ہے۔ پس وہی علت ہے۔ وہ حدیث یہ ہے:

حدیث —— حضرت مَعمر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کرتا تھا:

الطعام بالطعام مِثْلاً بِمِثْلٍ: کھانا کھانے کے بدل مساوی بیچو (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث ۲۸۱۱)

اورعرفِ عام میں ''طعام'' دو معنی میں مستعمل ہے: ایک: گیہوں۔ مگر یہ معنی یہاں دلالتِ عقل سے مراد نہیں۔ دوسرے: روزی کے طور پر کھانے کی کوئی بھی چیز جو ذخیرہ کی جاسکتی ہو۔ اور یہی معنی یہاں مراد ہیں۔ پس اس حدیث سے چار

چیزوں میں ''طعام'' کا علت ہونا ثابت ہوا۔

اور لوگ طعام کو فواکہ اور مسالوں کی مقابل قسم قرار دیتے ہیں۔ اور جب اس کو اس حدیث میں چاروں اصناف کی علت بنایا گیا ہے تو اب اس کی مقابل قسم کو علت بنانا درست نہیں (یہ تمر اور نمک میں شافعیہ کی تعلیل کا جواب ہے)

فائدہ: شاہ صاحب قدس سرہ نے احناف اور حنابلہ کی تعلیل سے تعرض نہیں کیا۔ اور آپ نے سونے چاندی کی علت: جو ثمنیت تجویز کی ہے اس میں غور طلب بات یہ ہے کہ جب ثمنیت: سونے چاندی کے ساتھ خاص علت ہے تو اس تعلیل کا فائدہ کیا؟ تعلیل تو حکم کے تعدیہ کے لئے ہوتی ہے۔ پس اس سے بہتر ''وزن'' کو علت بنانا ہے۔ کیونکہ لوہے تانبے وغیرہ کی طرف اس کا تعدیہ ہوتا ہے۔ اور ایک متفق علیہ روایت میں ''وزن وکیل'' کے علت ہونے کی طرف اس سے زیادہ واضح اشارہ موجود ہے۔ وہ روایت یہ ہے:

حدیث —— حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ایک صاحب کو عامل بنا کر خیبر بھیجا۔ وہاں سے وہ عمدہ کھجوریں لائے۔ آپؐ نے دریافت کیا: ''کیا خیبر میں سب ایسی ہی عمدہ کھجوریں ہوتی ہیں؟'' ان صاحب نے کہا: نہیں! بلکہ ہم عمدہ کھجوروں کا ایک صاع معمولی کھجوروں کے دو صاع سے، اور دو صاع تین صاع سے بدل لیتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: لاتفعل، بِعِ الْجَمْعَ بالدراهم، ثم ابْتَعْ بالدراهم جَنِيبًا: ایسا نہ کرو، مخلوط کھجوریں دراہم کے عوض بیچ دو، پھر دراہم سے عمدہ کھجوریں خرید لو۔ وقال: '' فی المیزان مثلُ ذلك'' اور فرمایا: ترازو میں بھی ایسا ہی کرو (مشکوۃ حدیث ۲۸۱۳) یعنی کھجوروں میں جید وردی کا تفاوت ظاہر کرنے کا جو طریقہ بیان کیا گیا ہے کہ دو بیعیں کی جائیں، یہی طریقہ موزونی چیزوں میں بھی ہے، اگر ان میں جید وردی کا تفاوت ظاہر کرنا ہو، تو دو بیعیں کی جائیں اور میزان کے تقابل سے واضح ہوا کہ کھجوریں مکیلی ہیں۔ پس اس حدیث سے ربا کی دونوں علتیں: کیل و وزن ثابت ہوئیں۔

اور یہی بات جو اس حدیث سے اشارۃً مفہوم ہوتی ہے: مستدرک حاکم (۴۳:۲) کی ایک روایت میں صراحۃً مروی ہے، گو وہ روایت ضعیف ہے مگر تائید کے لئے کافی ہے۔ وہ روایت یہ ہے:

حدیث —— حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سنایا: التمر بالتمر، والحنطة بالحنطة، والشعير بالشعير، والذهب بالذهب، والفضة بالفضة: يدًا بيدٍ، عينا بعين، مِثْلا بمثل، فمن زاد فهو ربا، ثم قال: كذلك مايكال ويوزن أيضا یعنی مذکورہ پانچ چیزوں کا جو حکم ہے وہی تمام مکیلات وموزونات کا ہے۔

نوٹ: شاہ صاحب کے لفظ تفطّن سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ یہ علّتیں مجتہدین کی نکالی ہوئی ہیں۔ یہ علّتیں منصوص ہیں جیسا کہ مذکورہ روایات سے واضح ہے۔

وتَـفَطَّنَ الفقهاءُ: أن الربا المحرَّمَ يجرى فى غير الأعيان الستة المنصوص عليها، وأن

الحكم متعدٍ منها إلى كلِّ مُلْحقٍ بشيئ منها.

ثـم اختلـفوا فى العلة، والأوفق بقوانين الشرع: أن تكون فى النقدين: الثمنية، وتختص بهـما، وفى الأربعة: الْمُقْتَاتُ الْمُدَّخَرُ؛ وأن الملح لايقاس عليه الدواءُ والتوابلُ، لأن للطعام إليـه حـاجة ليسـت إلى غيره، ولا عُشْرَ تلك الحاجة، فهو جزءُ القوت، وبمنزلة نفسه، دون سائر الاشياء.

وإنما ذهبنا إلى ذلك: لأن الشرع اعتبر الثمنية فى كثير من الأحكام، كوجوب التقابض فى الـمجلس، ولأن الحديث ورد بلفظ الطعام، والطعامُ يطلق فى العرب على معنيين: أحدهما: البُرُّ، وليس بمراد، والثانى: الْمُقْتَاتُ المدَّخر، ولذلك يُجعل قسيما للفاكهة والتوابل.

ترجمہ: اور فقہاء نے یہ بات سمجھی کہ حرام سود جاری ہوتا ہے ان چھ چیزوں کے علاوہ میں (بھی) جن کی حدیث میں صراحت کی گئی ہے (یہ جمہور کی تعبیر ہے) اور یہ کہ سود کا حکم متعدی ہونے والا ہے۔ اشیاءِ ستّہ سے ان میں سے کسی بھی چیز کے ساتھ ملحق ہونے والی ہر چیز میں (یہ شوافع کی تعبیر ہے) —— پھر اختلاف کیا انھوں نے علت میں۔ اور قوانینِ شرعیہ سے زیادہ ہم آہنگ یہ ہے کہ نقدین میں علت: ثمنیت ہو۔ اور خاص ہوگی یہ علت ان دونوں کے ساتھ۔ اور چار چیزوں میں: غذا بنائی ہوئی ذخیرہ کی ہوئی چیز ہو۔ اور یہ (بات اوفق ہے) کہ نمک پر دواؤں اور مسالوں کو قیاس نہ کیا جائے۔ اس لئے کہ کھانے کے لئے نمک کی ایسی حاجت ہے جو نہیں ہے اس کے علاوہ کی طرف۔ اور نہ اس حاجت کا دسواں حصہ۔ پس نمک روزی کا جزء ہے اور خود طعام کے بمنزلے ہے، نہ کہ دیگر چیزیں۔

اور ہم اس کی طرف اس لئے گئے ہیں کہ شریعت نے ثمنیت کا اعتبار کیا ہے بہت سے احکام میں جیسے مجلس میں تقابض کا واجب ہونا (اس کے علاوہ کوئی مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہے) اور اس لئے کہ حدیث طعام کے لفظ سے وارد ہوئی ہے۔ اور لفظ طعام: عرف میں دو معنی پر بولا جاتا ہے: ایک: گیہوں۔ اور وہ مراد نہیں۔ اور دوسرے: غذا بنائی ہوئی ذخیرہ کی ہوئی چیز —— اور اسی وجہ سے طعام قسیم بنایا جاتا ہے میوہ جات اور مسالوں کا۔

لغات: تَـفَـطَّـنَ وَفَطِنَ: سمجھنا، تاڑنا...... الـمُقْتَات (اسم مفعول) اِقْتَـاتَ الشيئَ: غذا بنانا، بطور خوراک کوئی چیز استعمال کرنا...... المُدَّخر (اسم مفعول) اِدَّخَر الشيئَ: جمع کرنا، ذخیرہ کرنا۔

☆ ☆ ☆

مجلسِ عقد میں تقابض ضروری ہونے کی وجہ

ربوی اموال کی بیع میں مجلسِ عقد میں فریقین کا عوضین پر قبضہ کرنا دو وجہ سے ضروری ہے:

پہلی وجہ ـــــ نزاع کا سدّباب ـــــ طعام اور نقد کی طرف احتیاج بہت زیادہ ہے[1]۔ معاملات بھی ان دو میں زیادہ ہوتے ہیں۔ اور دونوں سے انتفاع بھی جب ہوتا ہے کہ دونوں فنا ہوجائیں اور ملکیت سے نکل جائیں[2]۔ پس اگر ایک عوض ادھار ہوگا تو ممکن ہے قبضہ کے وقت جھگڑا پیدا ہو، جبکہ اس کا بدل ختم ہو چکا ہوگا۔ اور یہ نہایت پیچیدہ جھگڑا ہوگا، اس کا سلجھانا مشکل ہوگا۔ پس ضروری ہے کہ فساد کا یہ دروازہ بند کر دیا جائے۔ اور اس کی صورت یہی ہے کہ متعاقدین عوضین پر قبضہ کر کے ہی جدا ہوں تاکہ ان کے درمیان کوئی معاملہ باقی نہ رہے۔

فائدہ: شریعت نے اس وجہ (احتمالِ نزاع) کا دو اور معاملوں میں بھی لحاظ کیا ہے:

ایک: اگر کوئی غلّہ خریدا جائے تو مبیع پر قبضہ سے پہلے اس کی بیع جائز نہیں۔ حدیث میں ہے: **مَن ابْتَاعَ طعاماً فلا يَبِعْه حتى يَسْتَوْفِيَهُ**: جو شخص کوئی غلّہ خریدے تو جب تک اس کو وصول نہ کر لے آگے نہ بیچے (مشکوٰۃ حدیث ۲۸۴۴) کیونکہ احتمال ہے کہ مبیع کسی وجہ سے ہلاک ہوجائے اور بیع توڑنے کی نوبت آئے۔ پس نزاع ہوگا۔

دوسرا معاملہ: بیع صرف میں قبضہ سے پہلے جدا ہونے کی ممانعت ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں مقام نقیع میں اونٹوں کا کاروبار کرتا تھا۔ کبھی اونٹ دیناروں میں بیچتا اور ان کی جگہ درہم لے لیتا۔ اور کبھی دراہم میں بیچتا اور ان کی جگہ دینار لے لیتا (کسی نے ان سے کہا کہ ایسا کرنا درست نہیں) چنانچہ وہ حاضر خدمت ہوئے اور مسئلہ دریافت کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''اس دن کے ریٹ سے ایسا کرنے میں کچھ حرج نہیں، بشرطیکہ تم اس حال میں جدا نہ ہو کہ تمہارے درمیان کچھ لین دین باقی ہو'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۸۷۱) دینار اور دراہم کا باہم تبادلہ بیع صرف ہے، جس میں مجلسِ عقد ہی میں تقابض ضروری ہے۔ تاکہ آئندہ کوئی نزاع کھڑا نہ ہو (یہ فائدہ کتاب میں ہے)

دوسری وجہ ـــــ ترجیح بلا مرجح لازم نہ آئے ـــــ اگر معاملہ میں ایک جانب نقد (Money) ہو اور دوسری جانب طعام یا اور کوئی سامان ہو تو چونکہ اس صورت میں نقد کسی چیز کو حاصل کرنے کا ذریعہ اور وسیلہ ہوتا ہے، اس لئے ثمن پہلے سپرد کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ مبیع تعیین سے متعین ہوجاتی ہے، مگر ثمن متعین نہیں ہوتا (معاملات میں دراہم ودنانیر تعیین کرنے سے بھی متعین نہیں ہوتے) اس لئے ثمن پہلے سپرد کرنا ضروری ہے، تاکہ وہ بھی مبیع کی طرح متعین ہوجائے (یہ مسئلہ آئندہ مسئلہ کی تمہید کے طور پر بیان کیا گیا ہے)

اور اگر دونوں ہی جانب نقد یا طعام ہو یعنی بیع صرف یا بیعِ مقایضہ ہو، تو اگر اس صورت میں کسی ایک کو حکم دیا جائے کہ وہ اپنا عوض پہلے سپرد کرے تو یہ زبردستی کی بات ہوگی۔ کیونکہ بیع صرف میں دونوں عوض متعین نہیں ہوتے پس دونوں ہی عوض تعیین کے محتاج ہیں۔ اور بیع مقایضہ میں دونوں عوض متعین کرنے سے متعین ہوجاتے ہیں۔ پھر ایک شخص اپنا

---

[1] خیال رہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک ربا کی علّتیں: طعام اور نقد ہیں ۱۲

[2] یہ لف ونشر مرتب ہے یعنی طعام کھا لیا جائے، اور رقم خرج ہوجائے ۱۲

عوض پہلے کیوں سپرد کرے؟ پھر اگر مجلس میں دونوں میں سے کوئی بھی اپنا عوض دوسرے کو سپرد نہ کرے تو یہ ادھار کی ادھار کے عوض بیع ہوگی، جو حدیث شریف کی رو سے ممنوع ہے۔ اور اگر کسی ایک فریق کو پہلے سپرد کرنے کے لئے کہا جائے تو ممکن ہے وہ کنجوسی کا مظاہرہ کرے اور اپنا بدل سونپنے کے لئے تیار نہ ہو۔ اس لئے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ نزاع ختم کرنے کے لئے دونوں کو حکم دیا جائے کہ وہ عوضین پر قبضہ کر کے ہی جدا ہوں۔

اور مجلس میں تقابض کی شرط اموالِ ربویہ ہی میں اس لئے ہے کہ یہ بنیادی اموال ہیں۔ لین دین زیادہ تر ان میں ہوتا ہے اور ان سے انتفاع ان کے ہلاک ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ پس اگر طعام ونقد میں فریقین قبضہ سے پہلے جدا ہو گئے تو پریشانی زیادہ ہوگی۔ اور جھگڑے کی نوبت آئے گی۔ اور اگر ان دونوں میں قبضہ سے پہلے جدا ہونے کی ممانعت کردی جائے تو معاملہ میں بال کی کھال نکالنے کی نوبت نہیں آئے گی۔

فائدہ: جو معاملات قطعی طور پر حرام ہیں، جیسے سود لینا دینا یا خمر وخنزیر اور مردار کی بیع: ان میں جواز کی کوئی صورت باقی نہیں رکھی جاتی۔ ورنہ مقصد تحریم فوت ہو جائے گا۔ اور اگر کوئی جواز کا حیلہ کرے تو اس پر لعنت ہے۔ متفق علیہ روایت میں ہے کہ یہود پر خدا کی مار! اللہ نے ان پر چربی حرام کی تو انھوں نے اس کو پگھال کر بیچا (اور اس طرح فائدہ اٹھایا)

لیکن جن چیزوں کی ممانعت سدّ ذرائع کے طور پر ہوتی ہے، جیسے یہی ربوی اموال میں مجلس عقد سے تقابض سے پہلے جدا ہونے کی ممانعت: تو اس کا مقصد بس یہی ہے کہ اس طرح قبضہ سے پہلے جدا ہونے کا رواج نہ چل پڑے اور لوگ اس طرح کاروبار نہ کرنے لگیں۔ اس ممانعت کا یہ مقصد نہیں ہے کہ کسی صورت میں بھی یہ کام نہ کیا جائے۔ چنانچہ حدیث میں اسی قسم کے ایک دوسرے معاملہ میں جواز کی صورت تجویز کی گئی ہے:

حدیث —— حضرت بلال رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کی خدمت میں برنی کھجوریں لائے۔ آپؐ نے دریافت کیا: ''یہ کہاں سے لائے؟'' انھوں نے کہا کہ میرے پاس ردی کھجوریں تھیں۔ میں نے اس کے دو صاع: ایک صاع کے بدل بیچ دیئے۔ آپؐ نے فرمایا: ''اُوّوہ! بعینہٖ سود! بعینہٖ سود!! ایسا نہ کرو، جب تمہیں اچھی کھجوریں خریدنی ہوں تو پہلے اپنی ردی کھجوریں بیچ دو، پھر ان کی قیمت سے دوسری کھجوریں خرید لو'' (مشکوۃ حدیث ۲۸۱۴)

تشریح: ربا الفضل حقیقی ربا نہیں، حکمی ربا ہے، جیسا کہ ابھی گذرا۔ مگر یہ حکمی ربا بھی ممنوع ہے اور جید وردی کا تفاوت لغو کر دیا گیا ہے۔ مگر کبھی یہ تفاوت ظاہر کرنیکی واقعی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس لئے جواز کی یہ صورت تجویز کی گئی کہ دو الگ الگ معاملے کر کے جید وردی کا تفاوت ظاہر کیا جائے (یہ فائدہ کتاب میں ہے)

فائدہ: یہ حیلہ کی تعلیم نہیں، بلکہ قانون کی لچک کا بیان ہے۔ قانون اگر لوہے کا ڈنڈا ہوگا تو لوگ اس کو توڑنے پر مجبور ہوں گے۔ اور اگر قانون میں باہری راہ (By Pass) ہوگی تو لوگ بوقتِ ضرورت اس کو اختیار کریں گے۔ مگر یہ لچک قطعی محرمات میں نہیں ہوتی، جو چیزیں سدّ ذرائع کے طور پر ممنوع ہوتی ہیں انہیں میں جواز کی یہ صورتیں تجویز کی جاتی ہیں ——

حدیث میں مذکور صورت: حیلہ اس وقت ہوگی کہ جس سے عمدہ کھجوریں خریدنی ہیں اسی کے ہاتھ ردی کھجوریں بیچنا ضروری ہو۔ جبکہ ایسی کوئی پابندی نہیں۔ ردی کھجوریں کسی کے بھی ہاتھ بیچی جاسکتی ہیں۔

وإنما أوجب التقابضَ فی المجلس لمعنيين:

أحدهما: أن الطعام والنقدَ الحاجةُ إليهما أشد الحاجات، وأكثرُها وقوعاً، والانتفاعُ بهما لايتحقق إلا بالإفناء والإخراج من الملك، وربما ظهرت خصومةٌ عند القبض، ويكونُ البدل قد فنی، وذلك أقبح المناقشة، فوجب أن يُسَدَّ هذا البابُ بأن لايتفرقا إلا عن قبضٍ، ولايبقى بينهما شيئ.

وقد اعتبر الشرعُ هذه العلة فی النهی عن بيع الطعام قبل أن يُسْتَوْفٰی، وحيث قال فی اقتضاء الذهب من الورِق: "مالم تتفرقا وبينكما شيئ"

والثانی: أنه إذا كان النقدُ فی جانب، والطعام أو غيره فی جانب، فالنقدُ وسيلةٌ لطلب الشيئ كما هو مقتضی النقدية، فكان حقيقاً بأن يُبْذَل قبل الشيئ، وإذا كان فی كلا الجانبين النقدُ أو الطعامُ: كان الحكمُ ببذل أحدهما تحكما، ولو لم يُبْذَلْ من الجانبين كان بيعَ الكالِئِ بالكالِئِ، وربما يُشَحُّ بتقديم البَذْلِ، فاقتضی العدلُ أن يُقطع الخلاف بينهما، ويؤمرا جميعا أن لايتفرقا إلا عن قبض.

وإنما خص الطعام والنقد: لأنهما أصلا الأموال، وأكثَرُها تعاوُرًا، ولايُنتفع بهما إلا بعد إهلاكهما، فلذلك كان الحرجُ فی التفرق عن بيعهما قبل القبض أكثرَ، وأفضی إلی المنازعة، والمنعُ فيهما أَرْدَعُ عن تدقيق المعاملة.

واعلم أن مثل هذا الحكم إنما يُراد به أن لايجری الرسمُ به، وأن لايعتاد تكسُّبَ ذلك الناسُ، لا أن لايُفعل شيئ منه أصلاً، ولذلك قال عليه السلام لبلالٍ: "بِعِ التمر ببيع آخر، ثم اشْتَرِبه"

ترجمہ: اور مجلسِ عقد میں بائع کا قیمت کو اور مشتری کا مبیع کو وصول کرنا دو معنی کی وجہ سے ضروری قرار دیا گیا ہے۔

ان میں سے ایک: یہ ہے کہ طعام اور نقد کی طرف احتیاج بہت زیادہ ہے۔ اور وہ چیزوں میں زیادہ ہیں پائے جانے کے اعتبار سے۔ اور اُن دونوں سے انتفاع متحقق نہیں ہوتا مگر فنا کرنے اور ملکیت سے نکالنے کے ذریعہ۔ اور کبھی قبضہ کے وقت خصومت ظاہر ہوتی ہے۔ درانحالیکہ بدل فنا ہو چکا ہوتا ہے۔ اور وہ قبیح ترین مناقشہ ہے۔ پس ضروری ہوا کہ یہ دروازہ بند کر دیا جائے بایں طور کہ نہ جدا ہوں دونوں مگر قبضہ کر کے اور نہ باقی رہے ان کے درمیان کوئی معاملہ۔

(فائدہ) اور تحقیق شریعت نے اس وجہ کا اعتبار کیا ہے: (۱) طعام کی بیع سے ممانعت میں وصول کئے جانے سے پہلے (۲) اور جہاں فرمایا سونا لینے میں چاندی کے عوض: ''جب تک نہ جدا ہو تم درانحالیکہ تمہارے درمیان کوئی چیز ہو'' یعنی کچھ لین دین باقی ہو۔

اور دوسری وجہ: یہ ہے کہ جب نقد ایک جانب میں ہو اور طعام یا اس کے علاوہ کوئی چیز دوسری جانب میں تو نقد ذریعہ ہوتا ہے کسی چیز کو طلب کرنے کا، جیسا کہ وہ نقد ہونے کا تقاضا ہے پس وہ اس بات کے لائق تھا کہ چیز (سامان) سے پہلے اس (ثمن) کو خرچ کیا جائے یعنی سپرد کیا جائے —— اور جب دونوں ہی جانب میں نقد یا طعام ہو تو ان میں سے ایک کو خرچ کرنے کا حکم دینا زبردستی کی بات ہے۔ اور اگر نہ خرچ کیا گیا دونوں جانب سے تو وہ ادھار کی ادھار کے بدل بیع ہوگی۔ اور کبھی کنجوسی کی جاتی ہے خرچ کرنے کو مقدم کرنے میں۔ پس انصاف نے چاہا کہ دونوں کے درمیان اختلاف ختم کر دیا جائے۔ اور دونوں کو حکم دیا جائے کہ نہ جدا ہوں وہ مگر قبضہ کر کے —— اور طعام اور نقد کو اسی لئے خاص کیا ہے کہ وہ دونوں اصل اموال ہیں۔ اور اموال میں زیادہ ہیں باہم لینے کے اعتبار سے۔ اور ان دونوں سے فائدہ نہیں اٹھایا جاتا مگر دونوں کے ہلاک ہونے کے بعد۔ پس اس وجہ سے حرج زیادہ تھا ان دونوں کی بیع سے: قبضہ سے پہلے جدا ہونے میں۔ اور جھگڑے کی طرف زیادہ پہنچانے والا تھا۔ اور دونوں میں ممانعت زیادہ باز رکھنے والی ہے معاملہ کی باریکیاں نکالنے سے۔

(فائدہ) اور جان لیں کہ اس قسم کے حکم سے یہی مراد لی جاتی ہے کہ اس کی ریت نہ چل پڑے، اور یہ کہ لوگ اس کو کمائی کرنے کی عادت نہ بنالیں۔ یہ مقصد نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی چیز قطعاً کی ہی نہ جائے۔ اور اسی وجہ سے آپ ﷺ نے بلال سے فرمایا: ''بیچ تو کھجور کو دوسری بیع کے ذریعہ، پھر خرید تو اس کے ذریعہ۔

☆ ☆ ☆

وہ بیوع جو مخاطرہ کی وجہ سے ممنوع ہیں

بعض بیوع ایسی ہیں جن میں جُوے کے معنی پائے جاتے ہیں یعنی ان میں غرر (دھوکہ) اور مخاطرہ (جوکھوں) ہے۔ اور زمانۂ جاہلیت میں ان بیوع کا رواج تھا۔ چنانچہ نبی ﷺ نے ان سے منع کیا۔ وہ بیوع یہ ہیں:

بیع مزابنہ اور محاقلہ —— اگر درخت پر لگے ہوئے پھل —— مثلاً کھجوریں —— ہم جنس پھلوں کے عوض بیچے جائیں تو یہ بیع مزابنہ ہے۔ اور اگر زمین میں کھڑی ہوئی کھیتی —— مثلاً گیہوں کا کھیت —— ہم جنس غلّہ کے عوض بیچا جائے تو یہ بیع محاقلہ ہے۔ اور دونوں ممنوع ہیں۔ البتہ اگر رقم کے ذریعہ یا غیر جنس کے پھلوں اور غلّہ کے عوض بیع ہو تو درست ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں لوگ نفع کی لالچ میں ایسا سودا کیا کرتے تھے۔ مسلم شریف (۱۸۹:۱۰) میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں مزابنہ کی تفسیر میں ہے: إن زاد فَلِيَ، وإن نَقَصَ فَعَلَيَّ یعنی اگر پھل زیادہ اترا تو میرا، اور کم اترا تو میرے سر! یہی مخاطرہ

ہے (نیز پھل اور غلّہ ربوی اجناس ہیں۔ ان میں برابری ضروری ہے۔ جو اندازے سے نہیں ہوسکتی۔ پس احتمالِ ربا کی وجہ سے بھی یہ بیوع ممنوع ہیں)

بیعِ عریّہ کے جواز کی وجہ: نبی ﷺ نے بیع مزابنہ سے منع کیا، مگر بیع عریہ کی اجازت دی، بشرطیکہ پانچ وسق سے کم کا معاملہ ہو (ایک وسق ساٹھ صاع کا اور ایک صاع احناف کے نزدیک تین کلو ایک سو اڑتالیس گرام کا۔ اور ائمۂ ثلاثہ کے نزدیک: دو کلو ایک سو بہتّر گرام کا ہوتا ہے)

اور عریہ کی دو تفسیریں ہیں:

پہلی تفسیر: اگر کسی کے پاس سوکھی کھجوریں تو ہوں، مگر نقد پیسہ نہ ہو جس سے وہ تازہ کھجوریں خرید سکے، پس اگر وہ اپنے بال بچوں کو تازہ پھل کھلانے کے لئے کسی باغ والے سے سوکھی کھجوریں دیکر اندازے سے برابری کر کے درخت پر لگی ہوئی کھجوریں خرید لے تو یہ بیع عریہ ہے اور جائز ہے۔ کیونکہ نبی ﷺ یہ بات جانتے تھے کہ اتنی مقدار میں لوگ قسمت کا سودا نہیں کرتے، بلکہ تازہ میوہ کھانے کے لئے خریدتے ہیں۔ اور پانچ وسق زکات کا نصاب ہے یعنی یہ مالداری کی مقدار ہے۔ اور بیع عریہ غرباء کی ضرورت کے لئے مشروع کی گئی ہے اس لئے پانچ وسق سے کم کی شرط لگائی۔ نیز اتنی مقدار ایک فیملی کے تازہ میوہ کھانے کے لئے کافی ہے —— یہ تفسیر امام شافعی رحمہ اللہ نے اختیار کی ہے۔ اور اسی کو شاہ صاحب نے بیان کیا ہے۔

دوسری تفسیر: اگر کسی باغ والے نے کھجوروں کے چند درخت کسی محتاج کو دیئے۔ پھر اس شخص کے بار بار باغ میں آنے جانے سے مالک کو پریشانی ہوئی تو اس نے اندازہ کر کے خشک کھجوروں کے عوض ان درختوں کے پھل خرید لئے تو یہ بیع عریہ ہے اور جائز ہے۔ کیونکہ یہ صرف صورۃً بیع ہے۔ درختوں کے پھلوں پر چونکہ محتاج کا قبضہ نہیں ہوا اس لئے ہبہ تام نہیں ہوا۔ اور پانچ وسق سے کم کی شرط اس لئے ہے کہ اتنا ہی عشر مالک غرباء کو دے سکتا ہے۔ جب عشر کی مقدار پانچ وسق یا زیادہ ہو تو اس کو حکومت وصول کرے گی۔ عریہ کی یہ تفسیر امام مالک رحمہ اللہ سے المدونۃ الکبری جلد سوم کتاب العرایا میں منقول ہے۔ اور امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

بیع صبرہ —— کھجور یا گیہوں وغیرہ ربوی چیزوں کا ڈھیر —— جس کی پیمانوں سے مقدار معلوم نہ ہو —— ہم جنس پھلوں یا غلّے کے متعین پیمانوں کے بدل بیچنا بیع صبرہ ہے اور جائز نہیں۔ کیونکہ جب ڈھیر کی مقدار مجہول ہے تو برابری ممکن نہیں۔ کمی بیشی کا احتمال ہے۔ یہی مخاطرہ اور ربا ہے۔

بیع ملامسہ —— مشتری بائع سے کہے کہ جب میں آپ کا کپڑا (مبیع) چھولوں تو بیع پکّی۔ یہ بیع ملامسہ ہے۔

بیع منابذہ —— بائع مشتری سے کہے کہ جب میں اپنا کپڑا (مبیع) آپ کی طرف پھینک دوں تو بیع پکی۔ یہ بیع منابذہ ہے۔

بیع حصاۃ —— بائع اور مشتری میں یہ بات طے پائے کہ جب ایک دوسرے کی طرف کنکری پھینک دے تو بیع لازم،

اب دوسرے کو بولنے کا حق نہیں۔ یا یہ طے پائے کہ بائع یا مشتری —— مثال کے طور پر —— بکریوں کے ریوڑ پر کنکری اُچھالے، جس بکری پر کنکری پڑے وہ مبیع بننے کے لئے متعین! یہ بھی جائز نہیں۔

یہ بیوع دو وجہ سے ممنوع ہیں: ایک: ان میں مخاطرہ ہے۔ دوسری: ان میں معاملات کی غرض کو پلٹ دینا ہے۔ معاملات کی بنیاد: غور وفکر اور خوب تحقیق کر کے اپنا پورا حق وصول کرنے پر ہے یعنی معاملات میں کامل رضامندی ضروری ہے، دیکھنے بھالنے کا اختیار رہے اور زبان بندی جائز نہیں۔

بیع عُربان (سائی دینا) —— یعنی مشتری بائع کو بطور بیعانہ کچھ دے بایں طور کہ اگر معاملہ رہ گیا تو سائی کی رقم ثمن میں شمار کرلی جائے گی۔ اور اگر مشتری معاملہ سے ہٹ گیا تو سائی گئی یعنی وہ مفت میں بائع کی ہوگئی۔ یہ بیع بھی مخاطرہ کی وجہ سے ممنوع ہے۔

فائدہ: بیع عُربان کی ممانعت کی روایت ضعیف ہے۔ اس لئے امام احمد رحمہ اللہ نے اس کو نہیں لیا۔ ان کے نزدیک بیعانہ دینا جائز ہے۔ اور جمہور کے نزدیک چونکہ یہ روایت معاملات کے اصولِ موضوعہ کے مطابق ہے یعنی اس میں مخاطرہ ہے۔ کیونکہ معلوم نہیں سائی کی رقم کا کیا انجام ہو؟ اور یہ ناحق مال لینا بھی ہے، اس لئے ضُعف کے باوجود جمہور نے یہ روایت قبول کی ہے۔ ان کے نزدیک سائی رکھنا جائز نہیں (فائدہ پورا ہوا)

چھوہارے اور تازہ کھجور کی بیع —— حدیث: زید ابو عیاش —— ایک مجہول شخصیت —— کہتے ہیں کہ انھوں نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ گیہوں کو سُلت (بے چھلکے کے جَو) کے بدل بیچنا کیسا ہے؟ حضرت سعدؓ نے دریافت کیا: دونوں میں افضل کون ہے؟ زید نے کہا: گیہوں! تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اس بیع سے منع کیا۔ اور فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے: آپؐ سے تازہ کھجوروں کے بدل چھوہارے خریدنے کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ آپؐ نے پوچھا: ''جب تازہ کھجوریں سوکھیں گی تو گھٹیں گی؟'' لوگوں نے کہا: ہاں! پس آپؐ نے اس بیع سے منع کیا (موطا مالک کتاب البیوع حدیث ۲۲ ورواہ اصحاب السنن الاربعہ)

یہ بیع دو وجہ سے ممنوع ہے: ایک: یہ جوے کی شکلوں میں سے ایک شکل ہے۔ دوسری: اس میں ربا الفضل کا احتمال ہے۔ کیونکہ ربا کے سلسلہ میں چیز کی آخری حالت کا اعتبار ہے۔ اور آخری حالت کا پتہ نہیں۔ اس لئے فی الحال برابری ممکن نہ ہونے کی وجہ سے یہ بیع درست نہیں۔

فائدہ: یہ حدیث اول تو زید ابو عیاش کی جہالت کی وجہ سے ضعیف ہے۔ پھر اس میں مذکور پہلا مسئلہ: امام مالک رحمہ اللہ کے علاوہ کوئی نہیں لیتا۔ سب کے نزدیک: گیہوں اور سُلت دو جنسیں ہیں۔ اور کمی بیشی کے ساتھ ان کی بیع درست ہے۔ اس لئے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے دوسرے مسئلہ میں بھی اس روایت کو نہیں لیا۔ ان کے نزدیک بوقتِ بیع تازہ کھجوروں اور چھوہاروں کو برابر کر کے بیچا جائے تو درست ہے۔ وہ حال کا اعتبار کرتے ہیں مآل کا نہیں۔ اور دوسرے

ائمہ مآل کا اعتبار کرتے ہیں۔ اور وہ اس بیع کو ناجائز کہتے ہیں (فائدہ پورا ہوا)

نگینوں والے سونے کے ہار کو سونے کے بدل بیچنا ——— حضرت فَضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے جنگِ خیبر کے موقعہ پر بارہ دینار میں ایک ہار خریدا جس میں سونا اور نگینے تھے۔ جب میں نے ان کو جدا کیا تو اس میں بارہ دینار سے زیادہ سونا تھا۔ میں نے نبی ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''جب تک (سونا) جدا نہ کیا جائے (ہار) نہ بیچا جائے'' (ابوداؤد حدیث ۳۳۵۲)

یہ ممانعت دووجہ سے ہے: ایک: یہ جوے کی ایک شکل ہے۔ دوسری: اس میں احتمال ہے کہ کسی ایک کو گھاٹا ہو، پس وہ یا تو غصہ کے ساتھ خاموش رہے یا ناحق جھگڑا کرے (نیز اس میں ربا کا احتمال ہے۔ البتہ اگر سونے کا ہار: چاندی یا کرنسی کے بدل بیچے تو سونا الگ کرنا ضروری نہیں)

واعلم: أن من البيوع ما يجرى فيه معنى الميسِر، وكان أهل الجاهلية يتعاملون بها فيما بينهم، فنهى عنها النبى صلى الله عليه وسلم:

منها: المزابنة: أن يبيع الرجلُ التمر فى رء وس النخل بمائةِ فَرَقٍ من التمر مثلاً.

والمحاقلة: أن يبيعَ الزرعَ بمائة فَرَقٍ حنطةً.

ورخص فى العَرَايا: بِخَرْصِها من التمر فيما دون خمسةِ أَوْسُقٍ: لأنه عَرَفَ أنهم لايقصدون فى ذلك القدرِ الميسِرَ، وإنما يقصدون أكلَها رطبا؛ وخمسةُ أوسق هو نصاب الزكاة، وهى مقدارُما يَتَفَكَّهُ به أهلُ البيت.

ومنها: بيعُ الصُّبْرَةِ من التمر لايُعلم مكيلتُها: بالكيل المسمى من التمر.

والملامسة: أن يكون لمسُ الرجلِ ثوبَ الآخر بيده: بيعًا.

والمنابذة: أن يكون نَبْذُ الرجلِ بثوبه: بيعا من غير نظر.

وبيعُ الحصاة: أن يكون وقوعُ الحصاةِ بيعًا.

فهذه البيوع فيها معنى الميسر، وفيها قلبُ موضوعِ المعاملةِ، وهو استيفاءُ حاجتِه بِتَرَوٍّ وتَثَبُّتٍ.

ونهى عن بيع العُرْبان: أن يقدِّمَ إليه شيئًا من الثمن، فإن اشترى حوسب من الثمن، وإلا فهو له مَجَّانًا، وفيه معنى الميسِر.

وسئل صلى الله عليه وسلم عن اشتراء التمر بالرطب؟ فقال: ''أَيَنْقُصُ إذا يَبِسَ؟'' فقال: نعم، فنهاه عن ذلك.

أقول: وذلك: لأنه أحد وجوه الميسِر، وفيه احتمالُ ربا الفضل؛ فإن المعتبر حالُ تمامِ الشيئ.

وقال صلى الله عليه وسلم في قَلادة فيها ذهبٌ وخَرَزٌ: ''لاتُباع حتى تُفَصَّلَ''

أقول: وذلك: لأنه أحد وجوه الميسر، ومظنةُ أن يُغْبَنَ أحدُهما، فيسكت على غيظ، أو يخاصم في غير حق.

ترجمہ: اور جان لیں کہ بیوع میں سے بعض وہ ہیں جن میں جُوے کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اور زمانۂ جاہلیت میں لوگ ان کے ذریعہ آپس میں معاملات کیا کرتے تھے۔ پس نبی ﷺ نے ان سے روکا ـــــ ازانجملہ: مزابنہ ہے: کہ بیچے آدمی کھجور کے درخت پر لگے ہوئے پھل: مثلاً کھجور کے سوفرق کے بدل (فرق: تین صاع کے بقدر ایک پیمانہ ہے) ـــــ اور محاقلہ ہے کہ کھیتی فروخت کرے گیہوں کے سوفرق کے بدل۔

اور آپؐ نے عرایا (عریہ کی جمع) کی اجازت دی، اس (عرایا) کے اندازے کے ذریعہ کھجور کے بدل: پانچ وسق سے کم میں۔ اس لئے کہ آپؐ نے جانا کہ لوگ اتنی مقدار میں جوے کا ارادہ نہیں کرتے۔ اور وہ تازہ پھلوں کے کھانے ہی کا ارادہ کرتے ہیں۔ اور پانچ وسق: وہ زکات کا نصاب ہے اور وہ ایسی مقدار ہے جس کو ایک گھرانہ میوہ کے طور پر کھاتا ہے۔

اور ازانجملہ: کھجور کے ڈھیر کو فروخت کرنا ہے، جس کے پیمانے نہ جانے جاتے ہوں: کھجور کے متعین پیمانوں کے بدل ـــــ اور ملامسہ ہے کہ آدمی کا دوسرے کے کپڑے کو اپنے ہاتھ سے چھونا بیع ہوجائے ـــــ اور منابذہ ہے کہ آدمی کا اپنے کپڑے کو پھینکنا بیع ہوجائے دیکھے بغیر ـــــ اور بیع الحصاۃ ہے کہ کنکری کا پڑنا بیع ہوجائے ـــــ پس ان بیوع میں جُوے کے معنی ہیں۔ اور ان میں معاملہ کے مقصد کو پلٹنا ہے۔ اور وہ مقصد اپنا پورا حق وصول کرنا ہے غور وفکر اور خوب تحقیق کرکے۔

اور منع کیا آپؐ نے بیع عُربان سے کہ بائع کو پیشگی دیدے ثمن میں سے کچھ۔ پس اگر اس نے خرید لی تو وہ ثمن میں گن لی جائے گی۔ ورنہ پس وہ بائع کے لئے مفت ہوگی۔ اور اس میں جوے کے معنی ہیں ـــــ اور آپؐ سے دریافت کیا گیا: تازہ کھجوروں کے بدل چھوہارے خریدنے کے بارے میں؟ تو آپؐ نے پوچھا: ''کیا جب وہ سوکھیں گی تو کم ہونگی؟'' پس جواب دیا: ہاں! پس آپؐ نے سائل کو اس سے منع کیا ـــــ میں کہتا ہوں: اور وہ ممانعت اس لئے ہے کہ وہ جوے کی شکلوں میں سے ایک شکل ہے۔ اور اس میں ربا الفضل کا احتمال ہے۔ پس بیشک اعتبار چیز کی آخری حالت کا ہے۔

اور آنحضرت ﷺ نے اس ہار کے بارے میں جس میں سونا اور مُہرے ہیں فرمایا: ''وہ نہ بیچا جائے یہاں تک کہ سونا الگ کیا جائے'' ـــــ میں کہتا ہوں: اور وہ ممانعت اس لئے ہے کہ وہ جوے کی شکلوں میں سے ایک شکل ہے۔ اور اس بات کی احتمالی جگہ ہے کہ دو میں سے ایک دھوکہ کھائے، پس وہ غیظ کے ساتھ خاموش رہے یا ناحق جھگڑا کرے۔

☆ ☆ ☆

معاملات و بیوع کی کراہیت کی نو وجوہ

جب نبی ﷺ کی عربوں میں بعثت ہوئی تو ان میں کچھ معاملات اور چند بیوع رائج تھیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ چند کو ممنوع اور چند کو جائز قرار دیا۔ اور ممانعت کی چند وجوہ ہیں:

فائدہ: جن چیزوں کی ممانعت قرآن سے ثابت ہوتی ہے اس کے لئے ''حرمت'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اور جن چیزوں کی ممانعت احادیث سے ثابت ہوتی ہے اس کے لئے فرقِ مراتب کا لحاظ کر کے ''کراہیت'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

پہلی وجہ: ذریعۂ معصیت ہونا

جو چیزیں عادۃً کسی معصیت کے لئے ذخیرہ کی جاتی ہیں۔ یا لوگوں کے نزدیک ان چیزوں سے جو انتفاع مقصود ہے وہ کوئی گناہ کا کام ہوتا ہے تو ان ذرائع معصیت کو حرام کیا جاتا ہے۔ جیسے شراب، اصنام اور تنبورہ (سامانِ سُرود) کی تحریم۔ کیونکہ اگر ان چیزوں کی خرید و فروخت کا رواج رہے گا اور لوگ ان چیزوں کو اپنائیں گے تو اُن گناہوں کا شہرہ ہوگا جن کے یہ ذرائع ہیں۔ اور یہ چیزیں لوگوں کو ان گناہوں پر ابھاریں گی، اور ان سے نزدیک کریں گی۔ اور اگر ان کی خرید و فروخت اور ان کے جمع کرنے کو حرام ٹھہرایا جائے گا تو وہ گناہ گمنام ہوں گے۔ اور لوگ ان گناہوں سے دور ہوں گے۔ اس سلسلہ کی چند احادیث یہ ہیں:

حدیث ـــــ فتح مکہ کے موقعہ پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بیشک اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے شراب، مردار، خنزیر اور مورتیوں کو حرام کیا ہے'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۲۷۶۶ کتاب البیوع، باب الکسب)

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو حرام کرتے ہیں تو اس کے ثمن کو بھی حرام کرتے ہیں'' (سنن دار قطنی ۳: ۷ باسناد صحیح۔ یہ حدیث الفاظ کے تھوڑے فرق سے ابوداؤد اور مسند احمد وغیرہ میں بھی ہے)

تشریح: جب کسی چیز سے فائدہ اٹھانے کی صورت متعین ہوتی ہے، جیسے شراب پینے کے لئے بنائی جاتی ہے اور مورتی پوجا کے لئے: جب اس کو اللہ تعالیٰ حرام کرتے ہیں تو حکمتِ خداوندی چاہتی ہے کہ اس کی خرید و فروخت بھی حرام کر دی جائے۔

حدیث ـــــ بدکار عورت کا مہر (فیس) خبیث ہے (مشکوۃ حدیث ۲۷۶۳) اور آنحضرت ﷺ نے کاہن کے نذرانے سے منع کیا (مشکوۃ حدیث ۲۷۶۲) اور آپؐ نے بَین کرنے والی (بانسری بجانے والی) عورت کی کمائی سے منع کیا (مشکوۃ حدیث ۲۷۷۹) یعنی جس کی باندی گانے بجانے کا پیشہ کرتی ہے، اس کی کمائی آقا کے لئے جائز نہیں۔

تشریح: جو مال کسی معصیت کے اختلاط سے حاصل کیا جائے، اس سے انتفاع دو وجہ سے حلال نہیں:

پہلی وجہ: اس آمدنی کو حرام قرار دینا اور اس سے انتفاع ترک کرنے کا حکم دینا اُس گناہ سے زاجر (جھڑکنے والا)

بنے گا۔ اور اس قسم کے معاملات کی ریت چلنے سے شر وفساد کو بڑھاوا ملے گا۔ اور لوگوں کو گناہ کی شہ ملے گی۔
دوسری وجہ: لوگوں کے تصورات میں ثمن مبیع سے اور اجرت عمل میں پیدا ہوتی ہے۔ پس ملأ اعلی کے نزدیک ثمن مبیع کا اور اجرت عمل کا پیکر اختیار کرتے ہیں اس طرح ملأ اعلی کے تصورات میں مبیع اور عمل کی گندگی ثمن واجرت میں گھسٹ آتی ہے۔ پھر ملأ اعلی کا یہ علم انسانوں کے نفوس پر اثر انداز ہوتا ہے اور انسان بھی اس ثمن واجرت کو گندہ تصور کرنے لگتے ہیں، اس لئے ان کو حرام قرار دیا گیا ہے۔
آسان تقریر: ثمن اور اجرت: مبیع اور عمل کی راہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور طریقِ حصول کی خوبی اور خرابی شیئ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جیسے دھوپ: سرخ یا زرد آئینہ سے گذر کر گھر میں آئے تو آئینہ کا رنگ بھی ضرور اس کے ساتھ آئے گا۔ اسی طرح مبیع اور عمل کی برائی ثمن اور اجرت میں شامل ہوجاتی ہے۔ چنانچہ ان کو حرام قرار دیا گیا۔
حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے شراب کے سلسلہ میں دس شخصوں پر لعنت فرمائی۔ جن میں سے پانچ یہ ہیں: (اپنے لئے یا دوسرے کے لئے) شراب نچوڑنے والا۔ (اپنے لئے یا دوسرے کے لئے) نچڑوانے والا۔ اس کا پینے والا (پینے کے لئے) اس کو اٹھانے والا اور جس کے پینے کے لئے وہ اٹھائی گئی (مشکوٰۃ حدیث ۲۷۷۶)
تشریح: معصیت اور اس کی ترویج میں اعانت کرنا اور لوگوں کو معصیت سے نزدیک کرنا بھی معصیت اور فساد فی الارض ہے۔ اس لئے مذکورہ حدیث میں شراب میں کسی طرح کا بھی تعاون کرنے والوں پر لعنت کی گئی ہے۔

واعلم: أن النبی صلی اللہ علیه وسلم بُعث فی العرب ولهم معاملاتٌ وبیوعٌ، فأوحی اللہ إلیه کراهیةَ بعضِها وجوازَ بعضِها، والکراهیةُ تدور علی معانٍ:
منها: أن یکون شیئٌ قد جرت العادةُ بأن یُقْتَنٰی لمعصیةٍ، أو یکون الانتفاعُ المقصودُ به عند الناس نوعاً من المعصیة، کالخمر والأصنام والطنبور، ففی جَرَیَانِ الرسم ببیعها واتخاذِها تنویهٌ بتلک المعاصی، وحملٌ للناس علیها، وتقریبٌ لهم منها، وفی تحریم بیعها واقتنائِها إخمالٌ لها، وتقریبٌ لهم من أن لا یباشروها.
قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: "إن اللّٰه ورسولَه حَرَّم بیعَ الخَمْر والمیتة والخنزیر والأصنام"
وقال صلی اللہ علیه وسلم وسلم: "إن اللہ إذا حَرَّمَ شیئًا حَرَّم ثمنَه"
یعنی: إذا کان وجهُ الاستمتاع بالشیئ متعینا، کالخمر یُتخذ للشرب، والصنم للعبادة، فحرَّمه اللہ: اقتضی ذلك فی حکمة اللہ تحریمَ بیعها.
قال صلی اللہ علیه وسلم: "مهر البَغِیِّ خبیث" ونهی صلی اللہ علیه وسلم عن حُلوان

الكاهن، ونهى عن كَسْبِ الزَّمَّارَةِ.

أقول: المال الذى يحصل من مخامرة المعصية لايحل الاستمتاع به لمعنيين:

أحدهما: أن تحريم هذا المال، وتركَ الانتفاعِ به، زاجرٌ عن تلك المعصية، وجَرَيَانُ الرسم بتلك المعاملةِ جالبٌ للفساد، حاملٌ لهم عليه.

وثانيهما: أن الثمن ناشيءٌ من المبيع فى مدارِك الناس وعلومهم، فكان عند الملأ الأعلى للثمن وجودٌ تَشْبِيْهِيٌّ أنه المبيع، وللأجرةِ وجودٌ تشبيهى أنه العملُ، فانجرَّ الخبثُ إليه فى علومهم، فكان لتلك الصورة العلمية أثرٌ فى نفوس الناس.

ولعن رسول الله صلى الله عليه وسلم فى الخمر عاصِرَها، ومعتصِرَها، وشاربَها، وحاملَها، والمحمولةَ إليه.

أقول: الإعانةُ فى المعصية وترويجِها وتقريبِ الناس إليها معصيةٌ وفساد فى الأرض.

ترجمہ: واضح ہے۔ حل لغات یہ ہے: يُقتنى (فعل مجہول) اِقْتَنَى الشيئَ: کارآمد چیز جمع کرنا، ذخیرہ کرنا، حاصل کرنا، کمانا...... الطُّنْبُوْر: ستار (ایک باجا) جمع طَنَابِير...... الحُلْوان: نذرانہ، بخشش، رشوت...... الزَّمَّارة: بانسری بجانے والی زَمَرَ (ض) زَمْرًا: بانسری بجانا...... خَامَرَ الشيئَ: اختلاط رکھنا، ساتھ لگا رہنا...... اِعْتَصَرَ الشيئَ: نچوڑنا۔

ترجمہ: اور دوسری وجہ: یہ ہے کہ ثمن مبیع سے پیدا ہونے والا ہے لوگوں کے حواس اور ان کے علوم میں یعنی لوگ ایسا سمجھتے ہیں۔ پس تھا ملأ اعلی کے پاس ثمن کے لئے وجودِ شبہی (مانند وجود) کہ وہ مبیع ثمن ہے اور تھا اجرت کے لئے وجودِ شبہی کہ وہ عمل ہے۔ پس گھسٹ آئی گندگی اس (ثمن اور اجرت) میں ملأ اعلی کے علوم میں۔ یعنی ملأ اعلی کے نزدیک وہ ثمن اور اجرت بھی خبیث ہو گئے۔ پس تھا (ملأ اعلی کی) صورتِ علمیہ کے لئے اثر لوگوں کے نفوس میں یعنی لوگوں کے دلوں میں بھی وہ خبیث ہو گئے چنانچہ ان کو حرام کر دیا گیا۔

☆ ☆ ☆

دوسری وجہ: اختلاطِ نجاست

نجاست جیسے مردار، خون، گوبر اور پاخانہ کے ساتھ اختلاط بھی کراہیت کی ایک وجہ ہے۔ کیونکہ یہ اختلاط بری چیز اور اللہ کی ناراضگی کا سبب ہے۔ اور شیاطین کے ساتھ مشابہت پیدا کرتا ہے۔ اور نظافت و پاکیزگی اور گندگی سے بچنا ملتِ اسلامیہ کی اُن بنیادوں میں سے ہے جن کی اقامت کے لئے نبی ﷺ مبعوث کئے گئے ہیں۔ نیز گندگی سے بچنا

فرشتوں کے ساتھ مشابہت پیدا کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

البتہ نجاست سے کلی احتراز ممکن نہیں۔ پیشاب استنجے جانا ہی پڑتا ہے۔ پس کچھ اختلاط کی اجازت دینی ہوگی۔ ورنہ تنگی پیدا ہوگی۔ مگر اس کی مزاولت اور تجارت ضروری نہیں۔ اس لئے اس کی ممانعت کی گئی ـــــ اور زن وشوئی سے تعلق رکھنے والی بے حیائی کی باتیں جیسے جانوروں کی جفتی کا تذکرہ بھی نجاست کے حکم میں ہے ـــــ اس اصول سے درج ذیل احکام دیئے گئے ہیں:

۱ ـــ مردار کی بیع حرام کر دی (مشکوٰۃ حدیث ۲۷۶۶)

۲ ـــ پچھنے لگانے کی اجرت سے منع کیا (مشکوٰۃ حدیث ۲۷۶۳) کیونکہ یہ گندہ پیشہ ہے۔ خون منہ سے چوسنا پڑتا ہے۔ اور ایک صاحب نے اس کی بار بار اجازت چاہی تو آپؐ نے فرمایا: ''اس کا اپنی اونٹنی کو چارہ دو، اور اپنے غلام کو کھلاؤ'' جو وہ پیسہ کما کر لایا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۲۷۷۸)

۳ ـــ سانڈ کا نطفہ بیچنے سے منع کیا (مشکوٰۃ حدیث ۲۸۵۶) اور ایک روایت میں ہے: اونٹ کی جفتی بیچنے سے منع کیا (مشکوٰۃ حدیث ۲۸۵۶) اور ایک روایت میں ہے کہ بنو کلاب کے ایک شخص نے سانڈ کی جفتی کی اجرت کے بارے میں دریافت کیا تو آپؐ نے اس کو منع کیا۔ اس نے عرض کیا: ہم نر کو مادہ سے ملاتے ہیں اس پر ہمیں نذرانہ دیا جاتا ہے تو آپؐ نے نذرانہ کی اجازت دی (مشکوٰۃ حدیث ۲۸۶۶) نذرانہ وہ ہے جو شرط کے بغیر دیا جائے۔

ومنها : أن مخالطة النجاسة، كالميتة والدم والسِّرْقين والعذِرة، فيها شناعةٌ وسُخْطٌ، ويحصل بها مشابهةُ الشياطين؛ والنظافةُ وهَجْرُ الرُّجْزِ من أصول ما بُعث النبي صلى الله عليه وسلم لإقامته، وبه تحصلُ مشابهةُ الملائكة، والله يحب المتطهرين.

ولما لم يكن بدٌّ من إباحة بعضِ المخالطة، إذ في سَدِّ الباب بالكلية حرجٌ: وجب أن يُنْهىٰ عن التكسب بمعالجته، والتجارةِ فيه؛ وفي معنى النجاسة: الرَّفَثُ الذي يُسْتَحْيىٰ منه، كالسَّفَاد.

ولذلك حَرَّمَ بيعَ الميتة، ونهى عن كَسْب الحجَّام، وقال عند الضرورة: "أَطْعِمْه ناضِحَك!" وعن عسب الفحل، ويُروى: ضرابِ الجمل، ورخَّص في الكرامة، وهي ما يُعطىٰ من غير شرط.

ترجمہ: واضح ہے۔ حل لغات یہ ہے: الرُجْز: گندگی...... عَالَج الشيئَ معالجةً وعلاجاً: کسی چیز کی مشق کرنا، بار بار کرنا۔

☆　☆　☆

تیسری وجہ: احتمالِ نزاع

نزاع بچند وجوہ پیدا ہوتا ہے:

۱ —— عوضین یعنی مبیع یا ثمن میں کچھ ابہام ہو۔ جب تک اس کی وضاحت نہ ہو جائے نزاع کا احتمال رہتا ہے۔

۲ —— دو معاملے ملا کر ایک معاملہ کر دیئے گئے ہوں۔

۳ —— رضامندی کا تحقق مبیع کے دیکھنے پر موقوف ہو، اور مبیع مشتری نے ابھی دیکھی نہ ہو۔

۴ —— بیع میں کوئی ایسی شرط ہو، جس کے ذریعہ بعد میں دلیل پکڑی جائے یعنی نزاع کھڑا کیا جائے۔ یہ وہ شرط ہے جو عقد کا مقتضی نہ ہو، اور اس میں احد المتعاقدین کا فائدہ ہو۔

نزاع کی اور بھی صورتیں ہیں۔ پس ہر وہ جہالت جو مفضی الی النزاع ہو مُفسدِ عقد ہے —— امثلہ درج ذیل ہیں:

پہلی مثال —— مضامین وملاقیح کی بیع ممنوع ہے (رواہ مالک، جامع الاصول ۱: ۴۷۵) مضامین: وہ نطفہ ہے جو ابھی نر کی پشت میں ہے۔ اور ملاقیح: وہ بچہ ہے جو ابھی ماں کے پیٹ میں ہے۔

فائدہ: یہ بیوع احتمالِ نزاع کی وجہ سے ممنوع نہیں۔ بلکہ یہ بیوع زمانۂ جاہلیت میں ایک قسم کا جُوا تھیں۔ پس مخاطرہ کی وجہ سے ممنوع ہیں۔ کسی شخص کی بکری گابھن یا باندی حاملہ ہوتی تھی۔ وہ اس کے پیٹ کا بچہ معمولی قیمت پر فروخت کر دیتا تھا۔ پھر اگر بچہ صحیح سلامت پیدا ہوا تو مشتری کی قسمت چمکی، اور حمل ضائع ہو گیا تو مشتری کا گھاٹا! اسی طرح یہ سودا بھی ہوتا تھا کہ ایک شخص کی بکری یا باندی جو ابھی حاملہ نہیں ہوئی، وہ جب بھی حاملہ ہوگی اور بچہ جنے گی: اس کو بھی بہت معمولی قیمت پر بیچ دیتے تھے۔ اس میں بھی مخاطرہ تھا۔ ممکن تھا کہ بکری گابھن نہ ہو، اور یہ بھی ممکن تھا کہ حمل ضائع ہو جائے۔ دونوں صورتوں میں مشتری کا نقصان ہوگا۔ اور بچہ ہو گیا تو زہے نصیب! اس مخاطرہ کی وجہ سے ان بیوع کی ممانعت کی گئی ہے (فائدہ پورا ہوا)

دوسری مثال —— رسول اللہ ﷺ نے حمل کا حمل بیچنے سے منع کیا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ حمل کے حمل کو بیع میں ثمن کی ادائیگی کی معیاد مقرر کیا جائے۔ ایک شخص اونٹنی اس شرط پر خریدے کہ جب وہ گابھن ہوگی، پھر اتفاق سے وہ مادہ بچہ جنے، پھر وہ بچہ گابھن ہو تب ثمن کی ادائیگی ہوگی (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۲۸۵۵) اس صورت میں مخاطرہ بھی ہے اور جہالت مفضی الی النزاع بھی ہے۔ اس لئے یہ بیع ممنوع ہے۔

فائدہ: حدیث کی دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے کہ کوئی شخص اپنی اونٹنی کے پیٹ میں جو بچہ ہے اس کے پیٹ کے بچہ کو بیچے۔ تو اس میں مخاطرہ ہے۔ معلوم نہیں اس اونٹنی کے بچہ پیدا بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ پھر معلوم نہیں وہ نر جنتی ہے یا مادہ؟ پھر وہ مادہ بلوغ تک پہنچتی بھی ہے یا نہیں؟ پھر وہ گابھن ہوتی ہے یا بانجھ نکلتی ہے؟ پھر وہ بچہ جنتی بھی ہے یا حمل ضائع ہو جاتا ہے؟ یہ

سب احتمالات ہیں، اس لئے یہ بیع بھی جہالت اور مخاطرہ کی وجہ سے ممنوع ہے۔ اور اسی کو بیع نتاج النتاج بھی کہتے ہیں۔

تیسری مثال —— رسول اللہ ﷺ نے اُدھار بعوض اُدھار بیع سے منع کیا (رواہ الدار قطنی، مشکوۃ حدیث ۲۸۶۳)

فائدہ: بیع میں اصل یہ ہے کہ دونوں عوض نقد ہوں، تبھی متعاقدین کو پورا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن لوگوں کی حاجت کی وجہ سے بیع میں جو عوض مقصود بالذات ہے اس کا نقد ہونا ضروری قرار دیا گیا۔ اور جو عوض وسیلہ (ثمن) ہے اس کے ادھار کی گنجائش رکھی گئی۔ کیونکہ اگر مبیع بھی بیع میں ادھار ہوگی تو بیع کا فائدہ کیا؟ اس لئے ادھار کے بدل ادھار بیچنے کی ممانعت کی گئی البتہ بیع صَرف میں دونوں عوضوں کا نقد ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے دونوں عوضوں میں مبیع ہونے کی شان ہے۔ اور بیع سَلم میں لوگوں کی حاجت کے پیش نظر مبیع کے بجائے ثمن کا نقد ہونا ضروری ہے (فائدہ تمام ہوا)

چوتھی مثال —— نبی ﷺ نے ایک سودے میں دوسودے کرنے سے منع کیا (مشکوۃ حدیث ۲۸۶۸و۲۸۶۹)

اور ایک سودے میں دوسودوں کی صورت یہ ہے کہ بائع کہے: اس چیز کی نقد قیمت ایک ہزار ہے اور ادھار دو ہزار، پھر کوئی بات طے کئے بغیر مشتری مبیع لے کر چل دے تو بیع فاسد ہے۔ کیونکہ بعد میں نزاع کا احتمال ہے۔

اور بعض نے یہ تفسیر کی ہے کہ ایک شخص دوسرے سے کہے: آپ مجھے اپنا یہ گھر ایک لاکھ میں بیچیں، بشرطیکہ اپنا گھوڑا بھی دس ہزار میں بیچیں۔ یہ بیع بھی فاسد ہے۔ کیونکہ اگر وہ گھوڑا دس ہزار میں نہیں بیچے گا تو شرط کرنے والا بعد میں جھگڑا کرے گا۔

پانچویں مثال —— کوئی چیز اس شرط پر بیچنا کہ اگر مشتری اس کو کبھی فروخت کرے تو بائع ہی کو خریدنے کا حق ہوگا۔

حضرت ابن مسعودؓ نے اپنی اہلیہ زینب ثقفیہ رضی اللہ عنہا سے ایک باندی خریدی۔ زینب نے شرط لگائی کہ اگر آپ اس کو بیچیں تو اس کو میں ہی لونگی، اس قیمت پر جس پر آپ اس کو بیچیں۔ حضرت ابن مسعود نے حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے یہ مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا: لاتقربها وفيها شرط لأحدٍ: آپ اس سے صحبت نہ کریں، درانحالیکہ اس میں کسی کے لئے کوئی شرط ہو (رواہ مالک فی الموطا، جامع الاصول ۱: ۴۲۵) یعنی اس شرط کے ساتھ یہ بیع فاسد ہے۔ پس اس باندی سے مشتری کا استمتاع جائز نہیں۔

چھٹی مثال —— رسول اللہ ﷺ نے استثنا سے منع کیا۔ مگر یہ کہ معلوم چیز کا استثنا ہو (مشکوۃ حدیث ۲۸۶۱)

مجہول استثنا کی صورت یہ ہے کہ کہے: یہ گیہوں پچاس مَن ہے۔ اس قیمت سے آپ کو فروخت کرتا ہوں، مگر گھر کی ضرورت کے لئے کچھ رکھ لونگا۔ یا باغ فروخت کرے اور چند درختوں کا استثنا کرے، اور وہ متعین نہ ہوں تو یہ ایسی جہالت ہے جو منازعت تک پہنچانے والی ہے، اس لئے یہ بیع فاسد ہے۔

جو شرط مُفضی الی النزاع ہو وہی مُفسد بیع ہے —— ہر جہالت مُفسد بیع نہیں۔ کیونکہ معاملات میں بہت سی باتیں مبہم چھوڑ دی جاتی ہیں۔ اور عرف کے مطابق عمل کیا جاتا ہے۔ اور کوئی نزاع پیدا نہیں ہوتا۔ اور سب باتوں کی وضاحت ضروری ہونے کی شرط لگانے میں لوگوں کے لئے پریشانی ہے۔ پس قاعدہ یہ ہے کہ جو شرط مُفضی الی النزاع ہو وہی مُفسد بیع ہے۔

ومنها : أن لاتنقطع المنازعة بين العاقدين: لإبهام في العوضين، أو يكونَ العقدُ بيعةً في بيعتين، أولا يمكن تحقق الرضا إلا برؤية المبيع، ولم يره، أو يكونَ في البيع شرطٌ يُحتجُّ به من بعدُ.

ونهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع المَضَامِيْنِ والملاقيح: فالمضامينُ: ما في أصلاب الفحول، والملاقيح: مافي البطون؛ وعن بيع حَبَلِ الحَبَلَة، وعن بيع الكالِئِ بالكالِئِ، وعن بيعتين في بيعةٍ: هو أن يكونَ البيعُ بألف نقدًا، وألفين نسيئةً، لأنه لايتعين أحد الأمرين عند العقد. وقيل: أن يقول: بِعْني هذا بألف على أن تبيعني ذلك بكذا، وهذا شرطٌ يُحْتَجُّ به الشارط من بعدُ، فيخاصم.

ومنه : أن يبيعَ بشرطٍ إن أراد البيعَ هو أحقُّ به، وقال فيه عمر رضي الله عنه: لاتحلُّ لك وفيها شرطٌ لأحدٍ.

ونهى النبي صلى الله عليه وسلم عن الثُنْيَا حتى يُعلم، مثلُ أن يبيعَ عشرةَ أَفْرَاقٍ إلا شيئًا، لأن فيه جهالةً مفضيةً إلى المنازعة.

وما كلُّ جهالةٍ تُفسد البيعَ، فإن كثيرًا من الأمور يُترك مهملاً في البيع واشتراطُ الاستقصاءِ ضررٌ، ولكن المفسدَ هو المفضِي إلى المنازعة.

ترجمہ: اور از انجملہ: یہ ہے کہ نہ ختم ہو متعاقدین کے درمیان منازعت: (۱) عوضین میں کسی ابہام (گول مول بات) کی وجہ سے (۲) یا ہو دو سودوں میں ایک سودا یعنی دونوں سودے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوں (آگے جو دو تفسیریں آرہی ہیں ان میں سے دوسری تفسیر میں یہی صورت ہے) (۳) یا رضامندی کا پایا جانا ممکن نہ ہو مگر مبیع کو دیکھنے سے، اور مشتری نے مبیع دیکھی نہ ہو (۴) یا بیع میں کوئی ایسی شرط ہو جس کے ذریعہ بعد میں دلیل پکڑی جائے ——— اور رسول اللہ ﷺ نے مضامین وملاقیح کی بیع کی ممانعت فرمائی۔ پس مضامین: وہ نطفہ ہے جو نروں کی پُشت میں ہے۔ اور ملاقیح: وہ بچہ ہے جو پیٹوں میں ہے۔ اور رو کا حمل کے حمل کی بیع سے۔ اور اُدھار کی اُدھار سے بیع سے۔ اور ایک سودے میں دو سودوں سے: وہ یہ ہے کہ نقد بیع ہزار کے بدل اور ادھار دو ہزار کے بدل ہو۔ کیونکہ بوقت عقد دو باتوں میں سے ایک بات متعین نہیں ہے۔ اور کہا گیا: یہ کہے: آپ مجھے یہ چیز ہزار کے عوض بیچیں، اس شرط کے ساتھ کہ آپ مجھے وہ چیز بھی بیچیں اتنے میں (یہ دو سودوں میں ایک سودا ہے یعنی دو چیزوں کا سودا ایک ساتھ کیا گیا ہے) اور یہ ایسی شرط ہے جس سے شرط لگانے والا بعد میں استدلال کرے گا — اور اسی سے ہے کہ بیچے وہ اس شرط سے کہ اگر وہ (مشتری) بیچنا چاہے تو وہ (بائع) اس کا زیادہ حقدار ہے۔ اور اس کے بارے میں عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "نہیں حلال ہے باندی آپ کے لئے درانحالیکہ

اس میں کسی کے لئے شرط ہے —— اور منع فرمایا نبی ﷺ نے استثنا کرنے سے یہاں تک کہ وہ جانا جائے۔ مثلاً یہ کہ بیچے دس فَرق (پیمانے) مگر کچھ (مستثنیٰ کرے) اس لئے کہ اس میں ایسی جہالت ہے جو منازعت تک پہنچانے والی ہے —— اور ہر جہالت بیع کو فاسد نہیں کرتی، اس لئے کہ بہت سی باتیں بیع میں مبہم چھوڑ دی جاتی ہیں۔ اور معاملہ کی صفائی میں آخری حد تک جانے کی شرط لگانے میں ضرر ہے۔ بلکہ مُفسد: منازعت کی طرف پہنچانے والی شرط ہی ہے۔

لغات: المضامین: المِضْمَان کی جمع ہے بمعنی ضامن، کفیل، ذمہ دار۔ مراد: نر کا نطفہ ہے کیونکہ وہی حمل کا ضامن ہے...... الملاقیح: مَلْقُوْحَة کی جمع ہے بمعنی حمل والیاں۔ مراد: پیٹ کا بچہ (جنین) ہے...... الکالِئ (اسم فاعل) کَلأَ (ف) کَلْئًا الدینُ: قرض کی ادائیگی میں دیر ہونا۔

☆ ☆ ☆

چوتھی وجہ: بیع سے کسی اور معاملہ کا قصد

بیع سے کسی ایسے معاملہ کا قصد کیا جائے جس کا بیع کے ضمن میں یا اس کے ساتھ انتظار ہو تو بھی بیع فاسد ہوگی۔ کیونکہ اگر وہ دوسری چیز حاصل نہ ہوئی تو وہ نہ تو اس کا مطالبہ کر سکے گا اور نہ خاموش رہ سکے گا۔ مطالبہ اس لئے نہیں کر سکے گا کہ وہ چیز معاملہ میں داخل نہیں۔ اور خاموش اس لئے نہیں رہ سکے گا کہ سودے سے وہی مقصود ہے۔ پس یہ چیز ناحق خصومت کا سبب بن جائے گی۔ اور اس کا دوٹوک فیصلہ ممکن نہ ہوگا۔

مثال —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”قرض اور بیع جائز نہیں۔ اور بیع میں دو شرطیں جائز نہیں“ (مشکوٰۃ حدیث ۲۸۷۰)

قرض اور بیع کی صورت: یہ ہے کہ کہے: میں آپ کو یہ چیز اس شرط پر بیچتا ہوں کہ آپ مجھے اتنا قرض دیں۔ اور بیع میں دو شرطوں: سے مراد یہ ہے کہ ایک حقوقِ عقد کا مطالبہ کرے جو عقد کا مقتضی ہیں۔ اور ساتھ ہی کسی اور چیز کی بھی شرط لگائے جو عقد کا مقتضی نہیں ہے۔ مثلاً: کہے کہ آپ مجھے فلاں چیز ہدیہ دیں یا فلاں کے یہاں سفارش کریں یا جب آپ مبیع فروخت کریں تو مجھے ہی فروخت کریں۔ اسی طرح کی کوئی اور شرط جو عقد کا مقتضی نہ ہو۔ پس یہ ایک عقد میں دو شرطیں ہیں جو ممنوع ہیں۔

فائدہ: دو حدیثوں میں تعارض ہے (۱) حضرت عبداللہ بن عمر و رضی اللہ عنہما کی ضعیف حدیث ہے: إن النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن بیع و شرط (مجمع الزوائد ۴: ۸۵) جمہور نے اس روایت کو لیا ہے۔ ان کے نزدیک ایک شرط سے بھی بیع فاسد ہو جاتی ہے (۲) مذکورہ روایت جو صحیح ہے: امام احمد رحمہ اللہ نے اس کو لیا ہے۔ ان کے نزدیک: بیع میں ایک شرط جائز ہے، دو شرطیں جائز نہیں —— حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے دونوں روایتوں میں بہترین تطبیق دی ہے کہ دو شرطوں والی روایت میں ایک شرط تو وہ ہے جو عقد کا مقتضی ہے۔ اور دوسری شرط وہ ہے جو عقد کا مقتضی نہیں۔ عقد

سے خارج ہے۔ وہی مُفسد عقد ہے۔ اور ایک شرط والی روایت میں یہی شرطِ خارجی مراد ہے۔ پس دونوں روایتوں میں کچھ تعارض نہیں۔

ومنها: أن يُقصَد بهذا البيع معاملةٌ أخرى، يترقَّبُها في ضمنه، أو معه: لأنه إن فقدَ المطلوبَ: لم يكن له أن يُطالب، ولا أن يَسْكُتَ، ومثلُ هذا حقيقٌ بأن يكون سببا للخصومة بغير حق، ولا يُقضىٰ فيها بشيئ فَصْلٍ.

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " لايحلُّ بيعٌ وسَلَفٌ، ولاشرطانِ في بيع" مثلُ أن يقول: بعتُ هذا على أن تُقْرِضَنِيْ كذا؛ ومعنى الشرطين: أن يشترطَ حقوقَ البيع، ويشترط شيئًا خارجًا منها، مثلُ أن يَهَبَهُ كذا، أو يشفع له إلى فلان، أو إن احتاج إلى بيعه لم يَبِعْ إلا منه، ونحوُ ذلك، فهذا شرطان في صفقة واحدة.

ترجمہ: اور از انجملہ: یہ ہے کہ قصد کیا جائے اس بیع سے کسی ایسے دوسرے معاملہ کا جس کا وہ انتظار کرتا ہے بیع کے ضمن میں یا بیع کے ساتھ: اس لئے کہ اگر اس نے مطلوب کو گم کیا: تو اس کے لئے حق نہیں ہوگا کہ مطالبہ کرے، اور نہ یہ کہ خاموش رہے۔ اور اس طرح کی چیز اس بات کے لائق ہے کہ وہ ناحق خصومت کا سبب بن جائے۔ اور اس خصومت میں کسی دوٹوک بات سے فیصلہ نہ کیا جاسکے —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جائز نہیں بیع اور قرض۔ اور جائز نہیں بیع میں دو شرطیں" مثلاً یہ کہ کہے: میں نے یہ چیز اس شرط پر بیچی کہ آپ مجھے اتنا قرض دیں (یہ حدیث کے پہلے جزء کی شرح ہے) اور دو شرطوں کے معنی: یہ ہیں کہ بیع کے حقوق کی شرط لگائے (جو جائز ہے، کیونکہ حقوق تو بغیر شرط کے بھی ثابت ہوتے ہیں) اور شرط لگائے کسی چیز کی ان حقوق کے علاوہ۔ مثلاً: یہ کہ وہ بخشش کرے اس کو اتنا یا سفارش کرے اس کی فلاں کے پاس یا اگر وہ محتاج ہو اس کے بیچنے کی طرف تو نہ بیچے وہ مگر اسی سے، اور اس کے مانند (یہی شرط مفسد عقد ہے کیونکہ یہ عقد کا مقتضی نہیں اور اس میں متعاقدین میں سے ایک کا فائدہ ہے) پس یہ ایک عقد میں دو شرطیں ہیں۔

☆ ☆ ☆

پانچویں وجہ: مبیع کا قبضہ میں نہ ہونا

اگر مبیع کو سپرد کرنا بائع کے اختیار میں نہ ہو، جیسے وہ مبیع جو بائع کے قبضہ میں نہیں ہے، بلکہ وہ صرف ایک حق ہے جو اس کے لئے دوسرے پر ثابت ہوا ہے۔ اور ایسی چیز ہے جس کو مقدمہ کئے بغیر یا گواہ قائم کئے بغیر، یا دوڑ دھوپ اور تدبیر کئے بغیر، یا ناپ تول کرکے وصول کئے بغیر، یا ایسی ہی کوئی اور صورت کے بغیر نہیں پاسکتا تو بھی بیع فاسد ہے۔ کیونکہ جب مبیع

ایسی چیز ہوگی تو اندیشہ ہے کہ مقدمہ در مقدمہ کا سلسلہ قائم ہو جائے۔ یا دھوکہ ہو اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑے۔ اور جو بھی چیز قبضہ میں نہیں ہوتی اس کے بارے میں اطمینان نہیں کیا جاسکتا کہ وہ چیز کافی جِد وجُہد کے بغیر حاصل ہو جائے گی۔ اور کبھی مشتری بائع سے قبضہ کا مطالبہ کرتا ہے، اور مبیع اس کے پاس نہیں ہوتی تو وہ یا تو اس شخص سے مطالبہ کرے گا جس پر اس کا حق ثابت ہوا ہے، یا جنگل میں شکار کے لئے جائے گا، یا بازار سے خریدے گا، یا اپنے دوست سے ہبہ مانگے گا (یا آسمان کے تارے توڑے گا) اور یہ سخت ترین معاملہ ہے اس لئے ایسی مبیع کی بیع شریعت نے ممنوع قرار دی۔ اس کی تین مثالیں درج ذیل ہیں:

پہلی مثال —— حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ایک شخص میرے پاس آتا ہے۔ اور مجھ سے ایسی چیز خریدنا چاہتا ہے جو میرے پاس نہیں ہے، میں اس کو بازار سے خرید کر دونگا؟ آپؐ نے فرمایا: ''وہ چیز نہ بیچو جو تمہارے پاس نہیں ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۸۶۷) یعنی فروخت کرتے وقت مبیع کا ملکیت میں ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اندیشہ ہے: وہ چیز بازار میں دستیاب نہ ہو، تو جھگڑا پیدا ہوگا۔

دوسری مثال —— حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دھوکہ کی بیع سے منع فرمایا (مشکوٰۃ حدیث ۲۸۶۵) دھوکہ کی بیع سے مراد: ایسی چیز کو فروخت کرنا ہے جس کے بارے میں یقین نہ ہو کہ وہ موجود ہے یا نہیں؟ اور وہ اس کو حاصل کر سکے گا یا نہیں؟ یعنی مبیع ملکیت میں تو ہو مگر قبضہ میں نہ ہو تو اس کی بیع بھی درست نہیں۔ کیونکہ اندیشہ ہے کہ قبضہ نہ مل سکے۔

تیسری مثال —— حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص کوئی اناج خریدے، تو وہ اس کو اس وقت تک فروخت نہ کرے جب تک اس کو وصول نہ کر لے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۸۴۴) یعنی مبیع میں قبضہ سے پہلے تصرف کرنا جائز نہیں۔ رہی یہ بات کہ یہ حکم طعام کے ساتھ خاص ہے یا عام؟ تو اس میں تین رائیں ہیں:

پہلی رائے —— ائمہ ثلاثہ کی ہے۔ ان کے نزدیک یہ حکم طعام کے ساتھ خاص ہے۔ اور طعام سے مراد ان کے نزدیک تمام ربوی اشیاء ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر چیزوں کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنا درست ہے۔ اور تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ طعام کا لین دین زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی حاجت بھی زیادہ پیش آتی ہے۔ اور اس سے انتفاع بھی اس کو ختم کرنے کے ذریعہ ہوتا ہے یعنی جب اناج کھالیا جاتا ہے تبھی اس سے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ پس اگر طعام: مشتری نے وصول نہیں کیا تو ممکن ہے بائع اس میں تصرف کرے یعنی کھا کر ختم کر دے۔ اور قبضہ نہ ملے تو قضیہ در قضیہ کھڑا ہو جائے یعنی ایک نزاع: مشتری اور بائع کے درمیان ہوگا۔ اور دوسرا: مشتری اور اس سے خریدنے والے کے درمیان ہوگا۔ اس لئے طعام کی بیع قبل القبض درست نہیں۔

دوسری رائے —— امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کی ہے کہ تمام منقولات: طعام کے حکم میں ہیں۔ کیونکہ

منقولات میں تبدیلی بھی ہوسکتی ہے اور وہ عیب دار بھی ہوسکتے ہیں۔ البتہ عقار (جائداد) میں قبضہ سے پہلے تصرف جائز ہے۔ کیونکہ اس میں نہ تبدیلی ہوسکتی ہے اور نہ وہ عیب دار ہوسکتی ہیں۔

تیسری رائے ـــــ امام محمد رحمہ اللہ کی ہے۔ ان کے نزدیک ہر مبیع کا یہی حکم ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اگرچہ طعام کو وصول کرنے سے پہلے فروخت کرنے کی ممانعت کی ہے، مگر میں ایسا گمان کرتا ہوں کہ یہ حکم ہر چیز کے لئے عام ہے (مشکوٰۃ حدیث ۲۸۴۶) شاہ صاحب قدس سرہ نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔ کیونکہ یہ رائے ممانعت کی اس وجہ کے زیادہ موافق ہے جو ابھی گذری یعنی جائداد اگرچہ ضائع اور عیب دار نہیں ہوسکتی، مگر اس پر قبضہ کرنے کے لئے کبھی بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں، اس لئے اس کی بیع بھی قبضہ سے پہلے ممنوع ہے۔

ومنها: أن لايكونَ التسليمُ بيد العاقد، كمبيع ليس بيد البائع، وإنما هو حقٌّ توجَّهَ له على غيره، وشيئٌ لايجده إلا برفع قضيةٍ، أو إقامةِ بينةٍ، أو سعي واحتيال، أو استيفاءٍ واكتيالٍ، أو نحوِ ذلك: فإنه مظنةُ أن يكون قضيةٌ في قضيةٍ، أو يحصل غررٌ وتخييبٌ، وكلُّ ماليس عندك فلا تأمنُ أن تجده إلا بجُهْدِ النفس، وربما يطالبه المشترى بالقبض فلايكون عنده، فيطالب الذى توجَّهَ عليه حقُّه، أو يذهبُ ليصطاد من البرية، أو يشترىَ من السوق، أو يستوهبَ من صديقه، وهذا أشدُّ المناقشات.

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "لاتَبِعْ ماليس عندك"

ونهى عن بيع الغرر: وهو الذى لايتيقن أنه موجود أو لا؟ وهل يجده أولا؟

قال صلى الله عليه وسلم: "من ابتاع طعامًا فلا يَبِعْهُ حتى يستوفِيَه" قيل: مخصوص بالطعام، لأنه أكثرُ الأموال تعاوُرًا وحاجةً، ولايُنتفع به إلا بإهلاكه، فإذا لم يستوفِهِ فربما تصرف فيه البائع، فيكون قضيةً في قضيةٍ. وقيل: يجرى في المنقول: لأنه مظنةُ أن يتغير ويَتَعَيَّبَ فتحصل الخصومة في الخصومة. وقال ابن عباس رضى الله عنهما: ولاأَحْسِبُ كلَّ شيئ إلا مثلَه؛ وهو الأقيس بماذكرنا من العلة.

ترجمہ: اور ازانجملہ: یہ ہے کہ مبیع کا سونپنا بائع کے اختیار میں نہ ہو، جیسے وہ مبیع جو بائع کے قبضہ میں نہیں ہے۔ اور وہ (مبیع) صرف ایک حق ہے جو اس کے لئے اس کے علاوہ پر متوجہ ہوا ہے۔ اور (وہ مبیع) کوئی ایسی چیز ہے جس کو نہیں حاصل کرسکے گا وہ مگر قاضی کے یہاں مقدمہ لے جانے کے ذریعہ یا گواہ قائم کرنے یا دوڑ دھوپ اور تدبیر کرنے یا

وصول کرنے اور نا پنے یا اس کے مانند کے ذریعہ۔ پس بیشک وہ مبیع احتمالی جگہ ہے کہ وہ قضیہ در قضیہ ہو یا حاصل ہو دھوکہ یا ناکامی۔ اور ہر وہ چیز جو آپ کے پاس نہیں ہے، پس آپ اس بات سے مطمئن نہیں ہیں کہ اس کو حاصل کرسکیں، مگر بڑی جدوجہد کے ذریعہ۔ اور کبھی مشتری اس چیز کے قبضہ کا مطالبہ کرے گا، پس نہیں ہوگی وہ بائع کے پاس، پس وہ اس شخص سے مطالبہ کرے گا جس کی طرف اس کا حق متوجہ ہوا ہے یا جائے گا تا کہ شکار کر لائے جنگل سے یا خریدے گا بازار سے یا بخشش چاہے گا اپنے دوست سے۔ اور یہ شدید ترین جھگڑا ہے (باقی ترجمہ واضح ہے)

☆ ☆ ☆

چھٹی وجہ: بیمِ زیاں

ممانعت کی ایک وجہ: نقصان کا اندیشہ ہے۔ جیسے پختگی آنے سے پہلے پھل بیچنا، بالیاں سفید ہونے سے پہلے گیہوں کا کھیت بیچنا اور باغ کی بہار بیچنا اسی بنا پر ممنوع ہے۔ کیونکہ اگر آفتوں سے پھل خراب ہوگیا، یا فیصلۂ خداوندی سے پھل کم آیا یا نہ آیا تو نزاعات پیدا ہوں گے نیز بائع کے لئے طے شدہ ثمن لینا دیانۃً درست نہ ہوگا، اس لئے مذکورہ بیوع کی ممانعت کی گئی۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ممانعت کی ایک وجہ یہ ہے کہ بعض چیزیں ایسے جھگڑوں کی احتمالی جگہ ہوتی ہیں جو نبی ﷺ کے زمانہ میں پیش آچکے ہیں۔ اور نبی ﷺ نے یہ بات جان لی ہے کہ آئندہ بھی ایسے جھگڑے پیش آسکتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ عہد نبوی میں لوگ پھل (کھجوریں) خریدتے تھے۔ پھر جب لوگ پھل توڑتے اور مالکان کے تقاضے ہوتے تو خریدار کہتا: پھل گوبر کی طرح کالا پڑ گیا! پھلوں میں بیماری آگئی! پھل جھڑ گیا! چند آفات کے ذریعہ وہ احتجاج کرتے۔ جب نبی ﷺ کے پاس ایسے بہت جھگڑے آئے تو آپؐ نے فرمایا: ''جب لوگ جھگڑوں سے باز نہیں آتے تو خرید وفروخت مت کرو، یہاں تک کہ پھلوں میں پختگی آجائے'' یہ آپؐ نے خصومات کی کثرت کی بنا پر ایک مشورہ دیا تھا (بخاری حدیث ۲۱۹۳) اسی طرح آپؐ نے گیہوں کی بالیاں بیچنے سے بھی منع کیا، جب تک وہ سفید نہ ہوجائیں اور آفت سے محفوظ نہ ہوجائیں (مشکوۃ حدیث ۲۸۳۹) اور ارشاد فرمایا: ''بتاؤ، اگر اللہ تعالیٰ پھل کو روک دیں تو تم کس چیز کے عوض اپنے بھائی کا مال لوگے؟!'' (مشکوۃ حدیث ۲۸۴۰) یعنی اس بیع میں دھوکہ ہے۔ خطرہ ہے کہ مبیع ہلاک ہوجائے، اور مفت میں ثمن دینا پڑے۔ اس لئے بیم زیاں کی وجہ سے اس بیع کی ممانعت کی ہے۔ اور یہی وجہ باغ کی بہاریں بیچنے کی ممانعت کی ہے۔ یعنی باغ کی فصل کئی سال تک فروخت کرنے سے بھی اس لئے منع کیا گیا ہے کہ معلوم نہیں پھل آئے گا یا نہیں؟ اور آئے گا تو باقی رہے گا یا کسی ناگہانی حادثہ سے ضائع ہوجائے گا؟ پس احتمال ہے کہ خریدار کو سخت نقصان پہنچے۔ اس وجہ سے اس بیع کی ممانعت کی۔

فائدہ: پھل اور کھیتی جب تک مال نہ بن جائیں بیع باطل ہے۔ اور مال بننے کے بعد پختگی سے پہلے بیچنے کی تین صورتیں ہیں: اول: پھل فوراً توڑ لینے اور کھیت فوراً کاٹ لینے کی شرط کے ساتھ۔ یہ بیع درست ہے۔ دوم: پکنے تک پھل درخت پر اور کھیتی زمین میں کھڑی رکھنے کی شرط کے ساتھ۔ یہ بیع فاسد ہے۔ سوم: مطلقاً بیچنا۔ پھر بائع کی اجازت سے پکنے تک پھلوں کو درخت پر اور کھیتی کو زمین میں رہنے دینا۔ جہاں اس طرح کا عرف ہو، وہ مشروط کی طرح ہے۔ اور جہاں اس کا عرف نہ ہو جائز ہے (اس فائدہ کا کچھ حصہ کتاب میں ہے)

ومنها: ماهو مظِنة لمناقشات وقعت في زمانه صلى الله عليه وسلم، وعَرَفَ أنه حقيقٌ بأن تكونَ فيه المناقشاتُ كما ذكر زيدُ بن ثابت رضي الله عنه: أنهم كانوا يحتجُّون بعاهاتٍ تُصيب الثمارَ، يقولون: أصابها قُشَامٌ، دُمَانٌ، فنهى النبيُّ صلى الله عليه وسلم عن بيع الثمار حتى يَبْدُوَ صلاحُها — اللهم إلا أن يشترطا القطعَ في الحال — "وعن السنبل حتى يَبْيَضَّ ويأمَنَ العاهةَ، وقال:" أرأيتَ إذا منع الله الثمرةَ بم يأخذ أحدُكم مالَ أخيه؟!" يعني أنه غررٌ: لأنه على خَطَرِ أن يَهلك فلايجد المعقودَ عليه، وقد لزمه الثمنُ؛ وكذا في بيع السِّنِين.

ترجمہ: اور از انجملہ: وہ چیز ہے جو ایسے جھگڑوں کی احتمالی جگہ ہے جو نبی ﷺ کے زمانے میں پیش آچکے ہیں۔ اور آپؐ نے جانا کہ وہ اس بات کے لائق ہیں کہ اس چیز میں (آئندہ بھی) جھگڑے ہوں۔ جیسا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ لوگ ایسی آفتوں کے ذریعہ احتجاج کیا کرتے تھے جو پھلوں کو پہنچتی تھیں۔ وہ کہتے: پھلوں کو پہنچی پھلوں کی کمی، پھل سیاہ ہوگیا، پس نبی ﷺ نے پھلوں کو فروخت کرنے سے منع کیا، یہاں تک کہ ان کا کارآمد ہونا ظاہر ہوجائے — اے اللہ! مگر یہ کہ دونوں شرط کریں فوراً توڑ لینے کی — اور منع کیا بالیوں کے بیچنے سے یہاں تک کہ وہ سفید ہوجائیں اور آفت سے محفوظ ہوجائیں۔ اور فرمایا: "بتاؤ، جب اللہ تعالیٰ پھل کو روک لیں، پس کس چیز کے بدل تم میں کا ایک اپنے بھائی کا مال لے گا؟" یعنی یہ بیع دھوکہ ہے، اس لئے کہ وہ خطرہ پر ہے کہ ہلاک ہوجائے، پس نہ پائے مشتری اس چیز کو جس پر عقد ہوا ہے۔ درانحالیکہ اس پر ثمن لازم ہو چکا ہے۔ اور یہی وجہ ہے سالوں کی بیع میں۔

☆ ☆ ☆

ساتویں وجہ: ملکی مصلحت

بعض معاملات مملکت کی بد انتظامی اور لوگوں کی ضرر رسانی کا سبب ہوتے ہیں جن کی روک تھام ضروری ہے۔ ایسے پانچ معاملات ہیں جن کی مختلف حدیثوں میں ممانعت وارد ہوئی ہے۔ وہ احادیث درج ذیل ہیں:

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خریداری کیلئے کھیپ کا استقبال نہ کرو، اور بعض بعض کے خلاف سودا نہ کریں اور دھوکہ دینے کے لئے چیزوں کی قیمتیں نہ بڑھاؤ۔ اور کوئی شہری کسی دیہاتی کے لئے بیع نہ کرے'' (مشکوۃ حدیث ۲۸۴۷)

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے ذخیرہ اندوزی کی وہ خطا کار ہے'' (مشکوۃ حدیث ۲۸۹۲)

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کھیپ لانے والا روزی دیا ہوا ہے، اور ذخیرہ اندوزی کرنے والا پھٹکارا ہوا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۲۸۹۳)

ان احادیث میں جن پانچ معاملات کی ممانعت کی گئی ہے، ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلا معاملہ ـــــ **کھیپ کا استقبال کرنا ممنوع ہے** ـــــ شہر کے باہر سے کوئی شخص (لادی والا یا دیہاتی) تجارتی مال لیکر شہر میں آرہا ہو، اور وہ بازار کے بھاؤ سے بے خبر ہو، اس سے کوئی تاجر باہر نکل کر ملاقات کرے۔ اور بھاؤ غلط بتا کر اس سے سودا کرے تو یہ ممنوع ہے۔ اس میں بائع کا بھی ضرر ہے اور عوام کا بھی۔ بائع کا ضرر یہ ہے کہ اگر وہ اپنا مال لیکر بازار میں پہنچتا تو اس کو زیادہ قیمت ملتی۔ اسی وجہ سے جب اس کو گھاٹے کی اطلاع ہو تو اس کو بیع باقی رکھنے نہ رکھنے کا اختیار ہے۔ مسلم شریف میں روایت ہے کہ کھیپوں کا استقبال نہ کرو۔ جو شخص اس سے ملاقات کرے اور اس سے خریداری کرے، پھر جب کھیپ کا مالک بازار میں آئے تو اس کو اختیار ہے'' (مشکوۃ حدیث ۲۸۴۸)

اور عوام کا ضرر یہ ہے کہ جو مال باہر سے آتا ہے اس کے ساتھ تمام شہریوں کا حق متعلق ہو جاتا ہے۔ اور شہری مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ جس کو اس مال کی زیادہ حاجت ہے وہ مقدم ہے، پھر درجہ بہ درجہ۔ اور اگر سب ضرورت میں مساوی ہوں تو سب برابر ہوں گے۔ پھر یا تو ہر ایک کو حصہ رسد ملے گا یا قرعہ اندازی کریں گے۔ پس کسی ایک شہری کا باہر نکل کر اس چیز کو خرید لینا باقی شہریوں پر ایک طرح کا ظلم ہے۔

مگر شہری اس بیع کو ختم نہیں کر سکتے۔ کیونکہ خریدار نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا۔ اتنا ہی نقصان کیا ہے کہ جس چیز کے وہ امیدوار تھے وہ چیز ان کو حاصل نہیں ہوسکی۔ اور صرف اتنی بات پر بیع فسخ نہیں کی جاسکتی۔

دوسرا معاملہ ـــــ **سودے پر سودا کرنے کی ممانعت** ـــــ ایک شخص کی بائع سے یا مشتری سے بات چیت چل رہی ہے۔ اور سودا ہونے ہی والا ہے کہ دوسرا شخص بیچ میں کود ے اور کچھ بڑھ کر سودا کرے یا کچھ سستا بیچے تو یہ ممنوع ہے۔ کیونکہ اس میں ایک مسلمان کا نقصان اور اس کے ساتھ بدمعاملگی ہے۔ نیز جب پہلے شخص کے ساتھ بات تکمیل کے مراحل میں داخل ہو چکی ہے تو اس مبیع کے ساتھ اس کا حق متعلق ہو گیا ہے۔ اور اس کی روزی کی ایک صورت سامنے آگئی ہے۔ پس اس کا معاملہ خراب کرنا اور اس سے مزاحمت کرنا ایک طرح کا ظلم ہے۔

تیسرا معاملہ ـــــ **نجش کی ممانعت** ـــــ نجش: یہ ہے کہ ایک شخص کو چیز خریدنی نہیں ہے، صرف خریدار کو پھنسانے کے لئے قیمت بڑھاتا ہے۔ اور بڑھ کر دام لگاتا ہے تو یہ بھی ممنوع ہے۔ اور اس کا ضرر مخفی نہیں۔

چوتھا معاملہ —— شہری کو دیہاتی کے لئے بیچنے کی ممانعت —— ایک دیہاتی اپنا تجارتی مال لے کر شہر آیا۔ وہ اسی دن جو بھی قیمت ملے گی: مال فروخت کر کے گھر لوٹ جائے گا۔ اب اس کے پاس ایک شہری آتا ہے۔ اور کہتا ہے: آج بھاؤ کم ہے۔ مت بیچ۔ مال میرے پاس رکھ دے۔ چند دنوں کے بعد میں اس کو زیادہ قیمت پر فروخت کرونگا۔ تو یہ ممنوع ہے۔ کیونکہ دیہاتی بذاتِ خود بیچے گا تو سستا بیچے گا اور شہریوں کو نفع ہوگا۔ اور دیہاتی کو بھی نفع ہوگا۔ کیونکہ نفع کی دو صورتیں ہیں: ایک صورت یہ ہے کہ کچھ دنوں کے بعد مال زیادہ قیمت پر بکے اور اس کو وہ شخص خریدے جس کو اس مال کی حاجت ہے۔ اور حاجت مند کے لئے زیادہ قیمت دینا کچھ دشوار نہیں۔ دوسری صورت: یہ ہے کہ تھوڑے نفع میں بیچ دے، اور دوسرا مال لائے۔ اسی طرح کرتا رہے تو تھوڑا نفع بھی زیادہ نفع ہو جائے گا۔ اور نفع کی یہ دوسری صورت ملکی مصلحت سے زیادہ ہم آہنگ ہے اور اس میں برکت بھی زیادہ ہے۔

پانچواں معاملہ —— ذخیرہ اندوزی کی ممانعت —— جس سامان کے شہر والے محتاج ہوں، اس کو محض گرانی اور قیمت کی زیادتی کی خاطر روک رکھنا: تھوڑے نفع کی توقع پر لوگوں کو ضرر پہنچانا ہے، اور اس میں مملکت کی بدانتظامی ہے، اس لئے ممنوع ہے۔

ومنها: مايكون سبباً لسوء انتظام المدينة، وإضرارِ بعضِها بعضاً، فيجب إخمالُها، الصدُّ عنها.

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " لاتَلَقَّوُا الرُّكبانَ لِبَيْعٍ، ولا يَبِعْ بعضُكم على بيع بعض، ولايَسُمِ الرجلُ على سَوْمِ أخيه، ولاتناجَشوا، ولايَبِعْ حاضرٌ لبادٍ"

أقول:

[١] أمـا تَـلَقِّي الركبان: فهـو أن يَـقْـدَمَ ركبٌ بتـجـارةٍ، فيتلقَّاها رجلٌ قبل أن يدخلوا البلدَ، ويعرِفوا السِّعْرَ، فيشتريَ منهم بأرخصَ من سعر البلد: وهذا مظنةُ:

[الف] ضررٍ بالبائع: لأنه إن نزل بالسوق كان أغلى له، ولذلك كان له الخيار إذا عَثَرَ على الضرر.

[ب] وضـررٍ بـالـعامة: لأنه توجه في تلك التجارة حقُّ أهل البلد جميعاً، والمصلحةُ المدنيةُ تـقـتـضـى أن يُـقَـدَّمَ الأحـوجُ فالأحوج، فإن استووا سُوِّيَ بينهم، أو أُقْرِعَ، فاستئثارُ واحدٍ منهم بالتلقي نوع من الظلم.

وليس لهم الخيار: لأنه لم يفْسد عليهم مالَهم، وإنما منع ما كانوا يرجونَه.

[٢] وأمـا البيع على البيع: فهـو تـضـيـيـق عـلى أصحابه من التجار، وسوءُ معاملةٍ معهم، وقد توجَّه حقُّ البائع الأول، وظهر وجهٌ لرزقه، فإفسادُه عليه، ومزاحمتُه فيه: نوع ظلم.

[٣] وكذا السوم على سـوم أخيـه في التضييق على المشترين، والإساءةِ معهم؛ وكثير من

المناقشات والأحقاد تنبعث من أجل هذين.

[٤] والنجش: وهو زيادة الثمن بلارغبة في المبيع تغريرًا للمشترين، وفيه من الضرر مالايخفى.

[٥] وبيع الحاضر للبادى: أن يَحْمِلَ البدويُّ متاعَه إلى البلد، يريد أن يبيعه بسعر يومه، فيأتيه الحاضر، فيقول: خَلِّ متاعك عندى حتى أبيعَه على المهلة بثمن غالٍ؛ ولوباع البادى بنفسه لأَرْخَصَ، ونَفَعَ البلديين، وانتفع هو أيضًا: فإن انتفاعَ التجار يكون بوجهين: أن يبيعوا بثمن غال بالمهلة على من يحتاج إلى الشيئ أشدَّ حاجة، فيستقلُّ في جنبها ما يبذل؛ أو يبيعوا بربح يسير، ثم يأتوا بتجارة أخرى عن قريب، فَيَرْبَحُوْا أيضا، وهلم جرًّا، وهذا الانتفاعُ أوفق بالمصلحة المدنية، وأكثرُ بركةً.

قال صلى الله عليه وسلم:" من احتكر فهو خاطئٌ"

وقال عليه السلام:" الجالب مرزوق، والمحتكر ملعون"

أقول: وذلك: لأن حبس المتاع مع حاجة أهل البلد إليه، لمجرد طلب الغَلاء وزيادةِ الثمن: إضرارٌ بهم بتوقعِ نفعٍ مَّا، وهو سوءُ انتظام المدينة.

ترجمہ: اور از انجملہ: وہ بات ہے جو مملکت کی بدانتظامی اور مملکت کے بعض کو بعض کے ضرر پہنچانے کا سبب ہوتی ہے پس ضروری ہے ان معاملات کو گمنام کرنا اور ان سے روکنا (اس کے بعد حدیث شریف ہے مگر ولایَسِم الرجل علی سوم أخیہ اس حدیث میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ مسلم شریف کی مستقل حدیث ہے۔ مشکوٰۃ میں اس کا نمبر ۲۸۵۱ ہے) میں کہتا ہوں: (۱) رہا کھیپ کا استقبال کرنا: تو وہ یہ ہے کہ کوئی قافلہ تجارتی سامان لیکر آئے۔ پس اس تجارت سے کوئی شخص ملاقات کرے ان لوگوں کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے، اور ان کے بھاؤ کو جاننے سے پہلے۔ پس ان سے شہر کے بھاؤ سے سستے میں خریدے۔ اور یہ احتمالی جگہ ہے: (الف) بائع کے ضرر کی، اس لئے کہ وہ اگر بازار میں پہنچے گا تو اس کو زیادہ قیمت ملے گی۔ اور اسی وجہ سے اس کو اختیار ہے جب وہ ضرر پر مطلع ہو (ب) اور عوام کے ضرر کی، اس لئے کہ متوجہ ہوا ہے اس تجارت میں شہر کے سبھی لوگوں کا حق۔ اور شہری مصلحت چاہتی ہے کہ زیادہ حاجت مند مقدم کیا جائے، پھر اس سے کم حاجت مند۔ پس اگر سب برابر ہوں تو ان کے درمیان برابری کی جائے یا قرعہ اندازی کی جائے۔ پس ان میں سے ایک کو ترجیح دینا ملاقات کرنے کے ساتھ ایک طرح کا ظلم ہے —— اور نہیں ہے ان کے لئے اختیار: اس لئے کہ اس خریدار نے ان پر ان کا مال نہیں بگاڑا ہے۔ اور صرف روکا ہے اس چیز کو جس کے وہ امیدار تھے —— (۲) رہا بیع پر بیع کرنا: تو وہ اپنے ساتھی تاجروں پر تنگی کرنا ہے۔ اور ان کے ساتھ بدمعاملگی ہے۔ اور تحقیق پہلے بائع کا حق متوجہ ہوا ہے۔ اور اس کے رزق کی ایک صورت

ظاہر ہوئی ہے، پس اس کو اس پر فاسد کرنا، اور اس سے اس روزی میں مزاحمت کرنا: ایک طرح کا ظلم ہے —— (۳) اور اسی طرح ہے اپنے بھائی کے بھاؤ تاؤ پر بھاؤ تاؤ کرنا خریداروں پر تنگی کرنے میں اور ان کے ساتھ برائی کرنے میں۔ اور بہت سے جھگڑے اور کینے ان دو (نمبر ۲ و ۳) کی وجہ سے برانگیختہ ہوتے ہیں (یہ تسامح ہے نمبر ۲ و ۳ ایک ہی ہیں۔ کیونکہ بیع پر بیع تو ہو ہی نہیں سکتی۔ پس اس سے مراد بھی بھاؤ تاؤ کرنا ہے۔ اسی لئے تقریر میں نمبر ۳ کو حذف کر دیا ہے) —— (۴) اور نجش: وہ قیمت بڑھانا ہے مبیع میں رغبت کے بغیر، خریداروں کو دھوکہ دینے کے لئے۔ اور اس میں جو ضرر ہے وہ پوشیدہ نہیں —— (۵) اور شہری کا دیہاتی کے لئے بیچنا: یہ ہے کہ دیہاتی اپنا سامان شہر میں لائے وہ چاہتا ہے کہ اس کو اس دن کے بھاؤ سے بیچے۔ پس آتا ہے اس کے پاس شہری، پس کہتا ہے: چھوڑ اپنا سامان میرے پاس یہاں تک کہ میں اس کو کچھ دنوں کے بعد گراں قیمت پر بیچوں۔ اور اگر دیہاتی بذاتِ خود بیچتا تو سستا بیچتا اور شہریوں کو نفع پہنچتا۔ اور وہ بھی نفع اٹھاتا۔ پس بیشک تاجروں کا نفع دو طرح سے ہوتا ہے: کہ بیچیں وہ گراں قیمت میں کچھ دنوں کے بعد اس شخص کے ہاتھ جو اس چیز کا بہت ہی زیادہ حاجت مند ہے۔ پس وہ شخص کم سمجھے گا حاجت کے پہلو میں اس مال کو جو وہ خرچ کرے گا۔ اور یہ کہ بیچیں وہ تھوڑے نفع سے، پھر جلد ہی لائیں وہ دوسری تجارت، پس نفع اٹھائیں نیز، اور اسی طرح کریں۔ اور یہ انتفاع ملکی مصلحت سے زیادہ ہم آہنگ ہے اور برکت کے اعتبار سے زیادہ ہے —— (پھر دو حدیثیں ہیں جو تقریر میں شروع میں ہیں) میں کہتا ہوں: اور وہ ممانعت اس لئے ہے کہ سامان کا روکنا، اس کی طرف شہر والوں کی حاجت کے ساتھ، محض گرانی اور زیادتی کی طلب میں، لوگوں کو نقصان پہنچانا ہے، تھوڑے نفع کی امید پر۔ اور وہ مملکت کی بدانتظامی ہے۔

☆ ☆ ☆

آٹھویں وجہ: فریب

معاملات میں فریب کرنا اور خریدار کو دھوکہ دینا بھی ممنوع ہے۔ شاہ صاحب نے اس کی دو مثالیں ذکر کی ہیں:

پہلی مثال —— تھن میں دودھ روک کر خریدار کو دھوکہ دینا —— بعض لوگ دودھ والا جانور فروخت کرنا چاہتے ہیں تو کچھ دودھ تھن میں روک لیتے ہیں، تاکہ آئندہ وقت میں جانور کے بھرے ہوئے تھن دیکھ کر خریدار دھوکہ کھائے اور زیادہ قیمت میں خرید لے۔ یہ تغریر فعلی (عملاً دھوکہ دینا) ہے۔ بائع نے اگرچہ زبان سے نہیں کہا کہ یہ جانور اتنا دودھ دیتا ہے، مگر عمل سے دودھ کی زیادتی دکھلائی ہے، اس لئے درج ذیل حدیث میں اس کی ممانعت کی گئی:

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (دھوکہ دینے کے لئے) اونٹنی اور بکری کے تھنوں میں دودھ مت روکو۔ پھر اگر کسی نے ایسا جانور خریدا تو دوہنے کے بعد (جب فریب کھل جائے) اس کو دو مفید باتوں میں اختیار ہے: اگر جانور پسند ہو تو رکھ لے، اور ناپسند ہو تو واپس کر دے، اور ایک صاع کھجور دے" یہ متفق علیہ روایت ہے، اور مسلم شریف کی ایک

روایت میں ہے: ''کسی بھی اناج کا ایک صاع دے، گیہوں کا ضروری نہیں'' (مشکوۃ حدیث ۲۸۴۷)

تشریح: اس حدیث میں تین باتیں ہیں، جن میں سے ایک اتفاقی ہے۔ اور وہی یہاں مقصود ہے، اور دو میں اختلاف ہے:

پہلی بات — تصریہ کے لغوی معنی ہیں: اونٹنی وغیرہ کے تھن کو مضبوط باندھنا تاکہ بچہ دودھ نہ پی سکے۔ اور حدیث میں مرادی معنی ہیں: تھن میں دودھ جمع کرنا تاکہ خریدار دودھ کی زیادتی خیال کر کے دھوکہ کھائے۔ یہ فریب ہے اور معاملات کے موضوع کے خلاف ہے، اس لئے ممنوع ہے۔

دوسری بات — جب مشتری کو فریب کا پتہ چلے تو اس کو بیع باقی رکھنے نہ رکھنے کا جو اختیار ہے: وہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اختیار تام ہے۔ بائع خواہ راضی ہو یا نہ ہو مشتری بیع فسخ کر سکتا ہے۔ اور احناف کے نزدیک یہ اختیار ناقص ہے یعنی بائع کی رضامندی سے بیع فسخ کر سکتا ہے۔ کیونکہ جب بیع تام ہوگئی تو اب ایک فریق فسخ نہیں کر سکتا۔

ملحوظہ — حدیث شریف میں اِسی صورت کا بیان ہے کہ بائع نے صرف غررِ فعلی کیا ہو یعنی جانور کا بھرا ہوا تھن دکھا کر مشتری کو دھوکہ دیا ہو۔ منہ سے کچھ نہ کہا ہو۔ اور اگر غررِ قولی بھی کیا ہے تو خیارِ وصف کی بنا پر احناف کے نزدیک بھی مشتری کو بیع فسخ کرنے کا اختیار ہے۔

تیسری بات — جانور واپس کرتے وقت ایک صاع کھجور یا کوئی غلّہ دینا: ائمہ ثلاثہ کے نزدیک واجب ہے۔ اور وہ دودھ کا ضمان ہے۔ اور احناف کے نزدیک مستحب ہے۔ اور وہ بائع کا دل خوش کرنے کے لئے ہے۔ کیونکہ شرعی ضابطہ ہے **الخَراج بالضمان** یعنی آمدنی اسی کی ہے جو نقصان کا ذمہ دار ہے (ابن ماجہ حدیث ۲۲۴۳) اگر لوٹانے سے پہلے جانور مر جاتا تو مشتری کا نقصان ہوتا۔ پس اس زمانہ کے دودھ کا بھی وہی مالک ہے۔ اس کا کوئی ضمان واجب نہیں۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے حدیث کی شرح ائمہ ثلاثہ کے مسلک پر کی ہے۔ اور ان کے مسلک پر جو سوالات اٹھتے ہیں ان کے جوابات دیئے ہیں:

پہلا سوال — جب بیع مکمل ہوگئی تو اب صرف مشتری کا اس کو ختم کرنا کسی اصول کے ماتحت نہیں آتا۔ اسی لئے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر بائع بیع فسخ کرنے کے لئے تیار نہ ہو تو تنہا مشتری اس کو فسخ نہیں کر سکتا۔ البتہ وہ عیب کا نقصان لے سکتا ہے۔ کیونکہ بائع نے فریب کر کے فائدہ اٹھایا ہے پس وہ اس کی مکافات کرے۔ یہی ضمان بالخراج ہے۔

جواب — اس خیار کو خیارِ مجلس اور خیارِ شرط کے تحت لایا جا سکتا ہے۔ ان دونوں کے ساتھ اس کی قریب ترین مشابہت ہے۔ جس طرح بیع مکمل ہونے کے بعد اگر ایک فریق کی رائے بدل جائے تو وہ تفرقِ ابدان سے پہلے بیع ختم کر سکتا ہے، اسی طرح دودھ نکالنے کے بعد جب دھوکہ کا پتہ چلے اور خریدار کی رائے بدل جائے تو وہ جانور کو پھیر سکتا ہے۔ اور خیارِ شرط کے ساتھ مشابہت اس طرح ہے کہ بیع گویا دودھ کی زیادتی کے ساتھ مشروط ہے، پس جب وصفِ مرغوب فیہ نہ رہا تو مشتری بیع فسخ

کرسکتا ہے۔اور جب یہ خیاران دواصولوں کے تحت آسکتا ہے تو ضمان بالخراج کے باب سے گرداننے کی ضرورت نہیں۔

دوسرا سوال —— جب دودھ کی مقداراوراس کی قیمت معلوم نہیں تو ضمان کس طرح دیا جائے گا؟

جواب —— جب دودھ استعمال کرلیا گیااور وہ ختم ہوگیا تو اب اس کی قیمت کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔خاص طور پر جب فریقین میں تیزم تازی ہو،اور معاشرہ بدّؤں کا ہو،جن کے نزدیک دودھ کی اہمیت ہے۔پس ضروری ہے کہ اکثری احتمالی جگھوں کو پیشِ نظر رکھ کر شریعت خود کوئی درمیانی قیمت تجویز کرے تاکہ باہمی نزاع رفع ہو۔ایک صاع: شریعت کا مقرر کیا ہوا ایسا ہی اندازہ ہے۔

تیسرا سوال —— اونٹنی کا دودھ زیادہ ہوتا ہے اور بکری کا کم، پھر دونوں کا معاوضہ مساوی کیوں تجویز کیا گیا؟

جواب —— اونٹنی کے دودھ میں عفونت ہوتی ہے اور ارزاں ملتا ہے۔اور بکری کا دودھ عمدہ ہوتا ہے اور گراں ملتا ہے، اس لئے دونوں کا ایک ہی معاوضہ تجویز کیا گیا ہے۔

بہرحال —— متعین ہوگیا کہ دودھ کا معاوضہ اس غلہ کی ادنی جنس سے دیا جائے گا جس کو لوگ بطور خوراک استعمال کرتے ہیں۔جیسے حجاز میں کھجوریں،اور ہمارے ملک میں جَو اور مکئی۔گیہوں اور چاول دینے ضروری نہیں کہ یہ زیادہ گراں اوراعلی خوراک ہیں۔

چوتھا سوال —— حدیث مصرات حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے۔جن کا شمار مجتہدین صحابہ میں نہیں، بلکہ حفاظ حدیث میں ہے اس لئے احناف کی اصولِ فقہ کی کتابوں میں یہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے کہ ”جو حدیث غیر فقیہ صحابی سے مروی ہو،اور وہ کسی طرح قیاس سے ہم آہنگ نہ ہو،تو اس کو چھوڑ دیا جائے گا“ (کشف الاسرار براصولِ بزدوی ۲:۵۵۶) یہ بات کہاں تک درست ہے؟

نوٹ: حدیث مصرات ابوداؤد (حدیث ۳۴۴۶) میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔مگر اس میں صدقہ اور جُمیع: دوضعیف راوی ہیں۔نیز اس میں دودھ کے بقدر یا دوگنا گیہوں دینے کا حکم ہے۔اس لئے ائمہ ثلاثہ نے اس کو نہیں لیا۔

جواب —— یہ ضابطہ اس شخص کا بنایا ہوا ہے جس کو اس حدیث پر عمل کی توفیق نہیں ملی۔اور یہ قاعدہ:

اولاً: مخدوش ہے۔جو روایت خلافِ قیاس ہوتی ہے وہ ردّ نہیں کی جاتی۔اگر وہ صحیح ہے تو اس کو استثنائی صورت قرار دیا جاتا ہے۔جیسے نماز میں قہقہہ سے وضو ٹوٹنے کی حدیث اور بیع سلم کے جواز کی حدیث۔اور ایسی حدیثیں بہت ہیں۔ اور وہ ان کے مورِد پر منحصر رہتی ہیں،ان کو متعدی نہیں کیا جاتا یعنی ان پر دوسری چیزوں کو قیاس نہیں کیا جاتا۔

ثانیاً: یہ قاعدہ زیر بحث مسئلہ پر منطبق نہیں۔کیونکہ یہ حدیث امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کی ہے (یہ تسامح ہے جیسا کہ فائدہ میں آئے گا) اور ابن مسعودؓ بلند پایہ مجتہد ہیں۔

ثالثاً: ایک صاع کے ذریعہ ضمان: ایک شرعی مقدار ہے۔اور مقادیر شرعیہ کی خوبی کا کچھ نہ کچھ ادراک تو عقل کرسکتی

ہے، مگر اس کا پوری طرح احاطہ نہیں کرسکتی۔ البتہ راسخین فی العلم مستثنیٰ ہیں۔ تو کیا مقادیر کی تمام روایات یہ کہہ کر چھوڑ دی جائیں گی کہ یہ قیاس سے ہم آہنگ نہیں!

فائدہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے امام بخاری رحمہ اللہ نے حدیث مصرات روایت نہیں کی۔ بلکہ ان کا قول روایت کیا ہے (دیکھیں حدیث ۲۱۴۹ و ۲۱۶۴) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس فتوی سے دو باتیں ثابت ہوئیں: ایک یہ کہ یہ حدیث صحیح ہے، تبھی ابن مسعودؓ نے اس کے موافق فتوی دیا۔ دوم: یہ جو مشہور ہے کہ احناف اس حدیث کو نہیں لیتے: یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ فقہ حنفی میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے فتاوی کو کلیدی مقام حاصل ہے۔ پس جب آپ کا یہ فتوی ہے تو احناف اس سے صرف نظر کیسے کرسکتے ہیں؟

بات دراصل یہ ہے کہ یہ نص فہمی کا اختلاف ہے۔ اور احناف نے اس روایت کا جو مطلب سمجھا ہے: وہ بے غبار ہے۔ اس پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔ اور حدیث کے انداز کلام سے جو اختیار کامل کا وہم ہوتا ہے تو اس کی وجہ وہ ہے جو خیار مجلس کی حدیث کی شرح میں گذر چکی ہے۔ یعنی جب کوئی شخص ایسا فریب کرے گا، اور راز کھل جائے گا اور مشتری بیع ختم کرنا چاہے گا تو شریف بائع تو فوراً تیار ہو جائے گا، مگر اڑیل نہیں مانے گا تو مسلمانوں کا صالح معاشرہ مشتری کا ساتھ دے گا۔ ہر شخص بائع سے کہے گا: فریب کرتا ہے اور پُٹھے پر ہاتھ بھی نہیں رکھنے دیتا! ایسے وقت میں حدیث کا طرز بیان بھی مشتری کا معاون ہوگا ـــــ البتہ ایسے موقع پر مشتری دودھ کے معاوضے کے نام سے کچھ نہیں دیتا۔ یہ معاشرتی خرابی ہے۔ حدیث کا اصل زور اس پر ہے کہ بائع کا دل خوش کیا جائے۔ واللہ اعلم۔

دوسری مثال ـــــ فریب دہی کی دوسری مثال وہ واقعہ ہے جو درج ذیل حدیث میں مروی ہے:

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ غلّہ کے ایک ڈھیر کے پاس سے گذرے۔ آپؐ نے اپنا ہاتھ ڈھیر کے اندر داخل کیا تو انگلیوں پر نمی محسوس کی۔ آپؐ نے فرمایا: ''غلے والے یہ کیا ہے؟!'' اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! بارش کی بوندیں پڑ گئی تھیں یعنی میں نے نہیں بھگایا۔ آپؐ نے فرمایا: ''اس بھیگے ہوئے غلہ کو تم نے ڈھیر کے اوپر کیوں نہیں رہنے دیا تاکہ لوگ اس کو دیکھ سکتے؟! جو شخص ملاوٹ کرتا ہے وہ ہم سے نہیں!'' اور طبرانی کی روایت میں آخر میں یہ بھی ہے کہ دغابازی اور فریب کا انجام جہنم ہے (مشکوٰۃ حدیث ۲۸۶۰ معارف الحدیث ۷: ۱۲۹)

ومنها: مايكون فيه التدليسُ على المشترى.

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "لاتَصُرُّوا الإبلَ والغنم، فمن ابتاعها بعد ذلك فهو بخير النَّظَرَيْنِ بعد أن يحلُبَها: إن رَضِيَها أمسكها، وإن سَخِطَها ردَّها، وصاعًا من تمر" ويُروى: "صاعاً من طعامٍ لاسَمْرَاءَ"

أقول: التصرية: جمعُ اللبن فى الضرع ليتخيل المشترى غزارتَه فيغتَرُّ.

ولـمـا كان أَقْرَبُ شِبْهِهِ بخيار المجلس، أو الشرط لأن عقدَ البيع كأنه مشروط بغزارة اللبن: لم يُجعل من باب الضمان بالخراج.

ثـم لـمـا كـان قـدر الـلبـن وقيمتُه بعد إهلاكه وإتلافه متعذرَ المعرفة جدًا، لاسيما عند تَشَاكُسِ الشركاء، وفي مثل البدو: وجب أن يُضرب له حدٌّ معتدلٌ، بحسب المظنة الغالبية، يُقطع به النزاع.

ولبـنُ الـنـوق فيـه زهـومة، ويوجد رخيصًا، ولبنُ الغنم طيب، ويوجد غالياً: فجعل حكمهما واحـدًا، فتعين أن يكون صاعًا من أدنى جنسٍ يقتاتون به، كالتمر في الحجاز، والشعير والذُّرَةِ عندنا، لا من الحنطة والأرز، فإنهما أغلى الأقوات وأعلاها.

واعتـذر بـعـضُ مـن لم يوفَّق للعمل بهذا الحديث بضرب قاعدة من عند نفسه، فقال: "كل حديث لايرويه إلا غيرُ فقيهٍ إذا انسدَّ بابُ الرأى فيه، يُترك العمل به" وهذه القاعدة – على ما فيها– لاتَنْطبق على صورتنا هذه، لأنه أخرجه البخارى عن ابن مسعود أيضًا، وناهيك به! ولأنه بـمـنزلة سائر المقادير الشرعيةِ يُدرك العقلُ حسنَ تقديرِ مَا فيه، ولايستقلُّ بمعرفةِ حكمةِ هذا القدر خاصةً، اللّهم إلا عقول الراسخين في العلم.

وقال صـلـى الله عـليه وسلم في صُبْرَةِ طعامٍ داخلها بَلَلٌ: " أفلاجعلتَه فوقَ الطعام حتى يراه الناس؟ من غَشَّ فليس منى"

ترجمہ: اورازانجملہ: وہ معاملہ ہے جس میں مشتری پر تدلیس (دھوکہ دہی) ہوتی ہے...... میں کہتا ہوں: تصریہ: تھن میں دودھ جمع کرنا ہے، تاکہ خریدار دودھ کی زیادتی خیال کرے، پس وہ دھوکہ کھائے ـــــ (پہلے سوال کا جواب) اور جب اس خیار کی قریب ترین مشابہت خیار مجلس یا خیار شرط سے تھی۔ کیونکہ عقد بیع گویا دودھ کی زیادتی کے ساتھ مشروط ہے: تو نہیں بنایا گیا ضمان بعوض خراج کے باب سے ـــــ (دوسرے سوال کا جواب) پھر جب تھی دودھ کی مقدار اور اس کی قیمت، اس کو ہلاک کرنے اور اس کو ضائع کرنے کے بعد بہت ہی متعذر المعرفہ، خاص طور پر شرکاء کی تیزم تازی کے وقت اور بَدّو جیسے لوگوں میں تو ضروری ہوا کہ اس کے لئے کوئی معتدل حد مقرر کی جائے۔ اکثری احتمالی جگہوں کے موافق، جس کے ذریعہ نزاع ختم کیا جائے ـــــ (تیسرے سوال کا جواب) اور اونٹنی کے دودھ میں تعفّن ہوتا ہے اور ارزاں مل جاتا ہے۔ اور بکری کا دودھ عمدہ ہوتا ہے اور گراں ملتا ہے؛ پس دونوں کا ایک حکم کیا۔ پس متعین ہوا کہ معاوضہ اس اناج کی ادنی جنس کا ایک صاع ہو جس کو لوگ بطور خوراک استعمال کرتے ہیں۔ جیسے حجاز میں کھجور، اور ہمارے دیار میں جَو اور مکئی۔ نہ کہ گیہوں اور چاول سے۔ پس بیشک وہ دونوں روزیوں میں زیادہ گراں اور ان میں اعلی ہیں ـــــ (چوتھے سوال کا جواب) اور عذر پیش کیا بعض ان لوگوں نے جو اس حدیث پر عمل کی توفیق نہیں دیئے گئے، اپنی طرف سے ایک قاعدہ بنانے کے ذریعہ،

پس کہا اس نے: ’’ہر وہ حدیث جس کو روایت نہ کرتا ہو مگر غیر فقیہ: جب اس میں رائے کا دروازہ مسدود ہو جائے: تو اس حدیث پر عمل چھوڑ دیا جائے گا‘‘ اور یہ قاعدہ اس خرابی کے ساتھ جو اس میں ہے ہماری اس صورت پر منطبق نہیں۔ کیونکہ اس حدیث کو بخاری نے ابن مسعود سے بھی روایت کیا ہے۔ اور میں تجھ کو ان کے ذریعہ روکنے والا ہوں یعنی وہ سب سے بڑے فقیہ ہیں، تجھے اور کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور اس لئے کہ وہ (ایک صاع) بمنزلہ دیگر مقادیر شرعیہ کے ہے۔ عقل اس خوبی کا جو اس میں ہے کچھ نہ کچھ ادراک کرتی ہے۔ اور مستقل نہیں ہے خصوصیت کے ساتھ اس مقدار کی حکمت جاننے میں۔ اے اللہ! مگر راسخین فی العلم کی عقلیں!

☆ ☆ ☆

نویں وجہ: مفاد عامہ کی چیزوں پر قبضہ

کوئی چیز مباح الاصل ہو یعنی عام لوگوں کے فائدے کی ہو جیسے وہ پانی جس کا سوت کبھی خشک نہیں ہوتا: کوئی ظالم اس پر قبضہ جمالے اور اس کو فروخت کرنے لگے تو یہ بھی ممنوع ہے۔ کیونکہ یہ اللہ کے مال میں ناجائز تصرف ہے اور لوگوں کو ضرر پہنچانا ہے۔ شاہ صاحب نے اس کی دو مثالیں ذکر فرمائی ہیں:

پہلی مثال — مباح گھاس بیچنا — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’فاضل پانی نہ بیچا جائے تاکہ اس کے ذریعہ گھاس بیچی جائے‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۲۸۵۹)

تشریح: اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی چشمے یا میدان پر قبضہ جمالے۔ پس کسی کو بدوں اجرت اس چشمہ سے جانوروں کو پانی نہ پلانے دے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اس میدان کی مباح گھاس بھی بیچے گا یعنی گھاس چرانے کی بھی قیمت لے گا۔ جبکہ یہ دونوں باتیں ناجائز ہیں۔ گھاس اور پانی دونوں مباح ہیں۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تین شخصوں سے نہ بات کریں گے، نہ ان کی طرف دیکھیں گے۔ ان میں سے تیسرا شخص وہ ہے جو ضرورت سے زائد پانی روکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے: ’’میں آج تجھ سے اپنا فضل روکونگا، جس طرح تو نے وہ فاضل پانی روکا تھا جس کو تیرے ہاتھوں نے نہیں بنایا تھا‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۲۹۹۵ احیاء الموات)

مذکورہ تفسیر تو اس صورت میں ہے کہ مباح پانی مراد لیا جائے۔ اور ایک ضعیف تفسیر یہ ہے کہ مملوکہ پانی مراد ہے۔ اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اپنی حاجت سے زائد پانی اس شخص کو بیچنا حرام ہے جو پینا چاہتا ہے یا جانور کو پلانا چاہتا ہے۔

دوسری مثال — گھاس، پانی اور آگ بیچنا — ایک مہاجری صحابی بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کے ساتھ تین جنگوں میں حصہ لیا ہے، اور میں نے تینوں میں آپ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ: ’’مسلمان تین چیزوں میں شریک ہیں: پانی گھاس اور آگ میں‘‘ (ابوداؤد حدیث ۳۴۷۷)

تشریح: اگر یہ تینوں چیزیں مملوکہ ہیں تو ان میں مواسات (غم خواری) مؤکد طور پر مستحب ہے۔ اور اگر غیر مملوکہ ہیں تو ان کا حکم واضح ہے کہ پھر روکنا ہی جائز نہیں (حدیث کا جو شانِ ورود ہے اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ ارشاد غیر مملوکہ گھاس، پانی اور آگ کے بارے میں ہے۔ لشکر جہاں پڑاؤ کرتا ہے وہاں جو گھاس پتے اور چشمے ہیں وہ سب کے لئے ہیں۔ اسی طرح امیر لشکر کی طرف سے جو لاؤ یا جلایا جاتا ہے تاکہ فوجی اس میں سے آگ لے کر چولھا جلائیں۔ یہ آگ بھی مشترک ہے)

ومنها : أن يكون الشيئُ مباحَ الأصل، كالماء العِدِّ، فيتغلَّبُ ظالمٌ عليه فيبيعُه، وذلك تصرف فى مال الله من غير حقٍّ، وإضرار بالناس. ولذلك نهى النبى صلى الله عليه وسلم عن بيع فضل الماء لِيُبَاعَ به الكلأُ.

أقول: هو أن يتغلَّب رجلٌ على عينٍ أو وادٍ، فلا يَدَعُ أحدًا يَسْقِىْ منه ماشيةً إلا بأجر، فإنه يُفضى إلى بيع الكلأ المباح يعنى يصير الرعىُ من ذلك بإزاء مال؛ وهذا باطلٌ، لأن الماء والكلأ مباحان، وهو قوله عليه السلام:" فيقول الله عزوجل: اليومَ أمنعك فضلى كما منعتَ فضلَ ماءٍ لم تعمل يداك"

وقيل: يحرم بيعُ الماء الفاضل عن حاجته لمن أراد الشرب أو سَقْىَ الدواب.

قال صلى الله عليه وسلم:" المسلمون شركاء فى ثلاث: فى الماء، والكلأ، والنار"

أقول: يتأكد استحباب المواساة فى هذه فيما كان مملوكاً، وما ليس بمملوك: أمره ظاهر.

ترجمہ: واضح ہے۔ البتہ تین باتوں کی وضاحت ضروری ہے:

(۱) نهى النبى صلى الله عليه وسلم عن بيع فضل الماء الگ حدیث ہے۔ اور لايُباع فضلُ الماء ليباع به الكلأ الگ حدیث ہے۔ اول حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور ثانی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے۔ مشکوٰۃ میں یہ دونوں حدیثیں یکے بعد دیگرے آئی ہیں، اس لئے غالباً نظر چوک گئی ہے اور شاہ صاحب نے دونوں کو ملا دیا ہے۔

(۲) اليوم أمنعك الى آخره مملوکہ پانی کے بارے میں ہے۔ ابوداؤد کی ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں: رجل مَنَعَ ابنَ السبيلِ فضلَ ماءٍ عنده (حدیث نمبر ۳۴۷۴) پس شاہ صاحب نے جو ضعیف تفسیر کی ہے وہ پہلی روایت کے اعتبار سے تو ٹھیک ہے۔ مگر جو روایت استشہاد میں پیش کی ہے اس کی صحیح تفسیر یہی ہے۔

(۳) حدیث المسلمون شركاء إلخ مشکوٰۃ میں شانِ ورود کے بغیر ہے۔ اور عام طور پر فقہ کی کتابوں میں بھی اسی طرح ذکر کی جاتی ہے۔ جبکہ شانِ ورود کا حدیث فہمی میں بڑا دخل ہے اس لئے شرح میں ابوداؤد سے وہ روایت نقل کی گئی ہے۔

باب ــــــ ۳

احکامِ معاملات

۱- معاملات میں فیاضی کا استحباب

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی: ''اللہ تعالیٰ مہربانی فرمائیں نرم آدمی پر، جب وہ بیچے، اور جب خریدے، اور جب قرض کا مطالبہ کرے!'' یعنی ہر معاملہ میں بلند حوصلگی اور سہل گیری سے کام لے (مشکوٰۃ حدیث ۲۷۹۰)

تشریح: سماحت (فیاضی) ان بنیادی اوصاف میں سے ہے جن سے نفس سنورتا ہے۔ اور آدمی گناہ کے گھیرے سے نکلتا ہے۔ نیز فیاضی میں مملکت کی بہبودی اور اس پر تعاون باہمی کا مدار ہے یعنی معاملات میں نرمی برتنے سے کاروبار ترقی کرتا ہے اور ملک کی حالت بہتر ہوتی ہے۔ اور حاجت مندوں کی ہمدردی بھی بلند حوصلہ والے ہی کرتے ہیں۔ اور خرید وفروخت اور قرض کا مطالبہ چونکہ ایسے معاملات تھے جن میں سخت گیری کا اندیشہ تھا، اس لئے نبی ﷺ نے اپنی دعا سے سہل گیری کے استحباب کی تاکید فرمائی۔

۲- بکثرت قسم کی کراہیت اور جھوٹی قسم کا وبال

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قسم کھانا: سامان کی نکاسی اور برکت کی نابودی کا سبب ہے!'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۷۹۴)

تشریح: خرید وفروخت میں قسم کی کثرت دو وجہ سے مکروہ ہے:

اول: قسم کھانے سے معاملہ کرنے والوں کو دھوکہ ہوتا ہے۔ اور دھوکہ معاملات کے موضوع کے خلاف ہے۔

دوم: بہت زیادہ قسمیں کھانے سے: دل سے اللہ کے نام کی عظمت زائل ہوجاتی ہے۔

اور جھوٹی قسم سے مال اس لئے بِک جاتا ہے کہ مشتری دھوکہ کھا جاتا ہے، اور سامان خرید لیتا ہے ـــــ اور برکت اس لئے اٹھ جاتی ہے کہ برکت کا مدار ملأ اعلیٰ کی دعاؤں پر ہے۔ اور جب آدمی یہ گناہ کرتا ہے تو ملأ اعلیٰ کی دعائیں بند ہوجاتی ہیں، بلکہ بددعائیں شروع ہوجاتی ہیں، اس لئے برکت ختم ہوجاتی ہے۔

۳- صدقہ سے گناہ کی معافی اور کوتاہی کی تلافی

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے تاجروں کی جماعت! کاروبار میں قسمیں اور لغو باتیں شامل ہوجاتی

ہیں، پس اس میں صدقہ کی ملونی کرو'' یعنی آمدنی میں سے کچھ خیرات کیا کرو (مشکوٰۃ حدیث ۲۷۹۸)

تشریح: صدقہ کرنے سے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ اور بہ تقاضائے نفس سرزد ہونے والی کوتاہیوں کی تلافی ہوجاتی ہے۔

۴- بیع صرف میں مجلس عقد ہی میں سب باتوں کی صفائی

حدیث —— حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اونٹوں کا کاروبار کرتے تھے۔ وہ کبھی دینار میں سودا کرتے اور اس کی جگہ درہم لیتے۔ اور کبھی اس کے برعکس کرتے۔ کسی نے ان کے ذہن میں شبہ ڈالا کہ یہ درست نہیں۔ ابن عمرؓ نے نبی ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''اس دن کے ریٹ سے ایسا کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ بشرطیکہ آپ دونوں اس حال میں جدا نہ ہوں کہ ابھی کچھ باتوں کی صفائی باقی ہو'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۸۷۱)

تشریح: اگر بیع صرف میں متعاقدین اس حال میں جدا ہوگئے کہ ابھی کوئی بات تصفیہ طلب ہے۔ مثلاً دراہم ودنانیر کا آپسی ریٹ طے نہیں ہوا۔ صرّافوں سے دریافت کرنے پر موقوف ہے۔ یا عوضین (سونے چاندی) کا ابھی وزن نہیں ہوا۔ یا اس قسم کی کوئی اور بات تصفیہ طلب ہے تو اندیشہ ہے کہ بعد میں کوئی حجت بازی کرے اور جھگڑا کھڑا کرے اور معاملہ صاف ستھرا نہ رہے۔ اس لئے مجلس ہی میں تمام باتوں کی صفائی ضروری ہے۔

﴿أحكام البيع﴾

[۱] قال صلى الله عليه وسلم: ''رحم الله رجلا سَمْحًا إذا باع، وإذا اشترى، وإذا اقتضى''

أقول: السماحة من أصول الأخلاق التى تتهذَّب بها النفسُ، وتتخلَّص بها عن إحاطة الخطيئة. وأيضًا: فيها نظام المدينة، وعليها بناءُ التعاون؛ وكانت المعاملةُ بالبيع والشراء والاقتضاءِ مظنةً لضد السماحة، فسجَّل النبيُّ صلى الله عليه وسلم على استحبابها.

[۲] وقال صلى الله عليه وسلم: ''الحَلْفُ مَنْفَقَةٌ للسلعة، مَمْحَقَةٌ للبركة''

أقول: يُكره إكثار الحَلْف فى البيع لشيئين: كونِه مظنة لتغرير المتعاملين، وكونِه سببا لزوالِ تعظيمِ اسمِ الله من القلب.

وَالحَلْف الكاذب مَنْفَقَةٌ للسِّلعة، لأن مبنى الإنفاق على تدليس المشترى، ومَمْحَقَةٌ للبركة، لأن مبنى البركة على توجه دعاء الملائكة إليه، وقد تباعدت بالمعصية، بل دعت عليه.

[۳] وقال عليه السلام: ''يامعشر التجار! إن البيعَ يحضُره اللغوُ والحَلِفُ، فَشُوْبُوْه بالصدقة''

أقول: فيه تكفير الخطيئة، وجَبْرُ ما فَرَطَ من غُلَوَاءِ النفس.

[٤] وقال عليه السلام فيمن باع بالدنانير، وأخذ مكانَها الدراهمَ: "لابأس أن تأخذَها بِسِعْرِ يومها، مالم تفترقا وبينكما شيئ"

أقول: لأنهما إن افترقا وبينهما شيئ، مثلُ أن يجعلا تمامَ صرفِ الدينار بالدراهم موقوفاً على ما يأمر به الصيرفيونَ، أو على أن يَزِنَه الوزّان، أو مثلِ ذلك: كان مظنةُ أن يحتجَّ به الْمُحْتَجُّ، ويُناقش فيه المناقشُ، ولا تصفو المعاملة.

ترجمہ: معاملات کے احکام: (۱) میں کہتا ہوں: فیاضی ان بنیادی اخلاق میں سے ہے جن سے نفس سنورتا ہے۔ اور جن کے ذریعہ نفس نجات پاتا ہے گناہ کے گھیرے سے۔ اور نیز: سماحت میں مملکت کا انتظام ہے، اور اس پر تعاون کا مدار ہے۔ اور خرید وفروخت اور قرض کے تقاضے کا معاملہ احتمالی جگہ تھا سماحت کی ضد (سخت گیری) کا تو نبی ﷺ نے اس کے استحباب کو موکد کیا —— (۲) میں کہتا ہوں: خرید وفروخت میں قسم کی کثرت دو چیزوں کی وجہ سے ناپسند کی گئی ہے: (ایک) اس کا احتمالی جگہ ہونا معاملہ کرنے والوں کے دھوکہ کا (دوم) اس کا سبب ہونا دل سے اللہ کے نام کی عظمت کے زائل ہونے کا —— اور جھوٹی قسم سامان کی نکاسی کا سبب اس لئے ہے کہ نکاسی کا مدار خریدار کے دھوکہ کھانے پر ہے، اور برکت مٹانے والی اس لئے ہے کہ برکت کا مدار اس کی طرف فرشتوں کی دعا کے متوجہ ہونے پر ہے۔ اور دعائیں معصیت کی وجہ سے دور ہوگئیں، بلکہ ملائکہ نے اس کے لئے بددعائیں کیں —— (۳) میں کہتا ہوں: صدقہ کی ملونی کرنے میں گناہ کی معافی ہے۔ اور اس چیز کی تلافی ہے جو سرزد ہوئی ہے نفس کے جوش سے —— (۴) میں کہتا ہوں: (جدا ہونے سے پہلے تمام باتوں کی صفائی کی ضرورت) اس لئے ہے کہ دونوں اگر جدا ہونگے۔ درانحالیکہ ان کے درمیان کچھ باتیں (تصفیہ طلب) ہونگی۔ جیسے یہ کہ گردانیں دونوں دینار کی درہم کے ساتھ تبادلہ کی تمامیت اس چیز پر موقوف جس کا صراف حکم دیں گے۔ یا اس شرط پر کہ اس کو تولنے والا تولے گا یا اس کے مانند تو وہ موقوف رکھنا احتمالی جگہ ہوگا اس بات کی کہ اس کے ذریعہ حجت بازی کرنے والا استدلال کرے اور اس میں جھگڑا کرنے والا جھگڑا کرے اور معاملہ صاف نہ رہے۔

☆ ☆ ☆

۵- گابھا دینے کے بعد پھل بائع کا ہونے کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس نے گابھا دینے کے بعد کھجور کا درخت خریدا تو اس کا پھل بائع کے لئے ہے۔ مگر یہ کہ مشتری شرط کرے" کہ وہ پھل کے ساتھ درخت خریدتا ہے تو پھل مشتری کا ہوگا (مشکوۃ حدیث ۲۸۷۵)

تشریح: تأبیر کے معنی ہیں: نر کھجور کا پھول مادہ کھجور کے پھول میں داخل کرنا۔ عرب میں دستور تھا کہ جب کھجور

کے درختوں پر پھول آتے تو پھل نمودار ہونے سے پہلے نر درخت کے پھول کی ایک پنکھڑی: مادہ درخت کے پھول میں شگاف کر کے داخل کرتے تھے۔ اس سے پھل عمدہ اور زیادہ آتے ہیں۔ اس کو تلقیح کہتے ہیں، تلقیح ایسے وقت کی جاتی ہے کہ اس کے بعد پھل بہت جلد نمودار ہو جاتے ہیں۔

اور تلقیح کے بعد پھل بائع کا اس لئے ہوتا ہے کہ گابھا دینا درخت سے علحدہ ایک مستقل عمل ہے۔ اور اس کے ذریعہ پھل بائع کی ملکیت میں ظاہر ہوا ہے۔ پس پھل گو بظاہر مبیع سے متصل ہے مگر حقیقت میں فروخت کئے ہوئے گھر میں رکھے ہوئے سامان کی طرح ہے، جو صراحت کے بغیر بیع میں داخل نہیں ہوتا۔ پس یہ پھل بائع کا حق ہے۔ البتہ اگر معاملہ میں اس کے خلاف صراحت ہو چکی ہو تو اس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

فائدہ: تلقیح سے مراد: میں اختلاف ہے۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک: گابھا دینا ہی مراد ہے۔ اور وہ مفہوم وصف سے استدلال کرتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ اگر بائع نے درختوں کی تلقیح نہیں کی تو پھل مشتری کا ہے، چاہے پھل نمودار ہو چکا ہو۔ اور تلقیح کی ہے تو پھل بائع کا ہے۔ چاہے پھل ابھی نمودار نہ ہوا ہو۔ اور احناف کے نزدیک: گابھا دینا پھل نمودار ہونے سے کنایہ ہے۔ پس اگر پھل نمودار ہونے کے بعد بیع ہوئی ہے تو پھل بائع کا ہے، چاہے اس نے تلقیح نہ کی ہو۔ اور اگر پھل نمودار ہونے سے پہلے بیع ہوئی ہے تو پھل مشتری کا ہے، چاہے بائع نے تلقیح کی ہو۔

۶- کونسی شرط باطل ہے؟

حدیث — حضرت بریرۃ رضی اللہ عنہا نے اپنے آقا سے نو اُوقیہ (۳۶۰ درہم) پر کتابت کا معاملہ کر لیا تھا۔ اور سالانہ ایک اُوقیہ (۴۰ درہم) ادا کرنا طے پایا تھا۔ وہ تعاون حاصل کرنے کے لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہوئیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''اگر تیرا آقا راضی ہو تو میں یہ رقم یکبارگی ادا کر دوں اور تجھے آزاد کر دوں'' اس کے آقا نے وَلاء کی شرط لگائی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ بات رسول اللہ ﷺ سے ذکر کی۔ آپؐ نے فرمایا: ''تم اُسے لیلو، اور آزاد کر دو'' اور آپؐ نے لوگوں سے خطاب کیا کہ ''لوگوں کو کیا ہو گیا: وہ معاملات میں ایسی شرطیں لگاتے ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں ہیں! جو بھی شرط کتاب اللہ میں نہیں ہے وہ باطل ہے۔ چاہے سو شرطیں ہوں۔ کیونکہ اللہ کا فیصلہ احقّ اور اللہ کی شرط اوثق ہے۔ وَلاء اس کے لئے ہے جس نے آزاد کیا'' (مشکوۃ حدیث ۲۸۷۷)

تشریح: معاملات میں مطلق شرط باطل نہیں، بلکہ وہ شرط باطل ہے جس کی شریعت میں ممانعت ہے۔ جیسے وَلاء (آزاد شدہ کی میراث) آزاد کرنے والے کا حق ہے۔ پس دوسرے کے لئے اس کی شرط لگانا باطل ہے۔

فائدہ: باطل شرط اگر ایسے معاملہ میں ہو جس کا اقالہ نہیں ہو سکتا، جیسے آزاد کرنا اور طلاق دینا وغیرہ تو وہ شرط باطل ہے اور معاملہ درست ہے۔ اور اگر معاملہ ایسا ہو کہ اس کا اقالہ ہو سکتا ہے جیسے بیع و شراء، اجارہ وغیرہ تو وہ معاملہ شرطِ فاسد

کی وجہ سے فاسد ہو جائے گا۔

۷- وَلاء بیچنا اور بخشش کرنا کیوں ممنوع ہے؟

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے وَلاء بیچنے کی اور اس کو ہبہ کرنے کی ممانعت فرمائی (مشکوۃ حدیث ۲۸۷۸)

تشریح: وَلاء: میراث پانے کا ایک حق ہے جو آزاد کرنے والے کو اپنے آزاد کئے ہوئے پر حاصل ہوتا ہے۔ جب آزاد کردہ وفات پائے اور اس کے ذوی الفروض اور عصبہ نسبی نہ ہوں تو آزاد کرنے والا عصبہ سببی ہو کر میراث پائے گا۔ عرب اس حق کو بھی بیچتے خریدتے اور بخشش کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی ممانعت فرمائی، کیونکہ وَلاء کوئی موجود متعین مال نہیں ہے، وہ نسب کی طرح کا ایک حق ہی ہے۔ حدیث میں ہے: **الوَلاءُ لُحْمَةٌ كلحمة النسب** : ولاء نسبی رشتہ کی طرح کا ایک رشتہ ہے (سنن بیہقی ۶: ۲۴۰) اور نا تا بیچا جا سکتا ہے نہ بخشا جا سکتا ہے۔ پس وَلاء کی خرید و فروخت اور بخشش بھی ممنوع ہے۔

[۵] وقال عليه السلام: " من ابتاع نخلاً بعد أن تُؤَبَّرَ، فثمرتُها للبائع، إلا أن يشترط المبتاع"

أقول: ذلك: لأنه عمل زائد على أصل الشجرة، وقد ظهرت الثمرة على ملكه، وهو يُشبه الشيئَ الموضوعَ في البيت، فيجب أن يوفّٰى له حقه، إلا أن يُصَرِّحَ بخلافه.

[۶] وقال عليه السلام: " ماكان من شرط ليس في كتاب الله فهو باطل"

أقول: المراد كل شرط ظهر النهي عنه، وذُكر في حكم الله نفيُه، لا النفيُ البسيطُ.

[۷] ونهى عليه السلام عن بيع الولاء، وعن هبته، لأن الولاء ليس بمال حاضرٍ مضبوطٍ، إنما هو حقٌّ تابعٌ للنسب، فكما لايباع النسب لا ينبغي أن يباع الولاء.

ترجمہ: (۵) وہ بات یعنی پھل بائع کے لئے اس لئے ہے کہ تلقیح اصل درخت سے ایک زائد عمل ہے یعنی یہ عمل مبیع میں داخل نہیں۔ اور پھل یقیناً بائع کی ملکیت پر ظاہر ہوا ہے۔ اور وہ گھر میں رکھی ہوئی چیز کے مشابہ ہے۔ پس ضروری ہے کہ بائع کو اس کا پورا حق دیا جائے۔ مگر یہ کہ مشتری اس کے خلاف صراحت کرے —— (۶) مراد ہر وہ شرط ہے جس کی شریعت نے ممانعت کر دی ہے اور حکم الٰہی نے اس کی نفی کی ہے۔ سادہ نفی مراد نہیں —— (۷) نبی ﷺ نے ولاء فروخت کرنے کی اور بخشش کرنے کی ممانعت اس لئے کی ہے کہ وہ موجود متعین مال نہیں۔ وہ نسب کے تابع یعنی نسب جیسا ایک حق ہی ہے۔ پس جس طرح نسب نہیں بیچا جاتا مناسب نہیں کہ ولاء بیچی جائے۔

☆ ☆ ☆

۸- آمدنی بعوض تاوان کی وجہ

حدیث —— زمانۂ نبوت میں ایک شخص نے غلام خریدا۔ اور اس کے ذریعہ آمدنی کی۔ پھر کوئی عیب ظاہر ہوا۔ چنانچہ اس نے غلام واپس کیا۔ بائع نے مطالبہ کیا کہ مجھے غلام کی آمدنی بھی ملنی چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آمدنی بعوض تاوان ہے!'' یعنی واپسی سے پہلے مبیع کا ذمہ دار مشتری تھا۔ اگر غلام مرجاتا تو مشتری کا نقصان ہوتا، پس اس زمانہ کی آمدنی کا بھی وہی حقدار ہے (ابن ماجہ ۲۲۴۳ مشکوٰۃ حدیث ۲۸۷۹)

تشریح: نبی ﷺ نے آمدنی بعوض تاوان کا فیصلہ کر کے جھگڑا ختم کر دیا۔ کیونکہ اس کے علاوہ جھگڑا ختم کرنے کی اور کوئی صورت نہیں۔ بائع سے اگر کہا جائے کہ وہ آمدنی کی مقدار ثابت کرے تو وہ کیسے ثابت کرے گا؟ —— اور اس فیصلہ کی نظیر آپؐ کا یہ فیصلہ ہے کہ جو ترکہ زمانہ جاہلیت میں تقسیم ہو چکا وہ اسی حال پر باقی رکھا جائے گا۔ کیونکہ اس کو دوبارہ اسلامی اصول کے مطابق بانٹنے میں بڑی جھنجھٹ ہے (ابن ماجہ حدیث ۲۷۴۹)

۹- مبیع یا ثمن میں اختلاف کی صورت میں فیصلہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر بائع اور مشتری میں اختلاف ہو جائے۔ اور کوئی گواہ موجود نہ ہو، اور مبیع اپنی حالت پر ہو تو بائع کا قول (قسم کے ساتھ) معتبر ہوگا۔ یا دونوں بیع ختم کر دیں'' یہ ابن ماجہ اور دارمی کی روایت ہے۔ اور ترمذی کی روایت میں ہے: ''جب بائع اور مشتری میں اختلاف ہو جائے تو بائع کا قول (قسم کے ساتھ) معتبر ہے، اور مشتری کو اختیار ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۸۸۰)

تشریح: مبیع یا ثمن کی مقدار میں اختلاف کو نبی ﷺ نے اس فیصلہ کے ذریعہ اس لئے ختم کیا کہ طے شدہ اصول یہ ہے کہ ''کوئی چیز کسی کی ملک سے عقد صحیح اور باہمی رضامندی ہی سے نکل سکتی ہے'' پس جب مبیع یا ثمن میں اختلاف ہوا تو اِس اصل کی طرف پھیرنا ضروری ہے۔ اور مبیع یقیناً بائع کا مال ہے۔ اور اس کا مبیع پر یا تو سرِ دست قبضہ ہے یا متنازع فیہ عقد سے پہلے قبضہ تھا۔ اور بات صاحبِ مال کی معتبر ہوتی ہے —— اور مشتری کو اختیار اس لئے ہے کہ بیع کا مدار باہمی رضامندی پر ہے۔ پس اگر مشتری بائع کی بات پر رضامند ہو جائے تو نزاع خود بخود ختم ہو جائے گا۔

ملحوظہ: یہ حدیث سند کے اعتبار سے متکلم فیہ ہے۔ اور متن بھی مختلف طرح سے مروی ہے۔ اس لئے فقہاء نے اس پر مسائل کی تفریع نہیں کی۔ مسئلہ کی تفصیل کتاب الدعوی، باب التحالف میں ہے۔ خواہشمند حضرات اس کی طرف رجوع کریں۔

[۸] وقال علیه السلام: '' الخَراج بالضمان''
أقول : لاتنقطع المنازعة إلا بأن يُجعل الغُنْمُ بالغُرْمِ، فمن رد المبيع بالعيب: إن طُولب

بَخَراجه كان فى إثبات مقدارِ الخراج حرجٌ عظيمٌ، فقطع المنازعةَ بهذا الحكم، كما قطع المنازعة فى القضاء بأن ميراث الجاهلية على ماقُسِمَ.

[۹] قال صلى الله عليه وسلم: "البَيِّعَانِ إذَا اختلفا، والمبيعُ قائم بعينه. وليس بينهما بينةٌ، فالقولُ ماقال البائع، أو يترادَّانِ البيعَ"

أقول: وإنما قطع به المنازعةَ، لأن الأصل أن لايَخْرُجَ شيئٌ من ملك أحد إلا بعقد صحيح وتراضٍ، فإذا وقعت المشاحَّةُ وجب الردُّ إلى الأصل، والمبيعُ مالُه يقينًا، وهو صاحب اليد بالفعل، أو قبلَ العقد الذى لم تَتَقَرَّرْ صحتُه، والقولُ قولُ صاحب المال، لكنَّ المتباعَ بالخيار، لأن البيعَ مبناه على التراضى.

ترجمہ: (۸) جھگڑا ختم نہیں ہوسکتا مگر اس طرح کہ نفع بعوض نقصان گردانا جائے۔ پس جس نے مبیع عیب کی وجہ سے واپس کردی: اگر اس سے مبیع کی آمدنی کا مطالبہ کیا جائے تو آمدنی کی مقدار ثابت کرنے میں بڑی دشواری ہوگی۔ پس آپؐ نے اس حکم کے ذریعہ جھگڑا کاٹ دیا، جس طرح جھگڑا کاٹ دیا اس فیصلہ میں کہ جاہلیت کی میراث اس طور پر باقی رکھی جائے گی جس طرح وہ تقسیم کی گئی ہے —— (۹) اور آپؐ نے اس طرح جھگڑا اسی لئے کاٹا کہ اصل یہ ہے کہ کوئی چیز کسی کی ملک سے نہ نکلے مگر عقد صحیح اور باہمی رضامندی کے ذریعہ۔ پس جب اختلاف رونما ہوا تو اصل کی طرف پھیرنا ضروری ہے۔ اور مبیع یقیناً بائع کا مال ہے۔ اور وہی سرِ دست قابض ہے یا اس عقد سے پہلے قابض تھا جس کی صحت ابھی ثابت نہیں ہوئی۔ اور قول صاحبِ مال کا قول ہوتا ہے۔ مگر مشتری کو اختیار ہے، کیونکہ بیع کا مدار باہمی رضامندی پر ہے۔

☆ ☆ ☆

۱۰- شفعہ کی علت اور مختلف روایات میں تطبیق

شفعہ کے سلسلہ میں تین روایتیں ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

پہلی روایت —— حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر اس چیز میں شفعہ کا فیصلہ فرمایا جو تقسیم نہیں کی گئی۔ پس جب حدود قائم ہوجائیں، اور راہیں جدا کردی جائیں تو شفعہ نہیں (رواہ البخاری، مشکوٰۃ حدیث ۱۹۶۱)

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ "شریک شفیع ہے، اور شفعہ ہر چیز میں ہے" (مشکوٰۃ حدیث ۲۹۶۸ مگر یہ روایت مرسل ہے)

دوسری روایت —— حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "پڑوسی اپنے شفعہ کا زیادہ حقدار ہے۔ شفعہ کے لئے اس کا انتظار کیا جائے، اگر وہ غیر موجود ہو، جبکہ دونوں کا راستہ ایک ہو" (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۶۷)

تیسری روایت —— حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’پڑوسی اپنے قرب کا زیادہ حقدار ہے‘‘ (مشکوٰۃ حدیث ۲۹۶۳) اور ترمذی کی روایت کے الفاظ ہیں: ’’گھر کا پڑوسی گھر کا زیادہ حقدار ہے‘‘

تشریح: ائمۂ اربعہ میں اختلاف ہے کہ شفعہ کی علت کیا ہے؟ احناف کے نزدیک علت: دفعِ ضررِ جوار (پڑوسی کی پریشانیوں سے بچنا) ہے — اور شفیع کی دو قسمیں ہیں: شریک فی نفس المبیع اور جار (جار فی الحقوق اور جار محض) ائمہ ثلاثہ کے نزدیک: شفعہ کا حق صرف شریک کے لئے ہے، جبکہ مبیعہ جائداد قابل تقسیم ہو۔ اور احناف کے نزدیک ترتیب وار سب کے لئے شفعہ ہے یعنی پہلا حق: شریک فی نفس المبیع کا ہے۔ وہ نہ ہو یا شفعہ نہ لے تو پھر شریک فی الحقوق کا ہے، اس کے بعد جار محض کا۔ نقشہ یہ ہے:

شفیع

- شریک
  - مبیع قابل تقسیم — بالاتفاق شفعہ ہے
  - مبیع ناقابل تقسیم جیسے حمام — ائمہ ثلاثہ: نہیں ہے — احناف: ہے
- جار
  - جار (شریک) فی الحقوق جیسے طریق اور پانی کا حصہ — ائمہ ثلاثہ: نہیں ہے — احناف: ہے
  - جار محض — ائمہ ثلاثہ: نہیں ہے — احناف: ہے

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ نے پہلی روایت کے منطوق و مفہوم: دونوں سے استدلال کیا ہے۔ منطوق یہ ہے کہ شفعہ شریک کے لئے ہے۔ اور مفہوم مخالف یہ ہے کہ غیر شریک کے لئے شفعہ نہیں۔ چنانچہ پہلی روایت میں صراحت ہے کہ جب حدیں قائم ہو جائیں اور راہیں جدا کر دی جائیں تو شفعہ نہیں۔ نیز ان حضرات کے نزدیک: علتِ شفعہ: دفع ضرر قسمت ہے یعنی اگر اجنبی خریدار آ گیا تو اس کے ساتھ جائداد تقسیم کرنی پڑے گی۔ اور اس کا جو خرچہ ہوگا اس میں شریک کو بھی حصہ لینا پڑے گا۔ پس اگر وہ خرچ سے بچنا چاہے تو خریدار کو نہ آنے دے۔ فروخت شدہ حصہ خود اسی قیمت پر لیلے۔ ظاہر ہے کہ یہ علت اس مبیع میں نہیں پائی جاتی جو قابل تقسیم نہیں ہے۔ کیونکہ وہ مشترک ہی استعمال کی جائے گی۔ اس لئے ان ائمہ نے اس صورت میں شفعہ کی نفی کی، اور صرف پہلی روایت لی، باقی روایات کو نہیں لیا۔

اور احناف نے پہلی روایت کے صرف منطوق کو لیا۔ مفہوم مخالف ان کے نزدیک حجت نہیں۔ اور انھوں نے شریک، جار فی الحقوق اور جار محض: سب کے لئے ترتیب وار شفعہ ثابت کیا۔ اور شفعہ کی علت: دفع ضرر جوار نکالی، جو سب کو عام ہے۔ اس طرح انھوں نے سب روایات پر عمل کیا۔

اور ان کے نزدیک پہلی روایت درحقیقت شریک کے لئے حق شفعہ ثابت کرنے کے لئے نہیں ہے۔ یہ بات تو اس سے ضمناً مفہوم ہوتی ہے۔ نیز دوسری مرسل روایت بھی اس سلسلہ میں موجود ہے۔ پہلی روایت درحقیقت ایک غلط فہمی

دور کرنے کے لئے ہے۔ایک مثال سے یہ بات واضح ہوگی:

ایک شخص کا انتقال ہوا۔اس کی جائداد کے وارث ——— مثال کے طور پر ——— تین بیٹے ہیں۔جب تک باپ کی جائداد ان میں مشترک ہے اگر کوئی بھائی اپنا حصہ فروخت کرے تو دوسرے بھائی شفیع ہیں۔لیکن جب زمین کا بٹوارہ ہوجائے، حدیں قائم ہوجائیں اور کھیتوں میں جانے کی راہیں الگ ہوجائیں، پھر کوئی بھائی اپنی زمین بیچے تو دوسرے بھائی شرکت کی بنیاد پر شفیع نہیں ہیں۔مگر دنیا کا رواج یہ ہے کہ اب بھی اگر کوئی بھائی اپنی زمین بیچتا ہے تو دوسرے بھائی یہ کہہ کر کھڑے ہوجاتے ہیں کہ ہمارے باپ کی جائداد ہے، ہم لیں گے۔دوسرے کو نہیں لینے دیں گے۔حدیث شریف میں اس غلط فہمی کو دور کیا گیا ہے کہ جب تک تم سب بھائی شریک تھے، بیشک شرکت کی بنیاد پر شفیع تھے۔مگر اب جبکہ بٹوارہ ہوگیا: تم شفیع نہیں رہے۔اب جس بھائی کی زمین فروخت کردہ زمین سے متصل ہے وہی شفیع ہے۔اور اگر کسی کی بھی زمین اس زمین سے متصل نہیں ہے تو پھر اجنبی شفیع ہے۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے احادیث کی تشریح میں دو باتیں بیان کی ہیں: **ایک**: شفعہ کی علت بیان فرمائی ہے۔**دوسری**: ائمہ ثلاثہ کے مسلک پر وارد ہونے والے ایک سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔سوال یہ ہے کہ ائمہ ثلاثہ نے صرف پہلی حدیث لی ہے۔حالانکہ باقی دو حدیثیں بھی صحیح ہیں۔ان کو کیوں چھوڑ دیا ہے؟ جواب یہ دیا ہے کہ قضاءً حق ِ شفعہ صرف شریک کے لئے ہے، باقی دو کے لئے دیانۃً ہے۔فرماتے ہیں:

شفعہ میں اصل یعنی علت پڑوسیوں اور شریکوں سے ضرر ہٹانا ہے۔اور شاہ صاحب قدس سرہ کی رائے میں شفعہ دو قسم کا ہے:

ایک: وہ شفعہ ہے جس میں جائداد فروخت کرنے والے پر لازم ہے کہ اس کو فیما بینہ وبین اللہ یعنی دیانۃً شفیع پر پیش کرے، اور اس کو دوسروں پر ترجیح دے، مگر قضاءً اس کو شفعہ دینے پر مجبور نہ کیا جائے۔یہ شفعہ اس پڑوسی کے لئے ہے جو شریک نہیں ہے یعنی جار فی الحقوق اور جار محض کے لئے ہے۔

دوسرا: وہ شفعہ ہے جو قضاءً ثابت ہے یعنی شفیع دعوی کرکے لے سکتا ہے۔یہ شفعہ صرف شریک کے لئے ہے ——— اور اس طرح باب کی مختلف احادیث میں تطبیق بھی ہوجاتی ہے۔

فائدہ: جب شاہ صاحب نے علت عام بیان کی ہے تو قضاءً اور دیانۃً کی یہ تقسیم محل نظر ہوجاتی ہے۔

[۱۰] وقال صلى الله عليه وسلم: "الشفعة فيما لم يُقْسَم، فإذا وقعت الحدود، وصُرِفَتِ الطرقُ فلاشفعة" وقال عليه السلام: "الجار أحق بِصَقَبِه"

أقول: الأصل فى الشفعة دفعُ الضرر من الجيران والشركاء؛ وأرى أن الشفعة شفعتان:

[الف] شفعة يجب للمالك أن يَعْرِضَها على الشفيع فيما بينه وبين الله، وأن يُؤْثِرَهُ على غيره،

ولا یُجْبر علیها فی القضاء، وهی للجار الذی لیس بشریك.
[ب] وشفعة یُجْبَر علیها فی القضاء، وهی للجار الشریك فقط —— وهذا وجه الجمع بین الأحادیث المختلفة فی الباب.

ترجمہ: شفعہ میں اصل: پڑوسیوں اور شریکوں سے ضرر ہٹانا ہے —— اور میری رائے میں شفعہ دو قسم کا ہے: ایک شفعہ: ضروری ہے مالک کے لئے کہ اس کو شفیع پر پیش کرے اس کے اور اللہ کے درمیان میں، اور یہ (ضروری ہے) کہ دوسرے کے مقابلہ میں اس کو ترجیح دے۔ اور وہ قضاءً اس پر مجبور نہ کیا جائے اور وہ اس پڑوسی کے لئے جو شریک نہیں ہے —— اور دوسرا شفعہ: قضاءً اس پر مجبور کیا جائے۔ اور وہ صرف شریک کے لئے ہے —— اور یہ باب کی مختلف احادیث کے درمیان تطبیق کی صورت ہے۔

☆ ☆ ☆

۱۱- نادم کا اقالہ مستحب ہونے کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے مسلمان بھائی کے ساتھ کیا ہوا ایسا عقد فسخ کیا جو اس کو ناپسند ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی غلطیوں کو معاف فرمائیں گے'' (شرح السنہ ۳۱۹:۴ حدیث ۲۱۱۰ مشکوۃ حدیث ۲۸۱۸)

تشریح: بیع کا معاملہ مکمل ہو جانے کے بعد کبھی ایک فریق پشیمان ہوتا ہے اور معاملہ ختم کرنا چاہتا ہے تو اگرچہ قانونِ شریعت کی رو سے دوسرا فریق مجبور نہیں کہ وہ اس کے لئے راضی ہو جائے، مگر اخلاقاً دوسرے فریق کو معاملہ ختم کرنے کے لئے رضامند ہو جانا چاہئے۔ کیونکہ معاملہ مکمل ہو جانے کے بعد آدمی اس کو اسی صورت میں ختم کرنا چاہتا ہے جب وہ محسوس کرتا ہے کہ اس سے غلطی ہوگئی۔ پس دوسرے فریق کا معاملہ ختم کرنے کے لئے تیار ہو جانا ایثار ہے جس کا صلہ یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی لغزشوں کو معاف فرمائیں گے۔

۱۲- وہ استثنا جائز ہے جو محلِّ مناقشہ نہ ہو

حدیث —— حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما ایک جہاد سے واپسی پر ایک تھکے ماندے اونٹ پر سفر کر رہے تھے نبی ﷺ ان کے پاس سے گذرے۔ آپؐ نے اونٹ کو ایک چھڑی ماری جس سے وہ غیر معمولی رفتار سے چلنے لگا۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ''مجھے یہ اونٹ ایک اُوقیہ (۴۰ درہم) میں فروخت کر دو'' حضرت جابرؓ فرماتے ہیں: میں نے وہ اونٹ آپؐ کو بیچ دیا۔ اور گھر پہنچنے تک اس پر سواری کرنے کا میں نے استثنا کر لیا۔ پھر جب میں مدینہ پہنچا تو اونٹ لیکر آپؐ کے پاس حاضر ہوا، آپؐ نے مجھے اس کی قیمت ادا کی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ مجھے اونٹ بھی واپس کر دیا (مشکوۃ حدیث ۲۸۷۶)

تشریح: اس حدیث سے ایسے استثنا (شرط) کا جواز ثابت ہوتا ہے جس میں جھگڑے کا اندیشہ نہ ہو۔ دونوں فریق اس کو تبرع اور فیاضی کا معاملہ سمجھ رہے ہوں۔ ان کے ذہنوں میں واقعی شرط اور حقیقی استثنا نہ ہو، تو جھگڑے کا کوئی احتمال نہیں ہوگا اور ممانعت مناقشہ کے اندیشہ سے تھی۔ جب اندیشہ نہ رہا تو ممانعت بھی نہیں رہی۔

۱۳- ماں بچے میں تفریق کی ممانعت کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے ماں اور اس کے بچہ کے درمیان (بیع میں) جدائی کی یعنی دونوں کو الگ الگ جگہ بیچا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے اور اس کے محبوبوں کے درمیان جدائی کریں گے (مشکوٰۃ حدیث ۳۳۶۱ کتاب النکاح، باب النفقات)

حدیث —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دو غلام (نابالغ بچے) بخشے، جو بھائی تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک کو بیچ دیا۔ آپ نے دریافت کیا: ''تمہارا غلام کیا ہوا؟'' انھوں نے بتایا کہ میں نے اس کو فروخت کر دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''اسے لوٹا لو! اسے لوٹا لو!! (مشکوٰۃ حدیث ۳۳۶۲)

تشریح: ماں اور اس کے چھوٹے بچہ میں، اسی طرح دو بھائیوں میں جبکہ دونوں یا ایک بچہ ہو، بیع یا ہبہ میں جدائی کرنا وحشت اور گریہ کا سبب ہے، اس لئے اس سے احتراز ضروری ہے۔

۱۴- آیتِ جمعہ کا مصداق کونسی اذان ہے؟

اور

جمعہ کے دن اذان کے ساتھ کاروبار بند کرنے کی وجہ

آیت کریمہ: سورۃ الجمعہ آیت ۹ میں ارشاد پاک ہے: ''اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز (جمعہ) کے لئے پکارا جائے تو تم اللہ کی یاد (خطبہ و نماز) کی طرف چل پڑو، اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تمہیں کچھ سمجھ ہو!''

تفسیر: اس آیت کریمہ کے ذیل میں شاہ صاحب قدس سرہ نے دو باتیں بیان کی ہیں:

پہلی بات —— آیت کا مصداق دوسری اذان ہے جو امام کے ممبر پر آنے کے بعد دی جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ کاروبار بند کرنے کا حکم ہے (کیونکہ نزولِ آیت کے وقت یہی اذان تھی، پس وہی آیت کا مصداق ہے)

فائدہ: مگر تفسیر کا ضابطہ یہ ہے: **العبرة لعموم اللفظ، لا لخصوص المورد** یعنی اگر آیت کے الفاظ عام ہوں تو اسی کا اعتبار ہے، محلِ ورود خاص ہو تو اس کا اعتبار نہیں۔ اور ﴿إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ﴾ یعنی جب نماز جمعہ کے لئے پکارا جائے،

یہ الفاظ عام ہیں۔ اور اب پہلی اذان ہی اس مقصد کے لئے دی جاتی ہے، پس وہی آیت کا مصداق ہے۔ دوسری اذان تو حاضرین کو اطلاع دینے کے لئے ہے کہ امام آ گیا، لوگ خطبہ سننے کے لئے تیار ہو جائیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اذان جمعہ شروع میں ایک تھی۔ اور وہ اس وقت دی جاتی تھی جب امام خطبہ کے لئے ممبر پر آ جاتا تھا۔ اور یہ اذان مسجد کے دروازے پر چھت پر دی جاتی تھی۔ اور وہ دو مقاصد کے لئے تھی: ایک: غائبین کو نماز کے لئے بلانا۔ دوسرا: حاضرین کو امام کے آنے کی اطلاع دینا۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اور شیخین رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں یہی معمول رہا۔ پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا۔ اور مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی اور شہر پھیل گیا۔ اور ساری بستی میں آواز پہنچنے میں دشواری ہوئی اور لوگوں کے آنے میں بھی دیر ہونے لگی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ کے مشورہ سے مذکورہ دو مقاصد کے لئے دو اذانیں الگ الگ کر دیں۔ پہلی اذان مسجد سے باہر مقام زَوراء پر دی جاتی تھی۔ جو لوگوں کو نماز کی اطلاع دینے کے لئے تھی۔ پھر کچھ وقفہ کے بعد حضرت عثمان تشریف لاتے تھے۔ تب دوسری اذان مسجد کے اندر آپ کے سامنے دی جاتی تھی، یہ حاضرین کو امام کی آمد کی اطلاع دینے کے لئے تھی۔ پس اذانِ جمعہ کے ساتھ کاروبار بند کرنے کا جو حکم ہے وہ پہلی اذان سے متعلق ہوگا۔ کیونکہ اب وہی اذان نماز و خطبہ کے لئے بلاوا ہے۔ اگر دوسری اذان سے یہ حکم متعلق کیا جائے گا تو پہلی اذان کی مشروعیت کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

ملحوظہ: اور ہمارے ملک میں جو رواج ہے کہ آدھ گھنٹہ پہلے جمعہ کی اذان دی جاتی ہے: یہ قطعاً نامناسب ہے۔ اتنی جلدی لوگ کاروبار بند کر کے کیا کریں گے؟ لوگ خواہ مخواہ حرام میں مبتلا ہوتے ہیں! صحیح طریقہ وہ ہے جو آج بھی عرب ممالک میں رائج ہے۔ پہلی اذان کے دس منٹ بعد امام ممبر پر آ جاتا ہے۔ اتنا وقفہ لوگوں کے جمع ہونے کے لئے کافی ہے۔ اور لوگوں کا حال تو یہ ہے کہ ان کو جس چیز کا عادی بنایا جائے بن جاتے ہیں۔

دوسری بات —— اذان کے بعد بھی لوگ خرید و فروخت اور دیگر کاموں میں مشغول رہیں گے تو اندیشہ ہے کہ ان کی نماز فوت ہو جائے۔ یا کم از کم خطبہ یا اس کا کچھ حصہ فوت ہو جائے گا اس لئے اذان کے بعد بیع کی ممانعت کر دی۔

[۱۱] وقال صلى الله عليه وسلم: ''من أقال أخاه المسلم صفقةً كرهها أقال الله عَثْرَته يوم القيامة''

أقول: يستحب إقالةُ النادم في صفقته، دفعاً للضرر عنه، ولايجب، لأن المرءَ مأخوذ بإقراره، لازمٌ عليه ما التزمه.

[۱۲] وحديث جابر رضى الله عنه: '' بعتُه فاستثنيتُ حُمْلاَنَه إلى أهلي''

أقول: فيه جواز الاستثناء فيما لم يكن محلَّ المناقشة، وكانا متبرعَيْن متباذلَيْن، لأن المنعَ إنما هو لكونه مظنة المناقشة.

[۱۳] وقال صلى الله عليه وسلم: " من فَرَّقَ بين والدة وولدها، فَرَّقَ الله بينه وبين أَحِبَّتِهِ يوم القيامة" وقال لعلى رضى الله عنه حين باع أحد الأخوين " رُدَّه!"

أقول: التفريق بين والدة وولدها يُهَيِّجُها على الوحشة والبكاء، ومثلُ ذلك حال الأخوين، فوجب أن يجتنب الإنسانُ ذلك.

[۱٤] قال الله تعالى: ﴿إِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلاَةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ، وَذَرُوا الْبَيْعَ﴾

أقول: يتعلق الحكم بالنداء الذى هو عند خروج الإمام، ولما كان الاشتغالُ بالبيع ونحوِه كثيرًا مايكون مفضيا إلى ترك الصلاة، وترك استماع الخطبة، نهى عن ذلك.

ترجمہ: (۱۱) اپنے عقد میں پشیمان کی بیع کو ختم کرنا مستحب ہے، اس سے ضرر کو ہٹانے کے لئے۔ اور واجب نہیں۔ کیونکہ آدمی اپنے اقرار کی وجہ سے ماخوذ ہے اس پر لازم ہے وہ عقد جس کا اس نے التزام کیا ہے —— (۱۲) اس حدیث میں استثناء کا جواز ہے اس بات میں جو محلّ مناقشہ نہ ہو، اور دونوں تبرع کرنے والے خرچ کرنے والے ہوں، اس لئے کہ ممانعت: مناقشہ کی احتمالی جگہ ہونے ہی کی وجہ سے ہے —— (۱۳) ماں اور اس کے بچہ کے درمیان جدائی کرنا برانگیختہ کرتا ہے ماں کو وحشت اور گریہ پر، اور ایسا ہی معاملہ ہے دو بھائیوں کا، پس ضروری ہے کہ انسان اس سے بچے —— (۱۴) بیع چھوڑنے کا حکم اس اذان سے متعلق ہے جو کہ وہ امام کے نکلنے پر دی جاتی ہے۔ اور جب بیع اور اس کے مانند میں مشغول ہونا بارہا پہنچانے والا تھا، نماز فوت ہونے کی طرف اور خطبہ سننے کو ترک کرنے کی طرف تو اس سے روکا۔

☆　☆　☆

۱۵- قیمتوں پر کنٹرول کا مسئلہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں (ایک دفعہ) مہنگائی بڑھ گئی۔ لوگوں نے عرض کیا: آپؐ ہمارے لئے قیمتیں مقرر فرمادیں۔ یعنی قیمتوں کا کنٹرول کردیں۔ آپؐ نے فرمایا: "اللہ ہی نرخ مقرر کرنے والے، نیچے لانے والے، اوپر لیجانے والے، روزی دینے والے ہیں" یعنی نرخ کی تعیین اور اس کا اتار چڑھاؤ اللہ کی حکمت سے ہوتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ لوگوں کو روزی پہنچاتے ہیں۔ جب قیمتیں اتری ہوئی ہوتی ہیں تو تاجر مال خرید لیتے ہیں۔ پھر جب چڑھتی ہیں تو نفع کماتے ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ مستقل قیمتوں کی تعیین درست نہیں۔ آگے فرمایا: "اور میں آرزو کرتا ہوں کہ اس حال میں اللہ تعالیٰ سے ملوں کہ مجھ سے کوئی حق تلفی کا مطالبہ کرنے والا نہ ہو" (مشکوۃ حدیث ۲۸۹۴)

تشریح: چونکہ صارفین اور مال کے مالکان کے درمیان ایسا منصفانہ حکم دینا یعنی ایسی مناسب قیمتیں مقرر کرنا کہ دونوں میں سے کسی کا نقصان نہ ہو، یا دونوں کو مساوی نقصان برداشت کرنا پڑے: انتہائی دشوار تھا، اس لئے نبی ﷺ نے

قیمتوں پر کنٹرول کرنے سے اجتناب فرمایا۔ تاکہ بعد کے حکام اس کو سند بنا کر من مانی نہ کریں۔ ورنہ اگر تاجروں کی طرف سے عام صارفین پر زیادتی ہو رہی ہو، اور زیادتی ایسی واضح ہو کہ اس میں کوئی شک نہ ہو، تو قیمتوں پر کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ایسے وقت بھی تاجروں کو ظالمانہ نفع اندازی کی چھوٹ دینا اللہ کی مخلوق کو تباہ کرنا ہے۔

وضاحت: بھاؤ جہاں تک چڑھا ہوا ہے: اگر اس کو بہت زیادہ نیچے لایا جائے گا تو تاجروں کا نقصان ہوگا۔ ان کو اسٹاک خرید سے بھی کم میں بیچنا پڑے گا۔ اور اگر بھاؤ برائے نام گھٹایا جائے گا تو خریداروں کی پریشانی دور نہ ہوگی۔ منصفانہ حکم کی دشواری کا یہی مطلب ہے۔

اور بوقتِ اضطرار تسعیر کا جواز: حدیث: **لاضرر ولا ضرار فی الاسلام** اور فقہی ضابطہ **الضرر یُزال** کی رو سے ہے۔ نیز ضررِ عام کے ازالہ کے لئے ضررِ خاص برداشت کیا جاتا ہے۔

فائدہ: حکومت کی جہاں یہ ذمہ داری ہے کہ وہ قیمتوں کو اتنا نہ بڑھنے دے کہ عام صارفین پریشان ہو جائیں، وہاں یہ بھی ذمہ داری ہے کہ قیمتوں کو اتنا نہ گرنے دے کہ تاجروں کا دیوالہ نکل جائے۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کی روایت ہے کہ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ منقّی کے دو بورے لیکر بازار میں بیٹھے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں سے گذرے۔ دریافت کیا: کس بھاؤ بیچتے ہو؟ انھوں نے کہا: ایک درہم کے دو مدّ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بھاؤ بڑھاؤ یا سامان گھر لے جاؤ یعنی اندرونِ خانہ جس طرح چاہو بیچو، مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ طائف سے تاجروں کا ایک قافلہ منقّی لیکر آرہا ہے۔ وہ تمہاری قیمت سے موازنہ کرے گا یعنی ان کو بھی ارزاں بیچنا پڑے گا، اور ان کا نقصان ہوگا (موطا ۲:۶۵۱ کتاب البیوع، باب الحکرۃ وازالۃ الخفا ۲:۱۰۸)

۱۶- قرض اُدھار میں چند باتوں کی تاکید کی وجہ

آیت کریمہ ـــــ سورۃ البقرۃ آیت ۲۸۲ میں ارشاد پاک ہے: ”اے ایمان والو! جب تم باہم ادھار کا معاملہ کرو ایک معین میعاد تک تو اس کو لکھ لو“

تفسیر ـــــ قرض ادھار میں سب سے زیادہ مناقشہ اور جھگڑا پیدا ہوتا ہے۔ اور قرض لینا اور ادھار معاملہ کرنا حاجت کی وجہ سے ضروری بھی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آیات ۲۸۲ و ۲۸۳ میں چند باتوں کی تاکید فرمائی ہے:

۱ ـــ اگر ادھار معاملہ کیا جائے تو مدت کی تعیین کر کے اس کی دستاویز لکھ لی جائے۔

۲ ـــ محض تحریر پر اکتفا نہ کی جائے، بلکہ اس پر گواہی بھی ثبت کی جائے۔

۳ ـــ لکھنے کی جگہ گروی یا ضامن لیا جائے تو یہ بھی درست ہے۔

۴ ـــ گواہی چھپانا بڑا گناہ ہے یعنی جو شخص کسی معاملہ کو جانتا ہو، بوقتِ ضرورت اس پر لازم ہے کہ گواہی دے۔

۵ ـــ جولوگ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں ان پر دستاویز لکھنا واجب بالکفایہ ہے۔
۶ ـــ جولوگ گواہ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ان پر لوگوں کے معاملات میں گواہ بننا بھی واجب بالکفایہ ہے۔
یہ دونوں باتیں واجب کفایہ اس لئے ہیں کہ قرض اُدھار کا معاملہ عقودِ ضروریہ میں سے ہے۔ اور وہ کاتبوں اور شاہدوں کے تعاون کے بغیر تکمیل پذیر نہیں ہوسکتا، جیسے میت کی تجہیز وتکفین لوگوں کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں، پس جیسے یہ فرض کفایہ ہے، وہ بھی واجب کفایہ ہیں۔

[۱۵] وقيل: قد غلَا السعرُ، فَسَعِّرْ لنا فقال عليه السلام: "إن الله هو المسَعِّر القابض الباسط الرزاق! وإنى لأرجو أن ألقى الله وليس أحدٌ يطلبنى بمظلمة"

أقول: لما كان الحكمُ العدلُ بين المشترِيِّيْنَ، وأصحابِ السلع الذى لايتضرر به أحدُهما، أو يكون تضررُهما سواءً: فى غاية الصعوبة: تورَّع منه النبيُّ صلى الله عليه وسلم، لئلا يتخذها الأمراء من بعده سنةً؛ ومع ذلك: فإن رُؤِىَ منهم جَوْرٌ ظاهر، لايَشُكُّ فيه الناسُ، جاز تغييرُه، فإنه من الإفساد فى الأرض.

[۱۶] قال الله تعالى: ﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا! إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلٰى أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ﴾ الآية.

اعلم: أن الدَّين أعظمُ المعاملات مناقشةً، وأكثرها جدلاً، ولا بد منه للحاجة، فلذك أكَّد الله تعالى فى الكتابة والاستشهاد، وشرع الرهنَ والكفالة، وبيَّنَ إثمَ كتمان الشهادة، وأوجب بالكفاية القيامَ بالكتابة والشهادة، وهو من العقود الضرورية.

ترجمہ: (۱۵) جب خریداروں اور مال کے مالکوں کے درمیان ایسا عادلانہ حکم دینا کہ دونوں میں سے کسی کا بھی نقصان نہ ہو، یا دونوں کو مساوی نقصان برداشت کرنا پڑے: انتہائی دشوار تھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قیمتیں مقرر کرنے سے اجتناب فرمایا، تا کہ آپؐ کے بعد حکام اس کو دستور نہ بنالیں۔ اور بایں ہمہ اگر دیکھا جائے مالداروں کی طرف سے ایسا کھلا ظلم جس میں لوگ شک نہ کریں تو بھاؤ کی تبدیلی جائز ہے۔ کیونکہ بھاؤ بڑھا دینا زمین میں تباہی مچانا ہے۔

(۱۶) جان لیں کہ قرض معاملات میں سب سے بڑا ہے مناقشہ کے اعتبار سے، اور ان میں سب سے زیادہ ہے جھگڑے کے اعتبار سے۔ اور حاجت کی وجہ سے قرض لینا ضروری ہے۔ پس اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تاکید فرمائی: (۱) لکھنے (۲) اور گواہ بنانے کی (۳) اور مشروع کیا گروی اور ضمانت کو (۴) اور بیان فرمایا گواہی چھپانے کا گناہ (۵) اور واجب کفایہ کیا لکھنے (۶) اور گواہی کے اہتمام کو۔ اور وہ قرض کا معاملہ: ضروری معاملات میں سے ہے۔

☆ ☆ ☆

۱۷- سلم اور شرائطِ سلم کی حکمت

بیع سلم: وہ بیع ہے جس میں ثمن فوری ادا کیا جاتا ہے۔ اور مبیع ادھار رہتی ہے۔ اس کو طے کردہ تفصیلات کے مطابق مقررہ مدت پر سپرد کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور اسی قسم کے ادھار معاملات میں دستاویز، گواہ، گروی اور ضامن لینے کی ضرورت پیش آتی ہے —— بیع سلم ہر اس چیز کی ہوسکتی ہے جس کی پوری طرح تعیین ہوسکے۔ مثلاً غلّہ، پھل، خشت، کپڑا اور برتن وغیرہ۔ بلکہ اب مشینی دور میں تو بے شمار چیزوں کا سلم ہوسکتا ہے۔

اور بیع سلم میں چونکہ مبیع بوقتِ عقد موجود نہیں ہوتی، اس لئے اس کا جواز خلافِ قیاس ہے۔ لوگوں کی مصلحت کو پیشِ نظر رکھ کر استحساناً جائز رکھا گیا ہے۔ اور وہ مصلحت یہ ہے کہ سلم کے ذریعہ سرمایہ حاصل کرکے بڑے سے بڑا کاروبار کیا جاسکتا ہے۔ اور اس میں خریدار کا بھی نفع ہے۔ البتہ سلم کے جواز کے لئے درج ذیل حدیث میں دو شرطیں بیان کی گئیں ہیں:

حدیث —— رسول اللہ ﷺ ہجرت فرما کر جب مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو لوگ پھلوں کی ایک سال، دو سال اور تین سال کے لئے بیع سلم کرتے تھے۔ آپؐ نے اس کو برقرار رکھا۔ اور فرمایا: ”جو کسی چیز کا سلم کرے وہ متعین پیمانے اور متعین وزن میں مقررہ مدت تک سلم کرے“ (مشکوٰۃ حدیث ۲۸۸۳)

تشریح: اس حدیث میں جوازِ سلم کے لئے دو شرطیں بیان کی گئی ہیں: ایک: پیمانے یا وزن سے مبیع کی مقدار کی تعیین۔ دوسری: تسلیمِ مبیع کی مدت کی تعیین (یہ مدت ایک ماہ سے کم نہیں ہونی چاہئے) اور یہ دو شرطیں بطور مثال ہیں۔ فقہاء نے ان پر قیاس کرکے کچھ اور شرائط بھی بڑھائی ہیں۔ تاکہ مبیع کی پوری وضاحت اور تعیین ہوجائے۔ اور آئندہ کسی بکھیڑے کا اندیشہ نہ رہے۔

۱۸- بیع اور قرض میں فرق کی وجہ

پہلے چار مسائل پڑھ لیں:

۱ —— اموالِ ربویہ گیہوں وغیرہ: دراہم ودنانیر یا کرنسی کے عوض بیچے جائیں تو ثمن ادھار ہوسکتا ہے۔ حالانکہ دراہم ودنانیر بھی ربوی اموال ہیں۔ مگر چونکہ وہ وسیلۂ تکمیلِ حاجات ہیں اس لئے لوگوں کی حاجت کو پیش نظر رکھ کر ثمن کا ادھار جائز ہے۔

۲ —— مبیع کا ادھار جائز نہیں۔ کیونکہ وہ مقصود بالذات ہے۔ مگر سلم اس سے مستثنیٰ ہے۔ اور اس کا جواز بھی لوگوں کی حاجت کے پیش نظر ہے۔

۳ —— مبیع اور ثمن دونوں ادھار نہیں ہوسکتے۔ اور اس میں کوئی استثنا نہیں۔ حدیث میں بیع کالی بالکالی کی ممانعت آئی ہے۔ کیونکہ ایسی بیع فوری فائدہ سے خالی ہوتی ہے۔

۴ــــ ربوی چیزوں کی ہم جنس سے بیع کی جائے تو کمی بیشی اور ادھار دونوں حرام ہیں۔ اور غیر جنس سے کی جائے تو کمی بیشی جائز ہے، اور ادھار حرام ہے۔ مگر قرض اس سے مستثنیٰ ہے۔ کیونکہ قرض کی ماہیت میں ادھار داخل ہے۔ اگر معاملہ دست بدست ہو تو وہ قرض کہاں ہوا؟ اور چونکہ قرض میں وہی چیز لوٹانی ضروری ہے جو لی گئی ہے، اس لئے قرض میں ادھار تو جائز ہے مگر کمی بیشی حرام ہے اور بیع میں دونوں باتیں حرام ہیں۔

اور وجہ فرق یہ ہے کہ دونوں کی حقیقتیں ابتداء میں مختلف ہیں۔ اگرچہ مآل (انجام) کے اعتبار سے دونوں یکساں ہیں۔ بیع میں شروع ہی سے معاوضہ کا قصد ہوتا ہے۔ اور قرض ابتدا میں تبرع یعنی کسی ذاتی منفعت کے بغیر دیا جاتا ہے۔ نیز اس میں عاریت یعنی برتنے کے لئے دینے کے معنی بھی ہیں۔ البتہ جب قرض واپس آتا ہے تو وہ بھی معاوضہ (ادلا بدلا) ہوتا ہے۔ مگر لوگوں کی حاجت کے پیش نظر ابتدائی حالت کا لحاظ کر کے ربوی چیزوں کا قرض لینا جائز رکھا گیا۔ اور ادھار بیچنا جائز نہیں۔

اور ابتدائی حالت میں تفاوت کی نظیر: ہدیہ اور صدقہ ہیں۔ ہدیہ میں مُہدیٰ لہٗ کی خوشنودی مقصود ہوتی ہے اور صدقہ میں اللہ کی خوشنودی منظور ہوتی ہے۔ اگرچہ دونوں کا مآل ثواب ہے (یہ نظیر ہے، مثال نہیں)

۱۹- گروی میں قبضہ کیوں ضروری ہے؟

سورۃ البقرۃ آیت ۲۸۳ میں ہے: ﴿فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ﴾ یعنی ادھار کے معاملہ میں اگر کوئی چیز گروی رکھی جائے تو شیئِ مرہونہ پر مرتہن کا قبضہ ضروری ہے۔ کیونکہ گروی اعتماد کے لئے ہوتی ہے۔ اور اعتماد قبضہ ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ زبانی جمع خرچ سے کیا ہوتا ہے؟ اس لئے رہن میں قبضہ شرط ہے۔ اس کے بغیر رہن مکمل نہیں ہوتا۔

فائدہ: لفظ **مقبوضۃ** میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ مرتہن کو مرہونہ چیز پر صرف قبضہ رکھنے کا حق ہے۔ اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں۔ شیئِ مرہون کے سب منافع اصل مالک کے ہیں۔

۲۰- گروی سے انتفاع کے جواز و عدم جواز کی روایتوں میں تطبیق

پہلی روایت ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''گروی رکھنا: گروی کی چیز کو اس کے اُس مالک سے روکتا نہیں جس نے اس کو گروی رکھا ہے۔ راہن کے لئے رہن کا فائدہ ہے، اور اس پر رہن کا تاوان (خرچہ) ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۸۸۷) یعنی مرتہن مرہونہ چیز سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

دوسری روایت ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سواری کے جانور پر سواری کی جائے اس کے نفقہ کے عوض جبکہ وہ گروی ہو، اور دودھ والے جانور کا دودھ پیا جائے اس کے نفقہ کے عوض جبکہ وہ گروی ہو۔ اور اس شخص پر جو سواری کرتا

ہے یا دودھ پیتا ہے خرچہ ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۸۸۶) یعنی مرتہن مرہونہ چیز سے فائدہ اٹھا سکتا ہے ——— پس دونوں روایتوں میں تعارض ہوا؟

جواب —— میرے نزدیک ان دونوں روایتوں میں کچھ تعارض نہیں۔ پہلی روایت میں: شریعت میں گروی کا مقررہ حکم بیان کیا گیا ہے کہ شیئ مرہون سے مرتہن کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔ گروی کا جو مالک ہے یعنی راہن ہی منافع کا مالک ہے، اور اسی کے ذمے اس کے مصارف ہیں۔ اور دوسری روایت میں ایک ناگہانی صورت کا بیان ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر راہن: شیئ مرہونہ پر خرچ کرنے سے انکار کردے، اور جانور کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہو، اور مرتہن اس کا گھاس چارہ کرکے موت سے بچالے تو مرتہن اس سے اتنا فائدہ اٹھا سکتا ہے جو بہ نظر انصاف درست ہو۔

فائدہ: پہلی حدیث کا یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ ایک جاہلی رواج کی اصلاح کی گئی ہے۔ زمانۂ جاہلیت کا یہ دستور تھا کہ اگر راہن مقررہ مدت میں رہن نہیں چھڑاتا تھا تو مرتہن گروی کی چیز ضبط کرلیتا تھا۔ اسلام نے اس رواج کو ختم کردیا۔

اور دوسری حدیث کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ چونکہ عام طور پر سواری کے جانور کے اور دودھ کے جانور کے منافع اور مصارف برابر ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر راہن اور مرتہن دونوں رضامند ہوں کہ مرتہن ہی گھاس چارہ بھی کرے اور وہی منافع سے استفادہ بھی کرے تو یہ بات درست ہے۔ اور یہ جواز باب مقاصّہ (بدلہ میں روک لینے) سے ہوگا۔ پس رہن سے انتفاع کا جواز ثابت نہیں ہوگا۔

[۱۷] وقَدِمَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم المدينةَ، وهم يُسْلِفون في الثمار السنةَ والسنتين والثلاثَ، فقال:" من أسلف في شيئ فَلْيُسْلِفْ في كيل معلوم ووَزْنٍ معلوم إلى أجل معلوم"

أقول: ذلك: لترتفع المناقشة بقدر الإمكان؛ وقاسوا عليها الأوصافَ التي يُبَيَّنُ به الشيئُ من غير تضييق.

[۱۸] ومبنى القرض على التبرع من أول الأمر، وفيه معنى الإعارة، فلذلك جازت النسيئة، وحرم الفضلُ.

[۱۹] و مبنى الرهن على الاستيثاق، وهو بالقبض، فلذلك اشتُرط فيه.

[۲۰] ولا اختلاف عندي بين حديث:" لا يَغْلَقُ الرهنُ الرهنَ من صاحبه الذي رهنه، له غُنمه، وعليه غُرمه" وحديثِ:" الظهر يُركب بنفقته إذا كان مرهونا، ولبنُ الدَّرِّ يُشرب بنفقته إذا كان مرهونا، وعلى الذي يركب ويشرب النفقةُ" لأن الأول هو الوظيفة، لكن إذا امتنع الراهن من النفقة عليه، وخيف الهلاكُ، وأحياه المرتهن، فعند ذلك ينتفع به بقدر ما يراه الناس عدلاً.

ترجمہ: (۱۷) وہ شرائط اس لئے ہیں کہ حتی الامکان جھگڑا اٹھ جائے۔ اور فقہاء نے ان شرائط پر ان اوصاف کو قیاس کیا ہے جن کے ذریعہ بغیر کسی دقّت کے چیز کی وضاحت کی جاسکتی ہے —— (۱۸) اور قرض کا مدار شروع ہی سے تبرع پر ہے۔ اور اس میں برتنے کے لئے دینے کے معنی ہیں۔ پس اسی وجہ سے ادھار جائز ہے، اور زیادتی حرام ہے —— (۱۹) اور رہن کا مدار مضبوط کرنے پر ہے۔ اور وہ قبضہ سے ہوتا ہے، پس اسی وجہ سے رہن میں قبضہ شرط کیا گیا ہے —— (۲۰) اور کچھ اختلاف نہیں میرے نزدیک اس حدیث کے درمیان...... اور اس حدیث کے درمیان...... اس لئے کہ اول مقررہ حکم ہے۔ لیکن جب راہن: مرہون پر خرچ کرنے سے انکار کرے، اور مرہون کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہو، اور مرتہن اس کو مرنے سے بچالے تو اس وقت وہ اس سے فائدہ اٹھائے جتنا لوگ انصاف سمجھتے ہوں۔

☆ ☆ ☆

۲۱- ڈنڈی مارنا کیوں حرام ہے؟

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے پیمانہ اور ترازو والوں سے فرمایا: ''تم ایسی دو چیزوں کے ذمہ دار بنائے گئے ہو، جن میں تم سے پہلی امتیں ہلاک کی جاچکی ہیں!'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۸۹۰)

تشریح: ناپ تول میں کمی کرنا اس لئے حرام ہے کہ وہ خیانت اور بد معاملگی ہے۔ اور بندوں کے حقوق کی رعایت اور معاملات کی درستگی اتنی اہم ہے کہ اس کی خلاف ورزی پر حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم تباہ کی جاچکی ہے۔ سورۃ الاعراف آیات ۸۵-۹۳ سورۃ ہود آیات ۸۴-۹۵ اور سورۃ الشعراء آیات ۱۷۷-۱۹۱ میں ان کا قصہ ذکر کیا گیا ہے۔

۲۲- دیوالیہ کے پاس جو اپنی چیز بحالہ پائے وہ اس کا زیادہ حقدار ہے

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص دیوالیہ ہوگیا، پس کسی نے اپنا مال بحالہ پایا، تو وہ اس کا زیادہ حقدار ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۸۹۹)

تشریح: جب کسی پر بہت قرضے ہوجاتے ہیں، اور وہ ان کی ادائیگی سے قاصر رہ جاتا ہے، اور قاضی اس کے دیوالیہ ہونے کا اعلان کردیتا ہے، تو اس کے پاس جو کچھ ہوتا ہے قاضی اس کو فروخت کردیتا ہے۔ اور ماحصل قرض خواہوں میں حصہ رسد تقسیم کردیتا ہے۔ ان لوگوں کو باقی قرضہ اس وقت ملے گا جب دیوالیہ کے پاس مال آئے گا —— مذکورہ حدیث اسی مسئلہ سے متعلق ہے۔ اور اس کے مصداق میں تھوڑا اختلاف ہے:

احناف کے نزدیک: حدیث میں امانت یا عاریت کا مال مراد ہے، کیونکہ وہی اس کا مال ہے یعنی اگر کسی نے دیوالیہ کے پاس کوئی چیز امانت رکھی ہے یا عاریت دی ہے، اور وہ اس نے خورد بُرد نہیں کردی تو وہ چیز فروخت نہیں کی جائے گی،

بلکہ مالک کو دیدی جائے گی۔احناف کے نزدیک **مالَه**اور**سلعتَه**میں اضافت: حقیقی ہے۔

اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک: امانت و عاریت کے علاوہ دیوالیہ کو فروخت کیا ہوا مال بھی مراد ہے یعنی کسی نے زید کو بکری فروخت کی۔ابھی اس کی قیمت وصول نہیں ہوئی کہ زید دیوالیہ ہوگیا۔پس اگر بکری بحالہ موجود ہے تو بائع اس کو لے لیگا۔ اس کو فروخت نہیں کیا جائے گا۔اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ فروخت کرنے کے بعد وہ بائع کا مال کہاں رہا؟ شاہ صاحب قدس سرہٗ اس کا جواب دیتے ہیں:

فروخت کیا ہوا مال بائع کو اس لئے واپس ملے گا کہ وہ دراصل اسی کا مال تھا۔پھر اس نے اس کو بیچ دیا۔مگر وہ قیمت کی وصولی کے بغیر اپنی ملک سے نکلنے پر راضی نہیں، اس لئے گویا بیع ثمن کی وصولی کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔پس جب دیوالیہ نے قیمت ادا نہیں کی تو جب تک مبیع بحالہ قائم ہے بائع کو بیع توڑنے کا حق ہے —— البتہ اگر دیوالیہ نے مبیع کو خورد برد کردیا ہو تو چونکہ اب مبیع واپس کرنے کی صورت باقی نہیں رہی اس لئے وہ دیگر قرض خواہوں کی لائن میں کھڑا ہوگا۔اور اس کو بھی حصہ رسد ملے گا۔

[۲۱] وقال صلى الله عليه وسلم لأصحاب الكيل والميزان:" إنكم قد وُلِّيتم أمرين، هلك فيهما الأممُ السالفة قبلَكم"

أقول: يحرم التطفيف، لأنه خيانة وسوءُ معاملةٍ، وقد سيق في قوم شعيبٍ عليه السلام ما قصَّ الله تعالى في كتابه.

[۲۲] وقال:" أيما رجل أَفْلَسَ، فأدركَ رجلٌ مالَه بعينه، فهو أحق به من غيره"

أقول: وذلك: لأنه كان في الأصل مالُه من غير مزاحمة، ثم باعه، ولم يرضَ في بيعه بخروجه من يده إلا بالثمن، فكأن البيع إنما هو بشرط إيفاء الثمن، فلما لم يؤد كان له نقضُه، مادام المبيع قائما بعينه، فإذا فات المبيع لم يكن أن يَرُدَّ المبيعَ، فيصير دينُه كسائر الديون.

ترجمہ: (۲۱) ناپ تول میں کمی کرنا حرام ہے، اس لئے کہ وہ خیانت اور بدمعاملگی ہے۔اور شعیب علیہ السلام کی قوم کے بارے میں بیان کی گئی ہیں وہ باتیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان کی ہیں —— (۲۲) اور وہ بات یعنی مبیع بائع کی اس لئے ہے کہ وہ اصل میں اس کا مال تھا بغیر کسی مزاحمت کے۔پھر اس نے اس کو بیچ دیا۔اور وہ راضی نہیں اپنی بیع میں اس چیز کے اپنے قبضے سے نکلنے پر مگر قیمت کے ذریعہ۔پس گویا بیع ثمن پورا وصول کرنے کی شرط کے ساتھ ہے۔پس جب دیوالیہ نے قیمت ادا نہیں کی تو اس کو بیع توڑنے کا حق ہے، جب تک مبیع بحالہ قائم ہے۔پس جب مبیع فوت ہوجائے تو نہیں ممکن ہوگا کہ اس کو لوٹائے۔پس اس کا قرضہ دیگر قرضوں کی طرح ہوگا۔

تصحیح: وقد سیق تمام نسخوں میں وقد سبق ہے۔ مگر پہلے اس کا تذکرہ نہیں گذرا۔ اس لئے صحیح سِیْقَ ہے۔

☆ ☆ ☆

۲۳-تنگدست سے معاملات میں نرمی برتنا حوصلہ مندی کی بات ہے

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کو یہ بات پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن کی پریشانیوں سے بچائیں: اس کو چاہئے کہ تنگدست کا غم ہلکا کرے یا اس کا قرضہ معاف کردے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۹۰۲)

تشریح: اس حدیث میں سماحت کی ترغیب ہے۔ مالی معاملات میں تنگ دست کے ساتھ نرمی اور رعایت کرنا، اس کو سہولت دینا، اور وہ قرض ادا نہ کرسکتا ہو تو اس کو معاف کردینا بڑی حوصلہ مندی کی بات ہے۔ اور یہ ان بنیادی صفات میں سے ہے جو دنیا وآخرت میں نفع بخش ہیں۔ اور بنیادی خصالِ حمیدہ کا تذکرہ پہلے کئی جگہ گذر چکا ہے۔

۲۴-حوالہ قبول کرنے کی حکمت

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مالدار کا قرض ادا کرنے میں ٹال مٹول کرنا ظلم (زیادتی) ہے۔ اور جب تم میں سے کوئی شخص کسی مالدار کے پیچھے لگایا جائے تو اس کو لگ جانا چاہئے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۹۰۷)

تشریح: حدیث کے پہلے جزء کی وضاحت آئندہ حدیث میں آرہی ہے۔ اور دوسرے جزء میں حوالہ قبول کرنے کی ترغیب ہے۔ حوالہ کے معنی ہیں: ایک کے ذمہ سے دوسرے کے ذمہ قرض اتارنا یعنی مدیون تنگ دست ہو اور وہ کہے کہ: آپ اپنا قرضہ فلاں سے لے لیں۔ اور فلاں مالدار ہے اس سے قرضہ ملنے کی امید ہے۔ اور وہ حوالہ قبول بھی کرتا ہے، تو قرض خواہ کے لئے مستحب یہ ہے کہ وہ حوالہ قبول کرلے۔ اور اب بجائے مدیون کے اس دوسرے شخص سے قرضہ وصول کرے۔ اس میں دو حکمتیں ہیں: ایک: یہ بھی تنگدست کے ساتھ ایک طرح کی رعایت ہے، جس کی گذشتہ حدیث میں ترغیب دی گئی ہے۔ دوسری: اس سے تنگدست کے ساتھ جھگڑا ختم ہوگا۔

۲۵-مالدار ٹال مٹول کرے تو نرمی کا مستحق نہیں

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مالدار کا قرض ادا کرنے میں ٹال مٹول کرنا اس کی بے عزتی اور سزا دہی کو جائز کردیتا ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۹۱۹)

تشریح: مالدار سامان کی قیمت ادا کرنے میں ٹال مٹول کرے تو چونکہ یہ اس کی زیادتی ہے اس لئے اس کے ساتھ درشتی سے پیش آنا جائز ہے۔ اور اس کو قرض خواہ کے مطالبہ پر قید کیا جاسکتا ہے۔ اور اس کو مبیع فروخت کرنے پر بھی مجبور

کیا جاسکتا ہے، اگر اس کے پاس قرضہ چکانے کے لئے اس کے علاوہ کوئی دوسرا سامان نہ ہو۔

۲۶- مصالحت اور اس کی دفعات کا بیان

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمانوں کے درمیان ہر صلح جائز ہے، مگر وہ صلح جو کسی حلال کو حرام یا کسی حرام کو حلال کرے۔ اور مسلمان اپنی طے کردہ دفعات پر ہیں، مگر وہ دفعہ جو کسی حلال کو حرام یا کسی حرام کو حلال کرے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۹۲۳)

تشریح: صلح خوب چیز ہے۔ اور مصالحت کی بہت سی صورتیں ہیں۔ اس کی ایک صورت سورۃ النساء آیت ۱۲۸ میں مذکور ہے کہ اگر کوئی عورت خاوند کا دل اپنے سے پھرا دیکھے، اور اس کو خوش اور اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے مہر یا نفقہ وغیرہ حقوق میں سے کچھ چھوڑ دے تو اس میں کچھ گناہ نہیں۔

صلح کی دوسری صورت یہ ہے کہ قرضہ کا کچھ حصہ معاف کردے۔ حضرت کعب بن مالک اور حضرت عبداللہ بن ابی حدرد رضی اللہ عنہما کے درمیان رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح صلح کرائی تھی (مشکوٰۃ حدیث ۲۹۰۸)

فائدہ: یہ حدیث مصالحت اور اس کی دفعات بلکہ جملہ معاملات کے سلسلہ میں ایک اہم حدیث ہے۔ اس کی رُو سے کسی بھی معاملہ میں آپسی رضامندی سے ایسی شرائط طے کی جاسکتی ہیں جو شریعت کے خلاف نہ ہوں۔ مثلاً: کسی ادارہ کا دستور اساسی بنانا ہے، تو صرف ایک بنیادی بات ملحوظ رکھ کر جو چاہیں دستور بنا سکتے ہیں۔ اور وہ بات یہ ہے کہ دستور کی کوئی دفعہ شریعت کی تصریحات کے خلاف نہ ہو، جیسے کسی کوتاہی پر مالی جرمانہ کرنا یا واجبات سوخت کردینا۔ ایسی دفعات ناجائز ہیں، باقی جو دفعات چاہیں شامل کرسکتے ہیں۔ پھر جب وہ دستور نافذ ہوجائے تو ہر ملازم پر اس کی پابندی لازم ہے (یہ فائدہ کتاب میں ہے)

[۲۳] وقال صلى الله عليه وسلم: " من سَرَّه أن يُنْجِيَه الله من كُرَبِ يوم القيامة، فَلْيُنَفِّسْ عن مُعسر، أو يَضَعْ عنه"

أقول: هذا نَدْبٌ إلى السماحة التي هي من أصولِ ما يَنْفَعُ في المعاد والمعاش، وقد ذكرناه.

[۲٤] وقال عليه السلام: " مَطْلُ الغنى ظلم، وإذا أُتْبِعَ أحدُكم على مَلِيْءٍ فَلْيَتْبَعْ"

أقول: هذا أمرُ استحبابٍ، لأن فيه قطعَ المناقشة.

[۲٥] قال صلى الله عليه وسلم: " لِيُّ الواجدِ يُحِلُّ عِرْضَه وعقوبتَه"

أقول: هو أن يُغَلَّظَ له في القول، ويُحْبَسَ له، ويُجْبَرَ على البيع إن لم يكن له مال غيره.

[۲٦] وقال صلى الله عليه وسلم: " الصلح جائز بين المسلمين، إلا صلحًا حَرَّم حلالاً، أو

أحلَّ حرامًا، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطًا حَرَّمَ حلالاً، أو أحلَّ حراما" فمنه وضعُ جزءٍ من الدين، كقصة ابن أبى حَدْرَدٍ؛ وهذا الحديث أحدُ الأصول فى باب المعاملات.

ترجمہ: (۲۳) یہ اس سماحت کی دعوت ہے جو کہ وہ ان اخلاق کی بنیادوں میں سے ہے جو آخرت اور دنیا میں نفع بخش ہیں۔اور ہم ان صفات کا تذکرہ کر چکے ہیں — (۲۴) یہ استحبابی امر ہے۔اس لئے کہ اس میں ٹنٹا ختم کرنا ہے — (۲۵) وہ بے عزتی یہ ہے کہ بات چیت میں اس سے سختی کی جائے، اور قرض خواہ کے لئے اس کو قید کیا جائے۔اور وہ مجبور کیا جائے۔مبیع بیچنے پر اگر اس کے سوا کوئی دوسرا مال نہ ہو — (۲۶) پس مصالحت میں سے قرض کے کسی جزء کو معاف کرنا ہے۔جیسے ابن ابی حدرد کا واقعہ — (فائدہ) اور یہ حدیث باب معاملات کی بنیادی احادیث میں سے ایک ہے۔

تصحیح: یُحْبس کے بعد **له** مشکوٰۃ سے بڑھایا ہے۔یہ حضرت عبداللہ بن المبارک کا قول ہے۔

باب — ۴

تبرعات ومعاونات

تبرعات کا بیان

پہلا اور دوسرا تبرع: صدقہ اور ہدیہ

تبرع: کسی کو ذاتی منفعت کی امید کے بغیر کوئی چیز دینا۔تبرعات چار ہیں: صدقہ، ہدیہ، وصیت اور وقف۔

پہلا تبرع: صدقہ (زکوٰۃ خیرات) یہ وہ تبرع ہے جس سے اللہ کی رضا جوئی مقصود ہوتی ہے۔اس کے مصارف وہ ہیں جو سورۃ التوبہ آیت ۶۰ میں مذکور ہیں۔جن کی تفصیل کتاب الزکوٰۃ میں گذر چکی ہے۔

دوسرا تبرع: ہدیہ سوغات: یہ وہ تبرع ہے جس سے اس شخص کا دل خوش کرنا مقصود ہوتا ہے جس کو ہدیہ دیا جاتا ہے۔

فائدہ: ہدیہ اگر چھوٹے کو دیا جائے تو اظہارِ شفقت مقصود ہوتا ہے۔دوست کو دیا جائے تو ازدیادِ محبت کا وسیلہ ہوتا ہے۔اور بزرگ کو دیا جائے تو اکرام مقصود ہوتا ہے۔اور وہ نذرانہ کہلاتا ہے۔

ہدیہ کا بدلہ یا تعریف کی حکمت

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس کو کوئی تحفہ دیا گیا: پس اگر اس کے پاس بدلہ دینے کے لئے کچھ ہو تو بدلہ دے، ورنہ (بطور شکریہ) تعریف کرے۔کیونکہ جس نے تعریف کی اس نے (بھی) یقیناً شکریہ ادا کیا۔اور جس

نے (مُنعم کا) احسان چھپایا اس نے یقیناً ناشکری کی۔ اور جو ایسی چیز سے آراستہ ہوا جو وہ نہیں دیا گیا تو وہ جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی طرح ہے'' (مشکوٰۃ ۳۰۲۳)

ہدیہ کا بدلہ دینے میں دو حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت —— ہدیہ کا مقصد لوگوں میں الفت و محبت پیدا کرنا اور تعلقات کو خوشگوار بنانا ہے۔ اور یہ مقصد اس وقت تکمیل پذیر ہوتا ہے جب ہدیہ کا بدلہ دیا جائے۔ کیونکہ ہدیہ دینے سے: ہدیہ دینے والے کی محبت تو اس شخص کے دل میں پیدا ہوتی ہے جس کو ہدیہ دیا جاتا ہے۔ مگر اس کا برعکس نہیں ہوتا۔ دونوں طرف سے محبت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب ہدیہ کا عوض بھی دیا جائے۔

دوسری حکمت —— خرچ کرنے والا ہاتھ: لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ اور دینے والے کا لینے والے پر احسان ہے۔ پس اگر ہدیہ کا عوض نہیں دیا جائے گا تو وہ خیرات ہوکر رہ جائے گا۔ اور بدلہ دیا جائے گا تو دونوں ہاتھ برابر ہوجائیں گے۔

شکریہ کی حکمت —— اگر بدلہ دینے کے لئے کوئی چیز میسر نہ ہو تو زبان سے شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ اور مناسب موقعہ پر مُنعم کے احسان کا اظہار کرنا چاہئے کیونکہ تعریف کرنا نعمت کو قابل لحاظ سمجھنا ہے۔ اور اس سے ہدیہ دینے والے کی محبت دل میں پیدا ہوتی ہے۔ تعریف بھی وہی کام کرتی ہے جو ہدیہ کرتا ہے —— اور اگر شکریہ ادا نہیں کیا جائے گا تو ہدیہ دینے والے کا مقصد فوت ہوجائے گا۔ اس کا مقصد مُہدی لہ کی خوشی ہے جس کا پتہ نہیں چلا۔ اور معاشرہ میں اتحاد و یگانگت کا مقصد بھی ہاتھ سے جائے گا۔ اور ہدیہ دینے والے کا حق بھی پامال ہوگا۔

آخری بات: اور حدیث میں آخری بات یہ ہے کہ جس نے کوئی ایسی بات کہی جس کی حقیقت کچھ نہیں تو وہ جھوٹا ہے۔ اور جھوٹ کے دو کپڑے پہننے کا مطلب یہ ہے کہ جھوٹ اس کے سارے بدن کو شامل ہے یعنی وہ سراپا جھوٹا ہے۔

وضاحت: بعض لوگ لاف زنی کرتے ہیں کہ مجھے ابّا نے یا شوہر نے یہ دیا۔ حالانکہ کچھ نہیں دیا۔ ایسی باتیں فساد پھیلاتی ہیں۔ ان سے احتراز چاہئے۔ حدیث میں ہے: ایک عورت نے کہا: میری سوکن ہے۔ کیا میرے لئے جائز ہے کہ میں یہ ظاہر کروں کہ شوہر نے مجھے یہ دیا۔ حالانکہ وہ نہیں دیا؟ آپؐ نے فرمایا: **المتشبِّعُ بما لم یُعْطَ کلابسِ ثوبَی زُور**: جو ایسی چیز سے شکم سیری ظاہر کرے جو وہ نہیں دی گئی تو وہ جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی طرح ہے (مشکوٰۃ حدیث ۳۲۴۷ کتاب النکاح، باب عشرۃ النساء)

اور یہ ایک معنوی حالت ہے۔ حدیث میں اس کو پیکر محسوس بنایا گیا ہے کہ یہ شخص بہروپیا ہے۔ جھوٹ کا لباس پہن کر سامنے آیا ہے۔ اور یہ بات اسی موقعہ کے ساتھ خاص نہیں۔ جو بھی شخص زبان سے یا طرزِ عمل سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کو بزرگی یا فلاں کمال ملا ہے۔ حالانکہ نہیں ملا، تو وہ بناوٹ کرنے والا دھوکہ باز ہے۔

جزاک اللہ خیراً کہنا آخری درجہ کی تعریف ہے

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس پر کسی نے احسان کیا یعنی ہدیہ دیا، اور اس نے مُنعم سے کہا: جزاک اللہ خیراً (اللہ آپ کو بہترین بدلہ عطا فرمائیں) تو اس نے آخری درجہ کی تعریف کردی'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۰۲۴)

تشریح: سوغات کا شکریہ ادا کرنے کے لئے نبی ﷺ نے یہ جملہ متعین فرمایا ہے۔ کیونکہ ایسے موقعہ میں یعنی احسان کے شکریہ میں لمبا کلام یعنی قصیدہ خوانی مکھن بازی اور لپٹ کر مانگنا شمار کیا جاتا ہے یعنی اس میں یہ استدعا ہوتی ہے کہ آئندہ بھی وہ ہدیہ دیا کرے۔ اور اس سے کم الفاظ بولنا یا منہ سی لینا احسان چھپانا اور نمک حرامی ہے۔ اور بہترین تحیہ (دعائے سلامتی) وہ ہے جو آخرت کی یاد دلائے اور معاملہ اللہ کے حوالے کرے۔ اس دعا کا یہی حاصل ہے کہ میں بدلہ دینے سے عاجز ہوں، اللہ ہی اس قیمتی سوغات کی آخرت میں جزائے خیر دیں گے۔ غرض یہ جملہ ان سب مقاصد کے لئے جامع ہے۔ اس لئے اس موقعہ پر اس کو تجویز کیا گیا ہے۔

﴿التبرع والتعاون﴾

التبرع أقسام:

[۱] صدقة: إن أُريد بـه وجـهُ الله؛ ويجبُ أن يكون مصرفُه ماذكر الله تعالى فى قوله:﴿ إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ﴾ الآية.

[۲] وهديَّة: إن قُصد به وجهُ المُهْدىٰ له.

قـال صـلـى الله عـلـيـه وسلم:" من أُعْطِيَ عطاءً، فوجد فلْيَجْزِ به، ومن لم يجد فَلْيُثْنِ، فإن من أَثنىٰ فقد شكر، ومن كتم فقد كفر، ومن تَحَلّى بما لم يُعْطَ كان كلابسِ ثَوْبَیْ زُورٍ"

اعلم: أن الهدية إنما يُبتغى بها إقامةُ الأُلفة فيما بين الناس، ولايتم هذا المقصودُ إلا بأن يَرُدَّ إليه مثلَه، فإن الهدية تُحَبِّبُ المُهْدِىْ إلى المُهْدىٰ له، من غير عكس.

وأيضا: فإن اليد العليا خير من اليد السفلى، ولِمَنْ أَعْطىٰ الطَّوْلُ على من أخذ.

فـإن عـجـز فـليشـكـره، ولْيُظْهر نعمتَه، فإن الثناء أولُ اعتدادٍ بنعمته، وإضمارٌ لمحبته، وإنه يـفـعـلُ فـى إيـراث الحب ما تفعل الهدية؛ ومن كتم فقد خالف عليه ما أرادَه، ونَاقَضَ مصلحةَ الائتلاف، وغَمَطَ حقَّه؛ ومن أظهر ماليس فى الحقيقة فذلك كِذْبٌ.

وقـولـه عـلـيـه السـلام:" كلابس ثوبَی زور" معناه: كمن تردّى واتَّزَرَ بالزور، وشمل الزورُ

جميعَ بدنه.

قـال صـلى الله عليه وسلم:" من صُنع إليه معروفٌ، فقال لفاعله:" جزاك الله خيراً" فقد أبلغ في الثناء"

أقول: إنـمـا عَيَّـنَ الـنبيُّ صـلى الله عليه وسلم هذه اللفظة: لأن الكلام الزائد في مثل هذا المقام إطراءٌ وإلحاحٌ؛ والناقصَ كتمانٌ وغَمْطٌ؛ وأحسنُ ما يُحَيِّي به بعضُ المسلمين بعضاً: ما يذكِّرُ المعادَ، ويُحيل الأمرَ على الله؛ وهذه اللفظة نصابٌ صالح لجميع ما ذكرنا.

ترجمہ: تبرع اور تعاون کا بیان: تبرع کی چند اقسام ہیں: (۱) صدقہ: اگر تبرع سے اللہ کی خوشنودی مقصود ہو۔ اور ضروری ہے کہ اس تبرع کا مصرف: وہ جگہیں ہوں جن کا اللہ تعالیٰ نے تذکرہ فرمایا ہے اپنے ارشاد میں: ...... (۲) اور ہدیہ: اگر تبرع سے اس شخص کی خوشنودی مقصود ہو جس کو ہدیہ دیا گیا ہے ——— جان لیں کہ ہدیہ سے لوگوں کے درمیان الفت قائم کرنا ہی چاہا جاتا ہے۔ اور یہ مقصد تکمیل پذیر نہیں ہوتا مگر اس طرح کہ لوٹائے وہ ہدیہ دینے والے کو اس کا مانند۔ پس بیشک ہدیہ محبوب بناتا ہے ہدیہ دینے والے کو اس شخص کی طرف جس کو ہدیہ دیا گیا ہے، بغیر عکس کے ——— اور نیز: پس دستِ بالا بہتر ہے دستِ زیریں سے۔ اور اس شخص کے لئے جس نے دیا: احسان ہے اس پر جس نے لیا (لمن أعطى: مبتدا اور الطَوْلُ إلخ خبر ہے۔ اور الطَول بمعنی احسان ہے)

پس اگر وہ درماندہ ہو تو چاہئے کہ وہ ہدیہ دینے والے کا شکریہ ادا کرے۔ اور چاہئے کہ اس کی نعمت کا اظہار کرے۔ پس بیشک تعریف کرنا اس کی نعمت کا اولین شمار میں لانا ہے، اور اس کی محبت کو دل میں چھپانا ہے۔ اور بیشک تعریف کرنا محبت پیدا کرنے میں وہ کام کرتا ہے جو ہدیہ کرتا ہے۔ اور جس نے نعمت چھپائی یعنی تعریف نہ کی تو یقیناً اس نے اس مقصد کی خلاف ورزی کی جو ہدیہ دینے والے نے چاہا ہے۔ اور اس نے مصلحتِ اتحاد کو توڑ دیا۔ اور ہدیہ دینے والے کے حق کی ناشکری کی ——— اور جس نے ظاہر کی وہ چیز جو حقیقت میں نہیں ہے تو وہ جھوٹ ہے۔ اور آپ کا ارشاد: "جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی طرح" اس کے معنی ہیں: جیسے وہ شخص جس نے جھوٹ کی چادر اوڑھی (پہلے کرتے کی جگہ چادر اوڑھی جاتی تھی) اور لنگی باندھی یعنی سوٹ پہنا۔ اور جھوٹ اس کے سارے بدن کو شامل ہو گیا۔

نبی ﷺ نے اس جملہ کو متعین فرمایا: اس لئے کہ اس جیسے مقام میں زیادہ الفاظ تعریف کا پُل باندھنا اور سر ہو جانا ہے۔ اور کم الفاظ نعمت چھپانا اور ناشکری ہے۔ اور بہترین وہ بات جس کے ذریعہ بعض مسلمان بعض کو زندہ رہنے کی دعا دیں: وہ کلام ہے جو آخرت کو یاد دلائے، اور معاملہ کو اللہ کے حوالے کر دے۔ اور یہ جملہ کافی مقدار ہے اُن تمام باتوں کے لئے جو ہم نے ذکر کیں۔

☆ ☆ ☆

ہدیہ: کینہ دور کرنے کا بہترین ذریعہ ہے

حدیث (۱) ـــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''باہم دیگر ہدایا دو۔ بیشک ہدیہ شدید بغض وعداوت کو ختم کر دیتا ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۰۲۷ یہ حدیث بے حد ضعیف ہے)

حدیث (۲) ـــــ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آپس میں ہدایا دو، پس بیشک ہدیہ سینہ کے غیظ وغضب کو ختم کرتا ہے۔ اور کوئی عورت ہرگز حقیر نہ سمجھے اپنی پڑوسن کے لئے، اگرچہ بکری کا آدھا کُھر ہو'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۰۲۸ یہ حدیث بھی ضعیف ہے)

تشریح: ہدیہ تحفہ دلوں کی رنجشیں اور کدورتیں دور کرتا ہے۔ اور آپس میں جوڑ اور تعلقات میں خوشگواری پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ ہدیہ اگرچہ تھوڑا ہو، اس پر دلالت کرتا ہے کہ ہدیہ دینے والے کے نزدیک وہ شخص قابل احترام ہے جس کو وہ ہدیہ دے رہا ہے۔ اور اس شخص کی اس کے نزدیک اہمیت ہے۔ اور اس کو اس سے محبت اور دلچسپی ہے۔ حدیث میں عورت کو جو پڑوسن کا خیال رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اس کی یہی بنیاد ہے کہ پڑوسن سے محبت اور دلچسپی ہونی چاہئے۔ اور جو کچھ میسر ہو، خواہ بکری کا آدھا کُھر ہی ہو، ہدیہ ضرر بھیجنا چاہئے۔ کیونکہ ہدیہ دل کے کینہ کو دور کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اور جب دلوں کا میل دور ہوتا ہے تبھی اہل شہر اور اہل محلّہ میں الفت قائم ہوتی ہے۔

خوشبو کا ہدیہ مسترد نہ کرنے کی وجہ

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کو ناز بو پیش کی جائے: وہ اس کو مسترد نہ کرے۔ کیونکہ وہ کم قیمت خوشبودار چیز ہے!'' (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث ۳۰۱۶) ناز بو: ایک خوشبودار پودا ہے۔ مراد ہر خوشبودار پھول ہے۔

تشریح: ناز بو اور اس جیسی چیزیں مسترد کرنا اس وجہ سے مکروہ ہے کہ وہ کم قیمت اور فرحت بخش ہے۔ اور لوگوں میں اس کے ہدیہ دینے کا رواج ہے۔ اس لئے اس کو قبول کرنے میں نہ بڑا اعار ہے اور نہ پیش کرنے میں زیادہ زحمت ہے۔ اور ایسی خفیف چیزوں کے ہدایا کو معمول بنانا میل ملاپ کو فروغ دیتا ہے۔ اور ان کو مسترد کرنا تعلقات کو بگاڑتا اور دلوں میں کینہ پیدا کرتا ہے کیونکہ ہوسکتا ہے پیش کرنے والا یہ خیال کرے کہ میری چیز کم قیمت ہونے کی وجہ سے قبول نہیں کی گئی، اور اِس سے اُس کی دل شکنی ہو۔

> وقال صلى الله عليه وسلم: '' تَهَادَوْا، فإن الهديَّةَ تُذْهِبُ الضَّغائنَ'' وفي رواية: '' تُذْهِبُ وَحْرَ الصدر''
> أقول: الهدية وإن قلّت تدل على تعظيم المهدىٰ له، وكونه منه على بال، وأنه يحبه، ويَرْغَبُ فيه، وإليه الإشارة في حديث: '' لاتَحْقِرَنَّ جارةٌ لجارتها ولو شق فِرْسَنِ شاةٍ'' فلذلك

كان طريقًا صالحاً لدفع الضغينة، وبدفعها تمامُ الألفة فى المدينة والحيِّ.

قال صلى الله عليه وسلم: " من عُرِض عليه ريحانٌ فلايَرُدَّه، فإنه خفيفُ المِحْمَل، طَيِّبُ الريح"

أقول: إنما كره ردَّ الريحانِ وما يشبهه لخفةِ مُؤْنَتِه، وتعاملِ الناس بإهدائه، فلا يلحق هذا كثيرُ عارٍ فى قبوله، ولاذلك كثيرُ حرج فى إهدائه، وفى التعامل بذلك ائتلاف، وفى ردِّه فساد ذات البين، وإضمار على وَحْر.

ترجمہ: ہدیہ اگرچہ تھوڑا ہو دلالت کرتا ہے مہدیٰ لہ کی تعظیم پر، اور مُہدی کے نزدیک اس کی اہمیت پر، اور اس پر کہ مُہدی اس سے محبت کرتا ہے، اور اس میں رغبت رکھتا ہے۔ اور اس کی طرف اشارہ ہے اس حدیث میں: ...... پس اسی وجہ سے ہدیہ دینا بہترین راہ ہے کینوں کے دفع کرنے کی۔ اور کینوں کے دفعیہ ہی سے شہر اور محلّہ میں الفت تام ہوتی ہے۔

نبی ﷺ نے نازبو کو، اور ان چیزوں کو جو اس کے مشابہ ہیں مسترد کرنا اس کے کم قیمت اور لوگوں میں اس کے ہدیہ پیش کرنے کا تعامل ہونے کی وجہ ہی سے ناپسند کیا ہے۔ پس نہیں لاحق ہوگا اِس شخص کو زیادہ عار اُس کے قبول کرنے میں۔ اور نہیں لاحق ہوگا اُس شخص کو زیادہ حرج اس کے ہدیہ دینے میں۔ اور اس کا تعامل بنانے میں میل ملاپ ہے۔ اور اس کے مسترد کرنے میں باہمی تعلقات کو بگاڑنا ہے۔ اور دل میں کینہ چھپانا ہے۔

☆ ☆ ☆

ہدیہ واپس لینا کیوں مکروہ ہے؟

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہدیہ دیکر واپس لینے والا اُس کتّے جیسا ہے جو اپنی قئے چاٹ لیتا ہے (کتّے کی عادت ہے: جب بہت کھالیتا ہے تو قئے کر دیتا ہے۔ پھر جب دوسرے وقت بھوکا ہوتا ہے تو اپنی قئے کھا کر بھوک مٹاتا ہے) اور ہمارے لئے بری مثال نہیں!'' یعنی مؤمن کو کتّے کی مثال نہیں بننا چاہئے (مشکوۃ حدیث ۳۰۱۸)

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی اپنی بخشی ہوئی چیز واپس نہ لے۔ البتہ باپ اپنی اولاد سے واپس لے سکتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۰۲۰)

تشریح: بخشی ہوئی چیز دو وجہ سے واپس لینا مکروہ ہے:

پہلی وجہ —— جس مال کو آدمی نے اپنے مال سے جدا کر دیا، اور اس کی چاہ ختم کر دی، اس کو واپس لینا: یا تو دی ہوئی چیز کی انتہائی لالچ پیدا ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے یا جس کو دیا ہے اس سے دل تنگ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے یا اس سے دشمنی ہوگئی ہے اس لئے اس کو ضرر پہنچانا چاہتا ہے۔ اور یہ سب باتیں اخلاق مذمومہ ہیں، جن سے احتراز ضروری ہے۔

دوسری وجہ —— ہبہ کی تکمیل وتنفیذ کے بعد اس کو توڑ دینا کینہ اور بغض کا باعث ہے۔ اگر شروع ہی سے نہ دیتا تو

کوئی بات نہیں تھی۔ اس لئے حدیث میں ہدیہ واپس لینے کو اس کتے سے تشبیہ دی ہے جو اپنی قئے چاٹ لیتا ہے۔ اس مثال کے ذریعہ آپؐ نے لوگوں کے لئے ایک معنوی چیز کو نظر آنے والا پیکر بنایا ہے۔ اور لوگوں کو اس حالت کی قباحت نہایت مؤثر طریقہ پر سمجھائی ہے۔

اور دوسری حدیث میں جو فرمایا ہے کہ باپ اپنی اولاد کو دی ہوئی چیز واپس لے سکتا ہے: اس کی وجہ آپسی بے تکلفی ہے، جس کی وجہ سے جھگڑے کا اندیشہ نہیں۔ کیونکہ ضرورت کے وقت باپ اولاد کو اور لادے گا۔

اولاد کو عطیہ دینے میں ترجیح مکروہ ہونے کی وجہ

حدیث —— حضرت نعمان کو ان کے والد بشیر نے ایک غلام بخشا۔ اور گواہ بنانے کے لئے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے پوچھا: ''کیا تم نے اپنی ساری اولاد کو ایسا عطیہ دیا ہے؟'' انھوں نے کہا: نہیں! آپؐ نے فرمایا: ''کیا تمھیں یہ بات پسند ہے کہ تمہاری ساری اولاد تمہارے ساتھ یکساں نیک سلوک کرے؟'' انھوں نے کہا: کیوں نہیں! آپؐ نے فرمایا: ''تو اب نہیں!'' اور ایک روایت میں ہے: ''پس اسے واپس لے لو'' (مشکوۃ حدیث ۳۰۱۹)

تشریح: عطیہ دینے میں بعض اولاد کو بعض پر ترجیح دینا مکروہ ہے۔ کیونکہ اس سے ایک طرف اولاد کے درمیان کینہ پیدا ہوگا، دوسری طرف باپ سے بغض و نفرت پیدا ہوگی۔ اور جس بچے کا حق گھٹایا ہے وہ دل میں غصہ ہوگا۔ اس کے دل میں میل آئے گا۔ اور وہ باپ کے ساتھ نیک سلوک نہیں کرے گا۔ اس طرح گھر برباد ہوگا۔

وقال صلى الله عليه وسلم: " العائد في هبته كالكلب يعود في قيئه، ليس لنا مَثَلُ السَّوْءِ"

أقول: إنما كره الرجوعَ في الهبة: لأن منشأ العود فيما أَفْرَزَهُ من ماله، وقَطَعَ الطمع فيه: إما شُحٌّ بما أعطى، أو تَضَجُّرٌ منه، أو إضرار له؛ وكلُّ ذلك من الأخلاق المذمومة.

وأيضًا: ففي نقض الهبة بعد ما أحكم وأمضى وحَرٌ وضغينةٌ، بخلاف مالم يُعْطِ من أول الأمر، فشبَّه النبيُّ صلى الله عليه وسلم العودَ فيما أفرزه من ملكه بعود الكلب في قيئه، يُمَثِّلُ لهم المعنى بادى الرأى، وبين لهم قبحَ تلك الحالة بأبلغ وجهٍ، اللهم! إلا إذا كان بينهما مباسَطَةٌ ترفع المناقشة، كالولد والوالد، وهو قوله عليه السلام: " إلا الوالدُ من ولده"

وقال صلى الله عليه وسلم فيمن يَنْحَلُ بعضَ أولاده مالم يَنْحَلِ الآخر: " أَيَسُرُّكَ أن يكونوا إليك في البر سواءً؟" قال: بلى، قال: "فلا إذًا"

أقول: إنما كره تفضيلَ بعضِ الأولاد على بعض في العطية: لأنه يورث الحِقدَ فيما بينهم، والضغينةَ بالنسبة إلى الوالد، فأشار النبي صلى الله عليه وسلم إلى أن تفضيلَ بعضِهم على

بعضٍ سببُ أن يُضمِر المنقوصُ له على ضغينةٍ، ويَطْوِی علی غِلٍّ، فیقصِّر فی البر، وفی ذلك فساد المنزل.

ترجمہ: نبی ﷺ نے ہبہ واپس لینے کو اس لئے ناپسند کیا کہ اس چیز کو واپس لینے کا منشا جس کو اس نے اپنے مال سے جدا کر دیا ہے، اور اس میں لالچ ختم کر دی ہے: یا تو بہت زیادہ حرص پیدا ہونا ہے، یا اس شخص سے تنگ دلی ہے، یا اس کو ضرر پہنچانا ہے۔ اور یہ سب باتیں اخلاق مذمومہ میں سے ہیں —— اور نیز: پس ہبہ توڑنے میں اس کو مضبوط کرنے اور نافذ کرنے کے بعد: مکنون غصہ اور کینہ ہے۔ برخلاف اس کے کہ شروع ہی سے نہ دیتا۔ پس نبی ﷺ نے تشبیہ دی اس چیز میں لوٹنے کو جس کو اس نے اپنی ملکیت سے جدا کر دیا ہے کتّے کے اپنی قئے میں لوٹنے کے ساتھ۔ آپ واضح پیکر بنا رہے ہیں لوگوں کے لئے ایک معنوی چیز کو، اور بیان کر رہے ہیں لوگوں کے لئے اس حالت کی قباحت مؤثر طریقہ پر۔ اے اللہ! مگر جب دونوں کے درمیان ایسی بے تکلفی ہو جو جھگڑے کو اٹھا دے۔ جیسے اولاد اور باپ، اور وہ آپ کا ارشاد ہے......

نبی ﷺ نے ناپسند کیا عطیہ میں بعض اولاد کو بعض پر ترجیح دینا، کیونکہ وہ ان کے درمیان چھپا بغض ہے، اور غیظ پیدا کرتا ہے باپ کی بہ نسبت۔ پس نبی ﷺ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ ان میں سے بعض کو بعض پر برتری دینا اس بات کا سبب ہے کہ دل میں پوشیدہ رکھے غیظ کو وہ بچہ جس کا حق کم کیا گیا ہے۔ اور وہ دل میں سخت کینہ رکھے۔ پس حسنِ سلوک میں کوتاہی کرے۔ اور اس میں گھر کا بگاڑ ہے۔

☆ ☆ ☆

تیسرا تبرع: وصیت

مالی معاملات میں سے ایک وصیت ہے۔ اور یہ تیسرا تبرع ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ میرے انتقال کے بعد میری فلاں جائداد یا میرا اتنا سرمایہ فلاں مصرفِ خیر میں خرچ کیا جائے یا فلاں شخص کو دیا جائے تو یہ وصیت ہے۔

وصیت کی حکمت —— وصیت کا طریقہ اس طرح چلا ہے کہ انسانوں میں ملکیت ایک عارضی چیز ہے۔ حقیقت میں ہر چیز کے مالک اللہ تعالیٰ ہیں۔ اور یہ عارضی ملکیت اس وجہ سے ہے کہ انسانوں میں اختلاف اور جھگڑے کی نوبت آتی ہے۔ دیگر حیوانات: چرند و پرند میں ملکیت نہیں ہے۔ ہر چیز اللہ کی ہے۔ مخلوقات اس سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔ اور ان میں کوئی بڑا جھگڑا کھڑا نہیں ہوتا۔ مگر انسانوں کی صورتِ حال دوسری ہے، اس لئے عارضی طور پر انسانوں کی ملکیت تسلیم کی گئی ہے۔ پس جب انسان موت کے قریب پہنچ جائے، اور مال سے بے نیازی کا وقت آ جائے تو مستحب یہ ہے کہ جن لوگوں کے حق میں کوتاہی کی ہے اس کی تلافی کرے۔ اور اس نازک گھڑی میں ان لوگوں کی غم خواری کرے جن کا حق اس پر واجب ہے۔

فائدہ: حق واجب کی وصیت واجب ہے، اور حق مستحب کی مستحب۔ مثلاً: کسی کے پاس کسی کی کوئی چیز امانت ہے یا

اس پر کسی کا قرض ہے یا کسی طرح کا کوئی حق ہے تو اس کی واپسی اور ادائیگی کی وصیت کرنا واجب ہے۔ اور اگر مصارف خیر میں یا کسی غریب یا دوست عزیز پر خرچ کرنا چاہتا ہے تو اس کی وصیت مستحب ہے۔ اور جو بھی وصیت کرے اس کو لکھ کر محفوظ کر دینا چاہئے۔

صرف تہائی کی وصیت جائز ہونے کی وجہ

حدیث —— حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سخت بیمار پڑے۔ نبی ﷺ ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ آپؐ نے دریافت کیا: ''تم نے وصیت کر دی؟'' انھوں نے کہا: جی ہاں! آپ نے دریافت کیا: ''کتنے کی؟'' انھوں نے کہا: میں نے اپنے سارے مال کی جہاد کے لئے وصیت کی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''پھر تم نے اپنی اولاد کے لئے کیا چھوڑا؟'' انھوں نے کہا: وہ اللہ کے فضل سے مالدار ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''دسویں حصہ کی وصیت کرو'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں برابر اصرار کرتا رہا کہ یہ کم ہے، یہاں تک کہ آپؐ نے فرمایا: ''تہائی کی وصیت کرو، اور تہائی بھی بہت ہے!'' (مشکوۃ حدیث ۳۰۷۲)

تشریح: دو وجہ سے وصیت جائز نہیں ہونی چاہئے:

ایک —— عرب وعجم کی قوموں میں میت کا مال اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اور یہ ان کے نزدیک فطری بات اور لازمی امر جیسا ہے۔ اور اس میں بے شمار مصلحتیں ہیں۔ پس جب کوئی شخص بیمار پڑتا ہے، اور موت اس کو نظر آنے لگتی ہے تو ورثاء کی ملکیت کی راہ کھل جاتی ہے یعنی مرض الموت میں میت کے مال کے ساتھ ورثاء کا حق متعلق ہو جاتا ہے۔ پس غیروں کے لئے وصیت کر کے ورثاء کو اس چیز سے مایوس کرنا جس کی وہ امید باندھے بیٹھے ہیں: ان کے حق کا انکار اور ان کے حق میں کوتاہی ہے۔

دوسری —— حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ میت کا مال اس کے بعد اس کے اُن قریب ترین لوگوں کو ملے جو اس کے سب سے زیادہ حقدار، سب سے زیادہ مددگار، اور سب سے زیادہ غم خوار ہوں۔ اور ایسا ماں باپ، اولاد اور رشتہ داروں کے علاوہ کوئی نہیں۔ اسی وجہ سے دور اول کے ہنگامی حالات میں جو موالات (آپس کی دوستی) اور مواخات (بھائی چارگی) کی وجہ سے میراث ملتی تھی، اس حکم کو ختم کر دیا گیا۔ اور رشتہ داری کی بنیاد پر توریث کا حکم نازل ہوا۔ سورۃ الانفال آیت ۷۵ میں ارشاد پاک ہے: ''اور جو لوگ رشتہ دار ہیں: کتاب اللہ میں ایک دوسرے (کی میراث) کے زیادہ حقدار ہیں''

مگر بایں ہمہ: بارہا ایسی باتیں پیش آتی ہیں کہ رشتہ داروں کے علاوہ لوگوں کی غم خواری ضروری ہو جاتی ہے۔ اور بہت سی مرتبہ مخصوص حالات مقتضی ہوتے ہیں کہ ان کے علاوہ کو ترجیح دی جائے۔ اس لئے وصیت کی اجازت دی گئی۔ مگر دوسروں کے لئے وصیت کی کوئی حد مقرر کرنی ضروری ہے تا کہ لوگ اس سے تجاوز نہ کریں۔ شریعت نے وہ حد ایک

تہائی مقرر کی ہے۔ کیونکہ ورثاء کو ترجیح دینا ضروری ہے۔ اور اس کی یہی صورت ہے کہ ان کو آدھے سے زیادہ دیا جائے۔ اس لئے ورثاء کے لئے دو تہائی اور ان کے علاوہ کے لئے ایک تہائی مقرر کیا گیا۔

وارث کے لئے وصیت جائز نہ ہونے کی وجہ

حدیث ــــ نبی ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے (احکام میراث نازل کرکے) ہر حقدار کو اس کا حق دیدیا ہے۔ پس وارث کے لئے وصیت جائز نہیں'' (مشکوۃ حدیث ۳۰۷۳)

تشریح: زمانۂ جاہلیت میں میراث کا کوئی قاعدہ نہیں تھا۔ میت کی وصیت کے مطابق عمل کیا جاتا تھا۔ اور لوگ وصیت میں ایک دوسرے کو ضرر پہنچاتے تھے۔ وہ اس میں حکمت کے تقاضوں کا پورا لحاظ نہیں رکھتے تھے۔ کبھی زیادہ حقدار کو چھوڑ دیتے تھے ــــ حالانکہ اس کی ہمدردی زیادہ ضروری تھی ــــ اور اپنی کج فہمی سے دور کے رشتہ داروں کو ترجیح دیتے تھے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ میراث کے احکام نازل کرکے فساد کا یہ دروازہ بند کردیا جائے۔ اور توریث کے سلسلہ میں رشتہ داری کی کلی احتمالی جگہوں کا اعتبار کیا جائے۔ اشخاص کے لحاظ سے عارضی خصوصیات کا اعتبار نہ کیا جائے۔ یعنی صرف رشتہ داری کو میراث کی بنیاد بنایا جائے۔ کس وارث کا میت سے کتنا تعلق ہے، یہ بات نہ دیکھی جائے۔ کیونکہ انسان پورے طور پر نہیں جان سکتا کہ اصول وفروع میں سے زیادہ نفع پہنچانے والا کون ہے (سورۃ النساء آیت ۱۱) غرض جب اس بنیاد پر میراث کا معاملہ طے کردیا گیا تاکہ لوگوں کے نزاعات ختم ہوں، اور ان کے باہمی کینوں کا سلسلہ رک جائے، تو اس کا تقاضا یہ ہوا کہ کسی وارث کے لئے وصیت جائز نہ ہو، ورنہ توریث کا سارا نظام درہم برہم ہوجائے گا۔

[۳] ووصية: إن كان موقَّتا بالموت. وإنما جرت به السنةُ، لأن المِلك في بني آدم عارض لمعنى المشاحَّة، فإذا قارب أن يستغني عنه بالموت استحب أن يتدارك ما قصَّر فيه، ويُوَاسِيَ من وجب حقُّه عليه في مثل هذه الساعة.

قال صلى الله عليه وسلم: '' أوصِ بالثلث، والثلثُ كثير''

اعلم: أن مال الميت ينتقل إلى ورثته عند طوائف العرب والعجم، وهو كالجبلة عندهم، والأمرِ اللازمِ فيما بينهم، لمصالح لاتُحصى، فلما مرض وأشرف على الموت: توجَّه طريق لحصول مِلكهم، فيكون تاييسُهم عما يتوقعون غمطا لحقهم، وتفريطًا في جنبهم.

وأيضا: فالحكمة أن يأخذ ماله من بعده أقربُ الناس منه، وأولاهم به، وأنصرُهم له، وأكثرهم مواساةً، وليس أحدٌ في ذلك بمنزلة الوالد والولد وغيرهما من الأرحام، وهو قوله تعالى: ﴿وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ﴾

ومع ذلك: فكثيرًا ما تقع أمور توجب مواساةَ غيرهم، وكثيرًا ما يوجب خصوصُ الحال أن يختار غيرَهم، فلابد من ضرب حدّ لايتجاوزه الناس، وهو الثلث، لأنه لابد من ترجيح الورثة، وذلك بأن يكون لهم أكثرُ من النصف، فضرب لهم الثلثين، ولغيرهم الثلث.

وقال صلى الله عليه وسلم:" إن الله قد أَعطى كلَّ ذى حق حقَّه،فلا وصية لوارث"

أقول: لما كان الناس فى الجاهلية يضارُّوْن فى الوصية، ولا يَتَّبعون فى ذلك الحكمةَ الواجبةَ، فمنهم من ترك الأحق– والأوجبُ مواساته– واختار الأبعدَ برأيه الأبترِ، وجب أن يُسَدَّ هذا البابُ، ووجب عند ذلك أن يُعتبر المظان الكلية بحسب القرابات، دون الخصوصيات الطارئة بحسب الأشخاص؛ فلما تقرر أمرُ المواريث قطعًا لمنازعتهم، وسدًّا لضغائنهم، كان من حكمه أن لايُسَوَّغ الوصية لوارث، إذ فى ذلك مناقضة للحد المضروب.

ترجمہ:(۳) اور وصیت: اگر تبرع موقّت ہو موت کے ساتھ۔ اور وصیت کرنے کا طریقہ اسی لئے چلا ہے کہ انسانوں میں ملکیت عارضی چیز ہے جھگڑا دشمنی کرنے کی وجہ سے۔ پس جب آدمی نزدیک ہوجائے اس بات سے کہ مال سے بے نیاز ہوجائے مرنے کی وجہ سے تو مستحب ہے کہ اس بات کی تلافی کرے جس میں اس نے کوتاہی کی ہے۔ اور اس شخص کی غم خواری کرے جس کا اس پر حق واجب ہے، اس جیسی (نازک) گھڑی میں۔

جان لیں کہ میت کا مال اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہوتا ہے عرب وعجم کی قوموں کے نزدیک۔ اور وہ ان کے نزدیک فطری بات اور لازمی امر جیسا ہے، ایسی مصلحتوں کی وجہ سے جو شمار نہیں کی جاسکتیں۔ پس جب وہ بیمار پڑا، اور موت سے قریب ہوگیا، تو متوجہ ہوئی ورثاء کی ملکیت کے پیدا ہونے کی ایک راہ۔ پس ان کو اس چیز سے مایوس کرنا جس کی وہ توقع رکھتے ہیں: ان کے حق کا انکار اور ان کے حق میں کوتاہی ہے —— اور نیز: پس حکمت (کا تقاضا) یہ ہے کہ اس کے بعد اس کا مال لے وہ جو لوگوں میں اس سے قریب تر ہے۔ اور جو ان میں اس کا سب سے زیادہ حقدار ہے، اور ان میں سے جو اس کی سب سے زیادہ مدد کرنے والا ہے۔ اور ان میں جو زیادہ غم خواری کرنے والا ہے۔ اور ان باتوں میں باپ، اولاد اور ان کے علاوہ رشتہ داروں کی بمنزلہ کوئی نہیں۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:...... اور باوجود اس کے: پس بارہا ایسی باتیں پیش آتی ہیں جو ان کے علاوہ کی غم خواری کو واجب کرتی ہیں، اور بارہا مخصوص حالات ان کے علاوہ کی ترجیح کو واجب کرتے ہیں۔ پس ضروری ہوا کہ کوئی ایسی حد مقرر کی جائے جس سے لوگ تجاوز نہ کریں۔ اور وہ حد ''تہائی'' ہے۔ اس لئے کہ شان یہ ہے کہ ورثاء کو ترجیح دینا ضروری ہے۔ اور وہ ترجیح بایں طور پر ہو کہ ورثاء کے لئے آدھے سے زیادہ ہو۔ پس ورثاء کے لئے دو ثلث اور ان کے علاوہ کے لئے ایک ثلث مقرر کیا۔

جب لوگ زمانۂ جاہلیت میں وصیت میں ایک دوسرے کو ضرر پہنچاتے تھے، اور اس سلسلہ میں حکمتِ لازمہ کی پیروی

نہیں کرتے تھے۔ پس ان میں سے بعض وہ تھے جو زیادہ حقدار کو چھوڑ دیتے تھے —— حالانکہ اس کی غم خواری زیادہ ضروری تھی — اور اپنی ناقص رائے سے دور والے کو ترجیح دیتے تھے تو ضروری ہوا کہ یہ دروازہ بند کر دیا جائے۔ پس جب میراث کا معاملہ طے ہوگیا، ان کے آپسی نزاعات کو ختم کرنے کے لئے اور ان کے دلوں کے غیظ کو بند کرنے کے لئے تو اس کے حکم (تقاضے) میں سے تھا کہ کسی بھی وارث کے لئے وصیت جائز نہ رکھی جائے۔ کیونکہ اس میں مقررہ حد (نظام توریث) کو توڑنا ہے۔

☆ ☆ ☆

وصیت تیار رکھنے کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی ایسے مسلمان بندے کے لئے سزاوار نہیں جس کے پاس کوئی ایسی چیز (جائداد، سرمایہ، امانت یا قرض وغیرہ) ہو جس کے بارے میں وصیت کرنی ضروری ہو: کہ وہ دو راتیں گذار دے، مگر اس حال میں کہ اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی ہو'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۰۷۰)

تشریح: وصیت کرنے میں اس کا انتظار نہیں کرنا چاہئے کہ جب بوڑھے ہو جائیں گے اور موت کا وقت قریب آئے گا اس وقت وصیت کر دیں گے۔ کیونکہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ معلوم نہیں وہ کس وقت آ گھیرے۔ یا کوئی ناگہانی حادثہ پیش آ جائے اور وصیت نہ کر سکے اور مصلحت فوت ہو جائے۔ اور کفِ افسوس ملنے کے سوا چارہ نہ رہے۔ پس ہر مؤمن کو چاہئے کہ وہ وصیت نامہ تیار رکھے۔ دو دن بھی ایسے نہیں گذرنے چاہئیں کہ وصیت نامہ موجود نہ ہو۔

فائدہ: معاملات کی یادداشت لکھ لینا یا کسی رازدار مثلاً بیوی بچوں کو بتلا دینا بھی وصیت نامہ لکھنے کے قائم مقام ہے۔

عُمریٰ کا حکم

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص: اس کے لئے اور اس کی نسل کے لئے عُمریٰ دیا گیا تو وہ اس کے لئے ہے جس کو دیا گیا۔ اس شخص کی طرف واپس نہیں لوٹے گا جس نے دیا ہے۔ کیونکہ اس نے ایسا عطیہ دیا ہے جس میں میراث چلتی ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۰۱۱)

حدیث —— حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جس عمری کو رسول اللہ ﷺ نے ہبہ قرار دیا ہے: وہ یہ ہے کہ دینے والا کہے: ''وہ آپ کے لئے اور آپ کی نسل کے لئے ہے'' رہی وہ صورت: جب دینے والے نے کہا ہو: ''وہ آپ کے لئے ہے جب تک آپ زندہ رہیں'' تو وہ دینے والے کی طرف لوٹ جائے گا (مشکوٰۃ حدیث ۳۰۱۲)

تشریح: بعثتِ نبوی کے وقت میں لوگوں میں کچھ ایسے جھگڑے تھے جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتے تھے۔ جیسے سود، خون وغیرہ کے نزاعات۔ ان کو نمٹانا نبی ﷺ کی بعثت کا ایک اہم مقصد تھا۔ ایسے ہی الجھے ہوئے معاملات میں سے

ایک معاملہ یہ تھا کہ کچھ لوگوں نے دوسروں کو عمر بھر کے لئے مکان دیا تھا۔ پھر دینے والے اور لینے والے مرگئے۔ اور اگلا دور آیا تو معاملہ مشتبہ ہوگیا کہ دینے والے نے بخشش دی تھی یا عاریت؟ چنانچہ ان میں جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پس نبی ﷺ نے وضاحت فرمائی کہ اگر دینے والے نے صاف کہا ہے کہ تیرے اور تیری نسل کے لئے ہے تو وہ ہبہ ہے۔ کیونکہ نسل کا تذکرہ کرنا ہبہ کی خصوصیات میں سے ہے۔ اور اگر اس نے کہا کہ تیرے لئے ہے جب تک تو زندہ رہے تو وہ عاریت ہے۔ کیونکہ دینے والے نے تاحیات کی قید لگائی ہے جو ہبہ کے منافی ہے۔

فائدہ: اگر دینے والے نے کوئی صراحت نہ کی ہو، صرف یہ کہا ہو: **اَعْمَرْتُك هذه الدار**: میں نے تجھے زندگی تک یہ گھر دیا: تو عرف کا اعتبار ہوگا۔ عرف میں اس طرح دینے کو ہبہ سمجھا جاتا ہو تو ہبہ ہوگا ورنہ عاریت۔

وقال صلى الله عليه وسلم: ”ما حقُّ امرىءٍ مسلمٍ، له شيئٌ يوصى فيه، يبيت ليلتين إلا ووصيتُه مكتوبةٌ عنده“

أقول: استحب تعجيلَ الوصية احترازًا من أن يهجمَه الموتُ، أو يحدث حادث بغتةً، فتفوته المصلحة التي يجب إقامتها عنده، فيتحسَّر.

قال صلى الله عليه وسلم: ”أيما رجلٍ أُعْمِرَ عُمْرىٰ“ الحديث.

أقول: كان في زمان النبي صلى الله عليه وسلم مناقشات لاتكاد تنقطع، فكان قطعُها إحدى المصالح التي بُعث النبي صلى الله عليه وسلم لها، كالربا والثارات وغيرها. وكان قوم اَعْمَرُوا القوم، ثم انقرض هؤلاء وهؤلاء، فجاء القرن الآخَرُ، فاشتبه عليهم الحال، فتخاصموا، فبين النبي صلى الله عليه وسلم: أنه إن كان نص الواهب: ”هى لك ولعقبك“ فهى هبة، لأنه بين الأمرَ بما يكون من خواص الهبة الخالصة، وإن قال: ”هى لك ما عِشْتَ“ فهى إعارة إلى مدة حياته، لأنه قيَّده بقيد ينافى الهبة.

ترجمہ: نبی ﷺ نے وصیت میں جلدی کرنا پسند کیا، اس بات سے بچتے ہوئے کہ آگھیرے اس کو موت، یا اچانک کوئی نئی بات پیدا ہو، پس وہ مصلحت اس کے ہاتھ سے نکل جائے جس کا قائم کرنا اس کے نزدیک ضروری تھا۔ پس وہ پچھتائے۔

نبی ﷺ کے زمانہ میں کچھ ایسے جھگڑے تھے، جو نہیں قریب تھے کہ ختم ہوں۔ پس ان کو ختم کرنا ان مصلحتوں میں سے ایک تھی جس کے لئے نبی ﷺ مبعوث کئے گئے تھے۔ جیسے سود اور خون کے بدلے اور ان کے علاوہ۔ اور کچھ لوگوں نے دوسروں کو عمر بھر کے لئے مکان دیئے تھے۔ پس یہ اور وہ ختم ہوگئے۔ اور دوسرا قرن آیا: تو ان پر صورتِ حال مشتبہ

ہوگئی۔ پس وہ باہم جھگڑنے لگے۔ پس نبی ﷺ نے یہ بات بیان کی کہ اگر ہبہ کرنے والے کی صراحت ہو کہ ’’مکان تیرے اور تیری نسل کے لئے ہے‘‘ تو وہ ہبہ ہے۔ اس لئے کہ ہبہ کرنے والے نے معاملہ واضح کیا ایسی چیز کے ذریعہ جو خالص ہبہ کی خصوصیات میں سے ہے۔ اور اگر اس نے کہا: ’’وہ تیرے لئے ہے جب تک تو زندہ رہے‘‘ تو اس کی زندگی کی مدت تک برتنے کے لئے دینا ہے۔ اس لئے کہ دینے کو مقید کیا ہے ایسی قید کے ساتھ جو ہبہ کے منافی ہے۔

☆ ☆ ☆

چوتھا تبرع: وقف

وقف: کے لغوی معنی ہیں: روکنا۔ اور اصطلاحی معنی ہیں: جائداد جیسی باقی رہنے والی کوئی چیز محفوظ کرنا اور اس کے منافع کو صدقہ کرنا۔ لوگ زمانۂ جاہلیت میں وقف سے واقف نہیں تھے۔ نبی ﷺ نے چند ایسے مصالح کے پیش نظر جو دیگر صدقات میں نہیں پائے جاتے: وقف کو قرآن کریم سے مستنبط کیا ہے۔ کیونکہ کبھی ایک انسان راہِ خدا میں بہت مال خرچ کرتا ہے۔ اور اس کی حیات تک فقراء اس سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ پھر جب وہ مرجاتا ہے تو ان غریبوں کی حاجت روائی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اور کچھ اور فقراء بھی سامنے آتے ہیں۔ وہ بالکل ہی محروم رہتے ہیں۔ پس اس سے بہتر اور مفید کوئی صورت نہیں کہ وہ شخص کوئی جائداد فقراء اور راہ گذروں کے لئے روک لے یعنی وقف کردے۔ جس کی آمدنی ان لوگوں پر خرچ ہوتی رہے۔ اور اصل جائداد واقف کی ملک میں باقی رہے۔ نبی ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایسا ہی کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ جو درج ذیل حدیث میں مروی ہے:

حدیث —— حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر میں ایک عمدہ زمین ہاتھ آئی۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا: مجھے خیبر میں ایسی زمین ملی ہے جس سے بہتر کوئی مال مجھے نہیں ملا۔ آپؐ اس کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ’’اگر تم چاہو تو اصل زمین روک لو یعنی وقف کردو، اور اس کی آمدنی خیرات کردو‘‘ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا۔ اور وقف نامہ لکھا کہ یہ زمین نہ بیچی جائے، نہ ہبہ کی جائے اور نہ اس میں وارثت جاری ہو۔ اور اس کی آمدنی فقراء پر، رشتہ داروں پر، غلاموں کی آزادی میں، جہاد میں اور مسافر اور مہمان پر خرچ کی جائے۔ اور جو شخص اس وقف کا متولی ہو وہ اس میں سے قاعدہ کے مطابق کھا کھلا سکتا ہے۔ بشرطیکہ مالدار بننے والا نہ ہو (مشکوۃ حدیث ۳۰۰۸)

فائدہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب یہ آیت پاک نازل ہوئی تھی: ﴿لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ اس آیت میں مِنْ تبیین کا بھی ہوسکتا ہے اور تبعیض کا بھی۔ اور مَا موصوفہ بمعنی شیئ یا موصولہ بمعنی الذی یا مصدریہ ہوسکتا ہے۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے تبیین کا ترجمہ کیا ہے۔ ان کا ترجمہ یہ ہے: ’’تم خیر کامل کو کبھی نہ حاصل کرسکوگے، یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کروگے‘‘ اور حضرت شاہ صاحب اور ان کے دونوں صاحب

زادوں نے تبعیض کا ترجمہ کیا ہے۔شاہ صاحب کا ترجمہ یہ ہے: ''ہرگز نیابید نیکوکاری راتا آنکہ خرچ کنید ازآنچہ دوست می دارید'' اور شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ یہ ہے: ''ہرگز نہ حاصل کرسکو گے نیکی میں کمال جب تک نہ خرچ کرو اپنی پیاری چیز سے کچھ'' (ترجمہ شیخ الہند)

اور نزولِ آیت کے وقت جو واقعات پیش آئے ہیں ان سے دونوں احتمال صحیح ثابت ہوتے ہیں۔حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنا باغ صدقہ کیا تھا،اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے اپنا محبوب گھوڑا خیرات کیا تھا۔اس سے معلوم ہوا کہ مِــن تبیین کے لئے ہے۔یعنی محبوب چیز ساری خرچ کرنا ضروری ہے۔اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے جو مشورہ دیا ہے،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مِــنْ تبعیض کے لئے ہے۔اور آیت کا مطلب ہے: اپنی محبوب چیز میں سے کچھ خرچ کرو یعنی محبوب چیز محفوظ رکھو،اور اس کی آمدنی خرچ کرو، یہی وقف کی حقیقت ہے۔غرض نبی ﷺ نے اس آیت سے وقف کا استنباط کیا ہے۔

ومن التبرعات:

[٤] الوقف: وكـان أهـل الـجاهلية لايعرفونه، فاستنبطه النبيُّ صلى الله عليه وسلم لمصالح لاتـوجـد فـى سـائـر الـصـدقـات، فـإن الإنسان ربما يصرف فى سبيل الله مالاً كثيرًا، ثم يفنى، فيـحتـاج أولـئك الـفقراء تارة أخرى، ويجيئ أقوام آخرون من الفقراء، فيبقون محرومين، فلا أحسـنَ ولا أنـفـعَ للعامة من أن يكون شيئ حبسًا للفقراء وأبناء السبيل، تُصرف عليهم منافعه، ويُبـقـى أصلُه على ملك الواقف، وهو قوله صلى الله عليه وسلم لعمر رضى الله عنه:" إن شئتَ حبسـتَ أصـلَهـا وتـصـدَّقتَ بها'' فتصدق بها عمر: أنه لايُباع أصلُها، ولا يوهَب، ولا يورَث؛ وتـصـدَّق بهـا فـى الفقراء، وفى القُربى، وفى الرقاب، وفى سبيل الله، وابن السبيل، والضيفِ؛ لاجناح على من وليها أن يأكل منها بالمعروف أو يُطعم، غير متموِّلٍ.

ترجمہ: اور تبرعات میں سے (۴) وقف ہے۔اور جاہلیت کے لوگ اس کو نہیں جانتے تھے۔پس مستنبط کیا اس کو نبی ﷺ نے چند ایسے مصالح کے پیش نظر جو دیگر صدقات میں نہیں پائے جاتے (مثلاً:) انسان کبھی اللہ کی راہ میں بہت مال خرچ کرتا ہے،پھر وہ مرجاتا ہے،پھر وہ فقراء دوبارہ مال کے محتاج ہوتے ہیں۔اور فقراء کی دوسری جماعت آتی ہے پس وہ محروم رہتی ہے۔پس نہیں ہے عوام کے لئے زیادہ اچھی اور زیادہ مفید بات اس سے کہ کوئی چیز روکی ہوئی ہو فقراء اور مسافروں کے لئے۔ان پر اس چیز کے منافع خرچ کئے جائیں۔اور اس کی اصل واقف کی ملک پر باقی رکھی جائے الی آخرہ۔

☆ ☆ ☆

معاونات کا بیان

معاونت: کے لغوی معنی ہیں: ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ چھ معاملات ایسے ہیں جن میں فریقین کو ایک دوسرے سے مدد ملتی ہے۔ وہ یہ ہیں: مضاربت، شرکت، وکالت، مساقات، مزارعت اور اجارہ۔ سب کی تعریفات اور مختصر تعارف درج ذیل ہے:

۱ــــ **مضاربت** ـــــ اور وہ یہ ہے کہ مال ایک آدمی کا ہو، اور تجارت دوسرا کرے، تاکہ دونوں کو نفع ہو، جیسا انھوں نے آپس میں طے کیا ہے۔

۲ــــ **شرکت** ـــــ یعنی ساجھا۔ شرکت دو طرح کی ہوتی ہے:

(۱) شرکتِ املاک: یعنی ملکیت میں شرکت۔ اور وہ یہ ہے کہ چند شخصوں کو میراث میں یا ہبہ کے طور پر کوئی جائداد یا نقد رقم ملے، تو تقسیم سے پہلے ان میں شرکتِ املاک ہوگی۔

(۲) شرکتِ عقود: یعنی وہ ساجھا جو باہمی معاہدہ سے وجود میں آتا ہے۔ شرکتِ عقود کی چار قسمیں ہیں:

(الف) شرکتِ مُفاوضہ: اور وہ یہ ہے کہ دو شخص جن کا مال مساوی ہو ان تمام چیزوں میں شرکت کا معاہدہ کریں جن کی وہ خرید و فروخت کریں گے۔ اور نفع ان کے درمیان مساوی ہو۔ اور ہر ایک دوسرے کا کفیل (ضامن) اور وکیل (کارندہ) ہو۔

(ب) شرکتِ عِنان: اور وہ یہ ہے کہ دو شخص کسی معین مال میں شرکتِ مفاوضہ ہی کی طرح کی شرکت کا معاہدہ کریں۔ مگر اس میں سرمایہ اور نفع میں برابری شرط نہیں۔

فائدہ: شرکت مفاوضہ صرف بالغ مسلمانوں ہی میں ہوسکتی ہے۔ کیونکہ غیر مسلم ان باتوں کی پابندی نہیں کرسکتا جو اس شرکت کے لئے ضروری ہیں۔ اور شرکتِ عنان: مسلم و غیر مسلم میں بھی ہوسکتی ہے۔

(ج) شرکت صنائع: جس کو شرکتِ اعمال اور شرکتِ تقبُّل بھی کہتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ سرمایہ کے بغیر دو ہم پیشہ یا مزدور باہم معاہدہ کریں کہ ہم مل کر فلاں کام کریں گے۔ اور جو کچھ پیسہ ملے گا وہ دونوں (مساوی یا کم و بیش) بانٹ لیں گے۔

(د) شرکتِ وجوہ: اور وہ یہ ہے کہ دو یا زیادہ آدمی نہ تو کاروبار میں سرمایہ لگائیں، نہ کوئی کام اور پیشہ کریں، بلکہ یہ معاہدہ کریں کہ ہم اپنی ساکھ اور وجاہت کے ذریعہ تاجروں سے ادھار مال لے کر فروخت کریں گے، اور جو کچھ فائدہ ہوگا اس کو حسب قرارداد بانٹ لیں گے۔

۳ــــ **وکالت** ـــــ یعنی اپنا معاملہ دوسرے کو سپرد کرنا، اور تصرف میں اس کو اپنا قائم مقام بنانا۔ وکالت جانبین سے بھی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں دونوں میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے لئے معاملات کرے گا۔

۴ — **مساقات** — کسی کے باغ کی پرداخت کرنا، اس شرط پر کہ پھل دونوں کے درمیان مشترک ہوگا۔

۵ — **مزارعت** — یعنی زمین بٹائی پر دینا۔ اس کی تین صورتیں بالاتفاق جائز ہیں:

(الف) زمین اور بیج ایک آدمی کا ہو، اور ہل بیل اور محنت دوسرے کی ہو۔

(ب) صرف زمین ایک شخص کی ہو، اور باقی تمام چیزیں: ہل بیل، بیج اور محنت کاشتکار کی ہو۔ خیبر کے یہود کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح بٹائی کا معاملہ کیا تھا اس لئے اس کو مخابرہ بھی کہتے ہیں۔

(ج) زمین، ہل بیل اور بیج سب چیزیں ایک کی ہوں، اور صرف محنت کاشتکار کی ہو۔

۶ — **اجارہ** — یعنی عوض لیکر اپنی ذات کے منافع کا کسی کو مالک بنانا۔ اجارہ میں مبادلہ کے معنی بھی ہیں اور معاونت کے معنی بھی۔ چنانچہ اجیر کی دو قسمیں ہیں: اجیر مشترک یعنی وہ پیشہ ور لوگ جو اجرت پر کام کرتے ہیں، جیسے درزی، دھوبی وغیرہ۔ اور اجیر خاص یعنی ملازم۔ اول میں کام مطلوب ہوتا ہے اس لئے اس میں مبادلہ کے معنی غالب ہیں۔ اور ثانی میں عامل کی خصوصیت مطلوب ہوتی ہے یعنی خواہ کام ہو یا نہ ہو ملازم حاضر رہے، اس لئے اس میں معاونت کے معنی غالب ہیں۔

یہ تمام معاملات: نبی ﷺ سے پہلے رائج تھے۔ ان میں سے جس معاملہ میں عام طور پر جھگڑا نہیں ہوتا، اور احادیث میں اس کی ممانعت بھی نہیں آئی وہ اپنی اباحت اصلیہ پر باقی ہے۔ اور گذشتہ باب کے آخر میں جو حدیث آئی ہے کہ: ’’مسلمان اپنی دفعات پر ہیں‘‘ الی آخرہ اس کی رو سے جائز ہے۔

نوٹ: تقریر میں ترتیب و تقسیم بدلی ہے۔ ملاتے وقت اس کا خیال رکھیں۔

أما المعاونة: فهى أنواع أيضاً: منها:

[١] المضاربة: وهى أن يكون المال لإنسانٍ، والعملُ فى التجارة من الآخر، ليكون الربح بينهما على ما يُبَيِّنَانِه.

[٢] والمفاوضة: أن يعقد رجلان- مالُهما سواءٌ- الشركةَ فى جميع ما يشتريانه ويبيعانه، والربح بينهما، وكلٌّ واحد كفيلُ الآخر ووكيلُه.

[٣] والعنان: أن يعقِدَ الشركةَ فى مال معين كذلك، ويكون كل واحد وكيلاً للآخر فيه، ولايكون كفيلاً يُطالب بما على الآخر.

[٤] وشركة الصنائع: كخيَّاطَين أو صَبَّاغَين اشتركا على أن يتقبل كلٌّ واحد، ويكونَ الكسبُ بينهما.

[٥] وشركة الوجوه: أن يشتركا، ولا مالَ بينهما، على أن يشتريا بوجوههما، ويبيعا، والربح بينهما.

[٦] والوكالة: أن يكون أحدهما يعقد العقود لصاحبه.

[٧] والمساقاة: أن تكون أصولُ الشجر لرجل، فيكفى مُؤْنَتَهَا الآخَرُ، على أن يكون الثمر بينهما.

[٨] والمزارعة: أن تكون الأرض والبَذر لواحد، والعمل والبقر من الآخر.

[٩] والمخابرة: أن تكون الأرض لواحد، والبذر والبقر والعمل من الآخر.

[١٠] ونوع آخر: يكون العمل من أحدهما، والباقى من الآخر.

[١١] والإجارة: وفيها معنى المبادلة ومعنى المعاونة: فإن كان المطلوبُ نفسَ المنفعة فالمبادلةُ غالبةٌ، وإن كان خصوصُ العامل مطلوبا فمعنى المعاونة غالبٌ.

وهذه عقود: كان الناس يتعاملون بها قبلَ النبى صلى الله عليه وسلم، فمالم يكن منها محلاًّ لمناقشةٍ غالبًا، ولم يَنْهَ عنه النبيُّ صلى الله عليه وسلم فهو باقٍ على إباحته، داخلٌ فى قوله صلى الله عليه وسلم: "المسلمون على شروطهم"

ترجمہ: واضح ہے۔ چند وضاحتیں یہ ہیں: یُبَيِّـنَانِه میں تثنیہ یُبَيِّنَانِ کے ساتھ مفعول کی ضمیر ہے..... شرکت اور اس کی اقسام اربعہ کو بیان کرنے کے بجائے اس کی اقسام ہی کو بیان کیا ہے..... شرکتِ عنان کے بیان میں كذلك کے معنی ہیں: شرکتِ مفاوضہ کی طرح...... وکالت کے بیان میں جانبین سے وکالت کے معنی ہی بیان کئے ہیں...... مزارعت، مخابرہ اور ایک اور قسم: یہ مزارعت کی تین جائز صورتیں ہیں۔

☆ ☆ ☆

مزارعت کی ممانعت کی توجیہات

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مزارعت کی ممانعت کی جو حدیث مروی ہے: اولاً: تو اس کے راویوں میں بہت ہی زیادہ اختلاف ہے۔ ثانیاً: اکابر صحابہ اور نامی گرامی تابعین نے اس کو قبول نہیں کیا۔ حضرت عمر، حضرت علی، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم مزارعت کرتے تھے (جامع الاصول حدیث ۸۴۶۸) اسی طرح حضرت عمر بن عبد العزیز، حضرت قاسم، حضرت عروہ وغیرہ بھی مزارعت کیا کرتے تھے (مشکوۃ حدیث ۲۹۸۰) ثالثاً: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہود کے ساتھ جو معاملہ کیا تھا وہ مزارعت کے جواز پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے ممانعت کی چند توجیہات کی گئی ہیں:

پہلی توجیہ — پانی کی گذرگاہوں اور کھیت کے خاص حصوں کی پیداوار پر بٹائی کا معاملہ کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ کیونکہ اس میں مخاطرہ ہے۔ ممکن ہے ایک جگہ پیداوار رہو اور دوسری جگہ نہ ہو۔ عام ممانعت نہیں ہے۔ یہ توجیہ خود حضرت رافع

بن خدیج رضی اللہ عنہ نے کی ہے، جو ممانعت کی حدیث کے راوی ہیں (رواہ مسلم، جامع الاصول حدیث ۸۴۷۰)

دوسری توجیہ —— نہی تنزیہی اور ارشادی ہے یعنی لوگوں کو ایک مفید بات بتائی گئی ہے کہ زائد زمین مزارعت پر نہ دی جائے، بلکہ ویسے ہی مسلمان بھائی کو فائدہ اٹھانے کے لئے دی جائے۔ یہ توجیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کی ہے (مشکوٰۃ حدیث ۲۹۷۶)

تیسری توجیہ —— ممانعت اس وقت کے ساتھ مخصوص مصلحت کی بنا پر تھی۔ دو شخص جھگڑتے ہوئے آئے تھے۔ اس موقعہ پر آپؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ''جب تمہارا یہ حال ہے تو کھیتیاں کرایہ پر نہ دیا کرو'' حضرت رافع نے لاتکروا المزارعَ لے لیا، اور موقعہ چھوڑ دیا۔ یہ توجیہ حضرت زید بن ثابت نے کی ہے (رواہ ابوداؤد والنسائی۔ جامع الاصول حدیث ۸۴۶۳)

فائدہ: چونکہ حضرت رافع وغیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے مزارعت کی ممانعت مروی ہے۔ اور مزارعت اور مساقات کا معاملہ یکساں ہے۔ زمین کو بٹائی پر دینے کا نام مزارعت ہے، اور پھل دار درختوں کو بٹائی پر دینے کا نام مساقات ہے، اس لئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے دونوں کو ناجائز فرمایا ہے۔ اور صاحبین کے نزدیک دونوں جائز ہیں۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ نے صرف مزارعت کو ناجائز کہا ہے۔ مساقات کی اجازت دی ہے کیونکہ اس کی ممانعت مروی نہیں۔ بلکہ ان کے نزدیک مساقات کے ضمن میں مزارعت بھی جائز ہے۔ مستقلاً جائز نہیں۔ اور امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک دونوں جائز ہیں۔ اور اب تو چاروں ائمہ کے متبعین جواز کا فتوی دیتے ہیں۔

وقد اختلف الرواةُ فی حدیث رافع بن خدیج اختلافًا فاحشًا، وکان وجوهُ التابعین یتعاملون بالمزارعة، ویدل علی الجواز حدیثُ معاملةِ أهلِ خیبر.

وأحادیثُ النهی عنها محمولة:

[الف] علی الإجارة بما علی الماذِیانات، أو قطعةٍ معینة، وهو قول رافع رضی الله عنه.

[ب] أو علی التنزیه والإرشاد، وهو قول ابن عباس رضی الله عنه.

[ج] أو علی مصحلةٍ خاصة بذلك الوقت، من جهة کثرة مناقشتهم فی هذه المعاملة حینئذ، وهو قول زید رضی الله عنه. والله أعلم.

ترجمہ: واضح ہے۔ المَاذِیَانات: پانی بہنے کی جگہ، یا وہ پیداوار جو پانی بہنے کی جگہ ہو...... تنزیہ اور ارشاد ہم معنی ہیں: نَزَّهه: بری بات سے دور کرنا۔ أَرْشَدَه إلی کذا: بھلائی کی راہ دکھانا...... تیسری توجیہ: یا ممانعت اس وقت کے ساتھ مخصوص مصلحت پر محمول ہے، اس معاملہ میں، اس زمانہ میں لوگوں کے بہت جھگڑوں کی وجہ سے۔ الی آخرہ۔

باب ـــــ ۵

وراثت کا بیان

معاملات میں وراثت ایک اہم معاملہ ہے۔اس کے اکثر احکام قرآن کریم میں منصوص ہیں۔کچھ احکام احادیث اور اجماع سے ثابت ہیں۔شاہ صاحب قدس سرہٗ نے باب کے شروع میں مسائل توریث کے پانچ اصول بیان کئے ہیں۔ اوراس کی تمہید میں دو باتیں بیان کی ہیں۔

خاندان کا قِوام صلہ رحمی سے ہے اور وہی وراثت کی بنیاد ہے

حکمتِ خداوندی چاہتی ہے کہ خاندان وقبیلہ میں ارتباط واتحاد کے لئے کوئی طریقہ ہو کہ ہر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون، تناصر اور ہمدردی کرے۔اور ہر ایک دوسرے کے نفع وضرر کو اپنا نفع وضرر تصور کرے۔اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب تین باتیں پائی جائیں:

اول ـــ جبلّت ـــ یعنی وہ فطری محبت جو باپ، اولاد اور بھائیوں وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔

دوم ـــ عارضی اسباب جو جبلت کو قوی کریں ـــ یہ اسباب: باہمی الفت، ایک دوسرے سے ملاقات کرنا، ہدایا کا لینا دینا اور ایک دوسرے کی غم خواری کرنا ہیں۔یہ چیزیں آپس میں محبت پیدا کرتی ہیں، اور کٹھن حالات میں تعاون پر ابھارتی ہیں۔

سوم ـــ کوئی ایسا موروثی طریقہ، جو جبلت کو مؤکد کرے ـــ یہ طریقہ وہ احکام ہیں جو شریعت نے دیئے ہیں۔ یعنی صلہ رحمی کا وجوب، اور اس سے پہلو تہی پر سرزنش۔

مگر صورتِ حال یہ ہے کہ کچھ لوگ غلط سوچ کی پیروی کرتے ہیں۔اور صلہ رحمی کا حق کما حقہ ادا نہیں کرتے۔اور وہ واجب صلہ رحمی سے کم درجہ کو بھی بہت سمجھتے ہیں۔اس لئے ضروری ہوا کہ صلہ رحمی کی بعض صورتوں کو واجب کیا جائے، خواہ لوگ اس کے لئے تیار ہوں یا نہ ہوں۔جیسے بیمار پرسی کرنا۔قیدی کو چھڑانا۔جنایت کی دیت ادا کرنا اور رشتہ کے غلام کو جب وہ ملکیت میں آئے: آزاد کرنا وغیرہ۔

اوراس قبیل کی چیزوں میں سب سے زیادہ اہمیت اس مال ومنال کی ہے جس سے موت کے قریب آدمی بے نیاز ہوجاتا ہے۔ایسی حالت میں ضروری ہے کہ اس کا مال اس کی زندگی میں گھریلو ضروریات میں خرچ کیا جائے یا اس کی موت کے بعد اس کے رشتہ داروں پر خرچ کیا جائے۔یہی وارثت ہے۔

﴿الفرائض﴾

اعلم : أنه أوجبت الحكمةُ أن تكون السنةُ بينهم: أن يتعاون أهلُ الحى فيما بينهم، ويتناصروا، وَيَتَوَاسَوْا، وأن يَجعل كلُّ واحد ضررَ الآخر ونفعَه بمنزلة ضررِ نفسِه ونفعِه؛ ولا يمكن إقامةُ ذلك إلا بجبلَّةٍ تؤكِّدُها أسبابٌ طارئةٌ، ويُسَجِّلُ عليها سنةٌ متوارثة بينهم:

فالجبلَّة: هى مابين الوالد، والولد، والإخوة، وغير ذلك من المُوَادَّةِ.

والأسباب الطارئة : هى التألُّف، والزيارة، والمُهاداة، والمواساة: فإن كلَّ ذلك يحبِّب الواحد إلى الآخر،ويُشَجِّعُ على النصر والمعاونة فى الكُرَيْهات.

وأما السنة: فهى ما نطقت به الشرائع من وجوب صلة الأرحام، وإقامة اللائمة على إهمالها.

ثم لما كان من الناس من يتَّبع فكرًا فاسدًا، ولايُقيم صلةَ الرَّحِمِ كما ينبغى، ويَعُدّ مادون الواجب كثيرًا: مسَّت الحاجةُ إلى إيجاب بعضِ ذلك عليهم، أشاء وا أم أبوا، مثلُ عيادةِ المريض، وفك العانى، والعَقْلِ، وإعتاق ماملكه من ذى رَحِمٍ، وغير ذلك.

وأحقُّ هذا الصنف ما استَغْنٰى عنه بالإشراف على الموت، فإنه يجب فى مثل ذلك أن يُصْرَفَ ماله على عينه فيما هو نافعٌ فى المعاونات المنزلية، أو يُصرف مالُه من بعده فى أقاربه.

ترجمہ: تقسیم میراث کا بیان: یہ بات جان لیں کہ حکمت الٰہیہ نے واجب کیا کہ لوگوں کے درمیان طریقہ ہو کہ تعاون کریں محلّہ (قبیلہ) والے آپس میں۔ اور ایک دوسرے کی نصرت کریں۔ اور ایک دوسرے کی غم خواری کریں۔ اور یہ (واجب کیا) کہ ہر ایک دوسرے کے نفع وضرر کو اپنی ذات کے نفع وضرر کے بمنزلہ گردانے۔ اور نہیں ممکن ہے اس بات کو بروئے کار لانا مگر ایک ایسی فطرت (مزاج) کے ذریعہ، جس کو مضبوط کریں پیش آنے والے اسباب، اور جس کو مؤکد کرے ایک ایسا طریقہ جو لوگوں میں نسل درنسل چلا آرہا ہو — پس جبلت: وہ باہمی محبت ہے جو والد اور اولاد اور بھائیوں اور ان کے علاوہ اقارب کے درمیان ہوتی ہے — اور عارضی اسباب: وہ باہمی الفت، اور ملاقات کرنا اور ایک دوسرے کو ہدایا دینا اور ایک دوسروں کی غم خواری کرنا ہے۔ پس بیشک یہ سب باتیں محبوب بناتی ہیں ایک کو دوسرے سے۔ اور ہمت افزائی کرتی ہیں مدد کرنے میں۔ اور کٹھن حالات میں ایک دوسرے کا تعاون کرنے میں — اور رہا طریقہ: تو وہ وہ احکام ہیں جن کی شریعتوں نے صراحت کی ہے یعنی صلہ رحمی کا واجب ہونا اور اس کے رائگاں کرنے پر سرزنش کرنا — پھر جب تھے بعض لوگ جو غلط سوچ کی پیروی کرتے تھے۔ اور کما حقہ صلہ رحمی کا اہتمام نہیں کرتے تھے۔ اور واجب صلہ رحمی سے کم درجہ کو بہت گنتے تھے تو حاجت پیش آئی لوگوں پر ان میں سے بعض کو واجب کرنے کی۔ خواہ وہ چاہیں یا انکار کریں۔

جیسے بیمار پرسی، اور قیدی کو چھڑانا اور تاوان ادا کرنا۔ اور اس رشتہ دار غلام کو آزاد کرنا جس کا وہ مالک ہو، اور ان کے علاوہ احکام —— اور اس قسم کا زیادہ حقدار وہ چیز ہے جس سے آدمی بے نیاز ہوجاتا ہے موت کی نزدیکی کی وجہ سے۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ اس جیسی (مایوسی کی) حالت میں واجب ہے کہ اس کا مال خرچ کیا جائے اس کی نگاہ کے سامنے اس کام میں جو کہ وہ مفید ہو گھریلو معاونت (ضروریات) میں۔ یا اس کا مال خرچ کیا جائے اس کے بعد اس کے رشتہ داروں میں۔

☆ ☆ ☆

میراث کے احکام تدریجاً نازل کئے گئے ہیں

میراث کے سلسلہ میں یہ بنیادی بات جان لینی چاہئے کہ دنیا جہاں کے تمام لوگ، خواہ عرب ہوں یا عجم، اس پر متفق ہیں کہ میت کے مال کے سب سے زیادہ حقدار اس کے قرابت دار اور اس کے رشتہ دار ہیں۔ پھر لوگوں میں اس کے بعد سخت اختلاف تھا۔ زمانۂ جاہلیت کے لوگ مردوں ہی کو وارث قرار دیتے تھے۔ عورتوں کو میراث نہیں دیتے تھے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ مرد ہی جنگ کرتے ہیں اور عورتوں اور بچوں کی حفاظت کرتے ہیں، اس لئے بے مشقت اور بے محنت ملنے والی چیز کے وہی زیادہ حقدار ہیں۔

اور نبی ﷺ پر سب سے پہلے جو حکم نازل ہوا وہ قرابت داروں کے لئے وصیت کا حکم تھا۔ مگر اس کی کوئی تعیین و تفصیل نہیں کی گئی تھی۔ کیونکہ لوگوں کے احوال مختلف تھے۔ کسی کا تعاون دو بھائیوں میں سے ایک کرتا تھا، دوسرا نہیں کرتا تھا۔ اور کسی کی مدد باپ کرتا تھا بیٹا نہیں کرتا تھا۔ وقس علی ہذا۔ پس مصلحت یہ تھی کہ معاملہ لوگوں کو سونپ دیا جائے۔ تاکہ ہر ایک اس مصلحت کے موافق فیصلہ کرے جو اس کی سمجھ میں آئے۔ پھر اگر وصیت کرنے والے کی طرف سے ظلم یا گناہ سامنے آئے تو قاضیوں کو اختیار تھا کہ وہ اس وصیت کو سنواریں اور اس میں تبدیلی کریں۔ یہی حکم ایک عرصہ تک رہا۔

پھر جب خلافتِ کبریٰ کے احکام ظہور پذیر ہوئے۔ اور آنحضرت ﷺ کو مشرق و مغرب کی فرمان روائی حاصل ہوئی۔ اور بعثتِ تامہ کی ضیا پاشیاں شروع ہوگئیں تو مصلحت کا تقاضا ہوا کہ لوگوں کا معاملہ ان کے حوالے نہ کیا جائے۔ اور نہ ان کی وفات کے بعد قاضیوں کے حوالے کیا جائے۔ بلکہ عرب و عجم وغیرہ کے جو خصائل و عادات علم الٰہی میں تھے ان کے غالب احتمالی مواقع پر مدار رکھا جائے[1]۔ جو لوگوں کے حق میں امر طبعی کا حکم رکھتے ہیں اور جس کی مخالفت کوئی شاذ و نادر ہی کرتا ہے۔ اور وہ مخالفت کرنے والا اس ناقص الخلقت چوپایے کی طرح ہے جو اللہ کی عادتِ مستمرہ کے خلاف ناک کان کٹا یا ٹیڑھا میڑھا پیدا ہوتا ہے۔ ارشاد پاک ہے: ''تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے باپ اور بیٹوں میں سے تمہیں کون زیادہ نفع پہنچانے والا ہے'' (سورۃ النساء آیت ۱۱) پس معاملہ تمہارے حوالے کرنا مصلحت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو

[1] اس کی تفصیل آگے اصول میراث کے تحت آرہی ہے ۱۲

سب کچھ معلوم ہے اس لئے انھوں نے تمہاری مصلحتوں کا لحاظ کر کے احکام خود تجویز کئے ہیں۔

فائدہ: پہلا حکم سورۃ البقرۃ آیات ۱۸۰-۱۸۲ ﴿کُتِبَ عَلَیْکُمْ إِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمُوْتُ﴾ میں ہے۔ یہ آیات ﴿یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْ أَوْلَادِکُمْ﴾ سے منسوخ ہیں (الفوز الکبیر باب ثانی، فصل ثانی)

واعلم: أن الأصل في الفرائض: أن الناس جميعَهم– عربَهم وعجمَهم– اتفقوا على أن أحقَّ الناس بمال الميت أقاربُه وأرحامُه. ثم كان لهم بعدَ ذلك اختلافٌ شديد. وكان أهلُ الجاهلية يُوَرِّثُوْنَ الرجال دون النساءِ، يرون أن الرجال هم القائمون بالبَيْضَة، وهم الذّابون عن الذِّمار، فهم أحق بما يكون شِبْهَ المَجَّان.

وكان أولُ ما نزل على النبي صلى الله عليه وسلم وجوبُ الوصية للأقربين، من غير تعيين ولاتوقيت، لأن الناس أحوالُهم مختلفةٌ، فمنهم من يَنْصره أحدُ أخويه دون الآخر، ومنهم من ينصره والده دون ولده، وعلى هذا القياس؛ فكانت المصلحة أن يفوَّض الأمر إليهم، ليحكم كلُّ واحد مايرى من المصلحة، ثم إذا ظهر من مُوْصٍ جنفٌ أو أثمٌ كان للقضاة أن يُصلحوا وصيتَه ويُغَيِّروا، فكان الحكم على ذلك مدةً.

ثم إنه لما ظهرت أحكامُ الخلافة الكبرى، وزُوِيَ للنبي صلى الله عليه وسلم مشارقُ الأرض ومغاربُها، وتَشَعْشَعَتْ أنوار البعثة العامة: أوجبت المصلحةُ أن لايُجعل أمرُهم إليهم، ولا إلى القضاة من بعدهم، بل يُجعل على المظانّ الغالبية في علم الله، من عادات العرب والعجم وغيرهم، ممايكون كالأمر الطبيعي، ويكون مخالفه كالشاذ النادر، وكالبهيمة المُخْدَجَةِ التي تُوْلد جَدْعَاء أوعَوْجَاءَ خَرْقًا للعادة المستمرة، وهو قوله تعالى: ﴿لَاتَدْرُوْنَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا﴾

ترجمہ: واضح ہے۔ چند لغات یہ ہیں: بَیْضَة: خود (لوہے کی ٹوپی جو لڑائی میں پہنتے ہیں) القائم بالبیضة: خود سنبھالنے والا یعنی جنگ لڑنے والا...... الذِّمار: قابل حفاظت چیز جس کا دفاع لازم ہو، جیسے بیوی بچے اور اپنی آبرو وغیرہ...... المَجَّان: مفت، بلا قیمت...... زُوِیَ (فعل مجہول) زَوَاہ زَیًّا الشیئَ: قبضہ میں کرنا، اکٹھا کرنا...... شَعْشَعَ الضوءُ: ہلکی روشنی پھیلنا۔

تصحیح: دون ولدہ مخطوطہ کراچی سے بڑھایا ہے۔

☆ ☆ ☆

مسائل میراث کے اصول

اصل اول

میراث میں قرابت کا اعتبار ہے

اور

زوجین قرابت داروں کے ساتھ لاحق ہیں

میراث میں اس مصاحبت ومناصرت اور طبعی یگانگت ومحبت کا اعتبار ہے جو فطری روش کی طرح ہے۔ عارضی اتفاقات مثلاً مواخات کا اعتبار نہیں۔ کیونکہ ان کا انضباط مشکل ہے۔ اور غیر منضبط امر پر شریعت کے عمومی احکام کا مدار نہیں رکھا جاسکتا۔ چنانچہ سورۃ الانفال کی آخری آیت میں اور سورۃ الاحزاب کی آیت ۶ میں ارشاد پاک ہے: ''اور جو لوگ رشتہ دار ہیں حکم شرعی میں ایک دوسرے (کی میراث) کے زیادہ حق دار ہیں'' اس آیت کے ذریعہ اس عارضی حکم کو ختم کردیا گیا جو اوائلِ ہجرت میں مہاجرین وانصار کے درمیان مواخات کی بنیاد پر توریث کے سلسلہ میں دیا گیا تھا۔ چنانچہ اس آخری قانونِ میراث کی رو سے اب میراث صرف رشتہ داروں کو ملتی ہے۔ البتہ میاں بیوی بچند وجوہ رشتہ داروں کے ساتھ لاحق اور ان کے زمرہ میں شامل ہیں۔ وہ وجوہ یہ ہیں:

پہلی وجہ —— زوجین کو ایک دوسرے کی میراث اس لئے دی جاتی ہے کہ نظام خانہ داری میں معاونت مزید پختہ ہوجائے۔ ہر ایک میں یہ جذبہ پیدا ہو کہ دوسرے کے نفع ونقصان کو اپنا ہی نفع ونقصان سمجھے۔ کیونکہ کسی کا بھی نفع یا نقصان ہوگا تو مآلاً میراث میں دوسرے کا نفع یا نقصان ہوگا۔

دوسری وجہ —— شوہر خرچ کرنے کے لئے بیوی کو رقم دیتا ہے (جس میں سے کچھ بچ بھی جاتا ہے) اور شوہر اس کے پاس اپنا مال بھی امانت رکھتا ہے اور اپنی ہر چیز میں اس کو امین سمجھتا ہے۔ پس بیوی کی وفات کے بعد شوہر کے دل میں یہ خیال ضرور پیدا ہوگا کہ بیوی نے جو کچھ چھوڑا ہے: وہ کل کا کل یا اس کا کچھ حصہ درحقیقت اس کا مال ہے۔ اور یہ ایک ایسا خیال ہے جو شوہر کے دل سے نہیں نکلے گا۔ پس شریعت نے اس مرض کا علاج یہ تجویز کیا کہ عورت کے ترکہ میں شوہر کا نصف یا چوتھائی حق رکھ دیا، تاکہ اس کے دل کو تسلی ہو، اور اس کے جھگڑے کی تیزی ٹوٹے۔

تیسری وجہ —— بارہا شوہر سے بیوی اولاد جنتی ہے، جو شوہر کی قوم اور قبیلہ سے ہوتی ہے۔ وہ حسب ونسب اور درجہ میں اس کے برابر ہوتی ہے۔ اور ماں سے انسان کا تعلق اٹوٹ ہے۔ پس اس طرح بیوی ان لوگوں میں شامل ہوجاتی ہے

جوشوہر کی قوم سے جدا نہیں ہوتے، اور بیوی بمنزلہ رشتہ داروں کے ہوجاتی ہے۔

چوتھی وجہ —— شوہر کی وفات کے بعد عورت پر واجب ہے کہ شوہر کے گھر میں عدت گذارے۔ شوہر کے گھر میں عدت گذارنے میں بہت سی مصلحتیں ہیں۔ اور شوہر کے خاندان کا کوئی شخص عورت کی معیشت کا متکفل نہیں ہوتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ شوہر کے مال سے اس کی کفالت کی جائے۔ اور بطور کفالت شوہر کے مال کا کوئی معین حصہ مقرر نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ معلوم نہیں: شوہر کیا چھوڑے گا؟ اس لئے جزِ مشترک چوتھائی یا آٹھواں مقرر کیا گیا۔

﴿مسائل المواريث تبتنى على أصول﴾

منها: أن المعتبر فى هذا الباب هو المصاحبة الطبيعية، والمناصرة، والمُوادَّة التى هى كمذهب جبلّى، دون الاتفاقات الطارئة، فإنها غيرُ مضبوطة، ولايمكن أن يُبنى عليها النواميسُ الكلية، وهو قوله تعالى: ﴿وَأُوْلُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ﴾ فلذلك لم يُجعل الميراثُ إلا لأولى الأرحام، غيرَ الزوجين، فإنهما لاحِقَان بأولى الأرحام، داخلانِ فى تضاعيفهم لوجوه:

منها: تأكيدُ التعاون فى تدبير المنزل، والحثُّ على أن يَعْرِفَ كلُّ واحد منهما ضررَ الآخر ونفعَه راجعًا إلى نفسه.

ومنها: أن الزوجَ يُنفق عليها، ويستودِعُ منها مالَه، ويَأْمَنُها على ذاتِ يده، حتى يتخيل أن جميع ما تركَتْه، أو بعضَ ذلك، هو حقه فى الحقيقة، وتلك خصومةٌ لاتكاد تَنْصَرِمُ، فعالج الشرع هذا الداء: بأن جعل له الربعَ أو النصفَ، ليكون جابرًا لقلبه، وكاسرًا لسَوْرة خصومته.

ومنها: أن الزوجة ربما تَلِدُ من زوجها أولادًا، هم من قوم الرجل لامحالة، وأهلِ نسبه ومنصبه، واتصالُ الإنسان بأمِّه لاينقطع أبدا، فمن هذه الجهة تدخل الزوجةُ فى تضاعيف من لاينفكُّ عن قومه، وتصيرُ بمنزلة ذوى الارحام.

ومنها: أنه يجب عليها بعدَه أن تعتدَّ فى بيته، لمصالح لاتخفى، ولا متكفلَ لمعيشتها من قومه، فوجب أن تُجعل كفايتُها فى مال الزوج، ولا يمكن أن يُجعل قدرًا معلومًا، لأنه لايُدرى كم يَترك؟ فوجب جزءٌ شائع كالثُّمن والرُّبع.

ترجمہ: واضح ہے۔ أولوا الأرحام: ارحام: رَحِم کی جمع ہے۔ جس کے معنی ہیں: بچہ دانی یعنی وہ عضو جس کے اندر بچہ کی تخلیق عمل میں آتی ہے۔ اور اولوا الارحام سے مراد ددھیالی اور ننہیالی رشتہ دار ہیں۔ اور ذوی الارحام یعنی ذوی الفروض اور عصبہ کے علاوہ رشتہ دار۔ یہ فقہی اصطلاح ہے۔ آیت میں وہ مراد نہیں۔

اصل دوم:

قرابت کی قسمیں اور ان کے احکام

قرابت دو قسم کی ہے:

ایک: وہ قرابت ہے جو حسب ونسب میں مشارکت چاہتی ہے۔ اور یہ بات چاہتی ہے کہ دونوں ایک قوم اور ایک مرتبہ کے ہوں یعنی باہم پدری رشتہ ہو۔

دوسری: وہ قرابت ہے جو حسب ونسب اور مرتبہ میں مشارکت نہیں چاہتی۔ البتہ اس میں مہر ومحبت پائی جاتی ہے۔ اور قلبی تعلق اتنا قوی ہوتا ہے کہ اگر تقسیم ترکہ کا اختیار میت کو دیدیا جائے تو وہ اس دوسری قرابت سے تجاوز نہیں کرے گا یعنی سب انہی کو دے گا۔

قاعدہ: میراث میں پہلی قسم کی رشتہ داری کو دوسری قسم کی رشتہ داری پر ترجیح حاصل ہے۔ کیونکہ دنیا جہاں کے تمام لوگ آدمی کے منصب اور اس کی دولت کو اس کی قوم سے دوسری قوم کی طرف منتقل کرنے کو ظلم اور ناانصافی تصور کرتے ہیں۔ اور اس سے سخت ناراض ہوتے ہیں۔ اور اگر میت کا مال اور اس کا منصب اس شخص کو دیا جائے جو اس کی قوم میں سے اور اس کا قائم مقام ہے جیسے بیٹے کو دیا جائے تو لوگ اس کو انصاف خیال کرتے ہیں، اور اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اور یہ ایک ایسا فطری جذبہ ہے کہ جب تک دل پارہ پارہ نہ ہوجائیں: نکل نہیں سکتا ـــــ البتہ ہمارے زمانہ میں عجم میں چونکہ انساب کا نظام ابتر ہوگیا ہے، اور نسب کی بنیاد پر تناصر باقی نہیں رہا، اس لئے صورت بدل گئی ہے (ننہیالی اور سسرالی تناصر میں آگے بڑھ گئے ہیں)

البتہ قسم اول کی ترجیح کے بعد: قسم ثانی کو بھی ان کا واجبی حق دینا ضروری ہے۔ ان کا حق رائگاں کرنا جائز نہیں۔ اور ان دونوں باتوں کا لحاظ کرنے سے درج ذیل تین احکام پیدا ہوتے ہیں:

① ـــــ ماں کا حصہ بیٹی اور بہن سے کم ہے (ماں کو زیادہ سے زیادہ ثلث اور بیٹی اور بہن کو نصف ملتا ہے) حالانکہ ماں کے ساتھ حسنِ سلوک اور صلہ رحمی زیادہ ضروری ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ماں کا اپنے بیٹے یعنی میت کی قوم سے ہونا ضروری نہیں۔ اور نہ اس کے حسب ومنصب اور شرف ومرتبہ میں مشارکت ضروری ہے۔ اور نہ ماں کا اُن لوگوں میں سے ہونا ضروری ہے جو میت کے قائم مقام ہوتے ہیں۔ کیا ایسی مثالیں نہیں ہیں کہ بیٹا ہاشمی یعنی سید ہو اور ماں حبشن ہو؟ یا بیٹا قریشی ہو اور ماں عجمی ہو؟ یا بیٹا شاہی خاندان کا فرد ہو اور ماں بدکاری اور کمینہ پن سے معیوب ہو؟ اور بیٹی اور بہن کی صورتِ حال اس سے مختلف ہے۔ وہ میت کی قوم اور اس کے منصب داروں میں سے ہیں۔

② ـــــ اخیافی بھائی بہن جب وارث ہوتے ہیں تو ثلث ہی پاتے ہیں۔ اس سے زیادہ ان کو نہیں دیا جاتا یعنی حقیقی

اور علاتی بھائی بہن سے ان کو کم ملتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ غیر خاندان کے ہو سکتے ہیں۔ کیا ایسی مثال نہیں ہے کہ آدمی قریشی، اور اس کا اخیافی بھائی تمیمی ہو؟ اور کبھی دونوں قبیلوں میں ٹھن جاتی ہے تو ہر شخص اپنی قوم کی دوسرے کی قوم کے خلاف مدد کرتا ہے۔ اس صورت میں اخیافی بھائی برسر پیکار ہوگا۔ نیز اخیافی بھائی کا میت کی جگہ لینا لوگ انصاف نہیں سمجھتے۔

(۳) —— بیوی جو رشتہ داروں کے ساتھ لاحق اور ان میں شامل ہے فروضِ مقررہ میں سے سب سے کم یعنی آٹھواں حصہ پاتی ہے۔ اور اگر چند بیویاں ہوتی ہیں تو وہ اسی میں شریک ہو جاتی ہیں۔ دوسرے ورثاء کا حصہ بالکل کم نہیں کرتیں۔ کیا ایسی مثال نہیں ہے کہ عورت شوہر کی وفات کے بعد دوسری جگہ نکاح کر لیتی ہے اور شوہر کے خاندان سے اس کا تعلق ختم ہو جاتا ہے؟

میراث کی بنیادیں اور ان کی تفصیل

میراث کی تین بنیادیں ہیں[۱]:

اول —— شرف و منصب اور اس قسم کی دوسری باتوں میں میت کی قائم مقامی کرنا۔ لوگ پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان کا کوئی جانشیں ہو جو ان کی قائم مقامی کرے۔

دوم —— خدمت و نصرت، مہر و محبت اور اس قسم کی دوسری باتیں۔ یہ جذبات کامل طور پر قریبی رشتہ دار خواتین میں پائے جاتے ہیں۔ اور وہ اسی بنیاد پر وارث ہوتی ہیں۔

سوم —— وہ رشتہ داری جس میں جانشینی کی بھی صلاحیت ہو، اور خدمت و نصرت اور مہر و محبت کے جذبات بھی پائے جاتے ہوں۔ یہ تیسری بنیاد سب سے زیادہ قابلِ لحاظ ہے۔

تینوں بنیادوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔ مگر پہلے تیسری بنیاد کی تفصیل ہے۔ کیونکہ وہ جامع ہے۔ پھر پہلی بنیاد کی تفصیل ہے کہ وہ دوسری بنیاد سے اہم ہے۔ اور آخر میں دوسری بنیاد کی تفصیل ہے۔ فرماتے ہیں:

میراث پانے کی تینوں بنیادیں کامل طور پر ان رشتہ داروں میں پائی جاتی ہیں جو سلسلۂ نسب میں داخل ہیں۔ جیسے باپ، دادا، بیٹا اور پوتا۔ اسی وجہ سے یہ لوگ میراث کے سب سے زیادہ حقدار ہیں۔

البتہ باپ اور بیٹے میں فرق ہے۔ بیٹے کا باپ کی جگہ لینا فطری حالت ہے۔ عالم کی بنا اسی پر قائم ہے یعنی ایک قرن ختم ہوتا ہے اور دوسرا قرن اس کی جگہ لیتا ہے۔ اور لوگ چاہتے بھی یہی ہیں کہ ان کے بیٹے ان کی جگہ لیں۔ وہ اسی کے امیدوار رہتے ہیں۔ اور اسی مقصد کے لئے بیٹوں اور پوتوں کو حاصل کرنے کے جتن کرتے ہیں —— اور باپ کا اپنے بیٹے کی جگہ لینا غیر فطری حالت ہے۔ نہ لوگ یہ چیز ڈھونڈتے ہیں، نہ اس کے امیدوار رہتے ہیں۔ اور اگر آدمی کو اس کے مال

[۱] حقیقت میں دو ہی بنیادیں ہیں۔ تیسری بنیاد پہلی دو بنیادوں کی جامع صورت ہے ۱۲

میں تصرف کرنے کا اختیار دیدیا جائے تو یقیناً اولاد کی غم خواری کا جذبہ باپ کی غم خواری کے جذبے سے زیادہ اس کے دل پر قابو یافتہ ہوگا۔اسی وجہ سے دنیا جہاں کے لوگوں میں عمومی رواج یہ ہے کہ وہ اولاد کو آباء پر مقدم رکھتے ہیں۔

اور رہی جانشینی یعنی پہلی بنیاد: تو اس کے زیادہ حقدار مذکورہ ورثاء (باپ، دادا، بیٹا اور پوتا) کے بعد بھائی ہیں۔اور وہ لوگ ہیں جن میں بھائی پنا پایا جاتا ہے یعنی بھتیجے وغیرہ۔ کیونکہ وہ آدمی کے بازو اور ایک جڑ سے نکلنے والے دو درختوں کی طرح ہیں۔اور میت کی قوم، اس کے نسب اور اس کا شرف رکھنے والوں میں سے ہیں۔

اور رہی خدمت اور مہر ومحبت یعنی دوسری بنیاد: تو اس کا کامل جذبہ ان قریبی رشتہ دار عورتوں میں پایا جاتا ہے جو سلسلۂ نسب میں داخل ہیں یعنی ماں اور بیٹی وغیرہ۔البتہ بیٹی کا درجہ ماں سے بڑھا ہوا ہے۔کیونکہ بیٹی بھی (بیٹے کی طرح) کچھ نہ کچھ شرف ومنصب میں میت کی قائم مقامی کرتی ہے۔اور ماں میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ پھر بہن کا درجہ ہے۔وہ بھی (بھائی کی طرح) کچھ نہ کچھ میت کی قائم مقامی کرتی ہے۔اسی وجہ سے بیٹی اور بہن نصف پاتے ہیں، اور ماں کو زیادہ سے زیادہ ثلث ملتا ہے۔پھر بیوی کا درجہ ہے۔اور آخر میں اخیافی بھائی بہن کا۔

فائدہ (۱) عورتوں میں میراث کی پہلی بنیاد یعنی حمایت وجانشینی بالکل نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ عورتیں کبھی دوسری قوم میں نکاح کر لیتی ہیں، اور ان میں شامل ہو جاتی ہیں۔البتہ بیٹی اور بہن میں کمزور سی حمایت وجانشینی کی صلاحیت ہے۔

البتہ میراث کی دوسری بنیاد یعنی مہربانی اور میلان ان میں خوب پایا جاتا ہے۔اور یہ جذبہ سب سے زیادہ قریب ترین رشتہ دار عورتوں میں یعنی ماں اور بیٹی میں پایا جاتا ہے۔پھر بہن میں —— اور جو عورتیں دور کی رشتہ دار ہیں ان میں یہ بات نہیں پائی جاتی، جیسے میت کی پھوپی، اور اس کے باپ کی پھوپی، اس لئے ان کو میراث نہیں ملتی۔

فائدہ :(۲) مردوں میں پہلی اور دوسری دونوں بنیادیں پائی جاتی ہیں۔جانشینی کی کامل صلاحیت باپ اور بیٹے میں ہے، پھر بھائیوں میں، پھر چچا میں۔اور مہر ومحبت اور میلان کامل طور پر باپ میں پایا جاتا ہے، پھر بیٹے میں، پھر حقیقی یا علاتی بھائیوں میں۔

سوال: چچا عصبہ ہے اور وارث ہے، پھر اس کی بہن یعنی میت کی پھوپی کیوں وارث نہیں؟

جواب: وارثت کی جو دو بنیادیں ہیں: وہ دونوں پھوپی میں نہیں پائی جاتیں۔وہ نہ تو چچا کی طرح نصرت وحمایت کر سکتی ہے، اور نہ اس میں ایسا خدمت ومہربانی کا جذبہ پایا جاتا ہے جیسا بہن میں، اس لئے اس کو میراث نہیں ملتی۔

نوٹ: یہ دونوں فائدے اور سوال کا جواب کتاب میں ہیں۔

ومنها: أن القرابة نوعان:

أحدهما: مايقتضي المشاركة في الحسَب والمنْصِب، وأن يكونا من قوم واحد، وفي منزلة واحدة.

وثانيهما: مالا يقتضي المشاركة في الحَسب والمنصِب والمنزلة، ولكنه مظِنة الوُدِّ

والرفق، وأنه لو كان أمر قسمة الترِكة إلى الميت لَمَا جاوز تلك القرابةَ.

ويجب أن يُفَضَّلَ النوعُ الأول على الثانى: لأن الناس- عربهم وعجمهم- يرون إخراجَ مَنْصِبِ الرجل وثروتِه من قومه إلى قوم آخرين جورًا وهَضْمًا، ويسخطون على ذلك. وإذا أُعْطى مالُ الرجل ومنصِبُه لمن يقوم مقامَه من قومه رَأَوْا ذلك عدلاً، ورضوا به. وذلك كالجبلة التى لاتنفك منهم، إلا أن تقطَّع قلوبهم، اللّهم! إلا فى زماننا حين اختَلَتِ الأنسابُ، ولم يكن تناصرهم بنسبهم.

ولايجوز أن يُهْمَلَ حقُّ النوع الثانى أيضًا بعد ذلك. ولذلك كان نصيبُ الأم- مع أن بِرَّهَا أوجبُ، وصِلَتَها أوكدُ- أقلَّ من نصيب البنت والأخت، فإنها ليست من قوم ابنها، ولا من أهل حَسَبه ومَنْصِبِه، وشرفِه، ولا ممن يقوم مقامَه. ألا ترى أن الابن ربما يكون هاشميا والأم حبشيةً؟ والابن قرشيا والأم عجميةً؟ والابن من بيت الخلافة، والأم مغموصًا عليها بِعَهْرٍ ودناءةٍ؟ وأما البنتُ والأختُ فهما من قوم المرء وأهلِ منصِبِه.

وكذلك أولاد الأم: لم يَرِثوا حين وَرِثوا إلا ثُلُثًا، لايُزاد لهم عليه ألبتة، ألا ترى أن الرجل يكون من قريش، وأخوه لأمه من تميم؟ وقد يكون بين القبيلتين خصومة، فيَنْصُر كلُّ رجلٍ قومَه على قوم الآخر، ولايرى الناس قيامَه مقام أخيه عدلاً.

وكذلك الزوجة التى هى لاحِقَةٌ بذوى الأرحام، داخلةٌ فى تضاعيفها: لم تَحْرِزْ إلا أَوْكَسَ الأنْصِبَاءِ. وإذا اجتمعت جماعةٌ منهن اشتركنَ فى ذلك النصيب، ولم يَرْزَأْنَ سائرَ الورثةِ ألبتة. ألا ترى أنها تتزوج بعدَ بعلها زوجًا غيره، فتنقطع العَلاقةُ بالكلية؟

وبالجملة: فالتوارُثُ يدور على معانٍ ثلاثةٍ: القيامُ مقامَ الميت فى شرفه ومنصِبِه، وما هو من هذا الباب، فإن الإنسان يسعى كلَّ السعى ليبقى له خَلَفٌ يقوم مقامَه. والخدمةُ، والمواساةُ، والرفق، والحَدْبُ عليه، وما هو من هذا الباب. الثالث: القرابة المتضمنة لهذين المعنيين جميعاً، والأقدمُ بالاعتبار هو الثالث.

ومظِنَّتُها جميعا على وجه الكمال: من يدخل فى عمود النسب، كالأب، والجد، والابن، وابن الابن؛ فهولاء أحقُّ الورثة بالميراث. غير أن قيامَ الابن مقام أبيه هو الوضع الطبيعى الذى عليه بناءُ العالَم: من انقراض قرن وقيام القرن الثانى مقامَهم، وهو الذى يرجونه ويتوقعونه، ويحصِّلون الأولاد والأحفاد لأجله؛ أما قيام الأب بعد ابنه: فكأنه ليس بوضع طبيعى، ولا مايطلبونه ويتوقعونه، ولو أن الرجل خُيِّرَ فى ماله لكانت موساةُ ولدِه أَمْلَكَ لقلبه من مواساة

والده؛ فذلك كانت السنةُ الفاشية فى طوائف الناس تقديمَ الأولاد على الآباء.

أما القيام مقامَه : فمظنته بعد ماذكرنا: الإخوةُ، ومن فى معناهم ممن هم كالعضُد، وكالصِّنْوِ، ومن قوم المرء وأهلِ نسبه وشرفه.

وأما الخدمة والرفق : فمظنته: القرابةُ القريبة. فالأحقُّ به الأم، والبنتُ، ومن فى معناهما ممن يدخل فى عمود النسب، ولا تخلو البنتُ من قيامٍ مَّا مقامَه، ثم الأختُ، ولا تخلو أيضًا من قيام مَّا مقامه، ثم من به عَلاقة التزوج، ثم أولاد الأم.

والنساء لايوجد فيهن معنى الحمايةِ والقيام مقامَه. كيف؟ والنساء ربما تزوجن فى قوم آخرين، ويدخلن فيهم، اللّٰهم! إلا البنت والأخت على ضُعْفٍ فيهما. ويوجد فى النساء معنى الرفق والحدب كاملاً مُوَفَّرًا. وإنما مظِنته القرابة القريبة جدًا. كالأم، والبنت، ثم الأخت، دون البعيدةِ، كالعمة، وعمة الأب.

والباب الأول يوجد فى الأب والابن كاملاً، ثم الإخوةِ، ثم الأعمام، والمعنى الثانى يوجد فى الأب كاملاً، ثم الابن، ثم الأخ لأب وأم، أو لأب.

وإنما مظنته القرابةُ القريبةُ، دون البعيدةِ. فمن ثَمَّ لم يُجعل للعمة شيئٌ مما جُعل للعم، لأنها لاتَذُبَّ عنه كما يذب العم، وليست كالأخت فى القرب.

ترجمہ: اور میراث کے اصولوں میں سے: یہ ہے کہ قرابت دوقسم کی ہے: ان میں سے ایک: وہ قرابت ہے جو حسب (مال وجاہ کے شرف) اور منصب (رتبہ) اور مرتبہ میں باہم شرکت کو چاہتی ہے۔ اور یہ بات چاہتی ہے کہ دونوں ایک قوم کے اور ایک مرتبہ میں ہوں —— اور ان میں سے دوسری: وہ قرابت ہے جو حسب، منصب اور مرتبہ میں باہم شرکت کو نہیں چاہتی۔ مگر وہ محبت اور مہربانی کی احتمالی جگہ ہے۔ اور اس بات کی احتمالی جگہ ہے کہ اگر تقسیم مال کا اختیار خود مرنے والے کو دیدیا جائے تو وہ اس دوسری قسم کی قرابت سے آگے نہ بڑھے —— اور ضروری ہے کہ پہلی قرابت کو دوسری قرابت پر ترجیح دی جائے۔ اس لئے کہ لوگ —— عرب بھی اور عجم بھی —— آدمی کے منصب کو اور اس کی دولت کے نکالنے کو اس کی قوم سے دوسری قوم کی طرف ظلم اور ناانصافی سمجھتے ہیں۔ اور وہ اس پر سخت ناراض ہوتے ہیں۔ اور جب دیا جائے آدمی کا مال اور اس کا منصب اس شخص کو جو میت کے قائم مقام ہے اس کی قوم میں سے تو لوگ اس کو انصاف سمجھتے ہیں۔ اور اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اور یہ جذبہ اس جبلت کی طرح ہے جس سے لوگ جدا نہیں ہوسکتے، مگر یہ کہ ان کے دل پارہ پارہ ہوجائیں۔ اے اللہ! مگر ہمارے زمانہ میں جب انساب کا نظام ابتر ہوگیا۔ اور نسب کی وجہ سے ان میں تناصر باقی نہیں رہا —— اور بعد ازیں یعنی ترجیح دینے کے بعد یہ بھی جائز نہیں کہ قسم ثانی کا حق رائگاں کردیا جائے۔ اور اسی وجہ سے ماں کا

حصہ —— باوجود اس کے کہ اس کے ساتھ حسن سلوک زیادہ ضروری ہے۔ اور اس کے ساتھ صلہ رحمی زیادہ مؤکد ہے —— بیٹی اور بہن کے حصہ سے کم ہے۔ اس لئے کہ ماں اپنے بیٹے کی قوم سے نہیں، اور نہ اس کے حسب ومنصب وشرف والوں میں سے ہے۔ اور نہ ان لوگوں میں سے ہے جو میت کے قائم مقام ہوتے ہیں۔ کیا نہیں دیکھتے آپ کہ بیٹا کبھی ہاشمی اور ماں حبشن ہوتی ہے؟ اور بیٹا کبھی قریشی اور ماں عجمی ہوتی ہے؟ اور بیٹا کبھی شاہی خاندان کا اور ماں بدکاری اور کمینہ پن کے ذریعہ عیب نکالی ہوئی ہوتی ہے؟ اور رہی بیٹی اور بہن تو وہ دونوں آدمی کی قوم اور اس کے منصب والوں میں سے ہیں —— اور اسی طرح ماں کی اولاد: وارث نہیں ہوتی جب وہ وارث ہوتی ہے مگر تہائی کی۔ ان کے لئے تہائی پر قطعاً زیادتی نہیں کی جاتی۔ کیا نہیں دیکھتے آپ کہ آدمی خاندانِ قریش سے ہوتا ہے، اور اس کا اخیافی بھائی قبیلۂ تمیم کا؟ اور کبھی دونوں قبیلوں میں جھگڑا ہوتا ہے۔ پس ہر شخص اپنی قوم کی مدد کرتا ہے دوسرے کی قوم کے مقابلہ میں۔ اور نہیں دیکھتے لوگ اس کے اپنے بھائی کی جگہ میں قائم ہونے کو انصاف —— اور اسی طرح بیوی: جو ملنے والی ہے رشتہ داروں کے ساتھ، ان کے درمیان میں داخل ہونے والی ہے، نہیں سمیٹتی ہے مگر سہام میں سے کم تر کو۔ اور جب اکٹھا ہوتی ہے بیویوں کی جماعت تو شریک ہوتی ہیں وہ اسی حصہ میں، اور نہیں کم کرتیں وہ دیگر ورثاء کے حصہ سے بالکل۔ کیا نہیں دیکھتے آپ کہ بیوی نکاح کرلیتی ہے اپنے شوہر کے بعد اس کے علاوہ شوہر سے۔ پس تعلق بالکلیہ منقطع ہوجاتا ہے۔

الحاصل: پس توارث تین معانی پر گھومتا ہے: (۱) میت کے قائم مقام ہونا، اس کے شرف اور اس کے منصب میں اور ان باتوں میں جو اس قبیل سے ہیں۔ پس بیشک انسان کوشش کرتا ہے پوری کوشش کہ باقی رہے اس کے لئے کوئی جانشیں جو اس کا قائم مقام ہو (۲) اور خدمت کرنا اور ایک دوسرے کی مدد کرنا اور مہربانی کرنا اور اس پر جھکنا اور وہ باتیں جو اس قبیل کی ہیں (۳) تیسرے: وہ رشتہ داری جو ان دونوں ہی معنی کو شامل ہونے والی ہے اور سب سے زیادہ قابل لحاظ تیسرے معنی ہیں —— اور سبھی معانی کے کامل طور پر پائے جانے کی احتمالی جگہ: وہ رشتہ دار ہیں جو سلسلۂ نسب میں داخل ہیں، جیسے باپ اور دادا اور بیٹا اور پوتا۔ پس یہ لوگ ورثاء میں میراث کے سب سے زیادہ حقدار ہیں۔ البتہ یہ بات ہے کہ بیٹے کا اپنے باپ کی جگہ لینا وہ فطری حالت ہے جس پر عالم کی بنا قائم ہے یعنی ایک قرن کا ختم ہونا اور دوسرے قرن کا اس کی جگہ لینا۔ اور اسی کی لوگ امید باندھتے ہیں اور اس کی توقع رکھتے ہیں۔ اور اولاد اور پوتوں کو اسی کی خاطر حاصل کرتے ہیں —— رہا باپ کا اپنے بیٹے کے بعد اس کی جگہ لینا تو گویا وہ فطری حالت نہیں۔ اور نہ وہ چیز ہے جس کو لوگ ڈھونڈتے ہیں اور جس کے امیدوار ہیں۔ اور اگر یہ بات ہو کہ آدمی کو اختیار دیا جائے اس کے مال میں تو البتہ اپنی اولاد کی غم خواری اس کے دل پر زیادہ قابو یافتہ ہوگی اس کے باپ کی غم خواری سے۔ پس اسی وجہ سے مختلف لوگوں میں رائج طریقہ اولاد کو آباء پر مقدم کرنے کا ہے —— رہا میت کا قائم مقام ہونا: تو اس کی احتمالی جگہ ان رشتوں کے بعد جن کو ہم نے ذکر کیا، بھائی ہے اور وہ لوگ ہیں جو اس کے معنی میں ہیں ان لوگوں میں سے جو بازو کے مانند ہیں، اور ایک جڑ سے دو اُگنے والے درختوں کی طرح ہیں۔ اور آدمی کی قوم اور اس

کے نسب اور اس کے شرف والوں میں سے ہیں —— اور رہی خدمت اور مہربانی: پس اس کی احتمالی جگہ نزدیک کی رشتہ داری ہے۔ پس اس کی زیادہ حقدار ماں اور بیٹی اور وہ لوگ ہیں جو ان دونوں کے معنی میں ہیں، ان لوگوں میں سے جو سلسلۂ نسب میں داخل ہونے والے ہیں۔ اور بیٹی خالی نہیں کچھ نہ کچھ میت کی قائم مقامی سے، پھر بہن ہے، اور وہ بھی خالی نہیں کچھ نہ کچھ میت کی قائم مقامی سے۔ پھر وہ ہے جس کے ساتھ نکاح کرنے کا تعلق ہے۔ پھر ماں کی اولاد ہے —— (فائدہ) اور عورتوں میں حمایت اور قائم مقامی کے معنی نہیں پائے جاتے۔ کیسے پائے جاسکتے ہیں؟ درانحالیکہ عورتیں کبھی نکاح کرلیتی ہیں دوسری قوم میں، اور وہ ان میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اے اللہ! مگر بیٹی اور بہن ان دونوں میں کمزوری کے ساتھ —— اور عورتوں میں مہربانی اور میلان کے معنی کامل ومکمل پائے جاتے ہیں۔ اور اس کی احتمالی جگہ بہت ہی قریبی رشتہ داری ہے، جیسے ماں اور بیٹی۔ پھر بہن۔ نہ کہ دور کی رشتہ داری، جیسے پھوپی اور باپ کی پھوپی —— (فائدہ) اور باب اول یعنی جانشینی کے معنی کامل طور پر پائے جاتے ہیں باپ اور بیٹے میں، پھر (ان سے کم) بھائیوں میں، پھر (ان سے کم) چچاؤں میں —— اور دوسرے معنی یعنی محبت ومیلان کامل طور پر پایا جاتا ہے باپ میں، پھر بیٹے میں۔ پھر حقیقی بھائیوں میں یا علاتی بھائیوں میں —— (سوال کا جواب) اور اس کی احتمالی جگہ قریبی رشتہ داری ہے نہ کہ دور کی رشتہ داری۔ پس اسی جگہ سے نہیں دیا گیا پھوپی کو کچھ اس میں سے جو چچا کو دیا گیا۔ کیونکہ پھوپی میت سے نہیں ہٹاتی جیسا چچا ہٹاتا ہے۔ اور وہ نزدیکی میں بہن کی طرح نہیں۔

لغات: هَضَم (ن) فلانًا: ظلم کرنا...... غَمَصَ (ض) عليه: عیب نکالنا...... العِهْر و العَهْر: بدکاری، فحاشی...... الأوكس (اسم تفضیل) وَكَسَ (ض) وَكْسًا: کم ہونا...... رَزَأه ماله: مال میں سے کچھ لیکر اس میں کمی کرنا۔

تصحیح: اس عبارت میں چند تصحیحات مخطوطہ کراچی سے کی ہیں، جن کا تذکرہ غیر اہم ہے۔ البتہ ایک تصحیح قرائن سے کی ہے۔ ثم الأخ لأب وأم، أو لأب مطبوعہ اور مخطوطہ کراچی میں ثم الأخ لأب وأم، أو لأم ہے۔ یہ صحیح نہیں، کیونکہ حقیقی بھائی کی جگہ علاتی بھائی تو لے سکتا ہے۔ اخیافی بھائی نہیں لے سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

☆ ☆ ☆

اصل سوم:

میراث میں مرد کی برتری کی وجہ

مرد اور عورت جب ایک ہی درجہ میں ہوں تو ہمیشہ مرد کو عورت پر ترجیح دی جاتی ہے یعنی مرد کو میراث زیادہ دی جاتی ہے۔ جیسے بیٹا بیٹی، پوتا پوتی، اور بھائی بہن جمع ہوں تو مرد کو عورت کا دوگنا ملتا ہے۔ اسی اصول پر شوہر کا حصہ بھی بیوی سے دوگنا رکھا گیا ہے۔ البتہ باپ اور ماں اور اخیافی بھائی بہن جمع ہوں تو یہ قاعدہ جاری نہیں ہوتا۔ اور اس کی وجہ ابھی آرہی ہے۔

اور مرد کی عورت پر برتری: دو وجہ سے ہے: ایک: یہ ہے کہ وہ جنگ کرتا ہے اور اہل وعیال اور اموال واعراض کی حفاظت کرتا ہے۔ دوسری: یہ ہے کہ مردوں پر مصارف کا بار زیادہ ہے۔ اس لئے مالِ غنیمت کی طرح بے مشقت اور بے محنت ملنے والی چیز کے مرد ہی زیادہ حقدار ہیں۔ اور عورتیں نہ جنگ کرتی ہیں نہ ان پر مصارف کا بار ہے۔ نکاح سے پہلے ان کا نفقہ باپ کے ذمہ ہے، نکاح کے بعد شوہر کے ذمے اور آخر میں بیٹوں کے ذمے، اس لئے ان کو میراث سے حصہ کم دیا گیا ہے۔

اور مرد کی میراث میں برتری اور عورتوں کا بار مردوں پر ہے ان دونوں باتوں کی دلیل سورۃ النساء کی آیت ۳۴ ہے۔ ارشاد پاک ہے: ''مرد عورتوں کے ذمہ دار ہیں: بایں وجہ کہ اللہ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے'' یعنی یہ اللہ کا انتظام ہے تا کہ گھریلو زندگی کامیاب ہو۔ دونوں برابر ہوں گے اور کوئی کسی کی اطاعت نہیں کرے گا تو گھر تباہ ہوگا۔ اور مرد کی برتری کی دوسری وجہ یہ ہے کہ: ''مردوں نے اپنے اموال خرچ کئے ہیں'' یعنی مہر دیا ہے اور نان ونفقہ برداشت کرتے ہیں۔ اور ممنونِ احسان ہونا انسان کا امتیاز ہے پس مرد کی تو عورت پر فوقیت ہوسکتی ہے۔ اس کے برعکس نہیں ہوسکتا۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ عورتوں کا بار مردوں پر ہے — اس آیت سے مردوں کی جو برتری ثابت ہوتی ہے اس کا اثر میراث میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔

اور میراث میں مرد کی برتری کی دلیل: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے۔ آپؓ نے ثلثِ باقی کے مسئلہ میں فرمایا ہے کہ: ''اللہ مجھے ایسی اُلٹی سمجھ نہ دیں کہ میں ماں کو باپ پر ترجیح دوں!'' (مسند دارمی ۲: ۳۴۵ کتاب الفرائض)

وضاحت: باپ کو اگر میت کی مذکر اولاد ہو تو سدس ملتا ہے۔ اور مؤنث اولاد ہو تو سدس بھی ملتا ہے اور عصبہ بھی ہوتا ہے۔ اور کسی طرح کی اولاد نہ ہو تو صرف عصبہ ہوتا ہے — اور ماں کو اگر میت کی کسی طرح کی اولاد ہو یا کسی طرح کے دو بھائی بہن ہوں تو سدس ملتا ہے۔ ورنہ ثلث ملتا ہے۔ البتہ اگر میت نے شوہر یا بیوی اور والدین چھوڑے ہوں تو ماں کو ثلثِ باقی ملتا ہے یعنی شوہر یا بیوی کا حصہ دینے کے بعد جو بچے گا: اس کا تہائی ماں کو اور باقی باپ کو ملے گا — اس آخری مسئلہ میں صحابہ میں اختلاف تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی شاذ رائے یہ تھی کہ ماں کو حسب ضابطہ کل ترکہ کا تہائی ملے گا۔ اور جمہور صحابہ کی رائے یہ تھی کہ اس خاص صورت میں ماں کو ثلثِ باقی ملے گا، تا کہ ماں کا حصہ ایک صورت میں باپ سے زیادہ نہ ہو جائے۔ اور وہ صورت یہ ہے کہ شوہر کے ساتھ والدین ہوں تو شوہر کو نصف یعنی چھ میں سے تین ملیں گے اور ماں کو کل مال کا ثلث دیا جائے گا تو اس کو دو ملیں گے اور باپ کے لئے صرف ایک بچے گا۔ اور ثلثِ باقی دیا جائے گا تو ماں کو ایک ملے گا اور باقی دو باپ کو ملیں گے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد اسی صورت کے بارے میں ہے کہ ماں کو اس صورت میں کل مال کا ثلث کیسے دیا جاسکتا ہے؟ یہ تو الٹی بات ہوگئی۔ برتری مرد کو حاصل ہے نہ کہ عورت کو۔

سوال: باپ اور ماں میں: مرد کی ترجیح کا ضابطہ کیوں جاری نہیں ہوتا؟ اگر میت کی مذکر اولاد ہو تو ماں اور باپ دونوں کو سدس ملتا ہے۔ یہ برابری کیوں ہے؟

جواب: باپ کی فضیلت ایک مرتبہ ظاہر ہو چکی ہے۔ جب میت کی صرف مؤنث اولاد ہوتی ہے تو ماں کو سدس ملتا

ہے، اور باپ کو ذو الفرض ہونے کی حیثیت سے سدس بھی ملتا ہے اور عصبہ ہونے کی وجہ سے بچا ہوا ترکہ بھی ملتا ہے۔ اب اگر دوبارہ اس کی فضیلت ظاہر کی جائے گی اور اس کا حصہ بڑھایا جائے گا تو دیگر ورثاء کا نقصان ہوگا، اس لئے مذکورہ صورت میں دونوں کو سدس سدس ملتا ہے۔

سوال: اخیافی بھائی بہن میں بھی مرد کی برتری کا قاعدہ جاری نہیں ہوتا۔ وہ تہائی میں شریک ہوتے ہیں۔ بہن کو بھی بھائی کے برابر حصہ ملتا ہے، ایسا کیوں ہے؟

جواب: اخیافی میں مرد کی برتری دو وجہ سے ظاہر نہیں ہوتی۔ ایک: اخیافی بھائی میت کے لئے اور اس کی قابل حفاظت چیزوں کے لئے جنگ نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ کبھی دوسری قوم کا ہوتا ہے، اس لئے اس کو بہن پر ترجیح نہیں دی گئی۔ دوسری وجہ: یہ ہے کہ اخیافی کا رشتہ ماں کے رشتہ کی فرع ہے۔ پس گویا اخیافی بھائی بھی عورت ہے۔ اس لئے اس کا حصہ اخیافی بہن کے مساوی ہے۔

ومنها: أن الذكر يفضَّل على الأنثىٰ إذا كانا فى منزلة واحدة أبدا، لاختصاص الذكور بحماية البيضة، والذَّبِّ عن الذِّمار، ولأن الرجال عليهم إنفاقات كثيرة، فهم أحق بما يكون شِبْهَ المَجَّان؛ بخلاف النساء، فإنهن كَلٌّ على أزواجهن، أو آبائهن، أو أبنائهن، وهو قوله تعالى: ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ، وَبِمَا أَنْفَقُوْا مِنْ أَمْوَالِهِمْ﴾ وقال ابن مسعود رضى الله عنه فى مسألة ثُلُثِ الباقى: "ما كان الله لِيَرَانى أن أُفَضِّلَ أمًّا على أب!"

غير أن الوالد لما اعتبر فضلُه مرةً بِجَمْعِهِ بين العصوبة والفرض، لم يُعتبر ثانيًا بتضاعيف نصيبه أيضًا، فإنه غَمْطٌ لحق سائر الورثة.

وأولاد الأم: ليس للذكر منهم حماية للبيضة، ولاذَبٌّ عن الذمار، فإنهم من قوم آخرين، فلم يفضَّل على الأنثىٰ. وأيضًا: فإن قرابتهم منشعبة من قرابة الأم، فكأنهم جميعًا إناث.

ترجمہ: اور میراث کے اصولوں میں سے: یہ ہے کہ مرد کو ہمیشہ ترجیح دی جاتی ہے عورت پر جبکہ دونوں ایک ہی درجہ میں ہوں: (۱) مردوں کے حمایتِ بیضہ کے ساتھ اور قابل حفاظت چیزوں سے دشمن کو ہٹانے کے ساتھ مختص ہونے کی وجہ سے (۲) اور اس لئے کہ مردوں پر بہت اخراجات ہیں: پس وہ اس چیز کے زیادہ حقدار ہیں جو مفت ہاتھ آنے والی چیز کی طرح ہے۔ برخلاف عورتوں کے، پس وہ اپنے شوہروں یا اپنے باپوں یا اپنے بیٹوں پر بار ہیں۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''مرد عورتوں کے ذمہ دار ہیں، ان کے بعض کو بعض پر اللہ کے برتری دینے کی وجہ سے، اور ان کے اپنے اموال خرچ کرنے کی وجہ سے'' اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ثلثِ باقی کے مسئلہ میں فرمایا ہے: ''نہیں ہیں اللہ کہ دکھلائیں مجھے کہ میں ماں کو باپ پر ترجیح

دوں!'' ـــــ (سوال اول کا جواب) البتہ یہ بات ہے کہ جب باپ کی فضیلت کا ایک مرتبہ اعتبار کرلیا گیا، اس کے عصبہ ہونے اور حصہ دار ہونے کے درمیان جمع کرنے کے ذریعہ، تو دوبارہ بھی اعتبار نہیں کیا جائے گا اس کا حصہ بڑھانے کے ذریعہ، کیونکہ وہ دیگر ورثاء کے حصہ کو کم کرنا ہے ـــــ (دوسرے سوال کا جواب) اور ماں کی اولاد: ان میں سے مرد کے لئے حمایتِ بیضہ نہیں ہے، اور نہ قابل حفاظت چیزوں سے ہٹانا ہے۔ کیونکہ وہ دوسری قوم کے ہیں۔ پس وہ عورت پر ترجیح نہیں دیا گیا۔ اور نیز: پس ان کی رشتہ داری ماں کی رشتہ داری سے پھوٹنے والی ہے۔ پس گویا وہ سبھی عورتیں ہیں۔

☆ ☆ ☆

اصل چہارم:

حجب حرمان ونقصان

حجب: کے معنی ہیں: کسی وارث کا دوسرے وارث کو کل یا بعض سہام سے محروم کرنا۔ حجب کی دو قسمیں ہیں: حجبِ حرمان اور حجبِ نقصان۔ حجب حرمان: کسی وارث کا دوسرے وارث کو بالکل محروم کرنا، جیسے باپ کی وجہ سے دادا محروم ہوتا ہے۔ اور حجبِ نقصان: کسی وارث کا دوسرے وارث کے حصہ کو کم کرنا۔ جیسے میت کی اولاد کی وجہ سے زوج کو نصف کے بجائے ربع، اور زوجہ کو ربع کے بجائے ثمن ملتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے حجب کی دونوں قسموں کے لئے ضابطے اور ان کی وجوہ بیان کی ہیں۔ فرماتے ہیں:

اگر ورثاء کی ایک ہی جماعت ہو، اور وہ سب ایک مرتبہ کے ہوں یعنی ایک ہی صنف کے ورثاء ہوں۔ جیسے صرف بیٹا بیٹی یا پوتا پوتی یا دادیاں ہوں تو میراث ان پر تقسیم کردی جائے گی۔ کیونکہ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں، پس کوئی کسی کو محروم نہیں کرے گا۔

اور اگر مختلف اصناف کے ورثاء ہوں تو اس کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت: اگر سب کو ایک نام شامل ہے یا ان کے وارث ہونے کی جہت ایک ہے۔ جیسے باپ اور دادا دونوں ہوں تو دونوں کو عربی کا لفظ ''اب'' شامل ہے، اور بیٹا اور پوتا دونوں ہوں تو دونوں کو عربی کا لفظ ''ابن'' شامل ہے، اور اگر بھائی اور چچا ہوں تو دونوں کو اگرچہ کوئی ایک نام شامل نہیں، مگر دونوں کی جہت توریث ایک ہے۔ اور وہ عصوبت ہے۔ پس اس صورت میں ضابطہ یہ ہے کہ نزدیک کا وارث دور کے وارث کو بالکل محروم کردے گا۔ باپ اور بیٹا وارث ہوں گے اور دادا اور پوتا محروم ہوں گے۔ اسی طرح بھائی وارث ہوگا، اور چچا محروم ہوگا۔ یہی حجبِ حرمان ہے۔

فائدہ: حجبِ حرمان کے تعلق سے ورثاء کی دو جماعتیں ہیں: ایک: وہ ورثاء ہیں جو کبھی محروم نہیں ہوتے۔ یہ چھ ورثاء ہیں: زوجین، والدین اور لڑکے لڑکیاں۔ دوسری جماعت: ان ورثاء کی ہے جو کبھی محروم ہوتے ہیں، کبھی نہیں ہوتے۔ یہ

ورثاء: دادا، دادی، حقیقی، علاتی اور اخیافی بھائی بہن، پوتا پوتی، حقیقی اور علاتی چچا اور حقیقی اور علاتی بھائیوں اور چچاؤں کے لڑکے ہیں ان میں مذکورہ بالا قاعدہ جاری ہوتا ہے (فائدہ پورا ہوا)

اور حجبِ حرمان کی وجہ: یہ ہے کہ توارث کی مشروعیت تعاون پر ابھارنے کے لئے ہے۔ اور ہر رشتہ میں تعاون کی شکل موجود ہوتی ہے۔ مثلاً مائیں ہمدردی، بیٹے قائم مقامی اور عصبات حمایت کرتے ہیں۔ اور مصلحتِ تعاون اسی وقت بروئے کار آسکتی ہے جب وہ شخص متعین ہوجائے جو خود کو تعاون کا پابند بنائے۔ ایسا پابند کہ خلاف ورزی پر لوگ اس کو ملامت کریں۔ اور تعیین کی صورت یہی ہے کہ وہاں جو ورثاء جمع ہیں ان میں سے کوئی میراث میں سے حصہ پانے کے ذریعہ متمیز ہوجائے۔ مثلاً: باپ اور دادا یا بیٹا اور پوتا جمع ہوں تو باپ اور بیٹے کو میراث کا حقدار ٹھہرایا جائے، اور دادے اور پوتے کو بالکل محروم کیا جائے تبھی وہ تعاون کرنے کے لئے متعین ہوں گے۔ اور نہیں کریں گے تو دنیا ان کو پھٹکارے گی۔

سوال: جب بیٹا بیٹی اور پوتا پوتی جمع ہوں تو اول وارث ہوتے ہیں۔ اور پوتا پوتی بالکل محروم رہتے ہیں۔ اور اس کی حکمت یہ بیان کی کہ اس طرح بیٹا بیٹی تعاون کے لئے متعین ہوجائیں گے۔ حالانکہ بیٹا بیٹی مساوی حصہ نہیں پاتے۔ مرد کو عورت سے دوگنا ملتا ہے۔ پس دونوں تعاون کرنے کے لئے یکساں کیسے متعین ہوں گے؟

جواب: حصہ کی کمی بیشی کو لوگ زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ وہ بس یہی دیکھتے ہیں کہ وارث ہے، پس اسکو تعاون کرنا چاہئے۔

دوسری صورت: اور اگر ورثاء کے نام اور ان کے وارث ہونے کی جہتیں مختلف ہوں تو ضابطہ یہ ہے کہ علم الٰہی میں جو عمومی مصلحتیں ہیں، ان کے لحاظ سے جو اقرب اور انفع ہوتا ہے: وہ اَبعد کا حصہ گھٹا دیتا ہے۔ جیسے اولاد: بیوی، شوہر، ماں اور باپ کا حصہ کم کردیتی ہے۔

ومنها: أنه إذا اجتمع جماعةٌ من الورثة: فإن كانوا في مرتبة واحدة: وجب أن يوزَّع عليهم، لعدم تقدُّم واحدٍ منهم على الآخر.

وإن كانوا في منازلَ شتّٰى: فذلك على وجهين:

[۱] إما أن يَعُمَّهم اسمٌ واحد، أو جهةٌ واحدةٌ: والأصل فيه: أن الأقرب يَحْجِبُ الأبعدَ حرمانًا، لأن التوارث إنما شُرع حثًّا على التعاون، ولكل قرابةٍ تعاونٌ: كالرفق فيمن يعمُّهم اسمُ الأم، والقيامِ مقامَ الرجل فيمن يعمهم اسم الابن، والذَّبِّ عنه فيمن يعمهم اسم العصوبة، ولاتتحقق هذه المصلحةُ إلا بأن يتعينَّ من يؤاخِذُ نفسَه بذلك، ويُلام على تركه، ويتميز من سائر مَنْ هناك بالنَّيْلِ ـــ أما فضلُ سهم على سهم فلا يجدون له كثيرَ بالٍ.

[۲] أو تكون أسماؤُهم وجهاتُهم مختلفةً: والأصل فيه: أن الأقرب والأنفع – فيما عند الله من علم المظانِّ الغالبية– يحجبُ الأبعدَ نقصانا.

ترجمہ: اور میراث کے اصولوں میں سے: یہ ہے کہ جب ورثاء کی ایک (ہی) جماعت اکٹھا ہو: پس اگر وہ ایک مرتبہ میں ہوں تو ضروری ہے کہ ان پر تقسیم کی جائے۔ ان میں سے کسی کے مقدم نہ ہونے کی وجہ سے دوسرے پر —— اور اگر وہ مختلف مراتب کے ہوں تو اس کی دو صورتیں ہیں: (۱) یا ان کو ایک نام یا ایک جہت عام ہوگی: اور قاعدہ اس میں یہ ہے کہ اقرب محروم کرے گا ابعد کو بہ حجب حرماں۔ اس لئے کہ توارث مشروع کیا گیا ہے تعاون پر ابھارنے کے لئے، اور ہر رشتہ کے لئے کچھ تعاون ہے، جیسے ہمدردی ان میں جن کو لفظ ''ماں'' شامل ہے، اور مرد کی جگہ لینا ان میں جن کو لفظ ''بیٹا'' شامل ہے۔ اور آدمی کی حمایت و مدافعت کرنا ان میں جن کو لفظ ''عصبہ ہونا'' شامل ہے، اور یہ مصلحت (تعاون) نہیں پائی جاتی مگر بایں طور کہ متعین ہو وہ جو اپنے نفس کا اِس بات کے ساتھ مؤاخذہ کرے، اور اس کے ترک پر ملامت کیا جائے۔ اور جدا ہو وہ دیگر ان لوگوں سے جو وہاں ہیں میراث حاصل کرنے کے ساتھ —— رہی حصہ کی حصہ پر برتری تو لوگ اس کی کچھ زیادہ پرواہ نہیں کرتے —— (۲) یا ان کے نام اور ان کی جہتیں مختلف ہوں: اور ضابطہ اس صورت میں یہ ہے کہ اقرب وانفع —— اس بات میں جو اللہ کے پاس ہے یعنی اکثری احتمالی جگہوں کا علم —— ابعد کو محروم کرتا ہے۔ بہ حجب نقصان۔

ترکیب: حرمانا اور نقصانا: یحجب کے مفعول مطلق ہیں۔ اور ان کا موصوف محذوف ہے۔ أی حجبًا حرمانا وحجبًا نقصانا.

☆ ☆ ☆

اصل پنجم:

فروضِ مقدّرہ

جن سہام کے ذریعہ ورثاء کے حصے متعین کئے جائیں ان میں دو باتیں ضروری ہیں:

پہلی بات —— وہ سہام واحد (ایک) کے ایسے واضح اجزاء ہوں جن کو محاسب اور غیر محاسب اول وہلہ ہی میں جدا کرلے۔ حدیث میں ہے کہ ''ہم ناخواندہ امت ہیں: نہ لکھتے ہیں اور نہ گنتے ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۱۹۷۱) اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ عام لوگوں کو ایسی ہی باتیں بتلانی چاہئے جن میں حساب میں گہرائی میں اترنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

دوسری بات —— وہ سہام ایسے ہونے چاہئیں کہ ان میں کمی زیادتی کی ترتیب اول وہلہ ہی میں ظاہر ہوجائے۔

چنانچہ شریعت نے ایسے سہام مقرر کئے جن کے دو زمرے بنتے ہیں: (۱) ثلثان، ثلث اور سدس (۲) نصف، ربع اور ثمن۔ ان سہام میں تین خوبیاں ہیں۔

پہلی خوبی —— ان سہام کا اصلی مخرج شروع کے دو عدد ہیں یعنی دو اور تین سے یہ سب سہام نکلتے ہیں۔ نصف کا مخرج تو

دو ہے ہی۔ ربع اور ثمن کا بھی یہی مخرج ہے۔ اس طرح کہ دو کا دوگنا چار ہے جو ربع کا مخرج ہے۔ اور دو کا چار گنا آٹھ ہے جو ثمن کا مخرج ہے۔ پس چار اور آٹھ مخرج فرعی ہیں۔ اسی طرح ثلث اور ثلثان کا مخرج تو تین ہے ہی۔ سدس کا مخرج بھی یہی ہے۔ اس طرح کہ تین کا دوگنا چھ ہے، جو سدس کا مخرج ہے[1]۔

دوسری خوبی —— دونوں زمروں میں تین تین مرتبے پائے جاتے ہیں۔ جن میں تضعیف وتنصیف کی نسبت ہے۔ جس سے محسوس اور واضح طور پر کمی بیشی کا پتہ چل جاتا ہے یعنی ثلثان کا نصف ثلث ہے اور اس کا نصف سدس ہے۔ اور سدس کا دوگنا ثلث ہے، اور اس کا دوگنا ثلثان ہے۔ اسی طرح دوسرے زمرے کو سمجھ لیں۔

تیسری خوبی —— ان سہام میں تضعیف وتنصیف کے علاوہ اور نسبتیں بھی پائی جاتی ہیں جو ضروری ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر نصف پر اضافہ کیا جائے مگر ایک پورا نہ ہوتو درمیان میں ثلثان آئے گا۔ اور نصف کو کم کیا جائے مگر چوتھائی تک نہ پہنچے تو درمیان میں ثلث آئے گا۔

فائدہ: خُمس اور سُبع کو نہیں لیا، کیونکہ ان دونوں کے مخرج کا پتہ لگانا نہایت دشوار ہے اور ان میں تضعیف وتنصیف کی نسبت بھی باریک حساب کی محتاج ہے۔ (یہ فائدہ کتاب میں ہے)

ومنها: أن السهامَ التى تُعَيَّنُ بها الأنصِباءُ: يجب أن تكون أجزاءً ظاهرةً، يتميزها بادىَ الرأى المحاسب وغيرُه، وقد أشار النبى صلى الله عليه وسلم فى قوله: " إنا أمةٌ أُمِّيَّةٌ لانكتبُ ولانحسُب" إلى أن الذى يليق أن يخاطَب به جمهورُ المكلفين: هو مالايحتاج إلى تعمُّق فى الحساب، ويجب أن تكون بحيث يظهر فيها ترتيبُ الفضلِ والنقصانِ بادِىَ الرأى، فآثر الشرعُ من السهام فصلين: الأول: الثلثان، والثلث، والسدس، والثانى: النصف، والربع، والثمن؛ فإن مخرجَهما الأصلىَّ أوّلاَ الأعداد، ويتحقق فيهما ثلاثُ مراتب، بين كلٍّ منها نسبةُ الشيئ إلى ضِعفه ترفُّعًا، ونصفِه تنزُّلاً، وذلك أدنى أن يظهر فيه الفضلُ والنقصانُ محسوسًا متبينًا.

ثم إذا اعتُبر فصلٌ بفصل ظهرت نِسَبٌ أخرى، لابد منها فى الباب، كالشيئ الذى زِيد على النصف، ولايبلغ التمامَ، هو الثلثان، والشيئِ الذى ينقص عن النصف، ولايبلغ الربع، وهو الثلث؛ ولم يُعتبر الخمسُ والسبع، لأن تخريجَ مخرجِهما أدقُّ، والترفُّعَ والتنزلَ فيهما يحتاج إلى تعمق فى الحساب.

ترجمہ: اور اصولِ میراث میں سے: یہ ہے کہ جن سہام کے ذریعہ ورثاء کے حصے متعین کئے جائیں: ضروری ہے

[1] مخرج کے معنی کے لئے رحمۃ اللہ (۲: ۲۱۱) دیکھیں ۱۲

کہ وہ ایسے واضح اجزاء ہوں جن کو جدا کر لے اول وہلہ ہی میں محاسب اور غیر محاسب۔ اور نبی ﷺ نے اشارہ فرمایا ہے اپنے ارشاد میں کہ ’’ہم ناخواندہ امت ہیں، نہ لکھتے ہیں اور نہ حساب کرتے ہیں‘‘ اس طرح کہ وہ بات جو کہ لائق ہے کہ جمہور مکلفین اس کے مخاطب بنائے جائیں: وہ وہ ہے جو حساب میں تعمق کی محتاج نہ ہو۔ اور ضروری ہے کہ ہوں وہ اجزاء بایں طور کہ ان میں زیادتی اور کمی کی ترتیب اول وہلہ ہی میں ظاہر ہو۔ چنانچہ شریعت نے سہام میں سے دو زمروں کو ترجیح دی: اول: ثلثان، ثلث اور سدس۔ اور ثانی: نصف، ربع اور ثمن۔ پس دونوں زمروں کا اصلی مخرج ابتدائی دو عدد ہیں۔ اور ان دونوں زمروں میں تین مرتبے متحقق ہوتے ہیں۔ ان تین میں سے ہر ایک کے درمیان شیئ کی نسبت ہے اس کے دوگنے کی طرف یعنی تضعیف کی نسبت ہے بلند ہونے کے اعتبار سے یعنی نیچے سے اوپر چڑھنے کے اعتبار سے۔ اور اس کے آدھے کی نسبت ہے، نیچے اترنے کے اعتبار سے۔ اور یہ یعنی دوگنا اور آدھا ہونا وہ کم از کم ہے جس میں ظاہر ہوتی ہے بیشی اور کمی واضح محسوس طور پر —— پھر جب ایک زمرہ کا دوسرے زمرہ کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو اور (بھی) نسبتیں ظاہر ہوں گی، جو باب میراث میں ضروری ہیں۔ جیسے وہ چیز جو نصف سے بڑھائی جائے، اور وہ پورے یعنی ایک کو نہ پہنچے، اور وہ ثلثان ہے۔ اور وہ چیز جو نصف سے کم کی جائے، اور وہ چوتھائی کو نہ پہنچے، اور وہ ثلث ہے —— اور نہیں لحاظ کیا گیا پانچویں اور ساتویں حصہ کا: اس لئے کہ ان دونوں کے مخرج کا نکالنا بہت ادقّ ہے۔ اور دونوں میں ترفّع (اونچا ہونا) اور تنزّل (نیچا ہونا) حساب میں تعمق کا محتاج ہے۔

ترکیب: أَوَّلاً: أول کا تثنیہ ہے، اضافت کی وجہ سے نون حذف ہوا ہے۔

☆ ☆ ☆

مسائل میراث

اولاد کی میراث کی حکمتیں

آیت کریمہ —— سورۃ النساء آیت گیارہ میں ارشاد پاک ہے: ’’اللہ تعالیٰ تم کو تمہاری اولاد کے حق میں حکم دیتے ہیں کہ مذکر کے لئے دو مؤنث کے حصہ کے برابر ہے۔ پھر اگر عورتیں دو سے زیادہ ہوں تو ان کے لئے ترکہ کا دو تہائی ہے۔ اور اگر ایک ہو تو اس کے لئے آدھا ہے‘‘

تفسیر: اس آیت کے ذیل میں شاہ صاحب نے تین باتیں بیان کی ہیں، اور آخر میں دو سوالوں کے جوابات ہیں:

پہلی بات —— لڑکے کو لڑکی سے دوگنا ملنے کی وجہ —— وہ ہے جو سورۃ النساء آیت ۳۴ میں آئی ہے کہ ’’مرد عورتوں کے ذمہ دار ہیں، اس لئے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے۔ اور اس واسطے کہ انھوں نے اپنے مال خرچ کئے

ہیں'' اس بڑائی کا میراث میں اثر ظاہر ہوا ہے (فضیلت کی تفصیل ابھی گذر چکی ہے)

دوسری بات ــــ ایک بیٹی کو نصف ملنے کی وجہ ــــ یہ ہے کہ جب ایک بیٹا ہوتا ہے تو وہ سارا مال سمیٹ لیتا ہے۔ پس تضعیف وتنصیف کے قاعدہ کی رُو سے ایک بیٹی کو اس کا آدھا ملے گا۔

تیسری بات ــــ دو بیٹیوں کا حکم اور ان کو دو تہائی ملنے کی وجہ ــــ دو بیٹیاں دو سے زیادہ کے حکم میں ہیں۔ یعنی ان کو بھی دو تہائی ملے گا۔ اور یہ بات اجماع سے ثابت ہے ــــ اور ان کو دو تہائی ملنے کی وجہ یہ ہے کہ اگر ان میں ایک لڑکی کی جگہ لڑکا ہوتا، تو لڑکی کا حصہ ــــ باوجودیکہ وہ بھائی سے کم ہے ــــ ایک تہائی سے نہ گھٹتا۔ پس جب دوسری بھی لڑکی ہے، تب تو تہائی سے گھٹ ہی نہیں سکتا۔ اور دونوں لڑکیاں یکساں حالت میں ہیں۔ پس اس کا بھی ایک تہائی ہوگا۔ اور دونوں کا حصہ مل کر دو تہائی ہوگا (البتہ تین لڑکیوں میں شبہ ہوسکتا تھا کہ شاید ان کو تین تہائی یعنی سارا ترکہ مل جائے، اس لئے آیت کریمہ میں صراحت کردی کہ بیٹیاں جب ایک سے زائد ہونگی، تین ہوں یا تیس، ان کو دو ثلث ہی ملے گا)

فائدہ: اور اجماع کی بنیاد حضرت سعد بن الربیع رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے۔ جو اس آیت کا شانِ نزول ہے۔ ان کی شہادت غزوۂ اُحد میں ہوئی تھی۔ ان کے ورثاء میں دو لڑکیاں اور بیوی بھی تھی۔ مگر عرب کے دستور کے مطابق ان کے سارے ترکہ پر ان کے بھائی نے قبضہ کرلیا۔ ان کی اہلیہ نے یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رکھا۔ آپؐ نے فرمایا: ''انتظار کرو! اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں فیصلہ فرمائیں گے'' چنانچہ میراث کی یہ آیت نازل ہوئی۔ آپؐ نے مرحوم کے بھائی کو بلایا، اور فرمایا: ''دو لڑکیوں کو دو تہائی دو، اور ان کی ماں کو آٹھواں حصہ دو، اور جو بچے وہ تمہارے لئے ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۰۵۸)

اور رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم قرآن کریم سے دو طرح سے مستنبط کیا ہے:

۱ ــــ سورۃ النساء کی آخری آیت میں کلالہ کی بہنوں کی میراث کا بیان ہے۔ ارشاد پاک ہے: ﴿فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ﴾ یعنی اگر کلالہ کی دو بہنیں ہوں تو ان کو ترکہ میں سے دو تہائی ملے گا۔ پس جب بیٹیوں کی عدم موجودگی میں دو بہنوں کو دو تہائی ملتا ہے تو دو بیٹیوں کو بدرجۂ اولی دو تہائی ملے گا۔ کیونکہ بیٹیاں: بہنوں کی بہ نسبت میت سے اقرب ہیں۔

۲ ــــ قرآن وحدیث متقابلات میں مضمون تقسیم کرتے ہیں۔ اور ایک جگہ بیان کیا ہوا حکم دوسری جگہ لیا جاتا ہے۔ اس کی مثال سورہ ہود آیات ۱۰۷ و ۱۰۸ میں ہے۔ جہنمیوں کے تذکرہ میں ارشاد پاک ہے: ﴿إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِمَا يُرِيْدُ﴾ یہ بات جنتیوں کے حق میں بھی ماخوذ ہے۔ اور جنتیوں کے تذکرہ میں ارشاد پاک ہے: ﴿عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ﴾ یہ مضمون جہنمیوں کے حق میں بھی ماخوذ ہے۔ تفصیل میری تفسیر ہدایت القرآن میں ہے۔

اور حدیث میں ہے: أمتی یومَ القیامة غُرٌّ من السجود، مُحَجَّلون من الوضوء یعنی میری امت قیامت کے دن سجدوں کی وجہ سے روشن پیشانی، اور وضوء کی وجہ سے روشن اعضاء ہوگی (ترمذی ۱: ۸۷ کتاب الصلاۃ کا آخر) اس حدیث میں بھی مضمون تقسیم کیا گیا ہے۔ سجدوں کا اثر اعضاء میں بھی ظاہر ہوگا، اور وضوء کا چہرہ میں بھی۔

اور یہ تقسیم کیف ما اتفق نہیں ہوتی۔ بلکہ اس میں مقتضائے حال کی رعایت ملحوظ ہوتی ہے۔ کافروں کے تذکرہ میں یہ بات کہ آپ کا پروردگار جو چاہے کر سکتا ہے یعنی جہنمیوں کو چاہے تو جہنم سے نکال سکتا ہے۔ یہ اللہ کی قدرت کاملہ کا بیان ہے، مگر اس سے جہنمیوں کو امید ہو جائے گی، جو کبھی پوری نہ ہوگی۔ پس یہ عذاب بالائے عذاب ہے — اور جنتیوں کے تذکرہ میں یہ بات کہ یہ ایک ایسا عطیہ ہے جو کبھی منقطع نہ ہوگا: جنتیوں کی خوشی کو دوبالا کر دے گی۔ پس یہ جزائے خیر میں اضافہ ہے —— اسی طرح روشن پیشانی ہونے کا تذکرہ سجدوں کے ساتھ ہی موزون ہے۔ سجدے ہی غایتِ تذلل ہیں، پس اس کا صلہ سرخ روئی کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ پھر جو مضمون باقی رہ گیا اس کا تذکرہ اعضاء کے ساتھ کیا گیا۔

اسی طرح لڑکیوں کے تذکرہ میں فرمایا کہ اگر لڑکیاں دو سے زیادہ بھی ہوں تو ان کے لئے ترکہ کا دو تہائی ہے۔ اور بہنوں کے تذکرہ میں فرمایا کہ اگر بہنیں دو ہوں تو ان کے لئے ترکہ کا دو تہائی ہے۔ یہ مضمون کی تقسیم ہے۔ پس دو لڑکیوں کا حکم: بہنوں کی آیت سے لیا جائے گا۔ اور دو سے زائد بہنوں کا حکم: لڑکیوں کی آیت سے لیا جائے گا۔ اور دونوں جگہ وہی بات بیان کی گئی ہے جو وہاں موزون تھی۔ لڑکیاں چونکہ قریب ترین وارث ہیں۔ اس لئے خیال ہو سکتا تھا کہ شاید تعداد بڑھنے سے حصہ بڑھے، اس لئے فرمایا کہ خواہ وہ دو سے زائد ہوں ان کا حصہ دو تہائی ہے۔ اور بہنیں چونکہ دور کی وارث ہیں، اس لئے خیال ہو سکتا تھا کہ شاید دو کو دو تہائی نہ ملے، اس لئے صراحت کی کہ دو کو بھی دو تہائی ملے گا (فائدہ تمام ہوا)

سوال: دو یا زیادہ لڑکیوں کو دو تہائی دیا تو باقی ایک تہائی کس کے لئے ہے؟

جواب: باقی ایک تہائی عصبہ کے لئے ہے۔ اس لئے کہ بیٹیوں کے ساتھ بہنیں، یا بھائی یا چچا ہو سکتے ہیں۔ اور ان میں بھی سبب وراثت پایا جاتا ہے۔ لڑکیاں اگر خدمت و ہمدردی اور مہر و محبت کی وجہ سے وراثت پاتی ہیں تو عصبہ میں بھی معاونت کی شکل موجود ہے۔ بہن میں بھی یہی جذبات کسی درجہ میں پائے جاتے ہیں، اور بھائی اور چچا تو قائم مقامی بھی کرتے ہیں۔ پس ایک تعاون دوسرے تعاون کو ساقط نہیں کرے گا۔ اس لئے ایک تہائی عصبہ کے لئے باقی رکھا گیا ہے۔

سوال: جب لڑکیوں کی طرح عصبہ میں بھی تعاون کی شکل موجود ہے تو ان کے لئے صرف ایک تہائی کیوں رکھا؟ ان کو برابر کا شریک کیوں نہیں بنایا؟

جواب: لڑکیوں سے میت کا ولادت کا تعلق ہے۔ وہ سلسلہ نسب میں داخل ہیں۔ اور عصبہ اطراف کا رشتہ ہے۔ اس لئے حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ لڑکیوں کو عصبہ سے زیادہ دیا جائے۔ اور زیادتی واضح طور پر دوگنا کرنے سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس لئے لڑکیوں کو دو ثلث دیا گیا۔ اور عصبہ کے لئے ایک ثلث بچایا —— ایسا ہی اس وقت کیا گیا ہے جب لڑکے لڑکیوں کے ساتھ ماں باپ ہوں۔ والدین کو سدس سدس دیا جاتا ہے۔ اور دو سدس مل کر ثلث ہوتے ہیں۔ اور باقی دو ثلث لڑکے لڑکیوں کو دیا جاتا ہے۔

---

[۱] قال اللہ تعالیٰ: ﴿یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْ أَوْلَادِکُمْ: لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَیَیْنِ، فَإِنْ کُنَّ نِسَاءً فَوْقَ

اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَاتَرَكَ، وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ﴾

أقول: يضعَّف نصيبُ الذكر على الأنثىٰ، وهو قوله تعالى: ﴿اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ﴾

وللبنت المنفردةِ النصفُ: لأنه إن كان ابنٌ واحدلأحاط المالَ، فمن حق البنت الواحدة أن تأخذ نصفه،قَضِيَّةً للتضعيف.

والبنتان حكمُهما حكمُ الثلاث بالإجماع، وإنما أُعْطِيَتَا الثلثينِ: لأنه لو كان مع البنتِ ابنٌ لوجدتِ الثلث، فالبنت الأخرى أولى أن لا تَرْزَأَ نصيبَها من الثلث.

وإنما أُفضل للعصبة الثلثُ: لأن للبنات معونةٌ، وللعصبات معونةٌ، فلم تُسْقِطْ إحداهما الأخرى، لكن كانت الحكمة: أن يُفَضَّلَ من في عمود النسب على من يُحيط به من جوانبه، وذلك نسبةُ الثلثين من الثلث؛ وكذلك حال الوالدين مع البنين والبنات.

ترجمہ: دوگنا کیا جاتا ہے مرد کا حصہ عورت کے حصہ سے، اور وہ اللہ پاک کا ارشاد ہے:......اور اکیلی بیٹی کے لئے آدھا ہے۔اس لئے کہ اگر ایک بیٹا ہوتو وہ مال سمیٹ لیتا ہے۔پس ایک بیٹی کے حق میں سے یہ بات ہے کہ وہ لڑکے کا آدھا لے،دوگنا کرنے کے قاعدے کی رو سے —— اور دولڑکیوں کا حکم تین لڑکیوں کا ہے، اجماع کی وجہ سے۔اور دولڑکیاں دوتہائی اسی لئے دی گئی ہیں کہ اگر لڑکی کے ساتھ لڑکا ہوتا تو لڑکی تہائی پاتی۔پس دوسری لڑکی بہ درجۂ اولی کم نہیں کرے گی پہلی کے حصہ کو تہائی سے —— اور عصبہ کے لئے تہائی اسی لئے بچایا گیا کہ لڑکیوں کے لئے ایک تعاون ہے،اور عصبات کے لئے دوسرا تعاون ہے۔پس ایک معاونت دوسری معاونت کو ساقط نہیں کرے گی —— لیکن حکمت یہ تھی کہ برتری دی جائے اس کو جو سلسلۂ نسب میں داخل ہے،اس پر جو میت کا اس کے اطراف سے احاطہ کرتا ہے۔اور وہ برتری دو تہائی کی ایک تہائی کی نسبت سے ہے یعنی دوگنا —— اور اسی طرح والدین کا حال ہے لڑکے اور لڑکیوں کے ساتھ۔

☆ ☆ ☆

والدین کی میراث کی حکمتیں

آیت کریمہ: سورۃ النساء آیت گیارہ میں ارشاد پاک ہے: ”اور میت کے والدین میں سے ہر ایک کے لئے ترکہ کا چھٹا حصہ ہے اگر میت کی اولاد ہو۔اور اگر اس کی کوئی اولاد نہیں،اور والدین (ہی) اس کے وارث ہیں تو اس کی ماں کے لئے ایک تہائی ہے (اور دو تہائی باپ کے لئے ہے) پھر اگر میت کے کئی بھائی بہن ہوں تو اس کی ماں کے لئے چھٹا حصہ ہے“

تفسیر: اس آیت میں والدین کی میراث کی تین صورتیں بیان کی ہیں:

پہلی صورت ـــــ میت نے والدین چھوڑے، اور ساتھ ہی اولاد بھی، خواہ ایک ہی لڑکا یا ایک ہی لڑکی ہو، تو باپ کو سدس اور ماں کو سدس ملے گا۔ اور باقی ترکہ دیگر ورثاء کو ملے گا۔ پھر مذکر اولاد کی صورت میں تو کچھ نہیں بچے گا۔ کیونکہ وہ عصبہ ہوگی۔ پس باپ صرف ذوالفرض ہوگا۔ اور مؤنث اولاد ہوگی تو کچھ بچ جائے گا۔ وہ باپ کو مل جائے گا۔ اور باپ اس صورت میں ذوالفرض اور عصبہ دونوں ہوگا۔

اور اس حالت کی وجہ یہ ہے کہ والدین کے مقابلہ میں اولاد میراث کی زیادہ حقدار ہوتی ہے۔ اور برتری کی صورت یہی ہے کہ اولاد کو والدین سے دوگنا دیا جائے۔ والدین کے دو سدس مل کر ایک ثلث ہوں گے۔ اور باقی دو ثلث اولاد کو ملیں گے۔

سوال: مرد کا حصہ عورت سے دوگنا ہے، پھر والدین میں سے ہر ایک کو سدس کیوں دیا گیا؟ یہ تو دونوں کو برابر کر دیا؟

جواب: باپ کی برتری ایک مرتبہ ظاہر ہو چکی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ باپ کو ذوالفرض ہونے کے ساتھ عصبہ بھی بنایا ہے۔ اس لئے کہ وہ اولاد کی قائم مقامی اور حمایت بھی کرتا ہے۔ پس اسی فضیلت کا دوبارہ اعتبار کرنا اور اس کے حصہ کو دوگنا کرنا درست نہیں۔

دوسری صورت ـــــ مرنے والے کی نہ اولاد ہو، نہ دو بھائی بہن ہوں تو ماں کو کل ترکہ کا تہائی اور باپ کو عصبہ ہونے کی وجہ سے باقی دو ثلث ملے گا۔ البتہ اگر شوہر یا بیوی ہو تو ان کا حصہ دینے کے بعد باقی ترکہ کا تہائی ماں کو، اور دو تہائی باپ کو ملے گا۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب میت کی اولاد نہ ہو تو ترکہ کے سب سے زیادہ حقدار والدین ہیں، اس لئے وہ سارا ترکہ لیں گے۔ اور اس صورت میں باپ کو ماں پر ترجیح حاصل ہوگی۔ اور ترجیح کی صورت میراث کے اکثر مسائل میں دوگنا کرنا ہے۔ پس ماں کو ایک تہائی اور باپ کو دو تہائی ملے گا ـــــ اور شوہر یا بیوی کی موجودگی میں ماں کو ثلث باقی اس لئے دیا جاتا ہے تاکہ ایک صورت میں ماں کا حصہ باپ سے بڑھ نہ جائے۔ جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔

تیسری صورت ـــــ مرنے والے کی اولاد تو نہ ہو، البتہ کسی بھی طرح کے دو یا زیادہ بھائی بہن ہوں، تو ماں کو سدس ملے گا۔ اور بھائی بہن باپ کی وجہ سے محروم ہوں گے۔ مگر ان کی وجہ سے ماں کا حصہ کم ہو جائے گا۔ یعنی حجب نقصان واقع ہوگا۔ اور باقی ترکہ اگر دوسرے ورثاء ہوں گے تو وہ لیں گے۔ اور جو بچ جائے گا وہ باپ کو ملے گا۔ اور اگر دوسرے ورثاء نہ ہوں تو باقی سارا ترکہ باپ کو ملے گا۔ اور اس صورت میں باپ صرف عصبہ ہوگا۔

اور اس صورت میں ماں کا حصہ کم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اگر میت کے ایک سے زیادہ بھائی بہن ہیں تو اسکی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت ـــــ میت کی دو یا زیادہ صرف بہنیں ہیں تو وہ عصبہ نہیں ہونگی، بلکہ ذوالفرض ہونگی، اور عصبہ چچا ہوگا، جو بہنوں سے دور کا رشتہ ہے۔ پس ماں اور بہنوں کی میراث کی بنیاد ایک ہوگی یعنی ہمدردی اور مہر و محبت اور چچا کی میراث کی بنیاد دوسری ہوگی یعنی نصرت و حمایت۔ اس لئے آدھا ترکہ ماں اور بہنوں کا ہوگا اور آدھا عصبہ کا۔ پھر ماں اور دو بہنیں آدھا ترکہ آپس میں تقسیم کریں گی تو ماں کے حصہ میں ایک آئے گا۔ وہی اس کا حصہ ہے۔ اور ترکہ کے باقی پانچ:

بہنوں اور چچا میں تقسیم ہوں گے بہنوں کو ثلثان یعنی چار ملیں گے، اور باقی ایک چچا کو ملے گا۔

دوسری صورت —— اور اگر دو بھائی یا ایک بھائی اور ایک بہن ہو تو چونکہ یہ خود عصبہ ہیں، اس لئے ان میں وراثت کی دو جہتیں جمع ہونگی: ایک قرابتِ قریبہ یعنی ہمدردی اور محبت۔ دوسری: نصرت وحمایت۔ اور ماں میں وارثت کی ایک ہی جہت ہوگی یعنی محبت وہمدردی۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میت کے اور بھی ورثاء ہوتے ہیں۔ جیسے ایک بیٹی اور دو بیٹیاں اور شوہر، اس لئے ماں کو سدس ہی دیا جائے گا۔ تاکہ دوسرے ورثاء پر تنگی نہ ہو۔

وضاحت: اگر میت کی ماں، ایک بیٹی اور ایک بھائی اور ایک بہن ہو تو مسئلہ چھ سے بنے گا۔ اور سدس ماں کو، نصف بیٹی کو اور باقی دو بھائی بہن کو ملیں گے۔ اور ماں، دو بیٹیاں اور ایک بھائی اور بہن ہو تو بھی مسئلہ چھ سے بنے گا۔ اور سدس ماں کو، اور ثلثان بیٹیوں کو اور باقی ایک بھائی بہن کو ملے گا۔ اور شوہر، ماں اور ایک بھائی اور ایک بہن ہو تو بھی مسئلہ چھ سے بنے گا۔ اور نصف شوہر کو، سدس ماں کو اور باقی دو بھائی بہن کو ملیں گے۔

[۲] وقال الله تعالى: ﴿وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ، فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَّوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ، فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ﴾ الآية.

أقول: قد علمتَ أن الأولاد أحق بالميراث من الوالدين، وذلك بأن يكون لهم الثلثان، ولهما الثلث، وإنما لم يُجعل نصيبُ الوالد أكثرَ من نصيب الأم: لأنه اعتُبر فضلُه من جهةِ قيامِه مقامَ الولد، وذَبِّه عنه: مرةً واحدةً بالعصوبة، فلايعتبر ذلك الفضلُ بعينه في حق التضعيف أيضًا.

وعند عدم الولد لا أحقَّ من الوالدين، فأحاطا تمامَ الميراث، وفُضِّلَ الأب على الأم، وقد علمتَ أن الفضلَ المعتبر في أكثرِ هذه المسائل فضلُ التضعيف.

ثم إن كان الميراث للأم والإخوة، وهم أكثرُ من واحد: وجب أن يُنْقَصَ سهمُها إلى السدس:

[الف] لأنه إن لم تكن الإخوةُ عصبةً، وكانت العصباتُ أبعدَ من ذلك، فالعصوبةُ والرفقُ والمودَّةُ على السواء، فَجُعل النصفُ لهؤلاء، والنصفُ لهؤلاء، ثم قُسم النصفُ على الأم وأولادِها، فَجُعل السدس لها ألبتة، لايُنْقَص سهمُها منه، والباقي لهم جميعًا.

[ب] وإن كانت الإخوةُ عصباتٍ، فقد اجتمع فيهم القرابة القريبة والحماية، وكثيرًا ما يكون مع ذلك ورثة آخرون، كالبنت، والبنتين، والزوج، فلو لم يُجعل لها السدس، حصل التضييق عليهم.

ترجمہ: (پہلی صورت کی وجہ) آپ جان چکے ہیں کہ والدین کے مقابلہ میں اولاد میراث کی زیادہ حقدار ہے۔ اور وہ زیادہ حقدار ہونا بایں طور ہے کہ اولاد کے لئے دو تہائی، اور والدین کے لئے ایک تہائی ہو —— (سوال کا جواب)

اور باپ کا حصہ ماں کے حصہ سے زیادہ اس لئے مقرر نہیں کیا گیا کہ باپ کی فضیلت کا لحاظ کیا جاچکا، اولاد کی جگہ میں اس کے قائم ہونے اور اولاد سے اس کی مدافعت کی جہت سے: ایک مرتبہ عصبہ ہونے کے ذریعہ۔ پس بعینہٖ اس فضیلت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا حصہ دوگنا کرنے کے حق میں بھی ـــ (دوسری صورت کی وجہ) اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں والدین سے زیادہ حقدار کوئی نہیں۔ پس وہ دونوں پوری میراث لیں گے۔ اور باپ کو ماں پر ترجیح دی گئی، اور آپ یہ بات جان چکے ہیں کہ ان مسائل میں سے اکثر میں جو زیادتی معتبر ہے وہ دوگنا کی زیادتی ہے۔

(تیسری صورت کی وجہ) پھر اگر میراث ماں اور بھائی بہنوں کے لئے ہے، درانحالیکہ وہ ایک سے زیادہ ہیں، تو ضروری ہے کہ ماں کا حصہ کم کیا جائے سدس تک: (الف) اس لئے کہ اگر بھائی بہن عصبہ نہیں ہوں گے (بایں وجہ کہ صرف بہنیں ہیں، بھائی ساتھ میں نہیں ہے) اور عصبات ان سے دور ہوں گے (یعنی چچا عصبہ ہوں گے) تو عصبہ ہونا (جو چچا کا وصف ہے) اور ہمدردی اور محبت (جو ماں اور بہنوں کا وصف ہے) یکساں ہیں (یعنی دو سبب میراث یکساں درجہ کے پائے گئے) پس مقرر کیا نصف اِن (بہنوں اور ماں) کے لئے، اور نصف اُن (چچاؤں) کے لئے۔ پھر نصف ماں اور اس کی اولاد (یعنی بہنوں) پر بانٹا گیا (اور وہ تین ہیں۔ ایک ماں اور دو بہنیں، پس ماں کو ایک ملے گا) پس مقرر کیا گیا سدس ماں کے لئے قطعی طور پر، سدس سے ماں کا حصہ کم نہیں کیا جائے گا، اور باقی ان سبھی کے لئے ہوگا (باقی پانچ رہے وہ دو بہنوں اور عصبہ کے لئے ہوں گے، اس طرح کہ ان میں سے ثلثان یعنی چار بہنوں کو ملیں گے اور ایک عصبہ کو ملے گا) ـــ (ب) اور اگر بھائی بہن عصبات ہیں تو یقیناً ان میں قرابت قریبہ (یعنی ہمدردی اور محبت) اور حمایت جمع ہوگئیں، اور بارہا ان کے ساتھ دیگر ورثاء (بھی) ہوتے ہیں، جیسے ایک بیٹی اور دو بیٹیاں اور شوہر، پس اگر ماں کے لئے سدس مقرر نہیں کیا جائے گا تو ان ورثاء پر تنگی ہوگی۔

تصحیح: و البنتین اصل میں و البنین تھا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

نوٹ: إخوۃ: أخ کی جمع ہے، مگر کبھی بھائی بہن کے مجموعہ کو بھی إخوۃ کہتے ہیں۔ آیت میں یہی عام معنی مراد ہیں۔ اور شاہ صاحب نے تو اس عبارت میں صرف بہنوں کے معنی میں یہ لفظ استعمال کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

زوجین کی میراث کی حکمتیں

آیت کریمہ: سورۃ النساء آیت بارہ میں ارشاد پاک ہے: ”اور تمہارے لئے تمہاری بیویوں کے ترکہ کا آدھا ہے، اگر ان کی کوئی اولاد نہ ہو۔ اور اگر ان کی کوئی اولاد ہو تو تمہارے لئے چوتھائی ہے اس مال میں سے جو وہ چھوڑ مریں۔ اس وصیت کے بعد جو وہ کر گئیں، یا ادائے قرض کے بعد ـــ اور ان بیویوں کے لئے تمہارے ترکہ کا چوتھائی ہے، اگر تمہاری کوئی اولاد نہ ہو۔ اور اگر تمہاری کوئی اولاد ہو تو ان کے لئے تمہارے ترکہ کا آٹھواں حصہ ہے۔ اس وصیت کے بعد جو تم کر مرو یا ادائے قرض کے بعد“

تفسیر: زوجین کی میراث کے سلسلہ میں تین باتیں جاننی چاہئیں:

پہلی بات ـــــ زوجین کی میراث کی بنیاد ـــــ شوہر کو میراث دو وجہ سے ملتی ہے: ایک: شوہر کا بیوی اور اس کے مال پر قبضہ ہوتا ہے۔ پس سارا مال اس کے قبضہ سے نکال لینا اس کو ناگوار ہوگا۔ دوم: شوہر بیوی کے پاس اپنا مال امانت رکھتا ہے، اور اپنے مال کے سلسلہ میں اس پر اعتماد کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا قوی حق ہے اس چیز میں جو عورت کے قبضہ میں ہے۔ اور یہ ایک ایسا خیال ہے جو شوہر کے دل سے آسانی سے نہیں نکل سکتا۔ اس لئے شریعت نے عورت کے ترکہ میں شوہر کا حق رکھ دیا تا کہ اس کے دل کو تسلی ہو، اور اس کا نزاع نرم پڑے ـــــ اور بیوی کو خدمت، غم خواری اور ہمدردی کے صلہ میں میراث ملتی ہے۔

دوسری بات ـــــ زوجین کی میراث میں تفاضل ـــــ ارشاد پاک ہے: ''مرد عورتوں کے ذمہ دار ہیں، اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی ہے'' اس ارشاد کے بموجب شوہر کو عورت پر برتری حاصل ہے۔ اور یہ بات پہلے آچکی ہے کہ میراث کے اکثر مسائل میں جو زیادتی معتبر ہے وہ دوگنے کی زیادتی ہے۔ چنانچہ شوہر کو عورت سے دوگنا دیا گیا۔ جس حالت میں عورت کو ربع ملتا ہے، شوہر کو نصف ملتا ہے۔ اور جس حالت میں عورت کو ثمن ملتا ہے، شوہر کو ربع ملتا ہے۔

تیسری بات ـــــ زوجین کی میراث میں اولاد کا خیال ـــــ شوہر اور بیوی کو اتنی میراث نہیں دی گئی کہ اولاد کے لئے ترکہ بس برائے نام بچے۔ بلکہ اولاد کا خیال رکھ کر زوجین کا حصہ مقرر کیا گیا ہے۔ چنانچہ اولاد نہ ہونے کی صورت میں زوجین کو زیادہ دیا گیا ہے، اور اولاد ہونے کی صورت میں کم۔

---

[۳] وقال تعالیٰ: ﴿وَلَكُمْ نِصْفُ مَاتَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ، فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَا أَوْدَيْنٍ، وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ، فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَا أَوْدَيْنٍ﴾

أقول: الزوج يأخذ الميراث: لأنه ذو اليد عليها وعلى مالها، فإخراج المال من يده يَسُوْؤُه، ولأنه يُوْدِعُ منها، ويأمنُها في ذات يده، حتى يتخيل أن له حقًا قويا فيما في يدها. والزوجةُ تأخذ حق الخدمة والمواساة والرفق. فَفُضِّلَ الزوج على الزوجة، وهو قوله تعالى: ﴿الرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ﴾ ثم اعتبر أن لا يُضَيِّقَا على الأولاد، وقد علمتَ أن الفضل المعتبر في أكثر المسائل فضلُ التضعيف.

ترجمہ: واضح ہے۔ البتہ اس کا خیال رہے کہ تینوں باتیں ملی جلی ہیں۔ اور ایک جگہ تقدیم وتاخیر بھی ہے۔

☆ ☆ ☆

اخیافی بھائی بہن کی میراث کی حکمت

بھائی بہن دوطرح کے ہیں: سگےاور سوتیلے۔ سگے: جوماں باپ دونوں میں شریک ہیں۔ان کو حقیقی اور عینی بھی کہتے ہیں۔اور سوتیلےدوطرح کے ہیں:ماں کی طرف سےسوتیلے۔ان کوعلاتی کہتے ہیں۔اور باپ کی طرف سےسوتیلے۔ان کواخیافی کہتے ہیں۔

آیت کریمہ: ارشاد پاک ہے:''اوراگروہ مرد جس کی میراث ہے کلالہ ہو، یا ایسی کوئی عورت ہو، اوراس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہوتوان میں سے ہرایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔پس اگروہ ایک سے زیادہ ہوں تو وہ تہائی میں شریک ہوں گے''(سورۃ النساء آیت ۱۲)

تفسیر: یہ آیت بہ اجماع امت اخیافی بھائی بہنوں کے حق میں ہے۔اورحضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءتِ شاذّہ:وله أخ أو أخت من الأم اس کی بنیاد ہے۔اور کلالہ کی تعریف آگے آرہی ہے۔

اوراخیافی بھائی بہن جب ایک سے زیادہ ہوں توان کوثلث ملنے کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ یہ رشتہ ماں کی طرف سے ہے، اس لئے اخیافی اور ماں ایک جماعت ہیں۔اوران کے ساتھ درجہ سوم کے جوعصبہ ہیں یعنی حقیقی یا علاتی بھائی وہ دوسری جماعت ہیں۔اوردونوں جانب میراث کے دودوسبب ہیں۔ماں میں اُمومت یعنی میت سے پیارمحبت، اوراخیافی بھائی بہن میں رفق یعنی نرمی اور ہمدردی، اورعصبہ میں نصرت وحمایت یعنی عام حالات میں میت کی مدد، اوردشمن کے مقابلہ میں حمایت ومدافعت۔پس اگراخیافی کے ساتھ ماں بھی ہوتوترکہ دونوں جماعتوں کوآدھا آدھا ملے گا۔پھر ماں اوراخیافی اپنا حصہ باہم تقسیم کریں گے۔اخیافی کے حصہ میں ثلث آئے گا، اور ماں کے حصہ میں سدس۔کیونکہ دو بھائی بہنوں کی وجہ سے ماں کا حصہ کم ہوجاتا ہے —— اوراگراخیافی کی جانب ماں نہیں ہےتو چونکہ ان کی طرف میراث کا ایک ہی سبب ہوگا اس لئے ان کوثلث ملے گا۔اورعصبہ کی طرف دوسبب ہونگے، اس لئے ان کو دوثلث ملے گا۔

فائدہ:اوراگرایک اخیافی بھائی یا بہن ہےتو ماں کا حصہ کم نہ ہوگا۔وہ ثلث پائے گی، پس اخیافی کے لئے سدس بچے گا۔اوراگراخیافی کی طرف ماں نہیں ہےتو بھی اس کوسدس ہی ملے گا۔کیونکہ ماں جواخیافی کی میراث کی اصل ہے، اس کی موجودگی میں اخیافی سدس پاتا ہےتواس کی عدم موجودگی میں تورشتہ اوربھی کمزور ہوگا، پس بدرجۂ اولی سدس پائے گا۔

[٤] وقال تعالى: ﴿وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلاَلَةً، أَوِامْرَأَةٌ وَّلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ، فَإِنْ كَانُوْا أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ﴾

أقول: هذه الآية في أولاد الأم للإجماع. ولمالم يكن له والد ولا ولد، جعل لحق الرفق إذا كانت فيهم الأم النصفُ، ولحق النصرة والحماية النصفُ، فإن لم تكن أم جُعل لهم الثلثان، ولهؤلاء الثلث.

ترجمہ:اور جب نہیں ہے میت کے لئے باپ اور نہ اولاد (تو بھائی ہوں گے) تو مقرر کیا مہربانی کے حق کے لئے،

جب ان میں ماں موجود ہو، آدھا۔ اور نصرت وحمایت کے لئے آدھا۔ پس اگر ماں نہ ہو تو عصبات کے لئے دو تہائی اور ان اخیافی کے لئے ایک تہائی مقرر کیا جائے گا۔

☆ ☆ ☆

حقیقی اور علاتی بھائی بہنوں کی میراث کی حکمت

آیت کریمہ: ارشاد پاک ہے: ''لوگ آپؐ سے فتوی پوچھتے ہیں؟ آپؐ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تم کو کلالہ کے بارے میں فتوی دیتے ہیں: اگر کوئی شخص مرگیا، جس کی اولاد نہیں ہے، اور اس کی ایک بہن ہے تو اس کو ترکے کا نصف ملے گا۔ اور وہ بھائی (بھی) اس بہن کا وارث ہوگا اگر اس کی اولاد نہیں ہے۔ اور اگر دو بہنیں ہوں تو ان کو ترکہ کا دو تہائی ملے گا۔ اور اگر اسی رشتہ کے کئی شخص ہوں: کچھ مرد اور کچھ عورتیں: تو مرد کے لئے دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہے'' (سورۃ النساء آیت ۱۷۶)

تفسیر: یہ آیت بہ اجماع امت باپ کی اولاد کے لئے یعنی حقیقی اور علاتی بھائی بہنوں کے لئے ہے —— اور کلالہ: وہ مرد یا عورت ہے جس کا نہ باپ دادا ہو، نہ اولاد (بیٹا بیٹی) یا مذکر اولاد کی اولاد (پوتا پوتی)۔ اور ﴿لَيۡسَ لَهٗ وَلَدٌ﴾ میں آدھی تعریف ہے۔ باقی آدھی تعریف فہم سامع پر اعتماد کر کے چھوڑ دی گئی ہے۔ اور وہ ہے: ولا والد۔ احادیث میں اس کی وضاحت ہے (مراسیل ابی داؤد ص ۱۶)

اور آدھی تعریف اس لئے چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ مذکور سے مفہوم ہوتی ہے۔ کیونکہ بھائی بہن کو میراث: میت کی قائم مقامی کی وجہ سے ملتی ہے۔ اور قائم مقامی میں فطری وضع یہ ہے کہ اولاد اور ماں باپ کے بعد ہی بھائی بہن قائم مقامی کریں۔ باپ دادا کی موجودگی میں ان کی قائم مقامی فطری حالت نہیں ہے، اس لئے اولاد کی نفی سے اصول کی نفی خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے۔

اور حقیقی اور علاتی بھائی بہنوں کی میراث کے سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ جب وہ ورثاء موجود نہ ہوں جو سلسلۂ نسب میں داخل ہیں یعنی اصول وفروع موجود نہ ہوں تو اولاد سے قریب ترین مشابہت رکھنے والوں کو یعنی بھائی بہنوں کو ان کی جگہ دیدی جاتی ہے۔

وضاحت: جو رشتہ دار سلسلۂ نسب میں داخل ہیں وہی آدمی کی قوم اور اس کے منصب وشرف والے ہیں۔ پھر فطری وضع یہ ہے کہ میت کی قائم مقامی بیٹے پوتے کریں، بیٹیوں پوتیوں میں ضعف ہے۔ پھر جب وہ نہ ہوں تو اصول یعنی باپ دادا قائم مقامی کریں۔ پھر ان کے بعد وہ رشتہ دار جو جوانب سے میت کا احاطہ کرتے ہیں یعنی اصلِ قریب کی فرع بھائی بہن اولاد کی جگہ لیں۔ اور جو حکم اولاد کا ہے وہی حکم ان پر جاری ہو۔ اگر صرف بہنیں ہوں تو ذوی الفروض بنیں۔ اور مذکر ومؤنث جمع ہوں تو عصبہ بنیں۔ آیت کریمہ میں اسی صورت کا بیان ہے۔ اور اس صورت میں کلالہ کی تعریف میں لفظ ولد عام ہے۔ مذکر ومؤنث دونوں کو شامل ہے۔

رہا بیٹیوں اور پوتیوں کے ساتھ بہنوں کا عصبہ ہونا تو وہ حکم حدیث سے ثابت ہے۔ایک واقعہ میں بیٹی، پوتی اور بہن وارث تھے۔ نبی ﷺ نے بیٹی کو نصف اور پوتی کو سدس دیا اور بہن کو عصبہ بنایا (رواہ البخاری، مشکوٰۃ حدیث ۳۰۵۹ یہ روایت آگے آرہی ہے) پس اس خاص صورت میں کلالہ کی تعریف میں لفظ ولد سے بیٹا مراد ہوگا (شریفیہ شرح سراجیہ ص ۲۰)

[۵] قال الله تعالى: ﴿يَسْتَفْتُوْنَكَ؟ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلاَلَةِ: إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَّلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ، وَهُوَ يَرِثُهَا إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ، فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ، وَإِنْ كَانُوْا إِخْوَةً رِّجَالاً وَّنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ الآية.

أقول: هذه الآية في أولاد الأب: بني الأعيان وبني العلات، بالإجماع. والكلالة: من لاوالد له ولاولد وقوله: ﴿لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ﴾ كشفٌ لبعض حقيقة الكلالة. والجملة في ذلك: أنه إذا لم يوجد من يَدْخل في عمود النسب حُمِل أقربُ من يُشْبِهُ الأولادَ— وهم الإخوة والأخوات— على الأولاد.

ترجمہ: واضح ہے۔شاہ صاحب نے حقیقی اور علاتی بھائی بہنوں کو ''باپ کی اولاد'' کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہی خاندان کے لوگ ہیں۔

☆ ☆ ☆

عصبہ کی میراث کی حکمت

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''فروضِ مقدّرہ ان کے حقداروں کے ساتھ ملاؤ یعنی پہلے ذوی الفروض کو میراث دو، پھر جو بچ جائے: وہ قریب ترین مذکر آدمی کے لئے ہے'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۳۰۴۲)

تشریح: عصبہ: میت کے وہ رشتہ دار ہیں جن کا حصہ قرآن وحدیث میں متعین نہیں کیا گیا۔ وہ تنہا ہونے کی صورت میں پورا ترکہ، اور ذوی الفروض کے ساتھ ہونے کی صورت میں باقی ماندہ ترکہ لیتے ہیں۔ پھر عصبہ کی دو قسمیں ہیں: نسبی اور سببی۔نسبی عصبہ: وہ ہیں جن کا میت سے رشتہ داری کا تعلق ہو۔اور سببی عصبہ: وہ ہے جس کا میت سے آزاد کرنے کا تعلق ہو۔پھر نسبی عصبہ کی تین قسمیں ہیں۔عصبہ بنفسہ، عصبہ بغیرہ اور عصبہ مع غیرہ۔اس حدیث میں عصبہ بنفسہ کا بیان ہے۔

پھر عصبہ بنفسہ کی چار قسمیں ہیں: جزءِ میت، اصلِ میت، جزءِ اصلِ قریب اور جزءِ اصلِ بعید۔ان میں ترجیح الاقرب فالاقرب کے قاعدہ سے دی جاتی ہے۔عصبہ بنفسہ کی توریث کی وجہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ بیان فرماتے ہیں۔

پہلے یہ بات بیان کی جاچکی ہے کہ توارث کے دو سبب ہیں: ایک شرف ومنصب وغیرہ میں میت کی قائم مقامی کرنا۔ دوم: خدمت ونصرت اور مہر ومحبت کے جذبات۔اور یہ بات بھی بیان کی جاچکی ہے کہ سبب دوم کا اعتبار نہایت نزدیک کی

رشتہ داری میں کیا جاتا ہے۔ جیسے ماں اور بہنوں میں، دور کے رشتہ داروں میں اس سبب کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ ان میں صرف پہلا سبب معتبر ہے۔ یعنی چونکہ وہ میت کی قائم مقامی اور نصرت وحمایت کرتے ہیں، اس لئے وہ میراث پاتے ہیں۔ اور یہ بات خاندان والوں ہی میں پائی جاتی ہے۔ وہی نسب وشرف میں میت کے ساتھ حصہ دار ہیں۔ اس لئے باقی ترکہ اس بنیاد پر ان کو الاقرب فالاقرب کے قاعدہ کا لحاظ کر کے دیا جاتا ہے۔

فائدہ: رجل کے بعد ذکرٍ صفت کاشفہ ہے۔ اس سے کلام میں فصاحت بھی پیدا ہوئی ہے۔ اور اس بات سے احتراز بھی ہو گیا ہے کہ عصبہ کا مرد یعنی بالغ ہونا شرط نہیں، مذکر ہونا کافی ہے۔

مسلمان کافر میں توارث نہ ہونے کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوگا۔ اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوگا'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۳۰۴۳)

تشریح: یہ قانون اس لئے نافذ کیا گیا ہے کہ مسلمان اور کافر میں مواسات ومودت اور غم خواری کا رشتہ ٹوٹ جائے۔ کیونکہ اس قسم کا اختلاط فسادِ دین کا باعث ہوتا ہے۔ مسلمان اور مشرک میں مناکحت کی ممانعت کی وجہ بھی قرآن نے یہی بیان کی ہے۔ ارشاد پاک ہے: ''وہ دوزخ کی طرف دعوت دیتے ہیں'' (سورۃ البقرۃ آیت ۲۲۱) یعنی مشرکین ومشرکات کے ساتھ اختلاط ومحبت جو مناکحت کا لازمی تقاضا ہے، شرک کی طرف رغبت کا باعث ہوگا، جس کا انجام دوزخ ہے، پس اس سے کلی اجتناب چاہئے۔

قاتل کے وارث نہ ہونے کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قاتل وارث نہیں ہوتا'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۰۴۸)

تشریح: یہ قانون اس لئے نافذ کیا گیا ہے کہ بکثرت ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ وارث مورث کو اس لئے قتل کر دیتا ہے کہ اس کے مال پر قبضہ کر لے۔ خاص طور پر چچا زاد بھائی وغیرہ اسی وجہ سے قتل کرتے ہیں۔ پس ضروری ہوا کہ جو شخص قبل از وقت کوئی چیز لینا چاہے اس کو اس سے مایوس کر دیا جائے تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری!

غلام کے وارث ومورث نہ ہونے کی وجہ

قانون شرعی یہ ہے کہ غلام نہ کسی کا وارث ہوتا ہے، نہ کوئی غلام کا وارث ہوتا ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ غلام اپنے مال کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کا سارا مال اس کے آقا کا ہوتا ہے۔ پس جب اس کے پاس اپنا کچھ نہیں تو وارث میراث میں کیا لے

گا؟ اور اس کو وراثت دینا گویا اس کے آقا کو وراثت دینا ہے جو میت کا رشتہ دار نہیں۔ اور غیر رشتہ دار کو بغیر کسی سبب کے وراثت دینا بالاجماع باطل ہے، اس لئے غلام کو وراثت نہیں ملتی۔

[٦] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "أَلْحِقوا الفرائضَ بأهلها، فما بقى فهو لِأَوْلٰى رجلٍ ذكرٍ"

أقول: قد علمتَ أن الأصل فى التوارث معنيان، وقد ذكرناهما، وأن المودة والرفق لايعتبر إلا فى القرابة القريبة جِدًّا، كالأم والإخوة، دون ماسوى ذلك، فإذا جاوزهم الأمرُ تعين التوارث بمعنى القيام مقام الميت، والنصرة له، وذلك قومُ الميت، وأهلُ نسبه وشرفه، الأقرب فالأقرب.

[٧] قال صلى الله عليه وسلم: " لايرث المسلم الكافر، ولا الكافر المسلم"

أقول: إنما شَرَعَ ذلك ليكون طريقًا إلى قطع المواساة بينهما، فإن اختلاط المسلم بالكافر يفسد عليه دينه، وهو قوله تعالى فى حكم النكاح: ﴿أُوْلٰئِكَ يَدْعُوْنَ إِلَى النَّارِ﴾

[٨] وقال صلى الله عليه وسلم: " القاتل لايرث"

أقول: إنما شَرَعَ ذلك: لأن من الحوادث الكثيرة الوقوع أن يقتل الوارثُ مورثَه ليحرزَ مالَه، لاسيما فى أبناء العم ونحوهم، فيجب أن تكون السنة بينهم تأييسُ من فعل ذلك عما أراده، لِتُقْطَع عنهم تلك المفسدة.

[٩] وجرت السنة: أن لايرث العبدُ، ولايورث، وذلك: لأن ماله لسيده، والسيد أجنبى.

ترجمہ: (٦) آپ جان چکے ہیں کہ توارث کی بنیاد دو باتیں ہیں، اور ہم دونوں کو ذکر کر چکے ہیں۔ اور آپ یہ بات بھی جان چکے ہیں کہ محبت اور ہمدردی کا اعتبار نہیں کیا جاتا مگر نہایت نزدیک کی رشتہ داری میں، جیسے ماں اور بھائی بہن میں، نہ کہ ان کے علاوہ میں۔ پس جب معاملہ ان لوگوں سے آگے بڑھے تو متعین ہوگا ایک دوسرے کا وارث ہونا: میت کی جگہ میں کھڑے ہونے اور اس کی مدد کرنے کے معنی کی رو سے۔ اور وہی لوگ میت کی قوم اور اس کے نسب وشرف والے ہیں، قریب تر پھر اس سے کم تر کے قاعدہ کے بموجب۔ باقی ترجمہ واضح ہے۔

☆ ☆ ☆

حقیقی سے علاتی کے محروم ہونے کی وجہ

حدیث ــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "سگے بھائی وارث ہوتے ہیں، ان کے ہوتے ہوئے سوتیلوں کو کچھ نہیں

ملتا'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۰۵۷)

تشریح: حقیقی اور علاتی بھائیوں کا وارث ہونا اس ضابطہ سے ہے جو پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ جب صلبی اولاد (بیٹے پوتے) نہیں ہوتے تو بھائی (حقیقی اور علاتی) ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ اور حقیقی سے علاتی کے محروم ہونے کی وجہ وہ ضابطہ ہے جو پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ اقرب ابعد کو بالکلیہ محروم کر دیتا ہے۔ حقیقی رشتہ میں اقرب ہے، اور علاتی اس سے دور، اس لئے وہ محروم ہوتا ہے۔

دوصورتوں میں ماں کوثلثِ باقی ملنے کی وجہ

پہلے یہ بات آچکی ہے کہ دو مسئلوں میں ماں کو ثلثِ باقی ملتا ہے: ایک: جب ورثاء میں شوہر اور والدین ہوں۔ دوم: جب ورثاء میں بیوی اور والدین ہوں۔ پس زوجین کو حصہ دینے کے بعد باقی ماندہ کا تہائی ماں کو ملے گا، اور باقی باپ کو عصبہ ہونے کی جہت سے ملے گا۔ اور اس پر صحابہ کا اجماع ہے۔ اور اس کی وجہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایسی وضاحت سے بیان کردی ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا، بلکہ ماں کو کل ترکہ کا تہائی دیا جائے گا تو پہلے مسئلہ میں ماں کو باپ سے زیادہ مل جائے گا، جو خلافِ اصول ہے۔ مؤنث کو مذکر پر برتری حاصل نہیں۔ اور دوسرے مسئلہ میں گو ماں کو باپ سے زیادہ نہیں ملتا، مگر اس کو پہلے مسئلہ کے حکم میں رکھا گیا ہے۔ (ان مسائل کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اختلاف کا تذکرہ بھی پہلے آچکا ہے)

بیٹی اور پوتی کے ساتھ بہن کے عصبہ ہونے کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے: بیٹی، پوتی اور حقیقی بہن میں فیصلہ کیا کہ بیٹی کے لئے نصف، پوتی کے لئے سدس اور باقی بہن کے لئے ہے (مشکوٰۃ حدیث ۳۰۵۹)

تشریح: رسول اللہ ﷺ نے یہ فیصلہ اس وجہ سے کیا ہے کہ جو چیز اقرب کے قبضہ میں چلی جاتی ہے، اس میں تو ابعد مزاحمت نہیں کرتا۔ مگر باقی ماندہ کا ابعد زیادہ حقدار ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس صنف کے لئے جو کچھ مقرر کیا ہے اس کو پورا وصول کرتا ہے۔ پس جب بیٹی نے اپنا پورا حق نصف لے لیا تو سدس پوتی لے گی۔ کیونکہ بیٹیوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے دوثلث مقرر کیا ہے۔ اور پوتی بیٹیوں کے حکم میں ہے۔ پس وہ حقیقی بیٹی سے اس کے نصف میں تو مزاحمت نہیں کرے گی۔ البتہ بیٹیوں کے حق میں جو بچے گا وہ لے گی۔ پھر بہن عصبہ ہوگی۔ کیونکہ اس میں بیٹیوں کی قائم مقامی کرنے کے معنی پائے جاتے ہیں۔ جب بیٹے بیٹیاں نہیں ہوتیں اور صرف بہنیں ہوتی ہیں تو وہی ذوی الفروض بنتی ہیں۔ نیز وہ میت کے خاندان کی اور اس کے شرف کی حامل ہیں، اس لئے وہ عصبہ ہوکر باقی ترکہ لیتی ہیں۔

حقیقی بھائی کو اخیافی بھائیوں کے ساتھ شریک کرنے کی وجہ

اگر میت نے شوہر، ماں، چند اخیافی اور چند حقیقی بھائی ورثاء چھوڑے ہوں۔اور حسب ضابطہ مسئلہ بنایا جائے تو شوہر کو نصف، ماں کو سدس، اخیافی کو ثلث ملے گا اور حقیقی عصبہ ہوں گے۔پھر جب ۶ میں سے ۳ شوہر کو، ایک ماں کو اور دو اخیافی کو دیئے جائیں گے تو عصبہ کے لئے کچھ نہیں بچے گا۔اس صورت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ حقیقی محروم رہیں گے۔مگر حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت ابن مسعود، حضرت زید بن ثابت اور قاضی شریح کی رائے یہ تھی کہ حقیقی: اخیافی کے حصہ میں شریک ہوں گے یعنی ان کو جو ثلث ملا ہے وہ اخیافی اور حقیقی میں مشترک ہوگا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اخیافی صرف ماں شریک ہیں، اور وارث ہیں۔اور حقیقی ماں اور باپ دونوں میں شریک ہیں۔پس باپ نے حقیقی کو میت سے قریب ہی کیا ہے۔دور نہیں کیا۔پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اخیافی تو وارث ہوں اور حقیقی محروم رہیں؟ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہی قول میرے نزدیک شریعت کے اصول سے زیادہ ہم آہنگ ہے (یہ تمام روایات دارمی ۲: ۳۴۷ میں ہیں)

دادی کو سدس ملنے کی وجہ

حدیث —— حضرت بُریدۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے دادی کے لئے سدس مقرر کیا، جبکہ اس کے وَرے ماں نہ ہو'' (رواہ ابوداؤد، مشکوٰۃ حدیث ۳۰۶۹)

تشریح: دادی کو ماں کی جگہ میں رکھا گیا ہے، اس کے اقل احوال میں، پس اس کو سدس ملے گا۔اور ماں کی موجودگی میں دادی محروم ہوگی۔

دادا کی وجہ سے بھائی محروم ہونگے

دادا کی موجودگی میں حقیقی اور علاتی بھائی بہنوں کے محروم ہونے نہ ہونے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں اختلاف تھا:

پہلی رائے —— حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عثمان اور حضرت ابن عباس وغیرہ بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے یہ تھی کہ دادا کی موجودگی میں حقیقی اور علاتی بھائی بہن محروم ہوں گے۔امام اعظم رحمہ اللہ نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔اور یہی مفتی بہ قول ہے۔شاہ صاحب فرماتے ہیں: یہی قول میرے نزدیک زیادہ بہتر ہے (یہ تمام روایات سنن دارمی ۲: ۳۵۲ میں ہیں)

دوسری رائے —— حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کی رائے یہ تھی کہ حقیقی

بھائی بہن کو دادا کے ساتھ میراث ملے گی۔ صاحبین اور ائمہ ثلاثہ اسی کے قائل ہیں (تفصیل میری کتاب طرازی شرح سراجی ص ۱۹۰ میں ہے)

ولاءِ نعمت کی حکمت

جب آزاد کردہ غلام یا باندی مریں، اور ان کے ورثاء میں ذوی الفروض اور عصبہ نسبی نہ ہوں تو ان کی میراث آزاد کرنے والے کو ملتی ہے۔ اور وہ بھی نہ ہو تو اس کے عصبہ نسبی کو ملتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آزاد شدہ: آزاد کرنے والے کے خاندان کا ایک فرد بن جاتا ہے۔ وہی اس کی نصرت وحمایت کرتے ہیں۔ پس جب نزدیک کے ورثاء موجود نہ ہوں تو یہ آزاد کرنے والا پھر اس کا خاندان میراث کا زیادہ حقدار ہے۔ واللہ اعلم۔

فائدہ: نصرت وحمایت ہی کی وجہ سے ذوی الارحام اور مولی الموالات بھی میراث پاتے ہیں۔ ذوی الارحام: میت کے وہ رشتہ دار ہیں جن کا حصہ قرآن کریم میں مقرر نہیں، نہ اجماع سے ثابت ہے اور نہ وہ عصبات ہیں۔ جیسے ماموں، پھوپی، خالہ وغیرہ۔ اکثر صحابہ وتابعین کی رائے یہ تھی کہ ذوی الفروض اور عصبات کی عدم موجودگی میں ذوی الارحام وارث ہوں گے۔ اسی کو احناف اور حنابلہ نے لیا ہے۔ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ ایسی صورت میں ترکہ بیت المال میں رکھا جائے گا، ذوی الارحام کو نہیں دیا جائے گا۔ اسی کو مالک وشافعی رحمہما اللہ نے لیا ہے۔ مگر اب جبکہ بیت المال شرعی نظم کے مطابق موجود نہیں، متاخرین مالکیہ اور شافعیہ نے ذوی الارحام کی توریث کا فتوی دیا ہے۔

اور موالات: ایک خاص قسم کی دوستی کا نام ہے۔ اور وہ اس طرح ہوتی ہے کہ جس کا کوئی والی وارث نہ ہو، دوسرے سے کہے کہ آپ میرے مولی (ذمہ دار) بن جائیں، میں آپ کو اپنا وارث بناتا ہوں۔ اگر مجھ سے کوئی موجبِ دیت امر سرزد ہو جائے تو آپ دیت دیں۔ دوسرا اس کو قبول کرے تو یہ ''عقد موالات'' ہے۔ اور قبول کرنے والا ''مولی الموالات'' ہے (یہ عقد جانبین سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں دونوں ایک دوسرے کے مولی الموالات اور وارث ہوں گے) یہ عقد احناف کے نزدیک معتبر ہے، شوافع کے نزدیک معتبر نہیں۔ اور اس عقد کے لئے چھ شرائط ہیں جن کا بیان طرازی شرح سراجی ص ۴۵ میں ہے۔ اس عقد کا ذکر سورۃ النساء آیت ۳۳ میں ہے: ﴿وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ. وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ﴾ ترجمہ: اور ہر ایسے مال کے لئے جس کو والدین اور رشتہ دار چھوڑ جاویں، ہم نے وارث مقرر کر دیئے ہیں۔ اور جن لوگوں سے تمہارے عہد بندھے ہوئے ہیں ان کو ان کا حصہ دو یعنی اگر ورثاء موجود ہوں تو عقد موالات غیر معتبر ہے۔ رشتہ دار ہی وارث ہوں گے۔ اور کوئی والی وارث نہ ہو اور میت نے کسی سے عقد موالات کر رکھا ہو تو میراث کا وہی حقدار ہوگا۔ حدیث میں ضابطہ آیا ہے: **الغنم بالغرم**: نفع بعوض تاوان ہے۔

غرض: ذوی الارحام اور مولی الموالات کی میراث کی وجہ بھی نصرت وحمایت ہے۔ حدیث میں ہے: **الخال وارث**

من لاوارث له، يرث مالَه، ويفك عانَه اور ایک روایت میں ہے: يَعْقِلُ عنه، ويرثه (رواہ ابوداؤد، مشکوۃ حدیث ۳۰۵۲) یعنی ماموں میت کی طرف سے دیت ادا کرتا ہے، اور اس کے قیدی کو چھڑاتا ہے، پس وہ وارث بھی ہوگا۔ یہی وجہ مولی الموالات کے وارث ہونے کی ہے۔

[١٠] و قال صلى الله عليه وسلم: " إن أعيانَ بنى الأم يتوارثون، دون بنى العلّات"

أقول: وذلك لما ذكرنا من أن القيامَ مقامَ الميت مبناه على الاختصاص، وحَجْبِ الأقربِ الأبعدَ بالحرمان.

[١١] وأجمعت الصحابة رضى الله عنهم فى زوج وأبوين، وامرأة وأبوين: أن للأم ثلثَ الباقى. وقد بين ابن مسعود رضى الله عنه ذلك بما لامزيد عليه، حيث قال: " ما كان الله ليرانى أن أفضل أما على أب"

[١٢] وقضى رسول الله صلى الله عليه وسلم فى بنت، وابنة ابنٍ، وأختٍ لأب وأم: للابنة النصفُ، ولابنة الابن السدس، وما بقى فللأخت.

أقول: وذلك: لأن الأبعد لايُزاحم الأقرب فيما يَحُوْزُه، فما بقى فإن الأبعدَ أحقُّ به حتى يستوفى ماجعل الله لذلك الصنف؛ فالابنةُ تأخذ النصفَ كَمْلاً، وابنة الابن فى حكم البنات، فلم تزاحم البنت الحقيقية، واستوفت ما بقى من نصيب البنات، ثم كانت الأخت عصبة: لأن فيها معنى من القيام مقامَ البنت، وهى من أهل شرفه.

[١٣] و قال عمر رضى الله عنه فى زوج، وأم، وإخوةٍ لأب وأم، وإخوةٍ لأم: لم يزدهم الأب إلا قربا. وتابع عليه ابن مسعود، وزيد، وشريح رضى الله عنهم، وخلائقُ، وهذا القول أوفقُ الأقوال بقوانين الشرع.

[١٤] وقضى للجدة بالسدس: إقامةً لها مقام الأم عند عدمها.

[١٥] وكان أبوبكر، وعثمان، وابن عباس رضى الله عنهم يجعلون الجد أبا، وهو أولى الأقوال عندى.

[١٦] وأما الولاء: فالسرفيه: النصرةُ وحماية البيضة، فالأحق بها مولى النعمة، ثم بعده الذكورُ من قومه: الأقرب فالأقرب؛ والله أعلم.

ترجمہ: (۱۰) اور وہ بات یعنی علاتی کا محروم ہونا: ان باتوں کی وجہ سے ہے جن کو ہم نے ذکر کیا ہے، یعنی (۱) میت

کے قائم مقام ہونے کا مدار اختصاص پر ہے یعنی جو مخصوص رشتہ دار ہوتے ہیں وہی قائم مقام ہوتے ہیں (۲) اور اقرب کے ابعد کو بالکلیہ محروم کرنے پر۔

(۱۲) اور وہ فیصلہ اس لئے ہے کہ ابعد: اقرب سے مزاحمت نہیں کرتا اس چیز میں جس کو وہ قبضہ میں لے لیتا ہے۔ پس جو باقی رہ گیا تو ابعد اس کا زیادہ حقدار ہے تا آنکہ وہ اس چیز کو وصول کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس صنف کے لئے مقرر کی ہے۔ پس بیٹی پورا نصف لے گی۔ اور پوتی بیٹیوں کے حکم میں ہے، پس وہ حقیقی بیٹی سے مزاحمت نہیں کرے گی۔ اور جو کچھ بیٹیوں کے حصہ سے بچ گیا ہے وصول کرے گی۔ پھر بہن عصبہ ہوگی، اس لئے کہ اس میں بیٹی کے قائم مقام ہونے کے معنی ہیں۔ اور بہن میت کے شرف والوں میں سے (بھی) ہے۔

(۱۶) اور رہی ولاء: تو اس میں راز: نصرت (امداد) اور حمایتِ بیضہ یعنی مدافعت ہے۔ پس ولاء کا زیادہ حقدار آزاد کرنے والا مولی ہے، پھر اس کے بعد اس کی قوم کے مذکر ہیں۔ قریب تر پھر اس سے کم تر۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

بفضلہ تعالیٰ آج بروز پیر ۱۷ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ مطابق ۱۸ مئی ۲۰۰۳ء: بیوع ومعاملات کی شرح مکمل ہوئی۔ اسی پر یہ جلد ختم ہے۔ جلد پنجم نکاح وطلاق کے بیان سے شروع ہوگی۔ اور اس پر ان شاء اللہ شرح مکمل ہوگی۔ فالحمدللہ الذی بنعمته تتم الصالحات، والصلاة والسلام علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آله وصحبه أجمعین.

تصانیف

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری

① آسان نحو: نحو کی ابتدائی عربی کتابوں میں تدریج کا لحاظ نہیں رکھا گیا، یہ کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ زبان آسان اور انداز بیان سلجھا ہوا ہے۔ یہ دو حصے پڑھا کر عربی نحو کی کتاب شروع کرائی جا سکتی ہے۔

② آسان صرف: آسان نحو کے انداز پر تدریج کا لحاظ کر کے یہ رسالے مرتب کئے گئے ہیں۔ پہلے حصہ میں گردانیں ہیں قواعد برائے نام ہیں اور دوسرے حصہ میں قواعد مع گردان دیئے گئے ہیں۔ بہت آسان اور مفید نصاب ہے۔

③ آسان منطق: ترتیب تیسیر المنطق۔ دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس میں اب تیسیر المنطق کی جگہ یہ کتاب پڑھائی جاتی ہے۔

④ مبادئ الفلسفہ (عربی) میبذی سے پہلے اصطلاحات فلسفہ جاننے کے لئے یہ رسالہ دارالعلوم دیوبند نے مرتب کرایا ہے اور داخل نصاب ہے۔

⑤ معین الفلسفہ (اردو) یہ مبادئ الفلسفہ کی شرح بھی ہے اور فلسفہ کی بیش بہا معلومات کا خزانہ بھی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے میبذی آسان ہو جاتی ہے۔ عام قارئین کے لئے بھی معلومات افزا ہے۔

⑥ الفوز الکبیر (جدید ترجمہ) قدیم ترجمہ میں سُقم تھا، اس کو سنوارا گیا ہے، اور ضروری حاشیہ لکھ کر عمدہ کاغذ پر کتاب طبع کی گئی ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں اب یہی ترجمہ پڑھایا جاتا ہے۔ متوسط استعداد والے خود بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔

⑦ العون الکبیر (عربی) الفوز الکبیر کی مفصل شرح اور اصول تفسیر کی بیش بہا معلومات کا خزانہ ہے۔

⑧ الخیر الکثیر شرح الفوز الکبیر: الفوز الکبیر (جدید تعریب) کی پہلی کامیاب اردو شرح از جناب مفتی محمد امین صاحب پالن پوری، انوکھا انداز بیان۔ پہلے عنوان قائم کر کے مسئلہ سمجھایا ہے۔ پھر عبارت ضروری اعراب کے ساتھ رکھی ہے اور ترجمہ کیا ہے پھر حل لغات اور ضروری تشریح کی ہے۔ اصول تفسیر کو از خود سمجھنے کے لئے بھی یہ کتاب بے بہا ہے۔

⑨ محفوظات (تین حصے) آیات واحادیث کا مجموعہ، جو طلبہ کے حفظ کرنے کیلئے مرتب کے گئے ہیں۔

⑩ فیض المنعم: مقدمہ مسلم شریف کی اردو شرح ہے۔ اس میں ضروری ترکیب اور حل لغات بھی ہیں۔

⑪ مفتاح التہذیب: تہذیب المنطق کی نہایت آسان شرح، اس سے شرح تہذیب بھی حل ہو جاتی ہے۔

⑫ تحفۃ الدرر: نخبۃ الفکر کی شرح ہے۔ ہر اصطلاح مثال کے ساتھ علحدہ علحدہ دی گئی ہے۔ شرح نخبہ بھی اس سے حل ہوتی ہے۔

⑬ مفتاح العوامل: شیخ فخر الدین احمد صاحب مرادآبادی کی شرح مأۃ عامل کی اردو شرح، مع ترکیب۔

⑭ گنجینہ صرف: یہ بھی حضرت شیخ رحمہ اللہ کی پنج گنج کی مفصل شرح ہے اور علم صرف کی تحقیقات کا گنجینہ ہے۔

⑮ مبادیات فقہ: فقہ کی کوئی بھی کتاب شروع کرنے سے پہلے جو باتیں جاننی ضروری ہیں وہ سب اس کتاب میں موجود ہیں۔

⑯ آپ فتوی کیسے دیں؟: علامہ ابن عابدینؒ کی درسی کتاب رسم المفتی کا ترجمہ اور شرح۔ آخر میں فقہائے احناف اور

ان کی مشہور کتابوں کا تعارف بھی دیا گیا ہے۔

⑰ مشاہیر محدثین وفقہائے کرام اور تذکرہ راویان کتب حدیث: شروع میں خلفائے راشدین، عشرۂ مبشرہ، ازواج مطہرات، بنات طیبات اور مدینہ کے فقہائے سبعہ کا تذکرہ ہے، نیز صحاح ستہ، طحاوی، موطین اور مشکوٰۃ شریف کے رُوات (از مصنف کتاب تا اساتذۂ دارالعلوم دیوبند) کے احوال بیان کئے گئے ہیں۔ حدیث کے ہر طالب علم کیلئے اس کا مطالعہ مفید ہے۔

⑱ حیات امام ابوداؤد: صاحب سنن امام ابوداؤد رحمہ اللہ کے مفصل حالات۔ اور سنن ابی داؤد کا مفصل تعارف۔

⑲ حیات امام طحاوی: حنفی محدث وفقیہ امام طحاوی رحمہ اللہ کے مفصل حالات، شرح معانی الآثار کا مفصل تعارف اور نظر طحاوی اور نسخ وتواتر پر سیر حاصل گفتگو۔

⑳ زُبدۃ شرح معانی الآثار (عربی) کتاب الطہارۃ کا خلاصہ اور مفید حواشی سے مزین۔

㉑ اسلام تغیر پذیر دنیا میں: چار مقالے جو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اور جامعہ ملیہ دہلی کے سمیناروں میں پڑھے گئے۔

㉒ ڈاڑھی اور انبیاء کی سنتیں: ڈاڑھی، مونچھ، بال، زیر ناف، ختنہ وغیرہ بہت سی سنتوں کے مسائل، دلائل اور فضائل کا مجموعہ۔

㉓ حرمت مصاہرت: سسرالی اور دامادی رشتوں کے مفصل احکام اور ناجائز انتفاع سے پیدا ہونے والی الجھنوں کا حل۔

㉔ کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟ حضرت نانوتویؒ کی توثیق الکلام کی شرح، مسئلہ کی مکمل تنقیح اور سیر حاصل بحث۔

㉕ تسہیل ادلہ کاملہ: حضرت شیخ الہندؒ کی ادلہ کاملہ کی شرح۔ غیر مقلدین کے چھیڑے ہوئے دس مشہور مسائل کی تفصیل۔

㉖ ایضاح الأدلہ: ادلہ کاملہ کے جواب مصباح الادلہ کا مفصل ومدلل رد ہے۔ یہ حضرت شیخ الہندؒ کی مایۂ ناز کتاب ہے۔

㉗ تفسیر ہدایت القرآن: یہ مقبول عام وخاص تفسیر ہے۔ پارہ ۳۰ و ۱-۹ حضرت مولانا محمد کاشف الہاشمیؒ کے لکھے ہوئے ہیں اور ۱۰ تا ۱۵ مفتی صاحب نے لکھے ہیں، اس تفسیر میں ہر ہر قرآنی کلمہ کے الگ الگ معنی دئے گئے ہیں اور حاشیہ میں حل لغات اور ضروری ترکیب دی گئی ہے۔

㉘ طرازی شرح سراجی: یہ سراجی کی مکمل شرح ہے اور ذوی الارحام کا حصہ خاص طور پر حل کیا گیا ہے۔

㉙ رحمۃ اللہ الواسعہ: جلد اول، دوم، سوم اور چہارم طبع ہو چکی ہیں اور آخری جلد زیر تصنیف ہے۔

㉚ آداب اذان واقامت: اس کتاب میں اذان واقامت کے فضائل ومسائل اور دلائل عام فہم زبان میں بیان کئے گئے ہیں۔

اصلاح معاشرہ: مسلم معاشرہ کو ہر قسم کی برائیوں سے پاک کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ اور تعلیم بے حد مفید ہے۔

㉜ فتاویٰ رحیمیہ کامل دس جلدیں مع فہرست: حضرت مولانا عبدالرحیم لاجپوری صاحبؒ کی زندگی بھر کا سرمایہ، اور کتب فتاویٰ کا سرتاج۔

سوانح مولانا محمد عمر صاحب پالن پوریؒ: مولانا مفتی محمد صاحب پالن پوری کی نہایت مقبول کتاب۔

ملنے کا پتہ

مکتبہ حجاز دیوبند ضلع سہارنپور (یوپی)